UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222899

UNIVERSAL
LIBRARY

UnEven Page Numbers Within The Book Only

TEXT CUT BOOK ONLY&PAGE MISSING BOOK

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱ ک ۴۰۵ ہندوستانی ادب

Accession No.

Author

Title جلد ۳۳ نمبر ۱ - ۱۲

This book should be returned on or before the date last marked below.

اکتوبر ۱۹۷۲ تا ستمبر ۱۹۷۳ء

ہندستانی ادب

ایڈیٹر۔ جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا)
۹۹۔ اے۔ اعظم پورا شرقی۔ حیدرآباد ۳۶۔ آندھرا پردیش (انڈیا)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالا

رجسٹرڈ نمبر اچ (۳۸۴)
آذر۔ دے۔ بہمن سنہ ۱۳۸۲ف

جلد (۳۳) نمبر (۱۔۲۔۳)
اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء

چندا سالانا

بارا روپے

ہندستانی ادب

رازدار خان بوزنی

۹۹۔اے۔ اعظم پورا شرقی حیدرآباد (۶) آندھرا پردیش انڈیا۔

ایڈیٹر
جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحا
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
۲	شہزادی کا رومان	جی۔ ایم۔ خان صاحب ایڈیٹر "ہندستانی ادب"	۹
۳	رازدار خان صاحب بوزنی	جی۔ ایم۔ خان صاحب ایڈیٹر "ہندستانی ادب"	۵۳

ہمارے خیالات

ہندستانی ادب تینتیس (۳۳) ویں سال میں

آج ہمیں یہ کہتے ہوئے انتہائی خوشی اور بے حد مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ "ہندستانی ادب" نے اکتوبر ۱۹۷۲ء کو اپنے وجود کے ۳۳ ویں سال میں قدم رکھا ہے۔ ہر سال اس رسالے کی زندگی میں ایک سال کا اضافہ ہمارے نزدیک معجزے سے کم نہیں۔ جب تراس میں آس بندھتی ہے، تو بحیثیت حقیقت بیس دو بالا ہو جاتی ہے اور یہ سب کچھ "ہندستانی ادب" کے انتہائی کمزور یعنی صفر سے کئی درجے نیچے رہے اور اپنے حالات کا سبب ہے اظہر ہے کہ ان ناگوار، اور مایوس کن حالات میں اگر اتفاقی طور پر رسالے کی عمر میں ایک سال کا اضافہ ہو جائے تو لازمی طور پر ہمیں دلی مسرت اور خوشی ہو گی۔

"ہندستانی ادب" کا مالی موقف اس قدر کمزور ہے کہ ان سطروں کے لکھتے وقت ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسالہ مارچ ۱۹۷۳ء تک باقی رہ سکتا ہے، اس کے بعد ہم خدا نہیں کہہ سکتے کہ آیا اپریل ۱۹۷۳ء کا نمبر ہم نکال سکیں گے یا نہیں اس لیے کہ یہ ہمارے لیے کاروبار نہیں، نمبر نکالنا نہ نکالنا، حیدرآباد کے ایک سرکاری ادارے پر منحصر ہے، اگر وہ ادارہ آئندہ مالی سال یعنی اپریل ۱۹۷۳ء سے مارچ ۱۹۷۴ء کے لیے اس رسالے کی خریدی کی منظوری دے دے، تو پھر ہم بلا تکلف اس رسالے کو ایک سال تک جاری رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں

[illegible]

کے لیے بھی اس رسالے کی خریدی کی منظوری مل جائے گی، اور اگر اتفاق سے، ایک فی صد کی حد تک کسی خاص وجہ سے اور بدلتے ہوئے حالات کے بحیثیت آئندہ سال کے لیے اس رسالے کی خریدی کی منظوری نہ ملے، تو لازمی طور پر رسالہ بند ہو جائے گا، اس لیے کہ خدا ہمارا مالی موقف صفر سے کئی درجے نیچے ہے، ہم اپنے مالی موقف کا نام تک نہیں لے سکتے، اور ہم قطعی اور بلکل ہی کہنا نہیں چاہتے کہ مالی موقف کس چڑیا کا نام ہے، اس لیے کہ جس شخص کی ماہانہ ایک روپے کی بھی آمدنی نہ ہو تو وہ اپنا مالی موقف کیوں کر اور کیسے بیان کر سکتا ہے۔ اب حرف لے دے کر لازمی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مالی موقف جب صفر کے برابر ہے تو ہم زندا کیسے ہیں، آیا ہوا کھا کر جی رہے ہیں، نہیں، یہ تو سراسر غلط ہے کہ ہم ہوا نہیں بلکہ غذا کھا کر جی رہے ہیں، مگر وہ غذا ہمیں ایک محدود مقدار میں ملتی ہے، جس کو اصطلاح میں "موت تاخیر موت" کہا جاتا ہے، یعنی آدمی کو ہر روز صرف غذا مل جائے کہ وہ اس کے کھانے کے بعد مرنے نہ پائے، چنانچہ ہمارا بھی بلکل یہی حال ہے! اور ہمارے بعض ملنے جلنے والے، ہمارے بعض ملنے جلنے والے، ہمارے اس سوفی فیصد صداقت بھرے بیان کو بہتر جانتے ہیں۔

ایک اور سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اتنی قلیل غذا بھی لینے کے بعد ملتی ہے

ہماری ایک روپے کی بھی آمدنی نہیں ہے، تو پھر اس نام نہاد غذا کے خریدنے کے لیے اتنا پیسا کہاں سے آتا ہے۔ جی آتا مزور ہے، لیکن ہمارے گھر پیسوں کا کوئی سوتی جھرا نہیں ہے جس سے دولت کے جھرنے پھوٹ پڑتے ہوں، بلکہ "ہندستانی ادب" کے سلسلے میں ہم جو قرض لیتے ہیں، انہیں پیسوں میں سے اپنے "قوت لایموت" کے لیے بھی خرچ کیے دیتے ہیں۔ ہم دن میں صرف دو وقت کھاتے ہیں، صبح اور شام۔ صبح کا کھانا پیٹ بھر نہیں ہوتا بلکہ یوم فاقے کی حالت میں ہوتا ہے لیکن کسی روز تو پیٹ کو سمجھا بجھا کر ٹالے دیتے ہیں، اور ایک (صرف) کافی سے دل کو تشفی دے لیتے ہیں۔ اور رات کا کھانا لازماً پیٹ ہوتا ہے، اور اس سے ہماری تشفی بھی ہوتی ہے۔ یہ کھانا ہمارے لیے پیٹنٹ سا ہو گیا ہے۔ صبح کھا لیتے نہ کھا لیتے، تمہیں اس کی مطلق پروا نہیں ہوتی، لیکن اگر اتفاق سے ہمارا رات کا پیٹنٹ کھانا نہ ملے تو طبیعت بے چین اور بے قرار سی ہو جاتی ہے۔ صبح ایک تو تل ہم دو دھ لیتے ہیں، گرم کرکے وقت اس میں زیادہ مقدار میں شکر ملا دیتے ہیں، اس کے بعد ماڈرن بریڈ کے چار سلائیس چھوڑ دیتے ہیں، اور اگر اتفاق سے موز بھی آ جائیں تو دو چار کیلے ہوئے موز بھی کترکر اس میں ملا دیتے ہیں، اور یہ ہماری مرغوب اور بہترین غذا ہوتی ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ "ہندستانی ادب" کی آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے، تو اس کی پابجائی قرضوں سے کرنی پڑتی ہے، اور قرض لیے بغیر چارہ ہی نہیں، اس لیے کہ بغیر پیسوں کے کام نہیں چلتا۔ اور پھر ہمارے پیٹ کا بھی سوال نظر رہتا ہے، جس طرح سے نظر تطرے سے تالاب بھرتا ہے، بالکل اسی طرح ہمارے تھوڑے تھوڑے قرض نے ایک بڑی اور بھیانک شکل اختیار کر لی ہے، اور محض اور صرف "ہندستانی ادب" کی وجہ سے ہم اس وقت تقریباً چار ہزار روپے کے قرض دار ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چار ہزار روپے ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چار ہزار کی نظر میں چار روپے کے برابر ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چار ہزار کا بھی کوئی قرض ہوا، مگر ہمارے نزدیک تو ہی چار ہزار چار لاکھ کے برابر ہیں، اس لیے کہ ہمارے ہاں آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ نہیں ہے۔ بہرحال اس رسالے کے طفیل ہم قرض دار ضرور ہیں۔ یہ قرض سود کی نہیں ہے، بلکہ بلاسود کی ہے، مگر ہم نے قرض دینے والے کے ساتھ۔ سود در سود۔ سود در سود۔ سود در سود۔ اور بلا مبالغہ، سود در سود سے بھی کہیں زیادہ اسلوک کیا ہے۔ ہمارے اس "حاتم طائیانہ" سلوک کو صرف قرض دینے والا اور قرض لینے والا ہی جانتا ہے، اور یہ سب کچھ اپنے عزیز از جان رسالے "ہندستانی ادب" کو زندہ اور باقی رکھنے کی وجہ سے ہے!

علمی ادبی رسالوں کے جن ایڈیٹروں کو اپنا رسالہ جاری رکھنے کی دھن اور لگن ہوتی ہے وہ حقیقت میں اپنا رسالہ لفظاں میں چلاتے ہیں، اور بڑے ہی خسارے میں رہتے ہیں۔ آج سے چند سال پہلے، انہی کالموں میں ہم نے شاہد احمد، ایڈیٹر "ساقی"، کی مثال پیش کی تھی۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ "ساقی" نفع میں چلایا جا رہا ہے، لیکن پاکستان جانے کے بعد شاہد احمد نے اپنے ایک مضمون میں آپ بیتی لکھی، اور اس میں سارا پول کھول کر رکھ دیا کہ "ساقی" ہمیشہ ہی نقصان میں رہا، اور اسی نقصان کی پابجائی انہوں نے اپنی آبائی جائیداد بیچ کر کی، اور یہ بھی لکھا تھا کہ پاکستان میں بھی "ساقی" نقصان کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔ پاکستان ریڈیو کے شعبۂ موسیقی میں ہیلسنورے چلے ماہوار کے ملازم تھے اور اپنی آمدنی سے "ساقی" بھی چلا رہے تھے۔ یہ مضمون ہم نے "ساقی" سے "ہندستانی ادب" کے کسی ایک پچھلے نمبر میں نقل کیا تھا، اسی لیے اب موقع محل سے اتنی باتوں کو دہرا رہے ہیں۔

دوسری جانب "زیور" پبلشنگ کو دیکھیے کہ یہ رسالہ مسلسل پانچ سال سے سو فی صد اور سو فی صد نقصان میں چلایا جا رہا ہے، اور وہ بھاری نقصان ہماری چھوٹی سی عقل اور سمجھ سے باہر ہے، اس لیے آپ ایڈیٹر "زیور" [illegible] کے لفظوں میں سن لیجیے۔ "زیور" مارچ ستمبر ۱۹۷۲ء میں انھوں نے لکھا ہے کہ "ہم جس خدمت کے جذبے سے اٹھے تھے، آج بھی وہ جذبہ ہمارے [illegible] میں موجود ہے، یہ بتانے میں باک نہیں [illegible] مشکلات ہمارے سفر میں رخنہ انداز ہو [illegible]

ی لیے ابتک اس طور پر خدمت نہیں کر سکے ہیں، جیسی
ہماری خواہش ہے۔ قارئین کرام کو یہ جان کر حیرت
گی کہ "زیور" اب تک اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا
ے اور اس پانچ سال کے عرصے میں دس ہزار کا
ارا برداشت کرنا پڑا ہے۔ ہمارے سامنے سب سے
سوال یہ ہے کہ "زیور" کو کس طرح زندہ رکھا جائے؟
ن کے لیے ہم سوائے قارئین سے تعاون کی اپیل کرنے کے
دوا، اور کر سکتے ہیں! لوگ کہتے ہیں کہ اپیل سے
نہیں ہوتا، مگر یقین ہے کہ درد مند انا اور مخلصانہ
رش کبھی بے اثر نہیں جاتی۔ دیکھیں ہماری اس اپیل
ا اثر ہوتا ہے۔ ادارہ۔"

دیکھ لیا آپ نے ہمارا ایک معمار کس بری طرح سے
مشکلات کے بھنور میں پھنسی گیا ہے۔ اس نے قارئین
یور" سے اپیل کی ہے کہ خریدار فراہم کر کے "زیور"
ختم ہونے سے بچا لیجائے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی یہ
کار گر ہو، اور "زیور" کے لیے دو چار ہزار خریدار
ہم ہو جائیں، اور "زیور" ختم ہونے سے بچ رہے!
ہندستانی ادب کے سلسلے میں اگر ہم پڑھنے والوں
ں قسم کی اپیل کریں تو فوراً وہ یہ کہہ اٹھیں گے کہ
یلتا ہے، ہماری سمجھ سے باہر ہے، معلوم ہوتا ہے
یٹر کا دماغ خراب ہو گیا ہے، اس کو پاگل خانے
وغیرہ وغیرہ! ہاں اگر رعایتی پڑھنے والوں
ضرورت ہوتی تو پھر ہماری تعریف کے راگ الاپنے
ہیں کہ ہاں کیا کہنے! "ہندستانی ادب" سے بہتر
لا نہیں ہے، ارے ہندستان تو کیا سارا آپ نے سارے
یا میں جس سے پڑھ یا رسالا نہیں ہے، کیسے معیاری
ضامین، نظمیں، غزلیں وغیرہ شائع کرتا ہے "جس"
اب نہیں، اور ایڈیٹوریل تو ایسے نمونے کے
ہیں کہ کوزہ میں دریا بند کر دیا ہے، لکھا ہے، چھپا ہے
جواب، اور رنگین ٹائیٹل کے ساتھ پیش کرتا ہے
پہلے اس رسالے کے!

شہزادی کا رومان

ایک جدید بادشاہ کی رنگین جی۔ گ نانڈ فرنانڈس

G. ARNOLD FERNANDES نے ۱۹۰۰ء میں
رومانس آف ازینا ROMANCE OF AZENA
انگریزی میں ناول لکھا تھا، اور یہ ناول اسی سنہ
میں ہوا سنڈ کمپنی مدراس HOE & CO. MADRAS
میں چھپا تھا۔ یہ (۵۰۰) صفحے کا ناول ہمارے ہاں
موجود تھا، ہم نے اس کو پڑھا تھا، اور اس کا
ترجمہ کرنا چاہتے تھے کہ ایسے میں یہ ناول ہمارے ہاں
سے چوری ہو گیا۔ بعد میں ہم نے اس ناول کی تلاش
کی مگر وہ کہیں بھی نہیں ملا۔

ہم نے انگریزی زبان کو دو نئے لفظ (۱) CANTEL
(۲) MEATARIAN دیے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈکشنریاں
دیکھنے کی غرض سے ہم سالار جنگ میوزیم لائبریری گئے تھے۔
وہاں ڈکشنریوں کا کام ختم کرنے کے بعد ہم نے لائبریرین سے دریافت
کیا کہ آیا ناول رومانس آف ازینا ان کی لائبریری میں موجود
ہے؟ ہاں ہے ضرور، مگر بہت ہی بری حالت میں ہے، یعنی
اس کا ایک ایک ورق علیحدہ ہے۔ ہم نے کہا کہ ہم نہایت
ہی احتیاط سے اس کا مطالعہ کریں گے، اور اس کا ایک
ورق بھی خراب نہیں ہونے پائے گا، چنانچہ وہ ناول ہمیں
دیا گیا، اور ایک ہفتے کے اندر ہی ہم نے اپنے ناول کو
پڑھ ڈالا۔ پھٹی یادگار تازا ہو گئی، اور ہم نے لائبریرین سے
کہا کہ ہم اس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتے ہیں، روزانا
یہاں آ کر اس کتاب کا ترجمہ کریں گے۔ انھوں نے
اس کی بھی اجازت دیدی، اور دوسرے ہی روز سے
ہم نے ترجمہ شروع کر دیا، مگر ہم سے روز روز کی پابندی
نہ ہو سکی، جب کبھی فرصت ملے چلے جاتے اور چند صفحوں
کا ترجمہ کر ڈالتے تھے۔ (۵۰۰) صفحوں میں سے (۲۰۰)
صفحوں کا ترجمہ ہو جانے کے بعد ہم نے یہ طے کیا کہ اس
ناول کو "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کے لیے
انھی صفحوں میں قسط وار پیش کیا جائے، جس کی پہلی
قسط (۳۴) دیں سال کے اس (۱-۲-۳) ملے
جلے نمبر میں پیش ہے۔ اس کے بعد سے اس
رسالے کے ہر آنے والے نمبر میں قسطیں پیش کی جائیں گی،
یہاں تک کہ پورا ناول ختم نہ ہو جائے۔

خصوصیت کے ساتھ اس ناول کا ترجمہ کرنے
سے متعلق دو وجہیں ہم نے اس لیے طے کیں کہ اس ناول کی

ہیروئن HEROINE حیدرآباد کے مشہور و معروف امیر و کبیر نواب آسمان جاہ سابق وزیر اعظم حیدرآباد اور امیر پائیگاہ کی لڑکی، رحیم النسا ہے، جس نے اتفاقی طور پر ۵ محرم کو حیدرآباد کے مشہور زمانہ لنگر میں ایک حسین گھوڑے سوار نوجوان کو دیکھا تھا، اور اس کے حسن بے پایاں سے متاثر ہو کر رحیم النسا نے اپنا دل، اس حسین نوجوان افضل خان کو دے دیا تھا۔

افضل خان عالا تعلیم یافتہ (لندن پلیٹ) اور حیدرآباد کے ایک بڑے جاگیردار میر علی خان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ افضل خان رحیم النسا کی عشقیہ داستان سے سراسر ناواقف تھا۔ رحیم النسا کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ نوجوان کون ہے، اور کس کا لڑکا ہے، اور جذبہ رحیم النسا نے اپنے طور پر اس کی ٹوہ اور چھان بین میں لگ گئی۔ رحیم النسا ایک لاکھ بیچی باپ کی حسین ترین لڑکی تھی، جس کی ڈیوڑھی میں دولت اور بلا زمین وغیرہ کی کوئی کمی نہ تھی۔ چنانچہ رحیم النسا نے اپنی ہی ڈیوڑھی کی ملازم عورتوں کے ذریعہ دولت کے بے پناہ خرچ کے ذریعے، اپنے منظور نظر کی تلاش اور جستجو شروع کر دی، جس کی تفصیل اس ناول میں پڑھیے۔ رحیم النسا نے یہ ساری کوشش اپنی ماماؤں کے ذریعے راز میں کی، اور اپنے باپ نواب آسمان جاہ کو اس کا علم تک نہ ہونے دیا۔ اسی ضمن میں ڈیوڑھی کے ایک غدار اور لالچی ملازم نے رحیم النسا کو آفیون ملی ہوئی مٹھائی لا کر دی، اور یہ کہا کہ یہ مٹھائی اس کے عاشق زار نواب افضل خان نے بھیجوائی ہے، اور یہ تاکید کی ہے کہ یہ ساری مٹھائی رحیم النسا خود کھائے، اور کسی دوسرے کو نہ دے۔ رحیم النسا نے وہ مٹھائی کھائی اور بے ہوش ہو گئی۔ اس کا سارا جسم نیلگوں ہو گیا، اور موت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس اچانک حادثے سے پورا آسمان جاہ بے حد متاثر ہوئے اور (۲۴) گھنٹے تک کے تعلق رہتے رہے۔ انھوں نے ایک انگریز لیڈی ڈاکٹر مس کرک پیٹرک کو طلب کیا، کرک پیٹرک فوراً چلی آئی، اور تعریفاً کا ڈٹ کر علاج کیا، ڈیوڑھی

کرتی رہی، اور نواب آسمان جاہ کو یقین دلایا وہ گھبرائیں نہیں، اور پریشان نہ ہوں، افیون کا سلسل انجکشنوں کے ذریعے زائل کر دیا جائے گا۔ کرک پیٹرک کی خصوصی توجہ سے رحیم النسا بالکل بھلی چنگی ہو گئی۔

افضل خان اور کرک پیٹرک برائیٹن اور (انگلینڈ) میں سات سال تک دوست اور کلاس میٹ بھی تھے۔ افضل خان کرک پیٹرک سے محبت تھا، اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر کرک پیٹرک اس کے اس آفر کو ٹالتی رہی، یہاں تک افضل خان سات سال بعد لندن سے حیدرآباد اس وقت پیٹرک نے افضل خان کو یقین دلایا کہ سال تک لندن میں پریکٹیس کرنے کے بعد آکر وہ افضل خان سے ضرور شادی کر لے گی، مگر افضل خان کے ہندستان آتے ہی اس نے لندن کے بیرسٹر ولسٹر WEBSTER سے شادی کر لی۔ سال بعد بچا پیدا ہوا تو ولسٹر سے طلاق لے کر اس نے حیدرآباد آکر ڈیوڑھی قائم کی، اس سے وہ برابر خط و کتابت کرتی رہی تھی، مگر ان باتوں اس کو معلوم نہ کرایا تھا۔

حیدرآباد آنے کے بعد افضل خان اس کی طرح چاہتا تھا۔ رہنے کے لیے مکان دلایا، اور حیدرآباد کے بڑے بڑے امرا میں بہ حیثیت لیڈی ڈاکٹر اس کا تعارف بھی کرایا تھا۔ یہاں بھی افضل خان کو جل دیتی رہی، اور آج کل، آج کل ٹالتی رہی۔ ایسے میں جب رحیم النسا کا واقعہ پیش آیا، اور ڈیوڑھی کے ملازم کے ذریعے جب اس کو اس بات کا علم ہوا کہ مٹھائی در اصل افضل خان نے بھجوائی تھی، اور وہ رحیم النسا سے عشق کرتا ہے۔ رحیم النسا نے افضل خان سے ملنے ملانے سے انکار کر دیا۔ افضل خان نے یہ آخری حربہ اختیار کیا تاکہ رحیم النسا کو افیون ملی ہوئی مٹھائی کھا کر ختم کر دے۔

چنانچہ لیڈی ڈاکٹر مس کرک پیٹرک افضل خان

کہ خدا میں نے رحیم النسا کا علاج کیا ہے۔ رحیم النسا نے جو مٹھائی کھائی تھی، اس میں افیون ملی ہوئی تھی اور اسی افیون کے زیر سے رحیم النسا کا سارا جسم متاثر ہو گیا تھا۔ وہ حقیقت میں مرنے کے قریب ہو گئی تھی، مگر میں نے اس کو اپنے علاج سے مرنے سے بچا لیا ہے، اس لیے اس نے پولیس سے کہا کہ افضل خان کو اقدام قتل کی ملت میں حالان کیا جائے اور میں ایک لیڈی ڈاکٹر اور رحیم النسا کے معالج کی حیثیت سے عدالت میں گواہی دوں گی، تاکہ عدالت اس مرد دود، ذلیل اور کمینے شخص افضل خان کو موت کی سزا دے۔

اس نوعیت پر جل کر کمیں افضل خان کو علم ہوا کہ رحیم النسا اس کو چاہتی ہے، اور اس کے نام سے دو تو کیا کسی غدار ملازم نے مٹھائی میں افیون ملا کر افضل خان کے پاس بھجوائی تھی۔ چنانچہ رحیم النسا نے وہ مٹھائی کھائی تھی اور سارا زہر اس کے جسم میں پھیل گیا تھا، مگر کرک پیٹرک کے علاج سے رحیم النسا اچھی ہو گئی۔ نیز یہ کہ کرک پیٹرک اس سلسلے میں افضل خان کی جان کی دشمن بن گئی ہے۔ اس کے علاوہ اسی عرصے میں پراکٹس (انگلینڈ) سے لیڈی بیٹرس بوائیٹھ نے اپنی سگی بھتیجی مس کرک پیٹرک سارا حال احوال لکھ بھیجا کہ افضل خان کے ہندستان جانے کے بعد اس نے بیرسٹر ولسٹر سے شادی کی تھی، اور اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، لڑکا پیدا ہونے کے بعد اس نے ولسٹر سے طلاق حاصل کر لی، اور لڑکے کو باپ کے حوالے کرتے ہوئے افضل خان کے ہاں حیدرآباد چلی گئی۔

لیڈی بیٹرس بوائیٹھ کا خط دیکھتے ہی افضل خان کو مس کرک پیٹرک سے سخت ترین نفرت سی ہو گئی، اور یہ دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے۔ ان کی دشمنی کا کیا نتیجہ نکلا، اس کو آپ اصل ناول میں پڑھیے۔

چونکہ لیڈی ڈاکٹر مس کرک پیٹرک نے دل جمعی سے کر ان کی لڑکی رحیم النسا کی جان بچائی تھی اس لیے نواب صاحب نے لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، اور اس کو بہت کچھ نوازا بھی۔

نواب آسمان جاہ، حضور نظام نواب میر محبوب علی خان کے بڑے بھتیجے تھے۔ اس طرح رحیم النسا حضور نظام کی سگی بھانجی بنتی تھی، چنانچہ زہر خورانی کے بعد جب حضور نظام، نواب آسمان جاہ کی دلجوئی کے لیے

تشریف لے جاتے تھے تو نظام کے علاوہ 'رزیڈنٹ حیدرآباد' اور دوسرے انگریز عہدیدار بھی مزاج پرسی کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وزیراعظم حیدرآباد سر سالار جنگ اور کئی ایک امرا اور جاگیردار اور عہدیداران حیدرآباد بھی آیا کرتے تھے۔

یہ پورا ناول شروع سے آخر تک اسی قسم کی دلچسپیوں اور دلگیریوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اس ناول کا ترجمہ کرنے کی طرف خاص طور پر توجہ دی تھی چنانچہ اس ناول کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ اور باقی (۲۰۰) صفحے کا ترجمہ بھی ہو جائے گا، اور پورا ناول ترجمے کی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جائیگا۔ ترجمہ نہایت ہی آسان اور سلیس ٹھیٹ ہندستانی زبان میں کیا گیا ہے۔ ترجمے کی زبان میں سلاست اور روانی ہے، اور عبارت میں ربط قائم رکھا گیا ہے۔ حیدرآباد کے خاص حالات کا لحاظ کرتے بعض ضروری واقعات کا اظہار ہم نے اپنی طرف سے کیا ہے، جن سے ناول نگار فرنانڈز ناواقف تھا!

رازدار خان یوزفی نمبر

ایک طویل عرصے سے ہمارا خیال تھا کہ اپنے والد مرحوم کے بارے کچھ لکھیں۔ آج کل آج کل ٹالتے رہے، اور جب سے کہ ہم نے "ہندستانی ادب" جاری کیا ہے، اب تک کئی سال گزر گئے۔ سب سے پہلے یہ خیال ہمیں "ہندستانی ادب" کے "جوبلی نمبر" کے وقت ہوا تھا، یعنی اس رسالے نے اپنے وجود کے پچیس (۲۵) سال پورے کر لیے تھے تو ہم نے "ہندستانی ادب" کا جوبلی نمبر نکالا تھا، اور دنیائے صحافت میں ہماری یہ جدت تھی" اس لیے کہ پچیس سال کے ختم پر "سلور جوبلی" منائی جاتی ہے، اور بتیس سال کے ختم پر "جوبلی" کا خیال آج تک کسی کو بھی نہیں ہوا، نہ صرف صحافتی میدان میں، بلکہ زندگی اور کاروبار کے ہر شعبے میں پچیس سالا جوبلی منائی جانی چاہیے، لیکن لوگ اس قدر قدامت پسند یا CONSERVATIVE قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ کسی بھی قسم کی نئی بات یا جدت کو اپنانے سے گریز کرتے ہیں، حالانکہ "سلور جوبلی" سے پہلے "جوبلی" کی سخت ترین ضرورت ہے۔

اس کے بعد ہمیں "ہندستانی ادب"، کے (۲۵) سالا "سلور جوبلی" کے وقت بھی خیال پیدا ہوا تھا کہ ہم نے، اپنے والد محترم کے حالات و واقعات سے متعلق قلم اٹھائیں، مگر اس وقت کاتب نے ہمیں اتنا پریشان کر دیا کہ ہمارا دماغ گھما دیا

اس دلچسپ اور سحر آگیں ناول میں فرنانڈز نے آسمان جاہ کی لڑکی رحیم النساء اور میر علی خاں کے لڑکے افضل خاں کے عشق کی داستان بیان کی ہے، اور یہ عشق قصاسوق صد فیصلی اور بلکل ہی سچا ہے۔ قصے میں اس نے کوئی رنگ آمیزی نہیں کی ہے، بلکہ ۲+۲=۴ کے مصداق عشقیا داستان یا رومانس ROMANCE کے حقیقی واقعات آئینہ کی طرح کھول کر سامنے رکھ دیئے ہیں۔ ان کی طرز تحریر سے یہ پتا چلتا ہے کہ فرنانڈز کوئی مستقل مصنف نہیں ہے، جس نے اس ناول سے پہلے بھی کتابیں لکھی ہیں، بلکہ یہ انداز اضرور ہوتا ہے کہ اس کے قلم میں کوٹ کوٹ کر لکھنے کی صلاحیت بھری ہوئی تھی، اسی لئے "رحیم النساء، افضل خاں" کی داستان عشق سنتے ہی اس نے فوراً قلم بند کر ڈالی، اور تمام واقعات کو حقائق کی روشنی میں ایک یادگار اور بے نظیر، اور لاجواب ناول کا جامہ پہنا دیا!

اس نے اوپچ نیچ کچھ نہیں دیکھا، اس نے یہ تک غور نہیں کیا کہ وہ حیدرآباد کے ایک امیر پائیگاہ کی لڑکی کی عشقیا داستان بیان کر رہا ہے، اور اس امیر کبیر سے ملنے کے لئے جب حیدرآباد کے امرا، عالا عہدے دار، اور دوسرے لوگ جب آتے ہیں تو انہیں آسمان جاہ کے ساتھ کس طرح سے پیش آنا چاہئے۔ زہر خورانی کے سلسلے میں کوتوال شہر اور مجسٹریٹ تک آسمان جاہ کی دیوڑی پر آئے تو اس نے سیدے سادے طریقہ پر یہ لکھ دیا کہ یہ لوگ آسمان جاہ سے ملنے کے ساتھ، مگر ہم چونکہ پشتن حیدرآبادی ہیں، اس لیے ہم بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ امرا سے پائیگاہ کا حیدرآباد میں کتنا بلند مقام تھا۔ اور ان سے جب عوام، امرا اور عہدے دار ملتے تھے کو کس طرح اور کن آداب کے ساتھ ملتے تھے، اور امرا سے پائیگاہ ان لوگوں سے کس طرح پیش آتے تھے۔ اسی، زہر خورانی کے سلسلے میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضور نظام، اور رزیڈنٹ حیدرآباد، سپہ سالار جنگ وزیر اعظم حیدرآباد اور دوسرے عالا عہدے دار، اور سکندرآباد کی فوج کے عالا انگریز افسر بھی موقع موقع سے مزاج پرسی کو آتے رہے، مگر فرنانڈز نے ان کے ملنے جلنے اور مزاج پرسی کے کوئی طور طریق نہیں گنائے ہیں، لیکن ہم نے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ حضور نظام کی آمد کے وقت ملنے جلنے کا رنگ ڈھنگ کیا تھا، اور اس طرح دوسرے عہدے داروں کی آمد کے وقت کیا رنگ تھا۔ اس نے صرف حضور نظام، لکھا ہے، مگر ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اس وقت حضور نظام نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف سادس تھے۔ محبوب علی خاں کی بڑی بہن پرورش النسا بیگم نواب آسمان جاہ بہادر کو بیاہی گئی تھی، اس طرح حضور نظام آسمان جاہ کے برادر نسبتی (سالے) تھے اور آسمان جاہ حضور نظام کے بڑے بہنوئی تھے۔ اس کے علاوہ حضور نظام، عمر میں آسمان جاہ سے بہت چھوٹے تھے اس لئے حضور نظام کی حکومت کے کاروبار انجام دینے کے لئے ایک سرکاری کونسل قائم کی گئی تھی، جس کے صدر نشین یا چیرمن آسمان جاہ تھے، وزیر اعظم حیدرآباد اور دوسرے عالا عہدے داران حیدرآباد اس کونسل کے ارکان تھے۔ ان تمام گہرے تعلقات کے پیش نظر ہم نے اپنے طور پر اپنے ترجمے میں یہ ظاہر کیا ہے کہ حضور نظام اپنی سگی بھانجی رحیم النسا کی مزاج پرسی کی غرض سے جب آسمان جاہ کی دیوڑی آئے تھے تو آسمان جاہ ان سے کس طرح پیش آئے، اور اس طرح جب وزیر اعظم حیدرآباد اور رزیڈنٹ حیدرآباد، اور دوسرے عالا عہدے داران حیدرآباد اور سکندرآباد جب لڑکی کی مزاج پرسی کے لئے آسمان جاہ سے ملنے آئے تو وہ ہر ایک سے کس طرح پیش آئے تھے۔ یہ تمام وضاحت ترجمے میں ہم نے اپنی طرف سے کی ہے۔ اگر ہم اس ناول کا لفظی ترجمہ کرتے تو تمام اصلی واقعات چوپٹ ہو کر رہ جاتے اور حیدرآباد کی تہذیب اور کلچر کی جھلکیاں پڑھنے والوں پر ہرگز ہرگز ظاہر نہ ہونے پاتیں۔

ہم اس کوشش میں تھے کہ نواب آسمان جاہ سے متعلق ایک مختصر سا نوٹ، اس ناول کے پڑھنے والوں کے لئے پیش کریں، چنانچہ اس سلسلے میں، ہم نے پکٹوریل حیدرآباد مرتبہ کرشنا سوامی مدیر اج

اور اپنے نام پر اس بستی کا نام سلیم نگر" رکھا" اور یہ کافی بہت اچھی حالت میں ہے۔ سلیم خان صاحب مدد دار تھے "انجمن ترقی اردو" حیدرآباد کے سکریٹری کئی سال تک رہے تھے۔ یہی انجمن ہے ایک ٹریننگ انسٹیٹیوٹ بھی قائم کیا تھا جو اب شاید مڈل اسکول ہو گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بھائیوں کو یونیورسٹی کی ہوا بھی نہ لگنے پائی تھی، مگر راز دار خان صاحب کے پوتے فرزند جی۔ ایم خان نے یونیورسٹی سے علاقہ تربیتی ڈگری ایل۔ اے کی حاصل کی اور یونیورسٹی میں ہی ایل۔ اے اور ایم۔ اے کے چار سال تعلیمی دور میں بحیثیت بک طالب علم علاقہ ترین اعزازات حاصل کیے تھے۔ ایم۔ خان نے تعلیمی دور سے ہی ایل۔ اے کے دو سال حیدرآباد مسٹل میں گذارے۔ چنانچہ پہلے سال میں نائب عریف طلبا یا اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر رہے۔ اس کے بعد دوسرے سال سیکرٹری اور انجمن طلبائے اتحاد صدر مقام حیدرآباد کے صدر یا پریسیڈنٹ بھی رہے۔ ایم۔ اے سال اول میں محکمۂ عثمانیا کا ایڈیٹر، ہندستانی سکشن اور ایڈیٹر انگلش سکشن اور ہفتگی بلیٹن سکریٹریٹ کی ذمہ داری بھی عثمانیا میگزین کی ذمہ داری بھی رہی۔ عثمانیا میگزین کی تاریخ میں نام۔ خان کے پہلے اور پھر ایم۔ اے کے بعد جیسا کہ میں نے کہا ہے اعزازات حاصل کیے ہیں۔ ایم۔ خان کے لسی بھی دوسرے طالب علم کو حاصل نہیں رہے ہیں۔ ایم۔ اے انگلش میں بھی ایم۔ خان نے تین حصے تک "انجمن اتحاد طلبا" کے لیے جامعۂ عثمانیا کا آخری صدر یا پریسیڈنٹ تھا اور صرف دس مہینے بعد ہی بی۔ اے۔ ایم۔ خان انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیا کا پہلا صدر یا پریسیڈنٹ بنا۔ یونیورسٹی یونین کا پہلا صدر یا پریسیڈنٹ ہونے کا فخر راز دار خان صاحب یونیورسٹی کے صرف اسی چوتھے فرزند کو حاصل ہے۔ اہم صدر یا پریسیڈنٹ انجمن اتحاد طلبا کے حصے کی صدارت کر رہے ہیں وہ صدر یا پریسیڈنٹ انجمن اتحاد طلبا کے لیے جامعۂ عثمانیا کا پہلا انتخاب تھا۔ جامعۂ عثمانیا شہر میں تو اب کے سارے کی باس جب ہمارا انتخاب ہوا تھا تو یہ ہم صدر یا پریسیڈنٹ انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیا کے تھے۔ اسی وقت ہماری یونیورسٹی کے آخری پرنسپل ہمارے صدر محترم عالی جناب محمد عبدالرحمان خان صاحب ہی تھے (جو سنہ ۱۹۶۸ء میں یونیورسٹی کی اپنی عارضی عمارتوں کے کمپلیکس میں منتقل ہوئی تھی تو اس وقت بھی ہمارے صدر صاحب پرنسپل ہی کہلواتے تھے۔ جس جامعۂ عثمانیا سے ایم۔ اے کر کے ایم۔ خان ہی صاحب عثمانیا یونیورسٹی کے پہلے پرو وائس چانسلر بن کر آئے تھے۔ بحیثیت ایڈیٹر [illegible] اور بحیثیت صدر یا پریسیڈنٹ انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیا ہی ایم۔ خان کا تعارف ہوا تھا۔ اور یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ ہم ایم۔ خان کے پہلے صدر یا پریسیڈنٹ انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیا تھے۔ اور یہ بھی ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ ہم ایم۔ خان کے پہلے ایڈیٹر ہندستانی سکشن، ایڈیٹر انگلش سکشن، ہفتگی بلیٹن، ایڈیٹر اور سکریٹری آف دی میگزین تھے۔ اور یہ بھی ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ ہم ایم۔ خان کے پہلے طالب علم انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیا کے پریسیڈنٹ بھی رہے ہیں۔ [illegible] اور ہم ایم۔ خان کے پہلے طالب علم انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیا کے [illegible]

پروفیسر جانسر کی حیثیت سے جاریہ لیتے ہی "میکسری صاحب ہمارے ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں گے" جامعۂ عثمانیا یونیورسٹی کے قائم ہونے کے لیے لازمی طور پر ڈلاک کمیٹی کی تحریک پیش کی تھی میکسری صاحب نے اس کی خوری منظوری دی، اور ہم نے یونیورسٹی مرٹیٹ کے ساتھ گنڈیوں کی تحریک پیش کی تو اس کی بھی منظوری دی، یونیورسٹی کی تاریخ میں ہمارا سب سے اہم زبردست اور یادگار کارنامہ یہ رہا کہ انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیا کے دستور۔ انگریزی کاپی میں ضروری ترمیمیں کیں اور میکسری صاحب سے منظور کرائیں تاکہ آئندہ کے تحت یونیورسٹی کے تمام شعبے آ گئے ہیں، جس میں انجمن بنک کا بھی ہے اس لیے طلبا کی انجمن کا نام "انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیا" ہونا چاہیے۔ انھوں نے اس کی بھی منظوری دیدی تھی اور اس کے بعد۔ راز دار خان صاحب یونیورسٹی کے اس قابل قدر رجسٹرار تھے۔ ایم۔ خان کو یہ فخر حاصل رہا کہ وہ فخریہ سلیوٹ دی گئی صدر "انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیا" کا پہلا صدر یا پریسیڈنٹ بنا۔ یونیورسٹی کے بعد سوشل میدان میں بھی ایم۔ خان کے ان گنت نمایاں کارنامے رہے ہیں۔ مرحوم مملکت حیدرآباد کے دور میں سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۴۸ء تک پورے چھ سال جی۔ ایم۔ خان نے خلوص بلیدیا جدید ایا دیسپنسل کا رپوریشن کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ آخر میں ایک مختصر علمی ادبی ماہوار رسالے "ہندستانی ادب" کا اجرا اور جون ۱۹۶۱ء سے آخر تک اس کی پابندی کے ساتھ جاری رکھنا، دنیائے صحافت کا بڑا ہی زبردست کارنامہ ہے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر جی۔ ایم۔ خان نے اپنے کارنامے گنانے کے لیے محفل نے دوسرے بھائیوں کے مقابل اپنے لیے کچھ زیادہ لکھنے کیے ہیں تو کسی طرح بھی قابل اعتراض عمل نہیں ہے!

صفحہ (۱ تا ۱۰۰) صرف ایڈیٹوریل کے قلم سے!

دنیائے صحافت کا پہلا اور نادر ریکارڈ ہے!

یہ بالکل حقیقت اور سو فی صد صحیح ہے کہ علمی اور ادبی دنیائے صحافت میں کسی بھی ایڈیٹر نے صفحہ ایک سے لے کر ایک سو تک صرف اپنے قلم سے نہیں لکھا ہے یہ بات ہم اس لیے پورے وثوق کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ آج سے پچاس سال پہلے سے ہمیں علمی ادبی رسالے دیکھنے کا شوق رہا ہے۔ ہمارے گھر میں خود ہمارے علمی ادبی رسالے آیا کرتے تھے اور کتب خانۂ آصفیہ جا کر ہم متعدد علمی ادبی رسالے دیکھا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے خود ہم نے مضمون نگاری شروع کی، اس سلسلے میں بھی ہمارے نام کئی ایک رسالے آیا کرتے تھے" اور سنہ ۱۹۶۱ء میں ہم نے اپنا علمی ادبی رسالہ "ہندستانی ادب" جاری کیا تو غیر مقیم ہندستان کے ادبی رسالے ہمارے رسالے کے تبادلے میں آیا کرتے تھے۔ جب پاکستان بنا گیا تو پاکستان کے بھی متعدد رسالے ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ ان تمام رسالوں نے بلکہ ایک ہزار صفحے کے تک خاص نمبر نکالے ہیں، لیکن جیسا کہ عام طور پر قاعدہ ہے وہ تمام ضخیم نمبر دو دو جلدوں کے ضخیم نمبر ہوتے تھے۔ ایسے ضخیم نمبر بھی ہم نے دیکھے ہیں، مگر کبھی نمبر ہم نے [illegible]

شہزادی کا رومان

رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA

کا مقدما

یہ پانسو (۵۰۰) صفحے کا انگریزی ناول ہمارے ہاں موجود تھا۔ ہم نے اس ناول کو پڑھ ڈالا تھا اور اس کا ترجمہ کرنے والے تھے کہ ایسے میں یہ ناول کسی نے ہمارے گھر سے چرا لیا۔ اور اس چور سے بھی ہم واقف تھے، مگر مجبوری یہ تھی کہ ہم بنتاس سے کہہ سکتے تھے، اور نہ چور کے باپ سے، اس لئے کہ دونوں سے بھی ہمارے اچھے تعلقات تھے، لیکن باتوں باتوں میں ہم نے موقع محل سے اس نایاب ناول کے چوری جانے کا ذکر ان دونوں سے کر ڈالا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ ناول کمیاب ہے۔ اگر آپ دونوں کے علم میں کسی کتاب کی دکان میں موجود ہے تو آپ خرید لا دیجئے ہم پندرہ بیس روپے بلکہ پچیس تیس روپے تک بھی اس کی قیمت کے صلے میں ادا کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر ان دونوں نے نفی میں جواب دیا، اور ہم خدبھی فاحشی ہوئے۔ ہم نے انگریزی زبان کو دو بلکل ہی نئے لفظ کینٹل CANTEL (۱) اور میٹرین MEATARIAN (۲) دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں، ہم نے کئی ایک لائبریریوں میں سینکڑوں ہی مکتوب ارسال کئے، اور ہر لائبریری کے لائبریرین سے یہ خاص طور پر معلوم کرتے رہے کہ آیا آپ کے پاس ROMANCE OF A ZENANA انگریزی ناول ہے؟ سالار جنگ میوزیم لائبریری، حیدرآباد کے لائبریرین کے ہاں ہماری لائبریری میں موجود ہے" کہتے ہی، ہم بلا لعاخشی سے اچھل پڑے، اور ان سے سارا ماجرا کہہ سنایا کہ ہم ایک طویل سے عرصے سے اس ناول کی تلاش میں تھے، مگر کہیں بھی اس ناول کا پتا نہ چلا تھا، سوائے آپ کی لائبریری کے۔ ہمارے دو نئے انگریزی لفظ کے سلسلے میں ہم نے سالار جنگ میوزیم لائبریری کی بھی ساری انگریزی ڈکشنریاں کھنگال ڈالیں، اور اس کے نتیجے کے طور پر انگریزی زبان میں ایک مختصر سا مقالا یا THESIS بھی لکھ ڈالا، جس کو (۲۴) صفحے کے ایک کتابچے BOOK-LET کی شکل میں چھپوا کر سینکڑوں ہی انگریزی دانوں وغیرہ وغیرہ کے پاس بک پوسٹ BOOK. POST کے ذریعے بھجوایا، اور آج تک بھی بھجوا رہے ہیں۔

اس انگریزی کتابچے کا کام ختم کرنے کے بعد ہم پھر سے سالار جنگ میوزیم لائبریری پہنچے، اور لائبریرین صاحب سے کہا کہ اب ہمیں وہ ناول دیجئے پہلے ہم اس ناول کو پھر سے ایک بار پڑھ لیں گے، اور اس کے بعد اس ناول کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کریں گے۔ لائبریرین صاحب نے سارا قصہ ڈائرکٹر صاحب سالار جنگ میوزیم اور سالار جنگ لائبریری سے کہہ سنایا، چنانچے انہوں نے ہمیں اس بات کی اجازت دی کہ ہم لائبریری کے کسی بھی ایک پرسکون گوشے کو نے میں بیٹھ کر روزانہ ترجمے کا کام کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان دونوں صاحبان کا دلی شکریہ ادا کیا، اور ناول "رومانس آف اے زنانا" حاصل کر کے پڑھنا شروع کیا۔ ہم سے روزانہ جانے کی پابندی تو نہ ہو سکی، مگر دو چار روز کے وقفے سے ہم ضرور جاتے رہے، اور چند ہی روز میں اس ناول کو ختم کر ڈالا۔

اس ناول کی انگریزی زبان بظاہر ہی سیدھی سادی اور نہایت ہی آسان ہے۔ زبان میں بلا کی روانی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار کو انگریزی زبان پر پوری پوری قدرت حاصل تھی۔ پانسو صفحے کے ناول میں مشکل ہی سے دو تین مرتبا ہمیں انگریزی زبان کی ڈکشنری دیکھنی پڑی، اس لئے کہ وہ دونوں یا تینوں لفظ ہمارے لئے بلکل ہی نئے اور اچھوتے تھے

"رومانس آف اے زنانا" ناول نگار کا نام جی۔ آرنلڈ فرنانڈز G. ARNOLD FER-NANDEZ ہے۔ اس ناول کو ہوا ینڈ کمپنی، مدراس HOE & CO MADRAS نے ۱۹۰۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس ناول کے شروع میں کسی قسم کا مقدمہ یا دیباچا وغیرا نہیں ہے جس سے یہ پتا چلتا کہ ناول کیوں لکھا گیا، اور ناول نگار کون ہے، اور حیدرآباد کے امرا اور عالا عہدیداروں سے اس کے تعلقات کیسے تھے؟ پہلے باب کے پہلے ہی صفحے سے اس نے قصہ بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔ ابتدا میں ہمارا یہ خیال تھا کہ آرنلڈ فرنانڈز، رزیڈنسی حیدرآباد میں کوئی انگریز ملازم تھا جس کے تعلقات حیدرآباد کے امرا اور عالا عہدیداروں سے تھے، اور اسی طرح سے آسمان جاہ بہادر سے بھی اس کے دوستانا مراسم تھے، اسی بنا پر اس نے یہ عشقیا داستان قلم بند کی ہے، مگر ڈھائی سو صفحے کے بعد ایک مقام پر اس نے لکھا ہے کہ "ہمارے آریائی بھائی اور خصوص مسلمان اور بلخصوص حیدرابادی مسلمان اور امرا، جاگیردار وغیرا بہت ہی ملنسار اور ہر دلعزیز واقع ہوئے ہیں، چنانچے اس بنا پر آسمان جاہ کی لڑکی رحیم النسا کی زہر خورانی کی خبر کے شہر میں پھیلتے ہی روزانا مزاج پرسی کی غرض سے نواب آسمان جاہ کی دیوڑی پر، امرا، عزیا اور متوسط طبقے کے لوگوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا، تاکے مزاج پرسی کر کے نواب صاحب تسلی اور تشفی کریں ....."

"ہمارے آریائی بھائی" ایک انگریز کے قلم سے نہیں نکل سکتا، بلکے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ناول نگار خود بھی آریائی نسل سے ہے، اس سے یہ ثابت ہوا کہ جی۔ آرنلڈ فرنانڈز انگلو انڈین بھی نہیں، بلکے ٹھیٹ کرسچین یا عیسائی ہے۔ اس کی انگریزی زبان سے بھی ظاہر ہے کہ وہ ایک قابل آدمی ضرور ہے، اور یہ قابل آدمی، نہ معلوم حیدرآباد یا دیار رزیڈنسی میں یا کسی عالا عہدے یا خدمت پر تھا، جس کے باعث اس کے تعلقات امرا سے یا بیگاہ تک تھے۔

فرنانڈز نے اپنے ناول میں آسمان جاہ کا نام آسمان شاہ ASMAN SHAH لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آسمان جاہ سے راست تعلقات کی بنا پر اس نے صحی نام آسمان جاہ لکھنا غالب خیال نہیں کیا، لیکن آسمان جاہ اور آسمان شاہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سوا اسکے اس کو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک کرسچین کی زبان سے یہ لفظ غلط طور پر ادا ہوا ہے، اس خیال کے تحت ہم نے پورے ترجمے میں آسمان شاہ کی بجائے اصلی نام آسمان جاہ ہی استعمال کیا ہے، جو بلکل صحی اور حقیقت پر مبنی ہے۔

اور ہزار کوششوں کے باوجود "سلور جوبلی نمبر" ایک جیسا لیٹ ہو گیا۔ اس لیے ہم نے اس وقت قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس کے بعد سے ہم بری طرح سے مالی پریشانیوں کا شکار رہے گئے، آخر کار اس سال رسالے کی ۳۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ہم نے تہیا کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ہو اس نمبر میں والد صاحب کے حالات ضرور لیز و پیج رچ کریں گے۔ اس وقت خاص طور پر والد صاحب کے حالات اس نمبر میں درج کرنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ "راز دار خان صاحب یوزئی" مضمون سے پہلے ہم نے "شہزادی کے رومان" کا پہلی قسط دی ہے، جس سے متعلق نوٹ لوپر دیا گیا ہے، چونکہ رحیم النسا اور راز دار خان کا رومان بلکل ہی ملتا جلتا ہے، اور دونوں کے واقعات زندگی ماتا ہی ایک ہی ہے، اس کے علاوہ، دونوں کردار بھی شہر حیدرآباد کے باشندے تھے، مگر فرق صرف یہ تھا کہ رحیم النسا ایک کمزور لڑکی نے ۵ محرم کو لنگر میں ایک حسین نوجوان گھوڑے سوار کو دیکھ کر اس کو اپنا دل دے دیا، اور آخر میں رحیم النسا کی شادی اس نوجوان سے ہو کر رہی، بلکل اسی طرح راز دار خان، ایک کمزور نوجوان نے ایک شادی کی تقریب میں ایک (۱۲) سالا معصوم حسین لڑکی کو دیکھ کر اپنا دل دے دیا، اور آخر کار راز دار خان کی شادی بھی اسی لڑکی سے ہو کر رہی۔ اس عشقیاتی جذبات کی مماثلت اور مناسبت کے علاوہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، دونوں کے عشقیا داستان کا زمانا بلکل ایک ہی تھا، اور یہ دونوں ایک ہی شہر حیدرآباد کے رہنے بسنے والے تھے، چنانچہ ہم نے رحیم النسا کے عشقیا ناول "شہزادی کے رومان" کو بجا طور پر اپنے والد محترم کے نام "معنون" کر دیا ہے۔ اس قریبی مناسبت اور موزونیت کا لحاظ کرتے ہم نے یہ ضروری خیال کیا کہ اپنے والد بزرگوار کو بھی اسی نمبر میں ملبسند کر دیا جائے۔ "شہزادی کا رومان" کی پہلی قسط تو پہلے ہی سے لکھی رکھی تھی، لیکن "راز دار خان یوزئی" ہم نے قلم بلکل ابھی ابھی چلایا ہے، اور اس اداریے پر قلم چلانے سے کچھ دیر پہلے تک بھی مضمون "راز دار خان صاحب یوزئی" کی آخری قسط لکھی تھی۔ ہم نے اپنے والد کے جو بھی حالات لکھے ہیں ان میں ایک لفظ بھی غلط نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب جیسیوں خوبیوں سے متصف تھے۔ ہم ان کے بارے میں اور بھی زیادہ اظہار خیال کر سکتے تھے، لیکن صفحوں کی کمی نے ہمیں بلکل ہی مجبور کر دیا۔ ہم نے امکان بھر کوشش کی ہے، کہ "راز دار خان یوزئی نمبر" بہتر سے بہتر ہو، خانے (۳۶) روپے کا (۳۶) [illegible] ORIENT CO. کا کاغذ استعمال کیا ہے۔ اس نمبر کی کھائی، چھپائی بھی بہتر ہے، اور یہ نمبر پونے سو کی تعداد میں زیادہ چھپوایا گیا ہے۔ جو نمبر کی عرصہ سے بھجوایا جائے گا، اور پاکستان کی ڈاک جاری ہو کے بعد اس خاص نمبر کی چند کاپیاں، کراچی مقیم راز دار خان صاحب کے ہم سے بڑے دو فرزندوں، بہادر علی خان صاحب یوزئی بی۔ اے (عثمانیا) اور دلیل خان صاحب یوزئی (عثمانیا) کے نام، اور ہمارے سب سے بڑے بھائی حکیم غلام علی خان صاحب یوزئی (مرحوم) کی آل اولاد اور ہمارے خاندان کے بعض دوسرے رشتے داروں، عزیزوں اور بعض ہمارے خاص احباب وغیرہ کے ہاں بھی بھجوائی جائیں گی۔

ہم اپنے چاروں بھائیوں کے حالات اور بھی زیادہ وضاحت کا ساتھ لکھنا چاہتے تھے، مگر صفحوں کی کمی کا لحاظ ہمارے پیش نظر تھا، اس لیے ہر ایک بھائی کے حالات، ان کے مشاغل اور حصہ فہمیتوں کے لحاظ سے لکھے گئے ہیں۔ ہم بھائیوں کے حالات بیان کرتے ہوئے، ہم نے اپنے حالات اور واقعات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں، اور دوسروں کی نسبت ہمارے حالات بیان کرنے میں زیادہ صفحوں کی کھپت ہوئی ہے۔ یہ ہم نے عمداً اور قصداً کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راز دار خان صاحب کے دوسرے چار فرزندوں نے ملازمت اختیار کی اور گتے داری وغیرا کر کے کافی سے زیادہ دولت کمائی۔

بہادر علی خان صاحب یوزئی اور دلیل خان صاحب یوزئی دونوں نے عثمانیا یونیورسٹی میں تعلیم پائی، لیکن یونیورسٹی کی دوسری مصروفیتوں یا جادہ میں کوئی بھی حصا نہیں لیا۔ بہادر علی خان صاحب نے بی۔ اے کا جواب کر لینے کے بعد ملازمت اختیار کی، اور آگے چل کر وہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ دلیل خان صاحب یوزئی نے بی۔ اے کا جواب نہیں کیا، اور فیل ہو گئے، چنانچہ ان کی تعلیم ادھوری ہی رہی، اس لیے گتے داری شروع کی، کافی سے زیادہ دولت کمائی۔ ہمارے بڑے بھائی حکیم غلام علی خان صاحب نے طب کا امتحان اعزاز کے ساتھ کامیاب کیا، اور گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ انھوں نے بھی ملازمت اختیار کر لی تھی، آگے چل کر گتے داری کی، اس میں بھی بہت کچھ کمایا، اور لے دے کر بلکل برابر ہی رہا، پھر سے ملازمت کے رجوع ہو گئے۔ آخر زمانے میں ان کے معاشی حالات ہمارے جیسے بدترین ہو گئے تھے۔ ہم سے چھوٹے بھائی سلیم خان صاحب نے جو بھی جماعت سے تعلیم چھوڑ دی تھی۔ گتے داری کی خوب خوب کمایا۔ مگر سب خرچ کر ڈالا، کچھ بھی نہیں، جب مرے ہیں تو ہزاروں کے قرض دار تھے، اور سینکڑوں روپے ماہانا سود ادا کرتے تھے۔ پائیگاہ آسمان جاہی میں رئیسوں کو رس کے قریب کئی ایکڑ زمین پٹے پر [illegible]

PICTORIAL HYDERABAD, BY, KRISHNA SWAMY MUDIRAJ کی دونوں جلدیں دیکھ ڈالیں۔ حیدرآباد کی تاریخ کی یہ مصور کتاب، حیدرآباد ہی میں ۱۹۲۹ء میں لکھی گئی تھی۔ حیدرآباد کی حکومت۔ امرائے پائیگاہ۔ جاگیرداروں۔ حیدرآباد کے بڑے عہدے داروں اور مشہور مشہور ہستیوں اور حیدرآباد کے تمام رزیڈنسیوں وغیرہ وغیرہ کا تفصیل اور تاریخ وار اس کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے، چنانچہ آسمان جاہ سے متعلق بھی ایک تفصیلی بیان ہے، جس کا مختصر سا خلاصہ اس ناول کے پڑھنے والوں کی معلومات کی خاطر پیش ہے!

نواب آسمان جاہ بہادر

نواب آسمان جاہ بہادر کے جدامجد کا نام ابوالفتح خان، تیغ جنگ، شمس الدولا، شمس الملک، شمس الامرا بہادر تھا، اور یہی تیغ جنگ پہلے امیر پائیگاہ تھے۔ ان کی اولاد میں آگے چل کر نواب سلطان الدین خاں عنایت جنگ، محتشم الدولا، بشیر الملک امیر پائیگاہ ہوئے (۱) ان کے تین لڑکے تھے (۱) خرشید جاہ (۲) آسمان جاہ (۳) سروقار الامرا، اور یہ تینوں بھی امرائے پائیگاہ تھے۔

آسمان جاہ ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے ان کا پورا نام اور خطاب وغیرہ یہ تھا۔ ہز اکسلنسی نواب مظہر الدین خاں، رفعت جنگ، بشیر الدولہ، عمدت الملک ثانی، عظیم الامرا، امیر اکبر، سر آسمان جاہ بہادر کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ E - I - C - K امیر پائیگاہ تھا۔ آسمان جاہ کے نانا نواب سکندر جاہ بہادر حضور نظام حیدرآباد تھے۔

جیسا کہ اس زمانے کا قاعدہ تھا، آسمان جاہ کی تعلیم بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ گھر ہی پر ہوئی اور ان کی انگریزی تعلیم کے لئے ایک انگریز ٹیوٹر کو مقرر کیا گیا تھا، چنانچہ آسمان جاہ عربی، فارسی کے علاوہ، انگریزی زبان بھی بہتر طریقے پر جانتے تھے، اور روانی کے ساتھ بولتے بھی تھے۔

جب یہ تعلیم سے فارغ ہوئے تو تقریباً (۲۰) سال کی عمر میں ان کی شادی نواب افضل الدولا بہادر حضور نظام آف حیدرآباد کی بڑی لڑکی، اور آگے چل کر حضور نظام میر محبوب علی خان کی سگی بڑی بہن پدورستی النسا بیگم سے ہوئی اس طرح نواب آسمان جاہ ایک نظام افضل الدولا کے داماد، اور دوسرے نظام میر محبوب علی خاں کے بڑے بہنوئی تھے، اس خاص نسبت اور خصوصی رشتے کے سبب تینوں امرائے پائیگاہ میں نواب آسمان جاہ کا مقام بہت بلند تھا۔

جب ۱۸۶۹ء میں حضور نظام نواب افضل الدولا کا انتقال ہوگیا، تو اس وقت ان کے اکلوتے بیٹے نواب میر محبوب علی خان کی عمر بہت کم تھی، اس لئے ارکان سلطنت نے یہ طے کیا کہ حضور نظام کے سن شعور کو پہونچنے تک سلطنت نے یہ طے کیا کہ حضور نظام کے سن شعور کو پہنچنے تک سلطنت کے کاروبار انجام دینے کے لئے ایک کونسل قایم کی جائے، چنانچہ یہ کونسل بنائی گئی، جس کے صدر نشین یا چیرمن نواب آسمان جاہ بہادر تھے، اور ارکان کونسل میں یہ لوگ موجود تھے (۱) خرشید جاہ، امیر پائیگاہ (۲) سروقار الامرا امیر پائیگاہ (۳) مرسالار جنگ وزیر اعظم حیدرآباد (EX - OFFICIO MEMBER) تھے، جو سلطنت کے روز روز کے امور کو انجام دیا کرتے تھے۔

ان سب کی پانچ پانچ ہزار تنخواہ بھی مقرر تھی۔ کونسل نے آسمان جاہ کو حد لیاقا عالا ترین منصب یا PORTFOLIO عطا کیا تھا، اور اس خدمت کی پانچ ہزار روپے تنخواہ بھی مقرر کی تھی، مگر آسمان جاہ

تنخواہ لینے سے صاف انکار کر دیا، اور جب تک کونسل رہی بلا معاوضا ہی یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

۱۸۸۳ء میں جب سر سالار جنگ انگلستان گئے تو جاتے وقت انہوں نے اپنی وزارت اور مشیر سلطنت کا اہم کام بھی آسمان جاہ کے سپرد کر دیا جس کو آسمان جاہ نے نہایت ہی خوشی سے بسر و چشم قبول کیا، اور سالار جنگ کی انگلستان سے واپسی تک برابر انجام دیتے رہے۔ انگلستان سے واپسی کے کچھ ہی عرصا بعد سالار جنگ کا انتقال ہو گیا تو کونسل نے باتفاق آرا نواب آسمان جاہ بہادر کو وزیر اعظم حیدرآباد کا عالا ترین عہدا بھی عطا کرنے کی سفارش حضور نظام سے کی۔ حضور نظام کے فرمان کے بعد انہوں نے یہ ذمہ دارانا خدمت بھی کونسل کے اور چیرمن کونسل کے علاوا، وزیر اعظم حیدرآباد کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ ان کی وزارت اور صدارت کے دور میں حکومت آصفیا میں کئی ایک اہم تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں، مثلاً ملک کا مالیا جو نہایت ہی کمزور ہو گیا تھا، اس کو مستحکم اور مضبوط کیا گیا، اور آمدنی کے نئے ذرایع اختیار کیے گئے۔ عدالیا میں کئی ایک تبدیلیاں ہوئیں۔ پولیس فورس کی حالات زمانا کے لحاظ سے از سر نو تنظیم کی گئی، اور حکومت برطانیا سے مستحکم تعلقات کی طرف اہم قدم اٹھایا گیا۔

۱۸۸۷ء میں سر مجسٹی کوئین وکٹوریا کی تخت نشینی کی "سلور جوبلی" منائی جا رہی تھی۔ چنانچہ آسمان جاہ نے حیدرآباد کی نمایندگی کرتے ہوئے اس جشن میں شرکت کی۔ جب آسمان جاہ بہادر کا جہاز نہر سوئیز سے گزر رہا تھا تو لارڈ کرومر اور دوسرے امرائے مصر نے خدیو مصر کی طرف سے ان کا سرکاری طور پر استقبال کیا، اور ان کے اعزاز میں لنچ اور ڈنر کی دعوتیں بھی دیں۔ جب آسمان جاہ انگلستان گئے ہیں تو لندن میں تمام امرائے انگلستان سے ملاقاتیں کی تھیں، اور ان کے اعزاز میں کئی ایک دعوتیں اور ضیافتیں ہوئیں۔ وکٹوریا کے جشن سیمیں میں شریک رہے، اور کوئین وکٹوریا سے اور ان کے بیٹے ایڈورڈ پرنس آف ویلس سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا۔ اور کوئین وکٹوریا نے سلور جوبلی میڈل اپنے ہاتھ سے آسمان جاہ کے سینے پر لگا کر خصوصی عزت بخشی تھی۔ جب وہ انگلستان سے لوٹے ہیں تو یورپ کے بعض مشہور شہر مثلاً روما۔ فلورنس۔ ملان۔ نیس۔ وینس۔ ریویرا۔ پیرس۔ کانیا۔ جینوا وغیرا اور بھی کئی ایک مقامات کی سیر کرتے ہوئے آئے ہیں۔ جب وہ حیدرآباد لوٹے ہیں تو حکومت آصفیا کی طرف سے آنریبل اسٹیشن پران کا سرکاری طور پر شاندار استقبال کیا گیا، اور بعد میں ان کے اعزاز میں شہر کے مختلف حصوں میں شاندار تقاریب انجام دی گئیں، جن میں ان کی عالا قابلیتوں اور ملک و مالک سے وفاداری کو سراہا گیا۔

ان کی عالا ترین خدمات کے صلے میں حکومت برطانیا نے "SIR" "سر" کے عالا ترین اعزاز سے سرفراز فرمایا۔ اس وقت کے رزیڈنٹ حیدرآباد اے۔ پی۔ پاول A. P. POWELL نے رزیڈنسی میں ایک خصوصی تقریب کے موقع پر ملکۂ برطانیہ کی طرف سے آنریبل ہڈیا کے سی۔ آئی۔ ای K. C. I. E یعنی "SIR" کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اس تقریب میں حیدرآباد اور سکندرآباد کے سینکڑوں عالا عہدے دار، امرا، جاگیردار وغیرا شریک تھے۔

۱۸۹۳ء میں آسمان جاہ کا انتقال ہوا۔ انہیں آسمان جاہ کی لڑکی نام رحیم النساء ہے جس کے مشتق کے بارے میں یہ ناول لکھا گیا ہے۔ رحیم النساء کی ماں کے علاوا آسمان جاہ نے ایک دوسری شادی بھی کی تھی۔ اس بیوی سے آسمان جاہ کا صرف ایک لڑکا تھا، جس کا نام معین الدین خاں تھا۔ باپ کے انتقال کے وقت معین الدین خاں کی عمر صرف آٹھ سال تھی، اور اسی کم سنی میں لڑکا امیر پائیگاہ آسمان جاہی بنا۔ اور اس کو حضور نظام نے عنایت جنگ معین الدولا کا خطاب عنایت فرمایا تھا۔ معین الدولا کچھ عرصے تک حکومت نظام کی کابینا میں صدر المہام یا وزیر فوج کے عالا عہدے پر بھی رہے ہیں۔

معین الدولا کو ہم نے بارہا دیکھا ہے ان کے پاس رولس رائس ROLLS ROYCE

جیسی قیمتی موٹر کار تھی۔ اس شاندار کار میں وہ روزانہ اپنے محل، سروقد سے شہر آیا جایا کرتے تھے۔ معین الدولہ کے کئی محل تھے اور مختلف بیویوں سے ان کے کئی لڑکے اب تک موجود ہیں۔ بڑی بیوی سے لڑکے کا نام ظہیر الدین خاں تھا۔ آگے چل کر انہیں ظہیر یار جنگ کا خطاب ملا تھا، اور باپ کے مرنے کے بعد بھی یہی امیر پائیگاہ بنے تھے۔

ظہیر یار جنگ نے عالا تعلیم پائی تھی اور ۱۹۳۴ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا تھا اس طرح سے یہ عثمانیہ یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ GRATUATE امیر پائیگاہ تھے۔ ظہیر یار جنگ سے پورے دو سال تک ہمارا قریبی ربط رہا ہے۔ جس وقت ظہیر یار جنگ نے ۱۹۳۳ء میں بی۔ اے بی۔ اے جونیئر میں داخلہ لیا ہے، ہم بی۔ اے سینئر میں تھے۔ اس قریبی ربط کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہمارے ان کے مضامین اختیاری ہندوستانی زبان اور فارسی تھے، اس لئے ہر گھنٹے یا PERIOD کے بعد بی۔ اے اور ایم۔ اے کے مضامین اختیاری کے سب ہی طالب علم کالج کے کمپونڈ میں جمع ہوتے اور گپ شپ اور پان سگریٹ سے فارغ ہونے کے بعد اپنی اپنی جماعتوں میں چلے جاتے۔ جب ظہیر یار جنگ بی۔ اے سینئر میں آئے تو ہم نے بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد ہم نے ایم۔ اے کی ابتدائی یا PREVIOUS میں داخلہ لیا تھا، اور بلکل اسی طرح ان سب سے ہمارا ربط ضبط باقی رہا تھا۔

ظہیر یار جنگ واحد حیدرآبادی تھے، جنہوں نے ۱۹۳۲ء میں شکاگو CHICAGO امریکا کی عالمی نمائش WORLD FAIR 1932 میں شرکت کی تھی چونکہ یہ ہندوستانی ادب اور زبان کے طالب علم تھے اس لئے یہاں آنے کے بعد نمائش میں جمع کئے ہوئے نوٹس کو ایک کتابی شکل میں چھپوا ڈالا۔ اس کتاب کا نام تھا "شکاگو کی عالمی نمائش"۔ ۱۹۳۳ء میں ہم مجلۂ عثمانیا یا OSMANIA MAGAZINE کے ایڈیٹر تھے، چنانچہ اس دلچسپ اور معلومات آفرین کتاب کا ایک نہایت ہی دلچسپ اور معلومات آفرین پورشن بلاناغہ ہم نے مجلۂ عثمانیا میں نقل کر دیا تھا۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس ناول کی ہیروئن رحیم النسا، نواب آسمان جاہ بہادر کی پہلی بیوی کی لڑکی تھی اور معین الدین خاں یا آگے چل کر معین الدولا، آسمان جاہ کی دوسری بیوی کی نرینا اولاد تھے، یعنی رحیم النسا اور معین الدولا علاتی بہن اور بھائی تھے، اور رحیم النسا عمر میں معین الدولا سے بڑی تھیں۔ اس طرح رحیم النسا، نواب ظہیر یار جنگ بی۔ اے (عثمانیا) امیر پائیگاہ کی پھوپی تھیں۔ رحیم النسا اور افضل خاں کے عشق کی داستان سارے شہر حیدرآباد میں آگ کے شعلوں کی طرح پھیل گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ خاندان کے خاندان میں بھی یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی، اور ۱۹۳۳ء کا زمانہ اس عشقیا داستان کے دور سے کچھ زیادا دور نہ تھا۔ معین الدولہ کے خاندان کے تعلق سے اس عشقیا قصے کے بارے میں، ہم نے بھی سنا ضرور تھا، اس لئے ۱۹۳۳ء کے دور میں، کالج کی ایک بیٹھک میں، ہم نے ظہیر یار جنگ سے اس خاندانی معاشقے کی تصدیق چاہی تو انہوں نے بلا تکلف اور بغیر کسی جھجک کے کہا کہ "ہاں خاں صاحب ہماری پھوپی رحیم النسا اور افضل خاں کے عشق کی داستان سو فی صد صحیح ہے"۔ اس تصدیق کے بعد فرنانڈز کی داستان کسی طرح بھی غلط نہیں کہی جا سکتی۔

رحیم النسا

رحیم النسا نواب آسمان جاہ بہادر، امیر پائیگاہ اور وزیر اعظم حیدرآباد کی پہلی بیوی،

پرورش النسا بیگم سے صرف ایک ہی لڑکی تھی - ہم نے ان کی تاریخ پیدائش تلاش کی، مگر پتا نہیں چلا - پرورش النسا بیگم حضور نظام نواب افضل الدولا بہادر کی بڑی لڑکی، اور آگے چل کر ہونے والے حضور نظام نواب میر محبوب علی خاں بہادر کی سگی بڑی بہن تھیں - اس طرح رحیم النسا ایک نظام کی سگی نواسی اور دوسرے نظام کی سگی بھانجی تھی، اور میر کمیر یا لیگاہ کی صاحبزادی تھی - نواب آسمان جاہ کو اپنی پہلی بیوی پرورش النسا بیگم سے صرف ایک ہی لڑکی رحیم النسا تھی، اس لئے باپ نے بڑے ہی لاڈ پیار اور ناز و نعم کے ساتھ اس کی پرورش کی تھی، اور اس کو چاہتے بھی تھے - کمشنریل حیدرآباد کے مولف کے مستند بیان کے مطابق، اپنی پہلی بیوی سے اولاد نرینہ نہ ہونے کے سبب نواب آسمان جاہ نے اپنی بیوی پرورش النسا بیگم کی راضی مرضی سے دوسری شادی کی تھی، جس سے صرف ایک لڑکا معین الدین خاں ہوا تھا - یہ لڑکا ابھی چھوٹا ہی تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا، چنانچہ پرورش النسا بیگم نے اپنی سگی لڑکی کے برابر معین الدین خاں کی بھی پرورش کی، اور اس کو اپنی لڑکی رحیم النسا کی طرح چاہتی اور محبت بھی کرتی تھیں، جس کے باعث آسمان جاہ پرورش النسا بیگم سے بے حد خوش و خرم تھے - رحیم النسا اپنے علاتی بھائی معین الدین خاں سے عمر میں تقریباً دس سال بڑی تھی - رحیم النسا تقریباً اٹھارہ یا انیس سال کی تھی، اس سے دوسرے امرائے یا لیگاہ کے لڑکوں کی طرف سے پیام سلام کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، مگر ابھی بات پکی نہیں ہوئی تھی کہ ایسے میں اچانک پرورش النسا کا انتقال ہوگیا - اس کا صدمہ یوں تو سارے افراد خاندان کو ہوا لیکن نواب آسمان جاہ اور ان کی لڑکی رحیم النسا کو اتنا زبردست صدمہ ہوا کہ ایک طویل عرصے تک ان دونوں کے ہوش ٹھکانے نہیں رہے، اور معین الدین خاں کی عمر اس وقت صرف آٹھ نو سال کی تھی، جو نے اپنی اصلی ماں کی صورت تک نہیں دیکھی تھی، اس لئے پرورش النسا کی موت کے بعد، ماں کی کمی میں گھلا جا رہا تھا - باپ کے تاکید کرنے پر، رحیم النسا خاص طور پر اپنے علاتی بھائی کی دیکھ بھال شروع کی تو وہ کچھ عرصے کے بعد سنبھل سکا -

دن گزرتے گئے اور غم غلط ہوتا گیا - پرورش النسا بیگم کی پہلی برسی ہو چکی تھی، اور اس کو مرے ہوئے دوسرا سال شروع ہوگیا تھا، لیکن اس کے باوجود، پیام سلام کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے شروع ہونے نہیں پایا تھا کہ ایسے میں ۵ محرم کو وہ خدشہ ایک نوجوان شخص کے حسن بے پایاں کے گھائل ہوگئی -

حیدرآباد کے محرم کی طرح حیدرآباد کا لنگر بھی ایک یادگار واقعہ ہے - یہ لنگر ہر سال ۵ محرم کو ہوا کرتا تھا - لنگر دیکھنے کے لئے حضور نظام، ان کے متعلقات اور عزیز، قریبی سرکار اور دوسرے متعلقین، نیز امرائے یا لیگاہ، بڑے بڑے جاگیردار اور عہدے دار وغیرہ وغیرہ حسینی علم، چوک، لاڈ بازار، چارمینار، اور پتھر گٹی وغیرہ وغیرہ جمع ہوتے تھے، تاکہ ایک بجے سے چھ سات بجے شام تک لنگر میں گزرنے والے باقاعدہ اور بے قاعدہ لوگوں کا معائنہ کریں - چوک کے قریب آسمان جاہ کی دیوڑھی یا محل ہے اس محل سے کچھ فاصلے پر محل سے متعلق لگیاں بھی ہیں انہی لگیوں کے اوپر کے حصے پر آسمان جاہ کی دیوڑھی کے مرد عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا جاتا تھا، جو ہر سال ۵ محرم کو یہاں سے لنگر دیکھا کرتے تھے - رحیم النسا کی ماں کے مرنے کے بعد صرف ایک سال کے لئے لنگر نہیں دیکھا گیا تھا، مگر دوسرے سال لنگر دیکھنے کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا، چنانچہ اس سال خود رحیم النسا بیٹھی لنگر دیکھ رہی تھی جیسے جیسے فوج گزر رہی تھی ویسے ویسے جلیکے بیٹھے دیکھ رہی تھی - تھوڑی دیر بعد ایک حسین ترین نوجوان گھوڑے سوار رحیم النسا کے سامنے آیا - اس کو دیکھتے ہی رحیم النسا اس کے حسن بے نظیر کی گھائل ہوگئی اور صرف اسی کو دیکھتی رہی - جب رحیم النسا نے اس نوجوان کی طرف ٹکٹکی سی باندھ دی تو اس کے سہیلیوں نے

بھانپ لیا اور مذاقیا انداز میں اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، مگر رحیم النسا نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ نہ معلوم کس وجہ سے آگے کی فوج رک گئی تھی، جس کے باعث وہ حسین نوجوان کا براق سا گھوڑا بھی جہاں کا وہاں رکا ہوا تھا۔ اور رحیم النسا اس کو جی بھر کر اس طرح دیکھ رہی تھی کہ گویا نوجوان کو کچا ہی کھا جائے گی۔ جب فوج حرکت میں آئی تو اس نوجوان کا گھوڑا بھی دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ اور رحیم النسا کی نظریں بھی ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہی رہیں۔ آخر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو رحیم النسا کی نظریں اس کی تلاش میں پریشان سے ہو گئیں اور واقعی کیوپڈ CUPID نے عشق کے پیاں کا ایک طرفہ تیر چلا دیا۔ محل واپس آنے کے بعد رحیم النسا نے اپنی سہیلیوں سے کھلے طور پر اعتراف کر لیا کہ وہ تھی وہ اس حسین ترین نوجوان کے حسن بے پایاں کے بری طرح سے گھائل ہو گئی ہے۔

رحیم النسا خود بھی حسین ترین لڑکی تھی، جس کے حسن کے چرچے نہ صرف خاندان ہی میں تھے بلکہ خاندان سے باہر بھی اس کے حسن بے مثال اور لاجواب کی کافی سے زیادہ شہرت ہو چکی تھی۔ اس نوجوان کو دیکھنے کے بعد رحیم النسا نے اپنی حد تک یہ طے کر لیا تھا کہ وہ خاندان کے کسی بھی فرد سے یا خاندان کے باہر کے کسی شخص سے شادی نہیں کرے گی، سوائے اس نوجوان کے جس کو اس نے لنگر میں دیکھا تھا، مگر مشکل یہ تھی کہ وہ اور اس کی سہیلیاں کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ آخر وہ نوجوان ہے کون ــــــ ؟ اس کا اتا پتا معلوم کریں تو کس طرح سے ؟ آخر کافی سوچ بچار کے بعد رحیم النسا اور اس کی سب سہیلیوں نے یہ تدبیر نکالی کہ یہ رازانہ اس کی پیشی کی دو ماماؤں پر ظاہر کیا جائے۔ چنانچہ رحیم النسا نے اپنی دونوں ماماؤں سے کہا کہ روزانہ رات کو وہ بھیانک خواب دیکھا کرتی ہے۔ خواب میں ایک سرخ پوش اور ایک سفید پوش آیا کرتا ہے۔ سرخ پوش ڈراتا ہے اور سفید پوش دلاسا تسلی دیتا ہے۔ ان ماماؤں نے کہا کہ سرکار اس خواب کی تعبیر تو کوئی عامل ہی بتائے گا۔ اور شہر میں میر فراز علی مشہور عامل ہے، اگر آپ پیسے اور زر و غیرہ نذرانا دیں تو ہم دونوں اس سے مل کر آپ کا خواب بیان کرتے ہیں، اور وہ جتنا بھی پیسا مانگے دیں گے۔ اور وہ جو بھی تعبیر بتائے گا، آپ سے آن کر بیان کر دیں گے۔ اس پر رحیم النسا نے رضامندی ظاہر کی۔ وہ ماماؤں عامل کے ہاں گئیں۔ اس کے بعد مقابل کی پولیس کے جوان اور گھر کا ملازم عبدالقادر بھی اس میں الجھ گیا۔ اتفاقی طور پر یہ لوگ افضل خاں کے گھر پہونچ گئے اور عبدالقادر نے عورت کا بھیس بدلا، افضل خاں کے نام سے افیون ملی مٹھائی لا کر رحیم النسا کو دی، اور یہ تاکید کی کہ افضل خاں نے کہا ہے کہ یہ مٹھائی خود ہی کھائیں، دوسرے کسی شخص کو نہ دیں، اور ساتھ ہی افضل خاں کی تصویر بھی لا کر دی جس کو دیکھتے ہی رحیم النسا حشی سے اچھل پڑی اور کہہ اٹھی کہ یہی ہے وہ میرا نوجوان جس کو میں نے لنگر میں دیکھا تھا۔

ماماؤں اور عبدالقادر نے افضل خاں کے گھر کے خاص ملازم کو کافی پیسے دے کر وہ تصویر حاصل کی تھی، جس کا افضل خاں کو قطعاً علم نہ تھا، اور اس پوری عشقیہ داستان کے بعد بھی افضل خاں رحیم النسا کے عشق سے واقف ہی نہ تھا، مگر اس نوبت پر جا لیا تھا دنوں کے ساتھ ماماؤں اور عبدالقادر نے رحیم النسا کو یقین کامل دلا دیا تھا کہ افضل خاں کو رحیم النسا پر دل و جان سے فدا ہے۔ یہ سننے کے بعد تو رحیم النسا حشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔

ایک طرف اس خیال سے کہ اس نے اپنے منظور نظر کو پا لیا، اور یہ کہ افضل خاں خود بھی اس کو چاہتا ہے خشی سے پھولی نہ سماتی تھی تو دوسری طرف اس کو جلد سے جلد حاصل کرنے کی فکر میں گھلی جا رہی تھی اور چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے، کہ بوا تم کیوں فکر مند ہو، تمہارے گھر رحیم النسا نواب آسمان جاہ بہادر، امیر، بادشاہ اور وزیر اعظم حیدرآباد کی بیٹی ہے۔

میں کس چیز کی کمی ہے - کہو تو میں تمہارے لیے آسمان کے تارے توڑ لاؤں - ناول نگار فرنانڈز نے اس قسم کی کوئی باتیں نہیں بیان کی ہیں اور نہ ہی رحیم النساء کی سہیلیوں وغیرہا کا کوئی ذکر کیا ہے یہ سب اضافے ہماری طرف سے ہیں، جو آسمان جاہ کے محل کے لوازمات میں سے ہیں - وہ یہ تک نہیں جانتا تھا کہ ایسی دیوڑھیوں میں عزیز و اقربا کے علاوہ اپچاسوں ملازم وغیرہا بھی ہوا کرتے ہیں -

افضل خان

ناول نگار فرنانڈز نے لکھا ہے کہ افضل خان، میر علی خان جاگیردار کا نوجوان اور نہایت ہی حسین لڑکا تھا، میر علی خان اور آسمان جاہ کے دوستانہ تعلقات تھے، اور میر علی خان آسمان جاہ کی دیوڑھی آیا جایا کرتے تھے، اور کبھی کبھار اپنے ساتھ اپنے لڑکے افضل خان کو بھی لایا کرتے تھے اس طرح آسمان جاہ افضل خان سے واقف تھے -

حیدرآباد میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میر علی خان نے اپنے لڑکے افضل خان کو انگلستان بھجوایا تھا - افضل خان برائیٹن BRIGHTON انگلینڈ کے ایک کالج میں شریک ہوگیا تھا، یہاں پر اس کی ہم سبق ایک جوان اور حسین لڑکی مس کرک پیٹرک بھی تھی - ان دونوں میں آپس میں عشق کی چنگاریاں سلگ اٹھیں - افضل خان روزانا مس کرک پیٹرک کے گھر جایا کرتا تھا - کرک پیٹرک کے ماں باپ نیویارک، امریکا میں تھے، اس لیے وہ اپنی چچا نی لیڈی میٹرس بوائیٹس کے ساتھ رہتی تھی، اور لیڈی میٹرس کو افضل خان اور کرک پیٹرک کی ملاقاتیں ناگوار گزرتی تھیں، اور وہ موقع موقع سے اپنی بھتیجی کو ٹوکا بھی کرتی تھی - اس وجہ سے کرک پیٹرک نے افضل خان کو مشورا دیا کہ وہ دونوں لندن جاکر وہاں تعلیم حاصل کریں گے - چنانچہ یہ دونوں لندن آگئے کرک پیٹرک نے میڈیسن میں داخلہ لیا، اور افضل خان نے آرکی ٹیکچر کالج میں شرکت کی -

افضل خان کے والد جاگیردار بھی تھے، اور پیسے والے بھی تھے، چنانچہ وہ کھلے دل سے اپنے لڑکے کے خرچ کے سلسلے میں کافی سے زیادہ رقم لندن روانا کرتے تھے - اس رقم سے افضل خان، مس کرک پیٹرک کی کافی مدد کرتا تھا - آخر مس کرک پیٹرک نے ڈاکٹری کا امتحان کامیاب کرلیا، اور افضل خان نے آرکی ٹیکچر کی ڈگری حاصل کرلی - اس کے بعد یہ طے ہوا کہ پانچ عرصے تک لندن میں پرائیویٹ پریکٹس کرنے کے بعد کرک پیٹرک حیدرآباد آکر افضل خاں سے شادی کرے گی، اس بنا پر افضل خان، مس کرک پیٹرک کو رخصت کرتے ہوئے ہندوستان کے لیے چل پڑا، اور اپنے وطن حیدرآباد آگیا - اس کے بعد دونوں میں خط کتابت جاری رہی، اور ہر وقت اور ہر خط میں کرک پیٹرک لکھا کرتی تھی کہ پانچ عرصا بعد میں ضرور یضرور حیدرآباد آکر اس سے شادی کرے گی، مگر یہ سب جھوٹی باتیں تھیں، اس لیے کہ افضل خاں کے ہندوستان کے لیے جاتے ہی اس نے لندن کے ایک بیرسٹر ویبسٹر WEBSTER سے شادی کرلی - اس کے باوجود افضل خان کو جھوٹے خط لکھتی رہی کہ وہ جلد سے جلد حیدرآباد آئے گی - ایک سال بھی گزر گیا، اور ادھر اس کے ایک لڑکا بھی پیدا ہوگیا - اس کے بعد اس نے بیرسٹر سے جھگڑا مول لیا، اور اس سے طلاق حاصل کرکے بیچا اس کے حوالے کردیا، اور خود ادھر ہندوستان کے لئے چل پڑی - حیدرآباد آنے کے بعد افضل خان نے اس کو ایک مکان کرائے پر دلایا، اور اپنی برادری اور احباب وغیرہا میں لیڈی ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کا تعارف کرایا، جس کی بنا پر

اس کی پرائیویٹ پریکٹس چمک گئی اور بہت جلد اس نے مالی حیثیت سے ترقی کر لی۔ امرائے پایگاہ اور خصوصاً آسمان جاہ کے محل میں اس کی رسائی بہت جلد ہو گئی اور یہاں بھی اس کا طوطی بول رہا تھا۔ اسی نوبت پر بھی اس نے افضل خاں کو دھوکے ہی میں رکھا اور یہی جل دیتی رہی کہ بہت جلد وہ اس سے شادی کرے گی اور افضل خاں اس سے محبت سے پیش آتا تھا، جیسے برائیٹن اور لندن میں اس کا دیوانا تھا۔ آخر تا کجے لیڈی بیٹرس اس کی چالاکی کے خطاے سارا راز فاش ہو گیا۔ افضل خاں کو اس سے نفرت ہو گئی، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ رحیم النسا افضل خاں کو دل و جان سے چاہتی ہے تو افضل خاں بھی اس کے عشق میں دیوانا ہو گیا، جس کے نتیجے کے طور پر دونوں رشتۂ مناکحت میں منسلک ہو کر رہے!

مس اڈنا کرک پیٹرک

MISS EDNA KIRK PATRICK

مس کرک پیٹرک نے بھی اس دلچسپ اور اہم ناول میں بڑا ہی دلچسپ، زبردست اور اہم رول ادا کیا ہے، اس لیے ہم یہاں پر اس سے متعلق بھی تھوڑی بہت معلومات فراہم کر رہے ہیں، اور ہماری یہ معلومات اس ناول کے حقیقی مصنف آرنلڈ فرنانڈز کی معلومات پر مبنی ہیں۔

اڈنا کرک پیٹرک، انگلستان کے ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے ماں باپ، نہ معلوم ملازمت کے سلسلے میں یا تجارت کے سلسلے میں، اپنے دو کمسن بچوں کے ساتھ شہر نیویارک (امریکا) میں مستقل طور پر رہ پس گئے تھے۔ جس وقت یہ لوگ امریکا گئے ہیں، کرک پیٹرک برائیٹن BRIGHTON (انگلینڈ) کے ایک اسکول میں تعلیم پا رہی تھی، اور یہ اپنی چچائی لیڈی بیٹرس بوائیس LADY BAETRIC BOYCE کے ساتھ رہتی تھی تعلیم کے دوران یعنی اس کے ماں باپ نے کسی مرتبہ اس کو اصرار کے ساتھ کہا کہ وہ بھی مستقل طور پر نیویارک آجائے، اور یہاں آسانی سے اس کی تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے، مگر ہر وقت اس نے نفی میں جواب دیا، اور انگلینڈ میں رہنا پسند کیا۔

اتفاق سے ایک حیدر آبادی طالب علم افضل خاں بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ گئے اور برائیٹن کے اسی اسکول میں شریک ہو گئے، جس میں مس کرک پیٹرک تھی، اور یہ دونوں ہم سبق اور ہم جماعت تھے۔ پوری جماعت میں افضل خاں اور کرک پیٹرک دونوں ہی حسین اور جمیل تھے اس لئے فطری طور پر ان دونوں میں آپس میں خلا ملا اور ربط ضبط زیادہ ہو گیا تھا، اسی وجہ سے افضل خاں روزانہ کرک پیٹرک کے گھر بھی جایا کرتا تھا۔ افضل خاں حیدر آباد کے ایک امیر کبیر اور بڑے جاگیردار کا اکلوتا لڑکا تھا، اس لیے اس کے باپ میر علی خان اپنے چہیتے اور عزیز از جان لڑکے کی تعلیم کے سلسلے میں انگلینڈ میں کافی سے زیادہ رقمیں روانہ کرتے تھے، اس وافر رقم میں سے افضل خاں، مس کرک پیٹرک کی بہت زیادہ امداد کرتا تھا اور اس مدد اور امداد کا علم کرک پیٹرک کی چچائی لیڈی بیٹرس کو بھی ہو چکا تھا۔ وہ اس کی مدد سے سخت نالاں اور ناراض تھی، اور کئی مرتبہ اپنی بھتیجی کو ڈانٹا اور ڈپٹا اور منع بھی کیا کہ وہ ایک ہندستانی طالب علم سے اس قسم کی میل ہرگز نہ لیا کرے، مگر کرک پیٹرک نے سنی ان سنی کر دی اور ان دونوں کے تعلقات ایسے دن بڑھتے ہی رہے۔

رحیم النسا نواب آسمان جاہ بہادر امیر [illegible]

لیڈی بیٹرسن نے آخر میں کرک پیٹرک کے ماں باپ کے ہاں نیویارک میں ٹک اس قسم کی شکایت لکھ بھیجی، اور ماں باپ نے اپنے خط میں کرک پیٹرک کو ایسی امداد سے منع کیا، جس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس عرصے میں دو سال بھی گزر گئے، اور ان دونوں نے ایک ساتھ امتحان بھی کامیاب کر لیا۔ اس کے بعد کرک پیٹرک نے افضل خاں کو مشورا دیا کہ وہ اب اپنی چچانی کے گھر پر نہیں رہ سکتی اس لیے لندن میں رہ کر ان دونوں کو آگے تعلیم حاصل کرنی چاہیے چنانچہ یہ دونوں لندن چلے آئے اور کرک پیٹرک نے میڈیسن میں داخلہ لیا اور افضل خان نے کالج آف آرکی ٹیکچر میں شرکت کی۔ اسکے باوجود اس نے اپنی چچانی سے تعلقات منقطع نہیں کیے تھے اور کبھی کبھار پیرائین جا کر خاندان والوں سے مل آتی تھی۔ اس کے ماں باپ کرک پیٹرک کے اخراجات کے سلسلے میں برابر اس میں بھی رقم روانہ کرتے تھے، اور اب جبکہ وہ لندن میں آگئی تھی تو یہاں بھی وہ کافی سے زیادہ اس کی مالی امداد کرتے رہے۔

لندن میں تعلیم کے دوران میں افضل خان نے کئی مرتبہ کرک پیٹرک سے شادی کا خیال ظاہر کیا تو اس نے کبھی بھی انکار نہیں کیا۔ لندن کے قیام میں پورے پانچ سال گزر گئے، اور کرک پیٹرک نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی، اور افضل خان نے آرکی ٹیکچر کی ڈگری لی۔ اس کے بعد جب افضل خان نے پھر شادی کا ذکر کیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ وہ لندن میں دو ایک سال پریکٹس کر کے کچھ تجربہ حاصل کرنا چاہتی ہے، اس لیے اس نے افضل خان کو مشورا دیا کہ چونکہ وطن سے آئے ہوئے انہیں سات سال ہو گئے ہیں، اس لئے وہ اپنے وطن حیدرآباد چلے جائیں، اور دو ایک سال بعد حیدرآباد آن کر وہ افضل خان سے شادی کرے گی۔ اس کے بعد افضل خان اپنے وطن حیدرآباد آ گئے، اور ان دونوں میں خط بازی برابر جاری رہی، اور ہر وقت وہ یہی لکھتی رہی کہ ہاں میں اپنا وعدا ضرور پورا کروں گی، اور تم مجھ پر پورا پورا بھروسا رکھو۔

افضل خان کے جاتے ہی کرک پیٹرک نے لندن کے ایک مشہور اور مالدار بیرسٹر ویبسٹر WEBSTER سے شادی کر لی۔ اس واقعہ کو ایک سال بھی گزر گیا، اور اس کے ایک بچا بھی پیدا ہو گیا۔ نہ معلوم کس بنا پر اس نے ویبسٹر سے طلاق بھی لے لی، اور بچا اس کے حوالے کر کے حیدرآباد چلی آئی۔ یہاں افضل خاں نے اس کے لیے ایک اچھا خاصا کرائے کا مکان دلوایا، اور رہنے سہنے کے مکمل انتظامات بھی کر دیئے، اور پریکٹس کے سلسلے میں جانے آنے کے لیے ایک بہترین بگی بھی دلوا دی۔ ایک تو لندن کی لیڈی ڈاکٹر، اور دوسرے افضل خان کے شخصی تعارف کی وجہ سے وہ بہت ترقی کر گئی، اور حیدرآباد کے بڑے بڑے امرا اور جاگیرداروں اور خصوصاً امرائے پائیگاہ اور بالخصوص نواب آسمان جاہ بہادر کے محل میں اس کی رسائی بہت جلد ہو گئی اور وہ فیملی ڈاکٹر بھی مقرر ہو گئی۔ حیدرآباد آنے کے بعد بھی جب افضل خان نے شادی کا تقاضا شروع کیا تو پھر سے اس نے ٹال مٹول سے کام لیا، اور آج کل، آج کل کہتے ہوئے دن ٹالے جا رہی تھی۔

ایسے میں نواب آسمان جاہ کی لڑکی رحیم النسا کی زہر خورانی کا واقعہ پیش آیا۔ لڑکی بے ہوش ہو گئی تھی اور جاں بہ لب تھی۔ یہ حال دیکھ کر آسمان جاہ کے ہوش جاتے رہے۔ مس کرک پیٹرک کو طلب کیا گیا، وہ اسی وقت آئی اور خود بھی لڑکی کا مرن حال دیکھ کر گھبرا گئی، مگر ہمت نہیں ہاری، باقاعدہ علاج شروع کیا، اور دیوڑھی ہی میں رہ گئی۔ تین رات تین دن تک سوئی نہیں، اپنے پر چین آرام حرام کر لیا۔ دوا پر دوا اور انجکشن پر انجکشن دیتی رہی، اور ہر وقت آسمان جاہ کو دلاسا تسلی دیتی رہی کہ وہ گھبرائیں نہیں، افیون کا زہر ہے، میں نے لندن میں ایسے کئی مریضوں کو

ٹھیک کر دیا تھا، اور آپ کی لڑکی کے جسم میں افیون کا جو زہر سرایت کر گیا ہے، اس کو بھی زایل کر کے رہوں گی، اور آپ کی لڑکی پہلے کی طرح بھلی چنگی ہو جائے گی۔

خیر سے چار چھ روز میں رحیم النسا بالکل ٹھیک ہو گئی، اور جب وہ بات چیت کرنے لگی تو کھانے پینے کے قابل ہو گئی تو لیڈی ڈاکٹر اپنے گھر چلی گئی، مگر دیوڑھی میں اس کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ افضل خاں، رحیم النسا کو چاہتا ہے، اور اس سے عشق بھی کرتا ہے، جب اس کے عشق میں ناکامی ہوئی تو اس نے یہ کمینا اور ذلیل حربا اختیار کیا کہ اپنے اعتماد کے ملازمین کے ذریعہ افیون ملی مٹھائی رحیم النسا کے ہاں بھجوائی، اور تاکید یہ کہلوایا کہ وہ مٹھائی رحیم النسا خود ہی کھائے، اور کسی اور سے کو نہ دے، چنانچہ افضل خاں سے مخالفت کا یہ بہانا ہاتھ آیا تو کھلے طور پر وہ افضل خاں کی مخالف ہو گئی، اور باقاعدہ طور پر اس سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا، حالانکہ خود افضل خاں کو اس واقعے کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ نہ وہ رحیم النسا کو چاہتا تھا اور نہ عشق کرتا تھا، اور نہ اس نے افیون ملی ہوئی مٹھائی اس کے ہاں بھجوائی تھی۔ یہ سب درمیانی لوگوں، مثلاً رحیم النسا کی پھپھی کی دونوں ماماؤں اور دیوڑھی کے ایک بدکار اور بدکردار ملازم عبدالقادر کا، ذلیل اور کمینا کارنامہ تھا کہ رحیم النسا سے بے پناہ طریقے پر قیمتی زیورات اور جواہرات حاصل کرنے کے لیے اس نے یہ خطرناک کھیل کھیلا تھا کہ خود ہی اس نے مٹھائی میں زہر بھی ملایا تھا اور عورت کا بھیس بدل کر وہ مٹھائی لے جا کر شہزادی رحیم النسا کو دی تھی، اور یہ کہا تھا کہ آپ اس شخص کو چاہتی ہیں اس کا نام افضل خاں ہے، تو وہ بھی آپ پر دل و جان سے فدا ہے، اور اس نے آپ کو یہ مٹھائی بھجوائی ہے اور سختی کے ساتھ تاکید کی ہے کہ آپ اس میں سے ذرا برابر مٹھائی کسی دوسرے کو نہ دیں، بلکہ ساری مٹھائی رکھ کر خود ہی کھائیں۔ یہ سنتے ہی رحیم النسا خشی سے پھولے نہ سماتی تھی، اس لیے اس نے جس کو دیکھا تھا اسکی تصویر بھی آ گئی، اور یہ کہ وہ خود بھی اس کو چاہتا ہے اور پھر تحفہ بھی بھجوایا ہے، اس سے مٹھائی قبول کرلے کے بعد اس مصنوعی عورت یعنے اپنے گھر کے ملازم عبدالقادر کو کافی سے زیادہ زر و زیور اور جواہرات وغیرہ سے نوازا اور خشی خشی سے خوب مٹھائی کھائی، چونکہ مٹھائی میں کافی مقدار میں افیون ملی ہوئی تھی اس لیے زہر کا رحیم النسا پر فوری اثر ہوا، اور اس کا گورا چٹا جسم بلکل ہی نیلگوں ہو گیا، اور موت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ عبدالقادر نے یہ کمینی اور ذلیل حرکت اس لیے کی تھی کہ رحیم النسا اگر مر جائے گی تو اس نے ہزاروں روپے کے زر و جواہرات جو حاصل کیے ہیں، وہ اس کو مل جائیں گے، اور اس کی اور دونوں ماماؤں کی قسمت جاگ اٹھے گی، اور یہ راز کسی پر بھی نہ کھلے گا، مگر رحیم النسا کے صحت یاب ہو جانے سے یہ سارا بھانڈا پھوٹ گیا اور راز افشا ہو گیا۔

حیدرآباد کا محرم

بمبئی کی دیوالی، میسور کا دسہرا، اور حیدرآباد کا محرم خاص طور پر مشہور تہوار تھے۔ ہم نے بمبئی کی دیوالی دیکھی اور میسور کا دسہرا بھی دیکھا ہے، اور میسور کی وڈونمتی بھی دیکھی۔ وڈونمتی مہاراجا میسور کی سالگرہ کی تقریب ہوا کرتی تھی۔ دسہرے کے موقعے پر، موجود مہاراجا کے باپ مہاراجا سفید گھوڑے پر جلوس کی شکل میں نکلتے تھے۔ مہاراجا کے سر پر ان کے درباری پگڑی یا زرین کپڑے کا شملا ہوتا تھا۔ اطلسی یا کمخاب کی شیروانی پہنتے تھے اور ہر ایک کا سفید حیوڑی دار پاجامہ تنگ تن

کرتے تھے۔ مہاراجہ کے ہات میں زرین نیام کی تلوار ہوتی تھی، اور ان کا گھوڑا سب سے آگے ہوتا تھا، اس کے بعد ولی عہد سلطنت کا گھوڑا ہوتا، اور اس کے بعد حسب مراتب امرائے دربار کے گھوڑے ہوا کرتے تھے، اور آخر میں باقی درباری پیدل جلوس کی شکل میں چلتے تھے۔ مہاراجا سے آگے چپراسی ساٹ سرخ وردی پہنے سپاہی ہوتے تھے، جن کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے چاندی کے بھالے برچھے وغیرہا ہوا کرتے تھے۔ مہاراجا اپنی دیوڑھی سے جلوس کی شکل میں نکل کر شہر کے مقررہ خاص خاص مقامات کا چکر لگاتے ہوئے دوسرے رستے سے پھر اپنی دیوڑی کو لوٹ آتے تھے، رات میں اسٹیٹ ڈنر ہوتا تھا، جس میں امرائے سلطنت اور دوسرے خاص خاص لوگ مدعو ہوتے تھے۔ سارے شہر میں اور چاوندی ہل پر چراغاں ہوتا تھا، اور یہ جشن سرکاری طور پر تین روز تک منایا جاتا تھا۔

وڈونتی یا سالگرا کے موقع پر مہاراجا میسور ہاتی پر عماری میں بیٹھے ہوتے تھے، لباس اسی نوعیت کا ہوتا تھا جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ ان کے ہاتی کے پیچھے ولی عہد سلطنت کا ہاتی ہوتا تھا، اس کے بعد دیوان میسور کا ہاتی اور بعد میں دو چار خاص امرائے دربار کے ہاتی ہوتے تھے، اس کے بعد پیدل سپاہی ہوتے تھے۔ وڈونتی کے جلوس کا بھی وہی مقررہ رستا ہوتا تھا، جو دسہرے کے لیے مخصوص تھا، شہر کا چکر کاٹ کر مہاراجا دیوڑی واپس آجاتے اور رات میں اسٹیٹ ڈنر ہوتا تھا۔ سارے شہر اور چاوندی ہل پر اس موقع پر بھی چراغاں ہوتا تھا، مگر یہ جشن صرف ایک روز تھا۔

حیدرآباد کا محرم واقعی "چیزے دیگر است" کے مصداق ہے۔ پہلی محرم سے اس تاریخ تک سارے شہر میں ایک میلا سا لگا رہتا تھا۔ بلا تفریق مذہب وملت ہندو مسلمان سب ہی اس تقریب میں جی کھول کر حصہ لیتے تھے، اور اکثر و بیشتر ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھروں میں علم بٹھائے جاتے تھے۔ شیعوں کے گھروں میں دس روز تک مسلسل مجلسیں ہوا کرتی تھیں، جن میں ہزاروں ہی غیر شیعا بھی شریک رہتے تھے، اس لئے یہ مقامات مجلسوں کے لئے خاص طور پر مشہور تھے، اس لئے انکی مجلسیں خاص طور پر بڑے سلیقے سے خاص طور پر ہوا کرتی تھیں۔ سالار جنگ اور ان کا پورا خاندان شیعا تھا۔ اس لیے ان کا محل دیوان دیوڑی بھی مجلسوں اور ماتموں کا شہر کا سب سے زبردست مرکز تھا۔ خدم نے سالہا سال تک سارے شہر کے محرم کو دیکھا ہے، اور سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بار مجلسوں میں شرکت بھی کی ہے۔ ہر مجلس میں ایک مکان لازمی طور پر کچھ نہ کچھ تبرک تقسیم کرتا تھا، اس لیے کہ سال بھر میں اس سے بڑھ کر کوئی اور ثواب یا نیکی کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ غیر شیعا بھی پوچھو تو اسی تبرک کی خاطر مجلسوں میں جایا کرتے تھے۔ کہیں صرف مٹھائی تقسیم ہوتے تو کہیں نان اور حلوا۔ کسی گھر میں سوکھے میوے کے پیکٹ تو کسی کے ہاں کلیجے اور دالچا۔ کوئی نئی دکان میں جلیبی کا پیکٹ رکھ کر دیتا تو دوسرا ڈبے میں برفی اور شیرمال کا نذرانا پیش کرتا کسی کے ہاں صرف نمک پارے تقسیم ہوتے تو کسی گھر میں صرف ڈبل کا میٹھا ملا کرتا تھا۔ کوئی پورن پوری گزرانتا تو دوسرا حلیم تیار کر کے تقسیم کرتا تھا۔ بہرحال تبرک کے بغیر کوئی مجلس مکمل نہ ہوا کرتی تھی، اور ان تمام مجلسوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہر مجلس میں پینے والوں کے سامنے تیار رتھے بھی پیش کیے جاتے تھے جس سے نوجوان طبقا بہت ہی لطف اندوز ہوتا تھا۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ان محلوں میں شیعا کثرت سے آباد تھے۔ ایک گھر میں مجلس ہو رہی ہے تو سامنے کے یا برابر والے گھر کے لوگ عوام کو دعوت محفل دینے کے لئے تیار کھڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ مجلس ہے جیسے ہی مجمع باہر آتا تو یہ لوگ للکارتے۔ "آئیے مومنین مجلس تیار ہے" یہ مسخرے لوگ در مائت کرتے "آیا کچھ تبرک بھی ہے مارو کچھ سوکھا محلہ ہے"

ادھر سے جواب ملتا "ارے واہ! یہ کیسے ہو سکتا مومنین، حسنین کے جوتیوں کے طفیل عالا درجے کے تبرک کا انتظام کیا گیا ہے، اور مجمع میں سے بعض مشورا دیتے "چلو بھیا! چلے چلو، امام حسین کا صدقا بچ ہی جائے گا" اور یہ سب لوگ مجلس میں شریک ہو جاتے، مجلس ہوتی، اور حسب وعدا تبرک تقسیم ہوتا، اور حلقے بھی پیش کئے جاتے۔ یہاں سے فارغ ہو کر اہل تبرک پھر تیسرے تبرک کی تلاش میں آگے چلے جاتے۔

یہ ہماری آپ بیتی اور آنکھوں دیکھا حال ہے" ہم خدہی لکھنا چاہیں تو اس وقت حیدرآباد کے محرم پر صفحے کے صفحے کالے کر ڈالتے ہیں، مگر ہم اس نوبت پر آپ کو حیدرآباد کے محرم کے بارے میں ایک اور ذریعے سے مفید معلومات بہم پہونچانا چاہتے ہیں۔ اس وقت اچانک طور پر ہمیں یہ بات یاد آگئی کہ "ہندستانی ادب" کے کسی ابتدائی نمبر میں "حیدرآباد کا قدیم محرم" کے عنوان سے معین الدین رہبر فاروقی کا معرکا آرا مضمون چھپا تھا، چنانچہ پہلی جلد سے ہم نے فہرستوں کی ورق گردانی شروع کی "جو ہندایا ہند" کے مصداق ہماری تلاش کے نتیجے کے طور پر پانچویں جلد کے تیسرے ہی نمبر میں وہ مضمون مل گیا۔ اس لئے ہم آپ کی معلومات کی خاطر "ہندستانی ادب" بابت دسمبر ۱۹۴۳ء سے نیچے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ رہبر فاروقی لکھتے ہیں:-

"حیدرآباد کی دنیا پر اگلے زمانوں میں مسلسل چار سو سال تک ہلالی محرم عجیب عجیب تماشے لئے آسمان تھا، ادھر افق پر چاند نظر پڑا علم مبارک سارے شہر میں، امام عالی مقام اور شہدائے کربلا کے نام سے ایستادا کیے جاتے تھے۔ ذی حجہ کے اواخر ہی سے سارے انتظامات کا آغاز ہو جایا کرتا تھا۔

"عزہ محرم سے دسویں تک حیدرآباد کے اکثر امیر و غریب عالا اور ادنا بچے اور بوڑھے سبھی سبز و سیاہ لباس پہنتے، بازوؤں پر اور گلے میں آشیاں، سیل اور ڈھٹیاں باندھتے تھے اور آج تک اس طریقے کو اہل دکن "فقیر بننا یا فقیری" کے نام سے یاد کرتے آتے ہیں۔"

"اکثر نیچ قوم کے لوگ "شیر" بنتے تھے، یعنے اپنے جسم کو شیر کی طرح رنگتے تھے اور بیچے ایک لانبی دم لگایا کرتے تھے، باجے کے ساتھ بازاروں میں گھوم پھر کر دوکانداروں سے اپنا معمول وصول کرتے تھے۔ ان کے علاوا بعض غریب لوگ بھنوں بھی بنتے تھے اور وہ بھی عوام سے پیسے وصول کرتے تھے۔"

"عشرہ شریف میں بڑے لوگ اہتمام اور عقیدت سے اپنے مکانوں کی آرایش کرتے اور تعزیے بٹھاتے تھے، جن میں راجا راو رتنھا بہادر کا تعزیا بہت مشہور تھا، جس کی تیاری میں کئی مہینے اور کئی ہزار روپے صرف ہوتے تھے۔ اس تعزیے میں روشنی کے لئے روز انا کئی سو روپے اور دسویں کو ایکہزار روپے کا تیل جلایا جاتا تھا۔ ان کے محل کے کمپونڈ میں محرم سے پہلے شیر - ببر - چیتے - شترمرغ اور ہرائق کے مکھوٹی کے مجسمے تیار کر کے گیہوں کی سبزی لگائی جاتی تھی، ان کے اطراف رات میں روشنی بھی کی جاتی تھی اور یہ محل محرم کی دس تاریخ تک عوام کے لئے کھلا رہتا تھا۔"

"مہاراجا کی ٹٹی بڑی بے نظیر چیز تھی۔ حلو خانے راجہ جیندولال کی آرایش و سیرایش تو بے مثال تھی۔ سارے دیوڑی خانے آفتاب نظر آتی تھی۔ ولایتی درختوں کی روشنی، قندیلوں کی جگمگاہٹ اور طرح طرح کی رنگا رنگ روشنیاں بہار دکھاتی تھیں۔ ان سب میں قابل دید "مہاراجا بہادر کی ٹٹی" کا نظارا ہوتا، جس پر ساری صناعی صرف کی جاتی تھی۔ دوسری طرف امرا و سلاطین وغیرا کی نایاب قلمی تصویروں کی نمایش کی جاتی تھی، اور دم بدم مہتاب اور دوسری آتش بازی چھوڑی جاتی تھی، اور آسمان کو مہتاب کی روشنی سے [illegible]

احتشام برقرار تھا۔"

"میر عالم بیگی کے عرض بیگی، حسن یار جنگ کا آئینا خانا بھی ایک عجیب وغریب چیز تھی۔ اس کی زیبائش کے لیے انہوں نے ایک لاکھ روپے دے کر علی بیگ خاں سوداگر سے ان کی کوٹھی مع سازوسامان کے خرید لی تھی، اور نادر نادر سامان سے عاشور خانے کو پر زینت بنا دیا تھا، اور بڑے اہتمام سے بڑے بڑے امرا، اور عہدہ داران سلطنت کو دس روز تک غالا درجے کا تبرک اور قیمتی دھٹیاں تقسیم کی گئیں۔"

"مال والوں کی پتلیوں کی تفصیل یہ ہے کہ چار مینار کی مشرقی سڑک پر راجہ شیوراج بہادر کی دیوڑی ہے ان کے محل کے مقابل تعزیہ خانے میں ہر سال مختلف قسم کی پتلیاں بٹھائی جاتی تھیں۔ ان پتلیوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا تھا، اور رنگ آمیزی اس نزاکت سے کی جاتی تھی کہ بعض وقت اصل آدمی کا دھوکا ہوتا تھا۔ شیوراج کی دیوڑی میں بھی پہلی تاریخ کو علم بٹھائے جاتے تھے اور دسویں محرم تک علم کی زیارت کے لیے ہر شخص کو جانے آنے کی اجازت تھی۔"

"تالاب میر جملا کے قریب ایک بڑا امام باڑا ہے۔ اس امام باڑے کی تفصیل یہ ہے کہ جب قلعۂ سدوٹ فتح ہوا تھا تو وہاں کے علم ضبط کر کے سرکار میں پیش کئے گئے تھے۔ حضور سکندر جاہ نے یہ علم رحمان یا آغا شاہ سراج شمالی کو دیے، اور ساتھ ہی چار ہزار روپے سالانہ کی جاگیر عطا کی تاکہ اس کی آمدنی سے نئے امام باڑے کے اخراجات کی تکمیل ہو۔ سکندر جاہ کے بعد ہر نظام محرم کے زمانے میں اس امام باڑے میں آیا کرتے تھے۔"

"بادشاہی عاشور خانا، وسط شہر میں، دیوان دیوڑی کے مقابل واقع ہے اس کو سلطان محمد قلی قطب شاہ نے سنہ ۱۰۱۰ھ میں ساٹھ ہزار ہن کے خرچ سے تعمیر کروایا تھا، اور اس میں بیش قیمت جواہر سے مزین طلائی اور نقرئی علم ایستادہ کئے تھے اور یہ حکم دیا تھا کہ پہلی سے دس محرم تک روزانہ ۱۲ سو غربا اور مساکین کو کھچڑی کھلائی جائے اور ساتھ ہی شربت اور دودھ کا شربت بھی پلایا جائے۔ اس کے علاوہ دس روز تک مرثیے پڑھنے والوں اور اہل بیت کے حالات اور واقعات بیان کرنے والے ذاکروں کو ہزاروں ہن اپنی جیب خاص سے دیا کرتا تھا۔ آصفی دور میں بھی ہر نظام عاشورے کے درمیان کسی نہ کسی روز اس عاشور خانے کے علموں کی زیارت کے لیے ضرور آیا کرتے تھے۔"

"بادشاہی عاشور خانے کے علم کے علاوہ، حیدرآباد میں کئی ایک اور بھی مشہور مشہور علم ہیں جن کے نام یہ ہیں حسینی علم۔ دلہا صاحب کا علم۔ امام قاسم کا علم۔ لیچھڑ کا علم۔ حضرت عباس کا علم۔ تنس صاحب کا علم۔ کوکاٹنی کا علم۔ لہیچڑوں کے الاوے کا علم۔ الاوے تیمیاں کا علم۔ اور سب سے زیادہ مشہور علم راہم بی بی کا علم ہے۔ بی بی کا علم یاقوت پورے سے متصل ایک محلے میں ایستادہ ہے اور اس محلے کا نام بھی "بی بی کا علم ہے"۔ یہ علم پہلی محرم کو بٹھایا جاتا ہے، اور دس محرم کو اٹھایا جاتا ہے۔ اس علم میں قیمتی جواہرات لگے ہوئے ہیں جو ہر سال ایک مرتبہ چوری ہو گئے تھے، مگر کچھ عرصا بعد چور پکڑا گیا، اور وہ جواہرات پھر سے علم کو لگا دیے گئے۔ یہ علم دسویں محرم کو تقریباً (۱۱) بجے دن میں ماتی پر جلوس کی شکل میں نکلتا ہے۔ ماتی کے سامنے بچاسوں ہی نوجوان سیاہ لباس میں مرثیے پڑھتے ہوئے، اور ماتم کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ علم دبیر پورے سے ہوتا ہوا پرانی حویلی جاتا ہے، جہاں حضور نظام دکھنی چڑھاتے ہیں

چڑایا کرتے تھے۔ اس کے بعد چارمینار سے ہوتا ہوا دارالشفا اور چادر گھاٹ دروازے سے قریب رود موسا میں ٹھنڈا ہوا کرتا ہے۔ اس کے دیکھنے کے لیے سڑکوں پر ہزاروں آدمی جمع رہتے ہیں، اور ندی اور ندی کے اطراف وجوانب میں لاکھ دو لاکھ افراد کا مجمع ہوتا ہے جس میں ہندو مسلمان سب ہی شریک رہتے ہیں۔ اور ندی کنارے ایک میلا لگا رہتا ہے۔"

"ندی کے اس بڑے میلے کے علاوہ، اور کئی ایک میلے لگتے ہیں، جن کا سلسلہ محرم اور صفر کے مہینے تک جاری رہتا ہے۔ اصل میں علم بٹھلائے جاتے ہیں، اور جب وہ اٹھائے جاتے ہیں تو واقعی یادگار لگتا ہے اور سینکڑوں، بلکہ ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں اور ہر جگہ ایک میلا سا نظر آتا ہے۔ ان میلوں کے نام یہ ہیں ۔۔۔ تاڑبن کا میلا۔ ۲۰ محرم کا میلا۔ جھرے کا میلا۔ ۲۷ محرم کا میلا۔ کاروان ساہوکا میلا۔ ۲۹ محرم کا میلا۔ بی بی کے چشمے کا میلا۔ ۳۰ محرم کا میلا۔ مشیرآباد کا میلا (مشیرآباد کے علم کے میلے کا رکھوالی ایک ہندو ہے۔ پہلی محرم کو علم بٹھاتا ہے، اور ۲۰ صفر کو اٹھاتا ہے۔ سرشام سے کئی بنڈی لکڑی جلا کر دھکتے انگارے بنالے جاتے ہیں، اور ان انگاروں کو لانبی لانبی لکڑیوں سے دس فیٹ اور تین فٹ مستطیل کی شکل پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ رات کے دو بجے وہ شخص ہیند اور افراد کے ساتھ قریب میں ایک باولی پر جاکر اشنان کرتا ہے، اس کے بعد گیلے کپڑوں سے آن کر خدہی علم اٹھاتا ہے، اور اس کے ساتھی اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں، اور علم لے کر یا علی یا علی کے نعرے لگاتا ہوا مغرب سے مشرق کی طرف آگ پر سے جاتا ہے اور پھر پلٹ کر اس آگ پر سے واپس بھی آجاتا ہے۔ اس کے بعد علم کو اپنے مقام پر لٹا دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس علمبردار کو اور اس کے ساتھیوں کو آگ کے شعلوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اس کے پیچھے اور بھی بعض نوجوان چلے جاتے ہیں، مگر یہ لوگ آگ کی تپش کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس آگ کے مظاہرے کو دیکھنے کے لئے عکماً ان انگریز بھی زیادا تعداد میں آیا کرتے تھے۔" ۲۹ محرم کا میلا۔ قلعے کا میلا۔ ۲۲ صفر کا میلا۔ سنکیسر کا میلا۔ ۱ صفر کا میلا۔ چمپا پیٹ کا میلا۔ ۵ صفر کا میلا۔ عنبرپیٹ کا میلا۔ ۲۸ صفر کا میلا۔ اس کے علاوہ اور بھی محلوں میں چھوٹے موٹے میلے ٹھیلے ہوا کرتے ہیں۔"

چق چقی کا ماتم

یہ ماتم ۱ محرم کو صبح ۸ بجے دیوان دیوڑی میں ہوا کرتا تھا۔ نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث، اپنی دیوڑی میں، اپنے افراد خاندان اور احباب وغیرا کے ساتھ کھڑے اس ماتم کو دیکھا کرتے تھے۔ خدہم نے بھی کئی بار یہ دردناک ماتم دیکھا ہے، اس لیے آنکھوں دیکھا حال لکھ رہے ہیں۔

۱ محرم کے لحاظ سے ماتم کرنے والوں کی تعداد بھی دس ہی ہوا کرتی تھی یہ سب ہی موٹے تازے اور تگڑے نوجوان ہوا کرتے تھے، جن کے جسم میں خون کھیلا کرتا تھا اور ان کی عمر ۲۵۔ ۳۰ کے لگ بھگ ہوا کرتی تھی۔ ان کے مقابل مرثیا پڑھنے والی جماعت ہوا کرتی تھی، جو مرثیے بھی پڑھتی تھی اور ماتم بھی کرتی تھی۔ جب ان لوگوں کا ماتم نقطۂ عروج پر پہونچ جاتا تو چق چقی والی جماعت بھی چق چقیوں سے ماتم شروع کر دیتی۔ ان چق چقیوں میں باریک کیلے لگے ہوتے تھے۔ کیلوں کے سینے کے گوشت میں پیوست ہوتے ہی ان نوجوانوں کے جسم سے خون کے فوارے اٹھتے تھے، اور چق چقی کا ماتم ۵، ۶ منٹ سے زیادا [illegible]

دواخانے میں شریک کر دیا جاتا تھا۔

عالا حضرت حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف سابع نے چق چقی کا ماتم کے بارے میں سنا ضرور تھا، مگر دیکھا نہیں تھا۔ ایک سال انہوں نے سالار جنگ سے خاہش کی وہ دسویں محرم کو چق چقی کا ماتم دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دسویں محرم کو صبح ۸ بجے وہ سالار جنگ دیوڑی آئے اور سالار جنگ نے ان کا استقبال کیا، اور سالار جنگ کے مقابل کھڑے ہو کر انہوں نے بھی یہ ماتم دیکھا۔ ماتم شروع ہوتے ہی نوجوانوں کے سینوں سے خون کے فوارے اڑنے لگے اور اتفاق ایک چھوڑ دو ماتمی بے ہوش ہو کر گر پڑے اس کے ساتھ ہی حضور نے للکار کر کہا۔

"بند کرو، بند کرو، یہ دردناک ماتم ہرگز نہیں ہو سکتا، یہاں تو انسانیت کا خون بہایا جا رہا ہے"

اس کے بعد غصے کی حالت میں اپنی دیوڑی چلے گئے اور اسی روز جریدے غیر معمولی میں فرمان شایع کروایا کہ۔

"ریاست حیدرآباد کے کسی بھی حصے میں، انسانیت سوز اور نہایت ہی دردناک چق چقی کا ماتم نہیں ہو سکتا!"

جس روز چق چقی کا ماتم دیکھنے حضور نظام آئے تھے، ہزاروں عوام میں کھڑے ہم خود بھی یہ ماتم دیکھ رہے تھے چونکہ ہم اس جمعے یا PORTICO سے بالکل ہی قریب تھے اس لیے نظام کی خفگی بھی دیکھی ان کی غصیلی آواز کو بھی پورے طور پر سنا، اور جب وہ دیوڑی سے باہر اپنی موٹر کار میں بیٹھنے کے لیے جب باہر آئے ہیں تو ان کو رخصت کرنے کے لیے نواب سالار جنگ بہادر سات آئے تھے، نواب صاحب کے کار کا دروازے کھولتے ہی نظام کار میں بیٹھ گئے، اور نواب صاحب نے جھک کر پانچ آداب بجا لائے اس وقت بھی نظام نے نواب صاحب سے اسی غصے کی حالت میں پھر سے کچھ ہدایت کی، مگر وہ گفتگو ہم نہ سن سکے۔ معلوم ہوتا ہے پھر سے انہوں نے اس ماتم کی مذمت کی، اور اس کے بند کر دینے کے لیے کہا، جس کے جواب میں سالار جنگ نے صرف یہ کہا "جو حکم" اور کار چلی گئی۔ اس کے بعد جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، دوسرے روز "چق چقی کا ماتم" بند کرنے کے لیے فرمان جاری کیا جو جریدے غیر معمولی اور بعد میں تمام مقامی اخباروں میں چھپا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی چق چقی کا ماتم نہیں ہوا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء کا ہے۔

لنگر

لنگر فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے دو معنے ہیں پہلے معنے یہ ہیں کہ جہاز میں رکھا ہوا وہ وزنی آہنی کوجھ جو جہاز کے بندرگاہ میں ٹھہرنے تک موٹے موٹے رسوں کے ذریعے پانی میں گرا دیا جاتا ہے، جس سے جہاز حرکت نہیں کرتا ہے، اور جہاز کے روانا ہونے سے پہلے انہیں رسوں کے ذریعے سے

جہاز پر لوٹا لیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس لنگر کے لیے ANCHOR کا لفظ ہے۔ آج کل کے سمندری جہازوں کے لنگر بہت بڑے اور زیادہ وزنی بھی ہوتے ہیں، جن کے ساتھ لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں بندی ہوتی ہیں۔ جب جہاز گودی میں آتا ہے تو مشین کے ذریعے یہ لنگر پانی میں گرایا جاتا ہے اور جانے سے پہلے پھر اسی طرح لوٹا لیا جاتا ہے۔

لنگر کے روسرے معنے ہیں، خیرات کا وہ کھانا جو غریبوں اور مساکین کو کھلایا جائے۔ مگر حیدرآباد بھی لنگر کے ایک تیسرے معنے بھی ہیں، یعنے حضور نظام کی فوج ۱۰ محرم کے روز حضور نظام کو سلامی دیتے ہوئے گزرتی تھی۔ حضور نظام اپنے محلات اور عمایدین سلطنت کے ساتھ چوک محلے کے ایک اعلیٰ کے چھجے یا PORTICO میں بیٹھا کرتے تھے اور یہ ساری فوج اپنے پورے لوازمات کے ساتھ ایک بجے سے شام کے (۶) بجے تک پرانے پل کی طرف سے آتی اور حسینی علم۔ چوک۔ چارمینار کا چکر کاٹتے ہوئے پتھر گٹی سے نئے پل کی طرف جاتی اور وہاں سے اپنے اپنے مقام کو واپس چلی جاتی تھی۔ اس یادگار لنگر کے دیکھنے کے لیے دونوں طرف ہزاروں بلکے لاکھوں ہی آدمی کھڑے ہوتے تھے۔ رہبر فاروقی نے اپنے محترم والے مضمون میں "لنگر" کے بارے میں لکھا ہے، اس سے ہم نیچے انہیں کے معلوماتی مضمون سے اقتباسات پیش کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"لنگر کے بارے میں جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے، لنگر کی حقیقت یہ ہے کہ ایک سال ۲۷ ذی حجہ کے دن سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۲۷ھ تا ۱۰۷۶ھ) بلدۂ حیدرآباد سے بقصد قلعۂ محمد نگر یا گولکنڈا "صورت" نامی فیل خاصا پر سوار ہوا (جس کے نام سے اب تک حسینی علم ہی کے قریب ایک کوچا "صورت صورت" مشہور ہے) اور جب رود موسا کے کنارے پہونچا تو اور اس سے پار ہونا چاہا تو ہاتی پانی کے زور و شور کو دیکھ کر ایسا مبہوت اور بے اختیار ہو گیا کہ فیل بان یا مہاوت کو لونڈے سے گھسیٹ کر نیچے پٹک دیا، اور یہاں سے اس نے مستی کی حالت میں راہ فرار اختیار کی۔ بادشاہ حیران و پریشان موت و زیست کے عالم میں گرفتار، پریشان حال ہاتی ہی پر بیٹھا رہا، اور ہاتی اس کو تین دن تک کویہ کو لیے پھرتا رہا۔ سلطان کی ماں حیات بخشی بیگم جو ماں صاحب کے نام سے مشہور تھی، کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس کے ہوش و حواس جاتے رہے، اور کمال اضطراب اس پر چھا گیا، نہایت ہی پریشانی کی حالت میں اس کے دن رات کٹنے لگے۔ بیٹے کی بھوک پیاس کا خیال کر کے اس نے شہر کے اطراف درختوں پر توشے رکھوائے اور پانی کا بھی انتظام کروا دیا۔ تاکہ اس درختوں کے نیچے سے اگر بادشاہ کے ہاتی کا گزر ہو تو وہ توشا اور پانی حاصل کر کے ہاتی ہی پر بیٹھے کھا سکے۔"

"اسی ربیع الاخر میں جب حیات بخشی بیگم نے محرم کا چاند دیکھا تو نذر کی اگر میرا بیٹا صحت و عافیت کے ساتھ لوٹ جائے تو اس کے عمل شاہی میں داخل ہوتے سے تبل، (۴۰) من یخ طلا سے خالص کا لنگر (کہ اس سے جس طرح مست ہاتی کے پیر کو باندھتے ہیں) اس سلطان عبداللہ کی کمر سے باندھ کر اس کو قلعۂ محمد نگر سے پیدا پا لے بارگاہ حسینی میں حاضر ہوں گی" اور اس زنجیر کو سادات کرام و غربا و مساکین میں حضرت حسین کے نام نامی پر خیرات کر دوں گی۔

"جوں ہی کہ صدق دل کے ساتھ بیگم کی زبان سے یہ الفاظ نکلے اس وقت سے ہاتی کی مستی کم ہو گئی، اور بادشاہ کے قابو میں آ گیا۔ اس کو لے کر سلطان ۵ محرم کو دولت خانۂ شاہی پہنچا، ماں نے نذر کی تکمیل کی، بیٹے کو عمل میں نہ آنے دیا۔"

محمل کا فرش بچھا۔ بادشاہ اور اس کی ماہ شربت پلاتے اور خیرات کرتے ہوئے پاپیادہ حسینی علم تک پہنچے اور منت کے مطابق (۴۰) من سونے کی زنجیر فقرا میں لٹائی گئی۔"

"اس واقعے کی یادگار کے طور پر حیدرآباد میں ۵ محرم کو شہر میں لنگر نکلا کرتا تھا، مگر اس لنگر کی نوعیت الگ تھی، یعنے حضور نظام کے آگے سے سلامی دیتی ہوئی چلی جاتی تھیں، سب سے پہلے نواب شمس الامرا بہادر کا لنگر، ہر سہ پایگاہ کی ساری فوج کے ساتھ نکلتا تھا جس کے جلو میں پلٹنیں، عماریاں، شتر قال، علی غول، فیلان نوبت ایک کے بعد ایک گزرتے تھے اور چند ہاتیوں پر عبیر کے حوض بنائے جاتے تھے جو خلق خدا پر عبیر افشانی کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ خدا میر کبیر شمس الامرا بہادر اپنی کمر سے طلائی اور پھولوں کا لنگر باندھے عماری میں بیٹھے حسینی علم پر سے گزرتے تھے۔"

"اس کے بعد اس تاریخ ۵ محرم کو دوپہر سے شاہی لنگر کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ خد حضور پرنور اپنے محلات عالیا کے ساتھ جو محلے کے چھ یا PORTICO میں پہنچے شام کے ۶، ۷ بجے تک برآبر اس لنگر کا معائنا کرتے تھے۔ سب سے پہلے طلائی نشان کا کوئی پیکر ہاتی جھومتا جھامتا ہرکاروں کے دو داروغاوں کے ساتھ (جس میں فیض آب الدولا اور خورشید جنگ کے آٹ سوہرکارے اس کے آگے چلتے تھے) گزرتا تھا۔ پیچھے خبریں پہونچانے والے سانڈنی سوار، باندار اور شتربان ہوتے تھے، جن کی تعداد ایک سو کے قریب ہوتی تھی۔ یہ جمع ابھی گزرنے نہیں پاتا تھا کہ علاقۂ دیوانی کی جمعیت کا نیل نشان، سونڈ اٹھائے چلا آتا تھا، جس کے ہمراہ چھ ہزار سوار، جمعدار، رسالدار، عرب، سکھ اور سندی ہوتے تھے۔ ان کے بعد جوانان بارکمندانوں کی آراستا اور پیراستا جمعیت نئے نئے کپڑے کیلے ڈریس سے مزین پانچ ہزار کے قریب چلتی، جن کے ساتھ عماری توپ خانہ ہوا کرتا تھا اس کے پیچھے تین ہزار تعداد میں عرب سردار، سندی اور سکھ وغیرا، اور دوسرے دیوانی امیروں کے سردار بھی گزرتے تھے۔ اس نظارے سے نگاہ بھی چوکنا نہ ہونے پاتی تھی کہ حضور پرنور کی جمعیت خاصا کا زرین نشان، اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ نشان کے آگے رکاب میں چلتے تھے یہ شاہی نشان بہت بڑے نیزہ جیسے ایک ہاتی پر آتا نظر آتا تھا جس کے سیاہ جسم پر کلابتونی زرکاری سرخ و سپید جھول عجیب و غریب سماں دکھاتی تھی۔ داروغا کی معیت میں پانچ دار طلائی متفرق برقی ہاتوں میں لیے ڈیڑھ سو تیز رفتار سانڈنی سواروں اور بہت سے بان بردار شتروں کے ساتھ چلتے تھے۔ ان کے بعد دوسرے امرا کے رسالوں کے پانچ ہزار سواروں کا انبوہ کثیر آتا۔ منصب داروں اور جمعداروں وغیرا وغیرا کے ہاتیوں کا غول، جن پر عماریاں اور ہودے وغیرا کسے ہوتے تھے شانے سے شانا چھلتا آگے بڑا چلا جاتا تھا۔ ایک ہزار کے قریب مختلف قسم کے گھوڑے اپنی ناپوں کی آواز سے شور مچاتے گزر جاتے تھے۔ ان کے عقب میں ایک دوسرا فیل نشان مجمع کو چیرتا پھاڑتا چلا آتا تھا، جس کے جلو میں گیتا شی بیرقوں کے ساتھ، اعد جنگ کی دیڑھ ہزار جمعیت بن شامتق تہار جنگ جمعدار، عبداللہ علی خاں مدیر جنگ، شیخ احمد علی خان عبادی بیربار جنگ عمر بن جان باز جنگ بن محفوظ بن طیران، سلطان غالب علی عبداللہ، عبداللہ بن مبارک۔ اور سید صالح وغیرا نامی سارے جمعداروں کے پانچ ہزار عروب عربی بولیوں (رجز) سے آسمان سر پہ اٹھائے رہتے تھے۔ ان کے بعد مشہور فرانسیسی جنرل موسیو ریموں ارثر را الدونا کی تین ہزار کے قریب فرانسیسی فوج، نئے نئے آلات حرب اور نئے قوانین کے ساتھ آراستا پیراستا فوج،

نادعلی بیگ کی سرکردگی میں اور ایک ہزاری بخشی اسماعیل خاں، غلام مرتضا خاں کمندان، جوگین صاحب فرنگی، ملکوٹ صاحب فرنگی، پاپیا کمندان، کپتان صاحب فرنگی اور ہیرالال صاحب کمندان کے سپاہی گزرتے تھے اور اس کے بعد یانو لون صاحب فرنگی اور ایک سو حسین صاحب کمندان کے سپاہی اپنے اپنے ہتھیاروں سے لیس گزرتے تھے۔ کم و بیش اس طرح پچاس ہزار کے لگ بھگ جمعیت کا سیلاب گرد و خاک اڑاتا آہستہ آہستہ گزرتا تھا۔ ان کے پیچھے شیر بچوں اور جزایر برداروں کا یانو کے قریب رسالا آتا، جن کے ہاتھوں میں بھالے، بلم، برچھے اور دوسرے ہتھیار ہوتے تھے۔ یہ انسانی سیلاب اس وحشت ناکی کے ساتھ ٹوٹ پڑتا تھا کہ دیکھنے والوں کے ہوش و حواس گم ہو جاتے رہتے۔ بدتمیزیوں کا یہ طوفان ابھی گزرنے بھی نہ پاتا تھا کہ ظفر الدولا، محمد سلیمان و فرحت لنگر کمندان کے ایک ہزار کے قریب جوان تیزی کے ساتھ بڑھے چلے آتے تھے، جن کی قرابینوں اور دوسرے آلات حرب کی چمک دمک سے برقی کی تابندگی کا دھوکا ہوتا تھا، ان کے پیچھے بارا ہاتی حوضوں میں نوبت اور نقارے لیے لنگر کی شان و شوکت میں اضافے کا باعث بنتے تھے۔ قرناتی۔ فیقری۔ جھانج اور داموں کا شور جب آسمانوں کی طرف گزر جاتا تو ان کے بعد مرثیا خانوں، نقارچیوں، اور شہنائیوں کی صدائیں فضائے بسیط میں گونج اٹھتی تھیں۔ ان کے پیچھے بیس بڑے بڑے ہاتھیوں کی ایک اور سنگین متحرک دیوار مخملی جھولیں سجائی تماشائیوں کے دلوں پر اپنا رعب داب بٹھاتی تھی۔ ان کے عقب میں شامیانا آتا تھا جس کے آگے آگے رام ہزاری اور جگ لال سنگ ہزاری، اور روپ چند ہزاری کے دو ہزار پور بیٹھے ہوتے تھے جو حضور پر نور کی سلامتی کے بھجن گاتے جاتے تھے، اور انکے ہاتھوں میں طلائی نقرئی علم ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اکثر روشن چوکی اور باجتریاں (بجنتریاں) بجاتے جاتے تھے۔ ان کا لباس بھی خاص ہوتا تھا۔ یعنی یہ سب سپاہی گیروے رنگ کے کپڑے پہنتے تھے اور پیشانیوں پر کوکمے سے ٹیوی لگاتے تھے۔

اس غول بیابانی کے گزرنے کے بعد ایک اور شامیانا آتا تھا، اس کا سرکردا، علی قلی خان کمندان اوران کے دو ہزار فوجی ہوتے تھے۔ علی قلی خاں اپنے ہات میں "حضور پر نور" کی سلامتی کا علم آگے آگے رہتے اور ان کے پیچھے ان کی سپاہ کا تانتا بندا ہوتا تھا۔ جن کی ہاتھوں میں رنگ برنگ کی کشتیاں ہوتی تھیں، جن میں خاتشی کی دھنیاں ہوتی تھیں اور نذروں کا زر نقد بھی ہوتا تھا۔ پھر ایک ایسا تماشا نظروں کے سامنے سے گزرتا جو عجیب و غریب نوعیت کا ہوتا، اور آنکھوں کو خیرہ کیے دیتا تھا۔ یعنی ایک ہزار کے قریب عود و عبیر اور صندل سے معطر سنی کی ٹھلیاں ہوتی تھیں جن میں مصری اور گلاب سے بنایا ہوا شربت ہوتا اور چینی کے سرسبز و سرخ نقیش کے کپڑوں سے جگ مگ جگ مگ کرتے رہتے تھے یہ کچ ایسا دلفریب نظارا دکھاتیں، جن کا کیف دیکھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان تیرکات کے بعد رحیم الدولا خان سامان کی سرکاری سبز عاری ہوتی، ان کے پیچھے جھانج نوازوں اور نقاروں کے ہاتی نکلتے تھے۔ یہ جلوس دوپہر سے شروع ہوتا، اور آتش بازی اور ہوائیاں چھوڑتا مغرب کے بعد ختم ہوتا تھا عوام سنگر کے گزرنے کو "مل لگنا" کہتے تھے۔ اس جلوس کے اہتمام کے لئے دو سو چوبدار اور دو سو ہرکارے مامور تھے۔ لنگر کے وقت احتشام الملک عرض بیگی، حضور پر نور، کی برآمد کے نیچے کھڑے ہوئے حالات کی خبر گیری کیا کرتے تھے۔ سب سے آخر میں اقربائے سرکار، صاحبزادوں اور مرشدزادوں کا لنگر بھی آیا کرتے تھے۔ یہ لوگ چونکہ اقربائے سرکار سے تھے، اس لیے سب ہی سرکاری پیلے رنگ کی دستاریں پہنے رہتے تھے۔

[illegible] اور [illegible] سرکردگی [illegible] اور مرشدزادہ [illegible] احمد علی خاں، سطوت خگ کرتے تھے۔

تقریباً ایک ہزار کے قریب صاحب زادے یا پیادا جاتے تھے، جن کے آگے سلوت جنگ بہادر ہوتے تھے۔ سلوت جنگ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ولایت جنگ مرشد زادوں کے لنگر کی قیادت کرتے تھے، اور یہ سلسلہ نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کے حکم سے لنگر کے بند ہونے تک رہا۔"

"لنگر کے روز حکومت کی طرف سے یا حاکم وقت کی جانب سے کوئی دعوت یا اسٹیٹ ڈنر وغیرہ تو نہیں ہوا کرتا تھا، مگر کنگ کوٹھی مبارک میں شاہی خاندان کے تمام افراد کے لیے ایک پرتکلف دعوت ضرور ہوا کرتی تھی، جس میں قبولی اور دودھ اور مصری کا شربت بھی ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ، بعض امراء، جاگیرداروں، منصب داروں اور جمعداروں کے گھروں میں لنگر کی یادگار کے طور پر خصوصی ضیافتیں ہوا کرتیں، جن میں مختلف قسم کے کھانوں کے علاوہ دودھ اور مصری کا شربت ضرور ہوا کرتا تھا۔

دختر فاروقی نے اورنگ زیب کے مشہور اور تاریخی لنگر کا نقشہ کھینچا ہے وہ اصل میں حضور نظام نواب سکندر جاہ بہادر، ناصر الدولہ بہادر، اور افضل الدولہ بہادر کے دور حکومت کا لنگر ہے۔ حضور نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس اور حضور نظام میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے دور حکومت کے لنگر کا نقشہ اس سے کچھ تھوڑا سا مختلف ہے۔ حضور نظام میر محبوب علی خان کا انتقال ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ ان کی زندگی کے دور کا لنگر ہم نے بھی دیکھا ہے۔ گھر کے بزرگین ہمیں ساتھ لے جاکر دکھایا کرتے تھے، مگر اس وقت کے لنگر کا حال کچھ یاد نہیں۔ اپنے باپ محبوب علی خاں کے انتقال کے فوراً بعد یعنی ۱۹۱۱ء میں میر عثمان علی خاں گدی نشین ہو گئے تھے، چنانچہ ان کے دور حکومت کے پہلے لنگر کو بھی ہم نے دیکھا ہے۔ ۱۹۱۱ء ہی میں ہمارے والد محترم محمد رازدار خان صاحب بوزنی منصب دیوانی اور جمعدار حرف خاص کا فالج کے عارضے سے انتقال ہو گیا تھا۔ ہمارے سگے ماموں جو عمر میں ہم سے بہت بڑے تھے۔ ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد یہ پہلا لنگر تھا اس لیے ہم سے اپنے ماموں سے ضد کی کہ وہ اپنے ساتھ لے جاکر لنگر دکھالے آئیں۔ ہمارے ماموں بڑے ہی غصیلے آدمی تھے، اس کے باوجود انہوں نے اپنے بھانجے کی درخواست قبول کرلی، اور ہمیں اپنے ساتھ لنگر دکھانے شہر لے گئے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بارہ بجے سے پہلے ہی ہم دونوں پیدل ہی پہنچ گئے تھے، اور وہیں ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔ مجمع آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو پولیس مجمع کو قابو میں رکھنے کی خاطر بار بار آگے سے پیچھے ہٹاتی اور اگر یہ سیلاب پھر سے آگے بڑھتا تو پولیس اپنے لانبے لانبے ڈنڈوں سے مجمع کو پیچھے دھکیلتی تھی۔ لنگر ایک بجے شروع ہوا۔ نئے نظام کو سلامی دے کر پیچھے گئی آنے تک تقریباً پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے، ایسے میں سب سے پہلے ہم نے دیکھا کہ ایک گورا چٹا فوجی عہدے دار گھوڑے پر بیٹھے سامنے سے گزر رہا ہے، اور اس کے پیچھے فوجی سپاہی جا رہے ہیں۔ ہم نے اپنے ماموں سے دریافت کیا کہ سب سے پہلے جو گزرے ہیں کون عہدیدار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "یہ افسر جنگ بہادر ہیں، اور سپاہ السالار افواج آصفی ہیں، اور یہ ان کی باقاعدہ فوج ہے جو سلسلہ سے گزر رہی ہے۔" ایسے میں مجمع نے پھر سے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور پولیس نے اپنے ڈنڈوں سے پیچھے دھکیلنا شروع کیا تو پولیس اسی ہڑبونگ میں ہماری نئی شیروانی کو لاٹو پی سر سے نیچے گر گئی، اور ہم نے ماموں سے روتے ہوئے کہا "ماموں ماموں۔ ہماری نئی ٹوپی سر سے نیچے گر گئی ہے۔ آپ اس کو جلد اٹھا لیجیے ورنہ خراب ہو جائے گی۔" یہ سن کر ماموں نے ایسی زوردار ڈانٹ پلائی "ابے چپ بھی رہ کیا کیا ہے ٹوپی۔ ٹوپی۔ مجمع کی ہڑبونگ سے یہاں ہمارے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ تیری ٹوپی کہاں سے اٹھا لائیں، دومت۔ کل ہی شہر لے

آن کر مجکو نئی ٹوپی دلا دیں گے" اس کے بعد ہم بھی چپکے ہو رہے۔ اور لنگر دیکھنا شروع کیا۔ اس سال کے بعد بھی ہر سال ہم لنگر برابر دیکھا کرتے تھے، چنانچہ اس لنگر کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے نواب افسر جنگ افسر الملک بہادر سپاہ سالار افواج آصفی ہوا کرتے تھے اور ان کے پیچھے باقاعدہ اور بے قاعدہ فوج ہوتی تھی جس کی سرکردگی، کرنل، کپتان اور کمندان کرتے تھے۔ اس کے بعد صرف خاص یعنی حضور نظام کی ضد اپنی فوج گزرتی تھی، جس کی کمان ایک کرنل اداس کے پیچھے کپتان ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد ہر سہ پایگاہ کی افواج ہوتی تھیں۔ اس کے بعد عروب اور جمعداروں کا سلسلہ ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا غالباً حضور نظام افضل الدولا کے دور کے لنگر میں انہیں بڑے جمعداروں کے سلسلے میں میر علی خاں جمعدار اور جاگیردار کا اکلوتا حسین لڑکا افضل خان جمعدار اور جاگیردار بھی ۵ محرم کو لنگر میں سے گزر رہا تھا، جس پر آسمان جاہ کی لڑکی رحیم النسا کی اچانک نظر پڑ گئی اور وہ اس کے حسن دلفریب کی گھائل ہو گئی۔ یہی وہ یادگار لنگر تھا جس نے ایک عاشق صادق کے دل میں عشق کی چنگاری سلگادی، جو آگے چل کر شعلوں کی شکل میں بھڑک اٹھی۔ اور آخر کار "رحیم النساء افضل خان" رشتۂ مناکحت میں منسلک ہو کر رہے۔ دیکھ لیا آپ نے کہ ہم نے اپنے اس معرکا آرا اور بے نظیر مقدمے میں حیدرآباد کے مشہور اور یادگار محرم اور سو فی صدی تاریخی و آقتے لنگر کو کس لئے بیان کیا، محض اس لئے کہ ایک تحقیق پسند حیدرآبادی کے ہم یہ بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ محرم اور لنگر دونوں لازم و ملزوم ہیں یعنی اگر حیدرآباد کے محرم کا حال و احوال بیان کیا جائے تو لنگر کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اگر حیدرآباد کے تاریخی اور یادگار لنگر کا ذکر کیا جائے تو محرم کی اہمیت کو کسی طرح بھی بھلایا نہیں جا سکتا، چنانچہ اسی وجہ سے اور اسی بنا پر ہم نے ناول "شہزادی کا رومان" کے پس منظر BACKGROUND کو اجاگر کرنے یا اچھالنے کی خاطر اتنی زحمت گوارا کی کہ اس سلسلے میں بکھوریل حیدرآباد اور "ہندستانی ادب" کی ایک جلد سے یہ سارا ضروری مواد فراہم کر کے دوسروں تک اور اپنے قارئین میں پیش کر دیا، اس نوبت پر ہم پورے وثوق کے ساتھ اور پوری قوت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ واقعی یہ بے نظیر اور لاجواب اور معرکا آرا مقدمہ لکھ کر ہم نے ایک یادگار اور تاریخی ناول "شہزادی کا رومان" میں مزید روح بھر دی، اور جان بھی ڈال دی ہے، نیز اس ناول کو با معنی اور با مقصد بھی ثابت کر دیا ہے۔

جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا)

ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

۹۹۔ اے، اعظم پورا مشرقی حیدرآباد۔ آندھرا پردیش۔ انڈیا۔

فرزند

عالی جناب رازدار خان یوزئی (مرحوم) منصبدار و جمعدار حکومت حیدرآباد

پہلی اکتوبر ۱۹۷۲ء ۱۳۸۲ف

شہزادی کا رومان

رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA

کو ہم اپنے والد محترم

عالی جناب محمد رازدار خان صاحب بوزئی (مرحوم) جمعدار اور منصبدار

AALIJANAB MOHD. RAZDAR KHAN SAHEB BOZAI (LATE)
MANSABOAR AND JAMADAR

کے نام نامی پر **معنون** کرتے ہیں۔

DEDICATE

رحیم النساؤ کے عشق کی داستان، ہمارے والد بزرگوار کی عشق کی داستان سے ہو فی صد طریقے پر پوری پوری اترتی اور منطبق ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ رحیم النسا نے لنگر میں ایک حسین نوجوان گھوڑے سوار کو دیکھ کر اپنا دل دیدیا تھا اور آگے چل کر اسی نوجوان سے رحیم النسا کی شادی ہو گئی اور ہمارے والد نے شادی کی ایک تقریب میں اتفاقی طور پر ایک حسین خاندانی لڑکی کو دیکھ کر اپنا دل دے دیا تھا، جس سے آگے چل کر ان کی شادی بھی اسی لڑکی سے ہوئی، نیز عجیب اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان دونوں کی عشقیہ داستانوں کا زمانا بھی بلکل ایک تھا، اور دونوں ہی شہر حیدرآباد میں رہتے تھے اسی لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے بہتر انتساب کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔!

جی - ام - خان فرزند رازدار خان صاحب بوزئی (مرحوم) ام - اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب" ۹۹ - اے، اعظم پورا شرقی - حیدرآباد ۲۶ - آندھرا پردیش - انڈیا۔

شہزادی کا رومان

رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA

کے کردار

CHARACTERS

(۱) **حضور نظام نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس** سلطنت حیدرآباد کے حکمران، اور نواب آسمان جاہ کے برادر نسبتی یا سالے، اور رحیم النسا بیگم کے سگے ماموں۔

(۲) **نواب آسمان جاہ بہادر** امیر کبیر اور امیر پائیگاہ، ریاست حیدرآباد، رحیم النسا بیگم کے باپ۔

(۳) **رحیم النسا بیگم** نواب آسمان جاہ بہادر کی تعلیم یافتہ نوجوان اور حسین لڑکی اور اس دلچسپ ناول کی ہیروئین HEROINE۔

(۴) **افضل خان** حیدرآباد کے ایک بڑے جاگیردار میر علی خاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ (لندن پلٹ) لڑکا، اور اس ہنگامہ خیز ناول کا ہیرو HERO۔

(۵) **میر علی خان** حیدرآباد کے ایک بڑے جاگیردار اور اس سرکا آما ناتوں کے ہیرو افضل خان کا باپ، اور نواب آسمان جاہ بہادر امیر پائیگاہ کا دوست بھی ہے۔

(۶) **کریم الدین** کوتوال شہر حیدرآباد یا پولیس کمشنر حیدرآباد۔

(۷) **روب لا** ، مددگار کوتوال یا اسسٹنٹ پولیس کمشنر حیدرآباد۔

(۸) انسپکٹر ان پولیس اور سب انسپکٹر ان پولیس حیدرآباد
(۹) جوانان پولیس یا پولیس کانسٹیبلس آف حیدرآباد
(۱۰) چارمینار پولیس اسٹیشن کے دو روہیلا پولیس کانسٹیبلس، رحمت خان اور امیر خان، جنہوں نے آسمان جاہ کی دیوڑی کے دو ماماؤں کے ساتھ رحیم النسا کا زیور حاصل کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

(۱۱) نواب آسمان جاہ بہادر کی دیوڑی کی دو ملازم مامائیں، جو رحیم النسا کی پیشی میں (۲۴) گھنٹے رہتی تھیں، جن کو بڑی ماما جی اور چھوٹی ماما جی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ دو روہیلا سپاہیوں، احمد خان اور امیر خان کے ورغلانے ہی سے ان دونوں ماماؤں نے رحیم النسا سے کئی ہزار روپے کے زیورات لاکر ان ہی بدمعاش جوانوں کو دیے۔

(۱۲) **عبدالقادر** نواب آسمان جاہ بہادر کی پیشی کا خاص ملازم، جو (۲۴) گھنٹے دیوڑی ہی میں رہتا تھا، اور نواب صاحب کی خدمت بھی کرتا تھا۔ اپنے اس ملازم پر آسمان جاہ کو پورا بھروسا اور اعتماد تھا۔ لیکن ہزاروں روپے کے لالچ میں اس ظالم اور بدمعاش ملازم نے دیوڑی کی، دونوں ماماؤں کو اپنا ہم خیال بنا کر شہر کی ایک دوکان سے عالا درجے کی مٹھائی خریدی اور اس میں بڑی مقدار میں افیون گھول کر ملا دی۔ عبدالقادر بھیس اختیار کیا اور دیوڑی ہی کی عالا درجے کی کشتیوں میں مٹھائی رکھ کر ان ماماؤں کے ساتھ رحیم النسا کے محل میں گیا اور یہ بیان کیا کہ یہ مٹھائی نواب افضل خاں مرحوم نے آپ کے لیے بھجوائی ہے اور یہ تاکید ہے کہ یہ ساری مٹھائی آپ خود ہی کھائیں، اور کسی دوسرے کو نہ دیں رحیم النسا نے وہ مٹھائی خوشی سے قبول کی، اور مٹھائی لانے والی مصنوعی عورت کو بھاری انعام سے نوازا اور وہ مٹھائی خود ہی کھائی، چونکہ اس مٹھائی میں بہت زیادہ افیون ملی ہوئی تھی اس لیے ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ بیکل ہی بے سدھ اور بے ہوش ہوگئی، اس کا گورا جسم نیلگوں ہوگیا، آنکھیں پھٹی پھٹی بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں اور اس کے منہ سے کف یا جھاگ مسلسل بہہ رہا تھا ـــــ اس کے بعد اس معصوم اور حسین لڑکی پر کیا گزری، اور نمک حرام عبدالقادر کا کیا حشر ہوا اور سب سے بڑھ کر اس لڑکی کے ضعیف باپ پر کیا گزری ـــــ یہ سب کچھ آپ واقعی اس لاجواب، بے نظیر، اور نہایت ہی دلچسپ ناول میں پڑھئے۔!

(۱۳) **میر فراز علی** شہر حیدرآباد کا مشہور عامل، اور رمال، جس نے رحیم النسا کے بھیانک خواب کی تعبیر بیان کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے، اور خوب خوب ہی پیسا بٹورا ہے۔

(۱۴) افضل خاں کے گھر کا پرانا دار، جس نے پیٹ بھر کر کے عبدالقادر اور ان دونوں ماماؤں کو افضل خاں کا ایک فوٹو دیا تھا، جو رحیم النسا کے سامنے یہ کہتے ہوئے پیش کیا تھا کہ مرحوم افضل خاں نے یہ فوٹو اس کے لیے خاص طور پر روانہ کیا ہے جس کو دیکھتے ہی رحیم النسا خوشی سے اچھل پڑی اور فوٹو کو اپنے سینے سے لگا لیا، اور وہ اس کو بار بار چومتی رہی

(۱۵) **اے - پی - پاول A.P.POWELL** ریزیڈنٹ حیدرآباد اور آسمان جاہ کا دوست۔

(۱۶) **مس اڈنا کرک پٹرک MISS EDNA KIRKPATRICK**

ایک انگریز جوان لیڈی ڈاکٹر جو لندن میں افضل خاں کی ہم جماعت تھی۔ ان دونوں میں بہت گہری دوستی تھی اور افضل خاں نے اس کی بہت زیادہ مالی مدد کی تھی۔ افضل خاں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے کئی بار شادی کرنے کا وعدہ بھی کیا، مگر تعلیم ختم ہونے کے بعد بھی وہ وعدہ پورا نہ کیا، بلکہ یہ کہتے ہوئے افضل خاں کو اپنے وطن حیدرآباد لوٹا دیا کہ لندن میں دو ایک سال ڈاکٹری کی پریکٹس کرنے کے بعد وہ حیدرآباد آ کر وہاں اس سے ضرور بضرور شادی کرے گی۔ اسی بنا پر افضل خاں حیدرآباد واپس آگیا، اور ان دونوں میں برابر خط کتابت ہوتی رہی، اور وہاں اس نے لندن کے ایک مشہور بیرسٹر دلیر سے شادی کر لی اور اس سے ایک بچا بھی پیدا ہوگیا، جس کا علم افضل خاں کو مطلق نہ ہوسکا۔ ایک سال بعد وہ لڑکی سے طلاق [illegible] یہ بچا عورت بچے کو باپ کے حوالے کر کے

حیدرآباد دہلی آئی۔ یہاں بھی افضل خان نے اس کی مدد کی۔ اس کو ایک کرائے کا مکان دلایا، اور سواری کے لئے بگی دلائی اپنے عزیز اقربا اور دوست احباب میں یہ حیثیت لیڈی ڈاکٹر تعارف بھی کرایا۔ یہاں تک کہ جاگیرداروں، امرا اور پائیگاہ والوں کی دیوڑیوں میں تک وہ جانے لگی اور آسمان جاہ کے گھر کی وہ ہاوزسرجن بن گئی، اس کے باوجود اس نے افضل خان سے شادی نہیں کی، اور ہمیشہ ہی آج کل آج کل کہہ کر ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ ایسے میں رحیم النسا کی زہر خورانی کا خطرناک و واقعہ بھی پیش آگیا۔ چنانچہ نواب آسمان جاہ نے اس کی خدمات حاصل کیں۔ رحیم النسا سے بھی اس کی دوستی تھی، اس لیے وہ علاج کی خاطر دیوڑھی ہی میں رہ گئی۔ افیون کے خطرناک اور زہریلے اور جان لیوا اثرات کو دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہوگئی تھی، مگر ڈٹ کر علاج کیا اور ۴، ۶ روز میں زہر کے اثرات کو بالکل ہی زائل کر دیا، اور رحیم النسا پہلے کی طرح صحت مند اور بھلی چنگی ہوگئی جس سے آسمان جاہ بہادر بے حد خوش ہوئے، اور اس کو بہت کچھ نوازا اور سرفراز کیا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ یہ مٹھائی افضل خان نے بھجوائی تھی، اور رحیم النسا اور افضل خان دونوں سے عشق کرتے ہیں تو اس وقت سے افضل خان کی سخت ترین دشمن بن گئی، اور زہر خورانی کے سلسلے میں اس کو موت کی سزا دلوانے پر کس طرح تل گئی، اس کی تفصیل اس تاریخی اور یادگار ناول میں باب چھ ہی ملاحظہ فرمایئے۔

(۱۷) لیڈی بیٹرس بوائیس LADY BEATRICE BOYCE

برائٹین، انگلینڈ کی رہنے والی اور مس کرک پیٹرک کی چچا زاد ہے۔

(۱۸) وبسٹر WEBSTER

لندن کا مشہور بیرسٹر اور مس کرک پیٹرک کا شوہر ہے، جس سے کرک پیٹرک نے صرف ایک ہی سال میں طلاق حاصل کر کے اور بچا اس کے حوالے کر کے افضل خاں کے ہاں حیدرآباد دہلی آئی تھی۔

(۱۹) کرنل اے۔ آر۔ رچرڈسن COL. A.R. RICHARDSON

سکندرآباد کی فوج کا ایک مشہور کرنل، جو آسمان جاہ کا دوست ہے، اور آسمان جاہ کے گھر پر دعوتیں کھاتا ہے۔ چنانچہ آسمان جاہ کی لڑکی، کی مزاج پرسی کی غرض سے جب آیا تھا تو اس نے نواب صاحب کو بار بار مجبور کیا کہ لڑکی کی صحت یابی کی خوشی میں ایک گرانڈ پارٹی ہونی چاہیئے، اور جب آسمان جاہ نے گرانڈ پارٹی دینے کا وعدہ کیا تو گھر واپس گیا۔

(۲۰) سکندر علی

عدالت حیدرآباد کا ناظم اول یا فرسٹ کلاس مجسٹریٹ، جو داڑھیال اور مذہبی بھی ہے۔ رحیم النسا کے زہر خورانی کے کیس کے سلسلے میں کوتوال شہر سید کریم الدین کے ساتھ رحیم النسا کا بیان لینے آیا تھا اس سلسلے میں اس کی ملاقات مس کرک پیٹرک سے ہوئی تو وہ اس کے حسن کا دیوانا ہوگیا۔ افضل خاں سے بدلا لینے کی خاطر جب تنہائی میں کرک پیٹرک نے مجسٹریٹ سے ملاقات کی تو اس نے کھلے طور پر کہدیا کہ اگر تم مجھ سے شادی کا وعدہ کرو تو میں افضل خان کو موت کی سزا دیتا ہوں ـــ بہرحال اس کے بعد مجسٹریٹ اور کرک پیٹرک کا جو بھی برا انجام ہوا اس کو آپ اس تاریخی ناول میں پڑھیے۔

(۲۱)

مس کرک پیٹرک کے ماں باپ، جو اپنا وطن برائٹین (انگلینڈ) چھوڑ کر نیویارک شہر (امریکا) میں مستقل طور پر رہ بس گئے، جو یہ چاہتے تھے ان کی لڑکی کرک پیٹرک بھی وہیں چلی آئے مگر اس نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا۔

(۲۲)

نواب آسمان جاہ بہادر کے محل کے دوسرے مرد، عورت ملازم اور ادارے وغیرہ جو ہمیشہ دیوڑھی میں ہی رہا کرتے تھے۔

(۲۳)

رحیم النسا کی ان گنت سہیلیاں، اور عزیز رشتے دار لڑکیاں، جو روزانہ اس سے ملنے آجایا کرتی تھیں۔

(۲۴) ولایت حسین

ممبر یا سکریٹری اسٹیٹ آف پائیگاہ SCRETARY ESTATE OF PAIGAH جو اسٹیٹ کے سلسلے میں تمام امور کی نگرانی اور دیکھ بھال

کرتا تھا، اور ہر کام امیر یا لیگاہ نواب آسمان جاہ بہادر کی منظوری کے بعد انجام دیتا تھا۔ دیوڑی کے ایک حصے میں اس کا اپنا باقاعدہ دفتر تھا، جس میں پچاسوں ملازم تھے۔ جن کو ہر مہینا اسٹیٹ یا لیگاہ سے تنخواہ ملا کرتی تھی۔

(۲۵) نگیندر بہادر ایک کایست نوجوان، انگریزی عالا تعلیم یافتہ شخص جو حکومت حیدرآباد کی طرف سے نواب آسمان جاہ بہادر صدر نشین یا چیئرمین مشاورتی کمیٹی، اور وزیر عدلیہ اور آگے چل کر وزیر اعظم یا پرائم منسٹر آف حیدرآباد کا سکریٹری یا پی۔ اے تھا۔ دیوڑی کے ایک حصے میں اس کا اپنا الگ دفتر تھا اور اس کے تحت کئی ایک انگریزی تعلیم یافتہ ملازم تھے جن کی تنخواہ خزانۂ عامرہ ہی سے ملا کرتی تھی۔ تمام سرکاری امور میں اگر کوئی شخص نواب آسمان جاہ بہادر سے ملنا چاہتا تو بغیر P.A. کی اجازت کے نہیں مل سکتا تھا۔ نواب آسمان جاہ بہادر اپنے خانگی اسٹیٹ کے معتمد اور اس سرکاری P.A. دونوں سے بھی نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتے تھے۔

دنیائے ناول میں یہ جدت واقعی ہماری "ذہانت طبع کا ثبوت ہے۔"

انگریزی، فرانسیسی، اور ہندستانی زبانوں میں، نیز دنیا کی متعدد زبانوں میں اب تک لاکھوں، بلکہ کروڑوں ہی ناول لکھے گئے ہیں، لیکن کسی بھی ناول نگار نے اپنے ناول کے شروع میں کرداروں یا CHARACTERS کی فہرست نہیں دی اور نہ ہی اہم کرداروں کے ناول کا خاکا کھینچا ہے، یہ شکل ڈراما میں ہوتی ہے، اور ہر ڈرامہ نگار، اپنے ڈراما کے کرداروں کے پورے نام ایک مکمل فہرست کی شکل میں سب سے پہلے پیش کرتا ہے، نیز اہم کرداروں کے رول کا پورا پورا خاکا بھی کھینچ دیتا ہے۔ اس کی ابتدا آج سے چار سو سال پہلے مشہور زمانا انگریز ڈراما نگار ولیم شکسپیئر WILLIAM SHKESPEAR نے کی تھی، جس کی تتبع یا تقلید بعد کے سب ڈراما نگاروں نے کی ہے۔

ہم نے ڈراما کے اس زرین اور بہتر اصول کو پیش رکھتے ہوئے

شہزادی کا رومان۔ رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA میں پہلی بار تمام کرداروں یا CHARCTERS کی مکمل فہرست دی ہے اور بعض کرداروں کے رول کو مختصر طور پر بتا دیا ہے۔ ہمارے اس

اس انوکھی جدت کی تقلید، آیندہ ہر ناول نگار کو کرنی چاہیے، اس لیے کہ اس بہتر اور مفید طریقے پر عمل کرنے سے ڈرامہ کی طرح ناول کا بھی پورا خاکا یا PLOT قاری یا ناول کے پڑھنے والے کے سامنے آئینے کی طرح صاف آجاتا ہے، جس سے ناول پڑھنے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اور ناول کا سارا پلاٹ آسانی سے سمجھ میں بھی آجاتا ہے!

ناول کے سلسلے میں، ہماری یہ انوکھی اور مفید جدت عام طور پر ناول نگاروں کے لیے، پہلی ہی نظر میں، شاید قابل قبول نہ ہو، اس لیے کہ دنیا کی کسی بھی زبان میں آج تک ناول کے شروع میں کرداروں کی مکمل فہرست دینے کا طریقہ نہیں آیا ہے، اور غالباً اسی وجہ سے تمام ناول نگاروں کو ہماری یہ جدت ایک حد تک قابل اعتراض بھی ہو، اور وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں ناول نگاری جب سے شروع ہوئی ہے، دنیا کے کسی بھی ملک یا حصے میں اور دنیا کے کسی بھی زبان کے ناول میں، ڈرامے کی طرح کرداروں کی مکمل فہرست دینے کا طریقہ یا رواج نہیں رہا ہے، اس لیے اب سینکڑوں سال بعد ہم اس انوکھے طریقے کو کیوں قبول کریں!

ہمارے نزدیک اس مشکوک اور مشتبہ اعتراض کا آسان اور صحیح جواب یہ ہے کہ اچھی چیز کی تقلید کرنا کوئی برائی نہیں ہے، بلکہ ہر حالت میں اور ہر نقطۂ نظر سے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ ہم نے کرداروں کی فہرست ناول میں لکھنے کی طرف جو توجہ دلائی ہے، اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے، اور انصاف سے کہا جائے کہ آیا ہماری یہ جدت اچھی ہے یا نہیں؟ کیوں نہیں — ؟ جب ڈرامے کے شروع میں کرداروں کی فہرست لکھنا ایک اچھا اور مستحسن فعل ہے تو پھر ناول کے شروع میں بھی کرداروں کی فہرست کا لکھنا لازمی طور پر ایک اچھا عمل ہے تو آیندہ ہر ناول نگار کو ہماری اس مفید تحریک پر ضرور

جی- آرنلڈ فرنانڈز ترجما جی ام- خان، ام-اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

شہزادی کا رومان

رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA

پہلی قسط

باب (۱)

اپنی ماں پرورش النساء بیگم کے اچانک مرنے کا رحیم النسا کے دل پر بہت گہرا صدمہ تھا، اسی لیئے اس کے باپ نواب آسمان جاہ بہادر، امیر پائیگاہ اور وزیر اعظم حیدرآباد نے اپنی چہیتی اور لاڈلی بیٹی کو دکھ درد اور کسی قسم کی آذیت اور مصیبت سے اس کے نئے دل کو الگ اور دور ہی رکھنے کی کوشش کرتے رہے، مگر عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ان کی ان ساری کوششوں کے باوجود تقریباً اٹھارا سال کے سن ہی میں اب دکھی شکل اختیار کرلی۔

یہ بلکل سچ ہے کہ اپنی ساری عمر میں رحیم النسا نے نہ کسی سے خط کتابت کی تھی، اور نہ ہی کسی غیر مرد کو دیکھا تھا، ماں کے مرنے کے بعد وہ اپنے پیارے باپ کی آغوش میں پلی اور بڑی ہوئی اس کو دیکھ کر جی خوش ہوتا تھا۔ باپ کی بے پناہ محبت کے باعث وہ اپنے پدر بزرگوار کی اس حد تک عزت اور عظمت کرتی تھی کہ اپنی مدتک اس نے اپنے باپ کو خدا کا مرتبہ دے رکھا تھا۔ اس کا باپ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، بلکہ شہر حیدرآباد کا امیر کبیر امیر پائیگاہ، اور حضور نظام افضل الدولہ کا اکلوتا اور دوسرے حضور نظام میر محبوب علی خاں کا سگا بہنوئی تھا۔ آسمان جاہ کے دوسرے دو بھائی بھی امیر پائیگاہ تھے، اس لحاظ سے اپنے عزیز قریب اور دوست احباب وغیرہ کا مقام بہت ہی بلند اور بالا تھا۔ یہ سب لوگ نواب آسمان جاہ سے ملنے جلنے ان کی [illegible]

کرتے تھے۔ لیکن ان تمام مصروفیتوں کے باوجود آسمان جاہ زیادہ تر وقت اپنی چہیتی اور ہر دلعزیز لڑکی رحیم النسا کی دلجوئی اور تشفی میں بھی صرف کرتے تھے کہ وہ ہمیشہ ہی خش و خرم رہے۔

آسمان جاہ نے اپنی حسین ترین اور حور وش بیٹی کی تعلیم اور تربیت مشرقی اور مغربی دونوں طرز پر کرکھی تھی انگریز گورنس تک اپنی صاحبزادی کی تعلیم اور تربیت کے لیے ملازم رکھی تھی، اس لیے رحیم النسا کو بچپن ہی سے انگریزی زبان پر عبور حاصل ہو گیا تھا۔ انتہا یہ کہ اپنی لڑکی کی انگریزی دانی سے خش ہو کر بسا اوقات خود آسمان جاہ بھی اس سے انگریزی ہی میں بات چیت کرتے اور بے حد مسرور ہوتے تھے۔ رحیم النسا خود بھی انگریزی میں بات چیت کرنے میں دلچسپی لیتی تھی، چنانچہ روزانہ صبح باپ جب پہلی بار اس کے محل میں داخل ہوتے تو بجائے "آداب عرض ہے ابا جان" کہنے کے وہ گڈ مارننگ فادر۔ Good morning Father - کہتے ہوئے فرط مسرت سے پھولے نہ سماتے تھے، چنانچہ باپ اور انگریز گورنس کی اس تربیت کا نتیجہ تھا کہ رحیم النسا مغربی اور مشرقی تہذیب کا بہترین سنگم اور نمونہ بن گئی تھی۔

آسمان جاہ نے اپنی لڑکی کے خش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، چنانچہ رحیم النسا کے محل کے کمروں کو قیمتی سے قیمتی ساز و سامان اور فرنیچر وغیرہ سے سجایا گیا تھا اور آرائش و زیبائش بھی کیا گیا تھا۔ فرش پر بڑے ہی قیمتی ایرانی قالین بچھے تھے، اور دروازوں اور دیواروں پر لاجواب کشمیری اور دوسرے ممالک کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے کمروں میں جو کوچ اور صوفے پڑے تھے، ان پر نہایت ہی بھڑکیلے اور قیمتی مخمل اور کمخاب کے چھوٹے بڑے تکیے بھی پڑے رہتے تھے تاکہ بیٹھنے اور لیٹنے میں حد سے زیادہ آرام محسوس ہو اس کے علاوہ چاندی کی کشتیوں میں پان سپاری اور عطر وغیرہ بھی ہر وقت مہیا رہتا تھا۔ صاحبزادی یہ چیزیں خود بھی استعمال کرتی تھی، اور جو لوگ اس سے ملنے آیا کرتے تھے انہیں بھی پیش کرتی تھی۔ اس کے کمرے کے ایک دوسرے حصے میں ایک شاندار الماری میں جڑاؤ اور لعل، زمرد، وغیرہ کے بیش قیمت گہنوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ رحیم النسا خود بھی روزانہ قیمتی قیمتی زیورات اور لاقیمت موتیوں کی مالائیں وغیرہ پہنے رہتی تھی۔ اسکے ہاتھ میں خالص سونے کی چوڑیاں اور دونوں ہاتوں پر بازو بند بھی ہوا کرتے تھے۔

صاحبزادی رحیم النسا کا ایک حسین نوجوان کے حسن بے پایاں سے گھایل ہونا

یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ حیدرآباد کے مشہور زنانا لنگر کے روز پانچویں محرم کو صاحبزادی رحیم النسا ایک حسین اور نہایت ہی خوبصورت جاگیردار کو گھوڑے سوار کے حسن بے پایاں کا شکار بن گئی، یعنی جب وہ نوجوان گھوڑے پر بیٹھے ان کے سامنے سے گزرا تو رحیم النسا اس کے حسن بے پایاں کی والا و شیدا ہو گئی، اور اس روز سے اس نوجوان کی تصویر صاحبزادی کے دل میں بس گئی تھی۔

لنگر کی حقیقت دیہاں پر ناموں کے بیان میں اختلاف معلوم ہوتا ہے

حیدرآباد کے لنگر کے متعلق روایت یہ ہے کہ ۱۵۹۱ء میں شہزادہ عبداللہ قطب شاہ فرزند قلی قطب شاہ شہر حیدرآباد سے گولکنڈہ کی طرف جا رہا تھا، اور اس کے ساتھ کئی ایک امرائے دربار اور دوسرے معزز شہری بھی تھے۔ شہزادے کا جلوس شکل سے شہر کے دروازے سے باہر ہوا تھا کہ اس کا ہاتی مست ہو گیا اور جلوسیوں پر حملا کر دیا۔ جلوسی سخت پریشان ہو کر اپنی اپنی جان بچانے کی خاطر جس طرف بھی بن پڑا بھاگ نکلے۔ اس کے بعد ہاتی نے فیلگل کی طرف رخ کیا اور بہت جلد ہاتی اور سوار شہزادہ دونوں بھی عوام کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ جب یہ افسوس ناک اطلاع شہزادے کی ماں کو گولکنڈے میں ملی تو اس نے پیروں اور بزرگ مرحوم ہستیوں سے یہ منت مانی کہ اگر میرا لڑکا صحی سلامت گھر آجائے گا تو میں ہاتی کے باندھنے کے برابر سونے کی زنجیر نواکر

بھی کھلاؤں گی۔ اتفاق کی بات ہے کہ کچھ عرصا بعد ۵ محرم کو شہزادہ صحی سلامت گھر واپس آ گیا، اور اس کی غریبا ماں نے جو وعدے کیے تھے، وہ پورا کیئے اور یہ رسم قطب شاہی دور تک باقی رہی، لیکن آصف جاہی دور میں اس کی شکل بدل گئی، وہ یہ کہ ۵ محرم کو ہر سال سلطنت آصفیا کی تمام باقاعدا اور بے قاعدا فوجوں کا جلوس نکلتا تھا، اور چارمینار سے متصل غربی جانب شاہی مکانات میں کے برآمدوں میں بیٹھ کر رئیس وقت سلامی لیا کرتے تھے، اور اس موقع پر حکومت کے امرا اور بڑے عہدے دار وغیرا بھی مختلف مقامات پر بیٹھے جلوس کا معاینا کیا کرتے تھے۔

سپاہ سالار سلطنت آصفیا کی سرکردگی میں باقاعدا فوج کے گزرنے کے بعد سٹی پولیس، دیہلا پولیس عرب پولیس، اپنے اپنے خاص یونیفارمس میں حضور والا کے سامنے سے گزرتی تھی۔ جب عرب پولیس گزرتی تو دف کے ساتھ عربی نعرے لگاتے اور آسمان کی طرف بندوقوں کے فائر کرتی ہوئی جاتی تھی۔ اس کے بعد اضلاع پولیس کا جلوس ہوتا تھا، اس کے بعد شہر یا سٹی کے بے قاعدا پولیس - برگیڈ - جنڈارمس - کاسٹکس اور ڈراگونس ہو گزرتے تھے۔ انھیں بعض بوٹ سٹال کرتے اور بعض ننگے پیر بھی ہوتے۔ اس کے بعد سری رسالا۔ نظام سرکار کا خاصہ کا یا شاہی یا ڈی گارڈ اور پیشکار سلطنت کا سکھ یا ڈی گارڈ ہوتے۔ اس کے بعد خد نظام سرکار کی صرف خاص کی فوج ہوتی۔ پھر ہر سر یا لیگاہ کی بے قاعدا فوج کا سلسلا ہوتا۔ آخر میں اونٹ سوار۔ خچر سوار اور خچر سوار اور سیکل سوار فوج کا تانتا بند ہوتا تھا۔ اس کے بعد بڑے بڑے امرائے سلطنت، جاگیر دار عماری یا ہودوں کے ساتھ ہاتیوں پر سوار حضور نظام کے سامنے سے گزرتے اور آخر میں بڑے چھوٹے جاگیر دار اور جمعدار، رنگ برنگ کے گھوڑوں پر سوار حضور والا کے سامنے سے گزرتے تھے۔

انھیں گھوڑے سواروں میں سے ایک جاگیر دار کا حسین ترین نوجوان لڑکا بھی تھا، جس کے حسن بے پایاں کو دیکھتے ہی، صاحبزادی رحیم النسا اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی اس تاریخی جنگ کے دیکھنے کے لئے حیدرآباد اور حیدرآباد سے باہر سے ہزاروں ہی آدمی ہر سال آیا کرتے تھے۔ لنگر گزرنے کے دو طرفا رستوں سے متصل مکانات اور بلکیاں وغیرا پہلے ہی سے حاصل کر لی جاتی تھیں، تاکہ شوقین لوگ اس میلے اور تماشے کا اطمینان کے ساتھ معاینا کر سکیں!

رحیم النسا ایک گھوڑے سوار کے حسن بے پایاں کا شکار بنتی ہے

رحیم النسا اپنے مکان کے بالاخانے میں بیٹھی اپنی چند خاص سہیلیوں کے ساتھ گھنٹوں سے لنگر کے گزرنے کا تماشا دیکھ رہی تھی، لیکن آخر میں جب وہ ایک حسین ترین گھوڑے سوار کے حسن بے مثال کی شکار بن گئی تو ایک دم اس کی حالت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ ایسے میں وہ اپنے مقام سے اٹھی اور اسکی سہیلیاں بھی اس کے ساتھ چل آئیں، اور وہ ایک آرام دہ کوچ پر جا کر دراز ہو گئی، اور اپنی دونوں ماماؤں یا ماما جی سے کہدیا کہ وہ یہاں سے چلی جائیں، اس لئے کہ وہ اس وقت آرام کے ساتھ تھوڑا وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے، چنانچے دونوں ماما ئیں چلی گئیں اور ادھر رحیم النسا اور اس کی سہیلیاں اس عجیب و غریب حادثے کی روداد میں مصروف ہو گئیں۔

رحیم النسا جس نوجوان کے حسن کا شکار بن گئی تھی، آگے چل کر پتا چلا کہ وہ حیدرآباد کے ایک مالدار، جاگیر دار اور جمعدار شخص میر علی خان کا لڑکا افضل خان تھا جس کا اثر رسوخ حیدرآباد کے معزز طبقوں میں بہت زیادا تھا، اور وہ نواب آسمان جاہ بہادر کا بھی دوست تھا، اور اکثر و بیشتر ان کی ڈیوڑی کو آیا جایا کرتا تھا اور کبھی کبھار اپنے لڑکے کو بھی ساتھ لایا کرتا تھا۔

بہرحال بے چاری رحیم النسا نہ صرف بلکے بہت بری طرح سے افضل خان کے حسن بے نظیر کا شکار بن گئی تھی۔ اس بارے میں کوئی شخص بھی اس پر الزام نہیں لگا سکتا، اس لئے کہ اچانک وہ ایسے نوجوان کے عشق میں مبتلا ہو گئی جس کے حسن لاجواب اور بے مثال کے چرچے چار دانگ عالم میں تھے۔ رحیم النسا بھی تو ایک انسان ہی تھی جو اپنے سینے میں دل رکھتی تھی اور اس کا وہی دل نازک احساسات طبعی افتضا خاصۂ حسن

بے پایاں کا شکار بن گیا تھا۔

رحیم النسا نے اپنے عشق کا راز کسی سے بھی بیان نہیں کیا صرف اس کی وہ سہیلی جانتی تھی جو اس وقت اس کے ساتھ بیٹھے لنگر دیکھ رہی تھی۔ گھر والوں سے بھی اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اپنے شفیق باپ سے بھی اس نے اشارتاً تک نہیں کہا۔ اس کی حالت دن بدن غیر ہوتی گئی۔ ایک روز باپ نے اس کی گرتی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ "ہاں ابا سرکار کبھی دنوں سے میں خود بھی اپنی حالت میں تغیر پاتی ہوں، طبیعت مدمز اسی رہتی ہے، اور سینے میں درد بھی رہتا ہے کبھی کبھی پریشانی سی لاحق ہو جاتی ہے اور میں وحشت سی محسوس کرنے لگتی ہوں۔ رات رات بھر جاگتی رہتی ہوں، اور صبح سویرے سوتی ہوں۔ دن چڑھے چل کر کہیں ماما جی آ کر اٹھاتی ہیں۔

باب (۲)

رحیم النسا جب کبھی اپنے بستر یا کوچ پر لیٹی رہتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ ایک معصوم حسن کا مجسمہ لیٹا ہوا ہے اس کے سونے کے وقت دو ماما میں اس کی نگرانی کے لیے متعین تھیں، جو ہمیشہ ہی صاحبزادی کے کمرے میں موجود رہتیں، اور اس وقت بھی وہ دونوں عورتیں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے بیٹھی تھیں اور یہ دونوں ہی بڑے ہی تجربہ کار عورتیں تھیں جو زمانے سے باہر کے حالات سے بھی بخوبی واقف تھیں۔ یہ عورتیں اگرچہ سخت قسم کی واقع ہوئی تھیں، لیکن صاحبزادی رحیم النسا کے سامنے یہ وہ نہایت ہی نرم دل اور اطاعت گزار ثابت ہوئیں، اس لیے کہ چوبیس گھنٹے وہ رحیم النسا کی اطاعت گزار بنی رہتی تھیں۔ جب کبھی صاحبزادی انھیں بعض خاص خاص چیزیں اور پیسے وغیرہ عنایت دیتی تو وہ دونوں عورتیں شکریے قبول کرنے کے بعد صاحبزادی کی بلائیں لیتیں اور شکر گزاری کے طور پر اس کے پیروں تک پر اپنا سر رکھ دیتیں ان دونوں کی رائے میں عورت مرد کی تابعدار تھی، اور عورت کا حسن مرد کے نظر سے [illegible] ہوگا اگر ہماری صاحبزادی نے کوئی خواب دیکھا ہے تو وہ

رحیم النسا کا حسن نے نظیر اور لاثانی تھا جو کسی بھی مرد کی زیادتیوں سے کملایا یا مرجھایا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ عورتیں صدر جا شکی واقع ہوئی تھیں، زندگی کے معمولی سے معمولی واقعے کو وہ آدمی کی تقدیر اور قسمت سے موسوم کرتی تھیں۔ اس لحاظ سے ان عورتوں کو جادو گری فال، اور رمل وغیرہ پر بھرپور اعتقاد تھا اور یہ دونوں ہمیشہ خوش بختی اور خوش قسمتی کے سلسلے میں فال اور رمل وغیرہ دکھوایا کرتی تھیں۔ بہرحال ان دونوں معمر اور جہاندیدہ عورتوں کا آسمان جاہ کے محل میں بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا اور ان دونوں کو دیوڑھی کا ہر شخص اور خود صاحبزادی ماما جی کہہ کر پکارتی تھی۔

اس روز رحیم النسا غیر معمولی طور پر دیر تک سو رہی اس لیے ان دونوں ماما جی کو بڑی پریشانی ہو گئی اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا صاحبزادی اب تک سو رہی ہے، دونوں نے اٹھ کر اس کے بستر کی طرف رخ کیا اور جھک کر دیکھا، ایسے میں صاحبزادی ہشیار ہو گئی اور آنکھ کھلتے ہی اس نے دریافت کیا — ماما جی! کیا میرے لیے کوئی آیا ہے؟ نہیں صاحبزادی! دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا، ہم تقریباً دو گھنٹے سے یہاں بیٹھے ہیں، اس عرصے میں تو کوئی بھی نہیں آیا، ہم اپنی صاحبزادی کی نگرانی کرتے بیٹھے ہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی بھی آن کر ہماری پیاری شہزادی کی نیند میں خلل انداز ہو! ماما جی کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی اور خواب کی حالت میں بڑبڑا تو نہیں رہی تھی؟

نہیں صاحبزادی! دو گھنٹے کی بھرپور نیند میں ہماری پیاری شہزادی نے ایک بار بھی زبان سے بکے نہیں کہا، اگر ہماری صاحبزادی نے کوئی خواب دیکھا ہے تو ہم دونوں سے کہہ دیجیے، تاکہ ہم اس کی کوئی اچھی تعبیر تلاش کریں۔ یہ تو عام بات ہے کہ ہر خواب کی ایک تعبیر ہوا کرتی ہے، جو کبھی بھلی اور کبھی بری بھی ہوتی ہے جس کا تعلق بری روحوں سے ہوا کرتا ہے۔ خواب کی تعبیر بعض وقت فال کھولنے والوں اور رملوں اور نجومیوں سے بھی کروائی جاتی ہے اور اس سلسلے میں ضرورت پڑے تو کچھ پیسے بھی خرچ کرنے پڑتے ہیں بہتر

پلودے کا پورا ہمیں سنائیے!

رحیم النسا نے تعجب کے ساتھ دریافت کیا؟

ماما جی! یہ بری روحیں کون بلا ہیں، جن کا ابھی ابھی تم نے ذکر کیا ہے؟

آپ یقین کیجئے، ہماری شہزادی، بری روحوں کا وجود ضرور ہے، اور ہم نے ان کے بارے میں بڑے بڑے لوگوں سے سنا ہے!

یہ روحیں کہاں رہتی ہیں، ماما جی، صاحبزادی نے دریافت کیا؟

صاحبزادی یہ نہ پوچھیے کہ وہ کہاں رہتی ہیں، مگر یہ صحیح اور سچ ہے کہ ان کا ٹھکانا خدا وند جل جلالہ ہے!

اچھا ماما جی یہ تو بتائیے کہ آیا وہ روحیں انسان کی طرح رہتی بستی ہیں، اور وہ ہماری طرح سانس لیتی اور کھاتی پیتی اور چلتی پھرتی ہیں؟

اس سلسلے میں ہم دونوں نے آپ کو بہت کچھ بتا دیا ہے اب بہتر یہ ہے کہ صاحبزادی آپ اپنا خواب ہم سے بیان کریں اور ہم غور کریں گے کہ آخر اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟

ان دونوں کے اصرار پر صاحبزادی رحیم النسا نے اپنا خواب کہہ سنایا اور یہ دونوں ماما جی نہایت ہی توجہ کے ساتھ خواب کو سنتی رہیں، اور سنا ہی اس نے وہ ساری باتیں جیسے بھی کہہ سنائی جو کسی شخص کے ساتھ خواب میں کی تھی۔ ماما جی خواب میں میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی میرے سینے کو دبا رہا ہے، اور اپنے سینے کو بتاتے ہوئے اس نے کہا، ماما جی، یہاں پر میرے سینے میں درد ہے، اور یہ دیکھ کر مجھ کو سخت وحشت اور پریشانی ہونے لگی کہ میرے کوچ کے داہنی طرف ایک سفید پوش آدمی کھڑا ہے اور بائیں جانب ایک سرخ پوش ہے۔ سفید پوش نے میرا ہاتھ پکڑا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت ہی نرم انداز میں محبت آمیز باتیں کیں اور اس نے کہا — رحیم النسا میں تمھاری بہن ہوں، مگر ماما جی میری تو کوئی بہن ہی نہیں تھی، پھر اس نے اپنے آپ کو میری بہن کیسے کہا؟ دوسرے سرخ پوش نے بھی میرا ہاتھ پکڑ کر پکڑ کر کہا، او صاحبزادی، میں بھی تیری بہن ہوں اور یہ بھی بہت دیر تک مجھ کو نصیحت کرتی رہی۔ ان دونوں کی لمبی چوڑی تقریروں کے بعد میں نے ان سے دریافت کیا، آیا آپ میرے لئے کوئی تحفے لے آئے ہیں؟ ان میں سے ایک نے جواب دیا، نہیں، ہم تمھارے لئے کوئی خاص تحفا نہیں لے آئے ہیں، مگر یہ لو، ایک پھل ہماری طرف سے قبول کرلو، اور اس کو کھا لو، اس پر میں نے کہا، نہیں، میں کوئی بھی چیز نہیں کھا سکتی، سوائے اس کے کہ میرے ابا سرکار کی بھیجی ہوئی چیزیں ہوں، اس پر ہم دونوں میں بہت دیر تک بحثا بحثی رہی اور آخر میں دونوں مجھے میری نظروں سے غائب ہو گئے، اور جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو کوچ پر لیٹے پایا۔ ہاں ماما جی اب آپ دونوں مل کر میرے خواب کی تعبیر بیان کریں۔

پیاری شہزادی، ہم دونوں مل کر آپ کے عجیب و غریب خواب کی تعبیر ضرور بیان کریں گے، مگر اس سے پہلے بعض ضروری رسمیں انجام دینی پڑتی ہیں اور یہ کام صرف آدھی رات میں ہوا کرتا ہے۔ آپ گھبرائیے نہیں، صاحبزادی ہم اس سلسلے میں آپ کی پوری پوری مدد کریں گے۔ یہ کہتے ہوئے ایک ماما جی نے قریب کے ایک میز پر سے بالائی کا ایک پیالا اٹھایا، جس میں بادام پستے، اخروٹ وغیرہ خشک میوے کے علاوہ، گلاب اور کیوڑے کا عرق بھی ملا ہوا تھا اور نہایت ہی محبت آمیز انداز میں قریب جا کر رحیم النسا سے کھانے کی درخواست کی، جس پر شہزادی نے اٹھ کر پہلے دونوں ہاتھ دھویا اور اس کے بعد وہ بالائی کھائی۔

باب (۳)

حیدرآباد میں اس وقت بارش کا موسم تھا۔ ایک بلکل ہی تاریک اور اندھیری رات میں بادو باراں کا طوفان اٹھ چلا تھا اسی وجہ سے شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں کئی انچ پانی کھڑا ہوا تھا، اور بڑی سڑکوں پر روشنی کے چراغ گل ہو چکے تھے، مگر بعض ابھی جھلملاتی روشنی کی بہار دکھا رہے تھے۔ چار مینار کی صدر امین

یکھری میں چند روہیلے پولیس کے جوان موجود تھے، جو اس علاقے میں خاص طور پر، امن اور سلامتی برقرار رکھنے کے لیے متعین کیے گئے تھے۔ یہ جوان بھی بار بار ان کے زبردست طوفان سے حد درجہ خوف زدہ ہو گئے تھے اس لئے کہ ہوا کے بے پناہ تھپیڑوں نے کئی ایک درخت اکھیڑ دیے تھے اور بوسیدہ مکانات بھی گر گئے تھے، اسی وجہ سے ان جوانوں کو اپنی یکھری سے باہر قدم رکھنے کی جرات اور ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی طوفانی حالت میں بجلی بار بار چمک رہی تھی، اور ایسے پر خطر وقت میں، جبکہ کسی بھی آدمی کو باہر قدم رکھنے کی جرات نہیں ہوتی تھی دو معمر عورتیں چار مینار کے مقابل ایک دکان کے ٹن شڈ کے نیچے سہارا لیے کھڑی تھیں۔ ایسے میں بجلی کے چمکتے ہی روہیلا سپاہیوں کی نظر ان معمر دونوں عورتوں پر پڑی۔ سپاہیوں کو یہ کچھ تعجب سا ہوا کہ ایسی طوفانی حالت میں عورتیں باہر نکلنے کی جرات کیسے کر سکتی ہیں، مگر مسلسل بجلی چمکنے سے انہوں نے بار بار ان عورتوں کو غور سے دیکھا، اور جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ دو عورتیں، ایک دوکان کے شیڈ کا سہارا لیے کھڑی ہیں تو ان سپاہیوں نے یہ طے کیا کہ چلو، قریب جا کر دیکھیں کہ آخر یہاں پر اور ایسے پر خطر وقت میں، یہ دو عورتیں کیوں کھڑی ہیں، انہوں نے یہ بھی خیال کیا کہ شاید یہ بدقماش اور برے کردار کی آوارہ عورتیں ہیں، اسلیے ان کے شوہروں نے انہیں مار پیٹ کر گھر سے باہر کر دیا ہے، چنانچہ، یہ وقت بارش کا ہے اس لیے ان عورتوں نے دکان کے شیڈ کا سہارا لیا ہے۔

ان میں سے ایک سپاہی نے کہا ہم جا تو سکتے ہیں، مگر اس طوفانی بارش میں بھیگ جائیں، اور اس کے بعد نزلے، زکام، اور بخار کا شکار بن جائیں، اور اسکے نتیجے کے طور پر ہم مر جائیں تو اس کے بعد ہماری بیویوں کا کون پرسان حال ہو گا؟

ان میں سے ایک سپاہی رحمت خان نے جرات کر کے کہا، امیر خاں ٹھیک ہی کہتے ہے کہ، مرنے مرانے اور ہماری بیویوں کے بیوا ہو جانے کی ایسی بری دلانا باتیں مت کر۔ موت سے گھبرانا کیوں ہے۔ سن! ہمت کر کے میرا ساتھ دے ہم ابھی جاتے ہیں اور ان عورتوں سے کہتے ہیں کہ [illegible]

رہیں گے۔

ارے بے وقوف کیا ایسے مواقع بار بار ہاتھ آتے ہیں۔ خاموش رہ زیادہ بکواس نہ کر ہمارے دوسرے ساتھی جاگ اٹھیں گے تو پھر بنا بنایا ہمارا سارا معاملا بگڑ جائے گا۔ اس لیے اسی وقت چل اور میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔

چنانچہ وہ دونوں روہیلا سپاہی بھیگتے بھگاتے اس طوفانی بارش میں ان دونوں عورتوں کے قریب گئے اور فوراً ہی ان میں سے ایک نے دونوں عورتوں سے سوال کیا۔

اس اندھیری رات اور طوفانی بارش میں، اور اس خطرناک بجلی کی کڑک اور چمک کے وقت تم دونوں عورتیں اس دکان کے ٹن کا سہارا لیے کیوں کھڑی ہیں؟ تم دونوں بھی پی ہوئی اور بدمعاش عورتیں معلوم ہوتی ہیں؟

آخر اس طوفانی بارش کے سے اس ڈراونی اندھیری رات میں دیر گئے تم دونوں عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے کا کیا سبب ہے؟ جلد ہی سچ سچ بتاؤ، ورنہ ہم، تم دونوں کو سامنے کے پولیس اسٹیشن لے جا کر بند کیے دیتے ہیں۔

دوسرے سپاہی نے کہا، ہم تم دونوں عورتوں کو میوا مٹھائی کھلائیں گے، اور تمہارے ساتھ رات بھر عیش کریں گے، اور اس کے بعد تم چاہو تو، ہم دونوں، تم دونوں سے نکاح بھی کر لیں گے۔ اب تم اپنی کہانی سچ سچ کہہ دینا، ورنہ یاد رکھو، ہمارے کوتوال صاحب کے حکم سے تم دونوں کو جیل بھجوا دیا جائے گا، مگر سنو! اور کان کھول کر سنو، ہم یہ پورے طور پر محسوس کرتے ہیں کہ تم دونوں واقعی شریف گھرانے کی عورتیں ہو، اس لیے کہ تمہارے چہرے مہرے نقش و نگار سے ہمیں صحیح صحیح اندازا ہوتا ہے کہ تم اس وقت مظلوم حالت میں ہو، اور تم پر اس وقت کوئی آفت اور مصیبت آن پڑی ہے اسی وجہ سے تم دونوں عورتیں ایسے خطرناک وقت میں اپنے گھروں سے باہر نکلنے کی جہات کر بیٹھی ہیں۔ اس کے بعد اس سپاہی نے اپنے دوسرے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرے بھائی! ہمیں چاہیے کہ ہم ان دونوں عورتوں [illegible]

کوتوال صاحب نے ہمیں ہدایت کی ہے کہ ہم عورتوں کے ساتھ رعایت برتیں اور نرمی کا سلوک کریں!

اس کے بعد ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے جرات کر کے جواب دیا "سنو بھائی! نہ میں جوان ہوں اور نہ میری ساتھی جوان ہے، اور نہ ہم دونوں عورتیں خوبصورت، حسین ہیں، جیسا کہ آپ دونوں کو ہمارے بارے میں غلط فہمی ہے۔ ہم اصل میں معمر عورتیں، اور ہم دونوں بھی ہمارے سرکار آسمان جاہ کی گھر کی مامائیں ہیں، اور یہ کہ ہم دونوں عورتیں نہ ہی بدتماش، اور بدمعاش ہیں، اور نہ ہی ہوش حالت میں ہیں یہ بھی مادر ہے کہ ہمارے شوہروں نے ہمیں مار پیٹ کر گھر سے نہیں کیا ہے، اس لیے کہ ہم دونوں بیوا عورتیں ہیں۔

اس عورت سے یہ داستان سننے کے بعد ان میں سے ایک سپاہی نے کہا، ہٹا و بھی کچرے کو، کیا فضول اور لچر قسم کی باتیں کرتی ہیں، اب تمہیں معلوم ہوتا جاہیے کہ ہم پولیس والے ہیں، اور تمہاری جیسی مکار اور دغرپی عورتوں کو بہت دیکھا بھالا ہے۔ اس لیے اب ہم تمہارے جھانسے میں نہیں آئیں گے۔

دوسری عورت نے بھی اب کی بار زبان کھولی اور جرات کر کے اس سپاہی کی چٹر پٹر گفتگو کا یہ جواب دیا کہ سپاہی بھائی کان کھول کر میری سن لو، ہم دونوں واقعی اور حقیقت میں بیوا عورتیں ہیں اور حسین اور نوجوان نہیں ہیں، جیسا کہ آپ کا غلط خیال ہے، اور میں بھی آپکو پکا یقین دلاتی ہوں کہ ہم دونوں ہمارے سرکار آسمان جاہ بہادر کی ڈیوڑھی میں ملازم مامائیں ہیں اور ان کی صاحبزادی رحیم النسا بیگم کی پیشی میں (۲۴) گھنٹے رہتی ہیں۔

ان میں سے ایک سپاہی نے کہا، جیسا کہ تم دونوں نے بیان کیا ہے، اگر تم واقعی اچھی اور شریف عورتیں ہیں تو پھر شریف عورتوں کو آدھی رات گئے اس خطرناک طوفان بادوباراں میں گھر سے باہر آنے کی ضرورت کیا تھی؟

اچھا تو سنئے سپاہی صاحب، ان میں سے ایک عورت نے کہا کہ واقعی اس تاریک اور اندھیری رات میں اور بارش اور بجلی کی کڑک اور چمک کے خطرناک سمے ہم دونوں عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ میں اللہ اور رسول کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہم دونوں عورتیں ہمارے سرکار عالی جاہ نواب آسمان جاہ بہادر کی مستقل ملازم ہیں اور ان کی شہزادی بیٹی رحیم النسا کی پیشی میں (۲۴) گھنٹے رہتی ہیں۔

اس پر ان دونوں سپاہیوں نے کہا کہ اچھا اب تم اپنی سچی سچی داستان سناؤ اور ہم دونوں سپاہی تمہاری کہانی کو نہایت ہی دل چسپی کے ساتھ سنیں گے۔

باتیں کرتے ہوئے ان دونوں ماماؤں میں سے ایک ماما جی نے اپنی پان کی تھیلی نکالی اور پان کا بیڑا بنا کر ایک روپہلے جوان کے سامنے پیش کیا، اس پر اس جوان نے کہا کہ ہم دونوں بھی پان نہیں کھاتے ہیں اگر تمہاری تھیلی میں چکنی ڈلی اور الائچی ہے تو جدید وہم ضرور کھائیں گے، چنانچہ ماما جی پان کا بیڑا خود ہی کھا لیا، اور دونوں سپاہیوں کو چکنی کی ڈلی اور الائچی دی، اس کے بعد دوسری ماما کو ایک پان بنا کر دیا اس عرصے میں بارش کم ہو گئی تھی، اس لیے وہ دونوں جوان ان عورتوں کے مقابل دکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ پان چبانے کے بعد پیک تھوک کر بڑی ماما جی نے کہا، سپاہی بھائی، آپ دونوں کو بھی ہمارے بارے میں بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں بھی بدتماش اور آوارہ قسم کی عورتیں ہیں، اگر ایسی صورت حال یہ نہیں ہے، بلکہ ہم دونوں بھی شریف عورتیں، اور ہمارے سرکار عظمت مدار نواب آسمان جاہ بہادر کی ڈیوڑھی میں ملازم ہیں اور ہم دونوں بھی ان کی صاحبزادی رحیم النسا بیگم کی پیشی میں (۲۴) گھنٹے ڈیوٹی انجام دیتی ہیں۔ ہم اس یادوباراں کی اور طوفانی رات میں اپنی ڈیوڑھی سے اس لیے نکل پڑی ہیں کہ ہم کسی طرح بھی سیر فراز علی مشہور عامل اور رمال کے گھر پہنچ جائیں، اس لیے کہ ہماری شہزادی رحیم النسا بیگم نے کل رات ایک بھیانک خواب دیکھا ہے اور ہم نے اپنی شہزادی سے یہ پکا وعدہ کر لیا ہے کہ جس طرح بھی ہو ہم دونوں فراز علی کے گھر جا کر ان سے خواب بیان کریں گے، اور اس کے بعد وہ جو بھی تعبیر بتائیں گے اپنی شہزادی کو سنا دیں گے۔

آپ تو پولیس والے ہیں، آپ خود بھی بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ فرازعلی کتنا بڑا سمگلر ہے ایک علاقہ الدین بازار میں رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت آدھی رات سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اور عامل فرازعلی یقیناً سو رہے ہوں گے، لیکن یقین جانیے کہ ہماری آواز سنتے ہی وہ دروازہ کھول دیں گے، اور ہم دونوں ان سے شہزادی صاحب کا خواب کہہ سنائیں گے، اس کے بعد وہ جو بھی تعبیر کہیں ہم اپنی شہزادی سے کہہ سنائیں گے، چونکہ ہم نے اپنی نوجوان اور پریشان حال شہزادی سے وعدہ کر لیا ہے کہ جس طرح سے بھی ہو آج ہم ضرور فرازعلی کے گھر جائیں گے، اور اس سے خواب بیان کر کے تعبیر معلوم کریں گے، اس لیے اس طوفانی رات بارش کے سمے ہم دونوں دیوڑی سے چل پڑی ہیں۔

ان میں سے ایک سپاہی نے مکارانہ انداز میں یہ کہا کہ فرازعلی تمہاری دیوڑی کا ملازم یا غلام تو ہے نہیں۔ اس کو ہم خود بھی بہتر طریقے سے جانتے ہیں۔ وہ بڑا ہی حریص اور لالچی شخص ہے، بغیر پیسے کے کوئی بھی کام نہیں کرتا۔ اس پر بڑی ماما جی نے کہا، یہ صحیح ہے، سپاہی بھائی، ہم خود بھی جانتے ہیں کہ عامل فرازعلی بغیر پیسے کے کسی کا بھی کام نہیں کرتا ہے۔ اس پر دوسرے بھائی نے دریافت کیا ہے، تو اس کو دینے کے لیے تم نے پیسے کا کیا انتظام کیا ہے؟ دوسری ماما جی نے کہا، معاملا آسمان جاہ بہادر کی دیوڑی کا ہے، ہم فرازعلی سے پہلے خواب کی تعبیر معلوم کریں گے، اور بعد میں اس کو پیسا ادا کر دیں گے۔

اس عرصے میں بارش بلکل ہی تھم چکی تھی مگر گھپ اندھیرا بڑا ہی خوفناک اور ڈراؤنا منظر پیش کر رہا تھا، ایسے میں ایک رذیل سپاہی نے کہا، تم دونوں عورتیں ہمارے ساتھ آسمان جاہ کی دیوڑی چلیں، دیوڑی یہاں سے بلکل ہی قریب ہے، اور ہم چاروں جلد ہی پہنچ جائیں گے، اور ہم تم کو راستے میں ترکیب بتائیں گے کہ تم کو کیا کرنا چاہیے۔

ان دونوں عورتوں کے انکار کرنے کے باوجود وہ دونوں سپاہی، انہیں زبردستی کھینچتے لے گئے اور دیوڑی ہی لے جا کر انہیں سمجھایا کہ جاؤ اور سوتی شہزادی کو جگا کر کہو کہ فرازعلی نے یہ کہا ہے کہ جب تک شہزادی کے جسم پر اس وقت جو بھی زیورات ہیں وہ اس کو نہ دیے جائیں تو وہ خواب کی تعبیر نہ بتائے گا۔

ان میں سے بڑی ماما جی نے کہا، سپاہی بھائی آپکا خیال تو بہت اچھا ہے، اس وقت شہزادی کے جسم پر تقریباً پانچ سات ہزار روپے کے زیورات ہیں اگر وہ ہمیں مل جائیں تو ہم چاروں کی زندگی آسانی سے بسر ہو سکتی ہے۔ اس سپاہی نے جواب دیا اس لیے میں نے بھی تو اچھی ترکیب بتائی ہے، چلو ہم چاروں دیوڑی کی طرف چلیں، اور چاروں آخرکار دیوڑی کی طرف پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک سپاہی نے کہا، جاؤ تم دونوں دیوڑی میں جا کر اپنا مشن پورا کرو اور میں سرفراز علی کی حیثیت سے یہاں کھڑے رہوں گا، اور میرا ساتھی سپاہی کچھ فاصلے پر چھپا کھڑا رہے گا۔ تقریباً رات کے بارہ بجے کا وقت تھا، اس وقت یہ عورتیں دیوڑی میں داخل ہوئیں اور نگران کار، خبرداروں وغیرہ سے چھپتی چھپاتی شہزادی رحیم النسا کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ اس وقت شہزادی بڑی ہی گہری نیند سو رہی تھی۔ بڑی ماما جی نے قریب جا کر چارپائی پر بار بار جھنجھوڑ دیتے اٹھو شہزادی پاشا، اٹھو شہزادی پاشا آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ آخرکار رحیم النسا اٹھ بیٹھی اور والہانہ انداز میں یہ کہنا شروع کیا۔ آہ! آ گئے تم میرے محبوب، میرے دل کے مالک میں بے چینی سے تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ تمہارے آ جانے سے میرے دل کو بڑی مسرت اور خوشی حاصل ہوئی، او میرے سن مندر کے دیوتا، تم کہاں رہے اتنے عرصے تک!!

بڑی ماما جی نے کہا چپ رہو شہزادی، میں ہوں آپ کی بڑی ماما جی، زیادہ پکارا نہ کرو، ورنہ دوسرے لوگ اٹھ بیٹھیں گے، اس وقت شہزادی کے کمرے میں ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ جل رہا تھا، اس کی دھیمی روشنی میں ماما جی کی طرف دیکھ کر رحیم النسا نے کہا اوہ، تم ہو میری ماما جی، کہو ماما جی کیا خوش خبری لائی ہو تم میرے لیے۔ کیا میرے محبوب کو سات لیتی آئی ہو، آیا صبا آ گئے، میرے دل کا مالک، مجھ سے ملنے کے لیے آیا ہے

اس کے جواب میں ماما جی نے کہا "پیاری شہزادی گھبراؤ نہیں اور فکر مت کرو، ہم دونوں عامل فراز علی کے گھر کنٹا گوشا محل میں علاؤالدین یا زار گئے تھے، اور آپکی خاطر آدی رات کو اس کو جگایا، اور آپ کا خواب بیان کیا تو اس نے بیان کیا کہ خواب بڑا ہی پیچیدا، اور پریشان کن ہے، اور وہ نذرانا اس وقت آپ کے جسم کے اوپر کا پورا زیور ہے۔ فراز علی ہمارے ساتھ آیا ہے، اور ہم نے اس کو دیوڑی کے باہر ہی کھڑا کیا ہے، تاکے آپ کے زیورات دیتے ہی اس کو لے جا کر دے دیں۔

یہ سنتے ہی صاحبزادی رحیم النساء نے اپنے جسم پر کے پورے زیورات نکال کر ماما جی کے حوالے کرتے ہوئے کہا، یہ لو ماما جی میرے جسم پر کے سارے زیور اس شخص کو لے کر دیدو، مجھ کو اپنے زیورات سے زیادہ عزیز وہ شخص ہے جس کو صندوز پہلے لنگر میں میں نے دیکھا ہے، میں اس کے لئے بے قرار اور رسیلے بین ہوں، اور اس کے فراق میں گھلے جارہی ہوں، اس کا حسین چہرا اب تک میری آنکھوں میں پھر رہا ہے کہ ایک سفید گھوڑے پر بیٹھا ہوا نوجوان کتنا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے مجھ کو دیکھا، مگر میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ اسکی اچٹتی نظر میں پوری طرح مجھ پر نہ پڑ سکیں ہے لیکن میری نظریں آخر وقت تک اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ اب میں اس سے محبت کرتی ہوں، اور یہ بلکل ہی یقینی اور سچی بات ہے کہ سوائے اس نوجوان کے میں زندگی بھر کسی دوسرے سے محبت نہ کروں گی، چاہے مجھ کو اس کٹھن رستے میں کتنی ہی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ماما جی تم یقین جانو کہ اب میں نے صرف اس نہایت ہی خوبصورت اور حسین ترین نوجوان کو اپنے من مندر میں جگہ دے رکھی ہے، اور مرتے دم تک صرف اسی کی پوجا کرتے رہوں گی۔

شہزادی نے جو زیورات دیے تھے ان کو لیتے ہوئے ماما جی نے کہا میری پیاری اور حسین شہزادی، اس بات کا یقین رکھو کہ آپ کا مقصد پورا ہو کر رہے گا۔ صرف ان زیورات کے پہنچنے کی دیر ہے، ان بزرگ اور پیر کو نذرانہ چڑاتے ہی وہ آپ کی مراد پوری کر دیں گے۔ زیورات لے کر شہزادی کے پیروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ماما جی نے کہا، آپ پورا پورا بھروسا رکھیے مجھ پر، میں یہ سب زیورات لے جا کر اس وقت اس شخص کے حوالے کئے دیتا ہوں، جو دیوڑی کے باہر کھڑا ہے اور صبح ہونے تک آپ کی مراد بر آئے گی۔ یہ کہتے ہوئے اور ادب سے آداب بجالاتے ہوئے زیورات لے کر دونوں ماما جی چلی گئیں۔ جب ماما جی دیوڑی کے باہر گئی تو وہ روپیلا سپاہی جو اس کے انتظار میں بے چین کھڑا تھا، اس نے جلدی سے ساتھ دریافت کیا، کہو ماما جی سچ زیورات لے آئی ہو، اس کے جواب میں بڑی ماما جی نے کہا کہ، ہاں جیسا کہ آپ نے مشورا دیا تھا، ہم نے شہزادی سے وہ سب سچ کہا اور یہ بھی یقین دلایا کہ اگر آپ اپنے جسم پر کے پورے زیورات دان کر دیں تو بڑے پیر کو بطور نذرانا پیش کریں گے، جس کے بدلے فوراً ہی آپ کی دلی مراد بر آئے گی، چنانچے شہزادی نے اپنے جسم پر کا سارا زیور ہمارے حوالے کر دیا، اور اس کپڑے کو کھول کر دکھاتے ہوئے، ماما جی نے کہا، یہ دیکھو یہ رہے وہ سارے زیورات۔

اس وقت میں دوسرا چھپا ہوا سپاہی بھی آگیا، اور دونوں نے مل کر تمام زیورات کو غور سے دیکھا، اور کہا کہ یہ تو بڑے ہی قیمتی زیورات ہیں، یہ مال غنیمت تو ہمیں عمر بھر وصول نہیں ہو سکتا تھا، چنانچے دونوں سپاہیوں نے دونوں ماما جی کو مشورہ دیا کہ ابھی رات باقی ہے ہم چاروں یہاں سے جلدی سے چل پڑیں، ورنا ہمیں کوئی دیکھ پائے گا تو بڑی ہی مشکل پیش آئے گی۔ عالم کتے کے پیچھے ہم ساری رات گزار دیں گے، اور صبح سویرے اپنے اپنے گھروں کو جائیں گے! اس کے بعد وہ چاروں مل کر عالم کنٹا چلے گئے۔ وہاں جانے کے بعد بڑی ماما جی نے کہا، جوان صاحب جاما فراز علی کے گھر جانا ضروری ہے اس لیے کہ اس سے خاب کی تعبیر معلوم کرنی ضروری ہے، تاکے کل سویرے شہزادی کو سنا دی جائے۔ میرے ہاں پانچ روپے موجود ہیں، میں یہ پانچ روپے فراز علی کو دے کر خاب کی تعبیر معلوم کروں گی، اور رہے زیورات تو ہم چاروں مل کر تقسیم کر لیں گے۔ اس پر ان میں سے ایک سپاہی نے کہا، ارے کہا، بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو، فراز علی کے پاس وقت سے جانا، اور

اگر ابھی جانا ضروری ہے تو اس میں سے چار روپے مجھکو دیدو میں شراب کی دکان جاکر چار روپے کی شراب لے آتا ہوں، اور ہم سب مل کر مزے سے پئیں گے۔ سنو ماجی اس سپاہی نے کہا، تم گھبراؤ مت، پہلے تو خراز علی صاحب کی تعبیر بتلانے کے لئے پیسے دیتا نہیں لگتا ہے، میں اس کو اچھی طرح سے جانتا ہوں، وہ بڑا ہی بھلا آدمی ہے، اگر وہ بچے پیسے مانگے تو باقی ایک روپیا دے دینا۔ دونوں سپاہیوں کے اصرار پر ماجی نے اپنی چادر میں باندھے ہوئے پانچ روپے میں سے ۴ روپے دیدیے، ایک سپاہی نے ۴ روپے لیے، اور شراب کی دکان کی طرف چلا گیا، اور تھوڑی ہی دیر میں وہ شراب کی بوتل اور کچھ چبینا وغیرہ لیتے واپس آیا۔ پہلے پہل تو ان دونوں سپاہیوں نے شراب پی، اور دونوں ماجی صرف چبینا کھاتی رہیں، لیکن جوانوں کے مسلسل اصرار اور تقاضے پر دونوں ماؤں نے بھی شراب پینا شروع کر دیا، کچھ دیر میں شراب کی دونوں بوتلیں خالی ہوگئیں، تو اس سپاہی نے ماجی سے باقی ایک روپیا بھی حاصل کرلیا اور دوڑے دوڑے جاکر اور آدھی بوتل شراب خریدلے آیا، اور سبھوں نے مل کر ساری شراب پی ڈالی۔

دونوں ماؤں نے اپنی عمر میں پہلی بار شراب پی تھی، اس لیے ان دونوں پر بھی شراب کا بری طرح سے اثر ہوا، وہ دونوں بالکل ہی ساکت اور پھر بہکی بہکی باتیں کرنے لگیں۔ دونوں جوانوں نے ان عورتوں کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ یہ جو بچے بھی سوال کرتے، اس کا جواب تمارو بھی سپاہی نے بڑی ماجی کی پتلون کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا، ارے بچے تو بولو لو ماجی، ایسی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہی ہو؟ شراب آخر ہم دونوں نے بھی پی ہے، مگر اس کا ہم دونوں پر بچے اثر نہیں ہوا۔ ہم دونوں تو اس وقت بڑے ہی مزے کی حالت میں ہیں، ہماری طبیعت میں تو اس وقت چھل بیدا ہوگیا ہے، سنو تم دونوں میں سے جس کو بھی گانا آتا ہے گانا کر ہم دونوں کا دل خوش کرو، بولو، بچے تو کہو، ہمارے سوالات کا جواب دو پسند کر چھوٹی ماجی نے بچے کہنے کی کوشش ضرور کی مگر اس پر بھی نشہ کا گہرا اثر تھا اس لیے زبان سے بڑبڑاتے ہوئے منڈی ڈھلکا کر لیٹ گئی۔ دونوں ماجی کو نشا میں چور اور بیہوش دیکھ کر ایک سپاہی نے کہا کہ بھیا! اب موقع بہت ہی اچھا ہے، دونوں عورتیں لیٹ گئی ہیں، اور ان کے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں۔ شراب کی گرمی نے ہمارے جسموں میں شرارے دوڑا دیے ہیں، اس لیے اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کا واحد حل اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم دونوں ان ماؤں کے ساتھ ہم بستر ہو جائیں۔ اس پر دوسرے سپاہی نے ڈانٹا اور کہا کہ نہیں، ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ شرافت کے خلاف ہے کہ بیہوش عورتوں کے ساتھ ہم ناجائز فعل کریں۔ کیا ہمارے گھر میں عورتیں نہیں ہیں، اپنی ہوس ہم اپنے گھروں میں مٹا سکتے ہیں۔ ہمیں تو اپنا حقیقی کام کرنا چاہئے ان کے ساتھ جتنا بھی زیور ہے لے کر فوراً چلتے بنیں، چلو، اب صبح ہوا ہی چاہتی ہے، ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمیں دیکھ پائے۔ چنانچہ ان دونوں سپاہیوں نے دونوں ماجی کا پورا پورا جائزہ ایسا لیا کہ وہ دونوں بالکل ساکت اور بے ہوش پڑی تھیں ایسی حالت میں جتنا بھی زیور تھا وہ لے کر چمپت ہوگئے۔

دونوں ماجی شراب کے نشے میں بے حس و حرکت اسی جگہ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ صبح ہوئی آفتاب نکل آیا، ایسے میں کئی لوگوں نے ان کو اس بری حالت میں لیٹے دیکھا۔ کسی نے جاکر پولیس کو اطلاع دی۔ تھانے سے پولیس کے دو جوان آئے اور ان دونوں ماؤں کو اٹھا کر پولیس تھانے لے گئے رستے میں بچے بڑے سب ہی ان کا مذاق اڑا رہے تھے، تھانے لے جانے کے بعد، جمعدار پولیس نے ان کا بیان قلمبند کیا ماؤں نے بیان دیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ سرکار آسمان جاہ بہادر کی دیوڑی میں ملازم ہیں اور ان کی صاحبزادی رحیم النساء بیگم کی پیشی میں (۴ر) گھنٹے رہتی ہیں۔ جمعدار پولیس نے اپنے جوانوں سے کہا، یہ سب جھوٹ معلوم ہوتا ہے، یہ دونوں چور معلوم ہوتی ہیں، ان دونوں کی تلاشی لو، رات میں چوری کر کے معلوم ہوتا ہے کنٹے کے پیٹھے میں سو رہی تھیں۔ جمعدار کے کہتے ہی دو جوانوں نے ان عورتوں کی تلاشی لی، جس کی بنا پر چھوٹی ماجی کے نیفے میں لٹکی ہوئی تھیلی سے پچاس روپے جانی نکل آئے، جو ان نے وہ روپے جمعدار کے سامنے پیش کیے تو جمعدار نے ڈانٹ کر کہا! چوری پر چوری اور سر زوری، جھوٹ بھی بولتی ہو، تمہاری حیثیت کو دیکھو، یہ پچاس

روپے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟ اس پر دونوں ماماؤں نے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتے ہوئے کہی، جمعدار صاحب ہم سچ کہتے ہیں، ہم دونوں بھی چور نہیں ہیں، ہمارے سرکار بہت بڑے آدمی ہیں، وہ ہمیں کھدنے اور کپڑے کے سوا اتنے انعام اکرام بھی دیا کرتے ہیں اور ہماری صاحبزادی بھی وقتاً فوقتاً انعامات سے سرفراز کرتی رہتی ہیں، یہ وہی روپے ہیں جو ہمیں دیوڑی سے ملے ہیں، ہم خدا اور رسول پاک کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہ روپے چوری کے نہیں، بلکہ خدا ہماری محنت اور کمائی کے ہیں، اس پر جمعدار نے کہا کہ یہ روپے سرکاری تحویل میں رہیں گے۔ اور جوانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بیان کیا کہ اب دونوں عورتوں کو حوالات میں بند کر دو ان پر چوری کے الزام اور آوارگی کی علت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ یہ سنتے ہی دونوں ماماؤں نے گڑگڑا کر منت سماجت کی اور جمعدار کے پیروں اور ہاتھوں کو بار بار چھوتے ہوئے کہا کہ نہیں جمعدار صاحب ایسا نہ کیجئے، ہم نے چوری نہیں کی ہے ہم پھر سے آپ سے سچ کہتے ہیں کہ ہم سرکار آسمان جاہ بہادر کی دیوڑی کے ملازم ہیں اور ان کی صاحبزادی کی پیٹی میں رات دن رہتے ہیں۔ ان کی اس گڑگڑاہٹ کا جمعدار پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تمہارے پچاس روپے بھی جائیں گے اور پھر تم دونوں عورتوں کو حوالات میں بھی ڈالا جائے گا۔ اس لئے میں ایک ترکیب بتاتا ہوں لیئے جمعدار صاحب سے عرض کرتا ہوں کہ صاحب میں ان دونوں عورتوں سے واقف ہوں، یہ واقعی آسمان جاہ کی دیوڑی میں ملازم ہیں اور یہ شریف عورتیں ہیں، انہوں نے چوری نہیں کی ہے۔ اور پچاس روپے انہی کی ملک ہیں۔ اس کے بدلے تمہیں وہ پچاس روپے جمعدار کو نذر کر دینے پڑیں گے۔ اور اس وقت تمہیں اپنے گھر جانے کی اجازت مل جائے گی اس پر دونوں ماماؤں نے اپنی اپنی رضامندی ظاہر کی۔ پھر یہ تینوں مل کر جمعدار صاحب کے گھر گئے اور اس جوان نے جمعدار صاحب سے وہی الفاظ کہے جس کی بنا پر ان دونوں کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ اور وہ پچاس روپے جمعدار صاحب کی جیب میں چلے گئے۔

اس کے بعد یہ دونوں ماما میں جمعدار صاحب اور جوان کو دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیتی ہوئیں نواب آسمان جاہ بہادر کی دیوڑی کی طرف چل پڑیں۔

باب (۴)

اس وقت صاحبزادی جمیلہ النساء اپنے کمرے میں بالکل ہی تنہا تھی۔ اس لیے یہ محسوس کیا کہ جب سے اس نامعلوم نوجوان کے عشق میں وہ مبتلا ہوگئی ہے، اس وقت سے اس کی صحت بہت زیادہ متاثر ہوگئی ہے۔ اس واقعے سے اس کا نازک جسم اور دل و دماغ سب ہی بری طرح گھائل ہوگئے ہیں، وہ ایک قدآدم آئینہ کی طرف گئی اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سارے جسم کا جائزہ لیا تو اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کا پھول سا چہرہ مرجھا سا گیا ہے، اس کا سرخ و سفید سا رنگ سانولا ہوگیا ہے، اور اس کی فراخ آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں، اور ان کے نیچے ہلکی سیاہی مائل سا رنگ پیدا ہوگیا ہے، اور سب سے بڑا یہ کہ اس کی طبیعت میں جو اٹھان کا جو چہل تھا، وہ باقی نہیں رہا۔ اس کی روزمرہ کی غذا میں بھی فرق پیدا ہوگیا تھا، اور اس کی نیند بھی بری طرح سے متاثر ہوگئی تھی، وہ رات میں گھنٹوں اس سلسلے پر غور و فکر کرتے رہتی تھی کہ اس کا مقصود دیا منظور نظر اس کا کب اور کیوں کر حاصل ہوگا؟ ان حالات کی روشنی میں اس نے خیال کیا کہ لیڈی ڈاکٹر مس کرک پیٹرک کو کیوں نہ بلوایا جائے جو کچھ عرصے سے ہاؤز سرجن کی حیثیت سے کام کر رہی تھی، مگر ساتھ ہی اسکو اس بات کا احساس ہوا کہ اگر لیڈی ڈاکٹر کا علاج شروع کروایا جائے تو اس کے ابا سرکار پریشان ہو جائیں گے کہ میری لڑکی بیمار ہے، اس لیے ڈاکٹر سے علاج کروایا جا رہا ہے! اس شش و پنج میں وہ اپنے کوچ پر جا بیٹھی اور پھر سے اٹھ کر ایک بڑی الماری کی طرف گئی، جس میں مختلف قسم کے شربت کے شیشے وغیرہ رکھتے تھے۔ اس میں سے ایک شیشہ نکال کر ایک گلاس میں شربت انڈیلا، اور پانی ملا کر پی گئی۔ اس کے بعد ایک آرام کرسی پر جا لیٹی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی کہ اسی میں اس کی نظر سامنے رکھی کتاب بورڈ پڑی۔ وہ اٹھ کر وہاں گئی، اور کتاب بورڈ کھول کر

LADY DOCTOR MISS KIRK-PATRICK

زیورات کے درمیان میں سے ایک بڑا فیروزا نکالا۔ یہ فیروزا انتہائی بڑا اور انتہائی قیمتی تھا۔ اس نے اپنے آپ سے یہ کہا کہ یہ فیروزا تو میری ماں نے مرتے وقت مجھے دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ اس کو حفاظت سے رکھنا اور جب کبھی کوئی مشکل پیش آئے تو گلے کی مالا میں اس طرح سے بٹھا دینا کہ وہ سینے سے مس کرتا رہے اس سے آفت بلا ٹل جائے گی اور رکا ہوا کام بن جائے گا چنانچہ اس سے اور کوئی موقع بہتر ہو سکتا ہے، اس کے استعمال کرنے کا، اور اس نے وہ فیروزا ایک بوروڈ سے نکال لیا، اس کے بعد اس کو مالا کا خیال آیا تو خدا جانے اس نے اپنے دل ہی دل میں کہا کہ مالا تو کل رات جسم پر سے نکال کر بڑی ماما جی کو دے دی تھی، پھر سے اس نے کہا کہ خیر ایک مالا کے جانے سے کیا ہوتا ہے، میری ماں نے میرے لیے بہت سا قیمتی زیور چھوڑا ہے اور کئی بیش قیمت مالائیں اور بھی موجود ہیں۔ ایک دوسرے کیس بورڈ کو کھول کر رحیم النسا نے اس میں سے دو چار مالائیں نکالیں، اور اس میں سے ایک مالا پسند کی، اور دوسری مالائیں کیس بورڈ میں رکھ چھوڑیں، اور اس نفیس مالا کے بلکل آخری حصے میں وہ فیروزا بٹھا کر اس نے وہ مالا پہن لی، اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا کہ آیا وہ فیروزا سینے سے برابر مس کر رہا ہے یا نہیں؟ اس کے بعد وہ اپنے کوچ پر آ کر پھر سے بیٹھ گئی اس نے اپنے ملازمین کو آواز دی تو اس پر بڑی ماما جی آئی۔ یہ دونوں مائیں پولیس کے چنگل سے چھوٹ کر دیوڑی آ چکی تھیں، مگر بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔

ماما جی آتے ہی شہزادی کے پیروں پر گر گئی، اس پر شہزادی نے کہا، اٹھو ماما جی، ایسی حرکت کیوں کرتی ہو، اٹھو اٹھو کر سیدھے بیٹھو۔ شہزادی نے خدا اس کا سر پکڑ کر اٹھایا، اور وہ ماما جی اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں، صاحبزادی نے کہا کہ، ماما جی، میرے پریشان کن خواب سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ میری صحت بہت گر گئی ہے، اور میں اپنی جسمانی کمزوری کو بری طرح سے محسوس کر رہی ہوں۔ ماما جی یقین جانو کہ اس وجہ سے میری نیند میں حرام ہو گئیں ہیں اور چین و آرام بھی چھن گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے، ماما جی نے کہا، شہزادی صاحبا، آپ کے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، میں آپ کی صحت و تندرستی کے سلسلہ میں اپنی جان تک قربان کر دوں گی — آپ ہرگز ہرگز فکرمند نہ ہوں۔ آپ کی بھلائی بہتری کے سلسلے میں مجھ سے جو بھی ممکن ہے، میں ضرور بضرور کروں گی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں ماما جی کب آئیں؟ اور میرے خواب کی تعبیر کا کیا رہا؟ ایسے میں دوسری ماما جی بھی آ گئی، اور دونوں نے مل کر ساری داستان بیان کر دی کہ وہ زیور فراز علی کے حوالے کر دیا گیا، اور اس نے پیر کے نذر کر دیا، اور خواب کی تعبیر بعد میں بیان کی جائے گی —

ماما جی! صاحبزادی نے کہا، تم دونوں بھی نہیں جانتیں کہ میں اس شخص سے کتنی محبت کرتی ہوں جس کو میں نے ۵ رخرم کو نسٹگر میں دیکھا تھا۔ اس کی محبت میرے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو گئی ہے، اور یہ دیکھو! اپنے سینے پر سے کپڑے ہٹاتے ہوئے کہا، تم دونوں ماما جی دیکھو اور خوب غور سے دیکھو کہ میرے سینے پر یہ سرخی مائل دھبا یا نشان کیسا ہے، کیسے آیا اور کہاں سے آن کر میرے سینے پر مسلط ہو گیا ہے۔ ماما جی یقین جانو کہ میرے دل میں بھی اس قسم کا نشان یا دھبا بن گیا ہے؟ اور میری سچی اور حقیقی محبت کا وہ نشان اوپری طور پر ظاہر بھی ہو گیا ہے، تاکہ میری سچی محبت اور عشق لافانی کا ثبوت دے سکے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ظاہری نشان اس فیروزے کی رگڑ کا، جو میں اپنی ماں کی ہدایت کے اکثر و بیشتر کسی ایک قیمتی مالا میں لگا کر پہنتی رہتی ہوں۔ ماما جی اگر "قسمت" کسی چڑیا کا نام ہے تو وہ ایک نہ ایک روز خدبخد یہاں چلا آئے گا۔ میں اس وقت یہ کہتے ہوئے اس سے گلے ملوں گی کہ تم میری قسمت کے مالک، میرے تاجدار، آخر مجھ سے ملنے چلے آئے۔ اف! اتنے طویل عرصے سے تمہارا کٹھن اور سخت انتظار رہا۔ لوگ عام طور پر کہتے ہیں کہ لڑکیاں خدہی محبت میں پہل نہیں کرتی ہیں، لیکن، میں نے عشق میں پہل کر کے زمانے عشق میں ایک نئی مثال قایم کر دی ہے! ماما جی! دروازے پر کھٹ کھٹا رہا ہے، تم دونوں مل کر جاؤ، اور دیکھو کہ میرے لیے کون آیا ہے۔ بہت اچھا شہزادی کہتے ہوئے دونوں عورتیں اٹھ کر چلی گئیں، اور دروازا کھول کر

پیش دالان کی طرف دیکھتی ہیں تو ایک بھیس بدلے دیوزی کے مرد کو کھڑا پایا۔ اس نے ہاتھ سے اشارا کر کے اپنی طرف بلایا، اس لیے کہ وہ دروازے سے تیز خاصلے پر کھڑا تھا۔ دونوں ماما جی کے قریب جاتے ہی اس نے جیسکے سے کہا، خاموش، گڑبڑ نہیں کرنا، آواز نہیں نکالنا، میں سب کچھ سن چکا ہوں، اس لیے عورت کا بھیس اختیار کیا ہے تاکہ سماجزادی سے جا کر یہ کہوں کہ میں اس شخص کی طرف سے آیا ہوں، جس کو آپ نے لشکر میں گھوڑے پر سوار دیکھا تھا۔ سنو! تم دونوں ماما جی یکان کھول کر سنو، ہماری دنیا بدل جائے گی ہماری قسمت جاگ کر ہو جائے گی، اے بیوقوف عورت تو یاد رکھ اپنے مواقع زندگی میں بار بار نہیں آتے۔ ہم تینوں لکھ پتی بن جائیں گے، اور اس کے لیے میں نے ایک تدبیر سوچی ہے، اس لیے اس وقت اندر جاؤ، اور سماجزادی سے کہو کہ میں صرف پانچ منٹ کے لیے اس سے ملنا چاہتی ہوں، بڑی ماما جی نے کہا کہ دیکھو بھائی آپ کے سوا کوئی اور شخص تو نہیں جانتا ہے اس بھید کو اس شخص نے جواب دیا کہ میں خدائے ذوالجلال، اور رسول پاک کی قسم کھا کر سچ سچ کہتا ہوں کہ میرے سوا اس راز کو دوسرا کوئی نہیں جانتا ہے، اس کے یقین دلانے پر وہ دونوں عورتیں شہزادی کے کمرے میں داخل ہوئیں اور قریب جا کر اس سے کہا کہ شہزادی صاحبا! آپ جس شخص کو چاہتی ہیں ان کے ہاں سے ایک عورت یہ سچ پیام لے کر آئی ہے، باہر کھڑی ہے، اور آپ کی اجازت سے اندر آنا چاہتی ہے۔ یہ سنتے ہی سماجزادی کے کھلے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی، اور خوشی کے مارے اس نے کہا، جاؤ ماما جی، فوراً باہر جاؤ اور اس عورت کو فوراً اندر بلا لاؤ۔ یہ سنتے ہی ان میں سے ایک ماما جی باہر گئی اور چند ہی سکنڈ میں اس مصنوعی عورت کو اندر بلا لائی۔ وہ عورت اندر داخل ہوتے ہی رحیم النسا کے سامنے گھٹنے اور تین مرتبہ اور سے آداب بجا لائی۔ رحیم النسا نے اس کا جواب اپنی مسکراہٹ ہنسی اور مسکراہٹ کے ساتھ دیا اور اس عورت کو قریب آنے کے لیے کہا۔ وہ مصنوعی عورت سماجزادی کے بالکل قریب جا کر پھر سے آداب بجا لا کر سامنے ادب سے بیٹھ گئی شہزادی نے کہا تمہیں اجازت ہے، کہو ہم سے کیا کہنا چاہتی ہو۔ اس پر اس مصنوعی عورت نے کہا، شہزادی صاحبا! میں آپ کی بھی اسی طرح تابعدار اور غلام ہوں، جس طرح اپنے آقا اور مالک کی تابعدار ہوں۔ میں عمل وغیرہ بھی کرتی ہوں، اس لیے غیب کی حالت سے واقف ہوں۔ اس وقت آپ کا قیافہ دیکھ کر یہ کہہ سکتی ہوں کہ آپ کسی حسین شخص کے عشق میں گرفتار ہیں اور اس رستے میں ہر قسم کی کھٹنائیاں اور شکلوں کا سامنا دیکھ کر کر رہی ہیں۔ کہیے میری پیاری شہزادی صاحبا! آپا جی نے جو کچھ کہا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

یہ سن کر رحیم النسا نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہاں کہی جاؤ، تم اپنی داستان، سچی یا جھوٹی بیان کر کے تو میرا دل موہ لیا ہے۔

اس کے بعد اس مصنوعی عورت نے کہا، شہزادی صاحبا میں اپنے غیر معمولی عمل کے زور پر یہ حقیقت بیان کرتی ہوں کہ ۵ محرم کو لشکر کے روز ہماری بیازی سماجزادی نے اپنا جھنڈا دل ایک بہت ہی حسین اور خوبصورت گھوڑے سوار نوجوان کے حوالے کر دیا، اور اس وقت سے آپ عشق کی چکاریوں میں جھلسی جا رہی ہیں۔ کہیے میری اچھی شہزادی، آیا میں نے جو بیان کیا وہ صحیح ہے یا غلط؟

"ہاں ہاں! بالکل صحیح ہے، اور آگے بھی کہے چلے جاؤ میری اچھی عورت!"

جی ہاں! شہزادی صاحبا! میں نے غیب سے معلوم کر لیا ہے کہ آپ بھی عشق میں مبتلا ہو گئی ہیں تو بڑی تعجب ہوا کہ آخر وہ کون خوش قسمت نوجوان ہوگا، جو ہماری حور نما پرستان کی پری، نوجوان اور حسین و جمیل شہزادی کا شوہر بنے گا۔ یہ راز معلوم کرنے کے لیے میں پیر کے روز سے روزے پر گئی، اور چار روز وہاں چلہ جاے بیٹھی رہی اس کے بعد مجھ پر یہ راز ظاہر ہوا کہ آپ کے خواب میں ایک پیر نے آ کر یہ کہا تھا کہ اس خوش قسمت حسین و جمیل نوجوان سے آپ کی شادی ہوگی، جس کو آپ غائبانہ دل و جان سے چاہتی ہیں، کہیے کیا شہزادی صاحبا میں نے غلط بیان کیا ہے؟

کہی جاؤ، یہ اچھی عورت، تمہیں خدا کی قسم دیتی ہوں تم اور جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو جلد سے جلد بیان کرو، اس لیے کہ تم نے میرے دل کی باتیں کہی ہیں، اور جو کچھ بھی بیان کیا ہے بالکل صحیح اور سچ ہے۔ تمہاری صداقت بھری باتوں سے میرے دل و دماغ اور سینے میں عشق کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ اب اور آگے کہنا!

اس مصنوعی عورت نے ایک خاص انداز میں اپنے دہنے گال پر سیدھے ہاتھ کی انگلی رکھتے ہوئے کہا، میری پیاری صاحبزادی، اس پیر بزرگ نے مجھکو سختی کے ساتھ ہدایت کی ہے کہ میں اس وقت اس شخص کا نام ہرگز ہرگز نہ بتاؤں جس سے آپ کو بے پناہ محبت اور عشق ہے، مگر اسی پیر کی ایک راز کی بات بتائے دیتی ہوں کہ ایک نہ ایک روز وہ حسین نوجوان اور ہماری پیاری شہزادی شادی اور بیاہ کے رشتے میں ایک ہو کر رہیں گے، اور یہ عہد آپ کے دل کی بات بھی ہے کہیے میں نے جو کچھ کہا، سچ ہے یا نہیں؟

یہ سنتے ہی رحیم النسا آپے سے باہر ہو گئی، اور غیر معمولی خشی کے باعث دیوانہ وار اس مصنوعی عورت سے کہنے لگی، اوہیری اچھی عورت، تم میرے قریب آؤ، قریب سے قریب تر آؤ، اٹھو، اور جلدی کو چ پر میرے برابر بیٹھ جاؤ۔ اس حکم کی تعمیل میں وہ مصنوعی عورت رحیم النسا کے قریب تر چلی گئی، اور والہانہ انداز میں رحیم النسا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر ایک سے زیادہ مرتبہ چوم لیا اور بار بار یہ کہتی رہی کہ تم واقعی کتنی اچھی عورت ہو، اور تم حقیقت میں کتنی بھلی عورت ہو، تم نے میرے دکھی دل کو دلاسا دیا ہے۔ اس لیے میں دل سے تمھاری قدر کرتی ہوں، اور جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو کہی جاؤ، میرے اچھے پیارے تمہارے خوش آیند اور نصیحت بھرے الفاظ سن کر میرے واقعی مجروح اور متضرر دل کو بے حد سکون اور اطمینان نصیب ہوا، چونکہ تم نے مجھے بے حد تسلی، تشفی دی ہے، اور دلاسا بھی دیا ہے اس لیے تمھارے اس غیر معمولی احسان کے بدلے میں لازمی یہ قیمتی پہنچیوں کی جوڑ بطور نذرانہ دیتی ہوں۔ مجھکو یقین کامل ہے کہ اچھی عورت کہ تم میرے اس ناچیز اور حقیر ترین تحفے کو ضرور بغور و قبول کرو گی، یہ کہتے ہوئے صاحبزادی نے اپنے دونوں ہاتھوں کی دو عدد پہنچیوں کو اس مصنوعی عورت کے حوالے کر دیا۔ دونوں پہنچیاں قبول کرتے ہوئے اس مصنوعی عورت نے کہا کہ میں اپنی شہزادی کے اس قیمتی تحفے کو قبول کرتے ہوئے آپ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں، اور اللہ جل شانہ، اور رسول اکرم سے صدق دل سے دعا کرتی ہوں، کہتے ہوئے اس عورت نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے، اور یہ کہا کہ یا اللہ تو بڑا ہی کارساز اور مشکل کشا ہے میری بارگاہ رب العزت میں اس لونڈی کی یہ دعا اور التجا ہے کہ تو اپنے بے پناہ رحم و کرم سے محبت کے متوالے اس نوجوان جوڑے کو شادی کے رشتے میں جلد سے جلد جوڑ دے کہتے ہوئے اس نے آخر میں "آمین" کہا، اور اپنے دونوں ہاتھ شہزادی کے چہرے پر پھیر دیئے۔ اس غیر معمولی اور غیر متوقع دعا کے اثر سے مغموم شہزادی کے دل کی کلیوں کو شگفتہ پھولوں میں تبدیل کر دیا، اور واقعی شہزادی کے چہرے پر بشاشت، خوشی، مسرت کی لہریں مسلسل دوڑ رہی تھیں۔

اس کے بعد اس مصنوعی عورت نے کہا پیاری صاحبزادی مجھے افسوس ہے کہ میرے ہاں زیادہ وقت نہیں ہے، ورنہ اور زیادہ دیر تک میں آپ کی خدمت میں بیٹھی رہتی اب مجھ کو اجازت دیجئے! میں جاتی ہوں، ہاں جانے سے پہلے دو باتیں ضرور کہے دیتی ہوں، اول یہ کہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ بالکل راز میں رہے، اور دوسرے یہ کہ دونوں ماماؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ان دونوں ماماؤں کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دیجئے کہ وہ ہماری گفتگو اور بات چیت کا ایک لفظ بھی کسی پر ظاہر نہ کریں، یاد رہے، اگر اتفاق سے بھانڈا پھوٹ گیا تو یہ سارا کھیل تماشا ضایع اور رائیگاں جائے گا۔ اس پر ان ماماؤں نے خدا کی بار بار خدا اور رسول کی قسمیں کھاتے ہوئے، پکا وعدا کیا کہ وہ یہ سب باتیں اپنی حد تک رکھیں گی، اور یہ راز مرتے دم تک کسی پر فاش نہ ہوگا۔

مجھکو تنہا پریشان حالت میں چھوڑ کر اس قدر جلد نہ جاؤ، رحیم النسا نے اس مصنوعی عورت سے کہا جانے سے پہلے اس سلسلہ کی کچھ اور داستان اور کہانی سناؤ، اچھی عورت، جس کے نتیجے کے طور پر باقی رات امن اور سکون سے گزار سکوں، اور جب میں سو کر اٹھوں گی تو میرا دکھی دل تمھاری خوش خبریوں سے متاثر ہو کر بھولے نہ سمائے گا۔

یہ سن کر اس مصنوعی عورت نے کہا صاحبزادی صاحبہ میں نے جو کچھ بیان کیا وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے اپنی طرف سے باتیں بنا کر میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ آخر میں میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنی دونوں ماما جی کو آج رات میرے ساتھ کر دیں۔ اور جب باقی حالات کا

جایئے لوں گی تو پھر آپ کی اجازت سے میں دوبارہ حاضر خدمت ہوں گی۔

اس پر صاحبزادی نے کہا کہ "اچھی عورت، تم کو میری اجازت ہے، تم جس وقت بھی چاہو میرے پاس آسکتی ہو، لیکن تو یہ ہے کہ میں دل سے یہ چاہتی ہوں کہ تم جلد سے جلد کوئی اور خوش خبری لے کر میرے گھر آؤ۔ اس کے بعد اپنی دونوں مامائی کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے رحیم النسا نے کہا، "مامائی تم دونوں کو اجازت ہے، تم دونوں بھی آج رات اس اچھی عورت کے ساتھ اسکے گھر جاؤ اور وہ جب کبھی تمہیں واپس جانے کی اجازت دے میرے ہاں چلی آنا۔"

باہر جاتے ہوئے پلٹ کر آئی، اور اس مصنوعی عورت نے شہزادی سے کہا، "میری پیاری شہزادی، میں نے ایک اہم بات کہنی بھولا دی تھی، وہ یہ کہ آپ کی ماں نے مرتے وقت میرے جواہرات کی جو مالا آپ کو دی تھی، وہ میرے حوالے کر دیجئے، اس لیے کہ یہی مالا ہمارے مانے ہوئے بزرگ پیر کے مزار پر بطور نذرانہ پیش کرنی ہوگی۔"

یہ سن کر رحیم النسا نے تعجب کے ساتھ کہا، "یہ سچ ہے کہ میری ماں نے مرتے وقت مجھکو میرے جواہرات کی ایک نہایت قیمتی مالا دی تھی، جس کو میں نے صرف ایک مرتبہ پہنا تھا، اور وہ مالا اب تک میرے کپ بورڈ کے اندر ایک مقفل صندوق میں محفوظ ہے، میں نے آج تک دوبارہ اچھو تک نہیں، مگر سچ سچ بتاؤ، میری اچھی عورت کہ تمہیں اس راز کا کیسے علم ہوا؟ یہ راز تو صرف میری دیوڑی تک محفوظ ہے۔ دیوڑی سے باہر کسی بھی آدمی کو اس راز کا علم نہیں ہے۔"

یہ سن کر اس عورت نے کہا، "میری دانشمند اور عقلمند صاحبزادی، میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ہمارے بڑے پیر کی مہربانی سے میں غیب کے حالات بھی آسانی سے معلوم کر سکتی ہوں، صرف اسی ایک مالا پر کیا منحصر ہے، میں تو آپ کے سارے گھر اور دیوڑی کے تمام حالات بتا دیتی ہوں!

رہا یہ بات ہے! تب تو ٹھیک ہے، کہتے ہوئے رحیم النسا نے اس مصنوعی عورت سے کہا، "تم ہمیں ابھی یہ مالا لا کر تمہیں حوالے کیے دیتی ہوں، کہتے ہوئے شہزادی کپ بورڈ کی طرف گئی اور اس میں سے صندوق نکالا، اور اس کا تالا کھول کر اس میں سے اپنی عزیزاں کی دی ہوئی یادگار مالا نکال لے آئی، اور اس مصنوعی عورت کے حوالے کرتے ہوئے کہا، "لو یہ رہی وہ مالا، اگرچہ یہ مالا بہت قیمتی ہے

جس کو میں اپنی جان سے زیادہ پیار کرتی ہوں، لیکن اچھی عورت تم یقین جانو کہ میرے اپنے محبوب اور منظور نظر کے مقابل یہ قیمتی اور عزیز ترین مالا بھی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔"

شہزادی سے اس مالا کو لیتے ہوئے اس مصنوعی عورت نے کہا، "میری اچھی صاحبزادی آپ یقین مانئے کہ میں ایک فقیر منش اور گوشہ نشین عورت ہوں اس قیمتی مالا کو لے کر کیا کروں گی، میں نے پہلے بھی آپ سے کہا ہے کہ جہاں تمام میں جو پیر ہیں ان کو نذر دینا ہے اور ان پیر کو آپ خود بھی جانتی ہیں کہ آپ کی سات پشت مانتی چلی آئی ہے۔"

مالا کو اپنے جسم کے اندرونی کپڑے میں لپیٹتے ہوئے وہ مصنوعی عورت، آخری بار صاحبزادی کو بار بار ادب سے آداب کرتے ہوئے، دونوں مامائی کے ساتھ چلی گئی۔

ان تینوں عورتوں کے جانے کے بعد صاحبزادی رحیم النسا اپنی سنہری اور زرین مسہری پر جا لیٹی، اور خستی اور مست کی حالت میں، دونوں ہات آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا اے میرے اللہ! او میرے خدا اور میرے ارحم الراحمین اور اے میرے ساری دنیا اور کائنات کے مالک تو میرا بھی مالک ہے، اس لیے تو میرے حال زار پر رحم کر، رحم کر، رحم کر میں صرف اور صرف تیری طرف دیکھتی ہوں، اور صرف تجھ سے عرض معروض کرتی ہوں کہ تو میرے محبوب اور ساجدار کو مجھ سے جلد سے جلد ملا دے تاکہ ہم دونوں رشتۂ مناکحت میں جکڑ جانے کے بعد ہنسی خوشی کے ساتھ اپنی باقی زندگی گزار دیں، اور وہ میرے محبوب! میرے تاجدار! میرے دل کے مالک! بتا تو کہاں چھپا بیٹھا ہے، آجا جلد سے جلد آجا، اور اپنی گرم آغوش میں بھر لے، اے میری محبت کی شمع میں پروانا بن کر تجھ پر سے فدا ہونے کے لیے تیار ہوں آ، اسی وقت آ، اور جلد سے جلد آجا!۔

ویسے میں رحیم النسا کی دو چار سہیلیاں آگئیں، پھر تو سبھوں نے مل کر آپس میں مذاق کی باتیں شروع کر دیں۔

رحیم النسا نے اپنے ملازمین کو آزاد دی تو خود وہ ایک عورت آگئی، چنانچہ اس سے شہزادی نے کہا کہ میرے خانے جا کر بڑے شلجم سے کہو کہ خورد و نوش کا تیار کر کے دوسرے لوازمات کے ساتھ اسی وقت بھیج دے۔ یہ سنتے ہی وہ عورت چلی گئی اور یہ پھر سے باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چار بڑی بڑی کشتیوں میں کافی کیک پیسٹری وغیرہ لیکر ملازم عورتیں آگئیں اور ہر ایک کشتی کو ایک ایک عورت نے اپنے سر پر رکھ کر زنانہ

آذر۔ دے۔ بہمن ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۲ء

جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)
فرزند راز دار خان صاحب بوزنی (مرحوم)

ایڈیٹر
"ہندستانی ادب"

راز دار خان صاحب بوزنی (مرحوم)

ہندستانی ادب نے پچھلے نمبر کے ساتھ اپنے وجود کے (۳۲) سال پورے کرلیے، اور اس نمبر کے ساتھ اکتوبر ۱۹۷۳ء سے (۳۳) ویں سال میں قدم رکھا ہے، اور ہم نے ۳۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو اپنی عمر کے (۷۰) ستروں سال میں قدم رکھا ہے۔ ایک طویل عرصے سے ہمارا ارادا تھا کہ ہم "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں پر یہ واضح کریں کہ ہم "کون" ہیں ــــ و "کیا" ہیں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لیے کہ "ہندستانی ادب" کی (۳۳) سالا علمی ادبی خدمات ہماری کارکردگی کا ثبوت اور ہماری عالا قابلیت کی ضامن ہیں۔ ہم نے سرکاری یا غانگی حیثیت میں کوئی ملازمت اختیار نہیں کی۔ اگر آج سے (۳۳) سال پہلے یا اس سے بھی پہلے سرکاری ملازمت اختیار کی ہوتی تو حسب ضابطا ہمیں بھی (۵۵) سال میں وظیفا ہوتا، اور (۱۵) سال سے ہم وظیفے کی معقول آمدنی پر چین آرام کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کرسکتے تھے، لیکن ملازمت کی غلامی کو ہم نے صحافتی آزادی کو ترجیح دی، اور علمی ادبی صحافت کو پیشا بنایا، جس کو آج ہم بری طرح سے بھگت رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نام نہاد آزادی کا طوق ہمارے گلے میں پڑ گیا، اور بری طرح سے ہمارا گلا دبوچ رہا ہے، نہ معلوم کس آن ہمارا خاتمہ کردے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے خاتمے کے معنے "ہندستانی ادب" کا بھی خاتمہ ہے اور "ہندستانی ادب" کے خاتمے کے معنی ہمارا بھی خاتمہ ہے، اس لیے "ہندستانی ادب" اور ہم دونوں اس طرح گھل مل کر ایک ہوگئے ہیں کہ دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور بقول شاعر ؎ من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی تا کس نگوید بعد ازآں من دیگرم تو دیگری "یہ نہیں کہ ملازمت نہیں ملی، ملی اور گھر مل کر آئی، مگر ہم نے اس کو بری طرح سے ٹھکرا دیا۔ ہمارے مخلص اور کرم فرما نواب مہدی نواز جنگ بہادر (مرحوم) سابق گورنر گجرات، حیدرآباد کے تاریخی پولیس ایکشن سے پہلے فڈ کارپوریشن آف حیدرآباد FOOD CORPORATION OF HYDERABAD کے چیرمن CHIRMAN تھے۔ اپنے ماتحتوں کے تقرر، تبدل اور ترقی وغیرا کے سلسلے میں ان کے زبردست اور بڑے اختیارات تھے۔ انہوں نے اپنے ایک ماتحت

کے ذریعے (۵۰۰) پانسو روپے ماہوار تنخواہ کی ملازمت کا آفر OFFER ہمارے پاس بھجوایا، اور ہم نے اس آفر کو بڑی طرح سے ٹھکرا دیا۔ آفر لانے والے سے ہم نے کھلے الفاظ میں یہ کہا کہ جاکر نواب صاحب سے یہ کہنا کہ ہم آپ کی اس غیر معمولی عنایت اور مہربانی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہم اس وقت آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، اس لیے غلامی کا طوق گلے میں کون ڈالے۔ آفر لانے والے بھی ہمارے ملاقاتی تھے انہوں نے بھی زور دیا کہ ہم اس پیش کش کو قبول کرلیں، اس لیے کہ ملازمت کرتے ہوئے بھی ایک علمی اور ادبی رسالا چلا سکتے ہیں، اور انہوں نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ کیا معلوم رسالا چلے یا نہ چلے مگر ملازمت کی شکل میں (۵۵) سال کے بعد وظیفا ملتا ہے جس کی ماہوار آمدنی سے ہر شخص مرتے دم تک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ہم نے ان کی یہ بات بھی سنی ان سنی کر دی اور آج ہم خدا یہ کہتے ہیں کہ واقعی اس وقت ہمارے کان بہرے ہوگئے تھے، اگر ہم نے وہ سنہرا اور زرین مشورا سن لیا ہوتا تو آج مالی پریشانیوں کے بھنور میں نہ پھنستے سچ پوچھو تو ہماری صف سے کئی درجے نیچے کی مالی حالت اور مالی پریشانیوں کو کوئی بھی نہیں جانتا بقول حافظ ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنین حائل کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

بعد کی ایک ملاقات میں نواب مہدی نواز خنگ ہم پر بہت بگڑے، بلکہ برہم بھی ہوئے، اور کہا کہ "خان صاحب! پانسو روپے کی مدد گاری کی آپ نے کوئی قدر نہیں کی (۵۵) سالا وظیفے کی عمر تک نہ معلوم کس خدمت پر پہنچ جاتے اور آپ کو ہماری وظیفا ہوتا جو آخر زمانے میں ہر شخص کی زندگی کا بہترین سہارا بن سکتے

ہیں، غلامی کی طرف طبیعت کا رجحان نہیں ہے، یہ سنتے ہی مسکرا دیا اور خاموش ہو رہے۔

پولیس ایکشن کے بعد نواب مہدی نواز جنگ، بہادر (مرحوم) حکومت آندھرا پردیش کے وزیر لیبر، صحت عامہ، میڈیکل، اور سوشیل ویلفیر وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ ایک خانگی ادارے سوشل ویلفیر کے چیرمین بھی تھے، اور راے جانکی پرشاد (مرحوم) اس کے آنریری جنرل سکریٹری تھے۔ یہ غالباً ۱۹۵۷ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت نواب میر احمد علی خان نے ہمارے حلقے ملک پیٹ سے اسمبلی کے لئے انتخاب لڑا تھا، اور ہمارے مکان کے دیوان خانے میں انتخابی مہم کا مرکز قایم کیا تھا، جہاں روزانہ صبح سے شام تک ان کے ورکرس آیا کرتے تھے، اور جب ضرورت ہوتی دن اور رات میں دو چار مرتبہ وہ خود بھی آیا کرتے تھے، چنانچہ ہم دونوں کے بیچ بکثرت ملاقاتیں ہیں۔ اس لئے "ہندستانی ادب" کی نامکمل سرویوں کا پورا حال احوال ان پر واضح ہو گیا، اس لئے بطور ہمدردی، انہوں نے یہ تجویز نواب مہدی نواز جنگ پر ظاہر کر دیا۔ نواب صاحب نے ان سے تو کچھ بھی نہیں کہا، صرف یہ بیان کیا کہ کل (۱۲) بجے آپ سوشیل ویلفیر کے دفتر میں جانکی پرشاد صاحب کے ہاں میرا انتظار کیجئے۔ میں ٹھیک وقت پر وہاں آجاؤں گا، چنانچہ دوسرے روز احمد علی خان وہاں گئے، اور نواب صاحب بھی وقت پر پہونچ گئے، اور یہ تینوں حضرات ہمارے گھر چلے آئے۔ تقریباً ۱۲½ بجے کا وقت تھا، ہم بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ ایسے میں کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی، دیوان خانے کا دروازہ کھولا تو دیکھتے کیا ہیں، یہ تینوں حضرات مسکراتے کھڑے ہیں، اور سڑک پر نواب صاحب کی شاندار کار موجود، اور ڈرائیور بھی کھڑا ہے، ہم نے تینوں کو خوش آمدید کہا۔ اور بیٹھنے کے لئے کہا تو اس کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا ارے واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم تو آپ کا مکان دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا تشریف لائیے، مکان تو آپ کا دیکھا بھالا ہے۔ آپ کے لئے نیا نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ تینوں حضرات دوسرے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں فرش پر بیٹھے ہم اداریہ لکھ رہے تھے، اس لیے تمام کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔

یہ حال دیکھ کر نواب صاحب نے فرمایا، افسوس آپ کام کر رہے تھے اور آپ کے کام میں حرج ہوا، ہم نے کہا، نہیں تو آپ تینوں حضرات کا آنا ہمارے لیے افضل ہے، کام تو بعد میں بھی ہوتا رہے گا۔

اس کے بعد وہ اندر سے ہوتے ہوئے صحن میں گئے اور پپائی اور آم کے درختوں کو دیکھ کر کہا، آپ نوکروں، پپائی غالباً انہیں درختوں سے بھجواتے ہیں، جی ہاں! ہم نے کہا دو درخت ھنی ڈیو HONEY DEW اور دو درخت واسنگٹن WASINGTON کے ہیں اور یہ دونوں بھی اقسام یا VARIETIES آپ کی پسند کے ہیں، اور انہی درختوں کی پپائی نوکروں میں رکھ کر آپ کے بنگلے پر بھجوائی جاتی ہے۔ کہنے لگے آم کے ایک چھوڑ دو درخت ہیں، مگر کبھی آپ نے اپنے گھر کے آم نہیں کھلائے ہیں۔ ہم نے عرض کیا، کرم فرمائیے بتائیں ایک درخت دیسی ملغوبے کا ہے اور دوسرا سوا محمود کا ہے۔ دونوں ہی پھل بہت بڑے ہوتے ہیں، اور نہایت ہی لذیذ اور مزیدار بھی۔ مگر محلے کے شیطان صفت بچے، ہمارے گھر سے یا ہر جاتے ہی، دوسرے مکانوں کی چھت [illegible] اس کے بعد

ہم نے کہا کہ لیموں اور انجیر کے بھی درخت ہیں، لیکن ان درختوں کے پھلوں کا بھی وہی حشر ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر سے دیوان خانے میں آئے، ہم نے بیٹھنے کے لئے کہا تو فرمایا ٹھیک ایک بجے مجھے دفتر وزارت میں رپورٹ دینا ہے، اب صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں، میں دس منٹ میں دفتر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد یہ ارشاد ہوا کہ جانکی پرشاد صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا، محترم! یہ عجیب بات ہوئی، راے صاحب تو ہمارے سامنے کھڑے ہیں، کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں، راے صاحب یہ سن کر نواب صاحب نے فرمایا، نہیں وہ اپنے دفتر سوشل ویلفیر میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم نے راے صاحب سے دن، تاریخ اور وقت معلوم کیا تو انہوں نے کہا کہ کل دفتر پر (۱۲) بجے آجیے۔ یہ سنکر ہم نے ان تینوں حضرات کا پھر سے شکریہ ادا کیا، اور وہ لوگ کار میں بیٹھ کر پھر روانہ ہو گئے، اور پھر ہم اداریا لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

دوسرے روز ہم سوشل ویلفیر کے دفتر گئے۔ جانکی پرشاد صاحب نے اپنے پیشی کے چپراسی سے کہہ رکھا تھا کہ ہم آئیں تو کارڈ لے آنے کی ضرورت نہیں، بلکہ کمرے کا دروازا کھول دیا جائے، چنانچہ بالکل یہی ہوا، ہم گئے اور چپراسی نے دروازا کھول دیا، ہم اندر داخل ہوئے راے صاحب کرسی پر بیٹھے تھے گئے خیر خیریت کے بعد انہوں نے چپراسی کو بلوا کر چاے لانے کے لیے کہا، چپراسی چلا گیا ہم دونوں باتوں میں مصروف ہو!

جانکی پرشاد صاحب نے فرمایا، خان صاحب! نواب میر احمد علی خان صاحب نے نواب صاحب سے آپ کے رسالے کی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے، اور نواب صاحب اس سے بے حد متاثر ہوے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح آپ کی مالی امداد ہو، تاکہ رسالے کو بھی چلا سکیں، اور اپنی ذاتی پریشانیوں کو بھی دور کریں۔ ہم نے کہا، اس کے حل کی کیا صورت نکالی ہے تو اس کے جواب میں راے صاحب نے فرمایا کہ ہمارے دفتر میں آپ کیلیے خاص طور سے دو سو روپے کی نئی جائیداد نکالی ہے، ان کا کہنا ہے کہ آپ دفتر میں کسی وقت بھی آن کر حاضری کے رجسٹر پر دستخط کر دیں اور اگر آپ روزانا نہ آسکیں تو چار روز میں ایک مرتبا بھی دفتر آسکتے ہیں، اور نواب صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اگر خان صاحب دفتر کے کام میں دلچسپی لینا چاہیں تو ان کے موزوں کام بھی دیا جاے، بہرحال وہ یہ چاہتے ہیں کہ ماہانہ دو سو کی آمدنی سے آپکی ذاتی اور رسالے کی پریشانیوں میں تھوڑی سی کمی ہو!

ایلے میں دو کشتیوں میں چلے، کیک، پیسٹری، بسکٹ وغیرہ کے دو چپراسی آ گئے۔ دونوں کشتیاں ساتھ ساتھ رکھنے کے بعد راے صاحب نے چپراسیوں کو جانے کے لیے کہا، اور خود ہی چلے بنائی، اس کے بعد ہم دونوں چلے بھی پیتے رہے، اور کیک، پیسٹری، بسکٹ وغیرہ بھی کھاتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے۔

دو سو روپے کی ملازمت کا حال سنتے ہی ہمارے ہوش اور حواس جاتے رہے، اور ہم سخت حیران اور پریشان ہو گئے کہ آخر اس آفر کو کس طرح ٹالیں، ہم ابھی اس اہم نکتے پر غور ہی کر رہے تھے کہ راے صاحب نے خود ہی پوچھ لیا کہ، خان صاحب! آپ نے ہماری پیش کش کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم نے فوری دماغ لڑایا، اور کہا، راے صاحب! ہم نواب صاحب کا اور آپ کا، نیز نواب احمد علی خان صاحب کا بھی اپنے تئیں کرم فرماؤں کا ہم دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ حضرات کو ہماری شخصی خستہ حالی اور رسالے کی مالی پریشانیوں کا کس حد تک خیال ہے اور ان پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے آپ حضرات نے دو سو روپے کی نئی جائداد ہمارے لیے نکالی ہے اور اس سلسلے میں کتنی سہولتیں ہمیں دے رکھی ہیں۔

راے صاحب! آپ یقین جانیے، اس وقت ملازمت کرنے سے ہمیں کوئی عار نہیں، مگر جب ملازمت کرنی ہی ہے، اور جب غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا ہی ہے تو پانچ چھ سو روپے سے کم کی غلامی کا طوق ہم اپنے گلے میں نہیں ڈالیں گے!

یہ سن کر راے صاحب پرشاد صاحب نے کہا کہ، نہیں خان صاحب! اس دفتر میں اس سے زیادہ معاوضہ دینے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ اس ادارے کا موازنہ اسی خسارے میں چلایا جاتا ہے۔ ہم نے کہا، تب تو آپ اس وقت نواب صاحب کو فون کر دیجیے کہ ہم دو سو روپے کی ملازمت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، چنانچہ اسی وقت راے صاحب پرشاد صاحب نے نواب مہدی نواز جنگ سے فون پر بات چیت کی اور یہ سارا ماجرا کہہ سنایا، اس کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا، خان صاحب سے کہو وہ اسی وقت میرے دفتر آن کر مجھ سے ملیں۔

ہم فوراً نواب صاحب کے دفتر گئے۔ چپراسی کا جمعدار ہمارے ہی انتظار میں کھڑا تھا، ہمارے جاتے ہی آداب بجا لایا ہم نے کہا نواب صاحب ہیں؟ جی ہاں ہیں، کہتے ہوئے اجلاس کا دروازہ کھول دیا، ہم اندر داخل ہوتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ باقاعدہ اجلاس ہو رہا ہے، پچاس ساٹھ اہل غرض تین طرف کرسیوں پر لدے بیٹھے ہیں، ہر ایک کے ہاتھ میں درخواستوں اور کاغذات کے پلندے ہیں، عین مقابل سامنے میز اجلاس پر ہر ایک کی عرض معروض سن رہے ہیں، **ہمیں دیکھتے ہی نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ تمام اہل غرض بھی اٹھ گئے۔ ہم شرمندگی محسوس کر کے لوٹ رہے تھے کہ خدا نہوں نے للکارا، ادھر آیئے خانصاحب! واپس کیوں جا رہے ہیں۔**

ہم ان کے قریب گئے، اور اپنی شرمندگی اور افسوس کا اظہار کیا، ہم نے کہا ہم نے جمعدار صاحب سے دریافت کیا تو اس نے ہم سے یہ نہیں کہا کہ آپ یہ سر اجلاس ہیں اور وہاں اہل غرض بھی بیٹھے ہیں۔ ہم وزیٹرس روم میں بیٹھے جاتے، اور اجلاس کے ختم پر آپ سے ملتے، اس کے جواب میں مسکراتے ہوئے فرمایا کہ خدا نے

ان کے بازو ایک اونچے پورے سوٹ پہنے ایک صاحب کھڑے تھے۔ ان کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا آپ کو جانتے ہیں آپ؟ ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا ہے، ہلکا سا تعارف آپ ہی خود کر دیجئے۔ ارے یہ تو کرکٹ کے مشہور کھلاڑی غلام احمد صاحب ہیں، اور آپ میسرز P.S. ہیں۔ ہم نے کہا، ہم نے تو آپ کے پچاسوں ہی کرکٹ میچ دیکھے ہیں، اور ہم آپ کے کھیل کے مداحوں میں سے ہیں۔ اس پر نواب صاحب نے فرمایا، تب تو آپ دونوں ہمارے چیمبر میں بیٹھ کر باتیں کریں، میں پندرہ بیس منٹ میں اپنا یہ ضروری اور اہم کام ختم کر کے آتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے ہم چیمبر کی طرف جا رہے تھے کہ پلٹ کر میرے سے فرمایا:

خان صاحب! اگر آپ کو ضروری کام سے فوراً جانا ہے تو میں اجلاس روک کر ابھی آتا ہوں، اور آپ سے گفتگو کے بعد اپنا کام ختم کر لوں گا۔!

ہم نے اس کے جواب میں یہ عرض کیا کہ ہم آپ کے اہم ترین اور ضروری کام میں بے جا طور پر مخل ہو گئے ہیں جس کا ہمیں سخت افسوس اور ملال ہے، اور اب ہرگز اجلاس روک کر آپا ہمیں اور بھی شرمندا کرنا چاہتے ہیں، جی نہیں آپ اپنا کام کیجئے، چاہے آپ کا اجلاس ایک گھنٹے تک جاری رہے ہم آپ کے چیمبر میں بیٹھے رہیں گے۔ اسکے بعد ہم اور غلام احمد صاحب کرکٹ کھلاڑی دونوں ہی چیمبر میں گئے۔ پہلے تو کرکٹ کے بارے میں بات چیت رہی۔ اسی کے بعد "ہندستانی ادب" کا ذکر چھڑ گیا۔ آدھ گھنٹے بعد نواب صاحب تشریف لے آئے اور ان کے P.A. چلا گئے، اور پھر ہم دونوں باتوں میں مصروف ہو گئے۔

انہوں نے جانکی پرشاد صاحب کے خیال کی تائید کی اور یہ کہا کہ ماہانہ دو سو روپے سے زیادا کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ **اور ہم نے کھلے اور واضح طور پر یہ کہدیا کہ عمر میں پہلی بار ملازمت کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال رہے ہیں تو دو سو روپے کا ہلکا طوق ہرگز ہرگز نہ ڈالیں گے، اور جب غلامی کرنا ہی ٹھہری تو کم سے کم پانچ چھ سو روپے کی ملازمت دیجئے، تو ہم کرنے تیار ہیں۔**

جب انہوں نے قطعی طور پر نفی میں جواب دیا تو ہم نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ تو سلوک کرنا چاہتے ہیں، ہمارے رسالے کے ساتھ کیوں سلوک نہیں کرتے؟ اس پر انہوں نے دریافت کیا کہ آپ ہی بتلایئے، میں رسالے کے کس طرح سے سلوک کر سکتا ہوں۔ ہم نے سوشل ویلفیر کے جتنے بھی سنٹر یا مراکز ہیں ان کے نام رسالا جاری کروا دیجئے اور ان سب کا سالانا چندا ہمیں پیشگی دلوایئے۔ اس پر فون اٹھا کر انہوں نے جانکی پرشاد صاحب سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ (۱۵) سنٹر ہیں۔ اس وقت نواب صاحب نے فرمایا کہ ان (۱۵) سنٹر کے نام رسالا جاری کرنے کا آرڈر ہمارے نام دیا جائے اور ان کا چندا پیشگی دے دیا جائے۔ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم سوشل ویلفیر کے دفتر گئے۔ اسی وقت ہمیں (۱۵) پرچوں کا آرڈر بھی مل گیا، اور ایک سو بیس (۱۲۰) روپے کا چیک بھی دیا گیا۔ اس وقت رسالے کا چندا سالانا آٹھ روپے تھا۔ جب تک نواب صاحب سوشل ویلفیر کے چیرمن رہے یہ (۱۵) پرچے جاری رہے، اور ان کے بعد ایک شیطان صفت عورت روڈا مستری کا انتخاب

اس کے علاوہ، ہمیں ملازمت کا ایک اور بھی موقع ہاتھ آیا تھا۔ وہ اس طرح کہ جنوری ۱۹۵۱ء میں منسٹری آف ڈیفنس کی طرف سے ایک ہفتہ وار، ہندستانی زبان میں، فوجی اخبار، کی ادارت کا اخباروں میں اشتہار آیا تھا۔ ۵۰ اشتہار ہماری نظر سے گزرا۔ اس میں لکھا تھا کہ ایڈیٹر کسی یونیورسٹی کا ایم اے ہو اور اس کے مضامین ہندستانی زبان، اور ادب رہے ہوں اور کم سے کم (۵) سال تک آزادانہ طور پر علمی اخبار یا رسالے کا ایڈیٹر رہا ہو۔ اس کی ماہوار تنخواہ (۷۰۰) تا (۱۰۰۰) ہوگی۔ اس کے علاوہ ضروری الاؤنس وغیرہ الگ دیے جائیں گے، اور اس کو کپتان یا CAPTAIN کا فوجی درجہ یا RANK بھی دیا جائے گا۔ اس کا باقاعدہ الگ اپنا دفتر ہوگا اور اس کے تحت سب ایڈیٹر بھی ہوں گے۔ یہ اشتہار دیکھ کر ہم نے انگریزی میں ایک درخواست لکھی، اور اس کو نائیپ کروا کر رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعے بھجوائی، اور الگ "ہندستانی ادب" کے مختلف ایک درجن سے زیادہ نمبر بھی بھجوائے، جن میں بعض خاص نمبر بھی شامل تھے۔ ہم نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ ۱۹۴۱ء میں یہ رسالہ جاری ہوا تھا۔ مسلسل (۱۰) سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ہمارا کوئی بھی شریک کار نہیں ہے۔ ہم مدتی تنہا دس سال سے اس اہم رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دیتے چلے جا رہے ہیں، اور اس رسالے کے کئی ایک خاص نمبر بھی کامیابی کے ساتھ شائع کیے ہیں، جن میں سے بعض، جو دفتر میں بیچ رہے، وہ بطور نمونہ ارسال ہیں۔ اس واقعے کے تقریباً دو ہفتے بعد ہمارے نام اس منسٹری سے ایک لیٹر آیا، جس میں لکھا تھا کہ انتخابی بورڈ نے آپ کو بہ حیثیت ایڈیٹر "فوجی اخبار" منتخب کر لیا ہے، اس کے ساتھ ایک ضروری فارم روانہ ہے، جس کی خانہ پری کرتے وقت آپ یہ ضرور بتائیں کہ آیا آپ ابتدائی گریڈ قبول کریں گے یا انتہائی گریڈ۔ ظاہر ہے کہ کوئی بے وقوف سے بے وقوف آدمی بھی (۳۰۰) سو روپے ماہوار کا اپنا نقصان گوارا نہیں کرے گا۔ ہم نے لکھ بھیجا کہ ہم انتہائی گریڈ (۱۰۰۰) لینا پسند کریں گے۔ یہ لیٹر بھی رجسٹری کے ذریعے بھجوایا۔ اس کا جواب غالباً دسویں بارہ روز بعد آیا جس میں لکھا تھا کہ سکنڈ کلاس کا ریلوے پاس بھجوایا جا رہا ہے اور بورڈ نے نظر ثانی کے بعد یہ طے کیا ہے کہ اس وقت آپ کو صرف ابتدائی گریڈ (۷۰۰) سو دیا جائے گا۔ اور جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، (۱۰۰۰) نہیں دیا جائے گا۔ اگر آپ کو بورڈ کی یہ شرط منظور ہے تو فوراً چلے آیئے۔

اس کے جواب میں ہم نے لکھا کہ انتہائی گریڈ (۱۰۰۰) ایک ہزار کی شرط، ہماری طرف سے نہیں تھی، بلکہ خود آپ نے خود ہمیں موقع یا CHOICE دیا تھا، اس لیے ہم نے وہ شرط لکھ بھیجی تھی۔ ہم اپنی زبان اور قلم کے پابند ہیں، ہم نے جو بھی فیصلا کیا ہے، وہ حرف آخر ہے، اس لیے ہمیں آپ کا بعد کا دیا ہوا ابتدائی گریڈ قبول نہیں ہے، ہم نئی دہلی نہیں آئیں گے، اس لیے آپ کا بھجوایا ہوا ریلوے پاس بھی واپس مرسل ہے۔

[illegible] ہو سکتا ہے کہ ہمارے [illegible] کہنے سے پہلے کوئی سفارشی ٹٹو انہیں مل گیا، اور وہی

سفارش سے کوشش کر کے اس نے بورڈ کے ارکان کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ ہمارے انتخاب کو رد کرنے کی کوئی صورت نکالی جائے، تاکہ یہ بلا ٹل جائے اور اس کا تقرر ہو جائے، چنانچہ بلکل یہی ہو کر رہا۔ ہم دلی نہیں گئے اور اس جگہ پر کسی اور کا تقرر ہو گیا!

اس واقعے کے بعد عرصا بعد جب ہم نے ساری داستان، ہمارے مخلص اور کرم فرما نواب مہدی نواز جنگ بہادر کو کہہ سنائی اور وہ مراسلات وغیرا بھی دکھلائے تو ہم پر بری طرح برس پڑے کہنے لگے، یہ کیا حرکت کی آپ نے، ارے خان صاحب! ۷۰۰ روپے کا ابتدائی گریڈ ہی قبول کر لیا ہوتا۔ بعد میں ترقی کر کے ایک ہزار روپے آپ کی تنخواہ ہو جاتی، اور فوجی کمیشن کا آپ کو رینک ملتا۔ آپ کا ایک باقاعدہ دفتر ہوتا، اور آپ کے تحت سب ایڈیٹر بھی ہوتے اور آگے آگے چل کر نہ معلوم آپ کہاں تک ترقی کرتے **پولیس ایکشن سے پہلے میں نے پانسو روپے کی ملازمت کا آفر بھجوایا تھا تو آپ نے اس کو بر، طرح سے نظر انداز کر دیا تھا، اور اب ۷۰۰ سات سو روپے کی ملازمت کو ٹھکرا دیا۔ آپ نے واقعی اپنے حق میں برا کیا، سچ پوچھو تو آپ کی اس نادانی پر مجھ کو سخت غصا آرہا ہے۔**

ہم نے کہا محترم نواب صاحب! اگر ہم پیسے کے لالچ میں اس دوسری شکل کو قبول کر لیتے تو ہماری "خدداری" کا خون ہو جاتا! آپ جانتے ہیں ہم "اصولی" انسان ہیں، اور اپنی بات کے پکے ہیں، اپنے اصول کے پیش نظر ہم سینکڑوں اور ہزاروں کے نقصان کی بھی مطلق پروا نہ کرتے، چنانچہ تازا ترین مالی نقصان ہماری خدداری اور ہمارے اصول کا پکا یا بین ثبوت ہے۔ افسوس ہے کہ ہمیشا سے آپ ہماری خدداری اور اصول پسندی کی تعریف کرتے آرہے ہیں، اور آج خد آپ ہی ہماری خدداری کا ناس کرنے پر تل گئے ہیں۔ یہ کہتے ہی مسکراتے ہوئے ہمیں گلے سے لگا لیا اور یہ کہا کہ واقعی آپ کی ہستی مغتنم اور قابل قدر ہے، اسی لیے آپ کو دل سے چاہتا اور آپ کی قدر بھی کرتا ہوں!

اس نوٹ میں ان ضروری اور اہم واقعات کے پیش کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ **راز دار خان صاحب بوزئی** (مرحوم) **متصدار اور جمعدار کا یہ سیوت نکما یا ناقابل نہیں ہے، بلکے**

زمانے کے حالات اور واقعات نے اس کو مالی اعتبار سے کامیاب بننے سے قاصر رکھا۔ اگر وہ چاہتا، اور ابتدائی زمانے میں ملازمت یا غلامی اختیار کرلی ہوتی تو درجا بدرجا ترقی کرتے ہوئے نہ معلوم کہاں تک پہنچ جاتا، اور نہ معلوم آج کتنا بھاری وظیفا پاتا رہتا!

بہرحال آج ہمیں اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ہم نے اپنے خوددار باپ کی تقلید کرکے، ان کی بڑائی اور بزرگی کی لاج رکھ لی۔ اس وقت ہمیں کسی قسم کی حرص و ہوس نہیں ہے بلکے سچ پوچھیے تو ہم اپنی غربت کی کملی میں مگن اور خوش ہیں۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہمارے "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ "جی۔ ام۔ خان" کون اور کیا ہے؟ ایک طویل عرصے سے ہمارا ارادا تھا کہ اس سلسلے میں بھی قلم چلائیں مگر کچھ نہ کچھ مجبوریاں حایل ہوتی رہیں اسی لیے آج سے پہلے ہم اس بارے میں نہ لکھ سکے۔ اب چونکے "**شہزادی کا رومان**" ناول ہم نے والد محترم کے نام **معنون** کیا ہے اس لیے اس موقع سے فایدا اٹھاتے ہوئے ہم نے اپنے والد بزرگوار کے سلسلے میں معلومات قلمبند کی ہیں اور مہتاسی سے ہمارا یہ خیال تھا کہ جب کبھی ہم اپنے بارے میں قلم چلائیں گے تو پہلے اپنے والد کے سلسلے میں لکھیں گے، اس کے بعد ہم اپنا تعارف کرائیں گے، چنانچے اس وقت پہلے والد صاحب کے خاندانی حالات پیش کیے جا رہے ہیں اور اس کے بعد کسی موقع پر ہم اپنے واقعات اور حالات سے بھی "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کو واقف کرائیں گے۔

جی۔ ام۔ خان ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

رازدار خان صاحب کے جد امجد

رازدار خان صاحب یوزئی کے جد امجد رازدار خان صاحب یوزئی تقریباً (۳۰۰) تین سو سال پہلے افغانستان سے جے پور (راجستھان) آئے تھے۔ اور یہیں مستقل طور پر وہ بس گئے تھے۔ اس وقت صرف رازدار خان صاحب کا خاندان یا قبیلا یا جرگا ہی راجستھان نہیں آیا تھا، بلکے ایسے بارا قبیلے یا جرگے کے لوگ لکھنے اور ایک ساتھ آئے یا غرلا یزئی۔ مہمند زئی۔ بلیل زئی۔ حدیا زئی۔ یوسف زئی فلاں زئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ یوزئی کو ملا کر ہم نے بیان آئے ہوئے قبیلوں یا جرگوں کے نام گنائے ہیں، باقی چار کے نام اس وقت ہمیں یاد نہیں آرہے ہیں۔ بہرحال ان بارا قبیلوں کے کئی ہزار پٹھان اپنے اہل و عیال کے ہمراہ جلکی اجازت سے جے پور شہر میں بس گئے۔ ہر قبیلے نے اپنی اپنی الگ الگ

چنانچہ اس وقت بھی جے پور شہر کے قریب بارابستی نامی محلا موجود ہے اور انھیں بنجاروں کے نام لیوا لوگ اس وقت بھی اس بستی میں موجود ہیں۔ یہ لوگ عرصا بعد بیت سے خاندان ملازمت کی تلاش میں حیدرآباد آ گئے تھے، مگر ان کا تعلق جے پور سے برابر باقی رہا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر ان لوگوں نے اپنی مستقل جائیداد پیدا کر لی تھی، اور جے پوری پٹھان بن کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے زبان بھی اپنا لی تھی، اور بات چیت بھی راجستانی زبان میں کرتے تھے۔

نہ معلوم کن خاص وجوہ یا اسباب اور اثر کے تحت بارابستی کے ہزاروں بنجاروں نے اپنے تمام اہل وعیال کے ساتھ ایک ہی ساتھ ایک ہی وقت میں اسلام کے فرقۂ مہدویا کو قبول کر لیا، اور تین سو سالوں کے بعد آج تک بھی انہیں بنجاروں کے نام لیوا فرقے مہدویا سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ راز دار خان صاحب بوزنی کے جد امجد راز دار خان بوزنی کا تعلق بھی فرقۂ مہدویا سے تھا

افغانستان سے آئے ہوئے تو دار دیٹھانوں نے مہاراجا جے پور، جودھپور، ٹونک اور راجستھان کی دوسری دیسی ریاستوں میں فوجی ملازمت اختیار کر لی، اس لیے کہ یہ لوگ پڑھے لکھے تو تھے نہیں، نیٹ جاہل مطلق اور کند ذہن ناتراش تھے، سوائے فوجی خدمت کے اور کیا کام کر سکتے تھے، فوج کے لئے نہایت ہی موزوں تھے، اور بہت کامیاب بھی ثابت ہوئے اور اپنے اپنے کارنمایاں سے ان لوگوں نے فوج میں بہت جلد ترقی کی، اور بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے۔ راز دار خان صاحب بوزنی نے مہاراجا جے پور کی فوج میں ملازمت اختیار کی اور اپنی عالا قابلیت اور فطری صلاحیتوں کے باعث بہت جلد فوج کے عالا عہدے پر پہنچ گئے، اور مہاراجا جے پور کے منظور نظر بھی ہو گئے تھے، ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے نے بھی اسی فوج میں ملازمت اختیار کی اور ترقی کرکے نامور ہوئے

نواب داؤد خان قایم جنگ

نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر راز دار خان صاحب بوزنی کے پوتے داؤد خان نے دلی کا رخ کیا اور اپنی جے پور کی ملازمت کے واسطے سے میر قمر الدین چن قلیچ خان سپاہ سالار اعظم اور صوبے دار دکن کی فوج میں ایک عالا عہدے دار فوج کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی، اور اپنی فوجی قابلیتوں اور صلاحیتوں کی بنا پر بہت جلد ترقی بھی کی، اور قلیچ خان کا اعتماد بھی حاصل کر لیا۔ مبارز خان دکن کا صوبے دار بن بیٹھا تھا، اس لیے قلیچ خان ایک بھاری فوج کے ساتھ دلی سے دکن کی طرف آئے، چنانچہ ان کے ہمرکاب داؤد خان بوزنی نے کارہائے نمایاں کر دکھائے، اور صرف دو چار روز میں مبارز خان کو شکست فاش ہو گئی اور وہ مارا گیا۔ اس لیے اس کی فوج جس طرف بھی بن پڑا بھاگ نکلی۔ قلیچ خان کی فوج نہایت کامیابی کے ساتھ حیدرآباد میں داخل ہوئی اور صوبے داری پر قبضہ کر لیا۔ اور یہی قمر الدین خان پہلے نظام یا آصف جاہ اول کہلائے۔ آصف جاہ نے جہاں اپنے اور بھی فوجی عہدیداروں کو نوازا، ان میں داؤد خان کو بھی نواب داؤد خان قایم جنگ کے خطاب سے سرفراز فرمایا، اور منصب اور جاگیر بھی عطا کی۔ اسی بھاری اعزاز اور پذیرائی انعام اور اکرام کے بعد نواب داؤد خان قایم جنگ بہادر حیدرآباد سے باہر نہیں گئے، بلکہ یہیں رہ بس گئے۔ ان کی بیوی بچے اس وقت تک جے پور ہی میں تھے، چنانچہ ان سب کو انہوں نے حیدرآباد بلوا لیا۔ نواب قایم جنگ کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑے لڑکے کا نام نامدار خان اور چھوٹے لڑکے کا نام دلاور خان تھا۔ قایم جنگ کے مرنے کے بعد منصب اور جاگیر ان دونوں صاحبزادوں پر تقسیم ہو گئی۔ منگل ہاٹ کے قریب راز دار خان پہاڑی اور راز دار خان پیٹ مشہور محلا ہے۔ یہ علاقا بھی انہیں کی جاگیر میں شامل تھا اور انہیں راز دار خان کا بسایا ہوا ہے۔ نامدار خان صاحب بوزنی اور راز دار خان صاحب بوزنی کی آل اولاد حیدرآباد اور پاکستان میں سینکڑوں ہی افراد موجود ہیں۔

انہی راز دار خان صاحب بوزنی کی چھٹی پشت میں ہمارے دادا مصری خان صاحب بوزنی تھے۔ مصری خان بوزنی منصدار دیوانی اور جمعدار صرفخاص تھے۔ جمعدار شکار کے سلسلے میں تھی۔ مصری خان صاحب جمعدار

ایک ماہر اور مانے ہوئے نشانہ باز اور مشہور شکاری بھی تھے۔ مصری خان صاحب جمعدار کے گھر پر صرف تین ملازم بحالِ سوں ہی یاردی (۲۴) گھنٹے رہا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان ہی یاردیوں کے ذریعہ صرف تین کے علاقے سے میر فاتحے شاہی میں روزانہ شکار داخل کرنا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں مصری خان صاحب جمعدار کو خود ہی شکار لے کر ڈیوڑی جانا پڑتا تھا، اور ڈیوڑی کا ہر شخص مصری خان صاحب کو نشانہ بازی اور شکار کی صلاحیتوں سے بخوبی اور پورے طور پر واقف تھا، اس وجہ سے انہیں ہر شخص شکاری مصری کے نام سے پکارتا تھا۔ حضور نواب میر محبوب علی خان کو بھی نشانہ بازی اور شکار کا بھی شوق تھا، حیوانات کے تربیت میں تو یہ شوق بہت بڑھا ہوا تھا اور وہ ماہر نشانہ بازوں کی رہبری میں نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے اور بہترین نشانہ باز بن گئے تھے۔ اسی لیے ہی نے علا حضرت سے شکاری مصری خان کی نشانہ بازی اور شکار کی مہارت کا ذکر کر دیا، چنانچہ حضور نے انہیں طلب کیا، اور مصری خان صاحب گئے اور حضور کے حکم سے اپنی بہترین نشانہ بازی کا مظاہرا کر کے حضور سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا۔

"استاد، تم روزانہ آنا، ہم تم سے بھی صحی نشانہ بازی سیکھیں گے"

چنانچہ حکم کی تعمیل میں مصری خان صاحب روزانہ ڈیوڑی جایا کرتے تھے اور ایک عرصے تک حضور نظام کی استادی کا شرف حاصل رہا۔

مصری خان صاحب یوزئی قد آور جوان اور پہلوان قسم کے آدمی تھے، اور ساتھ ہی نہایت جریح اور بہادر شخص تھے۔ مصری خان صاحب یوزئی حیدرآباد کے مشہور محلے چنچل گوڑا میں رہتے تھے۔ ان کے کئی ایک مکانات اور ملکیات کے علاوا، ایک پختہ اور بڑے مکان کے ساتھ بہت بڑا باغ بھی تھا، وہ خود اپنے اسی بڑے مکان میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں گھوڑوں کے علاوا، ایک اونٹ بھی تھا۔ اس زمانے میں اس محلے میں چور کثرت سے آیا کرتے تھے اور اکثر گھروں میں چوریاں ہوا کرتی تھیں جس کی وجہ سے لوگ یا اہل محلہ سخت پریشان تھے۔ اسی بنا پر محلے کو چوروں سے محفوظ رکھنے کی خاطر روزانہ رات کے تقریباً بارہ بجے سے دو تین بجے تک اونٹ پر بیٹھے ہاتھ میں بندوق لیے سارے محلے کے دو تین چکر لگایا کرتے تھے، اور جہاں چور نظر آیا، اس کو بجاتے ہوئے بارہ فائر کرتے تھے تاکہ چور مرنے نہ پائے اور چور یہ سمجھا کہ نشانہ خطا ہو گیا۔ اس واقعے سے چوروں کے دلوں میں ایک دہشت سی بیٹھ گئی تھی، اور مصری خان صاحب کے نشانوں کا ان کے دلوں میں ایسا ڈر بیٹھ گیا تھا کہ پورے محلے میں چور شاذ و نادر ہی نظر آیا کرتا تھا۔ مصری خان صاحب کے اس کارنمایاں کے باعث اہل محلہ ان کے ممنون احسان تھے اور اسی وجہ سے وہ سارے محلے میں ہر دلعزیز تھے۔

ہمارے دادا (مصری خان صاحب) کے تین بیویاں تھیں پہلی بیوی سے تین (۱) جنید خان صاحب یوزئی (۲) سعدی خان صاحب یوزئی (۳) وصیل خان صاحب یوزئی (۴) لازوال

صاحب بونزئی اور دوسری بیوی سے راجا خان صاحب بونزئی تھے۔ تیسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔

رازدار خان صاحب بونزئی کی ماں کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف چھ مہینے کی تھی، اس لئے ہماری تیسری لاولد دادی نے انھیں پالا پوسا، اور اس غیر معمولی محبت اور لاڈ پیار کے ساتھ پرورش کی کہ ہوش سنبھالنے تک ہمارے والد کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ وہ ان کی سگی ماں ہیں یا علاتی ماں۔

ہمارے دادا صاحب نے چاروں بڑے لڑکوں کی شادیاں کردی تھیں اور انھیں مکانات اور جائیداد بھی دے رکھی تھی اسلیئے یہ سب الگ الگ رہتے تھے، اور خود دادا مصری خان صاحب اپنے چھوٹے لڑکے کے ساتھ رہتے تھے، چنانچہ رازدار خان صاحب نے کم عمری ہی میں اپنے باپ سے بندوق کی نشانا بازی اور بنوٹ کا فن بھی سیکھا اور آگے چل کر دونوں فنوں میں بڑے ہی ماہر اور صاحب کمال ثابت ہوئے، اس کے علاوہ تلوار کے فن میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے

مصری خان صاحب نے، اپنے لڑکے رازدار خان کو زمانے کے مطابق گھر ہی پر استاد رکھ کر فارسی اور ہندستانی زبان کی تعلیم دلوائی تھی۔ رازدار خان صاحب کا خط نہایت ہی اچھا تھا اس لیے گھر ہی میں وصلیاں لکھ کر وہ فن خطاطی کی مشق کرتے تھے اور انہوں نے سینکڑوں وصلیاں بطور

یادگار چھوڑی تھیں۔

باپ کے انتقال کے وقت رازدار خان صاحب کی عمر تقریباً بارہ (۱۲) سال کی تھی۔ ضروری کارروائی کے بعد سوا سو روپے کا دلیاتی کا منصب اور (۵۰) روپے کی معافی کی جمعداری رازدار خان صاحب کے نام منتقل ہوگئی، اور وہ اپنی علاتی ماں کی نگرانی میں خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔

نہ معلوم ہمارے دادا کو بھی کبوتر بازی اور تیتر بازی کا شوق تھا، یا خود رازدار خان صاحب نے یہ دو مشغلے اپنا لئے تھے۔ گھر کے فاٹک میں ہی سو پچاس عالا نسل کے کبوتر موجود رہتے تھے، اور بنگلے کی چھت پر کھڑے ہوکر وہ روزانہ کبوتر بازی کیا کرتے تھے۔ یہی حال تیتر بازی کا بھی تھا۔ چنانچہ آدھ درجن پنجروں میں عالا نسل کے اور منتخب ایک درجن تیتر ہر وقت موجود رہتے تھے۔ مکان کے بیرونی کمپونڈ میں دوسرے افراد کے تیتروں کے ساتھ تیتر لڑائے جاتے تھے۔ یہ مبالغہ نہیں ہے، سو فی صد صحیح ہے کہ رازدار خان صاحب کے تیتروں نے دوسرے تیتروں کے ساتھ لڑائی میں کبھی ہار نہیں کھائی، چنانچہ اسی بنا پر حیدرآباد سے باہر بھی ان کی تیتر بازی کی کافی سے زیادہ شہرت ہو چکی تھی۔ شمالی ہندستان کے کئی ایک مہاراجاؤں اور نوابوں کو بھی تیتر بازی کا شوق تھا۔ چنانچہ رازدار خان صاحب کی تیتر بازی کی شہرت سن کر بعض دیسی ریاستوں کے مہاراجاؤں نے انھیں اپنے اپنے اسٹیٹ آنے کی دعوت دی۔ رازدار خان صاحب نے یہ دعوت قبول کرلی اور غالباً ۱۹۰۰ء میں شمالی ہندستان کا سفر کیا۔ ان کے ہمسفران کے دودھ شریک بھائی اور دوست سید مصطفیٰ صاحب، اور ان کے دو بڑے لڑکے غلام علی خان، اور بہادر علی خان اور تیتروں کی دیکھ بھال کے لئے گھر کے پرورد ایک نوجوان لڑکے کو بھی ساتھ رکھا تھا۔ سنا ہے کہ عالا درجے کے لڑنے والے تیتروں کے چار پنجرے بھی ساتھ رکھے تھے جن ریاستوں کی دعوت پر گئے تھے، وہاں اور شمالی ہندستان کے بعض اور مقامات میں اپنے تیتر لڑائے اور ہر جگہ ان کے تیتروں کی جیت رہی۔ اسی وجہ سے

ان تمام اسٹیٹس اور مقامات پر راز دار خان صاحب کی کافی سے زیادہ شہرت ہوگئی اور ان کی بہت زیادہ آؤ بھگت بھی ہوئی۔ مہاراجا جیند، الور، اور تاباوغیرہ کے ہاں یہ کئی روز مہمان رہے اور ان راجاؤں نے ان کی تیز رفتار بھاری قیمتوں پر خریدنا چاہے، مگر انہوں نے تیتر بیچنے سے صاف انکار کردیا، اور یہ کہدیا کہ حیدرآباد میں بھی میں نے ایک تیتر تک نہیں بیچا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ جن لوگوں نے مجھ سے خواہش کی کہ ان کے تیتر ٹرینڈ کرکے لڑائی کے قابل بنا کر دیے ہیں۔ ان راجاؤں سے یہ وعدا کیا کہ حیدرآباد جانے کے بعد عالائش کے تیتر خرید کر انہیں ٹرینڈ کرکے اور لڑائی کے قابل بنا کر آپ کے پاس بھجوادوں گا، چنانچہ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنا یہ وعدا پورا کیا اور اپنے پروردا لڑکے کے ذریعے جو ان کا ہم سفر تھا تیتروں کے پنجرے ان راجاؤں کے پاس خفیہ بھجوائے۔

شادی

راز دار خان صاحب یوزئی نے شادی اپنی پسند کی عورت سے کی۔ واقعا یہ ہے کہ اپنے ہی محلے چنچیل گوڑہ میں وہ ایک شادی کی تقریب میں گئے تھے۔ قاعدا یہ ہے کہ شادی کی تقریب میں شریک ہونے والی عورتوں کے کم عمر بچے آپس میں باہر کھیلتے رہتے ہیں، چنانچہ اس تقریب میں بھی چند ایک لڑکے لڑکیاں باہر کھیل رہے تھے۔ اتفاق سے راز دار خان صاحب کی نظر ایک خاندانی حسین لڑکی پر پڑی، انہوں نے اس کو بار بار دیکھا، اور بغور دیکھا انہیں اس بڑا سا لڑکی کا چہرا مہرا، رنگ روپ اور حسن بہت پسند آیا، اور پہلی نظر میں انہوں نے اپنا دل اس معصوم اور بے خبر لڑکی کو دے دیا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ کچھ ہی فاصلے پر ایک ایسی معمر معمولی عورت بھی باہر بیٹھی ہوئی تھی جو ان کے گھر آیا جایا کرتی تھی، اس کے قریب جاکر انہوں نے اس عورت کے نام سے مخاطب کیا، اور اس حسین لڑکی کی طرف اشارا کرتے ہوئے دریافت کیا کہ یہ لڑکی کس کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں میاں میں اچھی طرح جانتی ہوں، یہ عمر دراز خان کی لڑکی ہے، اور اس بازو جو کھیل رہی ہے اس کی سگی چھوٹی بہن ہے، اور سب سے بڑی بہن جو دو یا تین سال کی ہے، اس لئے وہ اپنی ماں کے ساتھ اندر مکان میں ہے۔ انہوں نے پھر سے اس عورت سے اطمینان مزید کرلیا کہ آیا وہ ان کے نشانے یا ٹارگٹ TARGET کے بارے میں کہہ رہی ہیں، یا دوسری لڑکی کے بارے میں۔ اس نے پھر سے انہیں اطمینان دلایا کہ اس نے صحیح کہا، بالکل صحیح ہے۔ اور وہ بارا سالا لڑکی عمر دراز خان کی منجھلی لڑکی ہے۔ راز دار خان صاحب نے اسی عورت سے کہا کہ، کل کسی وقت تمہارے گھر ضرور آؤنگا۔ چنانچہ دوسرے روز وہ عورت ان کے گھر آئی، اور انہوں نے اس عورت کی موجودگی میں سارا ماجرا اپنی ماں سے کہہ سنایا اور صاف طور پر یہ کہدیا کہ میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس لئے عمر دراز خان کے گھر پیام بھجوایا جائے۔ اس وقت ان کی عمر (۱۸) سال تھی۔ ماں نے اور گھر کے دوسرے بڑے لوگوں نے انہیں ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی لڑکی کے جوان ہونے کے بعد پیام بھجوائیں گے۔ ہم اس عجیب و غریب واقعے کی تفصیل چھوڑ دے رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ پڑھنے والوں کو بار خاطر گزرے۔

**مختصر یہ کہ انہوں نے ماں اور گھر کی دوسری بزرگ عورتوں کو صاف طور پر "الٹی میٹم" دے دیا کہ اسی وقت پیام لے کر جاؤ، اور اسی وقت اس لڑکی کے ماں باپ کو اس بات پر راضی کرلو کہ شادی

اس وقت کردی جائے، اور رخصتی دو سال بعد ہو ورنہ ہم عمر بھر شادی نہیں کریں گے اور کنوارے رہیں گے۔ چنانچہ ماں اور دوسری عزیز عورتیں مل کر عمر دراز خاں صاحب کے گھر گئیں، اور ان کی بیوی سے اپنے لڑکے کی شادی کا پیام کہہ سنایا، انہوں نے یہ جواب دیا کہ اسی لڑکی کی عمر صرف (۱۲) سال ہے، آپ چاہیں تو اپنی لڑکی کے بارے میں بات چیت کر سکتی ہیں، اور وہ پندرہ سال کی ہے مگر ان کی ماں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ میرا لڑکا آپ کی منجھلی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے آپ اس وقت شادی کر دیجئے دو تین سال بعد رخصتی ہو سکتی ہے۔ بہرحال اسی مرحلے پر بھی ان عورتوں کو بہت کچھ کہنا سننا پڑا، اور آخر کار ان عورتوں نے عمر دراز خاں صاحب اور ان کی بیوی کو اس بات پر راضی کر لیا کہ شادی اس وقت ہو جائے گی اور رخصتی دو سال بعد ہمارے ہونے والے نانا عمر دراز خاں صاحب نظم جمعیت یا بے قاعدہ فوج میں صرف (۳۲) روپے کے سلحدار تھے انہوں نے یہ دیکھا کہ ایک پونے دو سو روپے کے منصبدار اور جمعدار، اور صاحب جائیداد شریف خاندان کے ہونہار نوجوان کا پیام آیا ہے اس لئے بھلائی بہتری اسی میں ہے کہ شادی کر دو، ورنہ بار بار ایسے صاحب استطاعت لڑکوں کے پیام نہیں آسکتے، چنانچہ بڑی ہی دھوم دھام سے شادی ہو گئی اور دلہن اپنے میکے ہی میں رہی۔ دو سال بعد رخصتی ہوئی، تو اس وقت بھی شادی ہی کے سے ٹھاٹ باٹ رہے، اور دلہن دلہا کے ساتھ، عزیز اقربا اور دوست احباب کے شاندار جلوس اور شادیوں کے ساتھ اپنے سسرال آئی

(نوٹ: یہ لوگ یہ اعتراض کریں کہ اپنے والد کے عشق کا یہ کمزور پہلو بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی، مگر یہ کہنا ہمارا ہے کہ یہ واقعہ سو فی صد حقیقت پر مبنی ہے اس لئے ہم نے اس کا اظہار ضروری سمجھا۔ اس لئے ہم نے ناول)

شہزادی کا رومان

رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA

رازدار خاں صاحب بوزئی (رحوم) کے نام "معنون" یا DEDICATE کیا ہے۔ اور اپنے

انتساب کے سلسلہ میں ہم نے یہ صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ رحیم النسا کے عشق کا واقعہ رازدار خاں صاحب بوزئی کے عشق کے واقعے سے سو فی صد طریقے پر منطبق ہوتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ رحیم النسا نے ۵ رجمرم کو لنگر میں ایک حسین ترین نوجوان افضل خاں کو دیکھ کر اپنی ہی نظر میں دل دے دیا تھا جس سے اس کا نشانا یا TARGET افضل خان بالکل ہی ناواقف رہا۔ بالکل اسی طرح ہمارے والد مرحوم رازدار خاں صاحب بوزئی نے ایک شادی

کی تقریب میں ایک حسین ترین لڑکی کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اپنا دل اس معصوم (۱۲) سالہ لڑکی کو دے دیا تھا، جس سے وہ لڑکی سراسر انجان اور بے خبر تھی۔!

جب فرہاد ــ شیریں کو، مجنوں ــ لیلا کو، واثق ــ عذرا کو، ہیر ــ رانجھا کو، ہینوال ــ سوہنی کو، قطب شاہ ــ بھاگ متی کو، اور رحیم النسا ــ افضل خان کو دل دے سکتی ہے تو پھر راز دار خان ــ حیات خاتون کو کیوں نہیں دل دے سکتے۔؟ ہم نے اپنی ماں کے نام کو، ان کے شوہر کے نام کے ساتھ ظاہر کر کے "امر" کر دیا ہے۔ ممکن ہے اس سلسلے میں ہماری خوب خوب ہی لے دے ہو، خصوصاً ہمارے دو بڑے سگے بھائیوں کی طرف سے جو پاکستان میں بقید حیات ہیں۔ وہ دونوں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود، لکیر کے فقیر یا CONSERVATIVE قسم کے واقع ہوئے ہیں ــ انھیں جب معلوم ہوگا کہ ہم نے ان کی ماں کے نام کو ظاہر کر دیا ہے تو وہ ہم پر بری طرح برس پڑیں گے، اور کہیں گے کہ تم نے ہماری ماں کے نام کو کیوں ظاہر کیا؟ اس کے جواب میں ہم بھی پوری قوت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح سے آپ کو اپنی ماں کے نام کے چھپانے کا حق حاصل ہے بالکل اسی طرح ہمیں بھی اپنی ماں کے نام کو ظاہر کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، اور سچ پوچھو تو اپنے باپ کے نام کے ساتھ اپنی ماں کے نام کو "ہندستانی ادب" کے صفحوں میں لکھ کر ہم نے ہمیشگی کی مہر ثبت کر دی ہے!

اولاد

راز دار خان صاحب پوزئی کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی پیدا ہونے کے فوراً بعد ہی مر گئی تھی۔ ان پانچ لڑکوں کے نام سلسلہ وار یہ ہیں۔ (۱) حکیم غلام علی خان عرف مصری خان صاحب پوزئی (۲) بہادر علی خان صاحب پوزئی (۳) دلیل خان صاحب پوزئی (۴) حامد خان (ہم پوزئی کی اولاد میں تو رہیں، لیکن ہم کسی خاص جماعت، طبقے یا فرقے وغیرہ کی تنگ نظری کے قائل نہیں ہیں، اس لیے ہم کوئی بھی زنانی نہیں ہیں۔ اور بقول شاعر

سخت مشکل ہے ہر ایک چیز کا آسان ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

ہم اول انسان اور آخر انسان ہیں، اور ایسی ہی انسانیت کے لیے مر مٹے جا رہے ہیں۔ دوسرے معنی میں ہم انسان کامل نہیں۔ اگر ہماری "سینزئی انسانیت" کے زرین اصولوں پر دنیا کے کچھ ادب آدمی عمل کریں تو تمام افراد میں آئے دن کے جھگڑے، جماعتوں میں آپس کے تفرقے، اور دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں میں جنگ وجدال کی تباہ کاریوں کا ایکسٹا تھا ہو جائے گا۔ (۵) سلیم خان صاحب پوزئی۔

راز دار خان صاحب نے اپنے پہلے لڑکے کا نام مصری خان پوزئی اپنے باپ کے نام پر رکھا تھا، خانیخانے مدرسے میں بھی ان کا نام یہی تھا، لیکن ہمارے والد کے انتقال کے بعد راز دار خان پوزئی کے ایک گہرے دوست حکیم امتیاز الدین صاحب دہلوی، افسر الاطبا نے جب انہیں اپنے مدرسۂ طبیا کے پہلے سال میں شریک کروایا تو ان کا نام غلام علی خان رکھا، یہ نام مدرسے اور ملازمت میں چل پڑا، اور گھر میں نیز عزیز و اقربا اور دوست احباب میں وہ اپنے عرف عام مصری خان ہی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ غلام علی خان صاحب نے طب کا امتحان امتیاز کے ساتھ کامیاں کیا، اول آئے، اور گولڈ میڈل GOLD MEDAL حاصل کیا تھا۔ کامیابی کے بعد انہیں فوراً ہی ملازمت مل گئی، اور حیدرآباد کے مختلف اضلاع پر بحیثیت طبیب سرکاری خدمت انجام دی۔ اسی زمانے میں آرائش بلدیہ کی طرف سے شہر میں اور شہر کے قریب و جوار میں نئے نئے محلے بنائے جا رہے تھے۔ حکیم صاحب نے رخصت حاصل کی، اور آرائش بلدیہ کی معرفت کئی سڑکوں کے بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اس میں آمدنی زیادہ ہو رہی تھی، اس لیے ایک طویل عرصے تک گتے داری کی، اور بہت زیادہ روپیا کمایا، مگر بے دریغ کے مصنوعی خرچ واقع ہوئے تھے، رکھا کچھ بھی نہیں، آخر میں پھر سے ملازمت پر رجوع ہو گئے۔ پولیس ایکشن کے وقت ملکھیڑ ضلع ناندیڑ کے دولتخانے پر طبیب سرکاری تھے پولیس ایکشن کے چند روز بعد اپنے گھر چنگلگوڑا چلے آئے۔ ان کا بیان ہے کہ ملازم ریلوے اسٹیشن پر ہر طرف کو روک کر پاسنجروں کو پلیٹ فارم پر اتار کر فوجی لوگ مذہ رعایت کرتے تھے کہ آیا تم بھی وہاں کا رہنے والے ہو۔ لوگوں کے انکار کرنے کے باوجود ایک لائین میں کھڑا کر کے شوٹ SHOOT

ہمکو دکھایا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا صندوق کھول کر سرکاری کاغذات دکھائے، اور یہ کہا کہ میں ملیکٹر پر سرکاری طبیب ہوں، صدر دفتر سے میری طلبی ہوئی ہے تو میں سرکاری کام سے حیدرآباد جارہا ہوں، چنانچہ ان کے کاغذات دیکھنے کے بعد انھیں چھوڑ دیا گیا، اور یہ بھی سلامت اپنے گھر چلے آئے۔ چند گھنٹوں میں انھیں کچھ وحشت سی محسوس ہونے لگی تو ہمارے گھر آگئے تھے، ہم نے ان کی پریشانی کو دیکھ کر مشورہ دیا کہ آپ یہاں نہیں رہ سکتے، اپنی بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان چلے جایئے۔ انھوں نے ہمارے مشورے پر عمل کیا، اور فوراً ہی اپنے اہل وعیال کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ وہاں بھی سخت پریشان حال رہے۔ دو چار سال بعد حیدرآباد آئے تھے اور ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک مہینے بعد واپس چلے گئے۔ وہاں جانے کے بعد ان کی صحت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی، اور ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر (۶۷) یا (۶۸) سال کی ہوگی۔

ہمارے بڑے بھائی نے بھی شادی اپنی پسند کی لڑکی سے کی تھی۔ تقریباً (۵۰) سال پہلے تعلقۂ عالم پور، موجودہ ضلع محبوب نگر میں طبیب سرکاری تھے۔ عالم پور کے ایک مشہور زمیندار سید محمد خاں صاحب کے گھر پیام سلام کے بعد تاریخ شادی مقرر ہوئی۔ چنانچہ ہمارا سارا خاندان اور عزیز و اقربا کے ساتھ عالم پور گیا تھا، اور شادی کے بعد تین مہینے تک وہاں رہ کر ہم سب لوگ گھر لوٹے تھے۔ مرحوم کی بیوی بقید حیات ہیں۔ ان کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، یہ سب لوگ کراچی (پاکستان) میں ابھی حالت میں ہیں۔ افسوس کہ دو سال پہلے ان کی بڑی لڑکی کا انتقال ہوگیا!

ہمارے بھائیوں میں دوسرے نمبر پر بہادر علی خان صاحب ہوتے ہیں۔ یہ بھائی پہلے بھائی سے دو سال چھوٹے ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد شہ سواری اور تیر بازی کا شوق انھوں نے بھی کیا تھا، تیر بازی تو ختم کردی، مگر شہ سواری کا شوق ایک طویل عرصے تک رہا۔ انھوں نے ہنوٹ میں بھی مہارت حاصل کی تھی، مگر ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھی۔ سنٹی کانچ سے میٹرک کامیاب کرنے کے بعد لوئر سیکنڈ ایئر سال اول میں شریک ہوگئے۔ ڈاکٹر زور تانی ادارے ادبیات اردو ان کے ہم صنفی یا کلاس میٹ تھے۔ بی۔ اے کے بعد انھوں نے پولیس روپے پر محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کرلی، اور نسٹ سیگ آنجہانی کمر

کو ان کے اسسٹنٹ مارشل کے دونوں بچوں کا ٹیوشن کرتے تھے۔ جب نسٹ سیگ مارشل ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس بنے تو اپنے بچوں کے استاد کو بھی ساتھ لے گئے، ضلع اورنگ آباد پر تقرر کردیا۔ کئی سال تک ملازمت کی مگر ایک روپیہ بھی رشوت کا نہ لیا جائیداد ضرور بنا لیا۔ کاظم یار جنگ کے بھائی جب ناظم ڈسٹرکٹ بنے تو ان کے توسط سے کوتوالی دہدیہ اور ترقی دہدیہ، ترقی سے محروم رکھا، چنانچہ انھوں نے ملازمت چھوڑ دی، اور احمد محی الدین کی سیاہ کاریوں کے خلاف ایک کتابچہ شائع کرکے سارے عہدیداروں اور عوام میں تقسیم کروایا۔ منصف کی آمدنی تھی، گھر ہی پر بیٹھے رہتے، چھوٹے بھائی کے بچوں اور دوسرے اعزہ وغیرہ کے بچوں کو مفت تعلیم دیا کرتے تھے۔ پاکستان چلا گئے تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی کے ہاں رہتے ہیں۔ دو سال پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا، پھر صحت یاب ہوئے پائے تھے کہ پھر دوسرا حملہ ہوگیا تھا معلوم نہیں کہ اب کیا حال ہے۔ اس وقت تقریباً (۷۵) سال کے ہیں۔

ان کی شادی کا واقعہ ایک نہایت ہی حسرتناک اور دردناک شکل میں تبدیل ہوگیا۔ ہم لوگ اپنے بڑے بھائی کی شادی کے لیے عالم پور گئے تھے، اس وقت تک ریلوے لائن (میٹر گیج سکندرآباد سے گدوال تک گئی تھی)، اس لیے ہم سب لوگ بنڈیوں میں لد کر رات بھر سفر کرتے ہوئے صبح کے دس بجے تک عالم پور پہنچ گئے تھے، جہاں گاؤں کے قاعدے کے مطابق بندر قصبہ سے کرکے ہمارا شاندار استقبال کیا گیا تھا، اور قربانی کے طور پر ایک بکرا بھی ذبح کیا گیا تھا۔ شیر محمد خان زمیندار کے قریب ترین عزیز گھانسی خان صاحب بھی اپنے سارے افراد خاندان کے ساتھ ہمارے ہم عزیز تھے۔ ان کی ایک نوجوان لڑکی نہایت ہی حسین و جمیل اور لمبے قد خوبصورت تھی۔ ظاہر ہے کہ بنڈیوں کے اتنے طویل سفر میں ایک دوسرے پر نظر پڑی ہوگی، اور ہمارے بھائی بہادر علی خان صاحب نے اس لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ گھر واپس آنے کے بعد اپنی ماں سے کہا کہ میں گھانسی خان صاحب کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اس لیے آپ جلدی پیام لے کر جایئے، چنانچہ ہماری ماں دوسری عزیز عورتوں کے ساتھ گھانسی خان صاحب کے گھر گئیں، اور ان کی لڑکی کے لیے اپنے لڑکے کا پیام دیا۔ ماں باپ بلا تکلف راضی ہوگئے۔ دونوں طرف پوری تیاری ہوگئی تھی، مگر اچانک اس حسین و نازنین لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ ماں باپ اور

ان کے خاندان پر جو بھی گزری ہو گی ظاہر ہے، مگر ہمارے خاندان والوں نے بھی اس کا گہرا اثر لیا، اور ایک طویل عرصے تک اس معصوم لڑکی کی موت کا غم بھلا نہ جا سکا۔ کچھ عرصے بعد خاندان والوں اور دوست احباب نے ہمارے بھائی کو دوسری لڑکی سے شادی کرنے کا مشورہ دیا، مگر وہ مرحوم لڑکی ان کے دل و دماغ میں بری طرح سے بس گئی تھی، اس لیے انھوں نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور ساری عمر کنوارے پن کی حیثیت سے گذار دی۔

تیسرے نمبر پر ہم سے بڑے بھائی دلسل خاں صاحب لوزئی ہیں۔ یہ بھائی ہم سے تین سال بڑے ہیں، اور اس وقت (۷۰) ستر سال کے ہیں۔ دارالعلوم سے انھوں نے عثمانیا میٹرک کا امتحان کامیاب کیا، اس کے بعد پونہ سٹی میں انٹر سال اول میں شریک ہو گئے۔ بی۔ اے کے امتحان میں ناکام رہے، اس لیے تعلیم کا سلسلہ ترک کر کے تجارت میں گتے داری شروع کر دی۔ وہاں گتے داری اچھی چل رہی تھی، مگر جب ہم ۱۹۳۶ء میں اپنے اقامتی حلقے اول بیروچ سے رکن بلدیہ یا میونسپل کونسلر بن کر بلدیا میں گئے اور جب ۱۹۴۰ء میں بلدیا نے سڑکوں اور دوسری بلدی اسکیموں کی تکمیل کی غرض سے (نو لاکھ) لاک کا قرض لیا تو بلدیا کے گتے داروں کی فہرست میں اضافے کا سوال پیدا ہوا۔ چنانچہ ہر رکن نے اپنی اپنی لسٹ کے نئے گتے داروں کے نام پیش کیے تو خدیم نے بھی اپنے ملاقاتیوں کے چند ایک ناموں کے ساتھ اپنے حقیقی بڑے بھائی دلسل خاں صاحب کا نام بھی پیش کیا، اور یہاں انھوں نے تجارت کے کاموں سے زیادہ تر پیسا کمایا۔ طبیعت میں عفو زیادہ تھے، چنانچہ ایک بار بلدیا کے اور سیر کو تیز دوڑوں کے سامنے ہوئے مار دیئے، اسی وجہ سے بلدیا نے انھیں کام دینا بند کر دیا، مگر بعد میں تجارت میں بہت زیادہ کمایا، اور موٹر شین بن گئے تھے۔ دلسیقہ حیدرآباد سے ۱۸ ہزار روپے کی ایک شاندار موٹر کار خریدی تھی، مگر بعد میں وہ سب بیچ کر پاکستان چلا گئے۔ ان کے پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ انھوں نے اپنے والد مرحوم کے نام پر خاندانی روایت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے بڑے لڑکے کا نام رازدار خاں رکھا ہے!

چوتھے نمبر پر ہم یعنی جی۔ ام۔ خاں (انسان کامل) ہیں۔ ہم مہر دسمبر ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ والد کے انتقال کے وقت ہماری عمر آٹھ سال کی تھی۔ ہم سے بڑے تینوں بھائی مدرسے جایا کرتے تھے، مگر والد نے ہمیں مدرسے میں شریک نہیں کروایا تھا، بلکہ دوپہر میں کھانے کے بعد حقا پیتے ہوئے ہمیں قاعدہ پڑھایا کرتے تھے۔ ہم سے چھوٹے اور آخری بھائی اس وقت صرف چار سال کے تھے، اس لیے ان کی تعلیم کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ہمارے والد بڑے ہی باذوق اور باسلیقہ آدمی تھے، انھوں نے جو بھی شوق کیا، بڑا شوق کیا۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ وہ ایک ماہر نیزہ باز تھے، اور تلوار چلانا بھی جانتے تھے۔ کبوتر بازی اور تیتر بازی کے میدان میں بھی کافی شہرت حاصل کی تھی۔ اسی طرح ان کے حقا پینے کا شوق بھی بڑے ہی عالا یانے کا اور معیاری تھا۔ ہم نے دوسروں سے سنا ہے، اور خود ہمیں بھی یاد پڑتا ہے کہ جب وہ حقے کا کش لے کر دھواں چھوڑتے تھے تو سارا دیوان خانا گڑگڑاہٹ کی خوش لو سے مہک جاتا تھا۔ بازار سے گوڑاکو منگوانے کے بعد وہ خود بھی اپنے گھر میں اس میں بعض خوش لو دار چیزیں ملایا کرتے تھے۔ بلکہ یہی حال ان کے عطر کے شوق کا بھی تھا۔ عطر کے لیے ایک بڑا مخصوص قلمدان تھا، جس میں نیچے اوپر دونوں خانوں میں دو درجن سے زیادہ عطر سے بھرپور کٹ گلاس کی شیشیاں ہوتی تھیں، اور سارے ہندستان کے متمول اور عالا سے عالا درجے کے متمول سے قیمتی عطر وہ خود بھی استعمال کرتے تھے اور اپنے عزیز و اقربا اور دوست احباب وغیرہ کو بھی بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔ والد صاحب جب کبھی باہر جایا کرتے تھے تو اپنے کپڑوں کو عطر لگا کر جایا کرتے تھے، اور جب وہ بیل یا سواری میں رستے سے گزرتے تھے تو عطر کی خوشبو اور مہک رستے کے چاروں طرف پھوٹ پڑتی تھی۔

سنا ہے کہ والد صاحب کا ایک فوٹو منصب کی اجرائی کے وقت خزانے عامرہ سرکار عالی میں داخل کروایا گیا تھا، مگر ہمارے گھر میں ان کا کوئی بھی فوٹو نہیں تھا۔ ہم نے آٹھ سال کی عمر میں انھیں جس طرح دیکھا ہے نیچے اس کی قلمی تصویر کھینچ رہے ہیں، اس لیے کہ ایک ایسے باذوق، باسلیقہ اور تمام خوبیوں سے متصف شخصیت کا قلمی خاکہ یا PROFILE ان کے اصل فوٹو یا آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر کے بغیر بے معنی سی بات ہے۔ ہم اگر آرٹسٹ ہوتے تو فوراً ہی قلمی تصویر بنا دیتے، اس لیے مجبوراً اپنے الفاظ میں ان کی ہیئت کا جیسا پیش کیے دیتے ہیں، جو ہمارے انداز میں بنا توڑے فی صد صحیح ہے۔ ہمارا بچپن کا بیان صرف ذاتی مشاہدے پر مبنی نہیں بلکہ ہم نے اپنے بزرگوں سے بھی کئی بار سنا ہے،

ہمارے والد محترم گرمیوں میں ڈھاکے کی ململ کا کرتا پہنتے تھے، اور جب گھر میں ہوتے تو لنگ یا لنگی باندھتے تھے۔ دوپہر کا کھانا زنانی حصے میں کھانے کے بعد کرتے اور لنگی کے ساتھ دیوان خانے میں چلے آتے اور ہم بھی ان کے ساتھ بیٹھے لیٹے چلتے جاتے تھے۔ گھر میں ماما اور کامائن کے علاوہ، ۲ دادا کے پرورد دو نوجوان لڑکے (۲۴) گھنٹے گھر ہی میں رہا کرتے تھے۔ ان میں سے بڑا لڑکا والد صاحب کا حقہ تیار کرنے میں مشاق بن گیا تھا، اور یہ اپنا سارا کام اور تمباکو کی دیکھ بھال کا کام بھی اسی کے لیتے تھے۔ دوسرا لڑکا گھر کے کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ والد صاحب کے دیوان خانے میں آتے ہی بڑا لڑکا ایک بڑی پیتل یا کسی اور METAL کی کشتی میں حقا تیار کر کے لا کر رکھ دیتا تھا۔ والد صاحب دیوان خانے میں آتے ہی کرتا اتار کر کھونٹی پر لگا دیتے، اور گاؤ تکیے سے ٹکا دیے بیٹھتے، اور حقے کا نیچا بات میں لے کر کش پر کش لگاتے تھے۔ ان کے تمام خفتے عالا دردے کے اور بخ رہی ہوا کرتے تھے، جو چلم کی آگ کی تپش کے ساتھ مختلف رنگ بدلا کرتے تھے۔ دیوان خانے پر ہمیشہ ہی علیل پڑی رہتی تھی، اور کوئی صاحب ملنے آتے تو انھیں خود ہی اندر بلا لیا کرتے تھے۔

ہمارے اندازے سے راز دار خان صاحب لوزی کا قد (۵) فٹ (۷)، انچ سے کم نہ تھا۔ سارا جسم بھرا بھرا سا تھا، اور سینا نانیت ہی چکلا اور کشادہ تھا، ڈنڈ اور رانیں پہلوانوں کی سی، اور چہرہ اشتیر جیسا رعب دار تھا۔ سارے جسم پر بڑے بڑے بال تھے۔ مونچھیں لانبی اور داڑھی گھنی، مگر کوتاہ تھی، سر پر ہمیشہ ہی گھنے بال رہتے تھے، پیشانی کشادہ اور بھنویں گھنی اور گہری تھیں یہی حال پلکوں کا بھی تھا۔ جسم گٹھیلا اور مضبوط تھا، اور جسم میں قوت پہلوانوں کی سی تھی۔ اس لحاظ ان میں کسی مل زیادہ تھا، اور بنوٹ اور تلوار چلانے کے مواقع پر وہ اپنی اس غیر معمولی قوت کا مظاہرہ کر کے عوام اور خواص سبھی سے خراج تحسین حاصل کرتے تھے۔

والد صاحب جب باہر جانے تو اراب کا پاجامہ کرتا، سلک کی شیروانی اور سلک کا شملہ زیب تن کر کے جاتے تھے۔ سر پر شوز اور جرابیں دونوں کا استعمال کرتے تھے۔ شملہ تو سمتا سلک کا ہی باندھتے تھے، مگر سلک کی شیروانی عموماً اور کبھی کبھار ٹویڈ کی شیروانی بھی پہنا کرتے تھے۔ دستی ہر وقت گھر میں اور باہر سلک ہی کی استعمال کرتے تھے، جو عالا درجے کے عطر میں بسی ہوئی ہوتی تھی۔ انھیں خوشبویات سے حد درجہ انس اور دلچسپی تھی، چنانچہ عطر کے علاوہ وہ مختلف قسم کے پھول بھی کثرت سے استعمال کرتے تھے، اور اپنے گھر میں موتیا، بٹ موگرا، چنبیلی، جوہی، رات کی رانی، دن کا راجا وغیرہ وغیرہ کے پودے اور بیلیں ہر وقت لگائے رکھتے تھے، ان کے انتقال کے بعد بھی یہ روایت ہمارے گھر میں جاری تھی، جس کو خود ہم نے والد صاحب سے ورثے اور ترکے میں پائی تھی، اور پھولوں اور پھلوں کے درختوں کی نگرانی اور دیکھ بھال خود ہی کیا کرتے تھے۔ ہاں تو ہم اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کرتے ہوئے ہم نے مڈل کا امتحان انگریزی میڈیم کے ساتھ رزیڈنسی مڈل اسکول سے کامیاب کیا۔ اس کے بعد سٹی کالج سے میٹرک اور انٹر کامیاب کرنے کے بعد عثمانیا یونیورسٹی میں بی۔ اے سال اول میں داخلہ لیا۔ بی۔ اے کے دو سال ہم نے مسرت منزل ہوسٹل میں گذارے۔ پہلے سال تو ہم صرف نایب عریف طعام یا ASST. FOOD MONITOR رہے۔ دوسرے سال میں صدر عریف طعام یا HEAD FOOD MONITOR بنے، اور ساتھ ہی ساتھ انجمن اتحاد طلبائے مسرت منزل ہوسٹل کے صدر یا PRESIDENT بھی منتخب ہوئے۔ بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد ہم۔ اے سال اول میں داخلہ لیا۔ میر حسن ہمارا ساتھی یا کلاس میٹ تھا۔ سٹی کالج انٹر کے دو سال، بی۔ اے کے دو سال اور ام۔ اے کے دو سال یعنی پورے چھ سال تک اس کا ہمارا ساتھ رہا، اور دھاگا میں اختیاری تھی ہم دونوں کے ایک ہی تھے، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں میر حسن نے ہمارے ساتھ ام۔ اے کے سال اول میں داخلہ لیا۔ اس سال کے لیے صدر انجمن اتحاد طلبائے کلیۂ عثمانیا یا۔ PRESIDENT STUDENTS UNION OSM. ANIA UNIVERSITY COLLEGE ——— کا سوال پیدا ہوا تو ہم سبھوں نے میر حسن کو صدر نامزد کر دیا اور وہ متفقہ طور پر ۱۹۳۴ء کے لیے صدر منتخب ہو گئے، اور ہم۔ اے سال اول کی طرف سے ان کی کامیابی کے لیے

نامزد ہو کر گئے تھے۔ صدارت کے بعد محلے عثمانیا کی ادارت کا سوال پیدا ہوا، اور یہ انتخاب یا نامزدگی منسٹری یا کابینہ کرتی تھی، چنانچہ میر حسن منسٹری نے ہمارے ایک اور ساتھی یا کلاس میٹ نور الہدیٰ کو انگریزی سکشن کا ایڈیٹر نامزد کیا، اور ہمیں جلنے کے ہندستانی سکشن کا ایڈیٹر بنایا، اور مخدوم محی الدین کو ہمارا نایب مدیر یا اسسٹنٹ ایڈیٹر نامزد کیا۔ مخدوم اس وقت بی۔ اے فائنل میں تھا۔ ایڈیٹر کے لیے گریجویٹ کا ہونا لازمی اور ضروری تھا، اور اسسٹنٹ ایڈیٹر کسی بھی سال کا طالب علم ہو سکتا تھا۔

جب ہم اور میر حسن ایم۔ اے فائنل میں گئے ہیں تو مخدوم ایم۔ اے سال اول میں آ گیا تھا، اور یہ ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔ میر حسن کی منسٹری ختم ہو چکی تھی، اس لیے سال رواں کے لیے نئی منسٹری کے سلسلے میں غور و خوض ہو رہا تھا۔ میر حسن منسٹری والوں نے مخدوم کا نام پیش کیا اور اکبر وفا قانی اور مصلح الدین وغیرہ کی پارٹی نے ہمارا یعنی جی۔ ایم۔ خان ایڈیٹر محلے عثمانیا کے نام کی تائید کی۔ انتخابی مہم دونوں طرف سے زور و شور سے چلی، اور آخر کار صرف (۴۹) ووٹس VOTES سے مخدوم کے مقابلے میں ہماری کامیابی رہی۔ ہمارے موئیدین نا فاتح جماعت نے ہمارا شاندار جلوس نکالا، اور نہ معلوم کس کی کار میں ہمیں بٹھا کر یونیورسٹی کے گرد و نواح میں چار چھ میل کا چکر لگایا۔ ہم نے دوسرے روز اپنے خاص خاص کارکنوں اور مخلصین کو لائبریری کے پچھلے حصے میں محلے عثمانیا کے دفتر کے کمپونڈ میں پارٹی دی۔ یہ مہم میں بہت ہی مہنگی پڑی تھی، اس لیے کہ مخدوم کے ساتھ ٹکر زور دار تھی۔ ادھر میر حسن کے علاوہ اشکر جی نمائش والا، ظفر الحسن ریڈیو والا، تشریار کا دس جی، بہرے گونگے مدرسے والا، اسی قسم کے بیسیوں مشہور و معروف طالب علموں کی تائید مخدوم کو حاصل تھی مخدوم کی مالی حیثیت صفر کے برابر تھی، مخدوم روزانہ شراب بھی ان ہی لوگوں کے پیسے سے پیتا تھا، اور ہماری مخالفت میں مخدوم کو انتخاب بھی ان ہی لوگوں نے لڑایا، اور اس سلسلے میں پورا پورا خرچ بھی برداشت کیا تھا۔ ہم نے اس یادگار انتخابی مہم کے سلسلے میں اپنے گھر سے کافی سے زیادہ پیسا حاصل کیا تھا، اس کے بعد بعض اپنے مخلص احباب سے قرض بھی لیا، جو آگے چل کر ان کا پورا پورا قرض ادا کر دیا، اور اس سے بڑھ کر ساتھ کل بھی فروخت کر دی تھی، جس کی آمدنی سے انتخابی مہم کی پابجائی کی گئی۔

اس زبردست اور تاریخی اور یادگار نا کامی کے سبب مخدوم اور اس کی پارٹی کو بڑا دھکا پہنچا تھا، اس واقعے سے اس کے بعد سے مخدوم اور اس کے سارے ساتھی ہمارے بے حد مخالف ہو گئے، اور طرح طرح سے ستانے اور دق کرنے اور تنگ کرنے لگے، مگر ہم نے ان تمام مخالفتوں کا ڈٹ کر مردانا وار مقابلہ کیا اور بہت آخر میں ہماری ہی رہی۔ مخدوم سے ہماری مراد وہی مخدوم محی الدین ہے جو آگے چل کر کمیونسٹ لیڈر بن گیا تھا، اور آج سے تقریباً دو تین سال پہلے نئی دلی میں ہارٹ فیل ہونے سے انتقال کر گیا۔

ہمارے انتخاب کے وقت یونیورسٹی ابھی اپنی پرانی عمارت میں تور کے سایے ہی بڑھی، چنانچہ ہم نے اپنے عالی قدر اور ریول عزیز پرنسپل عالی جناب محمد عبدالرحمان خان صاحب جی ایس آئی ای (لندن) کی سرپرستی میں بحیثیت آخری صدر انجمن اتحاد طلبائے کلیئے جامعہ عثمانیا اپنا معرکۃ الآرا خطبۂ صدارت دیا، اور پرنسپل صاحب اور حاضرین سے زبردست خراج تحسین حاصل کیا۔ اس نوبت پر شاید اب یہ خیال کر رہے ہوں گے کہ ہم بھٹک گئے ہیں، اور راز دار خان صاحب کی سوانح حیات لکھتے لکھتے اپنی زندگی کے حالات لکھنا شروع کر دیا ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ ہم اس وقت اپنے بارے میں جو کچھ بھی مختصر طور پر لکھ رہے ہیں، وہ بالکل بجا اور TO THE POINT ہے۔ ہم کسی بھی واقعے کی تفصیل میں نہیں جا رہے ہیں، بلکہ اپنی طالب علمی کے دور کے اہم ترین واقعات کو صرف اشاروں اور کنایوں میں بیان کر رہے ہیں، اور یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ راز دار خان مرحوم کے دوسرے چار لڑکوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے مال و دولت حاصل کی، اور بعضوں نے ملازمت بھی اختیار کی، لیکن ان میں سے ایک کا بھی طالب علمی کا دور روشن یا کامیاب نہیں رہا۔ ان کے مقابلے میں ان کے ایک اور فرزند جی۔ ام خان نے علم کی دولت حاصل کی اور عثمانیا یونیورسٹی سے عالی ترین ام۔ اے کی ڈگری لی اور تعلیم کے چار سالہ دور میں ہوسٹل اور یونیورسٹی کے وہ تمام عالی ترین عہدے حاصل کیے، جس کے حاصل کرنے میں ہر طالب علم اپنی جان کی تک بازی لگا دیتا

ہے - رہی ہماری زندگی کی تفصیل، یہ اس وقت بیان کی جائے گی، جب کسی مناسب اور موزوں موقع محل سے خدا ہمیں صحفوں میں جی - ام - خان کون ہے اور کیا ہے؟ پر قلم چلا سکیں گے - ہمارے صدر منتخب ہونے کے دوسرے ہی مہینے عثمانیا یونیورسٹی اپنی جدید عارضی عمارتوں، اڈیکمنٹ میں منتقل ہو گئی - وہاں جانے کے بعد ہم نے بحیثیت ایڈیٹر مجلۂ عثمانیا کا پہلا نمبر نکالا - ہمارے نائب مدیر مخدوم محی الدین نے تو کوئی کام نہیں کیا تھا - انگریزی سکشن کے ایڈیٹر نورالہدیٰ نے انگریزی میں صرف ایڈیٹوریل لکھ کر بھجوا دیا تھا - مجلے کے پہلے نمبر کے سلسلے میں انگریزی مضامین وغیرہ بھی خود ہم نے حاصل کیے تھے، اور جون نمبر کے ساتویں جلد کا پہلا نمبر شائع کر دیا - مخدوم اور نورالہدیٰ کے اس بائیکاٹ سے ہم نے انگریزی سکشن کے ایڈوائزر ADVISER پروفیسر ای - ای اسپیٹ (انگلش ڈپارٹمنٹ) PROF. E.E. SPEIGHT اور ہندستانی سکشن کے ایڈوائزرس ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور اور دوسرے متعلقہ پروفیسروں کو بھی واقف کرا دیا تھا - نمبر نکالنے کے بعد اس کی ایک کاپی اپنے استعفا کے ساتھ ہمارے پرنسپل صاحب کی خدمت میں پیش کی - نمبر دیکھ کر تعریف کی اور ہماری درخواست دیکھتے ہی کہا "یہ کیا ہے جی" ہم نے ان دونوں کے بائیکاٹ کا سارا قصہ کہہ سنایا اور کہا کہ سب پروفیسر گواہ ہیں کہ کام تو ہم نے کیا اور مجلے کی ادارت میں ان دونوں کے نام بھی شریک ہیں - ہمارے استعفا کے پیچھے یہ لکھا کہ مجلے کے بورڈ کی ایمرجنسی میٹنگ طلب کی جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں ہم نے مجلے کے بورڈ کے تمام ارکان، پروفیسروں، نیز مخدوم اور نورالہدیٰ کے نام بھی اطلاعی نوٹس بھجوائی تھی - تاریخ مقرر ہوئی پرنسپل صاحب کے اجلاس پر سب ہی پروفیسر ارکان آئے، اور نہیں آئے تو صرف مخدوم اور نورالہدیٰ - صدر صاحب نے ہم سے دریافت کیا، آیا ان دونوں کے نام نوٹس بھجوائی تھی ہم نے کہا جی ہاں جناب یہ رہی نوٹس جس پر ان دونوں کی دستخط موجود ہے تمام سکشن کو صدر صاحب اور سب ہی پروفیسروں نے دیکھا، اور ان کی حرکتوں پر اظہار افسوس بھی کیا - میٹنگ میں موجود تمام ارکان پروفیسر صاحبان نے اس بات کی تصدیق کی کہ ہم نے انہیں مخدوم اور نورالہدیٰ کے بائیکاٹ سے پہلے ہی واقف کرا دیا تھا - اس پر بورڈ نے بلا اختلاف اور متفقہ طور پر طے کیا کہ چونکہ مخدوم محی الدین اور نورالہدیٰ نے مجلۂ عثمانیا کی ساتویں جلد نمبر ایک کے ادارتی فرائض انجام نہیں دیے ہیں، اس لیے ان دونوں کے نام مجلۂ عثمانیا کی ادارت سے خارج کیے جاتے ہیں اور ان کی بجائے موجود ایڈیٹر ہندستانی سکشن جی - ام - خان ہی تنہا بحیثیت ایڈیٹر ہندستانی سکشن، اور بحیثیت ایڈیٹر انگریزی سکشن، اور بحیثیت مینجنگ ایڈیٹر اور بحیثیت معتمد یا سکریٹری آف دی عثمانیا میگزین بورڈ کے بھی فرائض انجام دینگے، چونکہ مجلے کے سات سالہ دور میں یہ

پہلا موقع تھا کہ کسی ایک طالب علم وقت واحد میں مجلۂ عثمانیا کی ادارت کے یہ سب اعزازات حاصل رہے ہوں۔ ہم سے پہلے اور ہمارے بعد، ہم پورے وثوق اور پکے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ عثمانیا میگزین کی تاریخ میں ادارتی اتنا اہم اعزاز ایک بھی طالب علم کو نصیب نہیں ہوا ہے، اور یہ اعزاز صرف اور صرف راز دار خان صاحب یوزفی (مرحوم) کے چوتھے لڑکے جی۔ ام خان کو حاصل ہوا، جس پر جی۔ ام خان نے اس وقت بھی بجا طور پر ناز کیا تھا، اور اپنی (۷۰) سالہ زندگی میں ہر وقت ناز کرتا رہا ہے، اور آج یہ سطریں لکھتے وقت بھی بجا طور پر نہ صرف ناز، بلکہ فخر و مباہات کا اظہار بھی کرتا رہا ہے!

بہر حال اس فیصلے کے سنتے ہی ہم نے صدر صاحب محترم اور تمام موجود ارکان پروفیسر صاحبان کے پیٹ میں منڈی ڈال دی اور پھر ایک سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ہم نے پہلے ہی سے نظامیا رسٹورنٹ کے مالک سے طے کر چائے اور آئسکریم وغیرہ کا انتظام کروایا تھا، اور ہماری یونین نے چپراسی کے ساتھ نظامیا کے بوائے بلڈرس مازدہ کے کمرے میں یہ چیزیں لیے تیار بیٹھے تھے۔ ہم نے صدر صاحب سے التجا اجازت چاہی کہ اگر حکم ہو تو سب کی خدمت میں چائے پیش کی جائے، چنانچہ سبھوں نے خوشی سے اجازت دی، اور ہم فوراً مازدہ کے کمرے میں گئے اور ہمارے چپراسی، اور پینٹری کے ذمہ دار چپراسی اور بوائے بلڈرس کے ساتھ لئی ڈکشنوں میں لدے ہوئے کیک، پیسٹری، بسکٹس، آئسکریم، مسوا، آئسکریم اور چائے وغیرہ صدر صاحب کے میز پر سجانے کے بعد خود ہم نے بھی سروس کیا۔ یہ سب چیزیں دیکھ کر صدر صاحب نے فرمایا کہ ارے تم نے اتنا زبردست انتظام کیوں کیا؟ اس پر دوسرے پروفیسر صاحبان نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ

آج وہ جتنی بھی خوشی کا اظہار کریں کم ہے، اس لیے کہ مجلۂ عثمانیا کی سات سالا تاریخ میں پہلی بار یہ فخر صرف اسی ایک طالب علم جی۔ ام۔ خان کو حاصل ہوا ہے کہ وہ مجلۂ عثمانیا کے کرتا دھرتا اور سب کچھ ہیں!

چائے سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے صدر صاحب اور دوسرے تمام پروفیسروں کا شکریہ ادا کیا، اور باہر چلے آئے۔ بوائے بلڈرس جب سامان باہر لے آئے تو ہم نے ان سے کہا کہ یونین کے چپراسی کے ساتھ یہ سب چیزیں یونین کے دفتر لے آؤ۔ ہم خود بھی یونین کے دفتر گئے، اور ہمارے ساتھ ہی بوائے بلڈرس اپنے سامان کے ساتھ چلے آئے۔ وہاں بعض ہمارے مخلص احباب بیٹھے ہوئے تھے، ان سے اوپر کا سارا واقعہ کہہ سنایا۔ یہ سنتے ہی سبھوں نے ہمیں مبارکباد دی، اور ہم سب طالب علم چائے پینے میں مصروف ہو گئے!

مجلۂ عثمانیا کے اس غالاتہ ین اعزاز کے بعد ہم نے

مجلۂ عثمانیا کی ساتویں جلد کا دوسرا نمبر نکالا، اور اس کے بعد آٹھویں جلد کا پہلا نمبر نکال کر ساتویں جلد کی تکمیل کر دی۔ اس وقت ہمارا مجلہ سہ ماہی تھا، اور سال میں صرف چار نمبر نکالے جاتے تھے، نہ معلوم ہمارے بعد کیا تبدیلی ہوئی ہو، اور آج کل کیا حال ہے؟ عثمانیا یونیورسٹی کے اپنی عارضی عمارتوں، اڈیکمیٹ میں منتقل ہونے کے دو مہینے بعد ہمارے پرنسپل عبدالرحمان خان صاحب وظیفے پر الگ ہو چکے تھے، اور ان کی بجائے ڈاکٹر اے ایچ میکنزی DR. A. H. MACKENZIE نے یونیورسٹی کے پہلے پرو وائس چانسلر PRO-VICE CHANCELLOR کی حیثیت سے چارج حاصل کیا تھا۔ عبدالرحمان خان صاحب وظیفے پر کیوں گئے، اور میکنزی صاحب بحیثیت پرو وائس چانسلر کیسے آئے یہ ایک لمبی چوڑی داستان ہے، اس تو ہم پر اس کو نظر انداز کیے دیتے ہیں، مگر ہمارے ایک اور متعلق "جی۔ ایم۔ خان کون اور کیا ہے؟" میں تفصیلی طور پر ضرور بیان کریں گے۔

ہم نے یہ بات تفصیلی طور پر نہیں لکھی کہ ہمارے صدر محترم عبدالرحمان خان صاحب ہمیں بہت چاہتے تھے، اس وجہ سے ہمیشہ ہی ہم ان کے قریب تر رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ کہ ڈاکٹر میکنزی کے جایزے کے روز جہاں انھوں نے تمام پروفیسروں کا تعارف کرایا آخر میں ایک طالب علم یعنی ہمارا بھی تعارف کرایا، اور یہ کہہ کر یہ لڑکا عثمانیا یونیورسٹی کے ہزاروں طالب علموں کا واحد نمایندہ ہے، یہ انجمن اتحاد طلبائے کلیۂ جامعۂ عثمانیا کا پریسیڈنٹ بھی ہے، اور مجلۂ عثمانیا کے ہندستانی سکشن اور انگریزی سکشن کا ایڈیٹر ہے، اور ساتھ ہی مینیجنگ ایڈیٹر بھی ہے۔ اور میگزین بورڈ کا سکریٹری بھی ہے۔ اتنا بڑا اعزاز اس وقت یونیورسٹی کے صرف اسی واحد طالب علم کو حاصل ہے، یہ سنتے ہی میکنزی صاحب نے ہم سے بات ملایا، اور اپنی اشتیاقی خوشی اور دلی مسرت کا اظہار کیا! اس کے بعد عبدالرحمان خان صاحب اپنی کار میں روانہ ہو گئے، اور پروفیسر اپنے اپنے منجنوں میں چلے گئے، اور میکنزی صاحب اپنے اطلاس پر گئے، اور ہم اپنے دفتر چلے گئے!

جایزۂ جمعرات کے روز ہوا، دوسرے روز جمعہ کو تعطیل تھی، چنانچہ ہم حسب دستور انگریزی میں چھپے ہوئے اٹ ہوم AT HOME کے دعوت نامے لے کر میکنزی صاحب کے گسٹ ہاؤز پر پہنچے، اپنا وزیٹنگ کارڈ بھجوایا، میکنزی صاحب نے ہمیں بلوایا، اندر وہاں بیوی دونوں موجود تھے، انھوں نے اپنی بیوی سے ہمارا اپنی الفاظ میں تعارف کرایا، جس طرح عبدالرحمان خان صاحب نے ان سے تعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد ہم نے ٹائپ کیے ناموں کے دو رقعے یاد دعوت نامے پیش کیے، بات میں لیتے ہوئے فرمایا یہ کیا ہے؟ ہم نے بتایا کہ ہماری یونیورسٹی کا طریقہ ہے کہ جب کبھی ہمارا صدر وظیفہ پر جاتا ہے، اور نیا صدر جایز لیتا ہے تو ایک کی ملتوی کے سلسلے میں اور دوسرے کی آمد کی خوشی میں اٹ ہوم بھی دیا جاتا ہے، اور ایڈریس بھی پیش کیا جاتا ہے، اور یہ تقریب یونیورسٹی پروفیسروں اور طلباء کی طرف سے ہوا کرتی ہے، اس کے انتظامات کئی روز سے ہو رہے تھے۔ دو ہزار کے قریب رقعے تقسیم ہو چکے ہیں، اور یہاں کے ایک مشہور ریسٹورنٹ انتظامیہ کینٹین کو اٹ ہوم کا آرڈر بھی دیا جا چکا ہے، اور دونوں ایڈریس بھی چھپ چکے ہیں۔ آج دن بھر ہم لوگ مصروف رہیں گے اور کل بھی مصروف رہیں گے۔ چار بجے اٹ ہوم ہوگا۔ اس کے بعد آپ دونوں کے ساتھ گروپ فوٹو بھی ہوگا۔

یہ سننے کے بعد میکنزی صاحب نے تعجب کے ساتھ دریافت کیا، کیا دو ہزار آدمیوں کو دعوت دی گئی ہے؟ ہم نے کہا جی ہاں حیدرآباد میں ایسی ہی شاندار دعوتیں ہوا کرتی ہیں۔ ہم نے ان سے درخواست کی، کل ہفتے کے روز آپ خود بھی انتظامات کی پابجائی کے سلسلے میں ہم سب کی مدد کریں، اور اگر ہو سکے تو ڈنر کی میکنزی بھی وقت سے کچھ پہلے آجائیں۔ ان سے رخصت چاہتے ہوئے ہم نے کہا کہ یہاں سے ہم عبدالرحمان خان صاحب کے مکان جا رہے ہیں۔ ان کا اور ان کے لڑکوں اور دوسرے عزیزوں کا بھی دعوت نامے ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ہم چلے گئے، اور ہمارے ہر دلعزیز صدر صاحب کے گھر پہنچے، صدر صاحب اپنی لائبریری میں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، ان کی اجازت سے ہم اندر گئے اور میکنزی صاحب سے اپنی ملاقات کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔ اس کے بعد ان کا اور ان کے لڑکوں وغیرہ کے کئی ایک دعوت نامے ان کے ہاتھ میں تھما دیے۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد ان سے وعدہ لے کر ہم پھر سے یونیورسٹی پہنچے جہاں کئی پروفیسر اور طلبا وغیرہ یونیورسٹی کے ملازمین اور غالبی

وغیرہ بھی اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔

دوسرے روز میکنزی صاحب ٹھیک ۱۰ بجے دفتر آگئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم پہنچے، اور ان سے وزارت کی کرسیاں کے چین میں چل کر انتظامات کا معائنہ کریں۔ وہ چار پروفیسروں کے ساتھ وہ آئے اور جو کچھ بھی کام ہوا تھا اس کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا، اور پھر اپنے آفس واپس چلے گئے۔ ساڑھے تین بجے تک سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا، ادھر سے ملیشیا کی آ گئے، اور روایے ٹیلرسن نے میزوں پر سامان سجانا شروع کر دیا۔ یو نے چار بجے عبدالرحمان خان صاحب، اور اپنے آفس سے اپنی لیڈی کے ساتھ میکنزی صاحب بھی آ گئے۔ ہم سب نے معزز مہمانوں کا استقبال کیا، اور اس کے بعد رائٹ ہوم شروع ہو گیا۔ میکنزی صاحب، لیڈی میکنزی، عبدالرحمان خان صاحب اور تقریباً صدر الہام یا سنٹر ایک ہی بڑے میز کے اطراف بیٹھے تھے۔ میکنزی صاحب نے اس شاندار ایٹ ہوم کو دیکھ کر کہا کہ میں یو۔ پی میں دس سال سے زیادہ عرصے تک ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن رہا ہوں، مگر اتنا اتنا شاندار ایٹ ہوم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ایٹ ہوم کے ختم پر ہندستانی زبان میں عبدالرحمان خان صاحب کا ایڈریس ہم نے پڑا اور ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ہمارے بعد ہمارے سکریٹری نے میکنزی صاحب کا ایڈریس انگریزی زبان میں پڑا، اور ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پیش کیے گئے یہ دونوں ایڈریس عالا در جے کے اطلس کے کپڑے پر چھپوائے گئے تھے، اور ہر زبان میں دو ہزار ایڈریس کاغذ پر بھی چھپوائے گئے تھے۔ جو پبلک یا حاضرین میں تقسیم کیے گئے۔ ایڈریس کے بعد ایک اونچے ٹیلے پر مہمانوں کا گروپ فوٹو بھی لیا گیا، جس کی ایک کاپی اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہے۔

اس کے بعد ہمارا ربط میکنزی صاحب سے ولیا ہی رہا، جیسے عبدالرحمان خان صاحب سے تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بحیثیت صدر الہمن اور بحیثیت ایڈیٹر مجلۂ عثمانیہ یونیورسٹی کے ہزاروں طالب علموں کے واحد نمائندہ اہم ہی تھے۔ پرو وائس چانسلر لارج بنا رہونے کے بعد میکنزی صاحب یونیورسٹی کے اپنے بنگلے میں آ گئے، اور ہم ان کے بنگلے میں جا یا کرتے تھے، چنانچہ لیڈی میکنزی اپنے بچے کی طرح ہمارے ساتھ سلوک کرتی تھیں، اور کھلایا پلایا بھی کرتی تھی۔ ایک بار حیدرآباد کے صدر اعظم اور یونیورسٹی کے چانسلر سر اکبر حیدری کسی کام سے میکنزی صاحب کے دفتر آئے تھے تو میکنزی صاحب نے پیشی کے چپڑاسی کو بھیجا کر یونین سے ہمیں اور سر اکبر سے انھیں لفظوں میں ہمارا تعارف کرایا، جن لفظوں میں ہمارے صدر صاحب نے میکنزی صاحب سے ہمارا تعارف کرایا تھا۔ سر اکبر نے بھی اپنی خوشی اور خوشنودی کا اظہار کیا، اور یونین کے مسائل اور محلے کے سلسلے میں ہم سے چند ایک سوالات کیے، جن کا تشفی بخش جواب ہم نے انھیں دیا تھا۔

میکنزی صاحب سے ہمارے تعلقات بڑے ہی اچھے اور گہرے رہے۔ ہم نے اپنے ایک سالہ دور میں یونیورسٹی میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں کر دکھائے۔ اگر ان کی تفصیل بیان کریں تو اس رپس کے گھوڑے کی طرح دوڑنے والے قلم کو بلا مبالغہ دو ری ایک سو صفحے چاہئیں۔ ہم صرف تین واقعات کا مختصر طور پر ذکر یہاں ضروری سمجھتے ہیں، جس سے راز دار خان صاحب مرحوم کے عزیز اور مفلس اکبر صاحب قلم فرزند کی اہمیت کا بھی کچھ اندازا آپ کو ہو سکے گا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں ترکی کی ذیکوسلوواکیا کے ادیب خاتم ہندستان کے دورے پر آئی تھیں۔ وہ حیدرآباد بھی آئیں اور حکومت کی مہمان رہیں۔ سر اکبر حیدری چاہتے تھے کہ خاتم یونیورسٹی کی طرف سے بھی ان کو دعوت دی جائے۔ انھوں نے فون پر میکنزی صاحب سے کہا، میکنزی صاحب نے ان سے کہا کہ یہ فون مت رکھیے، میں یونین کے پریسیڈنٹ کو ابھی بلواتا ہوں، چپڑاسی کے ہمراہ دوڑتے ہوئے آیا، اور اس نے کہا کہ صدر اعظم بہادر کا فون آیا ہے، اور صاحب نے آپ کو فوراً آنے کے لیے کہا ہے۔ ہم گئے اور میکنزی صاحب نے فون ہمارے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ سر اکبر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے آداب عرض کی، اور کہا کہ صاحب کا کیا حکم ہوتا ہے، کہنے لگے کہ جی۔ آپ خان تم کو معلوم ہو گا کہ ترکی کی ایجوکیشنل مسٹر خالدا ادیب خانم آئی ہیں، اور سرکاری مہمان ہیں۔ ان کی اب تک تین ایک دعوتیں ہو چکی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ یونیورسٹی کی طرف سے بھی ان کو دعوت دی جائے۔ ہم نے کہا صاحب! سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر جیسے عالی قدر ہمارے چانسلر اور ڈاکٹر میکنزی جیسے اولوالعزم اور قابل ترین شخصیت کے حامل پرو وائس چانسلر ہوتے ہوئے، یہ کیسے ممکن ہے کہ یونیورسٹی کی طرف سے کوئی

دعوت نہ دی جائے، دی جائے گی، اور ضرور دی جائے گی، آپ یقین رکھیے ایک شاندار اور یادگار ڈنر دیا جائے گا۔ یہ سن کر سر اکبر نے اپنی خشی کا اظہار کیا، اور ہم نے آداب بجالایا، اور فون رکھ دیا۔ سر اکبر کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بچوں سے انگریزی میں نہیں بلکہ ہندستانی زبان میں بات کرتے تھے۔ مسکتری صاحب ہندستانی فلموں کے بہت شائق ضرور مگر پوری طرح سمجھ نہیں سکتے تھے، چنانچہ ہم نے انگریزی زبان میں سر اکبر کی ہماری گفتگو کی تفصیل سنائی تو وہ پریشان ہو گئے کہ اتنا شاندار ڈنر کیسا سے دیں گے؟ ہم نے کہا آپ فکر نہ کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ ہمارا مشورہ سنیے، اس وقت چند ایک بیوقوفیوں کی تجویز بنائیے، اس کے سکریٹری ہم رہیں گے۔ نوٹس ٹائپ کروا کر ابھی گشت کروا دیجیے۔ ۳ بجے کمیٹی کا اجلاس ہوگا، اس وقت ہم ڈنر کی تفصیلات پیش کریں گے، چنانچہ اسی وقت نوٹس ٹائپ کروا کر گشت کروا دیا گیا۔ ہم لوگ کے دفتر گئے، اور انگریزی میں ڈنر کی ساری تفصیلات لکھ ڈالیں۔ ۳ بجے کمیٹی اجلاس پر ہوئی، ہم نے تفصیلات خرچ پیش کیں، اس کو سبھوں نے دیکھا، اس میں کچھ ترمیمیں ہوئیں اور خدا مسکتری صاحب نے اضافے کیے۔ دو سو مہمانوں کا ڈنر دینا طے ہوا۔ ڈنر کا کنٹراکٹ عامرا کو دیا گیا۔ دعوت نامے کا مضمون پاس کر کے ہمارے حوالے کیا گیا۔ دو سو رقعے چھپے اور معزز مہمانوں کے نام تقسیم بھی کر دیے گئے۔ ہم خود ہی سر اکبر، خالدا ادیب خانم اور ہمارے سابق صدر عبدالرحمان خان صاحب کے رقعے لے کر گئے۔ سر اکبر نے دعوت نامہ دیکھا اور بے حد خش ہوئے اور یہ کہا کہ خالدا ادیب خانم کا رقعہ میں خود ہی انھیں دے دوں گا۔ ہم نے سر اکبر سے کہا کہ دو سو دعوت نامے تقسیم ہوئے ہیں، جن میں تمام صدر المہام یا منسٹر اور معتمد یا سکریٹری حکومت حیدرآباد بھی شامل ہیں۔ رزیڈنٹ حیدرآباد کے علاوہ بعض انگریز عہدے داروں کو بھی دعوت دی گئی ہے۔ ڈنر کا انتظام عامرا کو دیا گیا ہے۔ ڈنر انگریزی اور مغلائی دونوں قسم کا ہوگا۔ حیدرآباد کی مشہور دوگوشتا بریانی، دم کا مرغ، کباب، لقمی شکمبور، قورما، بگھارے بیگن، تونک وغیرا وغیرا کے علاوا چار قسم کے مغلائی میٹھے بھی ہوں گے۔ ہم نے سر اکبر سے یہ تاکید بھی کر دی کہ خالدا ادیب خانم نے سیکڑوں ہی انگریزی ڈنر کھائے ہوں گے، لیکن حیدرآباد کی وہ گوشتا بریانی پورے لوازمات کے ساتھ کبھی نہیں کھائی ہوگی، اس لیے بہتر ہوگا، اگر آپ ان سے مغلائی ڈنر کھانے کی سفارش کریں۔ اس پر سر اکبر حیدری نے خشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ضرور ضرور نہیں سے کہوں گا، وہ یقین حیدرآباد کی بریانی ہی کھائیں گی، اور میں خود بھی وہی بریانی کھاؤں گا۔ سر اکبر سے رخصت لے کر ہم اپنے سابق صدر عبدالرحمان خان صاحب کے گھر گئے۔ انہیں دعوت نامہ دیا، اور آنے کا وعدہ لے کر چلے آئے، مگر بعد میں دعوت میں وہ نہیں آئے تھے، اس لیے کہ سر اکبر حیدری سے ان کے تعلقات نہایت ہی کشیدہ اور خراب تھے۔

ڈنر کے انتظامات میں مسکتری صاحب نے ضرورت سے زیادہ دلچسپی لی۔ ڈنر کا وقت آگیا، تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ ڈنر ایک بڑے شامیانے میں دیا گیا تھا، اندر اور باہر برقی روشنی کے اتنے زبردست انتظامات تھے کہ سارے ماحول کو لمحے نور بنا دیا گیا تھا۔ ساتھ سنگترہ ہی سرے بھرے پودوں کے گوندے رکھ کر چمن زار کا نمونا پیش کیا گیا تھا۔ یہاں پر مہمانوں کے لیے کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلا شروع ہوا، ہر مہمان کی حیثیت سے ہر شخص اس کا استقبال کر رہا تھا۔ ہماری یونیورسٹی کے چانسلر اور صدر اعظم یا پریمیئر منسٹر آف حیدرآباد سر اکبر حیدری آئے، جن کا ڈاکٹر مسکتری اور تمام پروفیسر صاحبان اور عہدے داروں وغیرا اور خود ہم نے بھی ان کا استقبال کیا۔ سر اکبر نے انتظامات کو دیکھ کر اپنی بے حد خشنودی کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر بعد خالدا ادیب خانم آئیں۔ سر اکبر نے ان کا استقبال کیا، اور ڈاکٹر مسکتری اور ہمارا تعارف کرایا۔ اسے میں رزیڈنٹ حیدرآباد بھی کار آگئی۔ سر اکبر اور ڈاکٹر مسکتری نے ان کا استقبال کیا، اور خالدا ادیب خانم سے تعارف ہوتے ہی، سب مہمان شامیانے میں چلے گئے۔ ہر کرسی پر نام کی چٹھیاں لگی ہوئی تھیں، اس لیے کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہونے پائی۔ پہلی لائن میں درمیان میں خالدا ادیب خانم تھیں، اور داہنے بائیں رزیڈنٹ حیدرآباد اور سر اکبر تھے۔ اس کے دونوں طرف منسٹرس اور انگریز عہدیداروں کا سلسلا تھا۔ خالدا ادیب خانم کے روبرو

ہمارے ہر دلعزیز پرو وائس چانسلر ڈاکٹر میکنزی صاحب تھے، اور ان کے دہنے ہاتھ پر ہم بیٹھے تھے، اور یہ انتظام خود میکنزی صاحب کا تھا۔ لیڈی میکنزی، حیدرآباد کے رزیڈنٹ میکنزی کے مقابل بیٹھی تھیں، اس لیے کہ ہمارے میکنزی صاحب رزیڈنٹ میکنزی کے چچازاد بھائی تھے سراکبر، خالدا ادیب خانم، رزیڈنٹ حیدرآباد، ہمارے میکنزی صاحب اور دوسرے تمام انگریزوں دوگونہ شادمانی اور ہم لوگوں نے گیارہ کورس کا انگریزی کھانا اڑایا۔ ی۔ ایم۔ خان کی شخصیت اور اہمیت کا اندازہ تھی اس یادگار ڈنر کے موقع پر ہوسکتا ہے کہ شہر حیدرآباد اور سکندرآباد کے جڑے ہوئے شفق، اور چوٹی کے معزز مہمانوں میں عثمانیا یونیورسٹی کا صرف ایک طالب علم ہی۔ ایم۔ خان ہی تھا، جس کو پرو وائس چانسلر ڈاکٹر اے۔ آر میکنزی نے خندہ جبیں پر اہمیت دے رکھی تھی، جس کا وہ حقیقی اور صحیح معنی میں مستحق تھا۔

ی۔ ایم خان کی طالب علمی کے کارگذاریوں اور کارناموں کی داستان بہت ہی طویل ہوئی جاتی ہے، اس لیے ہم اپنے دو اور اہم کارناموں کا مختصر سا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اول یہ کہ میکنزی صاحب کی منظوری کے بعد دسمبر ۱۹۳۴ء کی چھٹیوں میں شمالی ہندستان کا تعلیمی سفر کروایا۔ اس سفر میں ہمارے ساتھ (۳۰) طالب علم تھے۔ پاکستان کا موجودہ شہر لاہور بھی ہم نے دیکھا ہے، اس کے علاوہ امرتسر، آگرا، فتح پور سیکری، دلی، نئی دلی، کانپور، بنارس، الہ آباد۔ لکھنؤ۔ کلکتہ۔ وشاگ، وجے واڑا سے ہوتے ہوئے حیدرآباد لوٹے تھے۔ ہمارا دوسرا تعلیمی سفر اپریل اور مئی ۱۹۳۵ء میں رہا۔ اس سفر میں ہمارے ساتھ (۱۳) طالب علم تھے۔ پہلے ہم لوگ بنگلور گئے وہاں سے کولار دیکھتے ہوئے مدراس پہنچے، پھر پانڈیچری (فرنچ علاقہ) کڈالور، ترچناپلی سے ہوتے ہوئے تنجاؤر، مدورا پہنچے، وہاں سے اٹالیس بنجر کے ذریعے ۵ر مئی ۱۹۳۵ء کو سیلون (موجودہ سری لنکا) کے بائے تخت کولمبو پہنچے۔ وہاں ہم نے کنگ جارج پنجم کی تخت نشینی کی سلور جوبلی منائی۔ کولمبو میں آٹ روڈ ٹینک ظاہرا کالج میں ہمارا قیام رہا۔ اس کے بعد ہم ہائی جنکشن سے بس کے ذریعے ADAMS PEAKS گئے۔ پھر نیورا ایلیا۔ کینڈی۔ مائلے۔ ڈمبلے دیکھتے ہوئے ٹرنکومالی پہنچے۔ وہاں سے فیری بوٹ کے ذریعے ہندستان کے ساحل دھنسکوڈی پر اترے اس کے بعد ریل کے ذریعے مدورا دیکھتے ہوئے مٹوپالایم۔ کوئمبتور۔ کوتور۔ ادٹی۔ میسور۔ بھیلی۔ دھارواڑ۔ لونڈا۔ گوا۔ پونا۔ بمبئی سے ہوتے ہوئے اورنگ آباد پہنچے۔ وہاں ایلورا وغیرا دیکھا اس کے بعد اپنے وطن حیدرآباد لوٹے۔

ہمارے ہر دلعزیز پرو وائس چانسلر ڈاکٹر اے۔ آر میکنزی صاحب ہمارے اس ڈبل سفر کے اہم ترین کارنامے سے بھی بے حد خوش تھے، اور انھوں نے اس تعلیمی سفر کو بڑی اہمیت دے رکھی، اس لیے کہ ہم نے بتایا تھا کہ ہم سے پہلے طلباے جامعۂ عثمانیا کی انجمن اتحاد کے جتنے بھی صدر یا پریسیڈنٹ گزرے ہیں، انھوں نے اپنے اپنے دور میں صرف دو ایک شہر کا تعلیمی سفر کروایا، مگر ہم نے پاکستان کے موجودہ شہر لاہور سے لے کر ایک غیر ملک سیلون (سری لنکا) اور کلکتہ سے لے کر بمبئی تک سارا ہندستان گھما پھرا دیا تھا۔ اس تاریخی اور اہم یادگار سفر کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ طلباے جامعۂ عثمانیا نے پہلی بار ٹیوٹی کورن سے سیلون کے بائے تخت لنکا تک ایک بڑے اٹارلین لائنرز کے ذریعے سمندری سفر کیا تھا، اور ۵ر مئی ۱۹۳۵ء کو کولمبو شہر جی، برطانیا، ہندستان، اور سیلون وغیرا وغیرا کے شہنشاہ کنگ جارج پنجم کی تخت نشینی کی سلور جوبلی منائی تھی، چونکہ سیلون شاہ برطانیا کی کراؤن کالونی یا صرف خاص یا جیب خاص تھا، اس لیے اس ملک میں یہ یادگار تقریب بڑے ہی زور و شور سے منائی گئی تھی، اور کولمبو شہر کو بقعۂ نور بنا دیا گیا تھا۔ جوبلی تقاریب کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ ساحل کولمبو پر دو راتوں میں مختلف جہازوں سے مختلف قسم کی آتش بازی کے مظاہرے ہوا کرتے تھے، جس کے دیکھنے کے لیے سارا شہر کولمبو ٹوٹ پڑتا تھا۔ آتش بازی کے یہ نادر اور محیر العقول مظاہرے ایک ہفتے تک ہوتے رہے۔ سیلون سے جب ہم بمبئی لوٹے ہیں تو ہم لوگوں نے بمبئی شہر کے رہنے والوں سے معلوم کیا کہ آیا ساحل بمبئی پر بھی آتش بازی کے مظاہرے، جہازوں سے ہوا کرتے تھے تو سبھوں نے نفی میں جواب دیا، اس لیے ہم سب کو قائل ہونا پڑا کہ کولمبو شہر کو اس لیے اہمیت دی گئی تھی کہ کراؤن کالونی سیلون کا بائے تخت تھا۔

اس کے بعد بحیثیت طالب علم عثمانیا یونیورسٹی ہمارا ایک اہم ترین، زبردست اور تاریخی نیز یادگار کارنامہ، آپنے ہی چھیڑے اور پیر دلعزیز پرو وائس چانسلر ڈاکٹر اے۔ ایچ میکنزی کو "ہرا دیا" ہے! واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں نواب میر عثمان علی خان آصف سابع اور شاہ دکن کی تخت نشینی کی "سلور جوبلی" واقع ہوئی تھی۔ جوبلی کی تاریخیں یونیورسٹی کے امتحانات سے لڑ رہی تھیں، اس لیے طلبا یہ چاہتے تھے کہ امتحانات کی تاریخیں بڑا دی جائیں۔ میکنزی صاحب حیدرآباد کے لیے نئے تھے، اس لیے انھوں نے پروفیسروں سے اس بارے میں مشورا کیا تو سب ہی پروفیسروں نے ایک آواز ہوکر کہا کہ تاریخیں بڑانے کی ضرورت نہیں، طلبا امتحانات بھی دے سکتے ہیں، اور "سلور جوبلی" کی تقاریب میں حصا بھی لے سکتے ہیں، اور اس پر فضا تماشا یہ ہوا کہ اس وقت طلبا کی نمائندا تنظیم مزدوری کام کر رہی تھی، جس میں صدر یونین ظفر الحسن اور ارکان میں مخدوم محی الدین، شنکر جی، شمیم یار کاوس جی، الوالخیر صدیقی، لوئس سلیم، اختر حسن، محمد علی خاں، اور شہاب الدین وغیرا وغیرا شامل تھے۔ پروفیسروں کے لفظی تیر جواب دینے کے بعد میکنزی صاحب نے لازمی طور پر طلبا کی نمائندا جماعت یونین مینڈی سے بھی مشورا کیا، تو اس مینڈی نے متفقا طور پر پروفیسروں کے خیال کی تائید کی، اور میکنزی صاحب کو یہ جواب دیا کہ واقعی اور حقیقت میں امتحانات کی تاریخیں بڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، طلبا امتحانات بھی دے سکتے ہیں، اور "سلور جوبلی" کی تقریبوں میں بھی حصا لے سکتے ہیں۔ پروفیسروں اور مینڈی کے اس متفقا فیصلے کے بعد لازمی طور پر پرو وائس چانسلر میکنزی صاحب نے یہ اعلان کردیا کہ امتحانات کی تاریخیں نہیں بڑائی جائیں گی، بلکہ امتحانات دیتے ہوئے بھی طلبا "سلور جوبلی" کی تقریبوں میں شرکت کر سکتے ہیں۔ میکنزی کے اس اٹل فیصلے سے یونیورسٹی کے ہزاروں طلبا سخت مشتعل اور برہم ہو گئے۔ عام طلبا کا رجحان اور اٹل فیصلا یہ تھا کہ امتحانات کی تاریخیں "سلور جوبلی" کی تاریخوں سے چونکے ٹکرا رہی ہیں، اس لیے لازمی طور پر امتحانات کی تاریخیں بڑا دی جائیں، اس لیے کہ ہم تمام طلبا بحیثیت وفادار رعایا کے شاہ دکن کی "سلور جوبلی" کی تقاریب میں بھی کھول کر پورا پورا حصا لیں گے، اور یہ کہ "سلور جوبلی" بار بار نہیں آتی ہے، ہمارے بادشاہ کے (۲۵) سالا دور حکومت کے بعد آئی ہے، جس میں سب ہی شہری بھی کھول کر حصا لے رہے ہیں، بلکل اسی طرح جامعۂ عثمانیا کی طلبا برادری بھی اس یادگار تقاریب میں بھی کھول کر حصا لے گی، اور جب اس اہم تقریب میں بھی کھول کر حصا لے گی تو امتحانات کی تیاری برابر نہ کر سکے گی۔

پروفیسروں، مینڈی اور میکنزی صاحب کے اس متفقا غلط اور بے معنی فیصلے کے خلاف تمام طلبا نے میکنزی صاحب کے اجلاس کے سامنے مظاہرے شروع کردیے، اور پروفیسروں کی بھی بری طرح سے خبر لی، نیز یونین مینڈی کو بھی بری طرح سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور ان سب کے خلاف کھلی بغاوت پر اتر آئے، ایک روز ہزاروں طلبا کے مجمع نے ہمیں گھیر لیا، اور جی۔ ایم۔ خان زندا باد، ہمارا صدر زندا باد کے جیسے غلط نعرے لگانے لگے۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ آپ کی طرح ہم خدا بھی، پروفیسروں، ظفر مینڈی اور میکنزی صاحب کے اس سوفی صد بے معنی، لغو مہمل، اور غدارانا فیصلے کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتے ہیں، اور ہزاروں طلبا کی طرح ہم خدا بھی یہ چاہتے ہیں کہ امتحانات کی غلط تاریخیں فوراً بڑا دی جائیں، تاکہ دوسرے لاکھوں شہریوں کی طرح، ہم ہزاروں طلبا بھی اپنے بادشاہ کی "سلور جوبلی" کی یادگار تقاریب میں حصا لے سکیں! ہمارے اس مختصر اور مصدقہ تقریر نے مشتعل طلبا کے دل جلے جذبات اور شعلوں پر پٹرول چھڑکنے کا کام کیا، اور ہمیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر جی۔ ایم۔ خان زندا باد، ہمارا صدر زندا باد، کے نعرے لگاتے ہوئے سارے کمپونڈ کا ایک چکر لگایا۔ اس کے بعد ہم نے اپنی طلبا برادری سے پھر سے کہا کہ جذبات سے مشتعل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم طلبا آپا حق لے کر رہیں گے، مگر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے کہ آپ غلط ستم کے نعرے لگا رہے ہیں، اس وقت ہم آپ کے صدر نہیں ہیں، جو اس وقت یونین کا صدر ہے، اس کو اور پوری مینڈی کو بلائیے کہ اس نے طلبا کی مرضی کے اور فیصلے کے خلاف میکنزی صاحب کو ایسا سراسر غلط مشورا کیوں کر دیا، نیز یہ کہ ان

تک عوام پروفیسروں کی بھی خبر لیجئے جنہوں نے اپنے بادشاہ کی بادگار "سلور جوبلی" کی اہمیت کو کچھ بھی نہیں سمجھا، اور پرووائس چانسلر صاحب کو یہ غلط مشورا دے دیا کہ امتحانات بھی ہو سکتے ہیں، اور جوبلی کی تقاریب بھی منائی جا سکتی ہیں ہم نے زور دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اعلان کے مطابق تاریخوں میں امتحانات ہر گز ہر گز نہیں ہو سکتے، امتحانات کی تاریخیں لازمی طور پر بڑھا دینا پڑیں گی ۔ اس کے بعد دوسرے شہریوں کے ساتھ ہم ہزاروں طلبا بھی اپنے شاہ ذیجاہ کی "سلور جوبلی" کی تقاریب میں جی کھول کر حصا لیں گے یہ کہتے ہی پھر سے جی ۔ ام ۔ خان زندا باد، اور ہمارا صدر زندا باد کے نعروں سے سارا کیمپونڈ گونج اٹھا ۔

ہم نے طلبا برادری کو یقین کامل دلایا کہ ہم ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہیں، اور آپ کے اس مطالبے کو منوانے میں پورا پورا ساتھ دیں گے، مگر آپ کو کوئی غلط مشورا نہیں دیں گے، اس لیے کہ کل تک ہم آپ کے صدر تھے ۔ ہماری اصول پسندی کا ہر شخص قایل تھا، اور آج ہم صدارت سے ہٹنے کے بعد بے اصولی کی باتیں کریں، اور آپ کو غلط مشورا دیں، یہ تو ہم سے ہرگز ہرگز ممکن نہیں ۔ ہم نے کہا کہ ہم اس وقت ملیریائی بخار کا شکار بنے ہوئے ہیں، ہمارا سارا جسم بخار کی شدت سے جھلسا جا رہا ہے، اس لیے اب آپ ہمیں گھر جانے کی اجازت دیجئے، اور اس کام کی پابجائی کے سلسلے میں ظفر منزی سے پھر سے اپنا رابطہ قایم کیجئے، یہ کہتے ہوئے ہم اپنے گھر چلے گئے ۔

۱۹۳۶ء میں ہمارا کونسلر شپ سے تعلق اس طرح سے تھا کہ ام ۔ اے کامیاب کرنے کے بعد ہم نے ال ال بی (ابتدائی) میں داخلہ لیا تھا، اس طرح سے بحیثیت ایک طالب علم ہم یونیورسٹی روز ہی آیا کرتے تھے ۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ظفر منزی کے خلاف ہم نے صدر منزی کا انتخاب لڑایا تھا، مگر جو نکے ہماری کوشش ناکام ہو گئیں، اس لیے ہم یونین سے بالکل ہی بے تعلق ہو گئے تھے، مگر یونین کے قانون اور دستور کے تحت ہر سابق صدر موجودا کابینا کا ممبر ضرور ہوا کرتا ہے، لیکن ہم نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی، اور ایک بار بھی منزی کے اجلاسوں میں شرکت نہیں کی، فایدہ ہی کیا تھا ایسی مخالف فضا میں جا کر ہم کیا کرتے ؟ اس وجہ سے ہم موجودا منزی، اور اس کے کاروبار سے بالکل ہی بے تعلق ہو گئے تھے، مگر پروفیسروں، اور ظفر منزی کے ہزاروں طلبا کے جذبات کے خلاف جو غلط فیصلا دیا، اس سے ہم خفا بھی برہم تھے، جینکے اپنا سابق صدر طلبا کو اپنا ہم خیال مل گیا، اس لیے انھوں نے ہمیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ ہم اس اہم مہم کی کمان اپنے ہاتھ میں لیں، اور طلبا کے مطالبات کو کامیاب بنا کر رہیں، اور بھی دو چار روز تک ہم طلبا کو سمجھاتے رہے کہ ظفر منزی کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے ایک دوسرے فیصلے سے پرووائس چانسلر صاحب کو آگاہ کرے کہ اس کا سابق فیصلا غلط تھا، اور اب ہزاروں طلبا کے جذبات کا لحاظ کر کے منزی یہ چاہتی ہے کہ ہیکنزی صاحب اپنے سابق اعلان کو مسترد کرتے ہوئے دوسرا اعلان امتحانات کی تاریخیں بڑھا دیے جانے سے متعلق کریں، ہم نے ہزاروں مشتعل طلبا کو یقین دلایا کہ ظفر منزی کو منوانے کے لیے ہم خود بھی آپ کے ساتھ یونین کے دفتر چلتے ہیں ۔ اس پر طلبا نے صاف انکار کر دیا، اور اپنے صدر ظفر الحسن اور اس کی کابینا کے ہم ایک ممبر کا نام لے کر گالیاں دینے لگے ۔ ہمارے اس مشورے کے باوجود طلبا نے ایک آواز ہو کر یہ کہا کہ ہمارا یہ اٹل فیصلا ہے کہ ظفر الحسن منزی عذار ہے ظفر منزی نے اپنے غلط فیصلے سے ہم ہزاروں طلبا کے جذبات سے کھیلا ہے، اس لیے اس وقت آپ کے سامنے ہم ہزاروں طلبا ظفر منزی کے خلاف ووٹ آف نان کان فی ڈنس VOTE OF NONCONFIDENCE یا تحریک عدم اعتماد پاس کرتے ہیں ۔ ظفر منزی کو ہم نے اپنی رائے سے بنایا تھا، اور اب اس منزی کو اپنی متفقا رائے سے ختم کیے دیتے ہیں ۔ یہ منزی طلبا کی دشمن ہے، اس لیے ایسی منزی ایک منٹ کے لیے بھی قایم نہیں رہ سکتی ۔ اب آپ سے ہماری یہ متفقا اپیل اور درخواست ہے کہ آپ آج ہی، اور اسی وقت اس اہم مہم کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کر ہمارے مطالبات کو موقعی صد کامیاب بنایئے !

طلبا برادری کے اس اہم متفقا فیصلے کے بعد تو ہم بالکل ہی لاچار اور مجبور ہو گئے، اور اس بات کا اعلان

کر دیا کہ ہم آپ کے اس اہم اور آخری فیصلے کی طرف سر تسلیم خم کرتے ہیں، اور اس بات کا پکا وعدہ کرتے ہیں کہ پرو وائس چانسلر مکنزی صاحب نے اپنے واضح مطالبات کو منوا کر رہیں گے، لیکن ہم نے طلبا سے کہا کہ اس اہم تاریخی اور یادگار دن کا نشان اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد ہم لازمی طور پر آپ کے کمانڈر COMMANDER بن گئے ہیں، اس لیے کمانڈر کے ہر حکم کی آپ کو تعمیل کرنی پڑے گی، ورنہ اس اہم مہم کا چلانا اور کامیاب بنانا ہمارے لیے ناممکن ہو جائے گا، اس لیے اس وقت ہم آپ سب سے حلف وفاداری لیتے ہیں، چنانچہ اسی وقت ہم نے ہزاروں طلبا سے حلف وفاداری لیا۔ اس کے بعد پرو وائس چانسلر صاحب نے نام انگریزی زبان میں یہ "الٹیمیٹم" لکھ بھیجا کہ جامعۂ عثمانیا کے ہزاروں طلبا نے ظفر منزی کے نام تحریک عدم اعتماد پاس کر دی ہے، اور اپنے سابق صدر کی۔ ام جان کو اس بات کا مجاز گردانا ہے کہ طلبا کے مطالبات کو منوانے کے سلسلے میں آپ سے خط و کتابت کرے، اور ضرورت پڑے تو ملے بھی، اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ امتحانات کی تاریخیں بڑھا دیے جانے کے سلسلے میں آپ سابقہ ظفر منزی کی بجائے مجھ سے خط و کتابت کریں، اور ملنا چاہیں تو مجھ کو طلب فرمائیں، اور یہ کہ آج سے ہم ہزاروں طلبا اسٹرائیک پر ہیں۔ سوائے عذار طلبا کے یونیورسٹی کا ایک بھی طالب علم یونیورسٹی کے کمپونڈ میں نہیں رہے گا۔ طلبا کا ہیڈ کوارٹر ریلوے اسٹیشن جامعۂ عثمانیا کے سامنے کا میدان رہے گا، اور یونیورسٹی کے اوقات کار میں خدا بھی وہاں ہزاروں طلبا کے ساتھ موجود رہوں گا، اس لیے آپ جب کبھی مجھ کو طلب فرمائیں تو وہاں اپنے کسی نمائندے کو بھیج سکتے ہیں۔ یہ تحریر بھجوانے کے بعد تمام طلبا اپنے نئے ہیڈ کوارٹر، یعنی اسٹیشن جامعۂ عثمانیا کے کمپونڈ میں پہنچ گئے۔ کسی بھی جماعت میں ایک بھی طالب علم نہیں تھا، اور تمام اقامت خانوں یا ہوسٹلس کے طلبا بھی اسٹرائیک میں شریک ہو گئے تھے۔ ظفر منزی کے ایک درجن عذار طلبا مکنزی صاحب سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے یونیورسٹی کے دفتر میں منھ چھپائے بیٹھے تھے۔ طلبا برادری ان عذاروں سے اس قدر مشتعل تھی کہ اگر وہ ہاتھ آجاتے تو ان کا خاتمہ کر دیتے۔

پرو وائس چانسلر مکنزی صاحب، نمک حرام پروفیسرس اور ظفر منزی کے عذار ارکان ایسی سنسنی خیز کامیاب اسٹرائیک کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، اس لیے دو چار روز بعد مکنزی صاحب ہم سے بات چیت کرنے پر تیار ہو گئے۔ خدا ہم نے بھی بات چیت کرنے پر آمادگی ظاہر کی، اور اپنے ساتھ دو چار طلبا مشیروں کو لے کر گئے۔ مکنزی صاحب نے بعض سینئر پروفیسروں اور ظفر منزی کو بھی طلب کیا تھا۔ بات چیت شروع ہوئی۔ پروفیسروں کے علاوہ ظفر منزی نے اس نوبت پر بھی عام طلبا کے اس مطالبے کو غلط قرار دیا، اور اپنے اس اٹل فیصلے کو دہرایا کہ امتحانات کی تاریخیں بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں، اس کے برعکس ہم نے اپنا یہ اٹل فیصلہ سنا دیا کہ حضور نظام کی سلور جوبلی کی تقاریب میں ہزاروں طلبا کا حصہ لینا ضروری ہے، اس لیے طلبا امتحانات دینے سے قاصر اور مجبور ہیں، جس کا واحد حل یہ ہے کہ پرو وائس چانسلر صاحب امتحانات کی تاریخیں بڑھا دیے جانے کا فوری اعلان کر دیں، ورنہ یہ سو فی صد کامیاب اور مکمل اسٹرائیک برابر جاری رہے گی۔ ہزاروں طلبا کے جذبات سے کھیلنا کوئی دانشمندی، عقل مندی، اور فراست و دانائی کا ثبوت نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے کھلے طور پر یہ بھی کہہ دیا کہ اسٹرائیک کے سلسلے میں اگر کچھ ناگوار واقعات پیش آجائیں تو اس کی تمام تر ذمے داری خود پرو وائس چانسلر صاحب، اور پروفیسروں، نیز سابقا نام نہاد ظفر منزی کے عذار ارکان یا ممبروں پر ہوگی۔ یہ کہتے ہوئے اپنے مشیروں کے ساتھ وائس چلے آئے اور تمام طلبا کو وہاں کا حال احوال لفظ بہ لفظ کہہ سنایا، جس کے بعد طلبا نے جی۔ ام۔ خان زندہ باد، ہمارا قائد زندہ باد اور ہمارا لیڈر زندہ باد کے نعرے لگائے۔

ظفر منزی کے عذار طلبا یونیورسٹی کی کار میں سکندرآباد سے ہوتے ہوئے، اپنے گھروں کو جاتے، اور دوسرے روز یونیورسٹی کو آیا کرتے تھے۔ ادھر مشتعل طلبا اس بات کے منتظر تھے کہ اگر اتفاق سے ایک بار بھی کار کا

اس طرف سے گزر ہو جاتے تو کار اور طلبا کے پرچے اڑا کر رکھ دیں گے، دن گزرتے گئے، اور ادھر میکنزی صاحب سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا، انھوں نے کئی ایک سنئیر اور اہم پروفیسروں سے ہم پر انٹرویو لینے والے جن کا ہم زیادہ احترام کرتے تھے، مگر ہم "خطب از جائی جنند" کے مصداق اپنے فیصلے پر اٹل رہے، اور ہر ایک واقعے سے اپنی طلبا برادری کو واقف کراتے رہے آخری حربہ میکنزی صاحب نے یہ اختیار کیا تھا کہ پروفیسر الیاس برنی صاحب، صدر شعبۂ معاشیات کو بیدل جانے کا مشورہ دیا۔ ہمارے یہ پروفیسر واقعی قابل احترام تھے، اور سب طلبا ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے ہم اپنے ہزاروں ساتھیوں کے مجمع میں باتیں کرتے ہوئے تھے کہ دیکھا طالب علم دوڑے دوڑے آئے کہ پروفیسر الیاس برنی صاحب آپ سے ملنے پیدل چلے آرہے ہیں، یہ سنتے ہی ہم تنہا ان کے استقبال کے لیے چلے گئے، سڑک کے قریب ابھی وہ یونیورسٹی کے کمپونڈ ہی میں تھے کہ ہم پہنچ گئے اور آداب بجا لاتے ہوئے ان کے بیٹ میں ہنڈی ڈال دی اور یہ کہا کہ آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کیوں گوارا کی، اگر آپ اپنے چپراسی کے ذریعے بلواتے تو ہم فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ انھوں نے ہمارے سر اور پیٹھ پر بار بار ہاتھ شفقت اور محبت سے پھیرتے ہوئے کہا، میاں تم یقین جانو میکنزی صاحب کا بہت برا حال ہو گیا ہے۔ اتنا بڑا آدمی اس کا دل چھوٹ گیا ہے، بعض پروفیسروں اور ظفر منزی کے غلط مشورے کی وجہ سے اس نے یہ اعلان کر دیا ہے۔ اب اس کی عزت اور وقار کا سوال درپیش ہے۔ تم سب طلبا کے ساتھ جاؤ تو میں انھیں مشورہ دے کر امتحانات کی تاریخیں بڑھوا دوں گا وغیرہ وغیرہ، بہرحال تقریباً آدھ گھنٹے تک اپنے پند و نصائح سے ہمیں رام کرنے اور متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہے، اور ہم بمشکل تمام معتقد اور اطاعت گذار طالب علم کے ان کا رام کیا فی سنتے رہے، انتہا یہ کہ ہمارا ہاتھ کار کا دروازہ بند کرنے کے لیے میکنزی صاحب کی تائید میں انھوں نے اپنے قیمتی آنسو تک بہا دیے، اور بار بار بات سے آنسو پونچھتے جا رہے تھے۔ آخر میں ہم نے صرف یہ جواب دیا۔ بہت خوب، آپ یونیورسٹی واپس جائیے، اور ہم اپنی طلبا برادری سے مشورے کے بعد اپنے فیصلے سے آپ کو مطلع کرتے ہیں۔ پھر سے ادب سے آداب بجا لایا، اور انھیں رخصت کرتے ہوئے اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ملاقات کی ساری تفصیل کہہ سنائی، جس پر تمام طلبا نے بار بار زوردار قہقہے لگائے۔

میکنزی صاحب کی شرافت ملاحظہ ہو کہ کوتوال سنئیر نے حفاظت کی خاطر یونیورسٹی کے کمپونڈ میں پولیس فورس کا ایک دیان بھجوایا تھا۔ جس کا علم میکنزی صاحب کو بھی گزر دیا گیا، تو انھوں نے ۸.۸ سے کہا کہ کوتوال کو ابھی فون کرکے، اور کہو کہ پولیس دیان فوراً واپس بلوالے اس لیے کہ میرے بچے ہی خود پولیس کا کام انجام دے رہے ہیں، اس لیے کہ آئے روز کی اسٹرائیک کے دوران میں آج تک ایک معمولی سا بھی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا، چنانچہ اس وقت کوتوال نے وہ دیان واپس بلوا لیا، اور حقیقت میں ایک مہینا پانچ روز کی طویل اسٹرائیک کے زمانے میں طلبا کی طرف سے ایک بھی ناگوار واقعہ نہیں ہوا، سوائے ایک معمولی سے واقعے کے، وہ یہ کہ یونیورسٹی رجسٹرار حیدر احمد انصاری اسٹرائیک شروع ہونے کے دوسرے ہی روز اپنے بڑے لڑکے کو کار میں بٹھائے یونیورسٹی لے جا رہے تھے۔ طلبا نے کار روک دی، اور بچے کو باہر آنے کے لیے کہا، جس پر حیدر احمد نے ڈانٹ ڈپٹ کی اور یہ کہہ دیا کہ کون روک سکتا ہے، میں اپنے بچے کو اپنے ساتھ یونیورسٹی لے جاؤں گا۔ اس کے بعد طلبا نے دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آکے اور کہنے لگے، رجسٹرار صاحب بضد ہیں کہ وہ اپنے بچے کو یونیورسٹی لے جا کر رہیں گے، انھیں کوئی قوت نہیں روک سکتی، ہم نے کہا کہ آپ ان سے کہیے کہ آپ کا بچہ بھی ہماری طرح ایک طالب علم ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ ہزاروں طلبا کا ساتھ دیتے ہوئے اسٹرائیک میں شریک رہے اور ہمارا ساتھ دے۔ طلبا کے اصرار کے باوجود رجسٹرار راضی نہیں ہوئے، تو مشتعل طلبا نے ہم سے کہا، خان صاحب ہم رجسٹرار کی موٹر کار کے سب ٹائر پنکچر کاٹ دینا چاہتے ہیں، تاکہ رجسٹرار کو اس کی سزا مل سکے۔ یہ سنتے ہی ہمارا دماغ چکرا گیا کہ یونیورسٹی کی پہلی زیر دست

اسٹرائیک آج تک پرامن یا PEACEFUL رہی، لیکن آج تشدد کا داغ لگا چاہتا ہے، آخر کیا کیا جائے؟ ہم نے دل ہی میں کہا طلبا اس وقت مشتعل ہیں، اگر ہم انھیں اس فعل سے منع کر دیں، اور وہ کر گزریں تو ہمارا وقار خاک میں مل جائے گا، ہم اگر یہاں کہدیں تو پھر اسٹرائیک کے پرامن دامن پر تشدد پسندی کا بدنما داغ لگ جائے گا، چنانچہ ہم نے دماغ لڑایا، اور فوراً ہی جواب دیا، سنئے ہمارے دوستو! ہم آپ کی رائے سے پورے پورے متفق ہیں، ضدی رجسٹرار کو اس کی ضد کی سزا ملنی چاہیے، اس کی کار کا صرف ایک ٹائر اور ٹیوب کاٹ دیا جائے، اس کے بعد بچے کو زبردستی کھینچ کر اپنے ساتھ لے آؤ، اس سے ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی لڑکے خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے کار کے پاس گئے۔ ہمارے رجسٹرار انصاری ہکلاتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی ہکلاتی زبان میں طلبا سے یہ کہا، میں ابھی میکنزی صاحب سے جاکر یہ کہتا ہوں کہ لڑکے غنڈہ ایکٹ کر رہے ہیں، ان کو پولیس کے حوالے کیا جائے، وہ بڑبڑاتے ہوئے یونیورسٹی چلے گئے اور میکنزی صاحب سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ میکنزی صاحب سن کر خاموش ہو رہے۔ ہزاروں اور مشتعل طلبا کے خلاف وہ پولیس کارروائی کیسے کر سکتے تھے۔ اسٹرائیک شروع ہو کر پندرہ سولہ روز ہو گئے تھے۔ شہر سے باہر اسکولوں اور کالجوں کے سینکڑوں طلبا روزانہ بطور ہمدردی خدمی اسٹرائیک میں شریک رہتے تھے، اس کے علاوہ شہر سے سینکڑوں ہی فارغ البال لوگ اسٹرائیک کا میلا یا تماشا دیکھنے کی خاطر آیا کرتے تھے، اور اس طرح سے اسٹیشن جانے عثمانیا کے اطراف صبح سے شام تک ہزاروں آدمیوں کا میلا سا لگا رہتا تھا، چنانچہ اسٹیشن کے پچھلے حصے کے میدان اور سڑک پر بھی ہزاروں ہی طلبا اور دوسرے شہری برابر وقت ڈٹے رہتے تھے۔

ہماری کامیاب اسٹرائیک کا غالب تیسرا ہفتا شروع ہو گیا تھا، اور میکنزی صاحب سے وقفے وقفے سے بات چیت جاری تھی، مگر کوئی معقد نتیجا نہیں نکلا تھا۔ ہم حسب معمول اسٹیشن کے سامنے والے میدان میں، ہزاروں طلبا کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تقریر (۱۰ بجے چند طلبا دوڑتے ہوئے آئے اور ہم سے کہا کہ بیرسٹر اکبر علی خاں آئے ہیں، اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی ہم ان طلبا کے ساتھ ہو لیے، اور کیا دیکھتے ہیں کہ اسٹیشن کے پچھلے حصے میں اکبر علی خاں، میر احمد علی خاں، عبدالرحیم محمد علی اور بھی دو ایک حضرات کھڑے ہیں۔ خیر خیریت کے بعد اکبر علی خاں نے تو ہم سے کچھ نہیں کہا، بلکہ احمد علی خاں نے ہم سے کہا خاں صاحب! یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اکبر علی خاں ہم سب سے سینئر ہیں، اور ہمارے بڑے بھائی ہیں، ہم نے کہا ہم آپ سے زیادہ بہتر طریقے پر جانتے ہیں، ہمیں کب اس حقیقت سے انکار ہے، مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں اپنا مطلب تو بیان کیجیے! اس پر احمد علی خاں نے کہا، خاں صاحب! طلبا جذبات میں بہے چلے جا رہے ہیں، اسٹرائیک کو دو ہفتے گزر گئے ہیں، ان کی تعلیم خراب ہو رہی ہے، اس لیے وہ طلبا کو مخاطب کر کے کچھ متعدد اور زرین مشورے دینا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ آپ کو اور ان کو منع کس نے کیا ہے، یہاں پر ہر شہری اور ہر شخص کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ طلبا کی بھلائی، بہتری اور فلاح و بہبود کے سلسلے میں جو چاہے کہہ سکتے ہیں، اور ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ دوسروں کے کارآمد مشوروں سے طلبا اپنی ضد سے باز آجائیں، اور یہ تکلیف دہ، اور نقصان رساں اسٹرائیک جلد سے جلد ختم ہو جائے، اس وقت نہ صرف اکبر علی خاں، بلکہ آپ اور دوسرے ساتھی بھی ایک کے بعد ایک طلبا کو مخاطب کر کے ان کو ایک غلط اور برے کام سے روک سکتے ہیں۔ اس کے بعد احمد علی خاں نے کہا، اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں، اور آپ کی اجازت ہے تو صرف اکبر علی خاں اس وقت طلبا کو مخاطب کریں گے۔ اس کے جواب میں ہم نے کہا کہ اس وقت وہ نہایت خشی سے طلبا کو مخاطب کر سکتے ہیں، اس میں ہماری اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں ہم سب لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے، وہاں پر ایک اونچا سا کلورٹ CULVERT بنا ہوا تھا۔ احمد علی خاں کے مشورے سے اکبر علی خاں کلورٹ پر کھڑے ہو گئے، اور میرے چھوٹے بھائی دوستو! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں، وغیرہ، گویا ایک دو جملے بھی کہنے نہیں پائے تھے کہ طلبا کے مشتعل مجمع سے مخالف نعرے بلند شروع ہو گئے، اور آوازیں آنے لگیں، ہم نہیں سننا چاہتے، اترجاؤ، چلے جاؤ اور میاد و میاد جیسے

CATCALLS بھی ہونے لگے، اور آن کی آن میں تمام طلبا میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ جب اشتعاد، چلے جاؤ، کا مسلسل تقاضا ہونے لگا تو اکبر علی خان فوراً اتر پڑے، ان کے چہرے سے اپنی ناکامی کے آثار نمایاں تھے، اور وہ اپنا سا منہ لیے کھڑے تھے۔ ایسے میں احمد علی خان اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے ہماری خوشامد چاپلوسی شروع کر دی، اور منت سماجت کرتے ہوئے کہنے لگے، خان صاحب! طلبا آپ کے کنٹرول میں ہیں، آپ ان سے کہیے کہ اکبر علی خان ہمارے سینئر ہیں، اس لیے وہ جو کچھ کہتے ہیں، خاموشی سے سن لیں، عمل کرنا نہ کرنا، یہ طلبا کی مرضی پر منحصر ہے، انہیں کوئی قوت مجبور نہیں کر سکتی۔ خان صاحب! غور فرمایئے کہ یہ تو بہت بری بات ہوگی کہ ہمارے بڑے بھائی اکبر علی خان اس بری طرح سے ناکامی کا منہ لے کر واپس جائیں۔ خان صاحب! ہم آپ سے بزور طریقے پر اپیل اور درخواست کرتے ہیں کہ آپ اپنے ایک سینئر عمائین، اور بڑے بھائی کی لاج رکھ لیجیے۔ آپ کی دفعہ وہ کوئی طویل تقریر نہیں کریں گے، بلکہ صرف چند جملے کہہ کر اتر آئیں گے، تاکہ عوام کو یہ معلوم ہو کہ طلبا برادری اپنے بڑے بھائی اکبر علی خان کی مخالف نہیں ہے۔ اب آپ ہمارے مشتعل طلبا پر کنٹرول کی قوت اور بھی معنی میں لیڈر شپ LEADERSHIP کا اندازا کیجیے کہ ان سب کی خوشامد، چاپلوسی اور ہمیں بلکل ہی مجبور کر دینے کے بعد ہم خود ہی اس کھلے پر کھڑے ہو گئے، اور انہیں مشتعل طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بتایا کہ اکبر علی خان کون ہیں اور کیا ہیں، اور یہ بھی کہا کہ وہ ہمارے آپ کے سینئر عمائین اور بڑے بھائی ہیں، اس لحاظ سے بڑے بھائی کے مشورے کو خاموشی کے ساتھ سننا ہمارا اولین فرض ہے، یہ کوئی ضروری ہے کہ ہم ان کے پند و نصائح پر عمل بھی کریں، اور ہم نے طلبا کو اس بات کی دھمکی دی کہ اکبر علی خان کی تقریر سنتے وقت ایک بھی مخالف نعرا لگایا جائے گا، تو ہم اسی وقت آپ کا ساتھ چھوڑ کر اکبر علی خان کے ساتھ شہر چلے جائیں گے، اس کے بعد آپ کا اور ہمارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اور پندرا سولا روز کی ہماری تمام کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔ ہم پھر آپ سے کہتے ہیں کہ اکبر علی خان کو سنیے، اور ضرور سنیے، اگر وہ ایک گھنٹے تک بھی تقریر کرتے ہیں تو بلکل خاموشی کے ساتھ سنتے رہیے، اور یاد رہے کہ ہمارا آپ کو مشورا بھی "کمانڈر" حکم، کے برابر ہے، جس کی تعمیل آپ سب پر برابر لازمی اور ضروری ہے، یہ کہتے ہوئے ہم نے روٹھے ہوئے اکبر علی خان کی طرف اپنا بایاں ہاتھ بڑاتے ہوئے کہا، آیئے ہمارے بڑے بھائی اکبر علی خان، اور فوراً اکبر علی خان کلورٹ پر آن کر ہمارے برابر کھڑے ہو گئے، اور ہم نے اپنا دہنا ہاتھ بشکر کی طرح طلبا کی طرف آگے بڑاتے ہوئے کہا، بلکل خاموشی کے ساتھ سنیے اکبر علی خان کی تقریر!

اس نوبت پر اکبر علی خان کل کہتے، (۵) منٹ تک بلکل ہی بوکلائی سی باتیں کرتے رہے، اس کے بعد پھر خود ہی اتر پڑے، اور ان کے بعد خود ہم بھی نیچے آ گئے، اور اکبر علی خان کو ان کی کار تک لے جا کر رخصت کیا!

یہ وہی اکبر علی خان ہیں، جو اس وقت اتر پردیش کے گورنر بنے بیٹھے ہیں۔ آج سے (۳۶) سال پہلے ہم نے انہی اکبر علی خان کو تقریر کا موقع دے کر ان کی لاج رکھ لی تھی، اور آج سے (۳۲) سال پہلے انہی جشن سال نو کے موقع پر انہی اکبر علی خان کو ہمیں نے جوتے کھانے سے بچایا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس انوکھے جشن کے بانی مبانی اور روح رواں، اور جنرل سکریٹری ہم تھے، اور خود ہم نے اکبر علی خان کو صدر استقبالیہ بنایا تھا۔ پہلی آذر ۱۳۰۹ف مطابق پہلی دسمبر ۱۹۳۰ء کو پہلا جشن سال نو سر اکبر حیدری، حیدر نواز جنگ صدر اعظم یا پرائیم منسٹر آف حیدر آباد کی صدارت میں، ٹاؤن ہال (موجودا اسمبلی ہال، باغ عام) میں منایا گیا تھا۔ عبدالرحمان وحیدی، ایڈیٹر "وقت"،

روزانا اخبار ستر وع ہی اکبر علی خان کا مخالف تھا، اور مجلس اتحاد المسلمین کے سلسلے میں اکبر علی خان کی دوغلی پالیسی سے وہ سخت نالاں تھا، اور ان سے بدلا لینا چاہتا تھا۔ جلسے کے دوران میں ہمارے ایک مخلص اور ہم سبق مصلح الدین ایڈیٹر نے ہمیں بازو بلا کر کہا، ارے خان، رئیس اسی وقت اپنی غنڈا پارٹی کے ساتھ بنگلے پر تیار بیٹھا ہے، جلسے کے ختم ہوتے ہی اکبر علی خان کو اسی مقام پر جوتے مارنے کے لیے تیار ہے، اور وہاں بیٹھا بار بار اکبر علی خان کے خلاف مغلظات بک رہا ہے، بہتر یہ ہے کہ تو اکبر علی خان کو محبوس کر کے ان کی کار میں بیٹھا کر اسی وقت گھر کو روانا کر دے، ورنا اکبر علی خان کی آج خیر نہیں! ہم نے اس سے کہا تو دروازے کے باہر کھڑا رہ، ہم اسی وقت اکبر علی خان کو ساتھ لیے آتے ہیں۔ ہم نے اکبر علی خان کو اشارے سے بلوایا، اور ان کے دو اور احباب کو بھی اشارا کیا، یہ تینوں اپنی کرسیوں سے اٹھ کر چلے آئے، اور ہم چاروں مل کر دروازے سے باہر گئے، جہاں مصلح الدین کھڑا ہوا تھا۔ ہم نے مصلح الدین کی ساری داستان ان تینوں سے کہہ سنائی، اور ان دونوں دوستوں سے کہا، آپ اکبر علی خان کے ساتھ جایئے، اور ان کے گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہیے۔ جلسے کے ختم پر ہم دوسرے احباب کے ساتھ آپ کے گھر آئیں گے۔ اکبر علی خان بضد ہو گئے، اور کہنے لگے "کیا ہوتا ہے میاں، اگر رئیس مارتا ہے تو مارنے دو، اس کی بدنامی ہو گی، میرا کیا جائے گا، میں تو نہیں جاؤں گا، برابر اجلاس پر بیٹھا رہوں گا۔" ہم نے ان کے پیٹ میں منڈی ڈال دی، اور کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ رئیس مانا ہوا غنڈا ہے، جو کہتا ہے، وہ کر گزرتا ہے، اسی وقت ہزاروں کے مجمع میں آپ کی سبکی ہو گی۔ اس وقت پر آپ ضد مت کیجیے، اور ہماری بات مانیے، ان دونوں حضرات کے ساتھ اپنے گھر چلے جایئے، جلسے کے ختم پر ہم سب لوگ آپ کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ میں صدر جلسہ صدر اعظم بہادر کے بازو بیٹھا کہہ دوں گا کہ اکبر علی خان کی بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے، گھر سے آدمی آیا تھا اس لیے وہ چلے گئے ہیں، اور آپ سے معافی چاہتے ہیں۔ اکبر علی خان کا مکان ٹاؤن ہال بلکل قریب ہے۔ ان کا بات پکڑ کر زبردستی لے گئے، ہم نے اپنی کار میں بیٹھا یا اور دوسرے دو احباب بھی ان کے ساتھ گئے۔ وہاں آنے کے بعد ہم نے کہہ دیا کہ اکبر علی خان اس وجہ سے گھر چلے گئے ہیں، جلسہ ختم ہوا اور ہم سب لوگوں نے مل کر صدر جلسہ کو رخصت کی، جلسہ ختم ہوتے ہی رئیس اپنی غنڈا پارٹی کے ساتھ اسٹیج پر یہ آکر ہنگامہ مچا دیا، اور کہاں ہے اکبر علی خان دیکھو وہ ملعون یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو گا، اس کمرے میں دیکھو، اس کمرے میں دیکھو۔ کسی نے کہا، نہیں چلا گیا معلوم ہوتا ہے، اس کے جواب میں رئیس نے کہا، جی نہیں ابھی خدا میں نے اس کو دیکھا ہے، تر اکبر کے بازو بیٹھا تھا۔ تلاش کرنے کے بعد مایوس ہو کر رئیس ہماری طرف پلٹا، اور کہنے لگا، خان یہ تمہاری شرارت معلوم ہوتی ہے، ارے آج تو میں ہزاروں کے مجمع میں اس کو جوتے مار کر سزا دینا چاہتا تھا۔ ہم نے کہا وہ یہاں نہیں ہیں، جلسے کے دوران ان کے گھر سے آدمی آیا تھا کہ اچانک بیوی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے، اس لیے وہ اسی وقت گھر چلے گئے۔ اس میں ہماری شرارت کو کیا دخل ہے۔ اس کے بعد رئیس نے کہا، نہیں خان، میں نہیں مانتا تمہاری بات ماننے کے لیے، میرا دل گواہی نہیں دے رہا ہے، ارے آج تو میں اس کو بے عزت کرنا چاہتا تھا، کہتے ہوئے رئیس اور اس کی غنڈا پارٹی واپس چلی گئی۔ اس کے بعد ہم اور ہمارے چند ساتھی اکبر علی خان کے گھر گئے، اور رئیس کے ناپاک ارادے کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ سن کر سبھوں نے ہماری بے حد تعریف کی، اور یہ کہا کہ واقعی آپ نے اکبر علی خان کو ہزاروں کے مجمع میں پٹائی سے بچا لیا، مگر اکبر علی خان "مرغ کی ایک ٹانگ" کے مصداق میاں، کیں کرنا، مارتا تو مار کھاتا، اس کا غنڈا پن ثابت ہوتا، کہتے رہ گئے!

جناب اکبر علی خان کی آج سے کئی سال پہلے

دو مرتبہ لاج رکھ لی تھی، انھیں اکبر علی خاں کو آج ۱۹۷۳ء میں ہم نے اپنے اس قلم کے زور اور قوت بیان سے اتریر دلیشوں کا گورنر بنایا ہے!

اکبر علی خاں کے مخاطب کرنے کے بعد سے دنیا دیکھنے لگے، اور ادھر میکنزی صاحب سے بات چیت جاری رہی، مگر کوئی خاص نتیجہ نہ نکل سکا، اور ادھر طلبا کا اتحاد مستحکم سے مستحکم تر ہوتا گیا۔ طلبا کو رام کرنے کا میکنزی صاحب نے ایک اور ذریعہ سوچا جس کا کام سٹیج پر وفیسروں کو پریذیڈیم چانسلر لاج میں اٹ ہوم دیا گیا ہم سے دریافت کرایا گیا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دعوت ہے، آپ اپنے ساتھ کتنے طلبا کو لے آئیں گے۔ ہم نے اپنے کو تعداد کرتے ہوئے ایک درجن طلبا کے لیے کہلوایا تھا۔ اٹ ہوم کی دعوت اسٹرائیک کا پورا ایک مہینا گزرنے کے بعد رکھی گئی تھی۔ اٹ ہوم (یا) بجے تھا۔ ہم اپنے ساتھ گیارہ طلبا کو لیے پونے چار بجے اپنے ہیڈ کوارٹر سے P.V.C لاج پہنچے۔ سب مہمان آچکے تھے، اور میکنزی صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے جاتے ہی انھوں نے ہمارا استقبال کیا، اور اپنے میز پر بلیٹھایا۔ اس میز کے اطراف میکنزی صاحب کے علاوہ دو چار ہیڈ سن آف دی ڈیپارٹمنٹ بھی تھے۔ اس اٹ ہوم میں ظہر منسٹری کے تمام اسٹاف بھی شریک تھے۔ اٹ ہوم شروع ہوا بٹلر سرو کر رہے تھے، کیک، بسکٹس، تازہ اور خشک میووں کے ساتھ ساتھ بعض نمکین چیزیں بھی شامل تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چائے، کافی، آئسکریم، لیمن وغیرہ کی مسلسل سپلائی ہو رہی تھی۔ اٹ ہوم میں اسٹرائیک کے متعلق کسی نے بھی ایک لفظ تک نہیں کہا، بلکہ دوسری دلچسپی کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس دعوت میں ہم نے کسی بھی چیز کو چھوا تک نہیں، انتہا یہ کہ چائے، کافی تک نہیں پی۔ ظاہر ہے کہ میکنزی صاحب اور دوسرے پروفیسروں نے بار بار اصرار اور تقاضا بھی کیا، مگر ہم نے مزاج کی خرابی کا بہانا کیا، اس کے باوجود ان لوگوں کا شدید ترین اصرار رہا کہ ہم کم سے کم ایک کپ چائے یا کافی پی لیں، لیکن ہم نے اس سے بھی معذوری ظاہر کی تو اس کے بعد میکنزی صاحب نے ایک اور حربہ اختیار کیا، یعنی یہ کہ اپنی بیوی کو للکارا "ڈارلنگ یہاں آؤ تمہارا بچا پرچ بھی نہیں کھا رہا ہے" اس پر مسز میکنزی نے وہیں سے جواب دیا "میں ابھی آتی ہوں" اور وہ فوراً ہی چلی آئیں، ہم تعظیم اٹھ کھڑے ہوئے" میکنزی صاحب نے بیوی سے پھر یہ شکایت کی کہ خدیجہ نے مختلف چیزیں اپنے بچے کے لیے خاص طور پر تیار کیں، مگر تمہارا بچا ہی ان چیزوں سے محروم ہے، اس پر لیڈی میکنزی نے ہمیں بتایا کہ صرف ہماری خاطر بعض خاص خاص چیزیں بنانے میں وہ کوکس کے ساتھ کام کرتی رہیں، اس لیے انھوں نے کہا کہ انھیں بڑا ہی دکھ ہوگا، اگر ہم وہ چیزیں نہ کھائیں گے۔ ہم نے ان سے کہا "ماں" ہم سچ کہتے ہیں کہ اس وقت ہماری صحت بہت خراب ہے، اور ہم کوئی چیز بھی کھانے کے قابل نہیں ہیں، صرف آپ کی دعوت ہی میں نہیں، بلکہ ہم اپنے گھر میں بھی سخت پرہیز کر رہے ہیں، ہم نے انھیں یقین دلایا کہ طبیعت سنبھلنے کے دو چار دن بعد ہم خود ہی آپ سے مانگ کر وہی چیزیں کھائیں گے۔ اس وقت ماں کو کھانے سے زیادہ اپنے بچے کی خطرناک خرابی صحت کا خیال ہونا چاہیے۔ یہ کہتے ہی ALL RIGHT MY BOY کہتے اور ہمارے سر اور پیٹ پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ چلی گئیں، اور ہم پھر سے بیٹھ گئے۔ ہمارے اس معقول جواب سے میکنزی صاحب اور سب پروفیسرس لاجواب ہو گئے۔ پھر کسی نے ہمیں فیورس نہیں کیا۔ صرف ہم نے نہیں کھایا، لیکن ہم نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اٹ ہوم میں ضرور کھائیں۔ ہماری اس خدداری کا اثر نہ صرف میکنزی صاحب پر ہوا، بلکہ تمام دعوتی ہمارے اس خدداراانہ عمل سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس لیے کہ اتنا شاندار اٹ ہوم میکنزی صاحب نے صرف ہمارے اعزاز میں دیا تھا، اور ہم خود ہی اس سے محروم رہے۔ اٹ ہوم کے بعد جب ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچے تو

ہمارے ساتھیوں نے اڑہوم کا سارا حال احوال وہاں کے موجود طلبا کو کہہ سنایا تو سبھوں نے ایک آواز یہ کہا کہ اتنا خدا دار آدمی جی۔ ایم۔ خان کبھی معنی میں، اور واقعی ہمارا رہنما اور لیڈر رہے، اسی وجہ سے تو ایک مہینے کی طویل اسٹرائیک کامیاب رہی ہے!

اسٹرائیک کے ایک مہینا چار روز بعد منسٹری صاحب نے آخری بار، ہمیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے اجلاس پر طلب فرمایا۔ اس آخری میٹنگ میں بھی غدار ظفر منسٹری کے تمام ارکان موجود تھے۔ باتیں کرتے کرتے منسٹری صاحب اٹھے تو ہم سب ہی اٹھ گئے، ایسے میں انھوں نے ہمارے گلے کے اطراف بات ڈالا، اور اپنے ساتھ اجلاس کے بازو والے اپنے چیمبر میں لے گئے۔ وہاں انھوں نے ہمیں اپنی آرام کرسی پر بٹھا دیا، اور خود کھڑے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ ہم نے تعظیماً اور احتراماً اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی تو مجبور کرکے ہمیں بٹھا دیا۔ اس کے بعد تقریباً آدھ گھنٹے تک انھوں نے تقطیعی طور پر اسٹرائیک کے ایک مہینا چار روز کا جائزا لیا، اگر ہم وہ تمام تفصیل بیان کریں تو کم سے کم اور دو درجن صفحے چاہئیں اور وہ تمام وہی واقعات ہیں، جو خود ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اس روز پہلی بار انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ پروفیسروں اور ظفر منسٹری کے بہکانے میں آگئے، ورنہ یونیورسٹی کے ہزاروں طلبا کے خلاف اتنا سخت رویہ ہرگز اختیار نہ کرتے۔ آخر میں وہ روپڑے اور تلا میلا تا کی آنکھوں سے مسلسل آنسو ڈھلکنے لگے، اور اسی وقت ہمارا بات پکڑ کر اٹھایا، اور روتے ہوئے کہا "مسٹر خان، اس وقت اس ضعیف اور بڈھے آدمی کا PRESTIGE ہمارے ہاتھ میں ہے، تم چاہے تو اس کو بچا سکتے ہو، اور تم تمام طلبا کو غیر مشروط طریقے پر کلاسوں میں آنے کے لیے کہو تو تین گھنٹے میں تمہارا احسان مانوں گا۔ اس کے جواب میں ہم نے کہا کہ محترم، یہاں تو صرف ایک ہی شخص یعنی آپ کے PRESTIGE کا سوال ہے، لیکن ہم نے آج سے ایک مہینا چار روز پہلے یونیورسٹی کے ہزاروں ہی طلبا کے PRESTIGE یا عزت و آبرو کو تمام اور برقرار رکھنے کا ذمہ داری اپنے سر لی ہے، آپ جانتے ہیں کہ ہم صاحب کردار ہیں، اور بد عہد اور بد معاملا نہیں ہیں، اس لیے ان ہزاروں طلبا کے PRESTIGE کے مقابل صرف ایک شخص کے PRESTIGE کا سودا نہیں کر سکتے۔ اس لیے آپ ہمیں معاف فرمائیں کہ اس وقت ہم آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ یہ کہتے ہوئے ہم دونوں اجلاس پر چلے آئے۔ سب طلبا ہم دونوں کے منتظر تھے۔ اس کے بعد منسٹری صاحب نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا اب آپ اپنی شرطیں بتائیے، ان پر غور کرنے کے لیے ہیں تیار ہوں۔ اس پر ہم نے کہا ہماری شرطیں کوئی ٹیڑھی یا پیچیدہ نہیں ہیں، بلکہ سیدھی سادی اور قابل عمل ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہماری پہلی شرط یہ ہے کہ عارضی عمارتوں کے بڑے سینٹ ہال میں تمام پروفیسروں اسٹاف اور ہزاروں طلبا کے سامنے آپ اپنی غلطی کی معافی چاہیں، اور اس کے بعد جیسا کہ ہمارا مطالبا ہے، امتحانات کی تاریخیں پڑا دیے جانے کا اعلان کریں، اور یہ تاریخیں نظام کی "معمول حرکی" کے ختم پر شروع ہو سکیں گی۔ انھوں نے کہا بہت اچھا کل ایک بجے سے پہلے، اس کا جواب تمہارے ہیڈ کوارٹر پر بھجوا دیتا ہوں۔ اس کے بعد ہم اور ہمارے تمام ساتھی اپنے ہیڈ کوارٹر پر چلے آئے، اور ان ہزاروں ہی بے چین طلبا کو اجلاس پر جو بھی گفتگو ہوئی تھی، اس کا سارا حال کہہ سنایا، مگر جیسے ہر والی بات جیت کا حال ہم نے اپنے خاص خاص ساتھیوں سے بھی نہیں کہا تھا، اس لیے کہ وہ بالکل راز کی باتیں تھیں، اور ہم پر پورا اعتماد اور بھروسا کرتے ہوئے انھوں نے ہم سے وہ باتیں کہی تھیں، اس لیے یہ راز منسٹری صاحب کے معافی چاہنے کے اعلان کے بعد بیان کیا گیا تھا۔

دوسرے روز صبح دس بجے منسٹری صاحب تقریباً دو بجے اپنے ایک خصوصی قاصد کے ذریعے ہم سے کہلوایا کہ ہم سے کہیں کہ ہم نے کل جو شرطیں بیان کی تھیں، انھیں منظور ہیں، اس لیے وہ طلبا کے ساتھ سمجھوتہ

چلے آئیے۔ اس کے بعد میکنزی صاحب پروفیسروں کے ساتھ آ جائیں گے۔ ہم نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، آپ ان سے کہیے کہ ہم اپنی طلبا برادری کو بھولا تے ہیں، اور اس کے ساتھ آپ اپنے اسٹاف اور پروفیسروں کو بھولیے۔ اس کے بعد جب آپ وہاں سے چل پڑیں گے تو ہم یہاں سے آئیں گے۔ وہی قاصد کار سی گیا، اور پھر واپس آیا، اور کہنے لگا کہ آپ کی یہ شرط بھی منظور ہے، آپ اس وقت طلبا کو بھولیے۔ چنانچہ ہم نے فتح میدان میں جمع ہزاروں سے درخواست کی کہ وہ پرامن طریقے پر سینٹ ہال جائیں، اور ہم تھوڑی دیر بعد آتے ہیں۔ جیسے ہی طلبا گئے، ادھر سے پروفیسر اور سارا اسٹاف بھی آ گیا۔ اس کے بعد ہمیں اطلاع دی گئی کہ میکنزی صاحب اپنے اخلاص سے چل پڑے ہیں تو ہم خود بھی اپنے ہیڈ کوارٹر "فتح میدان" سے چل پڑے۔ سینٹ ہال سے کچھ ہی فاصلے پر ہم دونوں کا سنگم ہوا، قریب آ کے انھوں نے فرط محبت سے اٹھائی، اور سینٹ ہال سے باہر بھی سیکڑوں ہی افراد کے ساتھ یہ کہہ اٹھے کہ ہمارا لیڈر یونیورسٹی کا ہیرو HERO اور حیدرآبادی گاندھی ہے، اس لیے کہ ایک مہینا پانچ روز کی طویل ترین انڈر گراؤنڈ سی یونیورسٹی کیمپوٹنڈنس اور یونیورسٹی کے باہر ایک بھی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کے بعد تو طلبا نے جی۔ ام۔ خان زندآباد، ہمارا لیڈر زندآباد، یونیورسٹی کا ہیرو زندآباد، حیدرآبادی گاندھی زندآباد کے نعرے اور میکنزی صاحب ہمارے گلے میں اپنا دہنا ہاتھ ڈالے ہوئے سینٹ ہال میں لے گئے۔ یہ لکھتے ہی ہزاروں طلبا نے پھر سے جی۔ ام۔ خان زندآباد، ہمارا لیڈر زندآباد کے نعرے لگائے، اور اسٹاف اور پروفیسر تو بھر چکر سے ہو گئے تھے۔

میکنزی صاحب کسی حد تک ہماری قدر و منزلت کرتے تھے اس کا بھی اندازا اس واقعے سے کیجیے۔ سینٹ ہال میں سامنے میز تھت پڑے پڑے ہوئے تھے، ان پر اخباروں نے صرف دو کرسیاں رکھوائی تھیں۔ وہ اسی طرح ہمارے گلے میں ہات ڈالے ہوئے تخت پر لے گئے۔ اس کے بعد پھر سے جی۔ ام۔ خان زندآباد کے نعرے شروع ہوئے۔ وہ خود ایک کرسی پر بیٹھ گئے، اور ہمیں دوسری کرسی پر بٹھایا۔ یونیورسٹی کے سینئر اور جونئر تمام پروفیسر اور سارا اسٹاف سامنے کی کرسیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد باقی کرسیوں پر طلبا بیٹھے ہوئے تھے، اور ہزاروں طلبا ہال کے اندر اور باہر کھڑے ہوئے تھے۔

سب سے پہلے میکنزی صاحب اٹھے، اور اپنی بلکل مختصر سی تقریر میں یہ کہی کہ ایک مہینا پانچ روز میں جو کچھ بھی ہوا، اس کو دہرانا بیکار ہے، ہمیں یہ ضرور کہنا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ حقیقت میں نہیں ہونا چاہیے تھا، اب سب کا یہ فرض ہے کہ ان پچھلے واقعات کو بھلا دینا چاہیے، مگر اس کے باوجود طلبا کو ایک مہینے سے زیادہ عرصے تک تکلیفیں برداشت کرنی پڑی ہیں، اس کی ذمے داری میرے سر پر ہے، اور اس کی میں کھلے طور پر معافی چاہتا ہوں، اور اس کے ساتھ ساتھ امتحانات کی تاریخیں بڑا دیے جانے کا اعلان کرتا ہوں، اور یہ تاریخیں نظام کی "سلور جوبلی" کی تاریخوں کے ختم پر شروع ہوں گی! ان کے اس اعلان کے ساتھ ہی ہم اٹھ کھڑے ہوئے، اور ڈاکٹر اے۔ ایچ میکنزی زندآباد اور ہمارا ہر دل عزیز پرو وائس چانسلر زندآباد کے نعرے لگائے، جس کو ہزاروں ہی طلبا نے دہرایا۔

اس اعلان کے بعد میکنزی صاحب کرسی پر بیٹھنے سے پہلے ڈاکٹر عبدالحکیم خلیفا، صدر شعبۂ فلسفا سے خواہش کی کہ وہ پروفیسروں کی نمائندگی کرتے ہوئے اس موقع پر کچھ کہیں، خلیفا آئے اور صرف پانچ منٹ تک تقریر کر کے چلا گئے۔ اس کے بعد میکنزی صاحب نے ہم سے کہا کہ طلبا کی طرف سے آپ کس کو طلب کرتے ہیں۔ ہم نے عباس علی خان کو بلوایا۔ یہ انگریزی کا بہترین مقرر تھا۔ اس نے پروفیسروں کی خوب خبر لی۔ اس کے بعد میکنزی صاحب نے اٹھ کر کہا کہ اب آپ ہر دلعزیز لیڈر اور یونیورسٹی کے ہیرو اور حیدرآبادی گاندھی مخاطب کریں گے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اٹھ کر کہا، چونکہ انڈر گریجویٹ کے بچے انگریزی تقریر برابر نہیں سمجھتے ہیں، اس لیے آپ کے لیڈر

جی - ایم - خاں ہندستانی زبان میں ہم سب کو مخاطب کریں گے۔

میکنزی صاحب کے کرسی پر بیٹھتے ہی ہم اٹھے اور ہزاروں کے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ابھی ابھی میکنزی صاحب نے یہ فرمایا کہ عثمانیا یونیورسٹی کی انٹرمیڈیٹ کلاس کے بچے انگریزی میں برابر یا طور پر نہیں سمجھتے ہیں، اس لیے ہم اس وقت ہندستانی زبان میں تقریر کریں گے۔ ہم نے کہا کہ میکنزی صاحب کا یہ خیال سراسر غلط ہے، اس لیے کہ ابھی ابھی جس طالب علم میر عباس علی خان نے فصیح زبان میں انگریزی میں تقریر کی ہے، وہ بھی انٹرمیڈیٹ کا طالب علم ہے، اس لیے میکنزی صاحب کی یہ محبت ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ جو لڑکے انگریزی میں تقریر کر سکتے ہیں وہ انگریزی تقریروں کو سمجھ نہیں سکتے۔ ہمارے اس بامعنی استدلال کے بعد طلبا نے ہیئر ہیئر، واہ، واہ کے نعرے لگائے۔ اس کے بعد ہم نے کہا کہ ہم اس وقت ہندستانی زبان میں تقریر اس لیے کر رہے ہیں کہ پہلے میکنزی صاحب نے انگریزی میں تقریر کی، اس کے بعد ڈاکٹر خلیفہ نے انگریزی میں مخاطب کیا، اور آخر میں عباس علی خاں نے بھی انگریزی ہی میں تقریر کی۔ ہم نے کہا کہ یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ عثمانیا یونیورسٹی کا میڈیم آف انسٹرکشن ہندستانی زبان ہے، اور حیدرآباد کی سرکاری زبان ہندستانی ہے، اور عوام کی زبان بھی ہندستانی ہی ہے، لیکن اس وقت اس پلاٹ فارم پر ایک بھی تقریر ہندستانی زبان میں نہیں ہوئی ہے، اس لیے عوام، اور حیدرآباد اور خصوصاً عثمانیا یونیورسٹی کی لاج رکھنے کے لیے ہندستانی زبان میں تقریر کر کے میکنزی صاحب پر یہ ثابت کر دیتے کہ عثمانیا یونیورسٹی کا ہر طالب علم انگریزی میں بلا تکلف تقریر کر سکتا ہے۔ ہمارے اس فی البدیہہ اور مرحبا جواب پر سارا ہال فلک شگاف تالیوں کی گونج سے بھر گیا تھا، کئی منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا، اور پھر جی۔ ایم۔ خان زندہ باد! کی صدا سے اللہ بلند ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ میکنزی صاحب کا موٹھ بھی ہمارے اس دندان شکن یا دانت توڑ جواب سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

اس کے بعد آخر میں، ہم نے ہندستانی زبان میں تقریر کی، ہماری یہ تقریر آدھ گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک جاری رہی، ہم نے پروفیسروں اور ظفر مزدوری کی بری طرح سے خبر لی، ظفر اور اس کی مزدوری کے ہم ممبر غداد انا پالیسی پر تقریر کرتے ہوئے ان سب کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے، اور بار بار میکنزی صاحب کی تعریف کی۔ ہم نے کھلے طور پر کہا کہ میکنزی صاحب حیدرآباد کے لیے نئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ حیدرآباد کی رعایا کس حد تک بادشاہ پرست ہے، اور حضور نظام کی تخت نشینی کی "سلور جوبلی" کو کس طرح منانا چاہتی ہے، بلکل اسی طرح طلبا سے حیدرآباد کو بھی حضور نظام سے عقیدت ہے، اور ہم طلبا "سلور جوبلی" کی تقاریب میں پورا پورا حصہ لینا چاہتے، اگر میکنزی صاحب ہماری اس عقیدت سے واقف ہوتے تو وہ ہرگز ہرگز اتنا غلط اقدام نہ کرتے۔ اس کے بعد جلسہ ختم ہو گیا، اور ہم میکنزی صاحب سے بات ملانے کے بعد طلبا کے مجمع میں چلے گئے، جہاں سے طلبا نے ہمیں اپنے کندھوں پر بٹھا کر جلوس نکالا اور یونیورسٹی کے کمپونڈ میں گھمتے گھماتے اپنے ہیڈ کوارٹر یا "فتح میدان" گئے، اور کچھ دیر بعد سب طلبا اپنے اپنے مکان کو واپس چلے گئے۔

اوپر ہم نے جو کچھ بیان کیا، وہ عثمانیا یونیورسٹی کے چار سالہ تعلیمی دور کے اہم ترین، قابل تعریف اور یادگار کارنامے تھے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین سال تک ہم بے کار رہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء عثمانیا بلدی جماعت کے ٹکٹ پر اپنے اقامتی حلقے ادلی بیرون سے حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے لیے انتخاب لڑا۔ یہ انتخاب بھی بڑا ہی معرکہ آرا رہا، اس لیے کہ ہم نے اپنے مدمقابل، ایک سیٹھ وائیز راؤ صاحب کو ۱۸۰۰ ہزار ووٹ کی اکثریت سے شکست دی۔ اس بے چارے کو پانسو سے زیادہ ووٹ نہ مل سکے۔ کامیاب

ہو کر ہم بلدیا میں گئے، اور وہاں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ مثال کے طور پر شہر کی پرانی فصیل ہماری تحریک پر توڑی گئی، اور ریل کا دروازا ہماری ہی تحریک پر بڑھایا گیا، جس کی وجہ سے شہر میں آنے جانے والی ٹرافک میں سہولت ہو گئی۔ سارے شہر حیدرآباد میں، حدود بلدیا تک برقی روشنی ہماری ہی تحریک پر جاری کی گئی، اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ لائیٹ بلا تخصیص چاندنی راتیں، شام کے (۶) بجے سے صبح کے (۶) بجے تک کھلی رہے۔ نئے پل کے دونوں فٹ پاتھ کو سڑک میں شامل کرتے ہوئے، دونوں جانب (۲۰-۲۰) فٹ چوڑے فٹ پاتھ بنانے کی تحریک ہم نے کی تھی، جو حکومت کے پاس بھیجا دی گئی تھی، اور ریلوے الیکشن کے بعد چل کر اس پر عمل ہوا۔ اس کے ساتھ موسا ندی کے شرقی رخ پر علیحدہ پٹے کے قریب بند باندھ کر پانی روکنے، اور شہنی رانی کی تحریک بھی ہم نے کی تھی، اور اس کے ساتھ ہی یہ تھا کہ ملکی بن کو ایک دلفریب چمن زار میں بدل دیا جائے۔ اس پر آج تک کوئی عمل نہیں ہوا ہے، حالانکہ یہ شہر کو خوبصورت اور دیدہ زیب بنانے والی تحریک ہے۔ جس کی طرف موجودہ حکومت کو توجہ دینا چاہیے۔ ہماری اس تحریک سے شہر کی رونق بڑھ جائے گی، اور ٹورسٹ سے حیدرآباد کی حد تعریف کریں گے! چنانچہ جامع مارکٹ اور پرنسز میں ایک ٹیلیفون لنب کرنے کی ہم ہی نے تحریک کی تھی، جس کے بعد ہماری ہی تحریک کی بنا پر منصم جاہی مارکٹ کا پہلا ٹیلیفون بلدیا کی طرف سے لنب کروایا گیا تھا، جس سے عوام آج تک بھی استفادہ کر رہے ہیں۔ ہم نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ حسینی ساگر کے پیٹھے میں ایک وسیع رقبے پر چمن بنا کر اس کو ملک پارک میں بدل دیا جائے۔ اور میسور کے برندآون پارک کی طرح فوارے نصب کیے جائیں، اور رات میں روشنی بھی کی جائے۔ ہم نے شہریوں کی سہولیت کے لیے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بلدیا کے (۱۳) حلقوں میں (۱۳) شادی خانے بنائے جائیں، جن میں ہندو اور مسلمانوں دونوں کی مزدور قوں کا لحاظ رکھتے ہوئے سامان بھی رکھا جائے، اور وہ سب چیزیں کرایے پر دی جائیں، اس لیے کہ شادی وغیرہ لوگوں کو دوسروں سے سامان حاصل کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ ہم نے یہ بھی تحریک پیش کی تھی کہ آئندہ سے بلدیا ڈائیریکٹر کی سڑکیں نہ بنائے، بلکہ تمام سڑکیں سمنٹ ہی کی بنائی جائیں، اس لیے کہ گرمیوں میں ڈائیریکٹ سے، جس سے زہریلی گیس پیدا ہو کر شہریوں کی صحت کو متاثر کرتی ہے، اور ڈائیریکٹ کے پگھلنے سے سڑک میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ ہم کارپوریشن میں بہ حیثیت اول میرون کے منتخب رکن بلدیا یا میونسپل کونسلر ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۳ء تک پورے چھ سال رہے، اس طویل مدت میں ہم نے بلدیا میں مفاد عامہ اور شہریوں کی سہولت کی خاطر سینکڑوں ہی مفید تحریکیں کی تھیں، جو اس وقت یاد نہیں آ رہی ہیں، مگر بلدیا کے رزکارڈ میں موجود ہیں۔ اوپر ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ حافظے پر زور دے کر لکھا ہے۔ جس سنہ میں ہم رکن منتخب ہو کر بلدیا میں گئے ہیں، اس وقت نواب زین یار جنگ ناظم بلدیا یا میونسپل کمشنر تھے۔ چھ مہینے بعد نواب مہدی نواز جنگ نے زین یار جنگ سے نظامت کا چارج لیا، اور اس وقت سے مرتے دم تک نواب مہدی نواز جنگ سے ہمارے تعلقات برابر خوشگوار رہے، آگے چل کر وہ معتمد صنعت و حرفت بنے، پھر ایجنٹ بزار، اور اس کے بعد منسٹر حکومت آندھرا پردیش اور آخر میں گورنر آف گجرات بھی بن گئے تو ہمارے ان کے تعلقات برقرار رہے۔ گجرات سے واپس آنے کے بعد بھی وہ ہمارے گھر برابر آتے رہے اور آخری مرتبہ، اپنے سگے بھانجے نواب سعادت علی خاں ولیعہدیاب ناظم خنگلات کے ساتھ ہمارے لیے تحفے تحائف لے کر آئے تھے۔ یہ مرنے سے صرف ایک مہینہ پہلے کا واقعہ تھا، اس وقت بھی ہم سے وعدہ لیتے گئے کہ ہم تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے ان کے ہاں، واقع بنجارا ہلز پر چند ہفتے گزار آئیں گے۔ مگر ہم اپنی مصروفیتوں کے سبب ہم اس

وقت بھی نہ جا سکے، اور آخر کار ایک مہینا بعد جا کر ان کی جیت میں شرکت کی۔

بلدیا ہی کے دور میں ہم نے (جشن سال نو) کی تحریک کی تھی، جس کو نواب صاحب مرحوم نے بے حد پسند کیا تھا، اور بحیثیت نائم بلدیا اور اپنی شخصی حیثیت میں بھی اس جشن کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ہم نے اپنی اس بہتر اور مفید تحریک سے ہندو اور مسلمان کو ایک مشترک یا کامن پلاٹ فارم پر لا کھڑا کیا تھا۔ پہلا جشن ٹاؤن ہال (موجودہ اسمبلی ہال) میں، سر اکبر حیدری، حیدر نواز جنگ صدر اعظم یا پرائیم منسٹر آف حیدرآباد کی صدارت میں منایا گیا تھا، جہاں پر ہی۔ رام کرشن راؤ اور قاسم رضوی نے ایک سانقہ تقریریں کی تھیں۔ ہم اس جشن کے اصل محرک بھی تھے، اور جنرل سکریٹری بھی تھے۔ ہم نے ہی اکبر علی خاں، موجودہ گورنر آندھرا پردیش کو صدر مجلس استقبالیہ بنایا تھا، اور اس وقت انہیں عبدالرحمان رئیس ایڈیٹر "وقت" کے ہاتھوں جرنلسٹ کا خطاب دلایا تھا۔

راز دار خاں صاحب لوز ئی کے اس سوفی صد غریب اور ہزار فی صد مفلس اور سراسر قلاش چیلے فرزند کی دماغی صلاحیتوں کی داد دیجیے کہ اس نے بحیثیت ایک شہری اور سوشیل ورکر جن کی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس کا ایک اور بہترین، مفید اور یادگار دماغی کارنامہ ملاحظہ ہو کہ ہر سنہ فصلی پہلی آذر سے شروع ہوتا تھا، جس کو سرکاری اہمیت تھی، مگر پہلی آذر کو تعطیل یا چھٹی نہیں ہوتی تھی، چنانچہ ہم نے پہلے ہی جشن میں یہ تحریک پیش کی کہ جو نئے پہلی آذر سے سرکار آصفیا کا مالیا شروع ہوتا ہے، اس لیے ہر سال پہلی آذر کو چھٹی ہونی چاہیے، چنانچہ ہماری یہ تحریک ٹاؤن کے ہزاروں شہریوں کے مجمع میں بالاتفاق آرا پاس کرنے کے بعد متوسط صدر اعظم بہادر حضور نظام کے پاس منظوری کے لیے گئی، اور حضور نظام نے اس جدت کو بے حد پسند فرمایا، اور اسی وقت حیدرآباد میں غیر معمولی فرمان شایع کر دیا کہ ہر سال پہلی آذر کو تعطیل عام ہو، اور یہ تعطیل چھٹی میں درج کر دی جائے!

جشن سال نو کی خوشی میں، ہم نے رات میں ڈنر بھی رکھا تھا۔ ڈنر کے ٹکٹ پندرا روپیہ پہلے سے فروخت ہو رہے تھے۔ ڈنر ٹکٹ کی قیمت صرف ایک روپیا تھی۔ ڈنر دو قسم کا تھا، ویجیٹیرین VEGETARIAN اور میٹرین MEATARIAN یعنی گوشت خوروں کا ڈنر۔ میٹرین MEATARIAN ڈنر کے ایک ہزار سے کچھ زیادہ ٹکٹ فروخت ہوئے تھے، اور ویجیٹیرین کے صرف دو سو ٹکٹ سیل ہوئے تھے، مجلا تفریح پندرا سو آدمی کا ڈنر تھا! اس لیے اتنی بڑی سو کے لگ بھگ معزز مہمان بھی تشریف لائے تھے، رات کا ڈنر بھی سر اکبر حیدری، صدر اعظم یا پرائیم منسٹر آف حیدرآباد کی صدارت میں تھا، جشن میں حکومت حیدرآباد کے تمام صدر المہام یا منسٹرس اور ہندستانی اور انگریز بڑے بڑے عالی عہدے دار بھی مدعو تھے۔ میٹرین ڈنر کا کنٹریکٹ ہم نے حیدرآباد کے مشہور ہوٹل نظام انٹرنیشنل ہوٹل کو دیا تھا، اور ویجیٹرین ڈنر کا کنٹریکٹ موجودہ اگزیکٹو مینیجر کے بازو ایک مدراسی برہمن ہوٹل کو دیا تھا یہ دونوں بھی ڈنر نہایت کامیاب رہے، اور سر اکبر نے صبح میں جشن سال نو کی کامیابی پر جس طرح انہیں خوشنودی فرمایا تھا رات میں ڈنر کے کامیاب انتظامات کو دیکھ بھی بے حد خوش ہوئے۔ اس کے علاوہ ہم نے ڈنر کے فوراً بعد ایک ورائیٹی شو بھی رکھا تھا، اور شو کا انتظام کچھ ایسا کیا تھا کہ تینوں گوشوں یا WINGS کے مہمانوں کو اپنی نشستوں سے اٹھنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ ڈنر کے ختم ہوتے ہی، ورائیٹی شو کے اسٹیج کا پردہ اٹھا، اور شو شروع ہو گیا، یہ شو رات کے بارہ بجے تک ہوتا رہا، جس میں بچے ایسا مزاحیہ پروگرام پیش کیا گیا تھا، کہ ہنستے ہنستے سامعین کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ مہمان خصوصی، سر اکبر اور تمام دوست احباب اور عام مہمان وغیرہ بھی ڈنر اور ورائیٹی شو سے آخر وقت تک خش و خرم رہے۔ یہ جشن اور ڈنر اور ورائیٹی شو پہلی آذر کو ہر سال کیا جاتا رہا، مگر پولیس ایکشن کے بعد یہ بند ہو گیا۔

ان کارہائے نمایاں کے علاوہ، رازدار خان صاحب بوزنی کا، بقول سعدی "بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال" اور "تونگری بہ دل است نہ بہ مال" یہ عقل کی بزرگی اور دل کی تونگری رکھنے والا، بے مثل خرزند، عقل کی بزرگی اور دل کی تونگری کا ثبوت کئی میدانوں میں اور کئی ایک مواقع پر دے چکا ہے، چنانچہ کئی ایک اداروں سے وابستہ رہ کر وہاں بھی اس نے اپنے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ سر دنشی آف انڈیا سوسائٹی کے توڑ پر اس دماغ نے "مجلس خدمت گاران" قائم کی تھی، جس کا پہلا صدر خدا جی۔ ام۔ خان تھا۔ اس مجلس نے بہت سے بلدی خدمات انجام دیں، اور اس کا ایک زبردست کارنامہ یہ تھا کہ بنگال قحط میں جس کے لاکھوں آدمی فاقوں موت کا شکار بن گئے تھے، اس مجلس کے شعبہ میموریل لائبریری کے میدان میں، شامیانے کے نیچے پر ایک مزاحیہ ڈرامائی شو کرکے ساڑھے چار سو روپے حاصل کیے، اور پوری رقم بنگال ریلیف فنڈ میں بھجوا دی۔ جی۔ ام۔ خان مجلس علم و ادب کا پہلا صدر رہا ہے۔ یہ مجلس محمد عمر مہاجر کے مکان واقع کنگ کوٹھا میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جی۔ ام۔ خان، مجلس ترک مسکرات کی شاخ اول پیرون کا بھی پریسیڈنٹ رہا ہے، اور وہی جی۔ ام۔ خان اپنے حلقے اول پیرون کے لیے شیرف اور مشہور کی ارزاں فروشی کی دکانوں کی کمیٹی کا بھی صدر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ایک اداروں اور مجلسوں سے جی۔ ام۔ خان کا تعلق تھا۔ اس وقت حافظہ کام نہیں کر رہا ہے، اس لیے کہ وہ بھولی بسری باتیں ہو گئی ہیں، مگر اس وقت ایک اہم بات یاد آ گئی، وہ یہ کہ جی۔ ام۔ خان انجمن طلبا سینٹ مینا۔ OSMINA GRADUATES ASSO-CIATION کا فاؤنڈر ممبر ہے۔ اس انجمن کی تاسیس یا بنیاد نواب فخر نواز جنگ بہادر ام اے، ال ال۔ بی (کینٹا) کی ڈیوڑھی منعقد وقت بلدیا، واقع دارالشفا ڈالی گئی تھی۔ پہلے جلسے میں نواب فخر نواز جنگ کے علاوہ، احمد علی خان، نشکر جی، عبدالرحیم، محمد علی، فرید احمد وغیرہ وغیرہ تقریباً ایک درجن گریجویٹس موجود تھے۔ ہم سبھوں نے متفقہ طور پر نواب فخر نواز جنگ کو صدر اور عبدالرحیم کو معتمد منتخب کیا۔ اس کے بعد جی۔ ام۔ خان، انجمن طلبا سینٹ، عثمانیا یونیورسٹی جماعت کا معائنہ کمیٹی وغیرہ کا باقاعدہ ممبر رہا، مگر آج کل جی۔ ام۔ خان کا تعلق ان میں سے کسی بھی کمیٹی سے نہیں ہے، اس لیے اس انجمن اور اس کی متعلقہ کمیٹیوں کے کرتا دھرتا سو فی صد طریقے پر ہمارے نمائندگیڈ جنے ہوئے ہیں، اور جی۔ ام۔ خان جیسے مخلص اور بے غرض کارکنوں کو اندر قدم تک نہیں رکھنے دیتے ہیں۔

رازدار خان صاحب الوزنی کے اس تابناک ترین اور اہل ترین فرزند نے زندگی کا ایک اہم ترین اور یادگار کارنامہ ماہوار علمی و ادبی رسالے "ہندستانی ادب" کا اجرا ہے۔ جی۔ ام۔ خان نے اوپر بیان کیا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ام۔ اے کرنے کے بعد بھی جی۔ ام۔ خان نے ملازمت اختیار نہیں کی تھی۔ دو تین سال بے کاری میں گزر گئے، اور ۱۹۳۸ء میں کامیاب انتخاب لڑ کے بلدیا میں قدم رکھا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس وقت بلدیا کی مالی حالت بہت ہی کمزور تھی، چنانچہ ۱۹۴۰ء میں بلدیا نے حکومت حیدرآباد سے (۲۰) لاکھ روپے کا قرض لیا، تاکہ مفاد عامہ کے کاموں پر خرچ کیا جائے۔ اس وقت (۲۰) سب کمیٹیاں بنائی گئی تھیں، جن میں سے صرف ایک لائبریری LAW COMMITTEE کو چھوڑ کر جی۔ ام۔ خان (۲۳) سب کمیٹیوں کا ممبر تھا، اس لیے تقریباً ہر روز بلدیا آنا پڑتا تھا، ایسے میں ہمارے گرم فرما نواب مہدی نواز جنگ نے از راہ ہمدردی ہم سے کہا کہ خان صاحب بلدیا کے سب کام ایک قسم کی بیگاری ہے، اس لیے آپ کو ایک پیسے کا بھی فائدہ نہیں ہوتا ہے، آپ مالی منفعت کا کوئی کام لیجیے۔ ہم نے کہا کہ جناب ہی مشورہ دیجیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، انھوں نے کہا کہ آپ لڑکچر کے ام۔ اے ہیں، اس لیے ہندستانی زبان میں اخبار جاری کیجیے۔ ہم نے کہا کہ آپ ہمارے نجی حالات سے واقف نہیں، آپ کو معلوم ہے کہ بعض افراد خاندان کا تقاضا ہے

کہ ہم بھی ملازمت اختیار کر کے کماؤپوت بن جائیں۔ ان حالات میں ہم اپنے گھر سے کسی بھی قسم کی مالی امداد کی توقع نہیں کر سکتے۔ وہ حامشی ہو رہے، لیکن رہ رہ ہمیں خدیہ اماس ہوتے لگا کہ اس نوبت پر ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے، چنانچہ ایک طویل ذہنی کشمکش کے بعد ہم نے یہ طے کر دیا کہ ایک علمی اور ادبی رسالا نکالیں گے۔ یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے کہ ہم ایک شخص فقیر محمد کی سفارش کے سلسلے میں اس کے ساتھ ٹاں صاحب کے تالاب گئے تھے۔ واپسی میں محکمۂ اطلاعات کے بورڈ پر نظر پڑی۔ ہم دونوں دفتر میں گئے، وہاں کئی ایک ہمارے ملاقاتی تھے۔ ان سے ہم نے رسالے کی اجازت کی تفصیلات دریافت کیں، انھوں نے کہا آپ ڈیڑھ روپے کا اسٹامپ کاغذ لے آیئے، بعد میں سب کچھ طے ہو جائے گا۔ ہماری جیب میں اس وقت ڈیڑھ روپیا بھی نہیں تھا۔ ہم نے فقیر محمد سے کہا کہ ہم یہاں ٹھہریئے آپ جائیے اور فوراً اسٹامپ کا کاغذ لیتے آئیے۔ تھوڑی ہی دیر میں اسٹامپ کا کاغذ آ گیا۔ دفتر والوں کے کہنے کے مطابق لکھ دیا گیا، اور اسی وقت ہم نے اس رسالے کا یادگار نام "ہندستانی ادب" تجویز کیا۔ درخواست دے کر گھر چلے آئے۔ چوتھے یہ ایک علمی اور ادبی رسالا اس لیے بہت جلد اجازت مل گئی۔ اجازت نامہ آیا تو رسالہ جاری کرنے کے لیے پیسے ندارد۔ ہمارے ساتھ جلد یا بہی ہمارے ایک خاص کرم فرما شاہ عالم خاں صاحب تھے۔ ہم نے جوں ہی ضرورت بیان کی، دوسرے ہی روز ایک سو روپے ہمارے گھر لا کر پہنچا دیے۔ صرف کتابت اور کاغذ کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ ادھار چھپائی کے لیے عہد آفرین پریس موجود تھا۔ اس کے دو مالک تھے۔ مظہر اللہ اور کلیم اللہ۔ کلیم اللہ ہمارے کلاس میٹ تھے، اور ان سے لے حد۔ لے حد گہرے دوستانہ تھے، اور ان کی وجہ سے ان کے سارے خاندان سے ہمارے تعلقات تھے۔

اس وقت ہم اپنے آبائی مکان میجلگوڈا میں رہتے تھے۔ جلد (۱) نمبر (۱) بابت ماہ مارچ ۱۳۵۰ف مطابق جون ۱۹۴۱ء کی لکھائی ہمارے دیوان خانے میں ہوئی۔ پہلے کاتب کا نام سید محمد تھا، اور وہ بھی چنگلپٹ ہی کے رہنے والے تھے۔ رسالا چار جز یا (۶۴) صفحے کا تھا، اس لیے کاتب صاحب کو جملہ (۱۶) روپے اجرت دی گئی، اور یہ بہترین خوشخط اور کاتب تھے، مگر اس وقت اجرت اتنی ہی کم تھی۔ ہمارا پہلا نمبر نکلتے ہی، کاتب ہمارے گھر سفارشی چٹھی لے کر پہنچنے لگے، اور ایک کاتب نے تو کہا کہ ہمیں تین روپے فرمے سے لکھنے کے لیے تیار ہوں۔ ہم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر راسندر ناتھ ٹیگور کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس سے ہم نے فائدہ اٹھایا، اور ستمبر ۱۹۴۱ء میں "ہندستانی ادب" کا پہلا خاص نمبر "ٹیگور نمبر" نکالا۔ یہ نمبر بہت پسند کیا گیا، اور اس پر اخباروں اور رسالوں میں بہترین تبصرے ہوئے تھے۔ ہاں ہم نے یہ کہنا بھلا دیا کہ ہمارا رسالا "ہندستانی ادب" ہاروے کے بہترین چکنے کاغذ پر چھپتا تھا۔ اور اس عالا درجے کے کاغذ کی قیمت سات یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات روپے فی ریم تھی، اس لیے ہم نے رسالا نمبر کا سالانا چندہ صرف چار روپے رکھا تھا، جس میں پوسٹیج کا خرچ بھی شامل تھا، اور فی کاپی کی قیمت (۱۰) پڑنے لگی۔

اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کے بعد ہم نے محکمۂ آرائش جلد یا (موجودہ ناد ڈنگ بورڈ) میں اسی محلے میں کرائے کے مکان کے لیے درخواست دے رکھی تھی، چنانچہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں (B-78) ہمارے نام الاٹ ہو گیا تھا۔ اور ۱۹ نومبر ۱۹۴۱ء کو ہم اپنے موروثی اور آبائی مکان سے چل پڑے، اور چل پڑے تو اسی حالت میں کہ اس مکان کے تمام صندوق، پلنگ، بستر اور متعلقہ سامان سب کچھ وہیں چھوڑ دیا۔ فقیر محمد کے ذریعے کرائے کا سنڈی منگوائی اور اس میں اپنی ذاتی کتابیں، رسالے اور اسٹیشنری کا صندوق رکھا، اس لیے کہ اس صندوق کو ہم نے اپنے پیسوں سے کلکتا کے ۱۹۴۲ء کے سفر میں غرغا تھا۔ اندازا کیجیے کہ اس بے سروسامانی کے ساتھ ہم نے

مسافرانا زندگی سے اپنے نئے دورِ حیات کا آغاز کی، اور آج (۳۴) سال سے آج کی تاریخ تک راز داز خان صاحب کا یہ قابلِ قدر فرزند اپنے قلم کی قوت اور زور سے اپنی زندگی کی ناؤ کو کھیے جا رہا ہے، مگر اب پوری قوت اور پورے وثوق یا یقینی کامل کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہونے والا ہے، اس لیے کہ جی۔ ام۔ خان فلسفۂ زندگی سے بہتر طریقے پر واقف ہے، اور پورے طور پر یہ سمجھتا ہے کہ ہر جاندار کا لیے جان ہونا لازمۂ فطرت ہے، اور جی۔ ام۔ خان بھی جاندار ہے، ہوسکتا ہے کہ ان سطروں کے لکھتے وقت ہی بے جان ہو جائے، یا اس کے بعد کل، پرسوں، ترسوں، وغیرا وغیرا۔ بہرحال جی۔ ام خان اس نوعیت پر، بحالِ طور پر یہ فخر محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنے ریس کے اول آنے والے گھوڑے کی سی قلم کی روزی سے "ہندستانی ادب" کی (۳۴) جلدیں تو کھڑا کر دی ہیں، جس کے دو مکمل سیٹ "ہندستانی ادب" کے دفتر میں موجود ہیں، اور ہندستان اور پاکستان کی سینکڑوں ہی لائبریریوں اور کتب خانوں میں بھی "ہندستانی ادب" کی جلدیں مجفوظ ہیں۔ یہ کون ساری دنیا نے محافظ جانچ اور تسلیم تھی کرتی ہے کہ "ہندستانی ادب" ایک مختصر معیار کی علمی ادبی رسالہ ہے، جو اپنے ہر نمبر کو ایک بہترین گلدستے کی شکل میں پیش کرتا ہے!

رازدار خان صاحب یوزفی کے چوتھے فرزند جی۔ ام۔ خان نے اپنے تعلیمی دور کے جو کارہائے نمایاں گنائے ہیں، ان کا لحاظ کرتے جامعۂ عثمانیہ یا عثمانیا یونیورسٹی کی تاریخ اور محلۂ عثمانیا یا عثمانیا سٹیگرین کی تاریخ جی۔ ام۔ خان کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی، اور جدید حیدرآباد یا MODERN HYDERABAD کی تاریخ بھی جی۔ ام۔ خان کے نام کے بغیر ادھوری نہیں ہو سکتی، اسی لیے کہ آج سے کوئی (۴۵-۴۴) سال پہلے جلد یا، یا میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد میں یہ تحریک میونسپل کو فنکشنگ لانے شہر کو جدید سانچوں میں ڈھالنے کی جو تحریکیں کی گئیں، وہ ہر حالت میں قابلِ تحدید تھیں اور جی۔ ام۔ خان کی اس ڈھالنے کی حمایت جائز تحریکیں جن پر آج تک بھی عمل نہیں ہوا ہے، ان پر اس وقت بھی عمل کیا جائے تو شہر حیدرآباد کی صدارتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں، اور اس کی شہرت کے ڈنکے نہ صرف سارے ہندستان بلکہ ساری دنیا میں پیٹ جائیں گے۔ ان میں سے ایک نہایت ہی ضروری اور اہم ترین تحریک موسا ندی میں پانی چھوڑنے کی ہے، اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ عنبر پیٹ سے آگے یا اس سے قریب موسا ندی پر بند باندھا جائے، اور وہاں سے پرانے پل تک ندی کی تمام غیر ضروری اجزا سے پاک کی جائے۔ اس کے بعد بارش کے موسم میں پانی کو روکا جائے، جب ندی پانی سے بھر جائے تو اس میں باقاعدہ طور پر کشتی رانی کی جائے، اور اس سلسلے میں جو بھی اخراجات ہوں مقرر کیے جائیں۔ اسی سلسلے میں ندی کے درمیان اطالوی طرز میں جزیرے بنائے جائیں۔ اور رنگ برنگ کے فوارے بھی نصب کیے جائیں۔ یہاں برسات کے دن گزارنے تک روشنی کی جائے تو یہ منظر بڑا ہی دلفریب ہوگا۔ روزانہ ٹورسٹ بھی اس سے محظوظ ہوں گے، اور اس سحر آفرین منظر کی دلفریبیوں کو اپنے اپنے ساتھ لیتے جائیں گے۔ اس کے علاوہ حسین ساگر کے عقب میں ایک وسیع پارک بھی بنایا جائے اور وہاں میسور کے برندابن پارک کے سے دلفریب مناظر پیدا کیے جائیں!

ہم غالبؔ نہ مانا ہیں

یہاں ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں "ایجادِ بندا" نہیں ہے، بلکہ بلا مبالغہ حقیقت، اور واقعات پر مبنی ہے کہ ایک سے زیادہ مرتبا، ہمارے کئی کرم فرماؤں نے ہم سے تعجب کے ساتھ ہم سے دریافت کیا کہ کیا وریاستی اور مرکزی نے اب تک آپ کو نیشنل ایوارڈ NATIONAL AWARD نہیں دیا، تو ہم نے چپکے سے صرف یہی جواب دیا کہ بقول غالبؔ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہ مانا میرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالبؔ نے یہ شعر اس وقت کہا تھا، جب دوسرے شاعروں، اور عوام نے اس کو مہمل گو شاعر قرار دیا

تھا۔ شروع شروع میں غالب کا رجحان اوق گوئی کی طرف تھا، یعنی وہ فارسی کی ایسی مشکل اور نامانوس ترکیبیں استعمال کرتے تھے، جو عوام تو عوام، خواص بھی ان ترکیبوں کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتے تھے، اس لیے لوگ عام طور پر غالب کی شاعری کا مذاق اڑاتے تھے، یہاں تک کہ ظفر کے استاد ذوق نے بھی ایک جرتا، غالب کے بعض مشکل پسند اور اوق ترکیبوں والے اشعار سنکر، غالب پر "مہمل گوئی" کا الزام لگایا تھا، چونکہ قوت ذوق اور ظفر تک پہنچ گئی تھی، اس لیے، اس کی صفائی میں غالب نے ایک غزل لکھی، جس کا ایک شعر اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ذوق اور دوسرے شعرا، نیز عوام کے مسلسل اعتراضات کے باوجود غالب کا عقیدہ تھا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے، بلکل حق بجانب اور بجا ہے۔ اپنی غیر معمولی اوق گوئی سے وہ عوام اور خواص پر اپنی فارسی دانی کی عالانہ قابلیت کا سکہ بٹھانا چاہتا تھا۔ بلا شبہ غالب ایک جید فارسی داں تھا، اس کو فارسی زبان پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اس نے فارسی زبان اصل میں انگیم ایرانی استاد سے سیکھی تھی، اس لیے اس کا دعوٰی تھا کہ اس کی فارسی ایرانیوں جیسی ہے، اور ہندستانی جو فارسی لکھتے ہیں غلط سلط ہے، جس کو ایرانی پسند نہیں کرتے، اور ہندستانی فارسی کا نام دیتے ہیں۔ بہر حال عوام سے تنگ آکر اور مجبور غالب کو یہ کہنا پڑا تھا کہ ؎

"میں نے مانا میرے اشعار میں معنی نہ سہی"

گویا غالب نے اپنی اوق گوئی کے سلسلے میں اپنی ہار مان لی تھی، مگر "غالب زمانہ" مجید ام۔ خان کے ہار ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ اپنی علمی، ادبی اور (۳۰) سالا صحافتی زندگی میں مجید ام۔ خان نے بلا مبالغہ ہزاروں ہی صفحے کالے کر ڈالے ہیں، اور "ہندستانی ادب" جیسے ٹھیٹ علمی، ادبی اور معیاری ماہوار رسالے کی (۳۲) جلدیں کھڑا کردی ہیں، اور (۳۳) ویں جلد کے تکملے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ "ہندستانی ادب" وہ معیاری رسالا ہے، جس میں ٹھیٹ علمی، ادبی اور سماجی قسم کے معیاری مضامین چھاپے کرتے ہیں، نیز "ہندستانی ادب" نے ام۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کے معیاری مقالے یا THESIS بھی چھاپے ہیں، اور ابھی معیاری مقالوں سے ام۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کے طلبا نے اپنے اپنے مقالوں کی تیاری میں "ہندستانی ادب" کی سالقا جلدوں سے مدد لی ہے۔ "ہندستانی ادب" کوئی غیر معیاری یا گھٹیا قسم کا رسالا نہیں ہے، جو لکھنے والوں کو یہ ہدایت کرتا ہو کہ مضمون نگار ہیجان پیدا کرنے والے مضامین لکھتے وقت رسالے کے صفحوں کا خیال رکھا جائے، اور ایک دو صفحوں سے زیادہ طویل مضمون نہ لکھا جائے! اس کے برعکس "ہندستانی ادب" وہ معیاری رسالا ہے، جو حرف اور حرف مضمون کی افادیت اور معیار پر نظر رکھتا ہے۔ اگر کوئی مضمون اچھا اور معیاری ہے، اور اگر وہ مضمون (۲۰-۲۵) پرنٹی صفحوں پر مشتمل ہے تو یہ رسالا اس مضمون کو نقل کرنے میں ہرگز ہرگز دریغ اور گریز نہیں کرتا، اس لیے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ایسے ٹھیٹ معیاری ادب سے تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھائی جائے!

غالب نے تو اپنی شاعری کے سلسلے میں اپنی اوق گوئی کی ہار مان لی تھی، لیکن ہمارے، نثر کے سلسلے میں، کوئی ہار ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لیے کہ ہم جو کچھ بھی لکھتے ہیں، وہ روز مرا اور عام بول چال کی زبان میں ہوتا ہے۔ ہمارے قلم میں بلا کی روانی ہے، چنانچہ ایک ایک نشست میں صفحے کے صفحے لکھ مارتے ہیں۔ یہاں تک کہ انگلیاں لے قالو ہوئی جاتی ہیں، اور ہاتھ درد دینے لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود ریس کے اول آنے والے گھوڑے کی طرح ہمارا سحر آفرین اور جادو نگار قلم اپنی جولانیاں دکھاتا رہتا ہے۔ ہمارا یہ بلند بانگ دعوا نہیں ہے، بلکہ صداقت اور حقیقت پر مبنی دعوا ہے، جس کا ثبوت ہم ہر وقت، اور ہر آن ہر ایک کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار ہیں، اور یہ سب رنگا رنگیاں کس حالت میں ہیں ——؟

"یتیم ماؤں" کی حالت میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت بھی "ہندستانی ادب" سراسر اور سو فی صد لفظاں میں چلایا جا رہا ہے۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ "ہندستانی ادب" کا ہر نمبر صرف اور صرف (۵۰۰) کی تعداد میں چھپا کرتا ہے، اور بعض خاص خاص مواقع پر (۳۰۰) کی تعداد میں بھی چھپوایا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس رسالے کی عام خریداری نہیں ہے، صرف حیدرآباد کا ایک ادارا اپنے واجبی لائبریریوں اور ریڈنگ روم کے لیے "ہندستانی ادب" کے ہر نمبر کی (۱۵۰) کاپیاں خریدتا ہے، اور یہی ادارہ آج سے تین سال پہلے تک (۲۰۰) کاپی خریدا کرتا تھا، مگر تین سال پہلے اس نے (۵۰) کاپی کی جو کمی کر دی، اس کو ہمیں بری طرح سے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس کے علاوا نئی دہلی کا ایک اور ادارا (۷۱) کاپی خریدتا ہے، اس کے سوا اور چار لائبریریاں بھی اس کی خریدار ہیں، اور جو کاپیاں بچ رہتی ہیں وہ تبادلے میں بھیج دی جاتی ہیں، اور کچھ رعایتی طور پر بھی دی جاتی ہیں۔ خریداروں کی کمی کے علاوا "ہندستانی ادب" اشتہاروں سے بھی محروم ہے۔ اگر اشتہار ملتے تو اس کی آمدنی سے خریداری کی کمی کی پابجائی کی جا سکتی تھی، مگر چونکہ "ہندستانی ادب" کے لیے اشتہارات کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، اس لیے یہ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم نے اس سلسلے میں کوئی کوشش اور بھاگ دوڑ نہیں کی۔ اس کے علاوا (۳۳) سال کے طویل ترین عرصے میں ریاستی حکومت اور مرکزی حکومت ہندستان سے یا کسی بھی ادارے یا فرد واحد سے "ہندستانی ادب" کو ایک روپے کی بھی امداد نہیں ملی ہے۔ اب آپ ہی کچھ اندازا لگائیے کہ ان کٹھن اور جاں لیوا پریشانیوں کے ساتھ "ہندستانی ادب" کو کیسے اور کیونکر چلایا جا سکتا ہے، مگر ان ناگوار اور تلخ ترین حالات کے باوجود ہم "ہندستانی ادب" کو چلائے جا رہے ہیں، اور یہ مشکل صرف اسی وقت مشکل ہے، جب کہ ہم اس رسالے کو اپنا عزیز ترین خون پلا پلا کر پال رہے ہیں، اور حقیقت میں اس رسالے کو اپنا عزیز ترین خون پلا پلا کر پال رہے ہیں، ورنہ آج سے کئی سال پہلے ہی یہ ختم ہو جاتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص کو تو اپنی جان عزیز ہوتی ہے، اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر شخص پہلے اپنی جان کا خیال رکھتا ہے، اس کے بعد دوسروں کا لحاظ رکھتا ہے، لیکن یہاں معاملا بالکل ہی برعکس اور الٹا ہے۔ ہم سچ کہتے ہیں کہ ہمیں "ہندستانی ادب" اپنی جان سے زیادا عزیز ہے۔ ہر سال ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس رسالے کی عمر میں ایک اور سال کا اضافہ ہو جائے، ایک اور سال، اور ایک، اور سال بڑھ جائے۔ ہم نے اپنی عمر کے بڑھنے کا کبھی خیال ہی پیدا نہیں ہونے دیا، اس لیے کہ ہمیں یقین کامل ہے کہ جب موت آئے گی، تب ہم مر جائیں گے، اس لحاظ سے موت کے رونے کا تصور تو کوئی لے کر خوف بھی نہیں کر سکتا، مگر یہ ضرور ہے کہ جب تک ہم زندا ہیں، اپنے عزیز از جان رسالے "ہندستانی ادب" کی عمر کو طویل سے طویل تر کرنے کی فکر اور دھن میں لگے رہتے ہیں، اور ہمارا یہ سب عمل انتہائی تنگدستی، مفلسی، غربت اور کم مائیگی کے سے ناگوار حالات میں ہو رہا ہے۔

یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ چچا غالب کا آخری زمانا انتہائی افلاس اور تنگدستی میں گزرا، یہاں تک کہ غالب جیسے جیسے کو تنگ ترسنے لگے تھے غالب کی آمدنی کا کوئی بھی ذریعا نہ تھا۔ طبقہ بھی ان کی کوئی زیادا مدد نہیں کرتے تھے۔ غالب کا ابتدائی دور بڑا ہی اچھا گزرا تھا۔ کھاتے کھلاتے اور عیش کرتے رہے، مگر پنشن کے بند ہو جانے کے بعد سے غالب غربت اور افلاس کی بری طرح سے شکار بن گئے تھے۔ کھانے اور کپڑے کو تنگ ترستے تھے، اور جس کچی مکان میں کرایے سے رہتے تھے، اس کا کرایا تک ادا نہ کر سکتے تھے۔ غالب نے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا، اور اپنے شاگردوں کو خطوط لکھ کر پیسے منگوایا کرتے تھے، مگر غالب کے مسلسل اور بے در بے مطالبوں سے ان کے شاگرد بھی تنگ

آ گئے تھے، اور لازمی طور پر انھوں نے اخفا ہی اختیار کر لی تھی، انتہا یہ کہ اپنے استاد کے خطوں کا جواب تک نہ دیا کرتے تھے۔ یہ حال، انھیں ناگوار اور ابتر حالات میں غالب کا انتقال ہو گیا۔

افلاس، تنگدستی، نیز غربت و بے سروسامانی کا لحاظ کرتے، ہم خدا بھی غالب سے بچے کم نہیں ہیں، بلکہ چار قدم آگے ہی ہیں، غالب نے اپنے شاگردوں اور دوسروں سے پیسے مانگ کر اپنا پیٹ بھرا مگر اس غالب زمانا کو یہ فخر حاصل ہے کہ غربت، تنگدستی، کم مائگی اور انتہائی افلاس کے بھنور میں بری طرح سے پھنسا ہوا ہے، اور مسلسل نیم فاقے کیے جا رہا ہے، لیکن اس کے باوجود آج تک بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور ایک پیسے کی تک مدد امداد نہیں طلب کی۔ اس کے لیے بڑے ہی صبر اور عزم کی ضرورت ہے۔ آدمی اگر نفس پرستی کو تھکرا دے تو صبر و قناعت اس کا شیوا بن جاتا ہے، صبر و قناعت کے بعد آدمی زندگی کے لیل و نہار سے بالکل ہی بے نیاز اور بے پروا ہو جاتا ہے، اور یہ مشکل صرف ایک انسان ہی سے ممکن ہے چونکہ ہم ایک انسان کامل "ہیں"، اس لیے صبر و قناعت پر عمل کر رہے ہیں، اور اپنی خدداری اور بے نیازی کے سلسلے میں ہم نے واقعی "غالب خستہ جاں" کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔!

"ہندستانی ادب" کے سلسلے میں ہم بلا مبالغہ "قناعت" کے درجے کو پہنچ گئے ہیں، اور "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ ہو گیا ہے۔ اس نوبت پر صرف خدمت کا جذبہ رونما ہوتا ہے، جہاں خدمت اور سیوا کا سوال پیدا ہو گیا تو پھر صلے یا معاوضے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے خدا ہم کو غالب کے ہمنوا ہوتے ہوئے مجبور ہی کہتا پڑتا ہے کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
میں نے ماتا میرے مضمون "میں معنی نہ سہی

غالب کے لفظ "اشعار" کی بجائے ہم نے اپنے حسب حال "مضمون" کا موزوں اور مناسب لفظ استعمال کیا ہے۔

راز دار خان صاحب کے پانچ بیٹے اور آخری فرزند کا نام سلیم خان صاحب یوزفی تھا۔ سلیم خان ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے تھے، اور ہم سے چار سال چھوٹے تھے۔ ہم اس وقت (۷۰) دس سال کے ہیں، وہ اگر زندہ ہوتے تو (۶۶) دس سال کے ہوتے۔ آج سے تقریباً سات سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا مارٹ فیل نہیں ہوا بلکہ وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پہلی بار جب یہ جان لیوا مرض لاحق ہوا، انھیں عثمانیا دواخانے میں شریک کروایا گیا تھا، ایک مہینے سے زیادہ عرصے تک PAYING WARD میں رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر کی اجازت سے گھر آ گئے، لیکن کچھ عرصا بعد پھر سے وہ مرض لاحق ہو گیا تو انھیں دوبارہ دواخانے میں رجوع کروایا گیا، مگر اب کی دفعہ معاملہ سخت تھا، اور دواخانے ہی میں انتقال ہو گیا۔

ہم پانچ بھائیوں میں سلیم خان سب سے اونچے تھے۔ ان کا قد غالباً ۵ - ۱۰ یا ۵ - ۱۱ ہو گا۔ ہم سے بڑے تینوں بھائی ۵ - ۸، ۵ - ۹ کے لگ بھگ ہوں گے، اور ہم پرائیم منسٹر لال بہادر شاستری کے ہم قد ہیں، یعنی صرف ۵ فٹ، اس لحاظ سے قد کے اعتبار سے ہمارا شمار گدڑوں میں ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ ہم بلبل تحیف و زار، اور دبلے پتلے ہیں، بلا مبالغہ یوست استخوان ہیں، مگر معنی میں ہماری ہڈی چمڑی ایک ہے، مگر ہمارے دوسرے چاروں بھائی موٹے تازے اور تنومند ہیں

ہم نے اوپر کہیں بیان کیا ہے کہ ہم والد کے انتقال کے وقت آٹھ سال کے تھے، اور ہمارے چھوٹے بھائی سلیم خان صرف چار سال کے تھے۔ سلیم خان کی بسم اللہ کی تیاری پوری پوری ہو چکی تھی، ایسے میں والد مکرم پر فالج کا جان لیوا حملہ ہوا۔ وہ تقریباً چالیس روز تک زندہ رہے، مگر اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے تینوں دوست طبیب، افسر الاطبا حکیم ممتاز الدین دہلوی مہتمم دواخانۂ طبیہ سرکار کا منصفا، اور حکیم حبیب اللہ سدا سوری نیز حکیم شمس الدین حیدرآبادی نے ان کے علاج و معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اپنے علاوہ ان تینوں طبیبوں نے اور بھی ماہر طبیبوں

کو اپنا شریک کار رکھا تھا، مگر مرض کا حملہ اتنا سخت تھا کہ والد صاحب اس سے جانبر نہ ہو سکے۔

والد صاحب کے چہلم کے بعد سلیم خان کی بسم اللہ کی رسم ادا کی گئی تھی۔ سلیم خان کے قویٰ اچھے بھلے اور ان کے اعضا پورے ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے بکری کا دودھ پیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ سلیم خان کی پیدائش کے بعد دو تین انائیں رکھی گئیں۔ مگر اتفاق دیکھئے کہ ان تینوں اناؤں نے دھوکا دیا۔ اس پر والد صاحب کو سخت غصہ آگیا، اور وہ غور کرنے لگے۔ اور ایک عالا النسل کی بکری خرید لائے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس بکری کا بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا، اس لیے بکری کو گھر لے آتے ہی بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا، یعنی جس طرح سے بکری کا بچہ ماں کے تھن سے دودھ پیتا ہے بالکل اسی طرح تو مرتو د سلیم خان کو بھی والد صاحب ہاتھوں میں تھامے ہوئے بکری کا دودھ پلایا کرتے تھے۔ بکری بڑی تھی دودھ بھی زیادہ دیتی تھی، اس لیے دن رات میں چار چھ مرتبہ اس بچے کو دودھ پلایا جاتا تھا۔ چند روز بعد بچہ اور بکری دونوں بھی دودھ پینے اور پلانے کے عادی ہو گئے تھے، اور اگر بچے کو دودھ پلانے نہ لایا جائے تو بکری منمنا پکارتی رہتی تھی، اور بچے نے دودھ پینا شروع کیا تو وہ خاموش ہو جاتی تھی، چونکہ اپنے بچے کے دودھ کی بکری تھی، اس لیے اس کے چارے اور دوسری چیزوں کے کھلانے کا خاص طور خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کو باغوں اور کھیتوں میں چرانے اور چرانے کے لیے ایک خاص آدمی مقرر تھا۔ بکری جاڑے میں بھی بڑی تھی، اور موٹی تازی بھی تھی۔ اس کا رنگ جیت گرا تھا، یعنی سفید اور کالے پٹے تھے۔ یہ سچ ہے کہ بقریب دو (۲) سال کی عمر تک بھی سلیم خان نے اسی بکری کے تھن سے دودھ پیا تھا، اس لیے سلیم خان کا بچپن کا نام "بکری کا بچا" تھا۔ ہمارے گھر کے مقابل مارواڑی کی دکان تھی، جہاں سے ہمارے گھر میں علاوہ غلہ آیا کرتا تھا، اور ان دونوں مارواڑی بھائیوں موتی لال اور موہن لال سے ہمارے آپس میں خاندانی سے تعلقات تھے اور وہ دونوں بھائی سلیم خان کے بڑے ہونے تک انھیں "بکری کا بچا" ہی کے نام سے پکارتے تھے، اور چھوٹا بھائی موہن لال تو سلیم خان سے بہت محبت بھی کرتا تھا۔ سلیم خان جب مدرسا جانے کے قابل ہوئے تو انھیں بھی رزیڈنسی مڈل اسکول میں شریک کرایا گیا، لیکن انھیں بچپن ہی سے تعلیم سے دلچسپی نہیں تھی حتیٰ وقت ہم نے رزیڈنسی مڈل اسکول سے مڈل کا سرکاری امتحان کامیاب کیا ہے، اس وقت سلیم خان چوتھی میں تھے، اور انھوں نے چوتھی جماعت ہی سے تعلیم کو ترک کر دی تھی۔ گھر ہی میں بے کاری میں دن گذار رہے تھے۔ ایسے میں چن یتی سے ایک ماہر فلم ساز ہاشم میاں آئے، اور محلہ کالا ڈیرا میں اپنا فلم سازی کا کارخانا کھولا، اور چمنگوڑا، کالا ڈیرا وغیرہ کے محلوں کے بچوں کو کام سکھانا شروع کیا۔ ہماری ماں نے سلیم خان سے کہا کہ تم بیکاری میں اپنی اوقات خراب کر رہے ہو، اس لیے ہاشم میاں کے کارخانے میں جا کر فلم بنانے کا کام سیکھو۔ چنانچہ سلیم خان وہاں گئے، اور اس کارخانے میں فلم سازی کا کام سیکھنا شروع کیا۔ سلیم خان کے جاتے ہی ہمیں بھی شوق ہوا، اور ہم بھی ہاشم میاں کے کارخانے میں گئے اور فلم سازی کا کام سیکھنا شروع کیا۔ چند ہی روز میں سلیم خان نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی اور ہاشم میاں نے اپنے اس شاگرد کی بے حد ستائش کی، اور ہم اس فن میں نکے کے نکے ہی رہے۔ سلیم خان نے اپنے بڑے مکان کے ایک کمرے میں دو مرغے قائم کیے، اور گھر میں بیٹھے بیٹھے بہترین فلم اور بچوں کے کھلونوں کی چیزیں بھی بنانے لگے، اور اپنے استاد ہاشم میاں کے کارخانے کو تجارتی اصول پر سیلانی کے اس طرح سے ہر ہفتہ ان کی کچھ مستقل آمدنی ہو گئی تھی۔

جب ہمارے بڑے بھائی نے آر ایس ملدار (موجودہ ہاوزنگ بورڈ) کی سڑکوں کی گتے داری کا کام شروع کیا تو ہم اور سلیم خان دونوں بھی اس کام کی نگرانی کے لیے جایا کرتے تھے۔ سلیم خان نے جرخا چلانا چھوڑ دیا، اور دیکھ بھال بڑے بھائی کے کاموں کی طرف دینے لگے، مگر مالی مدد وغیرہ میں بڑے بھائی کا ہاتھ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ سلیم نے اپنے لیے دوسرا میدان تلاش کیا، یعنی محکمۂ آبرسانی WATER WORKS میں درخواست

دیدی اور نل نصب کرنے کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگے۔ ایسے میں ۱۹۳۸ء میں ہم اپنے اقامتی حلقۂ اول بیرون سے منتخب ہو کر بلدیا، یا میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد گئے تو ہمارے (۳۶) ساتھی کونسلروں میں حلقۂ اول اندرون کے ایک منتخب رکن محمد علی موسوی صاحب بھی تھے۔ موسوی صاحب سے ہمارے نہایت ہی گہرے دوستانہ تعلقات تھے، جس سے سلیم خان بخوبی واقف تھے، اس لیے سلیم خان نے یہ چال چلی کہ ہمیں پھسلانے، ٹالنے کے لیے ہماری تمام بلدی مراسلت وغیرہ کے سلسلے میں ایک باقاعدہ محاذ سے، موصولے یا IN WARD اور OUT WARD کا بالکل نئے اور عالا قسم کے کاغذ کا رجسٹر تیار کیا، اور ہمارے نام جتنے بھی مراسلے اور لیٹرس آتے، اور ہم جو دوسروں کے نام جو بھی لیٹرس بھجواتے، ان سب کا اندراج کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر ہم نے ان سے کہا کہ آپ بلاوجہ بھی یہ کیا زحمت لے جا مول رکھی ہے۔ لیٹرس آتے ہی تو ہم جواب دے دیتے ہیں، اور ہم جو لیٹرس بھجواتے ہیں، ہم خود ہی لکھ کر بلدیا کے چپراسی کے ذریعے روانہ کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں، ہر دفتر میں محاذ سے موصولے کا الگ الگ رجسٹر ہوا کرتا ہے، مگر میں نے صرف ایک ہی رجسٹر میں دونوں کام کے لیے گنجائش رکھی ہے، اور ہاں جو لیٹرس ہمارے ہاں سے دوسروں کے پاس جایا کرتے تھے، اس کے لیے بھی ایک الگ ڈائرنی بنا رکھی تھی۔

بہر حال کچھ ہی عرصا بعد ان تمام کارستانیوں کا ہم پر کل کھلا، چنانچہ ایک روز انھوں نے کہا، بھائی صاحب! میں ایک طویل عرصے سے آب رسانی میں نلکوں کی تنصیب کا کام کر رہا ہوں، کبھی کبھار چھوٹے کام مل جاتے ہیں، لیکن آج تو کوئی بڑا کام نہیں ملا۔ آپ کے دوست موسوی صاحب کا نام آب رسانی کے ممبروں میں ہے۔ وہ خود آب رسانی کا کام نہیں کرتے ہیں، بلکہ ڈرینج کے بڑے بڑے ٹھیکے لیتے ہیں، اور توپ کے سانچے پر ڈرینج کے سامان کی ایک دکان بھی ہے، اس لیے اگر آپ مجھ کو اپنے ساتھ بلدیا لے چلیں، اور ان سے کہیں کہ وہ مہتمم صاحب آب رسانی سے مجھ کو ملائیں اور یہ کہہ دیں کہ موسوی صاحب نام منصب نل کے جتنے بھی کام ہوں، وہ مجھ کو دیں، تو اس میں مجھ کو مسلسل کام ملنے لگے گا، اور کچھ آمدنی بھی ہو جائے گی۔ ہم نے کہا کہ آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں کہا، ہاں یہ سچ ہے کہ موسوی صاحب سے ہمارے گہرے تعلقات ہیں۔ اس وقت ہم باہر جا رہے ہیں، ہمارے ساتھ ابھی چلے چلیے، موسوی صاحب اپنے خسر کے مکان دارالشفا میں رہتے ہیں، ہم اس وقت ان سے آپ کا تعارف کرا دیں گے، چنانچہ ہم دونوں بھائی اسی وقت موسوی صاحب کے گھر گئے۔ موسوی صاحب مکان میں موجود تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے کہ ہم دونوں وہاں پہنچے، اور فوراً موسوی صاحب دیوان خانے میں آ گئے، ہم نے ان سے سلیم خان کا تعارف کرایا کہ یہ ہمارے سگے چھوٹے بھائی ہیں، وہ ان سے مل کر خوش ہوئے۔ ہم تینوں باتیں کر رہے تھے، ایسے میں چائے، بسکٹ، نمکو وغیرہ آیا، ہم تینوں نے مل کر چائے پی۔ اس کے بعد سلیم خان نے اپنی ساری داستان کہہ سنائی، تو اس کے بعد ہم نے موسوی صاحب سے کہا، سلیم خان ہمارے نہیں بلکہ آپ کے سگے بھائی ہیں، اس لیے آپ اپنے بھائی کے لیے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کیجیے۔ سلیم خان یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے پارٹنر دوست مہتمم آب رسانی سے ان کو ملائیں اور تاکید کہیں کہ آپ کے نام پر سلیم خان کو ضرور بالضرور کام دے دیا جائے۔ موسوی صاحب نے کہا یقین، سلیم خان آپ کے نہیں، بلکہ میرے چھوٹے بھائی ہیں، میں ابھی باہر جا رہا ہوں، اور اسی وقت انھیں اپنی کار

میں لے جاکر "رستم جی"، مہتم آب رسانی سے ملادوں گا، اور یہ کہوں گا کہ میرے نام پر سلیم خان کو مسلسل کام دیے جائیں، اور انھیں کبھی بے کار نہ رکھا جائے۔ اس کے بعد سلیم خان موسوی صاحب کی کار میں ان کے ساتھ روانا ہو گئے اور ہم اپنے کام سے چلا گئے۔

موسوی صاحب نے وعدا نبھایا کیا، اپنے دوست پارسی مہتمم آب رسانی سے مل کر اس انداز میں سلیم خان کو ملایا کہ اس کے بعد سے سلیم خان کو مسلسل کام ملنے لگے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑ چکی تھی، اور ہر چیز مہنگی ہو گئی تھی، چنانچہ دانڑ پانیس کا بھی یہی حال تھا، اور پانی کے میٹر تو بہت ہی گراں ہو گئے تھے۔ ایک سال بعد سلیم خان نے پیٹ میں کے پاؤں نکالے، اور پیسے سے ہمیں مجبور کر ناشروع کر دیا کہ اب کی دفعہ ہم موسوی صاحب کو اس بات مجبور کریں کہ انھیں کے نام کی آب رسانی کی پلمبری، ان کے نام منتقل کرا دیں۔ ہم نے پہلے پہلے تو ٹالا دیا، لیکن پھر سے انھوں نے ہماری غیر معمولی خوشامد چاپلوسی کر دی، اور اپنی ماں سے الگ کہنے لگے کہ وہ ہمیں مجبور کرے کہ ہم موسوی صاحب سے بول تا کر اپنی پلمبری، سلیم خان کے نام منتقل کرا دیں۔ اس طرح پر ہم بالکل ہی مجبور ہو گئے، اور آخر کار ان سے کہا کہ آج شام میں بلدیا کے اجلاس پر، اجلاس شروع ہونے سے پہلے آپ بلدیا آیئے، ہم موسوی صاحب سے کہہ دیں گے کہ وہ اپنی پلمبری آپ کے نام منتقل کرا دیں، چنانچہ سلیم خان وقت پر آ گئے، ایسے میں موسوی صاحب بھی آ گئے، دونوں میں باتیں ہوتی رہیں، چنانچہ موسوی صاحب نے دریافت کیا، کیسے سلیم خان صاحب کیسے آنا ہوا، اس کا جواب ہم نے یہ دیا کہ سلیم خان کا کہنا ہے کہ موسوی صاحب ڈرہیج کے بہت بڑے گتے دار بھی ہے، وہ لاکھوں کا کاروبار کرتے ہیں، اس لیے آب رسانی کے چھوٹے کام ان سے ناممکن ہیں، اور یہ ان کی مہربانی ہے کہ آج سے ایک سال پہلے مہتمم سے تعارف کرایا تھا، چنانچہ اس وقت سے برابر کام مل رہے ہیں۔ اب ان کی آپ سے یہ خاہش اور درخاست ہے کہ آپ مہتمم صاحب آب رسانی کے نام درخاست دے کر اپنی پلمبری اپنے چھوٹے بھائی سلیم خان کے نام منتقل کرا دیں۔ یہ سنتے ہی موسوی صاحب نے مسکرا دیا، اور ہم نے کہا مسکرانے کی ضرورت نہیں آپ کو خوشی ہونی چاہیے کہ آپ جیسے مشفق اور مہربان بڑے بھائی کا اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں ایک یادگار کارنامہ ہو گا، سوچنے سوچانے کی چنداں ضرورت نہیں، آپ انھیں کل دفتر آب رسانی کو آنے کے لیے کہیئے، اور اپنی راضی مرضی سے ایک درخاست مہتمم صاحب کے نام دے کر اپنی پلمبری سلیم خان کے نام منتقل کرا دیجیے، چنانچہ موسوی صاحب نے ایسا ہی کیا، دوسرے ہی روز مہتمم صاحب آب رسانی کے نام درخاست دے کر اپنی پلمبری سلیم خان کے نام منتقل کروا دی۔ اس کے بعد سے سلیم خان کا شمار آب رسانی کے بڑے بڑے ٹھیکے داروں میں ہو گیا۔ سلیم خان نے خوب خوب ہی کمایا، موٹر خریدی اور موٹر نشین بھی ہو گئے۔ اس کے باوجود اپنے بڑے بھائی "محسن اعظم" کے ساتھ ان کا سلوک ایسا رہا کہ انھیں یہ خیال گزرے کہ آیا جی۔ ایم۔ خان نے عمر بھر کے لیے ان کے ساتھ جو کچھ ایسا احسان کیا ہے، جس کے باعث وہ موٹر نشین بن گئے؟ کمال تو یہ ہے کہ رہتے ایک ہی گھر میں تھے، یوں سمجھتے تھے کہ سلیم خان خیریت سے تو ہیں، ان کا کاروبار کیسے چل رہا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے دوسرے "محسن اعظم" موسوی صاحب سے بھی نہیں ملتے تھے۔ سلیم خان تھے تو چوتھی جماعت فیل، لیکن دماغ

باتوں میں رام کر لیا تھا، چنانچہ ایک بڑے کام کے سلسلے میں (۱۹۰۸ء) ہزار روپیا نقد اس غرض سے لیا کہ منافع میں برابر برابر کا حصہ رہے گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ پارسی مر گیا تو سلیم خان نے اس کے بچوں کو ایک روپیا تک نہیں دیا۔

ہمارے والد صاحب کے نورتن دوستوں میں لفٹنٹ مظفر الدین صاحب ہر سر پائیگا کے مہتمم پولیس تھے۔ انھیں ہم سب بھائی چچا کہتے تھے۔ چنانچہ سلیم خان نے اپنے مہتمم چچا کا بڑی طرح پیچھا کیا اور ان کے اثر و رسوخ اور سفارشوں و قرائے ملک پیٹ ریس کورس کے سامنے پائیگاہ آسمان جاہی سے کئی ایکڑ زمین پٹے پر حاصل کی تھی۔ اس زمین پر ایک بہت بڑا باغ اور بنگلا بنایا تھا، جس کا نام "سعادت ولا" ہے۔ ملگیاں وغیرہ بھی بنائی تھیں۔ ایک کوارٹر میں سوسائٹی قائم کی، جس کے ذریعے انہیں کے نام "سلیم جمخانہ" کا کلب وجود میں آیا۔ انھوں نے اپنی پوری زمین سوسائٹی کو اس شرط پر دی کہ زمین کی قیمت مالک زمین سلیم خان کو قسطوں میں دی جائے گی، چنانچہ دو چار سال کے عرصے میں انھیں اس زمین سے [illegible] روپیا ملا، مگر اپنے بڑے بھائی کی طرح سب پیسا اڑا دیا۔ [illegible] زمینوں کا کرایہ بھی قائم کیا تھا، اس کو بھی نہ چلا سکے، وہ بھی ختم ہو گیا۔ زمین کی آمدنی ختم ہو گئی تو اپنا بنگلا و اکثر جہاں آرا کے ہاں رہن کر دیا تھا، اس پیسے سے کچھ عرصے ڈیری فارم قائم کیا تھا، مگر زیادہ نہ چلا۔ اس کام کو بھی نہ چلا سکے۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ ان کے باپ دادا کا تعلق اسلام کے فرقۂ مہدویا سے تھا، چنانچہ سلیم خان بھی مہدوی تھے۔ اپنے دور صدارت میں انہوں نے اپنے ذاتی پیسے سے ایک پرائمری اسکول قائم کیا تھا، جو اب غالباً مڈل اسکول بن گیا ہے۔ انجمن میں کچھ بھی نہیں تھا، اس لیے بعض طلبا کو وظیفے

سلیم خان کی دو بیویاں تھیں، دونوں بھی لڑکیاں خاندان ہی کی تھیں، اور ہیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی، اور وہ صاحب اولاد ہے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی، چنانچہ اس سے بھی ایک لڑکی ہے اور ان کی بیوی ابھی بقید حیات ہے۔ دوسری بیوی سے کئی لڑکے لڑکیاں ہوئیں، مگر سب ہی پیدا ہونے کے بعد مر گئے۔ اس لحاظ سے سلیم خان کے کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے۔ ہم نے اپنے ذکر میں یہ کہنا بھلا دیا کہ ہمیں کوئی لڑکی پسند نہیں آئی، اس لیے ہم شادی بیاہ کے جھگڑے ہی میں نہیں گئے، اور اب اپنی (۲۷) سالا زندگی بالکل تجرد ہی میں گزار دی، چونکہ اب ہماری صحت بہت خراب ہو چکی ہے، اس لیے ہماری زندگی ختم ہو رہی ہے نہ معلوم کس آن، اور کس گھڑی میں نکل ہو جائے!

دربار بوزنی کے "نورتن"

جس طرح شہنشاہ اکبر کے دربار کے "نورتن" بالکل اسی طرح راز دار خان صاحب بوزنی کے چھوٹے سے دربار کے "نورتن" تھے۔ اکبری دربار کے نورتن تو شاہی ملازم تھے، اور حکومت کی طرف سے انہیں تنخواہیں ملا کرتی تھیں، مگر دربار بوزنی کے "نورتن" راز دار خان صاحب کے خاص اور مخلص دوست احباب تھے جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) سید عزیز محمد صاحب عرف پاشاہ میاں (۲) افسر الاطبا حکیم امتیاز الدین (طبی) صدر مہتمم شفا خانۂ طبیہ اور پرنسپل مدرسہ طبیہ سرکار عالی (۳) سید مصطفیٰ صاحب عرف مصطفیٰ میاں (۴) لفٹنٹ مظفر الدین صاحب (۵) معشوق حسین (آگے چل کر معشوق یار جنگ) (۶) منظور حسین (آگے چل کر منظور یار جنگ، دوم تعلقدار

(۸) حکیم حبیب اللہ سدھوری (۹) حکیم شمشاد حسین حیدرآبادی۔

ان کے علاوہ والد صاحب مرحوم کے بہت سارے دوست احباب تھے جو ان کے گھر مستقل طور پر آیا جایا کرتے تھے، لیکن "نورتن" کہلوانے کا حق صرف اوپر گنائے گئے انہیں خاص الخاص نو حضرات کو تھا۔

رازدار خان صاحب بڑے ہی ملنسار، بامروت، فطرت خوش خلق واقع ہوئے تھے، اور آجکل کی ماڈرن اصطلاح میں انہیں سوشل قسم کے "انسان" کہا جا سکتا ہے۔ یہ کبھی بھی تنہا رہنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ جب کبھی وہ گھر پر ہوتے تو ان کے عزیز و اقربا، اور دوست احباب ضرور چلے آتے، اور ان کے ساتھ باتوں اور چائے خوری میں گذارتے، اور کوئی کھانے کے وقت آجاتا تو خدا دیوان خانے میں ایک، دو، تین، جتنے بھی احباب یا ملاقاتی ہوں ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے، اور ان کے کھانے کا مذاق نہایت عالا قسم کا واقع ہوا تھا۔ بہتر سے بہتر پکانے والی مختلف قسم کی ماما کو اپنے گھر میں پکوان کی غرض سے ملازم رکھتے تھے۔ ان کے انتقال کے وقت ایک ماہر فن ماما گھر میں ملازم تھی، جو والد صاحب کے انتقال کے بعد بھی کئی سال تک ہمارے گھر ملازم رہی، جس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کھانے خدا ہم نے بھی کھائے ہیں، جن کا ذائقہ آج تک بھی ہماری زبان پر ہے۔ آج سے (۶۰ - ۷۰) سال پہلے حیدرآباد میں چائے کا رواج بہت کم تھا۔ چند مخصوص گھرانوں اور بڑے جاگیرداروں اور عہدے داروں کے گھروں میں چائے استعمال کی جاتی تھی، اور رازدار خان صاحب کا شمار بھی انہیں مخصوص گھرانوں میں سے تھا، جن کے گھر چائے روزانہ تیار ہوتی تھی، وہ خود پیتے تھے، اور دوسروں کو پلاتے تھے۔

ہمارے [illegible] کے زمانے میں [illegible] طریقہ تھا کہ دودھ کبھی بھی باہر سے نہیں خریدا جاتا تھا، بلکہ ہمیشہ اور ہر وقت ایک عالا نسل کی بھینس گھر پر رہا کرتی تھی۔ گھر پر پرورش لڑکوں کے علاوہ، دو ایک ملازم بھی ہوا کرتے تھے، اس لیے بھینس کی دیکھ بھال، نگرانی، اور باہر چرائی کے لیے لے جانے کا کام ان میں سے کوئی ایک ملازم کر لیتا تھا۔ والد صاحب نے بھی ایک عالا نسل کی اور بہت اچھی نسل کی بھینس خریدی تھی، جو صبح اور شام دو وقت میں تقریباً آٹھ سیر دودھ دیتی تھی، ہمارے گھر میں دودھ کی "نہریں" بہتی تھیں، اس لیے کہ دودھ زیادہ نکلتا تھا، اور خرچ کم تھا۔ اسی لیے ہمارے والد صاحب نے طے کیا تھا کہ صبح کا دودھ گھر کے خرچ میں لایا جائے، اور شام کا دودھ بیچ دیا جائے تو اس طرح پر دودھ کی آمدنی سے بھینس کے دانے چارے کا خرچ نکل آئے گا۔ اتفاق سے گھر والوں میں سے کسی نے یہ خبر والد صاحب کو سنا دی، اور وہ دیوان خانے ہی میں سے بیری طرح گرجتے برستے آئے اور اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، میں نے سنا ہے کہ تم شام کا دودھ بیچ کر بھینس کے دانے چارے کا خرچ نکالنا چاہتی ہو، سنو اور کان کھول کر سنو، گوالی بدنما کا کچھ بالوز ہے، جہاں دودھ بیچا جاتا ہے وہ یہ حیدری خان جمعدار کے بیٹے رازدار خان کا گھر ہے، اور تم اس کو گوالی کا گھر بنانا چاہتی ہو، یاد رکھو اس بدنامی سے پہلے تلوار سے بھینس ہی کا خاتمہ کر دوں گا، تاکہ وہ بھینس رہ سکے اور نہ تم یہ دودھ بیچ سکو۔ احب سے میں نے یہ خبر سنی ہے میرا خون کھول رہا ہے دودھ زیادہ ہے تو دل بڑا کر کے اپنے عزیز اقربا کے گھر بھجوا دو، الگ بھینس بھجوانا چاہتی ہو تو وہی جاگیر اس کا مکا نکالو، اور بازاری کی بجائے گھر کے بنے ہوئے مکھن کا گھی استعمال کرو۔ بہر حال ہمارے والد اسے [illegible] اور ہمارے

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۳۸۴)

جلد (۳۳) نمبر (۴-۵-۶)

اسفندار۔ فروردی۔ اردی بہشت ۱۳۸۴ف

جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۷۳ء

چند اسالانا بارا روپے

ہندستانی ادب

گورنمینٹ نمبر

۹۹۔ اے اعظم پورا شرقی حیدرآباد ۳۶ آندھرا پردیش انڈیا۔

ایڈیٹر جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحا	شکریہ کیساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۳	
۲	شہزادی کا رومان	جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا) بلا مدیر "ہندستانی ادب"	۹	

۳	عروس نو	رؤف پرویز	۲۶	بانو
۴	گورنر میکر جی۔ ام۔ خان	جی۔ ام۔ خان "ام۔ اے (عثمانیہ) ایڈیٹر "ہندستانی ادب"	۲۷	
۵	میں گورنر ہوں	میر اکبر علی خان اکبر	۵۲	
۶	بچی چھپن میلاد شریف میں گئیں	عطیا پروین	۵۳	حریم
۷	راشن کی دکان	رضا نقوی واہی	۵۸	حریم
۸	سرسنگار سمسد کا دسواں آل انڈیا مشاعرہ اس سرنا کام رہا	شمس کنول "ایڈیٹر "گگن"	۵۹	گگن
۹	خوفی بھیڑیئے	پنڈت خوشدل "ایڈیٹر "دیش سیوک"	۶۴	دیش سیوک
۱۰	سنسکرت ہمارا گرانقدر ورثا	ڈاکٹر وی۔ راگھون	۶۵	مرکزی اطلاعات
۱۱	رباعی	ساگر نکودری	۶۸	رہنمائے تعلیم
۱۲	عثمانیا میڈیکل کالج	سید ضیاء الحق	۶۹	سب رس
۱۳	شکوۂ مدرس	حمید قیصر	۷۲	ہندستان
۱۴	رچرڈ ایم نکسن پریذیڈنٹ آف امریکا	رابرٹ۔ ال۔ برکلے	۷۳	یوسیس
۱۵	رباعی	امجد حیدر آبادی	۷۴	بنت حوا
۱۶	اقبال کی فارسی شاعری	جگناتھ آزاد "ام۔ اے	۷۵	مرکزی اطلاعات
۱۷	لفظ گجری کی تحقیق	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی	۷۸	معارف
۱۸	لیٹر	انوار انجم	۸۸	ہیجان پنج
۱۹	کٹی پتنگ	پرویز یداللہ مہدی	۸۹	رہنما
۲۰	کٹی پتنگ	مجروح سلطان پوری	۱۰۰	فلمی گانا کٹی پتنگ

اسفندار فروردی۔ اردی بہشت ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۶۲ء

ہمارے خیالات

گورنمنٹ نمبر

یہ نمبر اسم بامسمیٰ نمبر ہے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ دنیا کے صحافت میں آج تک بھی ایسا نمبر نہیں نکلا۔ یہ نمبر قصداً عمداً یا کسی خاص پلان کے تحت نہیں نکالا گیا ہے، بلکہ اتفاقی طور پر خدا کی وجود میں آگیا ہے۔

ہم دنیا سے انصاف سے اور خصوصاً انصاف پسندوں سے پرزور طریقے پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ انصاف کی عینک لگا کر صداقت اور حقیقت کی روشنی میں ہمارے اس معرکا آرا خطیر یا لیٹر کو دیکھیں کہ آیا اکبر علی خان، محض اور صرف ہمارے ہی لیٹر کی بنا پر اتر پردیش کے گورنر بنائے گئے ہیں یا نہیں ۔۔۔؟ اگر اکبر علی خان ہمارے لیٹر کی بنا پر، اتر پردیش کے گورنر نہیں بنائے گئے ہیں تو ہم راست اکبر علی خان سے اور خدا سے بھی سوال کرتے ہیں کہ اکبر علی خان ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء تک ممبر پارلیمنٹ (راجیا سبھا) کا رہے، اور کس عرصے کے لیے اکبر علی خان، راجیا سبھا کے نائب صدر یا وائس چیرمین بھی رہے۔ اسی وجہ سے اکبر علی خان مسلسل (۱۶) سال کے طویل عرصے تک نئی دہلی میں رہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ممبر پارلیمنٹ (۱۶) سال تک نئی دہلی میں رہنے کے بعد ہر ایک سے اپنے تعلقات بڑھاتا ہے، مرکزی وزراء سے ملتا ہے، اور پرائم منسٹر، نیز پریسیڈنٹ آف انڈیا سے بھی موقع بموقع سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا اکبر علی خان نہرو کے دور میں لگاتار سے تک، اور شاستری کے مختصر سے دور میں، اس کے بعد اندرا گاندھی کے دور میں ۱۹۶۲ء تک نئی دہلی میں رہے۔ صرف وہ نہرو سے نہ مل سکے، لیکن شاستری اور اندرا جی سے تو بار بار ملاقاتیں کی ہیں۔ یہ نہرو سے ملنا چاہتے تھے لیکن خدا نہرو نے انھیں ملاقات کا موقع نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نہرو کو یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ الیکشن سے پہلے طلسم رضوی کے رضا کار انا دور میں، اکبر علی خان کی تمام تر سرگرمیاں رضا کار تحریک سے متعلق تھیں، اس لیے نہرو ایک ایسے شخص کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ ان کے ذہن میں اگر کوئی بات بیٹھ جاتی تو بڑی سے بڑی قوت بھی اس کو دور نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ گاندھی جن کے رشوت کے سلسلے میں بنائے جانے کے بارے میں نہرو سے کہہ دیا گیا تھا جس کی بنا پر انھوں نے اس کا انتساب کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور وہ کئی مرتبہ حیدرآباد آئے لیکن ایک بار بھی گاندھی بھون میں قدم نہیں رکھا۔ بالکل یہی شکل اکبر علی خان کے سلسلے میں بھی ہوئی ہے کہ نہرو نے انھیں ایک بار بھی ملاقات کا موقع نہیں دیا۔

شاستری نہرو کے بنائے ہوئے آدمی تھے، اس لیے انہوں نے نہرو کے جذبات کا احترام کیا، اور اکبر علی خان کو اپنی کابینہ میں نہ لیا، اور نہ کسی ڈپلومیٹک پوسٹ پر بھیجا، نہ کسی ملک کو بھیجا، اور نہ کسی اسسٹنٹ کی گورنری دلائی۔ شاستری کی موت کے بعد اندرا گاندھی پرائم منسٹر آف انڈیا بنیں، مگر انھوں نے بھی اکبر علی خان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اگر وہ خدا سے اکبر علی خان کی طرف توجہ دیتیں تو لازمی طور پر اندرا جی انہیں

بحیثیت پوسٹ منسٹر جنرل آف اسٹیٹ یا کسی کے ڈپٹی منسٹر شامل کی ہوتیں، یا کسی اسٹیٹ کا گورنر بنا دیتیں یا باہر کسی ملک کا سفیر بنا کر بھیج دیتیں، لیکن یہ شوخی ضد تھی ہے کہ مسز اندرا گاندھی نے اکبر علی خان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ اپنے باپ اور شاستری کی طرح، انہیں سراسر نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد مسز گاندھی نے دوبارہ وزارت عظمیٰ کا بار سنبھالا، اپنی نئی کابینہ بنائی، کئی ایک لوگوں کو گورنری کی خدمت دی، اور جنہیں مناسب سمجھا باہر سفیر یا ہائی کمشنر بنا کر بھجوا دیا، مگر اس دفعہ بھی انھوں نے اکبر علی خان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ اکبر علی خان کو انھوں نے بھی بری طرح سے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نوٹ پر ہم ایک حقیقت کا انکشاف کیے دیتے ہیں، وہ یہ کہ خدا سے ہم نے وہ لیٹر اندرا گاندھی کے نام نہیں لکھا تھا، بلکہ یہ اس کرم آپ کو تعجب ہو گا کہ خدا اکبر علی خان نے ہمیں اس بات پر آمادہ کیا۔ وہ اس طرح کہ ہم نے دو نئے انگریزی لفظوں سے متعلق اپنا انگریزی خط بجا اکبر علی خان کے نام بھجوایا تھا۔ اکبر علی خان نے ایک خط کے ذریعے اس کی وصولی کی اطلاع دی تھی، اور ساتھ ہی دو انگریزی لفظ دینے جانے کے بارے میں ہماری "ذہانت طبع" کی تعریف بھی کی تھی، اور واقعی بہت اچھے الفاظ میں ہمارے کام کو سراہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ زیر تکمیل "ہندستانی ادب" کا نمبر تیار ہونے کے بعد ان کے گھر "اسٹوڈنٹ ہاؤس" جا کر ہم ان کا شکریہ ادا کریں گے۔ ۱۹۷۲ء میں اکبر علی خان کی راجیہ سبھا کی ممبری کی مدت ختم ہو چکی تھی، اس لیے وہ حیدرآباد اپنے گھر آ گئے تھے۔ اس نوٹ پر وہ کام ہی کر سکتے تھے، اس لیے مکھیاں مارتے ہوئے گھر ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا آزاد اور نیشنل رسرچ انسٹی ٹیوٹ اور میموریل کے وہ میمبر ہیں۔ کمیٹیوں کے میٹنگ جاتے آتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اور خاص روزگار کی کوئی بھی مصروفیت نہیں تھی۔ اس لیے وہ اپنا وقت [illegible]

ہم نے انھیں کالموں میں کئی مرتبہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ہم دلی، بمبئی، مدراس اور حیدرآباد کے انگریزی اخبارات روزانہ بلاناغہ دیکھا کرتے ہیں۔ اس طرح سے دنیا کے ہم تمام حالات سے باخبر رہتے ہیں، اور خصوصت کے ساتھ ہندستان اور ہندستان کی ریاستوں نیز مرکزی حکومت ہندستان کے حالات اور واقعات سے بھی واقف رہتے ہیں۔ کچھ عرصے سے نئی دلی کے اخباروں میں یہ خبر دیکھتے چلے آ رہے تھے کہ کئی اسٹیٹس کے گورنر اپنی خدمت سے الگ ہونے والے ہیں، اس لیے اندرا گاندھی نئی اہم شخصیتوں کی تلاشی میں ہیں، تاکہ ان گورنروں کے الگ ہوتے ہی وہ جگہیں پر کر دی جائیں۔ ایسے گورنروں کی کمی یا GOVERNOR CRISIS کے دور میں، ہم نے ایک خبر یہ بھی دیکھی کہ بی۔ گوپال ریڈی، آندھرا پردیش اتر پردیش کی گورنری سے سبکدوش ہونے والے ہیں، اور کچھ عرصا بعد یہ خبر آئی کہ وہ سبکدوش ہو چکے ہیں، اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے عارضی طور پر، اتر پردیش کی گورنری کا چارج لیا ہے، اور کسی مناسب شخصیت کے ملنے کے بعد وہ آپنی اپنی اصلی خدمت پر واپس چلے جائیں گے۔ اس وقت ہمارا دماغ کام کر گیا۔ ہم نے کہا کہ آزادی کے بعد اتر پردیش کی پہلی گورنر مسز سروجنی نائیڈو حیدرآبادی بنائی گئی تھیں۔ اس کے بعد دوسرے گورنر شری کرشنا راؤ حیدرآبادی بنے، ان کے بعد تیسرے گورنر بی گوپال ریڈی آندھرا پردیشی اور حیدرآبادی بنے، اس لیے ہم نے کہا کہ اس وقت اتر پردیش کا جو تھا گورنر بھی حیدرآبادی بنا چاہیے، اور وہ ہو سکتے ہیں صرف اکبر علی خان حیدرآبادی، جو اس وقت اپنے گھر میں تسبیح کے منکے ڈھالتے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ ہم نے قلم اٹھایا اور لکھ رہے جانے بنام جی۔ ایم۔ کہتے ہی ہمارا قلم حرکت میں آ گیا، اور دو ملک پیٹ (حیدرآباد) ریسکورس میں اول آنے والے گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑ لگا۔ اتنا دوڑا۔ اتنا دوڑا۔ اتنا دوڑا کہ آخر اول آ ہی گیا، اور ریس جیت کر رہا۔ لغو مطلب یہ ہے کہ اتنا لکھا اتنا

لکھا۔ کرہات کے لکھے ہوئے کئی صفحے کالے کر ڈالے، جو ٹائپ کے بارا (۱۲) صفحوں کے برابر تھے۔ اس خط کا نظر ثانی کی اور جو لفظ چھوٹ گئے تھے، اور ضروری ترمیم وغیرہ بھی کر دی۔ آنے والے صفحوں میں اس کا پورا پورا اثر جما دیا گیا ہے۔ آپ خود ہی پڑھ کر دیکھئے کہ اکبر علی خان کو بڑا بنانے اور ان کی مدح و ستائش میں ہم نے کونسی کسر اٹھا رکھی ہے۔ اکبر علی خان کے حالات و واقعات لکھ کر ہم نے مسز اندرا گاندھی پرائم منسٹر آف انڈیا کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اکبر علی خان حیدرآبادی کو اس قابل سمجھیں کہ وہ گورنر بنائے جانے کے مستحق ہیں۔ نہ جانے وہ قابل ہو گئیں، انھیں کسی بھی ایک اسٹیٹ کا گورنر بنا سکتی تھیں، مگر جو نکتے ہم نے اپنے لیٹر نمبر (778) میں اس بات پر زور دیا تھا کہ اینڈ اتر پردیش کے تین گورنر حیدرآبادی ہو چکے ہیں، اس لیے روایت یا TRADITION کا تقاضا یہ ہے کہ اتر پردیش کی خالی سٹاگورنری کی جگہ پر جو تھا گورنر بھی لازمی طور پر ایک حیدرآبادی ہی ہونا چاہیے۔ اور وہ حیدرآبادی اس اہم خدمت کے قابل سوائے اکبر علی خان کے دوسرا نہیں ہو سکتا! اکبر علی خان کے کیس کو قوی تر مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے ہم نے ہیم جال چلی کہ سملا سمٹ SIMLA SUMMIT کے سلسلے میں ایک اندرا لیٹر لکھ مارا، اور اس کی کامیابی پر پرائم منسٹر اور بھٹو دونوں کو مبارک باد دی، دونوں کی بھی تعریف کی، مگر اندرا گاندھی کی تعریف میں واقعی قلم ہی توڑ دیا۔ اس لیٹر کو بھی ٹائپ کروایا، اور اس کا لیٹر نمبر (777) قرار دیا، اور اکبر علی خان کے پہلے لکھے ہوئے لیٹر کو نمبر (778) قرار دیا، اور یہ ضروری تھا، اس لیے کہ پرائم منسٹر کی مبارک باد زیادہ اہمیت رکھتی ہے، نہ کہ اکبر علی خان کی گورنری۔ مبارک باد کا لیٹر (۲) صفحے کا تھا، اور اکبر علی خان کا (۱۲) صفحے کا۔ ان دونوں لیٹروں کو ہندستانی ادب" کے انگریزی میں چھپے ہوئے نوٹ کے ساتھ یہ ٹائپ کروایا تھا۔ ٹائپ ڈبل اسپیس میں تھا، اور دونوں لیٹروں میں ایک بھی غلطی نہیں تھی۔ ان دونوں لیٹروں کی ایک ایک کاپی نکلوائی گئی جو ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ان دونوں لیٹروں کو ایک الگ کلپ کیا، اور نتھی کر کے ایک بڑے سائز کے عالا در بتے کے لفافے میں رکھ چھوڑا۔ اس کو بند کر کے پرائم منسٹر کے نام رجسٹری کر دی۔ اس رجسٹری پر تین روپے نوے پیسے یا دوسرے معنی میں چار روپے خرچ ہوئے تھے، اور ٹائپ کروانے میں تقریباً دس گیارہ روپے، اس طرح تیرہ چودہ پندرہ روپے کا خرچ بیٹھا تھا۔ نیز سب کچھ ہم نے کیوں کیا۔ محض اکبر علی خان کے کیس کو کامیاب بنانے کے لیے، ورنہ ہمیں اس سے کیا حاصل ہونا تھا۔ شروع ہی سے ہماری عادت نہیں رہی ہے کہ ہم پرائم منسٹر و غیرہ کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دیں۔ محض اکبر علی خان کے کیس کو تقویت دینے کے لیے ہم نے "سملا سمٹ" کی کامیاب اور مبارک باد دیتے ہوئے، پرائم منسٹر کی کھل کر تعریف کی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ "سملا سمٹ" کی کامیابی پر پرائم منسٹر کے نام نہ صرف ہندستان سے، بلکہ ساری دنیا سے ہزاروں ہی لیٹر دس آئے ہوں گے، مگر ہمارا یہ چیلنج ہے کہ ان میں سے ایک بھی لیٹر ہمارے لیٹر سے ٹکر نہیں لے سکتا۔ ہم پوری قوت کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارا لیٹر "چینے دیگر است" کے مصداق ہے۔ انشاء اللہ ہے کہ انگریزی متن کو ہم یہاں پیش کرنے سے قاصر ہیں، مگر ان دونوں لیٹروں اور دوسرے کئی ایک کا میابل انگریزی لیٹروں کو ہمارے دفتر آن کر دیکھنے کی ہر شخص کو اجازت ہے!

فقط یہ کہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۲ء کو ہم نے مسز اندرا گاندھی کے نام یہ رجسٹری بھجوائی تھی، جس کی وصولی کی رسید ان کے پیش کار نے انگریزی میں بھجوائی۔

یہ تو لازمی بات ہے کہ ایسے نفیس ٹائپ کیے ہوئے دونوں لیٹروں کو پرائم منسٹر نے دیکھا ہوگا، اور خصوصاً اکبر علی خان کے لیٹر کو، اس لیے کہ اتر پردیش کے لیے ایک مسلم گورنر کا مسئلہ ان کے سامنے پیش تھا، اور ہم نے اکبر علی خان کو ہر اس اور کیا بھی لکھ کر اس کا آسان حل پیش کر دیا تھا، چنانچہ پرائم منسٹر نے اس بارے میں اپنے ساتھیوں اور دوسرے متعلقہ حضرات سے ضرور مشورہ کیا ہوگا، اور سبھوں نے ہماری تجویز کی تائید کی ہوگی۔ ایسے میں پورے تین مہینے گزر گئے، اور چھ مہینے، یعنی اگست ستمبر کے اواخر میں پرائم منسٹر نے اکبر علی خان کو نئی دہلی بلوایا۔

نہ معلوم کیا بات چیت رہی، بہرحال ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء کے انگریزی اخباروں میں ہم نے یہ خبر دیکھی کہ ــــ اکبر علی خان کو پرائیم منسٹر نے اتر پردیش کا گورنر بنایا ہے ــــ ہمارے دل نے للکارا کہ پرائیم منسٹر نے کہاں بنایا ہے ــــ وہ تو جی۔ ایم۔ خان، ایم۔ اے (عثمانیا)، ایڈیٹر "ہندستانی ادب" نے اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنایا ہے، پرائیم منسٹر نے، جی۔ ایم۔ خان کے لیٹر نمبر (778)، مورخہ ۷ نومبر ۱۹۷۲ء کی روشنی میں، پریسیڈنٹ آف انڈیا سے اکبر علی خان کے اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی سفارش کی ہے۔ اگر وہ واقعی چاہتے کہ اکبر علی خان کو گورنر بنانا چاہیں تو اپنی پرائیم منسٹری کے چار پانچ سالہ دور میں کسی وقت بھی بنا سکتی تھیں، مگر جو کچھ وہ اکبر علی خان کے حالات اور واقعات سے پورے طور پر واقف نہ تھیں، اس لیے انھوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کے باپ جواہر لال نہرو، اکبر علی خان سے ناراض تھے، اور شاستری جی بھی اکبر علی خان کے خلاف تھے، اس لیے انھوں نے اکبر علی خان کو کوئی اہم اور ذمے دارانہ خدمت دینے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا، مگر جب جی۔ ایم۔ خان نے اپنے (۱۲) صفحے کے میمورنڈم اور جاں دار لیٹر نمبر (778) کے ذریعے پرائیم منسٹر کو CONVINCED کر دیا کہ اکبر علی خان حیدرآبادی مسلمانوں کے قابل اور لائق شخص ہیں، جن کی ہمہ جہتی صلاحیتوں سے وہ اس وقت تک ناواقف تھیں، اور چونکہ اتر پردیش کے لیے ایک قابل اور لائق گورنر کی فوری ضرورت تھی، اس لیے انھوں نے جی۔ ایم۔ خان کے اندر کرائے گئے لیٹر کی روشنی میں، اتر پردیش کی گورنری کے لیے پریسیڈنٹ آف انڈیا سے اکبر علی خان کے نام کی سفارش کی، جس کو پریسیڈنٹ نے شرف منظوری بخشا، چنانچہ یہ خبر ایک ساتھ گورنمنٹ گزٹ اور اخباروں میں بھی شائع ہوئی، جس کا علم جی علم خان کو اسی روز ہو گیا، اور جی۔ ایم۔ خان اسی بات کا منتظر تھا کہ اکبر علی خان، شری دی سے واپس آنے کے بعد اپنے "محسن اعظم" جی۔ ایم۔ خان کے نام شکریے کا ایک دس پیسے کا پوسٹ کارڈ ضرور لکھیں گے!

اب آیئے ہماری بھی داستان سن لیجیے! ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اکبر علی خان نے ایک خط کے ذریعے ہماری "ذہانت طبع" کی خوب تعریف کی تھی، اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہم ان کے گھر جانا چاہتے تھے۔ ایسے میں ہم نے اکبر علی خان کی گورنری کا لیٹر پرائیم منسٹر کی سفارش کے ساتھ دیکھا، اس لیے اکبر علی خان کے گھر جاتے ہوئے اس لیٹر کی ایک کاپی ساتھ رکھ لی۔ ہم جب اپنے مکان گئے ہیں تو وہ تنہا اپنے دفتر وکالت کی ایک کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ ہمارے پیروں کی آہٹ سے وہ چونک پڑے "اور کون ہے کا نعرہ لگایا" اور ایسے میں ہم اندر داخل ہو گئے۔ انھوں نے ہمیں دیکھا، ہم دونوں نے، اور خیر خیریت کے بعد کہنے لگے "بہت روز بعد آئے میاں آپ نے" ہم نے کہا جی ہاں صاحب! کیا بتائیں کہ محنت کا ناس ہو گیا ہے، ہمیں دق ہو گئی ہے، آتش کے لیے ہم کہیں بھی جاتے آتے نہیں ہیں، صرف رسالے کے کام سے باہر جاتے ہیں۔ خیر تفصیلی باتیں رہیں، اور پھر اسی سے انھوں نے دو ایک انگریزی لفظوں کے سلسلے میں ہماری "ذہانت طبع" کی جس کا ہم نے دلی شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ہم نے اسی لیٹر کی ٹائپ کی کاپی انھیں دی، جس کو بات میں لیتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ کیا ہے میاں" ہم نے کہا ملاحظہ فرمایئے، سب کے آپ پر واضح ہو جائے گا۔ لیجیے میں دو اور صاحب آ گئے۔ ہم ان سے باتیں کرتے رہے، اور اکبر علی خان ہمارا لیٹر پڑھتے رہے۔ لیٹر پڑھنے کے بعد ان کا چہرا غصے سے سرخ ہو گیا، انھوں نے اپنی بھنوؤں پر شکنیں ڈالتے ہوئے غصے کی حالت میں وہ لیٹر ہماری طرف اٹھا کر پھینکا، جو ہمیں تو نہیں ہم پر گرا، اور اسی غصے کی حالت میں اکبر علی خان نے ہم سے مخاطب ہو کے اور کہا "کیا ہوتا ہے میاں ایسے لیٹر ان بھیجنے سے۔ کیا وہ مجھکو نہیں جانتے۔ کیا اس کا باپ مجھکو نہیں جانتا تھا۔ کیا شاستری جی مجھکو نہیں جانتے تھے۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۲ء تک میں راجیہ سبھا کے ممبر کی حیثیت سے دہلی میں رہا، میاں! اگر وہ لوگ میرے ساتھ کام کرنا چاہتے تو بھوت سلام کرتے" پھر آخر میں اسی موٹی اور غصے کی حالت میں آخری مارے ارشاد یہ ہوا ــــ "ہونے والے الاعلم گورنر بہادر کو وہ سکا تھا میاں یہ لیٹر آپ نے ــــ میں تو اس کو فضول سمجھتا ہوں" اور فوراً فراٹے کی میاں اگر نے ہم سے کہا صاحب! آپ ہمارے تیئں اور

صفحوں کی صحت کر لیجیے

پچھلے نمبر یعنی "راز دار خان نوروزی نمبر" بابت اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۲ء کے ملے جلے نمبر کے پہلے جزو (۱ تا ۵۰) میں پریس نے بعض صفحے غلط جوڑ دیے تھے۔ صفحہ ایک تا صفحہ ۱۶ برابر جوڑے گئے ہیں۔ ۶ کے بعد ۷ نہیں، بلکہ صفحہ ۱۱ جوڑ دیا گیا ہے۔ ۱۱ کے پیچھے صفحہ ۸ جوڑ دیا گیا ہے، اس کے بعد ۹ اور ۱۰ برابر ہیں۔ ۱۰ کے بعد صفحہ ۷ جوڑا گیا ہے، اور ۷ کے پیچھے صفحہ ۱۲ جوڑا گیا ہے، اس کے بعد تو سلسلہ برابر ہے۔

[illegible] پہلے "صبح امید" بمبئی میں بھی بالکل مفلس پیدا ہو گئی تھی، جس کا علم ایڈیٹر کو رسالہ چھپنے کے بعد ہوا، چنانچہ دوسرے ہی نمبر میں انہوں نے "تصحیح کر لیجیے" کے تحت فلاں جز میں یہ یہ صفحے غلط جوڑ دیے گئے تھے۔ بے چارا ایڈیٹر سوائے معذرت کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ بلکل یہی صورت "ہندستانی ادب" کے پچھلے نمبر کی رہی۔ پہلا جزو (۱ تا ۱۶) چھپنے کے بعد ہمیں پریس کی اس یادگار غلطی کا علم ہوا۔ ہم نے اسی وقت پریس کو قرعہ دلائی، لیکن مالک پریس بیماری کے سبب گھر پر تھے۔ ان کے دونوں چھوٹے نواسے ہمارے ساتھ بیٹھ کر ہی سے بیٹھتے آئے، اور چند ہی دن کے ساتھ [illegible] مشہور [illegible] یا موجود [illegible] کی زبان میں باتیں کرنے لگے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے ذہین [illegible] سلوک کے باوجود ہم کچھ نہ کر سکے، اور جلد ہی [illegible] باوجود ہم کچھ نہ کر سکے، اور جلد ہی [illegible] باوجود [illegible] خاص الخاص نمبر [illegible] ہم نے بھی نہیں [illegible] بلکہ خود ان کے گھر جا جا کر [illegible] کر دیا، اور اب آپ کو صحیح صورت حال سے واقف کرا رہے ہیں۔ اسی پریس نے [illegible] یہ کہ "راز دار خان نوروزی نمبر" کی چھپائی کے سلسلے میں ہم نے چار ریم اور پینتیس پیسے (۲۶) کے حساب سے ۳۶ روپے فی ریم علاوہ ٹیکس خرید کر دیا تھا، پریس نے ہمارا خریدا ہوا صرف ۲ ریم کاغذ استعمال کیا، اور باقی ۲ ریم کاغذ سرپلس بحساب (۳۰) روپے فی ریم بازار سے خرید کر ٹھکانے پر [illegible] چھاپ دیا۔ پورا نمبر چھپنے کے بعد ہم نے انہی ذہین لونڈوں کو سرپلس پیپر چھپے فارم بھی دکھائے کہ اور اور پیپر

بڑے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ مرکز نے آپ کے ساتھ آج تک کسی بھی قسم کا سلوک نہیں کیا ہے، اس لیے پرائم منسٹر کو آپ کے پورے پورے حالات سے واقف کرانے کے لیے یہ سب زحمت مول لی، ورنہ خدا جانے ہماری ذات کو اس سے کیا حاصل ہو سکتا ہے، چونکہ اور دو حضرات آ گئے تھے، اس لیے ہم نے اجازت چاہی، وہ اٹھ کر ملے، اور آداب تحالا کے ہوئے ہم رخصت ہوئے اور اپنے گھر آ گئے، مگر اس کا ہمیں ہرگز ہرگز افسوس نہیں ہوا کہ وہ نیٹر ہم نے کیوں لکھا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم حق بجانب ہیں، چنانچہ ہمارے حق بجانب ہونے کا نتیجہ ظاہر ہے، اور ہمارے اس ٹھکرائے ہوئے اور معتوب نظر لیٹر کے طفیل اکبر علی خان اتر پردیش کے گورنر بنے بیٹھے ہیں، مگر ایسے احسان فراموش ثابت ہوئے اکبر علی خان کہ نہ اس — ہیں سے آسی صفحے کے باوجود، یعنی اپنی امید اور توقع کے خلاف، محض جی۔ ایم۔ خان کے ایڈیٹر کی بنا پر اتر پردیش کا گورنر بنا دیے جانے کے باوجود انھوں نے ہمیں ملیٹ کر تک نہیں دیکھا، اور نہ (۲۵) پیسے کا لفافا ہی لکھا، اور انتہا یہ کہ دس پیسے کا ایک ادنا سا پوسٹ کارڈ تک لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اب خود آپ ہی انصاف کی نظر سے بتائیے کہ اکبر علی خان، موجودہ گورنر اتر پردیش سے بھی اور کوئی عزیز دوسرا شخص "احسان فراموش" ہو سکتا ہے یا نہیں — نہیں — نہیں — ہرگز نہیں، بلکہ یہ اکبر علی خان ہی — دنیا کا سب سے بڑا "احسان فراموش" شخص ہے۔!

"احسان فراموش" اکبر علی خان نے یہ خیال کیا ہوگا کہ یہ سچ ہے کہ جی ایم خان کے لیٹر نے (۲۷۳) سو روپے کے رجلائی [illegible] کی جاگیر اتر پردیش کے گورنر تو نہیں [illegible] اور اکبر علی صورت کیا ہے؟ لوگ جرق در جرق ہمیں مبارک باد دیے چلے جا رہے ہیں، پھولوں کے ہار بھی پہنا رہے ہیں اور میوے مٹھائی کے تحفے بھی لا کر دے رہے ہیں، ہمیں ان خشک لیڈروں کا شکریہ ادا کرنے سے فرصت نہیں تو ایک گمنام شخص جی۔ ایم۔ خان کا شکریہ ادا کرنے میں کون وقت ضائع کرے گا۔ "احسان فراموش" اکبر علی خان نے اس حقیقت کو جھٹلا دیا تھا کہ جی۔ ایم۔ خان ایک صفحے کا ایڈیٹر ہے اور اس کا "وہ صفحہ" ہندستانی ادب تھا، جس کے ایک ہی سے کر ایک سو صفحے تک [illegible] علی خان جیسے مکار، فریبی، دھوکا باز، [illegible]

پیمبر کے فارموں سے ان کا مقابلہ کرکے دکھایا کہ دونوں کاغذ میں کتنا نمایاں فرق ہے، اور تم نے ہمارے اوریجنل کاغذ کی چوری کی ہے، جو اخلاقی اور قانونی حیثیت سے بڑا جرم ہے، مگر لونڈوں نے سائیتے نے حیا اور بے شرم واقع ہوئے ہیں کہ انہوں نے صاف طور پر کہدیا کہ تم غلطی پر ہو، اور پورے نمبر کا کاغذ اوریجنل ہی ہے۔ انہی منظالم کے باعث ہم نے اس پریس کو چھوڑ دیا ہے، اور یہ نمبر ایک دوسرے پریس میں چھپوایا ہے!

معاصروں سے گلا شکوا

ہم نے "راز دار خان نوروزی نمبر" معاصروں کے ہاں تبصرے کی غرض سے بھجوایا تھا، مگر کسی بھی معاصر نے اس پر تبصرہ نہیں کیا۔ ہم حیران ہیں کہ آخر اس نمبر کے ساتھ ایسا "معاندانا" سلوک کیوں روا رکھا گیا، حالانکہ یہ نمبر صرف خاص نمبر ہی نہ تھا، بلکہ "خاص الخاص" نمبر تھا، اس لئے کہ اس نمبر کے پورے ایک سو صفحے صرف ایڈیٹر کے قلم کے مرہون منت تھے۔ ہم اپنے معاصروں کو کھلا چیلنج دیتے ہوئے، اور ان سے پوچھتے ہیں کہ آیا دنیائے صحافت میں آیا وہ کسی ایسے خاص نمبر کی نشاندہی کر سکتے ہیں کہ ایک سو صفحے یا اس سے بھی زیادہ صفحوں کا پورا نمبر ایک سے آخری صفحے تک کسی بھی ایڈیٹر کے قلم کا شاہکار رہا ہو؟

جب یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ واقعی اور حقیقت میں ایسا کوئی بھی نمبر نہیں ہے، جس میں سو صفحے ایک سے ایک سو تک صرف ایڈیٹر ہی کا قلم چلا ہو، سوائے "ہندستانی ادب" کے "راز دار خان نوروزی نمبر" کے، تو آخر آپ نے ہمارے اس خاص نمبر میں کونسی کمی پائی، جس کی وجہ سے آپ نے اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا، اور سنتقاد اور تبصرے کے قطعے "قابل نہیں سمجھا"، حالانکہ ہم آئے دن دیکھتے رہتے ہیں کہ آپ اپنے اپنے رسالے وغیرہ میں ایسی لچر پوچ تخلیقات پر تنقید اور تبصرے کرتے رہتے ہیں، جو ہرگز ہرگز تبصرے کے قابل چیزیں نہیں ہوتیں۔ ایسی شکل میں "ہندستانی ادب" جیسے ایک معیار کا آرٹ، لاجواب، بے نظیر اور بے مثال "خاص الخاص" نمبر پر تبصرہ نہ کرنا آیا معاندانا چشمک اور تنگ نظری پر محمول ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ "ہندستانی ادب" کے معیار اور فکر کا کوئی دوسرا ڈائجسٹ یا میگزین رسالہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "ہندستانی ادب" کا اپنا بڑا یا اور لاجواب معیار دوسرے رسالوں کا مرہون ہے، لیکن ایسے تھیٹ اور معیاری مضامین کا انتخاب کرنا کسی دوسرے کے بس کا روگ نہیں، وہ تو صرف "ہندستانی ادب" کے ایڈیٹر کی دماغی اختراعیوں پر منحصر ہے کہ ہر ایک رسالے کے ایک ایک جوہر منتخب کرکے "ہندستانی ادب" کے ہر نمبر کو قابل رشک جواہرات کے علمی ادبی گلدستے" کی شکل میں پیش کرتا ہے، اور اس بات کا دعوا کرتا ہے کہ دوسرا کوئی ایسا معیاری علمی، ادبی نمبر پیش کر دے!

"گورنر میکر نمبر" پر تبصرہ ضرور کیجئے

آخر میں آپ سے ہماری یہ عرض ہے کہ اس معرکۃ الآرا "یادگار" نمبر پر آپ تنقید اور تبصرہ ضرور کیجئے، اس لیے کہ یہ نمبر حقیقت میں اپنی نوعیت کا پہلا اور اچھوتی قسم کا نمبر ہے۔ ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کس ایڈیٹر نے کسی بھی شخص کو گورنر بنانے میں اپنے آرگن یا رسالے کے ذریعے ہاتھ بٹایا تھا۔ خدا ہمارے لئے بھی یہ شکل اتفاقی طور پر پیدا ہو گئی۔ اکبر علی خان موجودہ اتر پردیش کے گورنر کا، ہمارے دو نئے انگریزی لفظ انگریزی زبان کو دیے جانے کے سلسلے میں، ہماری "ذہانت طبع"، تعریف کرنا، اور ہمیں یہ خیال پیدا ہونا کہ ہم اپنے سینئر اور عثمانی برادری کے بڑے بھائی کا شکریہ ادا کرنے ضرور جائیں گے، اور اتفاقی طور پر اسی زمانے میں، کئی ایک اسٹیٹس کے گورنروں، خصوصی اتر پردیش کے گورنر کی فوری تقرری کا مسلہ پیش آنا، اور ہمارا دماغ لڑانا کہ چونکہ ہم اکبر علی خان کو بہتر سے بہتر طریقے جانتے ہیں، اس لیے ایک معرکۃ الآرا البم لکھ کر پریسیڈنٹ مسٹر کو یقین کامل دلایا جائے کہ اتر پردیش کی گورنری کے لئے اس وقت سارے ملک میں اکبر علی خان سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے، اور اس کیٹر کی اہمیت بڑھانے کے لیے ہمارا پریسیڈنٹ مسٹر کے نام "تھلاسٹ" کی کامیابی پر انھیں مبارک باد دینا، کا دوسرا معرکۃ الآرا البم لکھنا، جس کے نتیجے کے طور پر پریسیڈنٹ مسٹر نے اتر پردیش کی گورنری کے لیے اکبر علی خان کے نام کی پریسیڈنٹ آف انڈیا سے سفارش کی، اور محض ہمارے قلم کے زور پر اکبر علی خان اتر پردیش کے گورنر بن بیٹھے!

جی۔آرنلڈ فرنانڈز ترجما جی۔ام خان، ام اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ھندستانی ادب"

شہزادی کا رومان

رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA

دوسری قسط

باب (۵)

گوشا محل کنٹارو ڈ پر چند معمولی قسم کی دکانوں کی لائینس میں فراز علی عامل اور رمال کی بھی ایک پرانی اور پوسیدا قسم کی ملکی تھی۔ فراز علی کی عمر (۶۰-۶۵) کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا رنگ سانولا تھا، اور چہرے پر داڑھی مونچھ گھنی تھی۔ اس کا جسم نہ زیادہ دبلا تھا، اور نہ زیادہ موٹا، بلکے بھرا بھرا تھا۔ اس کے چہرے پر رعب داب تھا۔ اور اس کی آواز بھی گرجدار تھی۔ اس کی ملکی میں ایک پرانی [illegible] اس کے سامنے ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی تھی، جس پر فراز علی عامل بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے مقابل دو تین پرانی کرسیاں اور کمرے کی دیواروں سے لگے دو عدد بنچ بھی پڑے ہوئے تھے، تاکہ جو اہل غرض آئیں ان پر بیٹھ سکیں۔ اس کے کمرے میں ہر وقت عود اور اگر بتیاں جلتی رہتی تھیں، اور رات کے وقت ایک پرانے قسم کے چراغ سے وہ کام لیتا تھا۔ فراز علی حقے کا بڑا ہی شوقین تھا، چنانچہ ہر وقت حقا جالو حالت میں اس کی اپنی کرسی کے قریب دھرا رہتا تھا، اور وہ وقفے وقفے سے حقے کا کش پر کش لیتا تھا، اور اسی حالت میں اہل غرض سے باتیں بھی کرتا تھا۔ وہ حقہ میں تمباکو سے بہتر گوڑاکو استعمال کرتا تھا، جس کی خوشبو سارے کمرے میں مہک جاتی تھی۔

سارے شہر حیدرآباد میں بحیثیت ایک تاجر اور کامیاب عامل فراز علی کی بہت زیادہ شہرت تھی۔ بہت سے لوگوں سے پیسے بھی نہیں لیتا تھا۔ اس لیے کہ بڑے بڑے جاگیردار، منصدار، تاجر پیشا اور دوسرے مالدار لوگ مالی حیثیت سے فراز علی کی بہت مدد کرتے تھے۔ وہ سارے شہر میں ایک بڑے نام سے مشہور تھا، اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ملکی کے پیچھے جو اس کے رہنے کا مکان تھا، اس کے بعض بند کمروں میں ایک ایک ہزار روپے کی سو دو سو تھیلیوں میں سونے کی اشرفیاں بھری پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ اسونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے بیش قیمت زیورات بھی موجود تھے۔ فراز علی کی بیوی اور جوان جوان لڑکے اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ اس کی بیوی خدیجی بیگم تھی، جو عزیزوں کے ساتھ ضروری سلوک و لوک کرتی تھی۔ عام طور پر یہ عامل لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے ہیں، لیکن فراز علی عربی اور فارسی کا ماہر اور رمالی ہوا پڑھا لکھا شخص تھا۔ جس نے اپنی علمیت کے بل بوتے پر اپنے پیشے عمل و رمل کو چار چاند لگا دیے تھے۔ فراز علی قرآن کا بہت زیادہ مطالعہ کرتا تھا، اور رمل سے بھی اس کو کافی واقفیت تھی، اسی لیے انگریزی زمانہ بھی جانتا تھا۔ دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ فراز علی کھانے کا بھی شوقین تھا، چنانچہ وہ اور اس کی بیوی بچے اچھی سے اچھی مرغن غذائیں کھایا کرتے تھے۔ ایک روز رات کے کھانے سے فارغ ہو کر فراز علی اپنے کمرے میں حقہ پیتے بیٹھا تھا، ایسے میں ایک مرد اور دو عورتیں داخل ہوئیں۔ اس نے آداب کرنے کے بعد مرد سامنے کی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا، اور عورتیں دیوار سے ٹیک لگا کر نیچے جا بیٹھیں۔ یہ شخص جو مرد تھا عورت تھا جو رحیم النسا کے ہاں ایک بیاہی کی حیثیت سے بیچ گیا تھا۔ اور وہ دونوں عورتیں رحیم النسا کی دونوں ماما جی تھیں۔ فراز علی نے جس کے آنے کا مقصد دریافت کیا تو اس مرد نے جس کا نام خاب کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔ فراز علی ساری داستان چپکے سے سنتا رہا، اور حقے کے کش پر کش بھی لیتا رہا۔ تھوڑی میں جب ضرورت دونوں ماما جی نے کچھ تفصیل خود بھی بیان کی، اور فراز علی ان کے بیان کو بھی بغور سنتا رہا۔

جب ساری داستان ختم ہوئی تو فراز علی نے ان تینوں سے مخاطب ہو کر کہا ختم ہو گئی ساری داستان، اور کچھ باقی ہے؟ اس پر ان تینوں نے ایک آواز ہو کر کہا نہیں صاحب! اور کچھ بھی نہیں، بلکہ یہی سب کچھ داستان ہے جو ہم تینوں نے آپ کو کہہ سنائی۔

حقے کا ایک لمبا اور زوردار کش لیتے ہوئے فراز علی نے نیچا حقے کے اطراف رکھ دیا، اور ان تینوں سے مخاطب ہو کر کہا، جناب تو بڑا ہی دلچسپ اور معنی خیز ہے، سچ تو یہ ہے کہ اس پر مغز اور جاندار خاب کی تعبیر اسی وقت بیان نہیں کی جا سکتی، بلکہ اس کے بیان کرنے کے لیے سوچ و فکر چاہیے، تاکہ اس کے تمام عقدے حل کر لیے جائیں۔ خیر جو تم تینوں نے نواب آسمان جاہ بہادر کی صاحبزادی رحیم النسا کا واسطہ دیا ہے، اس لیے میں ابھی خاب کی تعبیر معلوم کرتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے میز پر رکھی ہوئی کتابوں میں سے فراز کی ایک کتاب نکالی، اس کے بعد خاب کی کتاب سے متعلق دو عدد کنڈلیاں بنائیں اور ان کو سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے ملانے لگا۔ کچھ دیر تک یہ کام کرتا رہا اور کنڈلیاں میز پر رکھ دیں، اور پھر ایک خاص قسم کی کتاب کھول کر خاب کی عبارت پڑھنے لگا۔ اس کے بعد ان تینوں سے بیان کی کہ ستو اصاحبزادی کا یہ سارا خاب کی تعبیر یہ ہے کہ خاب میں جس مرد نے صاحبزادی سے بیاہ کیا ہے وہ بالکل سچ مچ ہے، اور اس کا بیان صاحبزادی کے حق میں مفید ثابت ہوگا، اور سرخ بوش نے جو سرخ کپڑا، وہ صاحبزادی کی زندگی کے دریچے آزار ہے، یعنی وہ دونوں مجھے اصل میں صاحبزادی کی موت، اور حیات کی کشمکش میں تھے۔ اگر پھر سے وہ دونوں مجھے اس کے خاب میں آئیں تو صاحبزادی کو چاہیے کہ سرخ بوش کی مذمت ہی مذمت کرے، اور کسی طرح اس کی طرف اپنا رجحان ظاہر نہ کرے، یہ بھی اس کو چاہیے کہ سفید بوش مجھے کا تائید

کرے، جس سے اس کی آئندہ زندگی استوار ہوگی" اور ہر طرح سے زندگی سنور جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے فراز نے میز پر رکھے ہوئے لیموؤں میں سے ایک لیموں اور زور زور سے کئی منتر پڑھا اور اس پر پھونکا اور چاقو سے اس کے چار ٹکڑے کر کے کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ وہ تینوں آدمی بھی کھڑے ہوئے، چنانچہ فراز علی نے کہا کہ ابھی ابھی تم تینوں کے روبرو اس پر اپنے منتر اور ٹونے کا عمل کیا ہے۔ بتائے دیتا ہوں اگر جہت کی طرف پھینکے گئے اور یہ چاروں ٹکڑے اگر نیچے کی طرف واپس آگئے تو پھر تمہاری صاحبزادی کی زندگی پھر مصیبت میں مبتلا ہو جائے گی، اور اگر اتفاق سے یہ چاروں ٹکڑے واپس نہیں آئے اور جہت ہی میں غائب ہو گئے تو یقین جانو کہ صاحبزادی رحیم النسا عمر بھر خوش و خرم رہے گی اور ہر وقت اس کی دلی مراد بر آتی رہے گی۔ یہ کہتے ہی آہستہ سے منہ ہی منہ میں کچھ دعا وغیرہ پڑھتے ہوئے فراز علی عامل نے اپنے داہنے ہاتھ میں رکھے ہوئے لیموں کے چاروں ٹکڑے جہت کی طرف پھینکے، اور وہ مسلسل اپنا عمل بھی پڑھتا رہا۔ وہ عورتیں اور ایک مرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جہت کی طرف دیکھ رہے تھے، گمان چاروں میں سے ایک بھی لیموں کا ٹکڑا نیچے واپس نہیں آیا۔ اس کے بعد فراز علی نے ان تینوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہاری صاحبزادی معمولی طریقے پر نہیں بلکہ بڑے ہی زبردست طریقے پر خوش قسمت واقع ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ چاروں میں سے ایک بھی لیموں کا ٹکڑا واپس نیچے نہیں آیا۔ یہ بڑا ہی بہتر فالون ہے، اور ایسا نیک اور موفق عمل کا میاب شگون بہت کم ہوا کرتا ہے۔ جاؤ اپنی صاحبزادی کو ہماری یہ خوشخبری سنا دو۔

بہت اچھا کہتے ہوئے ان تینوں میں سے مرد آدمی نے اپنی جیب سے دس روپے نکال کر فراز علی عامل کو دیئے، اور اس نے کہا شاہ صاحب یہ دس روپے ہماری شہزادی رحیم النسا کی طرف سے قبول کیجئے۔ فراز علی نے وہ دس روپے لے کر میز کے خانے میں رکھ دیئے۔ تقریباً رات کے دس بج چکے تھے، جب کہ یہ تینوں فراز علی کے مکان سے چلے ہیں۔ ہلکی پھوار تھی۔ لیکن کچھ دور جانے کے بعد بوندا باندی شروع ہو گئی تو ان تینوں نے ایک شاندار مکان کے چھجے کے نیچے سہارا لیا، جس کے دروازے پر ایک چوکیدار بیٹھا تھا۔ رات اندھیری تھی، اور ہلکی سی بارش شروع ہو چکی تھی، اس لیے ان تینوں نے چوکیدار کے قریب جا کر کہا، بھائی چوکیدار صاحب! ہمیں یہاں تھوڑی دیر ٹھہرنے کی اجازت دیجیے، اس پر چوکیدار نے ڈانٹ کر کہا کہ اس اندھیری رات میں بارش کے وقت تم تینوں کہاں جا رہے ہیں، کوئی چور چکار تو نہیں ہیں جو یہاں پر سہارا تلاش کرنے آئے ہیں۔ اس پر ان تینوں میں سے مرد آدمی نے کہا، نہیں چوکیدار صاحب ہم تینوں بھلے آدمی ہیں، اور ہم تینوں بھی ہمارے سرکار اعظمان جاہ بہادر کی ڈیوڑھی کے ملازم ہیں، یہ دو عورتیں ان کی صاحبزادی رحیم النسا کے حضور میں (۲۴) گھنٹے رہتی ہیں، اور میں سرکار کی بیٹھک میں (۲۴) گھنٹے رہتا ہوں۔ ہم صاحبزادی کے ایک ضروری کام سے گئے تھے، واپس ہو رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی، اس لیے آپ پاس سہارا لیا ہے، خدا ہم کو بھی جلد سے جلد ڈیوڑھی پہنچ جانا چاہیے رحیم النسا کا نام سنتے ہی چوکیدار نے کہا، ارے ہاں نواب اعظمان جاہ بہادر کی صاحبزادی رحیم النسا، جس کے عشق کے ڈنکے سارے شہر میں پٹ رہے ہیں، مشہور ہے کہ ۵ رمحرم کو لنگر میں ہی حسین نوجوان کو دیکھا تھا، اور اس کے عشق میں دیوانی سی ہو گئی ہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ صاحبزادی کو دھوکا دے کر ڈیوڑھی کے بعض ملازمین نے ہزاروں روپے کے جواہرات اور زیورات لے کر رفو چکر ہو گئے ہیں، اور پولیس اس کی تحقیقات کر رہی ہے۔ یہ سن کر اس مرد آدمی نے کہا کہ یہ سب جھوٹ ہے، یہ خبر ہے کہ ہماری صاحبزادی کا مزاج خراب ہے، لیکن زیورات کی چوری وغیرہ سب غلط باتیں ہیں، جو کچھ ابھی بارش کا سلسلہ تھا۔ اس لیے آپس میں باتیں بھی ہو گئی ہیں ان میں سے بڑی ماما جی نے دریافت کیا، چوکیدار بھائی یہ مکان بھی بہت بڑا معلوم ہوتا ہے آپ کے سرکار کا کیا نام ہے؟ اس پر چوکیدار نے کہا، ہمارے

سرکار کا نام میر علی خان ہے ۔ گلبرگا میں ان کی جاگیر ہے ۔ آج کل وہ وہیں رہتے ہیں ۔ بڑے جاگیر دار اور معمار بھی ہیں ۔ ان کے صرف ایک ہی صاحبزادے ہیں، ان کا نام افضل خان ہے، ہمارے چھوٹے سرکار بھی نہایت ہی حسین اور خوبصورت نوجوان ہیں، لیکن آجکل وہ بیمار ہیں، اس لیے جہاز کچھ اترسا گیا ہے، اور ریلا پڑ گیا ہے، کچھ عرصا پہلے ۵ر محرم کو اپنے گھوڑے پر لنگر گئے تھے واپسی کے بعد سے مسلسل بیمار ہیں ۔

لنگر، ۵ر محرم اور گھوڑے سوار نوجوان کا نام سنتے ہی دونوں ماماجی اور مرد آدمی تینوں کے چہروں پر خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی، بڑی ماماجی سے رہا نہ گیا، آخر اس نے اس چوکیدار سے دریافت کر ہی لیا کہ، چوکیدار بھائی آپ کے چھوٹے سرکار کا نام افضل خان ہے، اور ۵ر محرم کو وہ لنگر گئے تھے، اور وہ وہاں سے واپسی کے بعد سے مسلسل بیمار ہیں ۔ اس کے جواب میں چوکیدار نے ہاں کہا ۔ اس پر اس عجوبہ نے کہا، بھائی آپ نے کہا کہ آپ کے چھوٹے سرکار مسلسل بیمار ہیں تو ان کا علاج معالجہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے؟ چوکیدار نے جواب دیا، کیوں نہیں علاج تو دوسرے بھی روز سے ہو رہا ہے، مگر کوئی فرنگی عورت ہے، کہتے ہیں کہ وہ لیڈی ڈاکٹر ہے، اور اس کا نام مس پیٹرک بی بی ہے، وہ روزانا آتی ہے، اور سرکار کو دیکھ کر انگریزی دوائیں دیتی ہے ۔ میں انگریزی دواؤں کا قائل نہیں ہوں، میں نے کئی مرتبا چھوٹے سرکار سے کہا کہ سرکار ہمارے شہر میں ایک بڑا ایک ماہر اور مشہور طبیب اور حکیم ہیں، اگر حکم ہو تو مالک کا روز ایک حکیم کو لے آؤں، مگر ہمارے سرکار حولایت پلٹ ہیں، یونانی علاج کے قائل نہیں ہیں، اس لیے انگریزی ڈاکٹر کا علاج کرواتے ہیں ۔ آج تک انھیں ان دواؤں سے کوئی فائدا نہیں ہوا ۔

بڑی ماماجی نے کہا، چوکیدار بھائی آپ نے بیان کیا کہ آپ کے چھوٹے سرکار کا نام افضل خان ہے، اور وہ نہایت ہی حسین اور خوبصورت نوجوان ہیں، اور ۵ر محرم کو لنگر میں اپنے گھوڑے پر گئے تھے ۔ بھائی آپ نے یہ بھی کہا کہ آپ کے سرکار ولایت پلٹ ہیں ۔ تو لازمی طور پر ان کے فوٹو اور تصویریں ہوں گی ۔ یہ سن کر چوکیدار نے جواب دیا، جی ماں ایک سے زیادا کئی تصویریں موجود ہیں ہمارے سرکار کی ۔ بڑی ماماجی نے اپنی تھیلی سے دس روپے نکال کر چوکیدار کو دیے، اور کہا، چوکیدار بھائی یہ دس روپے لو اور انڈے روٹیوں کی مٹھائی خرید کر گھر لے جاؤ اور اپنی بیوی بچوں کو کھلاؤ دو، یہ ہماری طرف سے تحفا ہے، ضرور قبول کرنا ۔ اور اسی وقت ایک تصویر لے آؤ ۔ دوسری ماماجی اور وہ مرد آدمی نے بھی زور دیا اس پر روپے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا، اس کی کیا ضرورت ہے، کہتے ہوئے دس روپے اپنی جیب میں ڈال لیے اور یہ کہتے ہوئے اندر گیا کہ آپ لوگ یہیں ٹھہریں، میں ابھی تصویر لے آتا ہوں ۔ اس عرصے میں یہ تینوں خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ تھوڑی دیر میں اس نے افضل خان کا ایک فریم کیا ہوا فوٹو لا کر ان کے حوالے کیا ۔ افضل خان گھوڑے پر بیٹھا ہوا نوجوان نہایت ہی حسین اور خوبصورت دکھائی دے رہا تھا ۔ اس فوٹو کو دیکھتے ہی تینوں خوشی اور مسرت سے پھول گئے، اور دونوں ماماجی نے میرے اچھے سرکار ۔ میرے اچھے سرکار کہتے ہوئے فوٹو کو چوما اور سینے سے لگا لیا ۔ اس وقت تک بارش کچھ تھم چکی تھی، اس لیے ان تینوں نے چوکیدار سے جانے کی اجازت چاہی، اور چوکیدار سے دعا کیا کہ وقت فوقت آپ سے ملتے رہیں گے، یہ کہہ کر آداب عرض ہے، اور خدا حافظ خدا حافظ کہتے ہوئے وہ تینوں چلے گئے ۔

تقریبا دو بجے رات کو وہ آسمان جاہ کی دونوں بیٹیاں، وہ مرد تو باہر رہ گیا، اور دونوں عورتیں رحیم النسا کے کمرے میں داخل ہوئیں ۔ کیا دیکھتی ہیں کہ ان کی محو دلکش شہزادی اپنی مسہری پر گہری نیند سو رہی ہیں ۔ بڑی ماماجی نے افضل خان کی تصویر دیکھ کر آہستہ سے کہا، دیکھو کتا ہی خوبصورت اور حسین جوڑا ہے دونوں کا ۔ چلو اس وقت ہم بھی سو رہیں شہزادی کو جگانا مناسب نہیں، کل سویرے یہ تصویر

دکھائی گئے۔

جب سویرے تمام ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد دونوں ماما جی نے سارا ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح سے یہ لوگ جہاں خاکے بڑے مزار پر گئے تھے اور آپ کا دیا ہوا زر و جواہر کا تمام زیوران پیر کے نذر کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ قبر میں سے داڑھی والے ایک بزرگ شاہ صاحب نکل کر ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے، اور کہا، بول کیا چاہتا ہے، تو ہم نے کہا شاہ صاحب ہم کو کچھ بھی نہیں چاہیے، ہماری شہزادی رحیم النسا حسین اور خوبصورت گھوڑے سوار نوجوان کو چاہتی ہے، اس کی تصویر ہمیں دے دیجیے تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ اچھا تصویر چاہیے اس نوجوان کی، اس پر ہم نے کہا، جی ہاں شاہ صاحب، ہمیں تصویر چاہیے، چاہیے ہمارے یہ کہتے ہی ان بزرگ آسمان کی طرف اپنا دہنا ہاتھ اٹھایا، اور ہم نے دیکھا کہ فوراً ہی ایک فوٹو ان کے ہاتھ میں آ گئی، اور وہ فوٹو ان بزرگ نے ہمیں عنایت فرمایا اور پھر دیکھتے دیکھتے ہی نظروں سے غائب ہو گئے۔

یہ عجیب و غریب داستان سنتے ہی رحیم النسا نے ان سے دریافت کیا، پھر وہ فوٹو کہاں ہے، ماما جی، لائیے آئیے، جلد سے مجھے دکھاؤ، میں تو اس فوٹو کو دیکھنے کے لیے سخت بے چین ہوں۔

ماما جی نے بات میں کپڑے میں لپٹے ہوئے فوٹو کو نکال کر رحیم النسا کے حوالے کی۔ رحیم النسا نے فوٹو کو اپنے دونوں ہاتوں میں لیتے ہوئے اس پر نظر دوڑائی، اور ساتھ ہی اس کے چہرے پر مسرت اور خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ فوٹو کو دیکھتے ہی اس نے چلا چلا کر کہا، یہ وہی شخص ہے ماما جی جس کو میں نے لنگر میں دیکھا تھا، یہ وہی ہے، یہ وہی ہے، یہ میرا سرتاج ہے، میں اس سے محبت کرتی ہوں، ماما جی آج تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ تم نے مجھ کو وہ چیز دے دی، جس کے لیے میں اتنی حیران اور پریشان تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ تم جانتی ہو ماما جی میرا سکون چھن گیا، اور جب سے میرا رام مجھ پر مہربان ہو گیا

اب تو وہ میری نظروں کے سامنے آ گیا ہے، اس لیے اس فوٹو کو سامنے رکھ کر (۲۴) گھنٹے اس کی پرستش اور پوجا کرتی رہوں گی۔ ماما جی یقین جانو کہ اس کے صلے میں میں تم دونوں کو بے حد خوش کر دوں گی، اس لیے کہ آج تمہاری کوششوں کے سبب میرا غم غلط ہو گیا، اور خوشی اور مسرت میرے نصیب میں آ گئی ہے۔

باب (۶)

مشرقی عوام میں خصوصی زنانا حلقوں میں، محلوں اور ویڑیوں کے اندر مختلف قسم کی سازشوں کے جال بچھائے جاتے ہیں، تاکہ جال کے کرتا دھرتا کو طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا کر کے اس سے کچھ نہ کچھ مالی منفعت حاصل کی جائے۔ یہ مرض سارے مشرق میں جاری و ساری ہے، خصوصی ہندستان کے مغلوبہ محلات میں اس کی وبا زیادہ تر پھیلی ہوئی ہے، اور خاص طور پر ریاست حیدرآباد دکن اس قسم کی بدعنوانیاں اور بدتمیزیاں ہر امیر اور جاگیر دار گھرانے میں کثرت سے پائی جاتی ہیں، مگر خوشی کی بات ہے کہ آسمان جاہ کا محل اس نوع کی سازشوں سے پاک و صاف ہے، سوائے ان دو ماما جی اور ایک مرد ملازم کی بدکاریوں کے، ویڑی کا کوئی بھی اپنے آقا کا کالے دھا نہیں ہے۔

رحیم النسا بذات خود ایک شریف اور نیک سیرت لڑکی واقع ہوئی ہے۔ وہ نادانستہ طور پر ان تینوں ملازمین کی سازشوں کا شکار بن گئی ہے۔ اپنے منظور نظر اور چہیتے کی تصویر یا فوٹو کو اس نے جس طریقے پر ہزاروں روپے کے زیورات کے بدلے حاصل کیا ہے، اس کو وہ سونی صادق اور حقیقت پر مبنی سمجھتی ہے۔ تصویر کو حاصل کرنے کے بعد وہ یہ باور کرتی ہے کہ زندگی میں اس کو اپنا محبوب ملے یا نہ ملے، صرف اسی تصویر کو دیکھ کر وہ اپنی زندگی کے باقی دن اسی طرح محو گذار دے گی۔ اور کسی دوسرے شخص سے شادی بیاہ نہیں کرے گی، اور اپنے پروردگار سے ہمیشہ دعا مانگتی

یہ دعا کرتی رہے گی کہ وہ جلد سے جلد اپنے منتظر نظر سے اس کو ملا دے۔ وہ انھیں خیالات میں غرق تھی کہ ایسے میں اس کے اب آسمان جاہ بہادر اس کے کمرے میں آ گئے۔ باپ کو دیکھتے ہی وہ دوڑی دوڑی گئی، اور بڑے ہی لاڈ پیار سے ان کے گلے لپٹ کر ان کو بار بار پیار کرنے لگی۔ اس مصنوعی خشمی اور مسرت کے مظاہرے کے باوجود باپ نے بیٹی سے سوال کیا "جان من تم سچ سچ بتاؤ کہ کونسا عارضہ ہو گیا ہے؟ تمہاری طبیعت میں وہ پہلا سا چہل نہیں ہے۔ تم ہمیشہ مغموم سی اور کھوئی کھوئی سی نظر آتی ہو۔ آخر کار اس کا سبب کیا ہے؟ تمہارے ہاں روپے پیسے کی کمی نہیں، اور نہ ہی زر و جواہرات کی کمی ہے۔ تم چاہو جتنا کھلے ہاتھ خرچ کر سکتی ہو۔ تمہیں اندرونی طور پر کوئی خاص مرض تو لاحق نہیں ہو گیا ہے۔ سچ سچ بتاؤ، میری اچھی بیٹی۔ جلد بتاؤ کہ تمہارے تکدر کا آخر سبب کیا ہے؟"

سر کار ابا! کہتے ہوئے اور باپ کی نظروں میں نظر ڈالتے ہوئے رحیم النسا نے کہا، آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ میں آپ کی وہ بیٹی نہیں ہوں، جو پہلی زندگی تھی، اور ہنسی خشی سے اپنے دن گزارتی تھی، اور میں یہ نہیں بیان کر سکتی کہ کس وجہ سے میں مغموم رہتی ہوں، لیکن آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی بیٹی اب زیادہ دن کی مہمان نہیں ہے، کہ آپ کی بیٹی اور آنکھوں کا تارا بیٹی جلد مرنے والی ہے، میں ایک طویل عرصے تک زندہ نہ رہوں گی، اور بہت بڑی عمر پاؤں گی۔

میری پیاری بیٹی، آسمان جاہ نے کہا، ایک باپ کی یہ دلی تمنا اور آرزو ہوتی ہے کہ اس کی اولاد قیامت تک زندہ اور خوش حال رہے، مگر جان من! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھلے بھلے خاصے لوگ ختم ہو جاتے ہیں، اس لیے ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ زندگی بھر اپنے خدا سے لو لگائے رہے، تاکہ اس کو سکون اور حسن آرام نصیب ہو، جانِ من

تمہارے پیار سے میں میں ضد بھی یہی چاہتا ہوں۔ سرکار ابا! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی زرین ہدایت کے مطابق میں ہر وقت خدا کی عبادت میں مشغول رہتی ہوں، اور اس سے بات اٹھا کر دعائے خیر مانگتی ہوں کہ یا اللہ تو ہر وقت مجھ کو صحت اور تندرست رکھ اور میری باقی زندگی عافیت کے ساتھ گزار دے۔ ابا جان، ان دعاؤں کے بعد بھی، بعض وقت آدمی بیمار ہو ہی جاتا ہے، ایسی صورت میں ہر شخص مجبور ہے، اب آپ ہی بتائیے۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔

یہ سچ ہے میری بیٹی، آسمان جاہ نے کہا، مگر باپ کی حیثیت سے تو میرا یہ اولین فرض ہے کہ تمہاری خیر و عافیت اور صحت و تندرستی کی ہمیشہ ہی خبر گیری کرتا ہوں۔

یہ ٹھیک ہے سرکار ابا کہتے ہوئے، رحیم النسا نے رونا شروع کر دیا، ایسے میں آسمان جاہ نے بیٹی کو گلے سے لگا لیا، اور بار بار دلاسا تشفی دیتے ہوئے کہا، مت رو میری بیٹی مت رو، تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل بھر آتا ہے، بتاؤ سچ سچ بتاؤ کہ تم کو کس قسم کی تکلیف ہے؟ میں تمہاری ہر آرزو اور خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یقین جانو میری اچھی اور پیاری بیٹی، اگر ضرورت پڑے تو تمہاری خاطر آسمان کے تارے تک توڑ لاؤں گا!

اس عرصے میں رحیم النسا روتے روتے ہچکیوں پر آ گئی، اور باپ اپنی دستی سے اس کے آنسو پونچھ رہے تھے۔ ایسے میں باپ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے رحیم النسا نے کہا کہ میرے پیارے سرکار ابا! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آسمان کے تارے توڑ لانے کے باوجود آپ میری دلی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتے ہیں۔

لیکن ایسا نہ کہو میرے جگر پارے، تمہارا پیارا باپ تمہاری دلی آرزو اور خواہش کو پورا کرنے کی خاطر اپنی ساری دولت قربان کر دے گا، اور اس کے باوجود میری جسمانی کوششوں کی ضرورت ہو تو

یقین جانو کہ تمہارا یہ معزز اور پر وقار باپ، جس کی عزت اور شہرت کے ڈنکے سارے شہر حیدرآباد میں بجتے ہیں، اپنی عزیز از جان بیٹی کا خاطر، قربان کر دینے کے لیے تیار ہے، کہو اور سچ سچ بتاؤ کہ تم کس حیثیت اور آفت میں مبتلا ہو گئی ہو؟

باپ کے اس حکم محکم کے جواب میں، رحیم النسا کے باپ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، میرے پیارے اور عزیز از جان سرکار ابا! آپ یقین جانیے کہ آپ کی بے پناہ دولت اور تمام زر و جواہرات پورے جواہرات بھی میری پسند کی چیز نہیں خرید سکتے، اور آپ تو مجھ سے زیادہ بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ قرآن شریف میں بھی ایک آیت ایسی ہے جس میں صاف طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنی پسند کی چیز لاقیمت ہوتی ہے اور ایسی چیزوں کو ساری دنیا کے جواہرات بھی نہیں خرید سکتے۔ اب میں صرف اپنے اللہ پاک پر بھروسا کیے ہوئے ہوں کہ دیکھیں میرے حق میں وہ کیا فیصلہ دیتا ہے۔

ایسے میں پیچھے سے دیوڑھی کے ایک ملازم نے آواز لگائی "سرکار! سرکار! آپ سے کوئی صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں۔"

پلٹ کر دیکھتے ہوئے آسمان جاہ نے کہا کون ہیں؟

سرکار! کوتوال صاحب آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔

آسمان جاہ نے بیٹی کی طرف پلٹتے ہوئے کہا تم خوش و خرم رہو، میری پیاری بیٹی، اس وقت تو میں کوتوال صاحب سے ملنے کے لیے جاتا ہوں۔ آپ کی یہ اونٹ لونڈی باندی آپ کے حضور میں آداب بجا لائی ہے سرکار، کہتے ہوئے جھک کر رحیم النسا نے باپ کو با ادب پانچ آداب بجا لائے اور باپ نے خود رخصت ہوئے اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر خیر و عافیت رہو میری بیٹی کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گئے، اور باپ کے جاتے ہی اندر رحیم النسا پھر سے فولاد ہات میں لے کر دیوانہ وار اس میں مبتلا ہو گئی۔

دیوڑھی کے شاندار اور پر تکلف دیوان خانے میں جہاں عالا درجے کا فرنیچر اور قیمتی صوفا سیٹ پڑے تھے، کوتوال شہر اور پولیس کے دوسرے ملازمین اور دیوڑھی کے ملازمین بھی کھڑے آسمان جاہ بہادر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ آسمان جاہ کے داخل ہوتے ہی کوتوال اور سب ملازمین نے جھک کر پانچ آداب بجا لائے۔ آسمان جاہ اپنے مخصوص اور مقررہ صوفے پر بیٹھ گئے، اور کوتوال کو قریب آنے کا حکم دیا، کوتوال قریب آتے ہی پھر سے جھک کر سرکار کی خدمت میں پانچ آداب بجا لائے، اس کے بعد سرکار نے کوتوال کو سامنے کے صوفے پر بیٹھنے کا حکم دیا، اور کوتوال اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

کہیے کیسے آنا ہوا، کوتوال صاحب، آسمان جاہ نے دریافت کیا۔ اس پر کوتوال نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ سرکار! میں اپنے ساتھ ایک وجیہہ اور شاندار آدمی کو آپ کی خدمت میں لے آیا ہوں، اس نے جواہرات کی چوری کی ہے، اور یہ جواہرات سرکار کے محل کے ہیں۔ اس کے ایک اور ساتھی شخص ہے اور ان دونوں نے مل کر ہماری پولیس کے دو رو ہیلا جوانوں کا قتل کر کے ان سے جواہرات حاصل کیے تھے۔ یہ دونوں بھی حضور والا عمر ایک کے بدمعاش ہیں، جب میں ان کو سرکار کی خدمت میں پیش کروں گا، تو خود حضور بھی ان کو پہچان لیں گے! ان کا کہنا ہے کہ آج سے چھ آٹھ مہینے پہلے یہ جواہرات سرکار کے ہاتھ فروخت کیے تھے۔ اپنے خاص امرا نا آباد میں، یا وقار طریقے پر کوتوال صاحب کی طرف دیکھتے آسمان جاہ نے لاپرواہی کے ساتھ کہا، مگر کوتوال صاحب! آج کو تو دیوڑھی میں جواہرات کی چوری کا کوئی بھی علم نہیں ہے! اگر میری دیوڑھی میں کسی قسم کی چوری ہوئی تھی تو میرے دفادار ملازم سب سے پہلے مجھ کو اس کی اطلاع کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قاتلوں نے آپ کو کچھ غلط بیانی کرا دیا ہے۔

سرکار! جو فیصلہ کیجیے حضور والا نواب آسمان جاہ

بہادر دوام اقبالہٗ کی ڈیوڑھی سے متعلق تھا، اس لیے بھیشت کوتوال شہر خود میں نے اس کیس کی تفتیش کی ہے، اور ایک بھی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ جواہرات گئے جواہرات سرکار والاشان ہی کی ملک ہیں، اور خود سرکار اس قسم کی چوری سے سراسر لاعلم ہیں۔ اگر سرکار عظمت مدار اجازت دیں تو، کہتے ہوئے بات جوڑ کر کوتوال نے کہا، میں ابھی قاتلوں اور مسروقہ جواہرات کو سرکار کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

کوتوال شہر کے بار بار اصرار اور یقین دلانے پر آسمان جاہ نے حکم دیا کہ بہتر ہے قاتل اور مال مسروقہ پیش کیا جائے۔ اس حکم کے ملتے ہی کوتوال نے دور کھڑے ہوئے پولیس کے مددگار کو اشارا کیا کہ وہ قاتل اور جواہرات لائے جائیں، چنانچہ ایک منٹ کے اندر اندر حاکر بیدار گارد دونوں قاتلوں اور جواہرات کو لے آیا، قاتل کونے میں کھڑے رہا، زرد جواہر کوتوال کے سامنے پیش کیا، کوتوال نے جواہرات اپنے ہاتھ میں لیے اور اٹھ کر بادب جواہرات کی کشتی آسمان جاہ کے ملاحظے میں پیش کی، اور کہا، سرکار کو اب تو یقین آگیا ہوگا کہ یہ جواہرات حضور والا ہی کی ملکیت ہیں، جواہرات کو دیکھتے ہی آسمان جاہ نے کہا، کوتوال صاحب، یہ جواہرات واقعی میری ہی ملک ہیں۔ میں نے اس بالا کے درمیان میرے پر، شہر کے مشہور مصور خدا بخش کے ذریعے اپنا نام کندا کروایا تھا، یہ دیکھو کوتوال صاحب وہ نام یہ رہا۔ ہاں اب مجھے یاد آگیا کہ اپنی اک قریبی لڑکی کی سالگرہ پر پچھلے سال خود میں نے یہ جواہرات کی مالا بطور تحفہ دی تھی، اور اس وقت یہ مالا اس کی تحویل میں تھی، مگر وہاں سے یہ چوری کیسے گئی، اس کا علم مجھ کو نہیں ہے۔ دور کھڑے ہوئے قاتلوں کی طرف بتاتے ہوئے کوتوال نے کہا، سرکار ایک تو آپ ہی کی ڈیوڑھی کا ملازم ہے، اور دوسرا شہر کا بڑا ہی مشہور چور اور ڈاکو ہے، اور ان دو بدمعاشوں نے آپ کی ڈیوڑھی کی ماماؤں کے ساتھ مل کر سازش کی ہے، جس کی وجہ سے آپ کے محل جواہرات ان دو مرحوم عورتوں کے ہاتھ آگئے تھے۔ اگر سرکار اجازت دیں تو میں ان دونوں ماماؤں سے کچھ سوالات کر کے مزید معلومات حاصل کروں گا۔ اس پر آسمان جاہ نے کہا کہ کوتوال صاحب یہ دونوں مامائیں میرے ہاں زیادہ طویل عرصے سے ملازم ہیں، اور وہ میری لڑکی رحیم النسا کی پیدائش میں (۲۴) گھنٹے رہتی ہیں۔ ان سے متعلق مجھکو یا میری صاحبزادی کو آج تک کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، اس کے باوجود اگر آپ کا اصرار ہے تو ان دونوں کو بلوا کر آپ کے ساتھ کیے دیتا ہوں، چنانچہ آسمان جاہ نے زنانے سے ان دونوں ماماؤں کو بلوا کر کوتوال صاحب کے ساتھ کر دیا، اور کوتوال صاحب آسمان جاہ کو آداب بجا لاتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرتے چلے گئے۔

کوتوال صاحب اپنے دفتر میں، اپنے خاص احلاس پر بیٹھے ہیں۔ میز کے سامنے کی کرسی پر بعد کوتوال صاحب ہیں، اور بازو کی کرسیوں پر ان کے مددگار بیٹھے ہیں۔ صدر امین اور جعدار سامنے باڈر لیس کھڑے ہیں، اور آسمان جاہ کی ڈیوڑھی کی دو ماماؤں بھی سامنے کھڑی ہیں۔ ایسے میں خود کوتوال نے ان دونوں ماماؤں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم دونوں مامائیں سرکار کی ڈیوڑھی میں کتنے عرصے سے ملازم ہیں، اس پر بڑی ماما نے جواب دیا سرکار ہم دونوں ماماؤں ایک ساتھ بڑے سرکار کی ڈیوڑھی میں ملازم ہوئی ہیں۔ ٹھیک طور پر تو یاد نہیں، تقریباً پندرہ سولہ سال سے ہم دونوں اپنے مالک اور اپنی شہزادی کا نمک کھا رہی ہیں۔ یہ تمام سوالات اور جوابات ایک دراز دفتر ساتھ کے ایک چھوٹے سے میز کرسی پر بیٹھا نوٹ کر رہا ہے۔ اس کے بعد کوتوال صاحب نے دریافت کیا، تمہاری نیک چلنی اور وفاداری کے سلسلے میں ہمیں اس لیے شبہ ہے کہ تم نے چوروں اور غنڈوں کو جواہرات کی چوری میں مدد دی ہے۔ اس پر بڑی ماما نے کہا

کوتوال صاحب بہادر یہ سراسر غلط ہے کہ ہم نے چوروں کی مدد کی ہے۔ ہماری دیانت داری اور نیک نیتی کی ساری دیوڑی قائل ہے، اور خدسر کار اور صاحبزادی بھی ہم کو اچھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

دیوڑی میں ملازمت سے پہلے تم کہاں ملازم تھیں، کوتوال صاحب نے بڑی ماماجی سے سوال کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے اس سے پہلے کہیں بھی ملازمت نہیں کی، اس لیے کہ میرا شوہر حسین علی خد ملازم تھا۔ اس کے مرنے کے بعد مجھ کو ملازمت کی تلاش ہوئی، اور یہ چھوٹی ماماجی اور میں دونوں ہی کم سر کار کی دیوڑی میں گئے، اور ہمیں اسی وقت ملازمت مل گئی، چنانچہ اس وقت سے ہم دونوں دیوڑی میں رہتے ہیں، کھانا، پینا، کپڑا وغیرہ سب کچھ ہمیں دیوڑی ہی سے ملتا ہے، اس لیے کہیں باہر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ شہزادی کے کام سے باہر جانا پڑتا ہے۔

خیر یہ سب سچ ٹھیک ہے، کوتوال نے بڑی ماماجی سے کہا، یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں عورتیں پینے پلانے کی بھی عادی ہیں۔ یہ کیا کہا کوتوال صاحب آپ نے، آپ ہم شریف عورتوں کی توہین کر رہے ہیں! ہم دونوں دیوڑی سے باہر قدم نہیں رکھتے ہیں، پینا پلانا تو رہا ایک طرف ہم پینے والوں کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

اف۔! اگر یہ بات ہے تو آئندہ تم سے ایسے سوالات نہیں کروں گا تاکہ آسمان جاہ بہادر کی شریف ماماؤں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے مگر یہ ضرور سوال کروں گا کہ آیا کسی پینے والی اوارا عورت سے آپ دونوں کے تعلقات ہیں؟

نہیں، ہم دونوں پینے والوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں، اس لیے کسی بھی ایسی عورت سے ہمارے تعلقات نہیں ہیں۔

ٹھیک ہے، مگر یہ ضرور آپ دونوں عورتیں بتا سکتی ہیں کہ کل رات آپ نے اس عورت کے ساتھ شراب کی نوتل پہلی بار دیکھی تھیں، کوتوال صاحب نے کہا۔ کل رات بالکل غلط، کل رات تو ہم دیوڑی میں موجود تھے۔ ماماجی نے کہا۔ خیر کل رات نہ سہی، پرسوں کی رات یہ تو بالکل ٹھیک ہے نا، کوتوال صاحب نے مذاحیا انداز میں کہا۔

ہوسکتا ہے، پرسوں رات ہم دونوں شہزادی ہی کے کام سے باہر گئے تھے، اور کسی سے ہماری ملاقات بھی رہی ہو، ماماجی نے بیان کیا۔

اچھا! شریف زادی، بڑی ماماجی، تم یہ تو بتاؤ کہ دیوڑی کی آمدنی کے سوا تمہاری آمدنی کا اور بھی کوئی ذریعہ ہے؟ کوتوال صاحب نے سوال کیا۔

نہیں، ہماری اور کوئی بھی آمدنی نہیں ہے۔ دونوں، ماماجی نے ایک ساتھ جواب دیا۔

تو تمہارے پاس شراب پینے کے لیے پیسے کہاں سے آئے، اور یہ جواہرات تمہیں کس نے دیے، کوتوال صاحب نے بیان کیا۔

شراب پینے کے لیے پیسے بڑی ماماجی نے تعجب کے ساتھ نفی کی، ہمارے پاس نہ پیسے ہی تھے، اور نہ ہم نے شراب ہی پی، اور نہ ہی ہمیں جواہرات کا علم ہے، بڑی ماماجی نے کوتوال کے اعتراضات کی نفی کردی۔

اگر یہ بات ہے تو پرسوں یا ترسوں کو تم دونوں عورتوں اور تمہارے ساتھ ایک غنڈا شخص کو شراب پی ہوئی حالت میں صبح سویرے ہمارے انسپکٹر نے اور جمعدار پولیس نے گرفتار کر کے تھانے لے گیا تھا، کیا یہ سچ ہے یا نہیں؟ کوتوال نے سوالیا انداز میں دریافت کیا۔

یہ سب جھوٹ ہے، بڑی ماماجی نے دلیرانہ انداز میں کہا۔

اس پر کوتوال نے، سامنے کھڑے ہوئے انسپکٹر پولیس اور جمعدار سے سوال کیا کہ تمہارے پاس اس الزام کا کیا ثبوت ہے؟

اس پر انسپکٹر پولیس نے کوتوال سے بیان کیا۔ سرکار! پرسوں صبح سویرے محلے کے چند بچے اور بڑے لوگ پولیس اسٹیشن آئے اور جمعدار نے کہا کہ دو عورتیں اور ایک مرد بھی ہوئی حالت میں کنٹے

کے قریب پڑے ہیں، اس پر جمعدار نے مجمع کو اطلاع کی، چنانچہ تین دو حوالوں اور جمعدار کے ساتھ مقام واردات پر گیا، ان سب کو گرفتاری کی شکل میں مال مسروقہ کے ساتھ پولیس تھانے لے آیا، اور اس کے بعد باضابطہ کارروائی کرنے کے بعد، سرکار کے روبرو تفصیلی رپورٹ پیش کی جس کی بنا پر کارروائی عمل میں آئی۔

یہ سب جھوٹ ہے کوتوال صاحب بہادر، ہم دونوں بھی بلکل بے قصور ہیں، دونوں ماؤں نے ایک ساتھ کہا۔

سرکار! کوتوال صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے جمعدار پولیس نے کہا کہ یہ سب سچ ہے، ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ زبانی جمع خرچ نہیں ہے، بلکہ ہمارے امین صاحب کی موجودگی میں، ایک ایک لفظ کی روداد لکھی گئی ہے، جس کی پوری رپورٹ سرکار کے ملاحظے میں پیش ہے، جو نکہ ان دونوں ماؤں کو صاحبزادی رفیع النساء اور سرکار آسمان جاہ کی سرپرستی حاصل ہے، اس لیے یہ اپنے گناہوں اور پاپوں سے بچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ سرکار جمعدار نے آگے چل کر کہا، کنٹھے کے قریب ہمارے دو رسیلا حوالوں کے قتل کرنے میں بھی ان ہی دو عورتوں اور ایک عورت عامر دکا ہاتھ ہے، اس کا ثبوت ہمارے دفتر میں کڑی در کڑی شہادت اور ثبوت کی صورت میں موجود ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے، بڑی ماما جی نے درمیان میں کہا، یہ شخص بڑا ہی مکار اور عیار ہے، جو مسلسل جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا ہے۔

خاموش! کوتوال صاحب نے بڑی ماما جی کو ڈانٹا، ہمارا آدمی اپنا سرکاری فرض ادا کر رہا ہے، وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہے، اس کو کہنے دو، درمیان میں ہرگز مداخلت نہ کرنا، ہاں کہیے جمعدار تم جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو کوتوال نے مفتش قاضی جمعدار پولیس سے کہا۔ یہ سن کر جمعدار نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، سرکار! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے بیان میں ایک لفظ بھی غلط نہیں ہے، بلکہ میری کہنے کا ایک ایک لفظ سرکاری نقشہ پر مبنی ہے۔ سرکار! ہم نے جو کچھ بھی بیان کیا ہے، وہ بلکل سچ اور صحیح ہے، اس کے ثبوت میں اگر سرکار اجازت دیں تو ہم اسی وقت ان دونوں قاتلوں کو آپ کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، اس پر کوتوال صاحب نے حکم دیا کہ ہاں وہ دونوں قاتل اسی وقت پیش کیے جائیں، چنانچہ انسپکٹر پولیس کے اشارے پر ایک حوالدار اصلاس کے باہر گیا اور ساتھ ہی دو قاتل ملزمین کو ہتھکڑیاں پہنی حالت میں لے آیا۔ ان دونوں کے دیکھتے ہی دونوں ماؤں کے ہوش حواس جاتے رہے۔

کوتوال صاحب نے قاتلوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم کو اجازت ہے، یہاں تم سارے واقعات سچ سچ بیان کرو۔

اس پر دونوں میں سے ایک قوی ہیکل قاتل نے کہا سرکار! اب یہ مانی ہوئی بات ہے کہ میں اور میرا ساتھی دوسرا قیدی اب کسی طرح موت کے چنگل سے بچ نہیں سکتے، اس لیے میں مرنے سے پہلے سب کچھ سچ سچ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ پرسوں رات میں ہم دونوں کنٹا رو ڈ سے گزر رہے تھے، روڈ سے تھوڑے ہی فاصلے پر کچھ گڑبڑ سنائی دی، چنانچہ ہم دونوں بھی اس طرف گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دو رسیلا پولیس جوان اور یہ دو عورتیں شراب پی کر بدمست ہیں، اور آپس میں زیورات اور جواہرات کی تقسیم کے سلسلے میں لڑ رہے ہیں، ہم دونوں نے ان کو سمجھایا کہ لڑتے کیوں ہو آپس میں بانٹ لو، اس کے بعد ہم دونوں کی نیت بدل گئی، اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ مزید شراب پلا کر ان حوالوں کو بدمست کر دیں، اور اس کے بعد زیورات لے کر رفوچکر ہو جائیں، چنانچہ میں نے ساتھی کو روپلے دے کر اور شراب منگوائی اور ان دونوں کو اتنی پلائی کہ وہ بے ہوش ہو گئے، اس کے بعد ہم نے عورتوں سے کہا کہ ہم ان دونوں کو قتل کیے دیتے ہیں، اور باقی زیور ہم چاروں مل کر تقسیم کر لیں گے، اس پر یہ دونوں عورتیں راضی ہو گئیں، چنانچہ ہم دونوں نے مل کر ان بے ہوش اور

اور بلکل ہی مدہوش و دھیلا جوانوں کو خنجر سے قتل کر دیا، اس کے بعد ان عورتوں کو اتنی شراب پلائی کہ یہ دونوں بے ہوش ہو گیئں، چنانچے اس کارروائی کے بعد ہم دونوں وہ تمام زیورات اور جواہرات لے کر فراز ہو گئے، اور یہ عورتیں وہیں بے ہوش پڑی رہیں۔ صبح پولیس نے ان عورتوں کو گرفتار کر لیا اور تھانے گئی۔ تفتیش کے بعد ان دونوں عورتوں نے سارا حال احوال پولیس کو کہہ سنایا، اور ہم دونوں کا قد و قامت اور رنگ و روغن نیز حلیا بیان کرنے کے بعد پولیس نے تشفی کی خاطر میں ہم دونوں کو گرفتار کر لیا، اور تھانے میں تفتیش کے بعد ہم نے سارا حال کہہ سنایا، اور چرائے ہوئے تمام زیورات اور جواہرات بھی پولیس کے حوالے کر دیئے۔

اس کے بعد کوتوال نے ماماؤں سے مخاطب ہو کر کہا کہو اس کے بعد تم دونوں کیا کہنا چاہتی ہو، ایسی مزید صفائی کے سلسلے میں تمہیں اجازت ہے، جو چاہو بیان کرو۔ اس پر وہ دونوں عورتیں بہت دیر تک کھڑی رہیں، ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، اس لیے کوتوال نے حکم دیا کہ ان دونوں قاتلوں کو لے جاؤ۔ یہ عدالت میں پیش کیے جائیں گے، اور عدالت ہی ان کی قسمت کا فیصلہ کرے گی، ان دونوں ماماؤں کا سوال تو اس سلسلے میں ہم سرکار نواب آسمان جاہ سے مزید بات چیت کریں گے، اس کے بعد کسی ایک صحی نتیجے پر پہنچیں گے۔

باب (۸)

دوسرے روز کوتوال صاحب اپنے پورے اسٹاف کے ساتھ آسمان جاہ کی ڈیوڑھی پر آئے، اور اطلاع کروانے پر دیوان خانے میں داخل ہوئے۔ آسمان جاہ سنہری صوفے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور بعض ملازمین پیچھے فاصلے سے کھڑے تھے۔ کوتوال صاحب داخل ہوتے ہی آسمان جاہ کے سامنے گئے اور جھک کر تاریخ آداب بجا لا کر اس کے

آسمان جاہ نے انھیں بیٹھنے کا اشارا کیا، کوتوال صاحب سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئے، اور ان کا اسٹاف دور سامنے ہی کھڑا رہا۔ کوتوال صاحب نے آسمان جاہ سے عرض کیا، سرکار آپ کے حکم سے میں نے کل اپنے دفتر ہی میں ان دونوں ماماؤں کے بیانات لے لیے ہیں، اور یہ بیانات دونوں قاتلوں ہی کی موجودگی میں ہوئے تھے۔ اب سرکار والا سے میری یہ عرض ہے کہ آپ کی اگر کوئی اور عورت ملازم سے تو ہیں اس کا بھی بیان لینا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے کہا، کوتوال صاحب، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ آسمان جاہ کی ڈیوڑھی ہے، اس میں مرد عورت ملا کر کوئی ڈیڑھ سو سے زیادہ ملازم رہتے ہیں کیا آپ ان سب کے بیانات لینا چاہتے ہیں؟ اس پر مات جوڑ کر کوتوال نے عرض کی نہیں سرکار میرا مطلب یہ ہے کہ شہزادی صاحبہ کی پیسی میں جو عورتیں رہتی ہیں، میں ان کا بیان لینا چاہتا ہوں۔ آسمان جاہ نے فرمایا، صرف ایک اور نوجوان عورت ہے، جو بروقت ان ماماؤں کے ساتھ صاحبزادی کی پیسی میں رہتی ہے، مگر ایک مہینے سے بیمار ہے، اپنے گھر گئی ہوئی ہے، اب تک واپس نہیں آئی ہے، اس گفتگو کے دوران آسمان جاہ حقے کا کش پر کش لیے جا رہے ہیں، اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک مرد ملازم آ کر چلم کی آگ تیز کر دیتا ہے۔

کوتوال صاحب نے آسمان جاہ سے کہا، سرکار کا سب سے معتبر اور قریب تر رہنے والا مرد ملازم کون ہے۔ حقے کا کش لیتے ہوئے آسمان جاہ نے جواب دیا، عبدالقادر۔ کوتوال صاحب نے پھر سے عرض کیا، وہ اس وقت کہاں ہے، اس پر آسمان جاہ نے حقے کے نیچے کے ساتھ سامنے کی طرف بات کا اشارا کرتے ہوئے کہا، وہ رہا، وہاں کھڑا ہے، کوتوال صاحب نے عرض کیا، اگر سرکار کی اجازت ہو تو میں اس کو قریب بلا کر چند سوالات کروں گا، اس کے جواب میں آسمان جاہ نے مناسب کہا۔ اس پر کوتوال صاحب [illegible]

کے اشارے سے بلوایا، اور اس کے آتے ہی کہا کہ دیکھو، سرکار کا حکم ہوا ہے کہ وہاں دیوڑھی کا ملازم عبدالقادر کھڑا ہے، اسی کو یہاں قریب آنے کے لیے کہو، چنانچہ انگریز نے جا کر اس شخص سے کہا، اور عبدالقادر فوراً ہی دونوں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

عبدالقادر کے آتے ہی کوتوال نے دریافت کیا میں سمجھتا ہوں تمہارا نام عبدالقادر ہے، اور تم سرکار کی دیوڑھی میں ایک طویل عرصے سے ملازم ہو۔ جی ہاں کوتوال صاحب! مگر میں اس وقت سخت بیمار ہوں میں کھڑے رہنے کے قابل نہیں ہوں، بیماری کے سبب میں کئی روز سے فاقے کر رہا ہوں، میرے قویٰ جواب دے چکے ہیں۔ بلاوجہ بھی آپ مجھے تکلیف نہ دیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں سرکار کا قدیم نمک خوار ہوں، میری رگ رگ میں سرکار کا نمک دوڑ رہا ہے۔ آپ مجھ سے جرح وغیرہ مت کیجیے، جو ملازم سرکار کے لیے وفادار دعا باز ہیں، ان کو بلوا کر باز پرس کیجیے، میرا کسی بھی جھگڑے یا قصے سے ہرگز ہرگز تعلق نہیں ہے۔ میرے حالات خود میرے سرکار والا تبار پر روز روشن کی طرح واضح ہیں۔

عبدالقادر کی چکنی چپڑی باتوں کا آسمان جاہ پر خاطر خواہ اثر ہوا، چنانچہ خود انہوں نے کوتوال سے کہا، کوتوال صاحب! سینے اپنے اس قدیم ملازم پر مجھ کو پورا بھروسا اور اعتماد ہے، اور اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت وہ بیمار اور کمزور بھی ہے۔ عبدالقادر کو چھوڑ آپ دیوڑھی کے جس ملازم سے چاہیں جرح کر سکتے ہیں۔

یہ سن کر کوتوال نے کہا، سرکار کا حکم سر آنکھوں پر، مگر حضور والا، جس کو آپ اپنا معتبر خاص سمجھتے ہیں، وہ نمک حرام تو بدمعاش نمبر ۱ ہے۔ اس کے بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ سرکار اس معاملے میں بالکل دخل نہ دیں۔ میں ابھی جرح کر کے اس کے تمام تر کارناموں کو آپ کے سامنے لے آتا ہوں۔ یہ سنتے ہی آسمان جاہ نے کوتوال اور عبدالقادر کی طرف ایک غائر نظر سے دیکھا، اور بالکل ہی خاموش ہو رہے۔

یہ تو بتاؤ کہ تم نے اپنی داڑھی اور مونچھیں کیوں منڈوا دیں؟ اس پر عبدالقادر نے کہا، یہ بات تک باتیں کرنے سے کیا حاصل، یہ میری اپنی مرضی کا سوال ہے کوتوال نے کہا، تم تو دیوڑھی میں بڑے نمازی اور پرہیزگار مشہور ہو، پھر داڑھی مونچھیں منڈوانا مذہب کے خلاف ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں عبدالقادر نے کہا، میں تو بس ایک مذہبی آدمی ہوں، مجھ کو ہمارے سرکار کو بھی معلوم ہے، گرمی دانے نکل آئے تھے، ہماری دیوڑھی کے حکیم صاحب نے مشورہ دیا کہ تم کچھ عرصے کے لیے چہرے پر سے بال نکلوا دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا، اسی لیے میں نے داڑھی مونچھیں منڈوا دیں، بھلا یہ بھی آپ کے سوال کرنے کا کوئی اہم پہلو تھا۔

یہ سب جھوٹ ہے، کوتوال نے کہا، مجھ سے باتیں بنانے سے کام نہیں چلتا، سچ سچ بتا دو کہ تم نے داڑھی کس لیے منڈوائی، میں نے تو سچ سچ کہہ دیا ہے، اگر کوتوال صاحب جھوٹ سمجھتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

پھر تم سچ کہنے سے گریز کر رہے ہو تو مجبوری ہے، میں تم سے ایک دوسرا سوال یہ کرتا ہوں کہ آیا تم شادی شدہ ہو یا نہیں، عبدالقادر نے کہا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں، میری تنخواہ اتنی نہیں ہے کہ میں بیوی بچوں کو پال سکوں۔ تمہارے جواب کو بھی باور کرتے ہوئے میں یہ یقین کر سکتا ہوں کہ تم نے شادی نہیں کی ہے، یہ سچ ہے نا؟ جی ہاں بالکل سچ ہے، عبدالقادر نے کہا۔ اس کے بعد کوتوال نے آسمان جاہ سے مخاطب ہو کر کہا سرکار! آج میں اس شخص کے اسی قدر بیان پر اکتفا کرتا ہوں، اور جب کبھی مزید بیان یا تحقیق کی ضرورت ہوگی، میں سرکار کے حکم سے اس شخص کو اپنے دختر پر بلوا کر بیان لوں گا۔

کوتوال کے یہ کہنے کے بعد آسمان جاہ نے

کوتوال سے کہا، کوتوال صاحب ڈیوڑی کے ملازمین کے بیانات کے سلسلے میں، میں نے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی ہے، رہا زیورات اور جواہرات کی مالا کے بارے میں، میں خود بھی اپنی لڑکی سے مزید معلومات حاصل کر کے آپ کے علم میں لاؤں گا، مگر اب بھی میں اپنے ابتدائی خیال پر مصر ہوں کہ زیورات اور مالا کی چوری میں میری ڈیوڑی کے ملازمین کا ہاتھ نہیں ہے، بلکہ اس کام میں باہر کے لوگوں کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ رہا عبدالقادر کی حد تک میں آپ کو پھر سے یقین دلاتا ہوں کہ وہ جب سے میرے ہاں ملازم ہوا ہے، ہر وقت اور ہر نوبت پر اپنی انتہائی وفاداری اور ایمان داری کا ثبوت دیا ہے، چونکہ آپ کو اس کا بیان لینے پر سخت اصرار تھا، اس لیے میں نے اجازت دی، ورنہ میرا یہ معتبر ملازم کسی بھی بازپرس کا تحقیقات کا متحمل نہیں ہے۔

خیر سرکار کی جیسی بھی مرضی ہو، مجھکو کچھ زیادہ اصرار نہیں ہے، اس وقت میں سرکار کی اجازت سے ان دونوں ماماؤں کو صرف دو چار گھنٹے کے لیے اپنے دفتر لے جانا چاہتا ہوں، اس لیے کہ کل کی تحقیقات کا سلسلہ بیچ ناتمامی سا رہ گیا تھا، میں سرکار کو اپنے طور پر یقین دلاتا ہوں کہ بہت ہی جلد یہ ماماؤں واپس کر دی جائیں گی۔ اس کے جواب میں آسمان جاہ نے کہا ٹھیک ہے، لے جا سکتے ہیں، اور جیسا کہ وعدہ کیا ہے، انھیں جلد واپس کر دیں، مگر اس سے پہلے یہ زنانے میں بھیج کر صاحبزادی کی اجازت حاصل کر لیں گی، اس لیے کہ یہ ان کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتی ہیں، چنانچہ آسمان جاہ کے حکم سے وہ دونوں ماماؤں اندر گئیں۔

اس کے بعد آسمان جاہ نے کوتوال سے کہا، ہمارے شہر کے ایک خاص سیاسی مسئلے میں، میں تم سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر کوتوال اور اپنے ماتحت پولیس سے امیر الملک

کرنے کے لیے کہا، جب تک وہ سرکار سے بات چیت نہ کر لیں، سب باہر کھڑے رہیں، پولیس والوں کے ساتھ موقع پاکر چالاک عبدالقادر بھی باہر چلا گیا، اور ان دونوں ماماؤں سے جا ملا جو صاحبزادی رحیم النسا کے محل کی طرف جا رہی تھیں۔ پانسے کا پانسے سخت پریشانی کے عالم میں عبدالقادر نے ان دونوں ماماؤں سے کہا، تم دونوں ماماؤں سے میں اپنی زندگی اور سلامتی کی بھیک مانگتا ہوں۔ میرے ساتھ دغا نہ کرنا۔ اگر تم نے کوتوال صاحب کے سامنے ذرا بھی اقرار کر لیا تو تحقیقات کے سلسلے میں وہ ظالم پولیس والے میری جان ہی لے ڈالیں گے۔ تم دونوں میرا راز جانتے ہو، اور میں تم دونوں کا راز جانتا ہوں، اگر ہم تینوں نے ذرا بھی بھول کی تو پھر موت کے سوا اور کوئی چارا نہیں ہے، کہو اپنی زبان سے وعدا کرو کہ تم دونوں میرا راز افشا نہ کریں گی۔ اس کے جواب میں ان دونوں ماماؤں نے عبدالقادر کو تسلی اور تشفی دی کہ گھبراؤ نہیں بھائی، بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے، کہ اس آسانی سے ہم آپ کا راز کہہ دیں۔ ہم دونوں آپ سے وعدا کرتے ہیں کہ ہمارے مرتے دم تک بھی یہ راز کسی کو معلوم نہ ہوگا۔ تم ہم پر پورا پورا وشواس اور بھروسا رکھو۔ اگر ہم کو بھاری رقم اور زر و جواہرات کی رشوت بھی دی گئی تو ہم آپ کا بھید کسی پر بھی ظاہر نہیں کریں گے اس کے بعد بڑی ماما جی نے کہا، ہاں عبدالقادر بھائی یہ تو بتاؤ کہ آپ نے وہ موتیوں کی مالا کہاں بیچ دی، اس میں ہمارا بھی حصہ تھا، آخر اس مال غنیمت میں ہم دونوں بھی حصے دار ہیں۔ یہ سن کر عبدالقادر نے جواب دیا، جی ہاں، بلکل سچ ہے، اس میں ہم تینوں برابر کے حصے دار ہیں۔ میں وہ مالا اب تک بیچی نہیں ہے، بلکہ ڈیوڑی کے باہر حصے میں دفن کر دی ہے، اور اس مقام پر ایک بڑا پتھر بطور نشانی رکھ چھوڑا ہے۔ جب بندوبست کر کے اور پولیس کے پہرے سے نجات پا جاؤں

تو پھر میں اس مالا کو بیچ کر ہم تینوں میں برابر برابر رقم تقسیم کر دوں گا۔ ہاں یہ بات یاد رہے کہ اس طرف سے جاتے ہوئے، مرے بتائے ہوئے مقام کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھنا، اس لیے کہ کوتوال صاحب سرکار سے باتیں کر رہے ہیں، اس وقت ان کے ساتھی پولیس والے باہر کھڑے ہیں، اگر تم دونوں میں سے کسی نے بھی پلٹ دیکھا تو پولیس والے تاڑ لیں گے، اور دبوچ کر سے باہر کا سارا حصا کھرچ کر غائب کر دیں گے۔ جس کے نتیجے کے طور پر وہ مالا ان کے حوالے ہو جائے گی، اور ہم تینوں اس کے مالی فائدے سے محروم ہو جائیں گے، نیز شبہے کی حالت میں گرفتار بھی کر لیے جائیں گے۔ کہو اور کھلے طور پر کہہ کر آیا میری تمام شرطیں آپ دونوں کو منظور ہیں کہ نہیں؟

کیوں نہیں عبدالقادر بھائی۔ ہم دونوں کو آپ کی تمام شرطیں منظور ہیں، اور آپ نے ہمیں جو ہدایتیں دی ہیں، ان پر ہم پورا پورا عمل کریں گے، اب ہم کو شہزادی کے پاس جانا چاہیے، اور سرکار کا حکم سنا کر دو چار گھنٹے کے لیے کوتوال صاحب کے دفتر جانے کی اجازت لینی ہے، ہاں عبدالقادر بھائی اس بات کا خیال رہے کہ سرکار اور صاحبزادی دونوں بھی ہماری تائید میں ہیں، ہم دونوں صاحبزادی کو خوش رکھنے کی کوشش کریں گے، اور تم سرکار کو خوش رکھنے کی سعی کرو، اگر یہ دونوں ہم سب سے خوش رہیں تو پھر کوتوال صاحب اور ان کی پولیس ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔

یہ سن کر عبدالقادر نے کہا، ماما جی، میں ابھی سرکار کے حضور میں پہنچ کر ان کے دل و دماغ سے کوتوال کے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ سرکار کو مجھ پر بڑا اعتماد ہے، اس لیے وہ کسی صورت بھی تمہیں چور یا بدمعاش نہیں سمجھ سکتے۔

اس بات چیت کے بعد عبدالقادر سرکار کے دیوان خانے کی طرف دوڑتا دوڑتا گیا، جہاں سرکار کوتوال صاحب سے ایک اہم سیاسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے، اور۔ دونوں ماما جی صاحبزادی رحیم النسا کے محل کی طرف گئیں۔ جب یہ آپس میں تو وہ کمسن صاحبزادی ایک زرین مسہری کوچ پر لیٹے ایک انگریزی ناول کا مطالعہ کر رہی تھی۔ صاحبزادی کے قریب جاتے ہی دونوں ماما جی کوچ سے قریب تعظیماً بیٹھ گئیں، اور کوچ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی ماما جی نے کہا، شہزادی، کوتوال صاحب سرکار سے باتیں کر رہے ہیں، اور سرکار سے یہ عرض کیا تھا کہ دو چار گھنٹے کے لیے کسی تفتیش کے سلسلے میں ہم دونوں کو ان کے دفتر لے جانا ہے، اس پر سرکار نے فرمایا کہ ہم آپ سے اجازت حاصل کر کے جائیں، اگر آپ کی اجازت ہے تو ہم اسی وقت کوتوال صاحب کے ساتھ جاتے ہیں۔ یہ سن کر رحیم النسا نے ناول اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا اگر سرکار کا حکم ہے تو تم دونوں ابھی جا سکتی ہیں، مگر جلد آنا، میں تو اس وقت ایک انگریزی ناول کا مطالعہ کر رہی ہوں، جس کا موضوع بڑا ہی دلچسپ ہے، یعنی اس میں ایک نوجوان اور حوان لڑکی کے معاشقے کی داستان بیان کی گئی ہے، میں خدا بھی تقریباً دو چار گھنٹے تک اس دلچسپ ناول کے مطالعے میں مصروف رہوں گی، اور اس وقت تک تم دونوں کی یہاں ضرورت بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد بڑی ماما جی نے دریافت کیا، شہزادی اب آپ کا مزاج تو بالکل ٹھیک ہے نا؟ چہرے سے خوشی کے آثار ظاہر ہیں، اس پر رحیم النسا نے کہا، ہاں ماما جی، میرا مزاج بالکل ہی ٹھیک ہے، اور میں بے حد خوش ہوں، جب سے مجھ کو اپنے چاہنے والے کا خط مل گیا ہے، نئی خوشی اور مسرت سے پھولے نہیں سما رہی ہوں، ماما جی! اب میری یہ دلی آرزو ہے کہ میں دل و جان سے چاہتی ہوں جلد سے جلد ایک ہو جائیں۔ یہ سن کر بڑی ماما جی نے صاحبزادی کی بلائیں لیں، اور کہا قربان جاؤں تیری اپنی چاند سا زادی کے، وہ دن دور نہیں کہ ہم آپ کی اونا لونڈیاں آپ دونوں کے سہرے کے

بھول دیکھیں گے۔ سہرے کا لفظ سنتے ہی رحیم النسا پر ایک عجیب کیفیت شدید طاری ہو گئی، وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی، اور اس کے چہرے پر انتہائی خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی، اور اس نے کہا ماما جی! تم نے میرے دل کی بات کہہ دی، میں خدا بھی یہی چاہتی ہوں کہ ہم دونوں بچھڑے ایک ہو جائیں، اس میں تم دونوں ماماجی کی کوششوں کو بڑا دخل ہوگا، اور اس کام کے صلے میں، میں تم دونوں کو زر و جواہرات سے نواز دوں گی۔ یہ سن کر دونوں ماماؤں نے ایک آواز ہو کر کہا، شہزادی پاشا آپ یقین جانیے کہ آپ کے ہونے والے دلہا میاں کی تلاش میں ہم رات دن ایک کر دیں گے، اور یقین جانو کہ اسی سلسلے میں آسمان کے تارے تک توڑ لائیں گے، اور آخر کار ان صاحبزادے سے آپ کی شادی کروا کر رہیں گے، ہم سرکار کے اور آپ کے نمک خوار ہیں، اگر اس سلسلے میں حق نمک ادا نہیں کیا تو پھر کیا کام آئیں گے!

سرکار اور کوتوال صاحب دونوں بھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو ہم دونوں جاتے ہیں۔ یہ سن کر رحیم النسا نے کہا تم دونوں کو اجازت ہے، جا سکتی ہیں، مگر جلد ہی واپس آنا، اس پر بڑی ماماجی نے جواب دیا، پاشا آپ یقین رکھیں کہ ہم بہت جلد آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے، کہتے ہوئے دونوں ماما ئیں چلی گئیں۔

جہاں آسمان جاہ اور کوتوال باتیں کرتے بیٹھے تھے، یہ دونوں ماما ئیں داخل ہوئیں، اور آسمان جاہ کو آداب بجا لا کر عرض کیا کہ ہماری شہزادی نے ہمیں چند دیر کے لیے باہر جانے کی اجازت دے دی ہے، یہ سنتے ہی کوتوال صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور آسمان جاہ سے جانے کی اجازت مانگی، اس پر آسمان جاہ نے کہا، سنیے! کوتوال صاحب! ان ماماؤں کو زیادہ دیر تک اپنے پاس نہ رکھیں، جرح یا تحقیقات ہوتے ہی جلد واپس کر دیں، جس پر جو حکم کہتے ہوئے کوتوال صاحب نے آسمان جاہ کی خدمت میں جھک کر پانچ آداب بجا لائے، اور دونوں کو ساتھ لے کر باہر چلا گئے۔ باہر جانے کے بعد کوتوال صاحب اپنی بگھی میں اپنے دفتر گئے، اور دونوں ماما ئیں پولیس کے عہدے داروں کے ساتھ ٹھاٹھ سے چلی گئیں۔

پولیس کے جاتے ہی عبدالقادر، آسمان جاہ کے حضور میں پہنچ گیا، اور کہنے لگا کہ کوتوال صاحب نے سرکار کا بہت سارا وقت خراب کر دیا، سرکار بہت تھک گئے ہوں گے، اگر حکم ہو تو تکان دور کرنے کے لیے شربت کا ایک گلاس پیش کرتا ہوں، اس پر آسمان جاہ نے کہا، ہاں ٹھیک ہے، شربت لے آؤ، اسی سے تکان دور ہو جائے گی۔ واقعی کوتوال صاحب نے غیر ضروری طور پر ہمارا وقت خراب کر دیا۔ یہ کہتے ہی آسمان جاہ نے بازو جھوٹے سے اسٹول پر رکھی ہوئی ایک انگریزی کتاب دیکھنا شروع کر دی، اور ادھر عبدالقادر شربت لے آنے کے لیے چلا گیا۔ ایک شیشے کی خش نما اور قیمتی الماری میں شربت کے متعدد شیشے، گلاس اور کشتیاں وغیرہ رکھی تھیں، اس میں سے اس نے انار کا شربت منتخب کیا، اور نہایت ہی عالا درجے کی چاندی کی کشتی میں دو بڑے گلاس میں شربت بنا کر لے آیا، اور جاذو کی میز پر کشتی رکھتے ہوئے، ایک خالی چھوٹا سا خش نما اسٹول سرکار کے سامنے رکھا، اس کے بعد شربت کی کشتی اٹھا کر اس پر رکھ دی، اور اس میں سے شربت کی ایک گلاس، ایک نہایت ہی خش نما اور دلفریب طشتری میں رکھ کر دونوں ہاتھ سے تعظیم نیچے جھکتے ہوئے آسمان جاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ شربت کا گلاس طشتری کے ساتھ لیتے ہوئے آسمان جاہ نے کہا، سنو عبدالقادر میں دو گلاس شربت نہیں پیوں گا، میرے لیے ایک گلاس کافی ہے، اور یہ دوسرا گلاس صاحبزادی کو دیدو، کہنا کہ گرمی کا وقت ہے، میں نے کہا ہے کہ یہ شربت پی لیں۔ یہ سنتے ہی، جو حکم کہتے ہوئے عبدالقادر نے شربت کی کشتی اٹھائی، اور رحیم النسا کے محل کی طرف

روانا ہو گیا، اور ادھر آسمان جاہ نے شربت پینا شروع کر دیا۔

رحیم النسا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی عبدالقادر نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اس کی اجازت کے بعد کشتی لے کر کوچ کے قریب گیا، اور کشتی اس کے ملاحظے میں پیش کرتے ہوئے کہا، سرکار کے حکم سے دو گلاس انار کا شربت برف ڈال کر بنایا ہے۔ سرکار نے ایک گلاس لیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ میں یہ عرض کروں کہ اس وقت گرمی زیادہ ہے، اس لیے یہ شربت آپ بھی نوش فرمائیں۔ یہ سنتے ہی رحیم النسا نے کہا، کشتی اس خالی اسٹول پر رکھ دو، اور سرکار اماں سے ہمارا شکریہ ادا کرنا، چنانچہ کشتی رکھ کر عبدالقادر آسمان جاہ کی خدمت میں پہنچ گیا، اس وقت تک آسمان جاہ شربت پی چکے تھے، اس لیے عبدالقادر نے خالی گلاس اٹھا لیا، اور عرض کیا، سرکار بہت تھک گئے ہیں، کچھ دیر آرام فرمائیں تو مناسب ہو گا۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے کہا، تم ٹھیک کہتے ہو عبدالقادر، واقعی میں بہت تھک گیا ہوں، مجھے تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے، تم جا سکتے ہو، کہتے ہوئے آسمان جاہ کوچ پر دراز ہو گئے، اور جھک کر آداب بجا لا کر عبدالقادر چلا گیا۔ شربت کا گلاس الماری میں رکھ کر عبدالقادر اپنے کمرے میں گیا، اور سوچنے لگا کہ آخر ہمارا کیا حشر ہو گا، پولیس جرح پر جرح کیے جا رہی ہے، اس لیے اس کے ظالم چنگل سے ہم تینوں کو بھی نجات نہیں مل سکتی۔ آخر اس کا حل کیا ہو سکتا ہے!

اتنے میں دل ہی دل میں کہا، اگر ہم شہزادی ہی کو ختم کر دیں، تو پھر سب جھگڑے ہی ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ پولیس کو بیان دے سکتی ہے، اور نہ پولیس ہم سے باز پرس کر سکتی ہے۔ آخر اس کا حل کیا ہے، بالآخر اس نے طے کیا کہ افیون مٹھائی میں ملا کر شہزادی کو کھلائی جائے تو ایک طویل عرصے تک بے ہوش رہنے کے بعد اس کے سارے جسم میں زہریلے اثرات سرایت کر جائیں گے اور آخر کار وہ مر جائے گی۔ اس کے بعد ہمیں نجات مل جائے گی۔ اس سے یہ کہا جائے کہ یہ مٹھائی اس کے عاشق زار افضل خان نے بھجوائی ہے، اس لیے وہ اس کو قبول کرنے اور کھانے سے انکار نہیں کرے گی، چنانچہ وہ چند روپے اپنے ساتھ لے کر پہلے افیون کی دکان پر گیا، اور دکان دار سے دو تولے افیون مانگی، دکان دار نے کہا، عبدالقادر آج تم افیون خرید رہے ہو، کیا کرنا چاہتے ہو، آیا کسی کو زہر دینے کا ارادہ ہے تمہارا؟ تم خود تو افیون نہیں کھاتے، مگر بعض وقت ڈیوڑھی میں ضرورت جتنا کر چند ماہ سے افیون تولے جایا کرتے تھے۔ سچ سچ بتا دو کہ آج اتنی زیادہ افیون کیوں خرید رہے ہو۔ یہ سن کر عبدالقادر نے ہنستے ہوئے کہا، ارے لالہ جی! تم بھی عجیب مسخرے آدمی نکلے۔ بھلا میرا کون دشمن ہے جو افیون کھلا کر میں اس کو ختم کر دوں گا۔ ارے، بھئی نیند بہت اچاٹ ہو گئی ہیں۔ ساری ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی ہیں، میرا ارادہ ہے کہ روزانہ رات میں سونے سے پہلے تھوڑی تھوڑی افیون کھا دوں تو شاید سکون نصیب ہو، اور نیند بھی آ جائے۔ لاؤ دو تولے افیون اور جو بھی قیمت ہے فوراً مجھ سے لے لو۔ یہ سن کر لالہ نے دو تولے افیون تول کر عبدالقادر کو دی، اور اپنے رجسٹر میں عبدالقادر کا نام، اس کی ملازمت، اور افیون کی مقدار مع تاریخ نوٹ کرتے ہوئے، رجسٹر میں عبدالقادر کی دستخط بھی لی، اور دو تولے کی قیمت چار روپے بھی لی۔

افیون خرید کر عبدالقادر شامی حلوائی کی دکان پر گیا، اور پانچ سیر خاصے کی مٹھائی اور چند مٹھائی خریدی۔ یہ سامان خرید کر عبدالقادر اپنے کمرے میں آیا۔ مٹھائی کی ٹوکری علیحدہ رکھ کر اس نے دو تولے افیون کو کٹورے میں پانی ڈال کر حل کرنا شروع کیا، جب ساری افیون

پانی میں گھل گئی تو عبدالقادر نے مٹھائی کی ٹوکری اٹھالائی اور اس کے کھولنے کے بعد ساری مٹھائی کو چینی کے تاب میں رکھ کر اپنے ہاتھ سے اچھوں کا محلول آہستہ آہستہ اور نہایت احتیاط کے ساتھ چھڑکنا شروع کیا۔ جب یہ کام پورا ہو گیا تو کچھ دیر کے بعد اس نے دیوڑھی کے چیز خانے کی بہترین قابیں اور کشتیاں اور سرپوش وغیرہ لے آئے، اور ان قابوں میں یہ زہریلی مٹھائی سلیقے سے جمانا شروع کر دی۔

ایسے میں کسی نے کنڈی کھٹ کھٹائی۔ عبدالقادر نے کہا، کون ہو۔ باہر سے آواز آئی ہم ہیں، دروازہ کھولیے۔ اس پر عبدالقادر نے جواب دیا، میں اس وقت ایک اہم کام میں مصروف ہوں، نہیں مل سکتا، کچھ دیر بعد آنا، واپس چلے جاؤ۔ پھر سے آواز آئی ہم ہیں عبدالقادر بھائی، آپ کی دونوں مامی۔ یہ سنتے ہی عبدالقادر دروازے کی طرف گیا، اور دروازہ کھول کر دیکھا کہ واقعی دونوں مامی کھڑی ہیں۔ اس نے جلدی سے کہا، فوراً اندر آجاؤ، اور ان دونوں ماماؤں کے اندر آتے ہی پھر سے اس نے دروازا بند کر دیا۔ اندر داخل ہوتے ہی ماماؤں نے کہا، بھائی! آج پولیس والوں نے ہمارے ہری طرح سے خبر لی، ہم دونوں کو مارا پیٹا، پیٹ اور پیٹھ پر چرکے دیے، اور بری بری فحش گالیاں بھی دیں، سادہ موتیوں کی مالا کہاں ہے، ورنہ ہم تمہاری جان لے لیں گے۔ اس پر ہم نے ان سے کہا کہ آپ ہمیں مار ڈالیں بھی تو غلط نہیں بتائیں گے۔ ہم پر گز نہیں جانتے کہ وہ مالا کس نے چرائی ہے، اور کس کے قبضے میں ہے۔ آپ چاہیں جتنا تظلم کریں، ہم اپنے آقا اور مالک اور بھائی سے کبھی سچ کہہ سنائیں گے۔ اس پر انھوں نے کہا، خیر اب تو تم دونوں مامی جا سکتی ہو، مگر ہم بعد میں تمہیں پھر سے بلوائیں گے، اس لیے ان کے چنگل سے نجات پاکر ہم سیدھے تمہارے ہاں آئے ہیں۔ اس کے بعد مٹھائی پر نظر پڑتے ہی دونوں ماماؤں نے کہا کہ یہ مٹھائی کس تقریب میں آئی ہے، اتنی زیادہ اور یہ قابیں اور کشتیاں وغیرہ کیا کسی کے گھر بھیجا جوا رہے ہو۔ اس پر عبدالقادر نے کہا ہاں بھیجوانا ہے، اور یہ بھی ایسا نادر ہوگا کہ کھانے والے کو خود ختم کر دے گا۔ یہ سنتے ہی دونوں ماماؤں کے ہوش و حواس جاتے رہے، اور انھوں نے اصرار کے ساتھ دریافت کیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ تب عبدالقادر نے اپنے زہریلے اور خطرناک انتظام یا پلان کی تفصیل سنائی کہ یہ شیرینی اور زہریلا بھجوا، افضل خان کی طرف سے صاحبزادی کی خدمت میں پیش کیا جائے گا، اور وہ پیش کرنے والا میں ہوں گا، جس نے سابق میں عورت کا بہانہ کر کے کامیاب پارٹ ادا کیا ہے، اور اب میں اسی عورت کے بھیس میں تمہارے ساتھ یہ دونوں کشتیاں مٹھائی کی لے جاکر کہوں گا کہ نواب افضل خان بہادر نے شہر کی عالا درجے کی مٹھائی کا یہ بھجوا آپ کی خدمت میں روانہ کیا ہے، اور یہ کہنے کی تاکید کی ہے کہ یہ لذیذ ترین عالا درجے کی مٹھائی آپ کسی کو نہ دیں، اور نہ ہی کسی کو تقسیم کریں، بلکہ خود ہی رکھ کر روزانہ کھائیں تو مجھ دلی مسرت اور خوشی ہوگی، اور بیٹے ماماؤں نے اس ساری مٹھائی میں پورے دو تولے افیون گھول کر ملا دی ہے۔ افضل خان کا نام سن کر صاحبزادی اس کے قبول کرنے سے انکار نہیں کرے گی، خوشی سے قبول بھی کرے گی، اور مسرت کے ساتھ کھائے گی بھی، اور اس کے بعد نتیجا ظاہر ہے، یعنی آپ کی صاحبزادی مر جائے گی۔ اس کے مرنے کے بعد پولیس کس طرح بیانا حاصل کرے گی، اور اس خطرناک پلان کے بعد ہم تینوں کو پولیس کے چنگل سے نجات مل جائے گی، اور ہم تینوں مل کر اس مٹھائی اور عالا درجے کی موتیوں کی مالا بیچ کر اتنی زیادہ رقم حاصل کر لیں گے کہ ایسا نا طریقے پر بٹھاٹ کی زندگی بسر کر سکیں گے۔

اس زہریلے اور خطرناک اقدام کے سنتے ہی دونوں ماماؤں کے ہوش جاتے رہے۔ بعد دونوں نے

ہات جوڑ کر کہا، نہیں، عبدالقادر بھائی! ہماری شہزادی کی نوجوان خوبصورت اور نیک سیرت ہے، وہ ہماری ہمدرد بھی ہے، بلکل ہی معصوم اور بھولی بھالی ہے۔ اس کی جیسی شہزادیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ ہم دونوں بھی ہات جوڑ کر اس کی زندگی اور سلامتی کی بھیک مانگتی ہیں۔ رحم کرو بھائی۔ اتنا خطرناک اور جان لیوا اقدام نہ کرو، کہتے ہوئے بلبلا کر رونے لگیں۔ اس پر عبدالقادر نے کڑک کر سختی کے ساتھ کہا، خبردار اگر میرے منصوبے اور پلان میں آپ دونوں حائل ہوئیں تو دونوں کو جنبیا یا کٹھار سے ابھی پھونک دوں گا۔ تم دونوں نادان اور بے وقوف ہو۔ کیا تم سمجھ نہیں سکتیں کہ صاحبزادی ہماری زندگی میں رکاوٹ ہیں ہو گئی ہے۔ اس کی موت سے ہم تینوں کی زندگی، حیات اور دولت و ثروت، عزت و وقعت وغیرہ اس پر کو ملے گی۔ آخر عورت ہی تو ہو، نادان ہو، آخر ہیں صاحبزادی سے بڑی ہمدردی جتانے کے لیے۔ خاتون ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو تم دونوں کی زبانیں کھینچ لوں گا، اور اگر مجھ کو بری نظروں سے دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گا۔ میرے صبر کا پیالا چھلک چکا ہے۔ میری اور ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ ہم تینوں مل کر صاحبزادی کو ختم کر دیں۔ وہ خاموش کھا ہے کی اور اس کے زہریلے اثرات سے بے ہوش رہ کر مر بھی جائے گی۔ یہ ایک ایسا راز ہے کہ سرکار پر بھی نہیں کھل سکے گا، اور سرکار انہیں کو طبعی موت سمجھیں گے۔ ہم پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا سمجھ گئیں نا، یہ کہتے ہوئے عبدالقادر اپنے کمرے کے ایک کونے میں گیا، اور شراب کا شیشہ اور تین گلاس لے آیا۔ شیشا کھول کر تینوں گلاس میں شراب ڈالی ایک گلاس خود پی لی، اور باقی دو گلاس ان دونوں ماماؤں کو دیتے ہوئے کہا، تم شراب پیتے رہو میں اپنا لباس بدل کر ساڑی چولی پہن کر ابھی آتا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد یہ دونوں مامائیں شراب پینے میں مصروف ہو گئیں، اور تھوڑی دیر میں عبدالقادر زنانی لباس پہنے آیا، اور تینوں نے مل کر تین کشتیاں سر پر رکھ لیں، اور رحیم النسا کے محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

عروس نو

رؤف پرویز

عروس نو کی ہے آمد خوشی کی محفل میں
کرن سنور کے چلا آیا جانۂ دل میں
ہر ایک سمت مسرت ہے شادمانی ہے
یہ منتہائے عقیدت کی ترجمانی ہے
جوان سال امنگوں کی برکتوں کا ثمر
جسے نگاہ مقدر نے کر لیا ہے قبول
حسین سرخ شگفتہ گلاب سا چہرہ
خوشی کے اشک مقدس سے دھلکے نکھرا ہے
جھکی جھکی سی وہ مخمور نرگسی آنکھیں
دھلا دھلا سا وہ بلور سا شفاف بدن
وہ زیر سایۂ آنچل گھٹا کی قوس قزح
سراپا جیسے کوئی شعر، گیت، نغمہ، غزل
سکوں کی چاندنی پھیلی ہے آج آنگن میں
اٹھی کی روشنی بکھری ہے آج گلشن میں
نیا نیا سا تصور نیا نیا سا خیال
نئی امنگیں نئی تمنائیں نئے سوال
حیات کے خاکہ میں رنگ و ضو ملا لائے
نئی حیات کا نقشہ نیا بنا لائے
ابھی تو برق سے آنکھیں ملا کے جینا ہے
ہر ایک موڑ پہ طوفان سے گزرنا ہے
ہمیں تو وقت کے دھارے کے ساتھ چلنا ہے
خزاں کیساتھ بہاروں کیساتھ چلنا ہے
ہمارے ہاتھوں سے پھول سے مہکے گلشن
ہمارے ہاتھوں سنور جائے وقت کی دلہن
رہ وفا میں بڑھیں ساتھ جانب منزل
جو ہم چلیں تو زمانہ بھی ساتھ ساتھ چلے

اسفندار۔فروردی۔اردی بہشت ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب جنوری۔فروری۔مارچ ۱۹۷۳ء

جی۔ام۔خان ام۔اے (عثمانیا) ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

گورنر میکر جی۔ام۔خان

مسز اندرا گاندھی، پرائیم منسٹر آف انڈیا

کنگ میکر ہے!

اور

جی۔ام۔خان، ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

گورنر میکر ہے!

جس طرح کسی بھی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکل اسی طرح اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسز اندرا گاندھی پرائیم منسٹر آف انڈیا "کنگ میکر" ہے۔ نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ مسز اندرا گاندھی نے اب تک دو کنگ یا بادشاہ بنائے ہیں۔ کنگ یا بادشاہ سے ہماری مراد پریسیڈنٹ آف انڈیا ہے۔ مسز اندرا گاندھی نے سب سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین کو پریسیڈنٹ آف انڈیا بنایا تھا، اور ذاکر حسین کے اچانک طور پر چلے جانے کے بعد مسز اندرا گاندھی نے وی۔وی۔گری کو پریسیڈنٹ بنایا۔ مسز اندرا گاندھی کے پریسیڈنٹ بنانے سے ہماری جرات ہرگز یہ نہیں ہے کہ قانون یا دستور پرائیم منسٹر آف انڈیا کو ایسا کوئی اختیار دیے کہ وہ جس کسی کو چاہے پریسیڈنٹ آف انڈیا بنا دے، بلکے اس سے ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسز اندرا گاندھی ذی اثر پرائیم منسٹر آف انڈیا ہے

اسی لیے ہندستان کے کروڑوں آدمی، اس کا کہنا مانتے ہیں، اور کانگریسی تو ایک دیوی طرح اس کی پوجا اور پرستش کرتے ہیں۔ اس کے اسی غیر معمولی اثر کے باعث سبا راؤ، سابق چیف جسٹس آف انڈیا کے مقابل ڈاکٹر ذاکر حسین کو ممدار قی انتخاب میں کامیابی ہوئی تھی، اگر مسز گاندھی، ذاکر حسین کی طرف دار نہ ہوتیں تو عمر بھر ذاکر حسین پریسیڈنٹ آف انڈیا نہ بن سکتے تھے۔

ہندستان میں صدارتی انتخاب INDIRECT طریقے پر ہوتا ہے، یعنی لوک سبھا اور راجیا سبھا کے ممبروں کے علاوہ ہر اسٹیٹ کے لیجسلیٹو اسمبلی اور لیجسلیٹو کونسل کے تمام ممبروں، اور ریونیو ڈسٹرکٹس کے تمام ممبروں کی رائے سے ہوتا ہے۔ جو کوئی امیدوار کو زیادہ آرا ملیں، وہ صدر منتخب ہوتا ہے، چنانچہ مسز اندرا گاندھی کے شخصی اثر کے سبب ذاکر حسین کو زیادہ ووٹ ملے تھے، اسی لیے سبا راؤ کے مقابل ذاکر حسین پریسیڈنٹ آف انڈیا بنے تھے۔

ذاکر حسین کے مرنے کے بعد جب نئے صدر کا مسئلہ پیش ہوا تو مسز اندرا گاندھی نے وی۔ وی۔ گری کی تائید کی، اور اپوزیشن کانگریس نے این۔ سنجیوا ریڈی کی تائید کی تھی۔ مسز اندرا گاندھی، اور اپوزیشن کانگریس میں بہت زیادہ اختلافات تھے۔ اگر سنجیوا ریڈی پریسیڈنٹ آف انڈیا منتخب ہو جاتے تو لازمی طور پر مرارجی دیسائی پرائم منسٹر آف انڈیا بنتے، اور اندرا گاندھی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ مرارجی دیسائی پرائم منسٹر آف انڈیا بنیں۔ اسی وجہ سے مسز گاندھی نے وی۔ وی۔ گری کو پریسیڈنٹ آف انڈیا بنانے میں اپنی چوٹی کا زور لگایا، اور اپنی تمام تر صلاحیتیں ختم کر ڈالیں، اور اپنے ذاتی اثر کو بھی کام میں لایا۔ پرائم منسٹر اور پریسیڈنٹ کے ہم خیال ہونے سے ریاست یا حکومت کے کاروبار بلا رکاوٹ اور آسانی سے طے پاتے ہیں، اور اگر اتفاق سے پرائم منسٹر اور پریسیڈنٹ نہ ہوں تو آپس میں سخت اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، اور حکومتی کاروبار کی بجا آوری میں بڑی مشکلات اور دشواریاں پیش آتی ہیں۔ انہی مشکلات اور دشواریوں سے بچنے کی خاطر مسز اندرا گاندھی نے اپنے دو ہم خیال پریسیڈنٹ بنائے اس لیے وہ "کنگ میکر" کہلائیں گی!

بلکل اسی طریقے پر جی۔ ام۔ خان ام اے (عثمانیا) ایڈیٹر "ہندستانی ادب" نے اپنے قلم کی بے پناہ قوت اور غیر معمولی زور و اثر کی وجہ سے اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنایا ہے! اپنے اس ناقابل قبول بیان اور استدلال نیز دعوے کو پڑھ کر آپ ضرور ہمارے متعلق یہ رائے قایم کریں گے کہ ان سطروں کے لکھتے وقت ممکن ہے، جی۔ ام۔ خان کے دماغ پر جنون کا دورہ پڑا ہو، اور اس کو اس بات کا تک احساس نہیں ہے کہ وہ کیا بک رہا ہے، اور لفظوں کے "بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ" کو بھلاتے ہوئے یہ شیخی بگھار دی کہ ایڈیٹر "ہندستانی ادب" نے اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنایا ہے" یہ پڑھ کر آپ زور دار قہقہے لگائیں گے، اور دوسروں سے مزاحیا انداز میں کہیں گے کہ سنا آپ نے

جی۔ ام۔ خان نے اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنایا ہے ——! اس کے ساتھ ہی ایک زور دار قہقہہ۔ ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ——! واہ! کیا کہنے ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے اس نے اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر

بنا دیا ہے!

ہم خدا بھی مانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کا ہمارا اندازِ اڑانا، اور ہمارے اس ناقابلِ قبول انکشاف سے متعلق اپنی غلط رائے قایم کرنا سنرفی صد بھی ہے، جس سے ہم خدا بھی متفق ہیں، مگر اس کے باوجود، یہ کہتے ہوئے خدا ہمیں بھی نہیں آرہی ہے کہ بات تو کچھ ایسی ہی ہے، اس لیے کہ آپ کے باور اور یقین نہ کرنے کے باوجود ہم آپ کو مجبور کرتے ہیں کہ یہ ایک چھپی حقیقت ہے، جس کو آپ کو قبول کرنا ہی پڑے گا، اور اس حقیقت سے صرف مسز اندرا گاندھی، پرائیم منسٹر آف انڈیا، اور جی۔ ایم۔ خان، ایڈیٹر "ہندستانی ادب" اور اکبر علی خان، گورنر اتر پردیش ہی واقف ہے! اندرا گاندھی کی بھالا سے بھی بڑی شخصیت ہے، اس لیے اس کو کیا پڑی ہے کہ ایک گمنام شخص "ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کی تخریک کو دوسروں پر واضح کرے، اور اس بات کا اعتراف کرے کہ واقعی جی۔ ایم۔ خان کی تخریک پر، اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی سفارش پریسیڈنٹ آف انڈیا سے کی ہے، اور اکبر علی خان نے بھی یہی خیال کیا ہوگا کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ پرائیم منسٹر آف انڈیا کی سفارش پر پریسیڈنٹ آف انڈیا نے مجکو اتر پردیش کا گورنر بنایا ہے، رہا جی۔ ایم۔ خان کا سوال تو میں دوسروں سے اس حقیقت کا اعتراف اور اعتراف کیوں کروں کہ ہاں بھائیو، واقعی جی۔ ایم۔ خان، ایڈیٹر "ہندستانی ادب" نے میرے اتر پردیش کے گورنر بنائے جانے کے سلسلے میں، انگریزی میں ٹائپ کے ہوئے صفحے کا لیٹر پرائیم منسٹر آف انڈیا کے نام لکھا تھا جس میں یہ واضح طور پر بتایا تھا کہ اکبر علی خان کون ہے، اور کیا ہے "اکبر علی خان ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۲ء تک راجیا سبھا کا ممبر رہا ہے، اکبر علی خان برسوں نئی دلی کی گلیوں میں پڑا رہا، مگر تم نے اس کو پلٹ کر تک نہ دیکھا، اور تمہارے باپ نہرو نے اپنی ساری زندگی میں بے چارے اکبر علی خان کو ایک بار بھی ملاقات کا موقع تک نہ دیا۔ اس بے حیائی کو گوارا کرتے ہوئے بھی اکبر علی خان ایک گداگر کی طرح دلی ہی کی سڑکوں پر پھرتا رہا، نہ جواہر لال نہرو نے اس کے ساتھ کوئی سلوک کیا، اور نہ لال بہادر شاستری دوسرے پرائیم منسٹر آف انڈیا نے اس کو نوازا، اور نہ مسز اندرا گاندھی ہی اپنے چار سالا پرائیم منسٹری کے دور میں اکبر علی خان کے ساتھ مادرانا شفقت اور محبت سے پیش آئیں، مگر یہ بلکل سچ ہے کہ جی۔ ایم۔ خان کے موثر اور جادو بھرا صفحے کے انگریزی لیٹر سے مسز اندرا گاندھی بے حد متاثر ہوئیں، اور اس وقت ان

کی آنکھیں کھلیں کہ اکبر علی خان کون ہے، اور کیا ہے، چنانچہ ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے اس لیٹر کی بنا پر، مسز اندرا گاندھی نے پریسیڈنٹ آف انڈیا سے اکبر علی خان کے اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی سفارش کی تھی، چونکہ یہ لیٹر خود اکبر علی خان نے دیکھا تھا، اس لیے اکبر علی خان کا دل گواہی دیتا ہے، اور ضمیر بھی یہی کہتا ہے کہ احسان فراموش اے اکبر علی خان تجکو گورنر کس نے بنایا، اندرا گاندھی نے، نہیں نہیں، اے پاگل جھوٹ مت بول، جھوٹ بولنے سے تیرا منھ کالا ہوجائے گا! او پگلے تو آج ہے، اور کل مرنے والا ہے، مرتے مرتے جھوٹ بول کر اپنے دل اور ضمیر کو دھوکا کیوں دے رہا ہے! ارے وہ مکار اور فریبی، اے وہ لعنتی اور دغا باز تو اپنے محسن کا کھلا اعتراف کرنے اور دوسروں پر اس کا احسان جتانے سے گریز کیوں کر رہا ہے، مگر تو نے یہ بلکل ہی بھلا دیا ہے کہ ایک کھلی حقیقت کو تیرے چھپانے سے کیا ہوتا ہے ــــ کیا تو نے اس بات کو سراسر بھلا دیا تھا کہ ایڈیٹر "ہندستانی ادب" ایک صاحب قلم ایڈیٹر ہے، جس کے قلم کی موشگافیوں اور زہر پاشیوں سے رستم دوراں تک گھبراتے اور لرزتے ہیں۔ اس کا جادو گر قلم کوہ کو کاہ، اور کاہ کو کوہ کر سکتا ہے، وہ ذرے کو آفتاب اور آفتاب کو ذرا بنا سکتا ہے۔ ارے سن! او کم عقل کہ تو ایک ذرا تھا، اس ذرے کی اس کے قلم نے ایسی بے پناہ تعریف کی کہ وہ آفتاب عالم تاب بن گیا، روشن ہوتے ہی منور ہو گیا، اور اس کی شہرت کے ذرے جگمگانے لگے، چنانچہ اس کے جادو اثر قلم نے حج جیسے ذرے بے مقدار کو ایک آفتاب ایک

ماہتاب کی شکل میں پیش کرتے ہوئے
مسز اندرا گاندھی پرائیم منسٹر آف انڈیا کی
بند آنکھیں کھولیں، اور چکا چوند بھی کر دیں،
اور وہ بلبلا کر کہہ اٹھیں ــــ! ارے یہ
کیا ہے؟ اکبر علی خاں! ہمارے باپ اور
شاستری جی نے اور خدا میں نے بھی اس
کو بے کار محض، مرغئ گوشت سمجھ رکھا
تھا، مگر جی۔ام۔خاں، ایڈیٹر "ہندستانی
ادب" کے سحر آگیں قلم نے مجھکو اس بات
پر مجبور کر دیا ہے کہ میں اکبر علی خاں، حیدرابادی
کو پریسیڈنٹ آف انڈیا سے اتر پردیش کا گورنر
بنائے جانے کی سفارش کروں! اے احسان
فراموش اکبر علی خاں میں ہوں تیرے ضمیر کی
آواز، سن او مکار، دغا باز، فریبی اور
جعلساز دونوں کان کھول کر سن کہ صرف
اور صرف "ہندستانی ادب" کے جادوگر
قلم سے متاثر ہو کر مسز اندرا گاندھی نے
پریسیڈنٹ آف انڈیا سے تیرے اتر پردیش
کا گورنر بنائے جانے کی سفارش کی تھی،
اور حقیقت میں تو اس کے بعد گورنر بنایا گیا
ہے، ورنا اس سے پہلے تو گورنر کیوں نہیں
بنایا گیا، حالانکے تو لیلائے نئی دلی کی
گلیوں میں مجنوئے گداگر کی طرح برسوں
خاک چھانتا پھرتا رہا، اور ایک مرتبا بقول
غالب یہاں تک نوبت آگئی تھی ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

تو بھی ایک مرتبا لیلائے نئی دلی کے پاس گورنری
کی بھیک مانگنے گیا تھا تو وہاں کے پاسبانوں
نے ڈنڈوں سے تیری بری طرح خبر لی تھی،
ڈنڈے کھانے کے باوجود تو وہاں اس آس
اور امید پر پڑا ہوا تھا کہ شائید کسی وقت
بھی گورنری کی بھیک کا ٹکڑا تجکو مل جائیگا،
جس سے تو اپنے حریص لالچی طماع من کو دلاسا

دے سکے ۔ تیری اس بے حیائی اور بے شرمی سے خدا لیلائے دلی تنگ آگئی تھی، اس لیے ۱۹۷۲ء میں تیری پیٹھ پر دولتی لگا کر تجھکو نئی دلی سے نکال باہر کیا، تاکہ یہ بلا رہے، اور نہ گورنری کی بھیک مانگنے پائے!

من کی آنکھیں کھول کر دیکھ، او احسان فراموش اکبر علی خان، کہ تو کیا تھا اور کیا سے کیا بنا دیا گیا ۔ تو دھوکا دے سکتا ہے تو جھوٹ بول سکتا ہے اکبر علی خان، مگر میں ہوں تیرا ضمیر تو کبھی بھی اور ہرگز ہرگز جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ضمیر سچی سچی باتیں کہہ گزرتا ہے، اور اب بھی تیرے ضمیر کا یہی کہنا ہے کہ یہ سچ ہے کہ تو جی۔ ام۔ خان ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے انگریزی (۱۲) صفحے کے مضمون کا آرا لیٹر کی بنا پر انٹرپریٹر کا گورنر بنایا گیا ہے، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے وہ لیٹر دیکھا تھا، دیکھنے کے بعد اٹھا کر پھینکتے ہوئے ٹھیٹ دکنی زبان میں کہا تھا کہ "کیا ہوتا ہے میاں ایسے لیٹروں کے لکھنے سے ۔ اس نے کیا کیا میرے ساتھ ۔ اس کے باپ نے کیا کیا میرے ساتھ ۔ شاستری جی نے کیا کیا میرے ساتھ ۔ میں برسوں سے دلی میں پڑا ہوا تھا، اگر ان کو کچ کرنا تھا تو پہلے ہی کر جاتے، تمہارے لیٹر لکھنے سے کیا ہوتا ہے، بیکار لکھا یہ لیٹر میاں تم نے" اس بے چارے کی تو نے بری طرح سے خبر لی تھی، اور بری طرح مذمت بھی کی تھی، اور اپنی سو فی صد مایوسی کا اظہار کیا تھا کہ تو نے برسوں دلی میں گداگری کی، لیکن تجکو گورنری کی بھیک نہیں ملی تھی، اس لیے تیرا یہ ایقان کامل تھا کہ ایک

گمنام اور معمولی آدمی جی۔ام۔خان، ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے لیٹر لکھنے سے تو اتر پردیش کا گورنر کیسے اور کیوں کر بن سکتا ہے! سن او نادان میں ہوں تیرے مافی الضمیر کی صحی صحی آواز، اور اب میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ تو حقیقت میں جی۔ام۔خان کے اسی سحر آگیں، اور سحر آفریں، اور جادو گر لیٹر کی بنا پر اتر پردیش کا گورنر بنایا گیا ہے! ارے او احسان فراموش! سن، اور تو کان کھول کر سن! اگر تیرے میں ذرا بھی غیرت، عزت، حمیت، خدداری، اور شرم وحیا ہوتی تو گورنر بنائے جانے کے فوراً بعد اپنے گھر "اسٹون ہاوز" سے "ہندستانی ادب" کے دفتر تک اپنے سر کے بل چلتا ہوا جاتا، اپنے "محسن اعظم" ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیتا، اور بھی سن! اس کے باوجود، اس کے گرانمایا، اور گرانقدر احسانات کا بدلا پوری طرح سے نہ چکایا جاسکتا تھا!

ارے وہ ضمیر فروش، مکار، دغا باز، فریبی، دھوکے باز، جھوٹے اور نابکار شخص تونے اپنے "محسن اعظم" ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے نام شکریے کا ایک لیٹر تک نہ لکھا، اور ساری دنیا کو اس بات کا دھوکا دے رہا ہے کہ تو اپنی قابلیتوں کی وجہ سے اتر پردیش کا گورنر بنایا گیا ہے، حالانکے یہ سو فی صد جھوٹ ہے!

یہ تھی گویا اکبر علی خان گورنر اتر پردیش کے ضمیر کی آواز۔ اگر ان کے ضمیر نے انھیں برا بھلا کہا ہے تو وہ جانیں اور ان کا ضمیر، اس سے ہمیں بھلا کیا واسطہ ہو سکتا ہے!

مگر یہ سو فی صد سچ ہے کہ جی۔ام۔خان

ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے قلم کے زور پر اکبر علی خان اتر پردیش کے گورنر

بنے ہیں واقعہ یہ ہے کہ راجیا سبھا کے ممبر کی حیثیت سے اکبر علی خان برسوں دلی میں رہے۔ نہرو سے تو قریبی توقع نہیں تھی کہ وہ اکبر علی خان کو گورنر بنائیں گے یا اپنی کابینا میں شریک کریں گے یا کسی ڈپلومیٹک پوسٹ پر ہندستان سے باہر بھجوائیں گے، اس لیے کہ اکبر علی خان کے خلاف غلط طریقے پر نہرو کے کان بھر دیے گئے تھے کہ اکبر علی خان کو قاسم رضوی کے رضاکار آنا علی سے ہمدردی تھی، اس لیے نہرو ایک ایسے شخص کی صورت تک دیکھنا نہیں گوارا کر سکتے تھے۔ نہرو کو خوش کرنے کی خاطر اکبر علی خان نے ایک چال یہ چلی کہ شہر حیدرآباد سے چند میل کے فاصلے پر عنبر پیٹ میں ان کی قانونی اور بنگل نے کار زمین پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس زمین کے ساتھ پچاس ہزار روپیہ لگا بھی دیا، تاکہ حکومت آندھرا پردیش وجود میں آئے تو جواہر لال نہرو پاپلک اسکول بنائے۔ حکومت نے اس قطعے کو تحویل کیا، اور وہ جلد ہی اسکول بنایا گیا، جو آج تک کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے، مگر نہرو نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔

نہرو کے بعد شاستری پرائیم منسٹر آف انڈیا بنے۔ اکبر علی خان کو توقع تھی کہ شاستری ان کے لیے کچھ نہ کچھ کریں گے، مگر شاستری نہرو کے سچے چیلے تھے، اس لیے انہوں نے بھی اکبر علی خان کو بری طرح سے نظر انداز کر دیا تھا۔ شاستری کے بعد مسز اندرا گاندھی پرائیم منسٹر آف انڈیا بنیں تو انہوں نے اکبر علی خان کو کچھ امید سی ہو چلی تھی کہ یہ دیوی بھی کچھ نہ کچھ دیا کریں گی، مگر اندرا گاندھی کا پہلا دور مایوسی کے ساتھ گزر گیا، اور دوسرے دور میں بھی وہ بات نہیں ہو سکی۔ ہمیں یہ محسوس ہوا کہ یہ خیال بہت تھا کہ اکبر علی خان کے ساتھ کچھ نہ کچھ بہتر سلوک ہونا چاہیے، ہم اس توقع کے متلاشی تھے کہ آخر وہ وقت آ ہی گیا۔ مئی اور جون ۱۹۷۲ء میں کئی گورنر اپنی اپنی خدمت سے الگ ہو رہے تھے۔ یہ خبریں ہم فلمی دنیا کے روزانا انگریزی اخباروں میں دیکھ رہے تھے، اس سلسلے میں ایک خبر یہ بھی دیکھی کہ اتر پردیش کے گورنر ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی جولائی ۱۹۷۲ء میں اپنی خدمت سے سبکدوش ہو رہے ہیں، اور پرائیم منسٹر مسز اندرا گاندھی متفکر ہیں کہ ایسا اہم خدمت پر کس قابل آدمی کا تقرر کیا جائے؟ یہ موقع تو ہمارے بات آ ہی گئی، اور اس سنہری موقع سے ہم نے فائدہ اٹھایا اور انگریزی میں مارا صفحے کا ایک زوردار اور معنی خیز لیٹر لکھ کر اندرا گاندھی کو یہ واضح کر دیا کہ "اکبر علی خان کون ہے اور کیا ہے" اور ہم نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ ہندستان کی آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں مسز سروجنی نائیڈو حیدرابادی، اتر پردیش کی پہلی گورنر بنیں۔ اس کے بعد بی۔ رام کرشنا راو حیدرابادی اتر پردیش کے دوسرے گورنر بنے، اور اس کے بعد بی۔ گوپال ریڈی (حیدرابادی میں رہنے والے) آندھرا پردیشی، اتر پردیش کے گورنر بنائے گئے، اس لیے ہم نے اپنے لیٹر میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ روایت یا TRADATION کا تقاضا یہ ہے کہ

اتر پردیش کا چوتھا گورنر بھی حیدرابادی ہی ہو، اور اس اہم خدمت کے قابل، وہ چوتھا حیدرابادی اکبر علی خان ہے، اور اکبر علی خان اس اہم خدمت کا مستحق کیوں ہے، اس کی خصوصیات اور خوبیاں یہ اور یہ ہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ نہرو اور شاستری نے تو اکبر علی خان کی حیثیت کو معلوم کرنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی تھی، اس لیے کہ ان دونوں کو اکبر علی خان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہمیں موثق ذرایع سے معلوم ہوا ہے کہ اکبر علی خان نے اندرا گاندھی کے بعض خاص لوگوں کے ذریعے اس بات کی کوشش کی تھی کہ وہ اپنے باپ اور شاستری کے نظریوں کو نظر انداز کرتے ہوے ان کے ساتھ ربط سلوک کر جائیں، مگر اس کو اکبر علی خان سے کہیں زیادہ اپنے باپ کا خیال تھا، اس لیے اس نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی، اس کے نزدیک اکبر علی خان کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی، بلکے اکبر علی خان سے کہیں زیادہ قابل کئی ایک اور بھی امیدوار تھے۔ بس اکبر علی خان کی اسی غلط فہمی کو دور کرانے کی خاطر ہم نے اپنا سحر آگیں قلم چلایا، اور اس میں کامیابی حاصل کی، یہ خط ٹائپ کے بھرپور بارا صفحوں پر مشتمل ہے۔ ہم نے یہ لیٹر "ہندستانی ادب" کے انگریزی میں چھپے ہوے لیٹر ہیڈ پر ٹائپ کروایا، اور اس میں جدت یہ کی کہ ہر نئے صفحے پر بولڈ لیٹرس میں پرائیم منسٹر کا نام، عہدہ اور القاب وغیرہ، ریفرنس نمبر، اور تاریخ وغیرہ ٹائپ کروائی۔ اس کے بعد ہز اکسیلنسی، مسز اندرا گاندھی، دی گریٹ پرائیم منسٹر آف انڈیا، اور یور اکسیلنسی سے مخاطب کیا!

لیٹر کے درمیان جہاں جہاں ضرورت پیش آئی آل یولڈ لیٹرس میں ٹائیپ کروایا۔

اس لیٹر کے لکھنے سے کچھ ہی عرصا پہلے شملا سمٹ SIMLA SUMMIT ہوئی تھی، چنانچہ ہم نے اس سے بھی فائیدا اٹھایا۔ پہلے ہم نے لیٹر نمبر (777) میں سمٹ SUMMIT کی کامیابی پر مسز اندرا گاندھی کو مبارک باد دی، اور اندرا گاندھی اور بھٹو دونوں کی بھی تعریف کی تھی۔ اس کے بعد ہم نے ہندستان۔ پاکستان۔ بنگلا دیش۔ ان تینوں ملکوں کے "اتحاد باہمی" FEDERATION کا بڑا ہی موزوں اور مناسب پلان پیش کیا ہے۔ یہ ایک اچھوتا خیال ہے، جس سے ان تینوں ملکوں کو فائیدا پہنچے گا، اس لیے ان تینوں ہمسایا ملکوں کے کرتا دھرتاؤں کو ہمارے "اتحاد باہمی" کے پلان پر خوب خوب ہی دھیان دینا چاہیے۔ یہ لیٹر ٹائیپ کے سات صفحے کا ہے۔

اس کے بعد لیٹر نمبر (778) میں، ہم نے اکبر علی خان کی تعریف وستایش میں، بلا مبالغا، قلم توڑ دیا ہے، یہاں پر ہم اکبر علی خان سے متعلق لیٹر کا ترجما پیش کرتے ہیں، تاکہ آپ پر واضح ہو جاے کہ واقعی اور حقیقت میں، ہم نے اپنے جادو نگار قلم کے زور سے اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنایا ہے یا نہیں!

REF No.(778) D/7-7-1972

بخدمت ہز اکسلنسی مسز اندرا گاندھی
دی گریٹ پرائیم منسٹر آف انڈیا۔ نئی دہلی

یور اکسلنسی!

حال ہی میں ہم نے اخباروں میں یہ خبر دیکھی ہے کہ اتر پردیش کے گورنر اپنی خدمت سے سبکدوش ہوتے ہیں، اور ان کی بجاے لکھنو ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے اس عہدے

کسی مستقل گورنر کے انتخاب تک یہ انتظام بکل عارضی رہے گا۔ اسی طرح یہ اڑیسا کے گورنر کا اضافی گورنری پر تبادلا عمل میں آیا ہے، اور بھوبھانیشور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے بحیثیت مقرم گورنر اڑیسا حلف وفاداری لیا ہے، اور یہ انتظام بھی عارضی ہے۔ اس کے علاوہ، اور دو چار اسٹیٹس کے گورنر بھی عنقریب اپنی اپنی خدمت سے الگ ہونے والے ہیں، اور ان کی بجائے مستقل گورنروں کا تقرر عمل میں آئے گا۔

یور اکسلنسی! اس سلسلے میں، ہم شری میر اکبر علی خان سالق ام۔پی (ممبر راجیا سبھا) کا نام پیش کرتے ہیں۔ آپ کو بہتر طریقے پر معلوم ہے کہ اکبر علی خان ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۲ء تک مشہور اور بلا دقفہ راجیا سبھا کے ممبر رہے ہیں، اور راجیا سبھا کے وائس چیرمین تھے۔ اکبر علی خان حیدرآباد (آندھرا پردیش) کے مشہور لیڈر کمیونٹی بھی ہیں، جن کی وکالت کی ماہوار آمدنی آٹھ اور دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس کے علاوہ اکبر علی خان کا تعلق حیدرآباد کے سابق حکمراں خاندان سے بھی تھا۔ اکبر علی خان سارے حیدرآباد میں نہ صرف ایک مقبول اور کامیاب لیڈر کمیونٹی اور ایک جاگیردار کی حیثیت سے عام مقبولیت کے حامل تھے بلکہ ایک دینی درسگاہ کی حیثیت سے بھی عوام میں بڑا احترام رکھتے تھے۔ وہ عثمانیا گریجویٹس ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ بھی تھے، اور انجمن کمیٹی کے پریسیڈنٹ بھی رہے ہیں۔ ان دو اہم اداروں کے علاوہ اکبر علی خان حیدرآباد کے کئی ایک مشہور اداروں کے پریسیڈنٹ اور ممبر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عثمانیا یونیورسٹی سینٹ کے وائس پریسیڈنٹ بھی تھے۔ لوک سبھا الیکشن سے پہلے رضاکارانہ طور پر صدر اعظم بابو جگجیون رام نے مسٹر لائق علی کے ذریعہ اکبر علی کو صدر الہٰی یا نمسکر ادی کا آفر دیا تھا، جس کو انھوں نے قبول نہیں کیا۔ ان کے خیالات معتدلانہ تھے اس لیے انھوں نے قاسم رضوی کے رضاکارانہ دور میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا، اور نہ ہی کبھی مجلس اتحاد المسلمین کے جلسوں میں شرکت ہی کی۔ یہ تاسم رضوی کی شدت پسند پالیسی کے سراسر خلاف تھے، اس لیے تاہم رضوی بھی اکبر علی خان کا سخت ترین مخالف اور دشمن تھا۔ اپنے مخالف نظریوں کے سبب یہ دونوں لیڈر آپس میں ایک دوسرے کے مخالف اور دشمن بھی تھے۔

پولیس ایکشن کے کچھ ہی عرصہ بعد اکبر علی خان کا ایک اہم اور زبردست کارنامہ "حواسر لال نہرو ہائی ٹیکنک" کا قیام ہے۔ شہر حیدرآباد سے کچھ فاصلے پر عنبرپیٹ میں ان کی ذاتی کئی ایکڑ زمین کا پلاٹ تھا۔ انھوں نے یہ زمین "جواہر لال نہرو ہائی ٹیکنک" بنانے کے لیے حکومت آندھرا پردیش کو مفت (ریوی) اور اس کے ساتھ اخراجات کے لیے چالیس ہزار روپے کا گراں قدر عطیہ بھی دیا۔ یہ ادارہ آئی سال سے کامیابی سے ساتھ چلایا جا رہا ہے، اور آئندہ نہ معلوم کتنے طویل عرصے تک جاری رہے۔

دی گریٹ پریسیڈنسی آف انڈیا! اس نوٹ پر ہم اس بات کا اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ حکومت ہندستان نے اکبر علی خان کی جیسے لائق و فائق اور قابل قدر شخص کی خدمات اور صلاحیتوں سے آج تک بھی کوئی استفادہ نہیں کیا ہے، مگر اب ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا وقت آگیا ہے، اس لیے کہ ہندستان کے اسٹیٹس کے گورنروں کی جائیدادیں خالی ہو چکی ہیں، اور مستقبل قریب میں اور بھی خالی ہونے والی ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک بھی اسٹیٹ پر اکبر علی خان حیدرآبادی کا تقرر بحیثیت گورنر لازمی طور پر کیا جائے!

چونکے شری بی۔گوپال ریڈی حیدرآباد (آندھرا پردیش) اتر پردیش کی گورنری

سے الگ ہو چکے ہیں، اس لیے اصولاً یہ لزوم عاید ہوتا ہے کہ اتر پردیش کی خالی شدا جائیداد یا خدمت پر میر اکبر علی خان حیدرابادی ہی کا تقرر کیا جاے۔ یہ لزوم اصولاً اس لیے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں ہندستان کی آزادی کے بعد جب اسٹیٹس کے گورنر بناے گئے تو اتر پردیش پر بحیثیت گورنر مسز سروجنی نائیڈو حیدرابادی کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ اس کے بعد بی۔ رام کرشنا راو حیدرابادی بھی اتر پردیش کے گورنر بنے تھے، اور آخر میں تیسرے حیدرابادی بی۔ گوپال ریڈی (آندھرا پردیش) بھی اتر پردیش کے گورنر بناے گئے تھے، جو حال ہی میں ریٹائر ہوے ہیں، اس لیے روایت یا TRADITION کا تقاضا یہ ہے کہ تین سابق حیدرابادی گورنروں کے بعد اتر پردیش کا چوتھا گورنر بھی لازمی طور پر حیدرابادی ہونا چاہیے، اور اس اہم خدمت کے قابل وہ اہم شخص صرف اکبر علی خان ہی ہے، جس کو لازمی طور پر اتر پردیش کا گورنر بنایا جاے!

یور اکسلنسی! اس ہمہ جہتی خوبیوں کے قابل اور لایق شخص اکبر علی خان کو آپ اپنی کابینا میں بحیثیت یونین منسٹر یا کم سے کم منسٹر آف اسٹیٹ شامل کریں تو ہم آپ کو یقین کامل دلاتے ہیں کہ اکبر علی خان ہر حیثیت سے ایک کامیاب منسٹر کے آپ کے بڑے ہی ممد و معاون ثابت ہوں گے، جن کی خدمات سے آپ ہر وقت خش رہیں گی۔

میڈم پرائیم منسٹر! یہ یاد رہے کہ ہماری یہ تحریک مشیرانا انداز میں نہیں

ہے، بلکے ہم حیدرآباد کی ایک قابل ترین شخصیت کا آپ سے تعارف کروا رہے ہیں، اور آپ کو ہم اس بات کا بھی یقین دلاتے ہیں کہ ہماری اس تحریک سے خدا اکبر علی خان بھی واقف نہیں ہیں، چونکے ہم، اکبر علی خان کو بہتر طریقے پر جانتے ہیں، اس لیے ایک حیدرآبادی کے اپنا یہ فرض ادا کیا ہے۔ اکبر علی خان کے بارے میں، ہمارے اس بیان کے سلسلے میں اگر آپ کسی قسم کا ثبوت یا تصدیق چاہتی ہیں تو نئی دلی میں موجود مس پدمجا نائیڈو سے بھی دریافت کر سکتی ہیں، مس پدمجا نائیڈو خود بھی حیدرآبادی ہیں، جو اکبر علی خان کو بہتر طریقے پر جانتی ہیں۔

محترما اور برگزیدا پرائیم منسٹر آف انڈیا!

ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آپ کا منظور نظر یونین سکریٹری PET FOOL ہمارا پیت جونیئر JONIOR ہے، اور ہم اکبر علی خان کے جونیئر ہیں، اس لحاظ سے یہ ناکارا یا WORTH LESS شخص ایک قابل اور لایق شخص اکبر علی خان THE GREAT سے بدرجہا جونیئر اور کم تر ہے!

مرکزی حکومت کے کرتا دھرتا یہ نہیں جانتے ہیں کہ یونس سلیم کون ہے اور کیا ہے؟ اے۔پی۔سی۔سی اور حکومت آندھرا پردیش کی غلط سفارش پر اس کو ناجایز اور غلط طریقے پر بلاوجہ بھی ترقی یا PET کی، اور پہلے یونین ڈپٹی لا منسٹر بنایا گیا، اور جب یہاں اس نے اپنی نالایقی اور نکمے پن کا ثبوت دیا تو اس کو یونین ڈپٹی ریلوے منسٹر بنایا گیا، چنانچہ وہاں بھی اس نے گڑبڑ کی اور کچھ ایسے گھپلے کیے کہ ریلوے سکریٹریٹ اس کی نالایق حرکتوں سے تنگ آ گئی تھا۔

ہم آپ کو یونس سلیم کی نالایقی اور نااہلی کی ایک مثال اور دیتے ہیں۔ آپ نے اس کو یونین ڈپٹی لا منسٹر بنایا تھا، مگر وہ اس اہم خدمت کے اہل نہ تھا، اور انگریزی میں جو بھی دستاویز تیار کرتا تھا، وہ سب غلط، مہمل اور بے معنی ہوتی تھیں، جس سے ایس سکریٹری تنگ آ گیا تھا، اور ایک دن نالایق یونس سلیم نے کسی فائل پر غلط انگریزی میں غلط تجویز کی تو لا سکریٹری نے کہہ اٹھا، YOU ARE A DISGRACE TO THE DEPARTMENT یعنی تم لا ڈپارٹمنٹ کے لیے باعث ذلت اور رسوائی ہو، اگرچہ زیر دست ریمارک سے ایک یونین ڈپٹی لا منسٹر کے خلاف، مگر وہ سکریٹری اس سخت ریمارک کرنے پر مجبور تھا، اس لیے کہ ایک لایق اور قابل آئی۔سی۔ایس I.C.S. ایک نالایق ڈپٹی منسٹر کی غلط تجاویز اور غلط انگریزی کو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ اس ناقابل برداشت ریمارک کے بعد آپ نے اس کا تبادلہ ریلوے منسٹری میں کر دیا تھا، اور وہاں بھی اس نے اپنی فطری کمزوریوں اور نالایقیوں کا ثبوت دیا۔

آپ بہتر جانتے ہیں کہ لا سکریٹری،

اس کے نازیبا اور سخت ریمارک یا اعتراض کے خلاف لوک سبھا میں بعض ممبروں نے توجہ دلائی تھی، لیکن چونکہ وہ واقعتاً بالکل حقیقت پر مبنی تھا "اس لیے لاسکریٹری کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی، مگر ہم تمام حیدرابادیوں کو اس بات کا بے حد افسوس اور ملال رہا کہ ایک حیدرابادی یونس سلیم نے اپنی فطری نالائقی کے سبب حیدرآباد کے نام پر بدنامی اور نالائقی کا دھبا لگا دیا!

میڈم پرائم منسٹر! اس خطرناک شخص یونس سلیم کے متعلق، ہم نے یہ کہنا بالکل ہی بھلا دیا کہ رضاکاری دور میں وہ ہمیشہ آگے آگے رہتا تھا، اور قاسم رضوی کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا تھا، یہاں تک کہ ایک بار قاسم رضوی کے ساتھ ریڈیو پر بھی گیا تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین کے ہر جلسے میں شرکت کرتا تھا، اور ہندستانی حکومت کی دشمن مجلس کے فنڈ میں وقتاً فوقتاً مالی امداد بھی دیتا تھا۔ قاسم رضوی سے اس لیے قریب تر رہتا تھا کہ قاسم رضوی، لائق علی کی کابینا میں اس کو صدر کابینہ یا منسٹر بنا دے، مگر اس کی یہ دلی آرزو کبھی پوری نہ ہوئی، اور اُسے ایسا آرزو دبا کہ خاک شدہ "کہتا ہوا بات ملتے رہ گیا۔ قاسم رضوی یونس سلیم کو اتنا زبردست لفٹ LIFT کیسے دے سکتا تھا، اس لیے کہ وہ بہتر طریقے پر جانتا تھا کہ یونس سلیم ایک نالائق اور نا قابل شخص ہے جو صدر المہامی یا وزارت جیسے اہم عہدے کے ہرگز ہرگز قابل نہیں ہے!

پولیس ایکشن کے بعد فوجی گورنر حیدرآباد جے۔ این۔ چودھری دوسرے رضاکاروں کے ساتھ یونس سلیم کو بھی گرفتار کر کے جیل بھجوانا چاہتے تھے، مگر وہ فی الحال کرشنا راؤ کے پیروں پر پڑ گیا، اور جب تک انھوں نے جے۔ این۔ چودھری کے چنگل سے چھڑانے یا بچانے کا وعدہ نہیں کیا، اس وقت تک اس نے ان کے پیر نہیں چھوڑے تھے۔ بعد میں ایک ملاقات کے موقع پر خود ہم نے کرشنا راؤ صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا تھا۔ ہم نے کہا "راؤ صاحب ایک غدار ملک کے ساتھ آپ نے ایسی غلط مہربانی کیوں کی؟ تو انھوں نے جواب دیا "جب تک میں نے اس سے وعدا نہیں کیا، اس نے میرے پیر نہیں چھوڑے"!

دی گریٹ پرائیم منسٹر آف انڈیا! جب آپ نے ایک نالائق اور نااہل اور ناکارا شخص یونس سلیم کو یونین ڈپٹی منسٹر بنایا تھا، تو ہم اس وقت حیدرآباد کے ایک قابل ترین اور تمام خوبیوں اور بہتر صلاحیتوں سے متصف شخص شری اکبر علی خان بیرسٹر کا نام اتر پردیش کے گورنر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ آپ انھیں گورنر بنا کر نہ صرف ہمیں، بلکہ تمام حیدرابادیوں اور آندھرا پردیشیوں کو ممنونیت کا موقع دینگی! آپ کی عنایت اور مہربانی کے منتظر!

آپ کے مخلص

منجانب:
جی۔ ایم۔ خان، ایم۔ اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"
۹۹۔ اے۔ اعظم پورا شرقی۔
حیدرآباد ۳۶ (اے۔ پی)

ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ اکبر علی خان کے لیٹر کی اہمیت کو بڑھانے کی غرض سے ہم نے پہلے لیٹر نمبر (777) لکھا تھا، جس میں "شملا سمٹ" SIMLA SUMMIT کی کامیابی پر پرائیم منسٹر مسز اندرا گاندھی کو مبارک باد دی گئی تھی، اور ساتھ ہی ہندستان۔ پاکستان اور بنگلہ دیشن کے اتحاد کا تلاتایا TRIRAR TITE FEDERATION کا اچھوتا خیال یا پلان پیش کیا ہے۔ ان تینوں ملکوں کی آپس میں سخت دشمنی کے باوجود، ہمارا یہ کہنا ہے کہ مسز اندرا گاندھی پرائیم منسٹر آف انڈیا، شیخ مجیب الرحمان پرائیم منسٹر آف بنگلا دیشن اور فوقار علی بھٹو صدر پاکستان پریسیڈنٹ آف پاکستان ایک گول میز کانفرنس ROUND TABLE CONFERENCE میں سر جوڑ کر بیٹھیں، اور ہمارے بتلائے ہوئے زرین اصولوں پر عمل کریں تو آپ یقین جانیے کہ ان تینوں ملکوں کے آپس کے اختلافات اور آئے دن کے جھگڑے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ اس آپ کے علم اور معلومات کے لیے ہم اپنے اس اہم ترین (۷) صفحے کے انگریزی لیٹر کا نتیجے تر جمہ پیش کرتے ہیں۔

(بقیہ نمبر (777) ۷ مئی ۱۹۷۲ء

ہز اکسلنسی مسز اندرا گاندھی
دی گریٹ پرائیم منسٹر آف انڈیا
نئی دلی

یور اکسلنسی ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ کو شملا سمٹ SIMLA SUMMIT کی مبارک باد کا بیش قیمت تحفہ پیش کرتے ہیں!

عام طور پر لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ "شملا سمٹ" بغیر کسی مسائل طے کیے دن بھی اور کسی سمجھے بھی ناکامی کی شکل میں ختم ہو جائے گی، لیکن آپ نے یار اصفت شری بھٹو کو اپنی اعلو دماغی اور حسن تدبر سے ایسے قابو سے باہر نہ ہونے دیا، اور اپنی فطری صلاحیتوں اور قابلیت تعریف عالا دماغی کے سبب "سمٹ" کو ایک ایک روز آگے بڑھاتی ہی گئیں۔ آپ کی سوجھ بوجھ کامیابی کی انتہا یہ ہے کہ ضدی بھٹو صدر پاکستان کو "سمٹ" کی مقررہ تاریخ سے اور ایک روز بھی لڑنے کے لیے راضی کر لیا۔ وہی جذباتی بھٹو، جس نے "سمٹ" سے پہلے، پاکستان میں اور پاکستان سے باہر کئی ایک تقریروں میں آپ کو برا بھلا کہا تھا، اور ہر طرح سے آپ کی مذمت کی تھی، وہی بھٹو، آپ کی نرم اور سلجھی ہوئی گفتگو اور میٹھی میٹھی باتوں کا دیوانا اور گرویدہ ہو گیا، اور پریس کے سامنے آپ کی جادو بیانی اور جھک آفرین باتوں کا ذکر کیے بغیر نہ رہا۔ اس "سمٹ" کے دوران بعض وقت ایسا بھی ہوا کہ باتوں باتوں میں صدر بھٹو بھول گیا تھا، مگر اس کی اس ناگوار اور ناپسندیدہ حرکت سے آپ، ملول، رنجیدہ یا ناخوش نہ ہوئیں، بلکہ اپنے حسن تدبر سے پھر سے اس کو رام کر لیا، اور آخر جو چاہا منوا لیا، اور ساری دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ مسز اندرا گاندھی واقعی ایک صاحب عقل و فہم گریٹ پرائیم منسٹر آف انڈیا ہے! آپ کی "شملا سمٹ" کی قابل تعریف کی کامیابی کا واقعہ، ہندستان کی تاریخ میں سنہرے لفظوں میں لکھا جائے گا، جس کو دنیا کبھی بھی بھلا نہیں سکتی۔

پاکستان جانے کے لیے صدر بھٹو کی دعوت کو قبول کر کے آپ نے عقلمندی اور دانشوری کا ثبوت دیا ہے، اس لیے کہ آپ میں اور شری بھٹو میں مزیدات جیت کے سبب ہندستان اور پاکستان کے درمیان کئی ایک اہم مسایل طے ہو جائیں گے، اور دونوں ملکوں کے کروڑوں آدمیوں کے لیے سہولتیں نکل آئیں گی، اور آپس میں تعلقات کے بند دروازے کھل جائیں گے! اس میں شک نہیں کہ "سمٹ" کے ذریعے دونوں ملکوں نے آپس میں "امن" یا PEACE کا ایک حل تلاش کیا ہے، مگر ہمارا یہ کہنا ہے کہ آئندہ "سمٹ" کے موقع پر چاہے وہ ہندستان میں ہو یا پاکستان میں مستقل طور پر "امن" یا PEACE کے فارمولے FORMULA پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔

اس نوٹ پر ہم پریسیڈنٹ بھٹو کی بھی تعریف کیے بغیر نہیں رہیں گے کہ انھوں نے اپنی مانی ہوئی یار اصفت اور جذباتی صفت کے باوجود "شملا سمٹ" کو کامیاب

سنانے میں آپ کی مدد کی اور آپ نے جو رکے بھی کہا اسے کو بغور سنا اور تسلیم بھی کر لیا! اس لحاظ سے صدر بھٹو کو بھی ہم مبارک باد دیے بغیر ہم نہیں رہیں گے!

آخر میں ہم آپ دونوں سے اپیل کرتے ہیں کہ ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے درمیان جو خود ساختہ عقل کی عینک لگا کر دیکھیں اور حسن تدبر کے ہتھوڑے سے اس کو پارا پارا کرنے کی سعی مستحسن کریں، تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان اختلافات اور دشمنی کی جو خلیج حائل ہے، وہ ایکسٹینشن کے لیے دور ہو جائے اور دونوں ملکوں کے لوگ اطمینان چین کی زندگی بسر کر سکیں۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ دونوں ملکوں کے افراد آئے دن جنگ کی تباہ کاریوں سے تنگ آ گئے ہیں۔ ایک دو تین جنگیں ہیں، دونوں ملکوں کا اربوں روپے کا نقصان ہو گیا ہے، اور ہزاروں ہی قیمتی جانیں نذر اجل ہو گئیں۔ اور ہندستان اور پاکستان میں حقیقی معنی میں ہر قسم کی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ آپس کے اختلافات کو دور کرنے کے ذریعے اور وسایل پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کیا جائے۔ آپس میں دشمنی کی یہ عارضی خلیج بہت جلد دوستی میں بدل سکتی ہے بشرطیکہ دونوں ملکوں کے بڑے لوگ صدق دل سے بات چیت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس سلسلے میں ہم ایمپریم منسٹر آف انڈیا اور آپ کے دورہ ہے محترم صدر پاکستان دونوں کو ہمارا یہ مفید اور قیمتی مشورا ہے کہ دونوں ملکوں کے چند مدبروں پر مشتمل ایک نئی کمیٹی GRIEVANCES COMMITTEE بٹھائی جائے جس میں (۱۲) ہندستان کے اور (۱۲) پاکستان کے ہوں جس کے اجلاس باری باری سے ہندستان اور پاکستان میں ہوا کریں۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہو کہ دونوں ملکوں کے نزاعی معاملات اور واقعات پر غور کرنے کے بعد اس کا حل اپنے قیمتی مشوروں کے ساتھ ایک رپورٹ کی شکل میں دونوں ملکوں کے پاس پیش کرے۔ اس کے بعد ان دونوں حکومتوں کا فرض ہے کہ ان اختلافات کو دور کرتے ہوئے آپس میں دوستانہ سمجھوتا کریں، اور اس کے بعد ہمارا یہ مشورا ہے کہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس اتحاد میں ہمسایا ملک بنگلا دیش کو بھی شامل کیا جائے، اور اس طرح اتحاد تلاتا ہندستان۔ پاکستان۔ بنگلا دیش یا۔

TRI - PARTITE COMMONWEALTH OF THE SOVEREIGN STATES OF INDIA - PAKISTAN - BANGLA DESH OR INDO - PAK - BAGLA PACT.

گریٹ پرائیم منسٹر آف انڈیا!

انسانی نقطۂ نظر یا "انسانیت" کے نام پر ہم دونا طریقے پر ہم اپیل کرتے ہیں، اور آپ کے توسط سے دوسرے ملکوں پاکستان اور بنگلا دیش کے ہیڈس آف دی اسٹیٹس سے بھی پرزور طریقے پر درخواست کرتے ہیں کہ ان تینوں ملکوں کو کروڑوں آفت زدا اور مصیبت زدا، پریشان حال اور فاقہ کش عوام کی بھلائی بہتری کی خاطر ہمارے "سہ رخے" اور "زرین" مشورہ پر غور خوب ہی دھیان دیں اور ایک بہتر آور بھی نتیجے پر پہنچیں، تاکہ ان تینوں ملکوں کے لاتعداد سنگینوں اور فاقہ کشوں کی جان کی کوئی بہتر صورت نکل آئے، اور ان تینوں ملکوں کے عوام آپس میں دوست بن جائیں، بلکہ ان تینوں کی طرح امن چین اور سکون کے ساتھ زندگی کے باقی دن گذار سکیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور خلوص کا برتاؤ کر سکیں!

ان تینوں ملکوں کے درمیان دایمی "امن" اور "اتحاد" کے جو نتیجے نکلے ہم اپنے نتائے گئے "زرین" حل پیش کرتے ہیں، جن پر عمل کرنا ان تینوں ملکوں کے ہاتھ بات ہے۔

(۱) تینوں ملکوں کے مابین کشمکش۔ کانفلکٹ جرنلس۔ کانفلکٹ۔ اور ریزولیوشن وغیرہ کے تمام عہدوں کو ایکسپائر ختم کر دینا چاہیے۔

(۲) ان تینوں ملکوں کے درمیان پاسپورٹ اور ویزا سسٹم کو بدلکل ہی ختم کر دینا چاہیے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ایک ملک کا آدمی بلا کسی دوسرے

ملک میں رہ سکتا ہے۔

(۳) اگر ایک ہندستانی، پاکستان یا بنگلا دیش میں جاکر رہ بس جاتا ہے، یا ایک پاکستانی، ہندستان اور بنگلا دیش میں، اور ایک بنگلا دیشی ہندستان میں رہنا چاہتا ہے تو اس کو وہاں رہنے دیا جائے، اور اگر وہاں کوئی خلاف قانون حرکت کرتا ہے تو اس کو وہاں کے قانون کے تحت سزا دینی چاہیے، اور اسی طرح دوسروں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جانا چاہیے۔

(۴) ان تینوں ملکوں کے درمیان مشترکا اعشاریائی DECIMAL سکہ جاری ہونا چاہیے، جس پر انڈو۔ پاک۔ بنگلا INDO-PAK-BANGLA کندا ہو، اور جس کا چلن ان تینوں ملکوں میں عام ہو۔ اس طرح سے ایک۔ دو۔ پانچ۔ دس۔ بیس۔ پچاس۔ ایک سو ایک ہزار۔ دس ہزار۔ پچاس ہزار اور ایک لاکھ روپے کے نوٹ بھی جاری کیے جائیں، جن پر سکے کی طرح انڈو۔ پاک۔ بنگلا چھپا ہو، اور ہر نوٹ پر تینوں آزاد ملکوں کے ریزرو بنکوں کے گورنروں کی دستخطیں ہونی چاہئیں۔

(۵) ان تینوں ملکوں کے پوسٹل اسٹامپس۔ پوسٹل آرڈرس پر بھی انڈو۔ پاک۔ بنگلا لکھا ہو، اور ان کا چلن بھی تینوں ملکوں میں عام ہو۔ تار یا ٹیلگرامس اور ٹیلیفون سسٹم بھی ان تینوں ملکوں کا مشترک ہو۔

(۶) ان تینوں آزاد ملکوں میں تجارت بارٹر BARTER SYSTEM یعنی ہندستان، اگر پاکستان یا بنگلا دیش کو (۵۰) کروڑ کی مشنری سپلائی کرتا ہے تو وہ اس کی قیمت کے طور پر (۵۰) کروڑ روپے حاصل کرے گا، بلکہ اس کے بدلے (۵۰) کروڑ روپے کی اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرے گا۔ اسی طرح سے اگر پاکستان اور بنگلا دیش بھی ہندستان کو کچ ضروری چیزیں سپلائی کریں تو وہ بھی نقد رقم نہیں لیں گے، بلکہ اس قیمت کی اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں ہندستان سے حاصل کریں گے۔

(۷) ریل۔ ہوائی جہاز اور سمندری جہازوں کے مسافروں اور سامان و بضا کا کرایا بھی ان تینوں ملکوں کے مابروں کی رائے اور مشورے سے یکساں قرار دیا جانا چاہیے۔

(۸) ان تینوں ملکوں کے پرخنا کے مابروں کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ٹیکنیکل معلومات یا KNOW HOW سے ایک دوسرے کو واقف کرائیں، اور ضرورت پڑے تو باقاعدہ طور پر طلبا کو ٹریننگ دیں۔ کوئی بھی ملک اپنی ٹیکنیکل یا سائنٹفک معلومات کو ایک دوسرے سے زائد نہیں نہ رکھے۔

(۹) ایک ملک کی زیادہ غذائی۔ جنگلاتی۔ زراعتی، اور صنعتی پیداوار شرط ضرورت دوسرے ملک کو لازمی طور پر دی جائے، یہاں تک کہ وہ ملک اس کا بدل نہیں کر سکتا ہے تو اس سے کسی قسم کا معاوضہ نقد طلب نہ کیا جائے۔ قحط، آفات سماوی۔ طوفان باد و باراں سے اگر کسی ملک میں تباہی آجائے تو باقی دو ملکوں پر لازم ہے کہ وہ ہر طرح سے اور ہر حیثیت سے اس ملک کی مدد کریں، اور بلکل اسی طرح دوسرے دونوں ملکوں پر بھی یہی شرط عاید ہوتی ہے۔

(۱۰) اگر کوئی ملک ایٹمک انرجی ATOMIC ENERGY اور سائنٹفک میں بہت بڑا ہو یا ADVANCED ہے، اور دوسرے دو ملک اس سے پیچھے ہیں تو اس ملک کا فرض ہے کہ ان دونوں ملکوں کے سائنٹیسٹ دانوں کو اپنی بڑی معلومات سے واقف کرائے، اور ان کو بھی اس خاص میدان میں اپنے برابر کام بتا دے۔

(۱۱) ان تینوں ملکوں میں آپس میں وقفے وقفے سے کلچرل اور سوشیل پروگرام باقاعدہ طور پر ہوتے رہیں، اور حسب ضرورت مہینے دو مہینے میں مشاعرے یا کوی سمیلن بھی ہوا کریں۔

(۱۲) ان تینوں ملکوں کے درمیان ریڈیو۔ ٹیلی ویژن اور ٹیلی کمیونی کیشن سسٹم بھی یکساں ہونا چاہیے۔

(۱۳) آخری شرط اس اتحاد و تلاقا کی یہ ہونی چاہیے ریڈیو۔ ٹیلی ویژن۔ فلموں، یا کسی اور ذریعے یا طریقے پر ایک ملک دوسرے ملک کے خلاف ہرگز ہرگز غلط پروپیگنڈا نہ کرے، جس کی سختی کے ساتھ نگرانی کرنا ہر ملک کی حکومت کا اولین فرض ہونا چاہیے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ ان تینوں ملکوں کے صدور ہمارے وچاروں پر خوب خوب ہی دھیان دیں گے، اور غور و تذکرہ کریں گے۔

دی گریٹ پرائیم منسٹر آف انڈیا۔ مسز اندرا گاندھی!

یہ ہیں ہمارے "زرین خیالات" اور "سنہرے مشورے" جن پر نہ صرف ہندستان بلکہ پاکستان اور بنگلہ دیش کو بھی پورا پورا عمل کرنا چاہیے۔ ہمارے ان مفید اور فائدہ مند چاروں پر آپ خود بھی غور و خوض فرمائیں، اور اگر مناسب سمجھیں تو پاکستان کے صدر بھٹو اور بنگلہ دیش کے پرائیم منسٹر شیخ مجیب الرحمان کے پاس بھی ان مشوروں کی ایک ایک کاپی بغرض غور روانہ فرمائیں!

ہم ہیں آپ کے مخلص

جی۔ ام۔ خان "ام۔ اے (عثمانیہ)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"
۹۹۔ اے، اعظم پورا مشرقی۔
حیدرآباد ۳۶ (اے۔ پی)

جی۔ ام۔ خان "ام۔ اے (عثمانیہ)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

ہم نے اپنے اس (۷) صفحے کے انگریزی لیٹر میں مسز اندرا گاندھی پرائیم منسٹر آف انڈیا کی تعریف اور ستائش میں دو انتہائی الفاظ کے بگبلے چھوڑ دیے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ اس سلسلے کے ہمارے جتنوں انگریزی خطوط کے جیرلے نکلوا کر اپنے اپنے ٹی ترجمے کے ساتھ دیں گے، فیکٹی مائی اعتبار سے ہم جو "غالب" بنا رہے ہیں تو یہ ہمارے اس کارروگ میں کوئی چیز نکلوانے کے خریدار برداشت کریں۔ اس لیے ان خطوں کا بامعنی اور بامحاورا، اور سیاق کی مار مار ترجمہ کرنا ہے، جو بلکل آسانی اور بغاوت سی روانی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ دونوں خطوں کا تو ترجمہ آپ نے پڑھ لیا، اور تیسرے خط کا ترجمہ آگے چل کر پڑھیں گے۔

لیٹر نمبر (777) اصل میں لیٹر نمبر (778) کا کورنگ لیٹر COVERING LETTER تھا۔ ہمیں کیا پڑی تھی کہ پرائیم منسٹر کو "شملا سمٹ" کی مبارک باد دیں۔ سچ پوچھیے تو ہم نے اگر علی خان کو کورنر بنانے کے لیے (۱۴) صفحے کا کھرپور لیٹر لکھا تھا، اور ترنگے اس ترنگانے میں "شملا سمٹ" ہو چکی تھی، اس لیے ہم نے کہا کہ اپنا کام بنانے کے لیے پہلے پرائیم منسٹر کو "شملا سمٹ" کی مبارک باد دیں، اور اس کے بعد اپنا مقصد حاصل کریں، چنانچہ اگر علی خان کا لیٹر لکھا جانے کے بعد ہم نے "شملا سمٹ" کی کامیابی پر مبارک باد کا لیٹر لکھا، اور اس بعد کے لیٹر کو (777) نمبر دیا، اور پہلے لکھے گئے لیٹر کو (778) اور یہ دونوں لیٹر ٹائپ کروائے، جس کی ایک ایک کاپی بھی نکلوا لی، جو ہمارے پاس محفوظ ہے اور ہر شخص کو جانچ سکتا ہے کہ وہ ہمارے دفتر آ کر یہ لیٹرس دیکھ سکتا ہے۔ ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم خود ہی حیران ہیں کہ "شملا سمٹ" کی مبارک باد کا لیٹر ہمارے قلم سے کیسے نکل گیا؟ حقیقت میں ہم نے اس لیٹر میں الفاظ کے حسین نگینے جڑ دیے ہیں، اور جب کبھی اس کو پڑھتے ہیں تو ایک نیا حظ حاصل کرتے ہیں۔ اس معمر کا آرا لیٹر کا اقتباس ہم نے جو ترجمہ پیش کیا ہے، امکانی کوشش کی ہے کہ اصل سے قریب تر کر دیں، لیکن بقول کسے "وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی"، کے مصداق اصل اصل ہے، اور ترجمہ نقل ہے!

آپ غور فرمائیے کہ پرائیم منسٹر کو اپنے جال میں پھانسنے کے لیے ہم نے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ اور اس "شملا سمٹ" کی کامیابی کے سلسلے میں ایک خوشگوار انداز میں مبارکباد کا لیٹر لکھ مارا۔ یہ لیٹر (۷) صفحے کا اور دوسرا لیٹر بھی اسی سلسلے میں (۱۲) صفحے کا ہے۔ ان دونوں لیٹرس (اور "ہندستانی ادب" کے نئے شمارے) پیکر کے لیٹر ہیڈ سوا یہ ٹائپ کروایا، اور جدت یہ کی کہ ہر صفحہ کا اصل لیٹر ہیڈ پر ٹائپ کروایا۔ عام طور پر ہم ایسا نہیں کرتے کہ ٹائپ کیے ہوئے پہلے دو صفحے لیٹر ہیڈ پر ہوتے ہیں، اور اس کے بعد کے صفحے سادہ کاغذ پر ٹائپ کروائے جاتے ہیں۔ مگر ہم نے دوسرے صفحے اپنے لیٹر ہیڈ پر ٹائپ کروائے۔ اس طرح سے لیٹر ہیڈ پیپر کے خلا (۱۰) ورق ٹائپ ہوئے۔ جن کے پیچھے بھی خط کا مضمون ٹائپ ہوا تھا۔ ان دس صفحوں کو ہم نے موڑا D O C نہیں کیا، بلکہ جوں کے توں کھلا رکھا۔ اس کے بعد لیٹر نمبر (777) کے چار پیپر کلب کر دیے، اور اس کے بعد لیٹر نمبر (778) کے چھ کاغذ الگ کلب کر دیے، اور دونوں لیٹر کے علاوہ دس کاغذ ایک بڑے لفافے کے لفافے میں رکھ

کر لفافا بند کر دیا، اور رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعے پرائیم منسٹر آف انڈیا کے نام روانا کر دیا، یہ رسید ملنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ اس لیے اس رجسٹری پر جملہ تین روپے نو پیسے خرچ ہوئے تھے، اور ایک کاپی کے ساتھ دونوں لیٹر کے ٹائپ کروانے میں تقریباً دس روپے خرچ ہوئے تھے، گویا تقریباً چودہ پندرہ روپے کا جملہ خرچ اس سلسلے میں بیٹھا تھا، اور یہ سب "زحمت بے جا" ہم نے مول لی تھی محض اکبر علی خاں کو گورنر بنانے کے لیے، چنانچہ آخر کار ہمیں اپنے مقصد میں پوری پوری کامیابی ہو کر رہی، اور ہماری ہی تحریک اور کوششوں کی وجہ سے اکبر علی خاں اتر پردیش کے گورنر بن کر رہے، اگر ہم نے یہ تحریک نہ کی ہوتی تو عمر بھر اکبر علی خاں گورنر نہ بنتے۔ ہمارے رجسٹرڈ لیٹر کے وصول ہونے کی رسید پرائیم منسٹر نے بھجوائی، اور اس انگریزی لیٹر کا ترجمہ پیش ہے۔

پرائیم منسٹرس سیکریٹریٹ

REF. F 61/7/72 PMP.
NEW DELHI.
13 TH. JULY. 1972

شری جی۔ام۔خاں
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"
۹۶۔اے، اعظم پورا نئی حیدرآباد ۳۶

ڈیر سر!

مجھ سے کہا گیا ہے کہ پرائیم منسٹر کے نام آپکے ۷ رجولائی ۱۹۷۲ء کے لیٹر کی رسولی کی اطلاع آپ کو دے دوں۔

آپ کا اطاعت گذار
آر۔کے۔گوئیل
پرائیویٹ منسٹری کے لئے بھجوایا

۷ رجولائی کو ہم نے رجسٹری کی تھی، اور ایک ہفتے کے اندر اندر ۱۳ رجولائی کو پرائیم منسٹر نے ہمارے رجسٹری پہنچنے کی اطلاع کروادی، اور چونکے دونوں لیٹر لیجر پیپر کے چھپے ہوئے لیٹر ہیڈس پر ڈبل اسپیس کے ساتھ ٹائیپ کروائے گئے تھے، ٹائیپ نہایت ہی نفیس تھا، اور بلا مبالغا دونوں لیٹرس میں ٹائیپ کی ایک غلطی بھی نہیں تھی، اور یہ لیٹرس موڑے بھی نہیں گئے تھے، اور ان لیٹرس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ دونوں لیٹرس کے ہر نئے صفحے پر بولڈ ٹائیپ میں پرائیم منسٹر کا نام اور عہدا، مقام نئی دلی اور ریفرنس نمبر، نیز تاریخ اور سنہ تک ٹائیپ کروایا گیا تھا، یہ ہماری طرف سے جدت تھی، جس کو خود پرائیم منسٹر نے بھی پسند کیا اور لازمی طور پر ہمارے دونوں لیٹر کا پرائیم منسٹر نے غایر مطالعا بھی کیا ہوگا،

یعنی تقریباً ۱۰ر جولائی ۱۹۷۲ء کو ہمارے دونوں لیٹرس پرائیم منسٹر کی نظر سے گزر چکے تھے، اور ہمارے لیٹر نمبر (778) کے توسط سے وہ پورے طور پر اور بہتر طریقے پر واقف ہو چکی تھیں کہ اکبر علی خان "کون ہے اور کیا ہے؟" اتر پردیش کے گورنر گوپال ریڈی ریٹائر ہو چکے تھے، اس لیے اتر پردیش کے لیے ایک مستقل گورنر کی انھیں تلاش تھی، چونکہ جی۔ ایم۔ خان انڈیا نے اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنانے کی منظوری دی ہے۔

ام۔ اے (عثمانیا) ایڈیٹر "ہندستانی ادب" نے ایک قابل شخص کا تعارف کرا دیا تھا، اس لیے پرائیم منسٹر نے بعد غور و خوض اکتوبر کے مہینے میں اکبر علی خان کو نئی دہلی طلب کیا۔ نہ معلوم کیا بات چیت ہوئی، اس کے بعد ۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کے "دکن کرانیکل"، سکندرآباد (اے۔ پی) میں ہم نے یہ خبر دیکھی کہ اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنا دیا گیا ہے۔ بے ساختہ ہماری زبان سے یہ نکلا۔ ارے پرائیم منسٹر نے کہاں۔ ہم نے 'اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنایا ہے۔ ہمارے اس معرکا آرا لیٹر کی بنا پر پرائیم منسٹر نے پریسیڈنٹ آف انڈیا سے اکبر علی خان کے اتر پردیش کا گورنر بنانے کی سفارش کی ہے، اور پرائیم منسٹر کی سفارش پر حسب ضابطہ پریسیڈنٹ آف انڈیا نے اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنانے کی منظوری دی ہے۔

اب آپ ہی انصاف کے نقطۂ نظر سے اس بات کا تصفیا کیجیے کہ اکبر علی خان، جی۔ ام خان کے لیٹرس کی بنا پر اتر پردیش کے گورنر بنے ہیں، یا ان کا پرائیم منسٹر کے خاندان سے کوئی ددیالی یا ننیالی رشتا تھا، جس کا ذکر کرتے پرائیم منسٹر نے بطور خود پریسیڈنٹ آف انڈیا سے

اکبر علی خان کے اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی سفارش کی تھی۔؟ یہ مسلاذرا حل طلب ہے، اکبر علی خان اس کو حذ تو حل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ اگر ان میں اتنی صلاحیت ہوتی تو وہ اپنے "محسن اعظم" جی۔ام۔خان ام۔اے (عثمانیا) ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کو کبھی نہ بھلاتے، جس کے سحر آفریں اور جادو نگار قلم کی جنبشوں کے طفیل اکبر علی خان مفت میں اتر پردیش کے گورنر بن بیٹھے! اکبر علی خان کی اس احسان فراموشی اور طوطا چشمی کے بعد جی۔ام۔خان "انسان کامل" کی نظروں میں اکبر علی خان کی کوئی اہمیت اور وقعت نہیں رہی ہے، اس لیے جی۔ام۔خان نے اس عصرانے یا اٹ ہوم میں شرکت نہیں کی، جو ۱۰ر نومبر ۱۹۷۲ء کو نمائش میدان مکرم جاہی روڈ، حیدرآباد میں نمائش کمیٹی، معاشی کمیٹی اور عثمانیا گریجوئیٹس اسوسی ایشن کی طرف سے مشترکا طور پر اکبر علی خان کو گورنر بننے کی خوشی میں دیا گیا تھا۔ ہمارے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا، ہم نے اس کو حقارت کی نظروں سے دیکھا، اور دل ہی دل میں کہا کہ کون اکبر علی خان ــــ ایک تھرڈ کلاس عثمانیا یونیورسٹی کا گریجوئیٹ اور ڈنر بیرسٹر جو اپنے جاگیردار مفت خور باپ کے پیسے پر لندن گیا تھا، اور جیسا کہ اس زمانے میں لندن میں قاعدہ تھا، پیسے والے ہندستانی لندن میں ڈنر پر ڈنر دیکر بیرسٹری کی سند لے کر دو ہی سال میں اپنے وطن ہندستان چلے آتے تھے، جنہیں یہاں ڈنر بیرسٹر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اکبر علی خان ایک مفت خور جاگیردار کا بیٹا تھا، اس لیے اس نے دوسرے مفت خور

جاگیرداروں کی وکالت اور پیروی کی اور خوب خوب ہی دونوں ہاتوں سے دوسرے جاگیرداروں کو لوٹا اور پیسے والا بن گیا! اکبر علی خان نے اس حقیقت کو بھلا دیا تھا تھا کہ جی۔ ام۔ خان کون ہے۔ ؟ قلم کا دھنی ہے، جس کے قلم میں جادو کا سا اثر ہے، جو کاہ کو کوہ، اور کوہ کو کاہ بنا سکتا ہے، جو ذرے کو آفتاب اور آفتاب کو ذرا بنا سکتا ہے، چنانچہ جی۔ ام۔ خان کے اس جادو نگار قلم نے "ہندستانی ادب" کے پچھلے ایک نمبر میں اکبر علی خان جو ایک کاہ تھا، اس کو کوہ بنا دیا تھا، اور اب اسی اپنے جادو کا سا اثر رکھنے والے قلم سے آفتاب کو پھر سے ذرا بنا دیا ہے، اور سچ پوچھو تو اکبر علی خان کو ہم نے کہیں کا نہیں رکھا، اور حقیقت میں اس نالائق کی مٹی پلید کر کے رکھ دی ہے۔

بد دماغ اکبر علی خان نے اس حقیقت کو بھلا دیا تھا کہ "ہندستانی ادب" کوئی روزانا یا ہفتا وار اخبار نہیں ہے، بلکے ایک معیاری ٹھیٹ علمی ادبی رسالا ہے، جس کی مانگ بڑی بڑی لائبریریوں میں ہے، اور وہاں اس رسالے کی جلدیں تیار کر کے رکھوائی جاتی ہیں، اور خود "ہندستانی ادب" کے دفتر میں اس کی (۳۲) جلدوں کے دو مکمل سیٹ موجود ہیں، اور یہ (۳۳) ویں جلد بھی تیار ہو کر رہے گی، اور ہزاروں ہی آدمیوں کی نظروں سے گزرے گی، اور یہ لوگ اکبر علی خان کے متعلق یہ رائے قایم کیے بغیر نہ رہیں گے کہ کتنا کم ظرف اور کتنا ہی احسان فراموش تھا اکبر علی خان، جس نے اپنے "محسن اعظم" کے احسانات کو ایکسر بھلا دیا! اکبر علی خان کی احسان فراموشی سے کیا ہوتا ہے، اندرا گاندھی تو اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتیں۔ اندرا گاندھی

نہ صرف ہندستان کی بڑی پرائیم منسٹر ہیں، بلکہ دنیا کی بعض مانی ہوئی شخصیتوں میں سے ایک اہم شخصیت کی حامل ہیں، اس لیے اتنی بڑی شخصیت سے کوئی شخص بھی یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ خلاف واقعا بات کہہ گزریں گی، اور یہ کہہ لینگی کہ ہاں میں نے "ایڈیٹر ہندستانی ادب" کے لیٹر کی بنا پر نہیں، بلکے خدا نے طور پر اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی سفارش پریسیڈنٹ آف انڈیا سے کی تھی، نہیں نہیں، ہرگز نہیں! ایسے الفاظ اندرا گاندھی جیسی بڑی شخصیت کی زبان اور قلم سے نہیں نکل سکتے، اس لیے کہ خد ان کا ضمیر گواہی دے رہا ہے کہ جی۔ام۔ خان کا لیٹر نمبر (778) پڑنے کے بعد اکبر علی خان کی حیثیت سے واقف ہوئیں، اور تب ہی انھیں اس قابل سمجا کہ پریسیڈنٹ آف انڈیا سے اس بات کی سفارش کی جاے کہ اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنایا جاے!

جب ہم نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء کے انگریزی اخباروں میں یہ خبر دیکھی کہ اکبر علی خان اتر پردیش کے گورنر بنا دیے گئے ہیں تو ہم نے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ یہ ہمارے ۷ جولائی ۱۹۷۲ء کے لیٹر نمبر (778) کا نتیجہ ہے، جس سے متاثر ہو کر اندرا گاندھی نے اکبر علی خان کے اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی پریسیڈنٹ آف انڈیا سے سفارش کی تھی، اس لیے ہم نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو مسز اندرا گاندھی کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا جس کا ترجمہ پیش ہے

ہز اکسلنسی مسز اندرا گاندھی
پرائیم منسٹر آف انڈیا۔نئی دلی۔

(ریفرنس نمبر 811)
۳۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء

ڈیر میڈم!

آپ نے ہمارے لیٹر نمبر (778) بابت ۷-۷-۱۹۷۲ء اور اس کے بعد بطور یاد دہانی لیٹر نمبر (800) بابت ۱۲-۱۰-۱۹۷۲ء کی بنا پر شری اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی جو سفارش پریسیڈنٹ آف انڈیا سے کی تھی اس کا ہم دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یہ خبر ہم نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء کے انگریزی اخباروں میں دیکھی تھی، اس لیے پورے اطمنان کے بعد ہی آپ کو یہ خط لکھا ہے۔

آپ اس آئینا حقیقت سے یور اکسلنسی! ہرگز ہرگز انکار نہیں کر سکتیں کہ اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی سفارش کا "محرک"، حقیقت میں ہمارا اوپر بیان کیا گیا لیٹر ہوا ہے، جس میں ہم نے واضح طور پر لکھا

خصوصیت کے ساتھ اکبر علی خان کو اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی تحریک ہم نے اس لیے بھی کی تھی کہ آزادی کے بعد اتر پردیش کی پہلی گورنر مسز سروجنی نائیڈو، حیدرآبادی تھیں۔ اس کے بعد اتر پردیش کے دوسرے گورنر بی۔ رام کرشنا راو حیدرآبادی بنے تھے، اور اتر پردیش کے تیسرے گورنر بی۔ گوپال ریڈی بھی حیدرآبادی یا آندھرا پردیشی تھے۔ ان کے خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد روایت یا TRADITION کا اقتضا یہی ہے کہ اتر پردیش کا چوتھا گورنر بھی حیدرآبادی ہو، چنانچہ اسی بنا پر ہم نے (۱۲) صفحے کا طویل خط لکھ کر آپ پر یہ واضح کر دیا کہ اکبر علی خان حیدرآبادی اتر پردیش کے گورنر بنائے جانے کے قابل ہیں، خوشی کی بات ہے کہ خدا آپ نے بھی ہماری اس اہم تحریک کو قبول کر لیا، اور اسی بنا پر پریسیڈنٹ آف انڈیا سے، اکبر علی خان کے اتر پردیش کے گورنر بنائے جانے کی سفارش کی، جس کو پریسیڈنٹ نے بشرف منظوری بخشا، اور اکبر علی خان، جیسا کہ ہم چاہتے تھے، اتر پردیش کے گورنر بنا دیے گئے!

آپ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتیں کہ اکبر علی خان برسوں سے ممبر پارلیمنٹ (راجیا سبھا) کی حیثیت سے نئی دلی میں رہتے تھے۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۲ء تک وہ راجیا سبھا کے ممبر رہے، اور ایک مرتبا راجیا سبھا کے وائس چیرمن بھی بنے تھے۔ مگر اس طویل عرصے میں آپ کے مرحوم باپ جواہر لال نہرو نے ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا سلوک نہیں کیا۔ ان کے مرنے کے بعد لال بہادر شاستری ہندستان کے دوسرے پرائم منسٹر بنے، لیکن انہوں نے بھی اکبر علی خان کے ساتھ کوئی سلوک نہیں کیا، دو وجہیں جائیں، خدا آپ نے بھی اکبر علی خان کے ساتھ کسی بھی قسم کا سلوک نہیں کیا، حالانکہ تقریباً چار سال سے آپ پرائم منسٹر آف انڈیا بھی بیٹھی ہیں۔ اگر آپ، اکبر علی خان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے بہتر طریقے پر واقف تھیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے انہیں آج تک کسی بھی اسٹیٹ کا گورنر کیوں نہیں بنایا، یا یہ کہ اپنی کابینا میں وزیر کیوں نہیں بنایا، یا یہ کہ انھیں ہائر ڈپلومیٹک پوسٹ پر کیوں نہیں بھیجا؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ اکبر علی خان کو اس قابل نہیں سمجھتی تھیں، اس لیے آپ نے ان کے ساتھ کوئی بھی سلوک نہیں کیا تھا۔ صرف ہمارا لیٹر نمبر (778) پڑنے کے بعد آپ اکبر علی خان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں سے پورے پورے طور پر واقف ہوئیں، چنانچہ اسی کے نتیجے کے طور پر آپ نے وہ اہم قدم اٹھایا، اور پریسیڈنٹ آف انڈیا سے اکبر علی خان کے اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی سفارش کی۔ آپ نے صرف سفارش کی، اور پریسیڈنٹ نے اس کی منظوری دی، مگر یہ سب کچھ سوفی صد ہماری "تحریک" پر ہوا ہے! ہمیں یقین کامل ہے کہ دنیا کی ایک بڑی شخصیت، اور ہندستان کی کرتا دھرتا ہونے کی حیثیت سے آپ خدا بھی اس صداقت اور حقیقت سے ہرگز ہرگز انکار نہیں کریں گی کہ صرف اور صرف ہماری تحریک کی بنا پر اور ہمارا لیٹر پڑنے کے بعد ہی آپ نے اکبر علی خان کو گورنر بنائے جانے کی سفارش کی تھی۔

میڈم پرائیم منسٹر! ہم اس حقیقت سے پورے پورے طور پر واقف ہیں کہ ہندستان کے پرائیم منسٹر کے اختیارات بہت وسیع اور بڑے ہیں، بحیثیت پرائیم منسٹر آپ جس کسی کو چاہیں یونین منسٹر، منسٹر آف اسٹیٹ وغیرہ بنانے کی پریسیڈنٹ آف انڈیا سے سفارش کر سکتی ہیں، اور آپ کسی بھی شخص کے گورنر بنائے جانے کی بھی سفارش کر سکتی ہیں، اور بالکل اسی طرح کسی شخص کو ہندستان سے باہر کسی بھی ڈپلومیٹک پوسٹ پر متعین کیے جانے کی بھی سفارش کر سکتی ہیں، اور آپ اس کے برعکس انہی لوگوں کے برطرف کیے جانے کی سفارش بھی کر سکتی ہیں، بہرحال یہ مانی ہوئی بات ہے کہ آپ کی حیثیت نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا کی نظروں میں بڑی ہوئی ہے اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ جیسی بڑی شخصیت کو رائے عامہ دینے کا ہمیں کون سا حق حاصل ہے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ہم نے آپ کو نہ رائے ہی دی ہے، اور نہ ہی مشورہ دیا ہے، بلکہ اس ناواقف شخص کی صلاحیتوں سے آپکو واقف کرانے کے بعد اس بات کی "تحریک" ضرور کی تھی کہ حیدرآباد کا ایک قابل آدمی آپ کی نظر عنایت، مہربانی نور کرپا کا مستحق ہے، اس لیے آپ اس کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا لحاظ کرتے ہوئے پریسیڈنٹ آف انڈیا سے اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی سفارش کریں، تو پھر ہم تمام حیدرآبادیوں بلکہ ہم تمام آندھرا پردیشوں کے لیے باعث خوشی و مسرت ہوگا۔ ہماری یہ "تحریک" آپ کے کاروبار میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہے، اس لیے کہ بحیثیت "ایڈیٹر ہندستانی ادب" ہمیں اس کا پورا پورا

علم اور احساس بھی ہے کہ کیا سیاسی امور اور کاروبار میں کس قسم کی مداخلت نہ کرنی چاہیے اس لیے کہ "امور مملکت خویش خسرواں دانند" اور اس وقت آپ "ملکۂ فرنگستان" کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے آپ کو کسی قسم کی رائے یا مشورہ دینا بقول شاعر ؎

یہ تاب یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
اور ہم نے اسی سلسلے میں جو کچھ کہا "واجب تھا عرض کیا"۔

یور اکسلنسی! پھر سے ہم آپکا شکریہ ادا کیے بغیر نہ رہیں گے کہ آپ نے ہماری "تحریک کو قابل اعتنا سمجھا" اور ہماری ہی "تحریک" کی بنا پر اکبر علی خان حیدرآبادی کو اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کی پریسیڈنٹ آف انڈیا سے سفارش کی تھی!

میڈم پرائیم منسٹر! ہم نے ۱۲-۱۰-۱۹۷۲ء کو جو لیٹر نمبر (۵۰۰) روانا کیا تھا، وہ اکبر علی خان کے اتر پردیش کا گورنر بنائے جانے کے سلسلے میں بطور یاد دہانی بھجوایا تھا، اور ساتھ ہی اس میں، ہم نے ایک اور "تحریک" یہ بھی کی تھی کہ جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک G.D.R کو تسلیم یا RECOGNISE کرلیا ہے، اس لیے مسز اروناآصف علی چیرمین انڈو جی۔ ڈی۔ آر سوسائٹی، نئی دلی کو G.D.R کا پہلا سفیر یا AMBASSADOR بنانا مناسب ہوگا ہم نے طریقہ رہا تھا

ہیں کہ آپ کے اور مسز آصف علی کے تعلقات کشیدا اور ناگوار سے ہیں، لیکن اس کے باوجود، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس نئی اور اہم خدمت کی ہر طرح سے مستحق ہیں۔ آشا ہے کہ آپ ہماری اس دوسری تحریک پر بھی ٹھنڈے دل سے غور فرما کر مسز اروناآصف علی کو G.D.R کا پہلا سفیر بنائے جانے کی پریسیڈنٹ آف انڈیا سے سفارش کریں گی۔

پھر سے آپ کا شکریہ!

ہم ہیں آپ کے مخلص

جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

منجانب:۔
جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"
۹۹۔ اے، اعظم پورہ۔ شرقی
حیدرآباد ۳۶ (اے۔ پی)

اسفندار۔ فروردی اردی بہشت ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۷۳ء

میر اکبر علی خان اکبر

میں گورنر ہوں!

لوگو مجھے سلام کرو، میں گورنر ہوں!
گردن میں ہار ڈال دو گر جھک سکوں نہ میں
تم ہاتھوں ہاتھ لو مجھے دورے پہ آؤں جب
لکھے ہیں شاعروں نے قصیدے مرے لیئے
جو مجھ سے کہنے آؤ خبردار مت کہو
معذور ہوں میں اپنی گورنری سے بے طرح
بے شک ہے برہمی سی مری گفتگو کے بیچ
میں وہ نہیں کہ یوسف بے کارواں پھروں
اخبار والو سوچ سمجھ کر کرو سوال!
مجھ سے قرابتوں کو بس اب بھول جاؤ تم

گردن کیسا تھ خود بھی جھکو، میں گورنر ہوں!
نعرے بھی کچھ بلند کرو، میں گورنر ہوں!
موٹر کے ساتھ ساتھ چلو، میں گورنر ہوں!
اک آدھ نظم تم بھی کہو، میں گورنر ہوں!
جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سنو، میں گورنر ہوں!
تم طرح دار مجھ کو کہو، میں گورنر ہوں!
لیکن اسے ادب سے سنو، میں گورنر ہوں!
میرا جلوس لے کے چلو، میں گورنر ہوں!
"جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو" میں گورنر ہوں!
اے میرے بھائی بند گدھو، میں گورنر ہوں!

اکبر کو مل گئی ہے گورنر کی زندگی
مرتے ہو تم تو جاؤ مرو، میں گورنر ہوں!

اسفندار۔فروردی۔اردی بہشت ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب جنوری۔فروری۔مارچ ۱۹۷۳ء

عطیا پروین

پچی چھمن میلاد شریف میں گئیں

"لو بیوی یہ تبرک اللہ رکھے سب بچوں میں بانٹ دینا" پچی چھمن نے گلابی رنگ کا ایک بتاشا لفافا خالاجان کو دیتے ہوئے کہا۔ خالاجان نے لفافا لھوتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تبرک بی۔ کیا گڑ الائچی چلکے؟"

"میں نگوڑی ماٹھی کیا کرتی بھابی" پچی نے ٹھنڈی سانس بھر کر تخت پر بیٹھتے ہوئے خالاجان کے سامنے رکھی چھایا کی لڑکی اور سروتا اپنے قریب کھسکاتے ہوئے جواب دیا۔ کینے کو دشمنوں کی آنکھوں میں خاک بیٹا بھی سنے بیٹے کی لگی سگی (بہو) بھی مگر مچ مٹی ملی کی قسمت میں کوئی خوشی ہی نہیں اتری۔ ارے بی وہ تمثل میرے اوپر کیا کہتے ہیں، سالق آتی ہے کی ۔۔۔"

"صادق ۔۔۔" خالاجان نے فوراً ٹوکا کی۔ پچی ایک ڈلی کو سروتے کے بیچ دبا کر، سروتے کو قینچی پر رکھ کے دوسرے ہاتھ سے زور لگاتے ہوئے بولیں۔

"کون صادق ۔۔۔ اے بھابی تم بھی کس کو یاد دلاتی ہو، صادق غریب کب کے اللہ میاں کے ہاں گئے، پچھلی اتوار کو جانے بھی ہو تھے بھابی میں تو ان کے لیے مالک کو کسی دوم درجے کی چالیسی کا بھیجے۔ سمت رنگا کھانا کھلوایا، اور جو کھول کے دو ہزار دسو انہیں ہزار آدمی تھے، نوے ہزار (اسی ہزار؟) لنگر کھلا تھا، یہ مجمع، ہائے کیا جوانا مرگ موت تھی۔ بتلاؤ بھابی ساٹھ برس کا جوان آدمی اور پٹ سے مر گیا۔۔۔"

"ساٹھ برس کا جوان" خالاجان نے حیران ہو کر کہا۔

"اے ہاں اور کیا تم نے وہ نکی نہیں سنی مرد ساٹھ اور پاٹھ عورت بیسی اور کھیسی، مگر بی آج کل زمانا ہی الٹ گیا ہے۔ مرد ادھر چالیس کا ہوا کمر جھکی گئی کہ سوجنے لگا بال بھت سفید ہو گئے، دانتوں میں بتیسیاں لگنے لگیں۔ عورتوں کو دیکھو تو دیدے پھٹ جائیں جس عمر میں چھوہارے کی ماں ہو جاتی تھی، اس عمر میں آج کل بی بی لڑکے کو بہت طویل کر کے گردن ترچھی کرتے ہوئے، کہی جاتی ہیں لو اور سنو، بلے بی ۔۔۔"

"چھوڑیے بچی آج کل کی بے بیوں کو، یہ بتایئے یہ تبرک کیا ہے؟" بھابی نے لفافے سے ایک جلیبی لے کر منھ میں ڈال لی۔

"اوہ ایسی ہے یہ جلیبی ۔۔۔ کوئی مزا ہی نہیں ہے"

"ہاں بیٹا ذرا جو میرا ہو" پچی نے بھابی سے زیادہ برا موہ بنایا۔ ڈالڈے کی بنی ہوئی پھر غنیمت ہوتی تھی اب تو سائے موم پھلی کے تیل سے اور جانے کاہے کے تیل سے تلی جاتی ہے۔ ارے میاں اب کون چیز اصلی رہ گئی سوائے مرغی کے انڈے کے۔"

"اب وہ بھی اصلی نہیں ملتا بی بچوں کے انڈے ملا کر بیچے جاتے ہیں" خالاجان نے کہا تو، پچی نے ایک فلک شگاف چیخ ماری۔

"انڈے! بچوں کے انڈے"۔

۔۔۔ اور پچی، بی نے بھی دخل دیا۔ شہروں میں لوگ خون کھیلے کرتے ہیں ۔۔۔

"لعنت ہے بی، ان لوگوں پر اللہ کا قہر ٹوٹے۔ نوج میں تو ایسے انڈے کھانا چھوڑ دوں گی، ہائے انڈے کھانا تو اس روز سے گیا جس روز سے میری درشہوار اس مردی ناشاد بلی نے وہ کیا کہتے ہیں، اجل گلا لقمہ بنایا۔" پچی کی آواز رندھ گئی، سروتا تیز تیز چلنے لگا، بھابی نے ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔

"بچی وہ آپ کی دوسری مرغی انڈے نہیں دیتی"

"اے ابھی کہاں بھیا دن گن گن کے گزار رہی ہوں"

"ہاں وہ کوں کی نسل بیمار تھیں، آپ بچی! میں نے

بچی کو اصلی موضوع کی طرف گھر لانا چاہا۔

"ایک پان دو بھابی کھٹنے پھر سے آئی۔ بیٹھی ہوں، خدا سے کھلاتے کی توفیق نہ ہوئی منہ پھیر کر مانگتا اے بی اب اتنا بھلا نہیں لگتا ہے، زمانے میں کی ایک ٹکڑے پان کو نہ پوچھا جائے! ارے یہ سب ریت ہے، رواداری نبھانی جان کے دم تک بھی اب تو بس۔"

خالو جان پھر چرچ شروع ہو گئیں، جلدی جلدی پان لگانے لگیں۔ میں نے ان کو خوش کرنے کے لیے پوچھا۔

— بچی چائے بنادوں پیجیے گا

بچی جانے کس موڈ میں تھیں، تنک کر بولیں۔

"آئے ہے۔ بیٹی پوچھ پوچھ کر خاطر نہیں کی جاتی ہے، چاہے کوئی ایسی نعمت ہے کی ایک پیالی کے لیے سو بار پوچھو گی۔"

میں نے جھٹ اٹھ کر ان کے سامنے ہی چائے کی کیتلی لگادی۔ جب تک پانی لگاتی رہی کچھ نہ بولیں۔ پیالے میں پانی رکھے پان۔ پانی۔ کرتی رہیں، جب میں بیٹھی تو بولیں۔

"شائستگی ہے ہی تم کو۔ اس خدا نے عقل دے چلے بنا لیتی ہو اسے میرا تو دل رکھنے لگتا ہے، لوا اور شعور دشمن کے جھٹ انگا مار دے تب۔ اچھی میاں کے گھر اسکو کیتے ہیں ہنڈ ہے — تار نکالا اور بھک سے لال ہو گئی، اسی پر بات بگاڑ کر رہی ان کی دلہن۔"

"ہیڑ —" منے میاں کسی طرف سے چہکے۔

"یہ لو بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ!"

بچی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے سر ہلایا۔ "سلامت رہو بیٹا اس قابل تو ہوئے کی بزرگوں کے منہ پر تالا چھوٹے — ارے ہمارا نہیں زمانے کا قصور ہے۔ وہ اچھی میاں کی سالی کی لڑکی ہے۔ حوصلہ باشن بھری، کی کرتا کرتا زبان چلاتی ہے بی میں تو منہ ہی دیکھا کرتی ہوں، اور عقل عشق کرتی ہوں، پرسوں کیا ہوا ان کے گھر دو تیلی جھاڑو بھری باجیں لینے گئی۔ اماں جان صاحبا حو تھیں، آمنا سامنا دیکھے جلدی جلدی سرخی پاوڈر پس رہی تھیں ماوٹ کا ماوٹ کر بھر کا لیا جوڑا گدی کے اوپر کھوپر کر رہا تھا، مکھیاں منھ ناک اور منہ میں گھسی جا رہی تھیں، دوسری لونڈیا نانی کے پاس کھڑی کتے کی طرح بھونک رہی تھی، ستیاناس خانا پکوڑے ہر ک کی دہائی دیدے تھا، مجھا تھڈے سے بانی سے ہنا کے کھڑا اتھر تھر کانپ رہا تھا، پانچویں لونڈیا جو سب سے بڑی اور ہوشیار تھی کوئی بڑی ہے، ماں کے کولھے سے کولھا بھڑائے گالوں پر کاجل کے تل بنا رہی تھی۔

— اے بی میں تھک سے وہ گئی۔ لو بتاؤ ۵۔۵ بچوں کی ماں اور یہ فیشن —"

"فیملی پلاننگ کا مشورا دیجیے ان کو" بھابی جانے کس جھونک میں کہہ کر چور بن گئے۔ بچی نے خالو جان کے بات سے گلوری لے کر منہ میں رکھی انگلی میں مزید کتھا لگایا اور چاٹتے ہوئے بولیں۔

"اے بیٹا میں یہ انگریزی سمٹی ملی تو بتانے سے رہی، مگر زبان قابو میں نہ رہی۔ جناب میر شمشیر آگ لگ گئی میرے بدن میں جی چاہ رہا تھا وہ مواسی ساحوذا پکڑ کر جوتے میں منہ کھیر دوں اللہ کی شان یہ عمر اور یہ منشن۔ چلا کر کہا جی! آگ لگا دا اسی سرخی پوڈر میں پہلے بچوں کو سنبھالو — اے ہے وہ مردار ایک لے غیرت نیتر دل ہنسی کر کہنے لگی۔ بچی ایسی عملدت ہی نہیں قصے دار ہوتی ہے۔ وہ دن لد گئے جب عورتوں کو گائے سمجھا جاتا تھا اب برابری کا زمانا ہے آدا کام مرد کریں آدا عورتیں ان لوگوں کے گھڈی میری ساڑی لینے گئے ہیں آتے ہوں گے سنبھالیں گے میں ذرا بالٹی (بلڈنگ) بھی جا رہی ہوں —"

"لاحول ولا قوۃ —" بھابی نے اپنے کلے پیٹ ڈالے بچی کو اور جوش آگیا بھابی کا ایک پھنکا دہان مبارک میں جھر تکتے ہوئے بولیں۔

"لے میں نے کہا لعنت اسیے مردوے پہ۔ مردوا ہے کب، بی بی کی جوتی سیدھی کرنے والا۔ ارے آسمان پھٹ کر زمین پر نہ سما جائے تب کہنا، شوہر کو تو مزاجی خدا کہا جاتا ہے —"

بھابی نے اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بولنے کا موقع نہیں تھا۔ بچی اس وقت بڑے زوروں پر تھیں یا پنے ہی اتفاق میں بڑی وصوان دھاز تبلیغی تقریر کر رہی تھیں۔

"ارے آج کل کی عورتیں شوہر کو سدھا کریں گی بھلا! یہ کہو اپنے ہی سامنے گھٹنے ٹکائیں گی۔ مرد کچھ نہیں بچے لے کر تیس مار خاں دھاڑو پھرا سینما دیکھیں گی

اور آئینے کے سامنے اللہ جھوٹ نہ بلوائے سینما کی لقلقیں اتاریں گی مشاق، مشاق کر گائیں گی۔ میں کہتی ہوں بی آجکل کے مرد کیسے بانسیتی ہو کے رہ گئے ہیں ارے تھوتھنا پکڑ کے گھر پر چار لاتیں ماریں دیکھو سیدھی نہ ہو جائیں جبتا من من کھرک بنو گے اتنا ہی وہ شیریں ہوں گی۔"

آپ کو تو خشخش ہونا چاہیے چچی عورتوں کا زمانہ ہے، بھائی نے کہا تو چچی تڑپ کر بولیں —

"فوج میں خشخش ہوں، آگ لگے مردے اس زمانے کو، گھر بھولیں بچے بھولیں میاں کو بھولیں اللہ کو بھولیں گود میں بچے کے بجائے تکیہ سا بیک لیے کیا بھلی لگتی ہیں، میں ہوتی اندرا گاندھی کی جگہ پر تو الوخ ہم سب سے پہلے ان سرپھری عورتوں کو گھر کے اندر بند کرنے کا قانون بناتی کہ ان موئے سینماؤں کو آگ لگوا تی —"

"اوف خدا اتنا جلال —" بھائی نے کہا اور چچی سینے پر ہاتھ مار کر اچھلنے لگیں۔

"ہاں ہاں کیوں نہ آئے جلال۔ شاہی خون ہے بھیا کوئی ٹھٹھولی دھنیا نہیں وہ کیا کہتے اکبر الدین جلال بادشاہ میرے پرکھے تھے —"

"جلال الدین اکبر —" بھائی نے چھت کی طرف دیکھا یوں جیسے چھت پر تحریر ہو۔ چچی جوش میں تھیں اور لگاہیں ان کی پانی کی کیتلی پر جمی تھیں، اس لیے بھائی کی بات پر غور نہیں کیا۔ میں جلدی سے اٹھی اور چائے دم کرنے کا انتظام کرنے لگی چچی اسی طرح کہتی رہیں۔

"بلکل بلوا دیتی آگ بھلا بتاؤ کل کے بیدا لڑکے اور اکھوارے کی لونڈیاں زہ دہ نار خرے جانتے ہیں جو اس عمر میں مجھے نہیں آتے غضب خدا کا وہ ذرا سی فقنی ماں سے پوچھ رہی تھی ممی پتہ نہیں جھاڑو پھرا کون تمہارا تھی کو پیار کیسے کرتا تھا — اے ہے — میرا قلب الٹ کر رہ گیا — اور سنو ممی (اللہ اس کو غارت کرے) فرماتی ہیں بیٹی وہ دونوں — اے انگریزی میں کیا کہتے ہیں اس کو — لو — دو — جانے کیا —"

"لو لیجئے محبت" میں مصلحت چپ رہی بھیا کی شامت آئی تو بولی پڑے چچی نے آنکھیں چمکا کر ان کو دیکھا اور غرائیں۔

"یہ دیکھو — میں اس گھر کو پرور رہی تھی یہاں اپنے ہی گود میں بیٹھ کر ٹھڈا مکیاں لگنے لگے۔ لو — مائی محبت — اور کیا بیٹا یوں آنکھیں ملا کے ہم سے نہ کہو گے تو بخشش کیسے ہو گی —"

واقعی بھائی نے ستم ہی کی حد کر دی تم نے، میں نے چچی کی ہاں میں ہاں ملائی بھائی نے تہرآلود نظروں سے مجھے دیکھا پر بولے نہیں پائے، چچی نے میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر اور خشمگیں ہو کر بولیں۔

"اللہ اختیار رکھے تمہیں کیا ٹھنڈا کر دیتی ہو۔ بھلا بتاؤ بیٹی اس سے بڑ کر لے غیرتی اور کیا ہو گی، ارے بیٹی چائے کا ایک گھونٹ لے کر، میرا یہ عالم ہوا کہ زمین پھٹے اور سما جاؤں! انہیں میاں کھڑے قد گرتے گرتے بچے موہنڈ لال ٹمارٹ ہوگیا لاحول پڑھتے باہر بھاگے۔ دوسری چکی لے کر۔ بڑی عمر ہو پر وین بی بی تمہیں ذرا سی شکر اور ڈال دو پھیکی ہے —"

میں نے ایک چمچا بھر کر ڈالا، لو میں ایک اور، دوسرا ڈالا۔ مجھے سے چائے یوں چلائی مانو ڈال گھونٹ رہی ہو اور ایک گھونٹ چکی لے کر لو میں۔

"ہاں اب ہے میٹھی۔ رہ چائے کیا میں کوچی کر ہونٹوں پر لگیاں نہ لگیں اے آجکل چائے پی جاتی ہے موئی پھیکی کافی بھٹ سینا جلانے والی یہ بھی آگ لگے خیش ہے —"

— تو اس لڑکی کو ڈانٹا نہیں آپ نے؟ میں نے چچی کو یاد دلایا چچی نے جلدی جلدی دو تین چسکیاں لیں

اے نی میری بہن بھی کیا بات کرتی ہو۔ میری ڈانٹ بھلا وہ کس شمار میں لاتی۔ اماں جان بیٹھی بیٹی کی باتیں سن رہی تھیں، بولیں کاہے کو اپنی عزت مٹی کرنی تو جیسا کرے گا بھگتے گا مگر مد مانی بہت ہوا غصے کے مارے کانپ گئی — اور سنو بیٹی سے کہتی کیا ہیں مینا اپنی کو پپی کر کے بتا تو وہ چکر (پلیز) میں کیسے پپی کر رہا تھا — بس جی میں بھاگی تو یہ کملا کرتی ماچس پر آگ لگا گئی۔ اللہ تیرا ہزار احسان کہ بچہ کو لڑکی نہ دی ارے یا تو میں مرتی یا اسکو زندہ دفن کر دیتی۔ لڑکا لاکھ بدمعاش ہو بات سے نکل جائے پر لڑکی بھٹ کھسنی ہے ماں نہیں کسی اللہ ہر لڑکی سے باپ کو

بھائے آج کل زمانا بڑا برا لگا ہے میری مانو تو یہ سب اسٹیم پکھرا اور وہ لانڈری کا قصور ہے ــــ ''

ــــ لانڈری کا قصور ــــ میں نے حیران ہو کر کہا۔ چچی پیالی خالی کر کے ایک آسودا ڈکار لی اور کہنے لگیں۔

ہاں بیٹی لانڈری ــــ جہاں پیسا دینے پر کتابیں ملتی ہیں۔''

''لائبریری!'' بھیا ہنسے۔ چچی نے محض موضوع بنانے پر اکتفا کی ''ہو گا یہی سہی۔ مجھے کونسا امتحان دینا ہے ڈگری لیکے تعویز بنانا ہے، جس گھر جاؤ صاحبزادیاں بیٹھی، بیٹی یہ موٹی موٹی کتابیں پڑ رہی ہیں ــــ کوئی آئے کوئی جائے ان کی جوتی کو کیا غرض۔ ہاں چرا سنبھالے ہیں، بیٹی بستہ سنبالے ہیں، کیا میں جانتی نہیں، ان ناولوں مرزیوں میں سوائے اشتیق ماشوقی کی باتوں اور کوئی اچھی بات کب ہوتی ہے، اسی لیے لونڈیوں کے یہ ہوائی دیدے ہوتے ہیں۔ ہائے ایک ہم لوگ تھے معصوم کبوتریاں بھولے بھرے موہ سے بات کرتے تو پھول جھڑتے شادی کا نام سنتے تو مارے شرم کے پسینے آجاتے۔''

''لو بھوی ساری ذکر چھڑ گئے تم نے یہ نہ بتایا ترک کیسا لائق ہو'' خالا جان نیم دراز سی ہو کر اونگ رہی تھیں، ایک دم چونک کر بولیں۔

''کل ننو بھائی کے یہاں میلاد شریف تھا ــــ تم لوگوں کا بلاوا نہیں تھا کیا الاخ سم دیدے پھاڑ پھاڑ کر تم سب کو دیکھا ہو تمہیں تو نظر نہ آئیں''، چچی نے چائے کی دوسری پیالی نوش فرماتے ہوئے کہا، میں بولی۔

ــــ خالا جان کا بلاوا تھا، مگر نہیں جا سکیں، کیا تھا کوئی منت وغیرہ۔

''کن چھیدن تھا پوتی کا، ارے تم لوگ نہ گئیں اسی محفل میں، میں تو دیکھ دیکھ کر غشی کھاتی رہی ــــ''

اب خالا جان سنبھل کر بیٹھیں مچ مچے چائے بنانے کے لیے کہہ کر چچی سے مخاطب ہوئیں۔ چچی نے بھی پینترا بدلا پیالی ہٹا کر پاندان پر دھماکا ڈالا اور بولیں۔

ایک وہ زمانا تھا بی۔ ایسی محفلوں میں تو لوگ ادب سے جاتے تھے، مانو سچ مچ رسول اللہ کے سامنے حاضر ہوں یہ سر ڈھانکے نظریں نیچی کیے درود پڑھتے اور ہر لغت پہ سر دھنتے ہوئے۔ کیا مجال جو موہ سے کوئی برا الفاظ نکل جائے، بتی کی بی بی میری محفلیں ہوتی تھیں، جی باغ باغ ہو جاتے تھے بھر بھر مجھوں کی ثواب لوٹتے تھے ــــ عاقبت روشن کرتے تھے آج کل کی طرح تھوڑے کی میلاد کی محفل ایسی لگتی ہے، مانو چڑیا بازار، کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی ہے، دنیا بھر کے قصے قصیدے دوسروں کی برائیاں ساتھ ڈاڑھوں پر انجمن بازیاں، مولانا لے چارے اپنی کہہ رہے ہیں سننے والے اپنی کہہ رہے ہیں ــــ ایک تو جی یہ طریقا مجھے بڑا برا لگتا ہے کی زنانی محفل میں مرد لوگ پڑائے جاتے ہیں لو بتا و بھلا، نامحرموں سے چھینے کا کیا آواز تک چھپانے کا ذکر کیا جا رہا ہے شرم دلائی جا رہی ہے مگر سر پردے کے اندر پیچھے عورتوں کی آوازیں سن رہے ہیں ہنس ہنس مزاخ سے وہ کیا کہتے ہیں محفوظ ہو رہے ہیں ــــ''

''محضوظ نہیں محفوظ ــــ'' بھیا تلے تھے کہ چچی کو عفا دلائیں خدا کا شکر ہے چچی اس وقت دھیرج میں تھیں۔ پیک کی پیکا الراتی ہوئی لے پرواہی سے بولیں۔

''ہو گا محفوظ ہی کون سی مجھے ڈگری لینا ہے کہہ چکی ہوں، ہاں تو بی ــــ دوسری پچکاری چھوڑ کر تمباکو کی چٹکی موہ میں ڈال کر۔ ایک تو لے چارے پتے اتنے ضعیف کی آواز نکلنا دوبھر تھی زور لگاتے تو کھانسنے لگتے کھانس چکتے تو گھٹا بھر سانس برابر کرتے پھر پڑنا شروع کرتے تو بی نہیں عینک گر پڑتی کہیں رومال ڈھونڈھنے لگتے کبھی ناک پونچھنے لگتے ــــ''

''اوئی بھوی تم ان کو دیکھے جا رہی تھیں کیا؟'' خالا جان نے چچی کو چھیڑا چچی بھویں چڑھا کر چٹکیں۔

''نوج میری بیزار دیکھتی ــــ تو اور سنو نیل دیکھے جا رہی تھی ــــ اے تی وہاں پر داہی موا کا ناتھا۔ بیچ میں انگنی باندھ کے چادریں ڈال دی گئی تھیں ادھر عورتیں ادھر مولانا ــــ ہوا چلتی تو کہیں پردا کھسکتا کوئی بچا پکڑ کے چادر کھینچ لیتا کبھی کوئی ذرا ہنسی کے مارے الجھ کے گر پڑتیں ــــ''

''کتنی میلاد سن بھی رہا تھا کہ ہنسی مذاق ہی ہو رہا تھا'' چچی نے تڑپ کر میری بات کاٹ لی۔

''کہا نا بیٹی، میلاد کیا تھا معاذ اللہ چڑیا بازار تھا۔ مولانا تھکے جا رہے تھے اور ادھر چاؤں

چاول پڑی تھی۔ گھر والی بے چاری چلا رہی تھیں نی بیوا ذرا پیر خاموش ہو جاؤ ــــ نی بیبیاں تھیں کہ ٹھٹھے لگا رہی تھیں لونڈیاں ایک گھر پھیر لگا کے لوٹتیں کبوتر بنی تھیں اماں جانیں دوسری طرف ایک دوسرے کے مجازی لہو پی رہی تھیں وہ میٹنگ کے الامان الحفیظ۔ نی ایک لڑکی تو آتا تنگ یا جاما پہنے تھی گوشت پھاڑ رہا تھا جانے کیسے چڑھایا ہوگا، دوسری وہی حواج کاں چلا ہے ہم ہم کے اوپر ہل خول کرتا بھی پہنے کرتا بھی نہیں تھا مزا جانے کیا تھا، پھر پھر اڑ رہا تھا کہ اڑ رہا تھا خاصی صورت ہاگر کے رہ گئی تھی۔ لونڈیاں تو لونڈیاں ہاں سفید والی عورتیں وہ ٹھاٹ کیے تھیں کہ ہوش اڑے جا رہے تھے۔ ایک نی بی کے موٹھ پر پوڈر دو رسے جھک رہا تھا بھولے سے لے چاری رومال سے موٹھ پونچھ گئیں تو کیا بتاؤں نی بی، انگریزی میں اسی کو کیا کہتے ہیں ٹھلی خون سن کے رہ گئی تھیں۔

بڑی دیر سے ہنسی رکی تھی جس طرح سیلاب بند توڑ دیتا ہے، اسی طرح کارٹون کی جگہ پر چچی کے ٹھلی فون نے ہنسی کا سیلاب لے تاؤ کر دیا، لیکن اذان محمدیہ کا حلیہ یاد کر کے چچی کو بھی ہنسی آگئی تھی لیے ساختہ ہنستی اور موٹھ اوچا کر کے پیک کو گرنے سے روکتی ہوئی وہ کہتی رہیں۔

"ہاں بیٹی مجھے تو ہنسی کے مارے حال آنے لگے۔ آدا موٹھ کالا آدا موٹھ سفید اس پر وہ دماغ کی دوسروں کو دیکھنا گوارا نہیں کسی نے پہلو بدلا ان کا موٹھ بنا ــــ اے حج سے برداشتی (برداشت) نہ ہوا چکے۔ بولی "بہن برا نہ مانو تو اس رومال سے پورا موٹھ پونچ لو ایک طرف کا پوڈر چھ گیا ہے ــــ" بھابی نے تالی بجا کر فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

چچی نے پیک تھوک کر باچھیں پونچھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

بیٹم والی ہوتیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب جاتیں۔ ایک اور بھنگی الاٹی سے کیا بتاؤں ان کے نخرے۔ ۔ ۔ سے دو چار برس چھوٹی ہوں گی ہاں خضاب سے بھورا کیے تھیں موٹھ پر کھال چرس گئی تھی، مگر پوڈر اور کریم کے تھکلے جمے ہوئے تھے۔ یہ بڑا ٹرا کا حل بھی لگا تھا، سرخ پاجاما جمپر پہنے دو پٹے میں بانکڑی ٹانگے چھٹی کی زچا بنی بیٹھی تھیں۔ گود میں اکلوتا بھر کا لڑکا تھا، میں سمجھی پوتا نواسا ہوگا۔ دیکھا کیا چمچیر دودھ بلا رہی ہے اوئی عقد، چچی نے ماتھے پر ہتھیلی کا دھکا دیا۔ یہ عمر اور زچا بننے کا شوق ــــ لو اور سنو بہو کو زچا بنا تے بنا تے خدا بن گئیں۔

ایک اور تھیں نی! جانے کس چکی کا پسا کھاتی ہیں ذرا سستی دیر کو میرے گھٹنے پر گھٹنا رکھ دیا تھا لگا تھا ہمالیا ٹوٹ کر آگیا ہو۔"

ماشاءاللہ! بہت خوب چچی آپ تو اب ادبی گفتگو کرنے لگی ہیں۔

"اے بیٹا میں اللہ نہ کرے لے کب تھی اور آج کل کے زمانے میں تم لوگ جس کو مغوبیانا کہو ــــ"

ــــ ہاں تو پھر وہ محترما ــــ میں نے پوچھنا چاہا۔ چچی نے اذان کی آواز سن کر سر پر آنچل ڈالتے ہوئے کہا۔

"نماز کا وقت آگیا ہے۔ تو ما ہے حمزہ شیطان کسا سکاتا ہے، باتوں میں یاد ہی نہیں رہا ــــ تم لوگوں کو تو بیٹی پر بات کہاں معلوم ہوتی ہے اور سب خوب یاد رہتا ہے اذان کی آواز پر سر چھپانا بھول جاتی ہو، برا نہ ماننا یہ خوب یاد ہوگا کہ وہ ریڈیو پر دودھ بھات کے گانے آنے لگے ہوں گے ــــ"

دودھ بھات ــــ میں نے تعجب سے کہا۔ چچی کو جوش آگیا۔ تخت کے نیچے پاؤں اتار کر سلیپر پہنتی ہوئی بولیں۔

ہاں وہ جھاڑو پھر اور دودھ بھات۔ کل نرگس اور افضال بے قرار ہوئی جا رہی تھیں، اے ہے جلدی ختم میلاد دودھ بھات کا وقت آگیا ہے ــــ"

دودھ بھاتی بھیا نے میری مشکل حل کر دی۔

چچی کا موڈ ذرا سا تیکھا ہوا تھا اس لیے میں اپنا قہقہہ ضبط کر گئی۔

"اے ہاں وہی" چچی بے زاری سے بولیں۔ زبان پر چڑھتے بھی نہیں یہ نجو بانام ــــ لو اور سنو میرے پیارے نام فضل النبا، دیکھ لیجیے حور بانو جھوٹ کے نام کیا رکھے جاتے ہیں ڈولی بولی تعلق ہے فی ڈولی ڈنڈا، دنیا سے ڈولی نہیں اٹھ گئی نام رہ گئے۔ وہ جو موٹی

تازی بی بی بیٹھی تھیں، ان کا نام ڈولی تھا۔ ہے ہے ذرا جوا چھا لگ رہا ہو — بھلا بتاؤ اتنی بھاری بھرکم پیاری اور نام ڈولی ارے ہونا تو شاہ جہاں بیگم، بادشاہ بیگم اتنی زیادہ خبطو لگا لی تھی کہ تلی آنے لگتی تھی، ان کے پاس بیٹھ کے۔ اس جتنے پر بیٹھے کیا تھیں شلوار، جمپر — تو بند کے اوپر ہوا کھال سا منڈا تھا، لگے اب پھٹا تب پھٹا جب ذرا ہلتیں پیٹ ڈھک ڈھک ہلنے لگتا، لیر لیر ہو کر نیفہ نیفہ، عمر ازار پہنتی ڈھیلا ڈھالا جمپر پہنتی چوڑا دوپٹا اوڑھتی، کیا شان ہوتی۔ لونڈیوں کی طرح ٹھل ٹھل ہنسے جاتیں باتیں کیے جاتیں۔ سلام کے لیے سب کھڑے ہوئے تو کانکھ کو نکھ کے خدا بھی کھڑی ہو گئیں، مولانا بے چارے سلام پڑ رہے ہیں، یہاں ہنسیاں ہو رہی ہیں سب سے زیادہ ڈوڈی بیگم قطامہ ہنس رہی تھیں —

"یہ ڈوڈی بیگم اور رقطامہ کا جوڑ خوب رہا" بھیا بولے۔

"خوب کوستا کیں نے دل میں کی اللہ رسول کریں اور موٹی ہو جاؤ، نہل کے پانی نہ پی سکو — بھلا بتاؤ اپنا دین بھولی جاتی ہیں —"

"آپ اپنا برقعا پہن کے گئی ہوں گی چچی؟" میں نے پوچھا۔ چچی بڑے زور سے ہنسیں۔

"ہاں ہاں بیٹی اللہ تم کو ہزاروں برس زندہ رکھے، دولا ملے، پامر بدر ہے، ارے سب کی نظریں چچی تھیں میرے برقعے پر، مشکل کشا قسم محفل بھر میں کسی کسی کا برقعا میرے ایسا نہیں تھا — چلو اب تیرے نماز قضا ہو جائے گی۔"

"چچی وہ تو شامل تورہ ہی گئی — وہی حوا آپ سنا رہی تھیں" بھیا چچی کو چھیڑتے دیکھ کر چیخے — چچی زلفیں سر کھجا یا سونچیں اور پھڑک کر اولیں۔

بھیا تم کو شامل کبھی پڑی ہے۔ تیرا کلیجا پھٹ کا جاتا ہے۔ اللہ کی پناہ یا کیا یا لا پوسا جان کر دی رکھ کے پڑایا لکھیا یا اسی قابل کیا کی بڑھاپے کی لاٹھی بنے باپ کی روح کو شاد کرے ایک ڈھائیں بہو آئی رکھ لیا، میرے بچے کے دشمنوں کو ہائے نکلتی ہے میرے دل سے ہر وقت۔ ہر نماز میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ میرے جمال کی بڑی مزار برس کی عمر کرے۔ دودھوں نہائے پوتوں پھلے مگر بچے سدا اس کے ایسے ہی بے بیان آ کے چھینیں، جیسے اس کی نام نہاد جورو نے اس کو چھینا ہے ماں سے — اللہ کرے بہوؤں سے بھر بھر پائے اپنی کرنی آگے اترے — وہی مثل ہے بھیا کی دکھ چھلیں بی بی ناچتا اور کوے انڈے کھائیں۔ اتنے میں نے کل میلاد کے بعد یہی دعا مانگی۔ آگے بڑتے موے بولیں، غضب خدا کا، بڈا غریب ہانپ ہانپ گیا، کسی نے کان دھر کے نہ سنا۔ اس نیک کام میں تھی کیسے لگتا۔ ڈیوڑھی کے قریب پہنچ کر۔ کہیں لڑائی ہو رہی رنڈی منڈی کا ناچ ہوتا ہوتا بھکر ہوتا پھر دیکھو — وہ کیا کہتے ہیں سب ہمہ تن یا توش ہو کے بیٹھ جاتے۔"

جیو پچی جاتے جاتے بھی قہقہوں کی بارش کر گئیں۔

رضا نقوی واہی

راشن کی دکان

واللہ کہ جس دانۂ گندم کی بدولت
جاری ہوا آدم پہ سخن چھن گئی جنت
اس دانۂ گندم کا ستم آج بھی ہے جاری
ظالم نے بنا یا ہمیں در در کا بھکاری
بالا خر پڑا اس سے تو یہ مان گئے ہم
گندم کی دکاں کوچہ دلبر سے نہیں کم
منظر ہے وہی حشر کا میدان وہی ہے
دھکا ن سے پٹ جانے کا سامان وہی ہے
رونق بھی وہی بھیڑ بھی وحشت بھی وہی ہے
چشمک بھی وہی ہے آپس میں رقابت بھی وہی ہے
دوکاں پہ ہے اک سمت خواتین کا میلا
اک سمت ہے مردوں کا امنڈتا ہوا ریلا
گندم کے عوض کشتۂ گندم کا ہے جلوہ
ہر آنا یہ نظر ہے کہ ہو جائے نہ بلوہ
جیسے ہی در یچے کو دوکاں دار نے کھولا
ہر شخص لیے زور پڑا ہاتھ کا جھولا
بیشک کوئی دیتا ہوا گزرا کوئی دھکے
اس نے اسے روندا وہ گرا آپ لڑھک کے
اتنے میں گرجتی ہوئی آواز یہ آئی
سپلائی کا کوٹہ نہ ملا جائے بھائی۔
گندم کے عوض وعدۂ فردا کا پتاشا
حصے میں ملا سب کو ہوا خاک تماشا

شمس کنول ایڈیٹر "گگن"

سرسنگار سمسد کا دسواں آل انڈیا مشاعرہ سراسر ناکام رہا!

ایک آل انڈیا مشاعرے کی بری طرح ناکامی کی تمام تر ذمے داری

سرسنگار سمسد کے چیرمین خاجا عبدالغفور سیلز کمشنر حکومت مہاراشٹرا

کے سر ہے! خاجا صاحب قطعاً اس کام کے اہل نہیں ہیں،

اس لیے انھیں چاہیے کہ آیندہ سے وہ ایسی ذمے داری

اپنے سر نہ لیں، اور کوئی مشاعرہ وغیرہ منعقد نہ کریں!

جس مشاعرے میں نصف درجن گانے والیوں کو خاتون شعرا کی حیثیت سے پیش کیا جائے، اسے مشاعرہ کہا جائے گا یا کامنی دیوی یوسف آزاد قوالی کا مقابلہ؟

بہرصورت! اس جگل بندی کا نام تھا سرسنگار سمیلن کا دسواں آل انڈیا مشاعرہ جو ۲۱ اکتوبر کی رات میں بمبئی کے رنگ بھون میں خاجا عبدالغفور سیلز ٹیکس کمشنر حکومت مہاراشٹرا کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔ مشاعرہ کمیٹی کے چیرمین خاجا صاحب حیدرآبادی ہیں جو نکے صاحب نظر ہیں، اور جہاں مال اچھا نظر آتا ہے، وہیں سے تھوک میں خرید لینا بہتر سمجھتے ہیں، اس لیے انہوں نے اس جگل بندی کے لیے نصف درجن شاعروں کی کھیپ ہندستان کے صرف ایک ہی علاقے حیدرآباد سے امپورٹ کر لی، اور قدیم شرفا کی طرح دوست نوازی اور علاقا شناسی کی وضعداری کو برقرار رکھا۔

اسٹیج کا پردا گرچہ اٹھا نہیں تھا، مگر اناؤنسنگ جاری تھی، آواز جانی پہچانی تھی، وہ جناب یوسف ناظم بول رہے تھے، جو پہلے کبھی اچھے مزاح نگار تھے، خاصے

شاعر تھے مگر پچھلے کچھ عرصے سے خاکا عبدالغفور کا ضمیمہ بنے ہوئے ہیں۔ پہلے پڑھے لوگ عوام و خواص تک اپنی تخلیق پہنچایا کرتے تھے، آج کا پڑھا لکھا انسان عوام تک اپنی آواز پہنچانے کا شعور رکھتا ہے، آواز چاہے کتنی ہی نے سری کیوں نہ ہو، بے موقع بولتا ہے، اور بے تکان بولتا ہے، جب یہ بات پروگرام میں شامل تھی کہ گورنر صاحب کے آنے پر سرستنگارا کا ڈلی کی جانب سے ادبی انعامات گورنر صاحب کی بیگم صاحبا کے ہاتھوں تقسیم کیے جائیں گے اور انعامات سے متعلق ہر بات تفصیل سے بیان کی جائے گی تو پھر (۹) بجے سے پہلے یوسف ناظم انعامات کا تذکرہ فرما کر کیوں بور کر رہے ہیں؟ اس کیوں کا جواب شاید یہی ہو سکتا ہے کہ دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے لوگ کیا کچھ نہیں کرتے، یوسف ناظم تو صرف بول ہی رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک سرستنگارا کا ڈلی کے انعامات کی تقسیم کا سلسلہ جاری رہا اور ٹھیک دس بجے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ مشاعرے کے اناؤنسر تھے حاجی بے کل اتساہی اور صدر تھے ریاست مہاراشٹرا کے گورنر جناب علی یاور جنگ ۔۔۔ ان دنوں جب ہم غلام تھے حاکم کو اپنے سر آنکھوں پر بیٹھانا اچھا معلوم ہوتا تھا، مگر اس آزاد اور جمہوری ہندستان میں فن کار کو چاہیے کہ وہ صاحب اقتدار کو کھیت کر اپنے دربان نہ بٹھائے صاحب اقتدار کا کچھ نہیں بگڑتا البتہ فن کار اور فن کار کی تذلیل ضرور ہوتی ہے۔

ابتدا فخر ماعرشی حیدرآبادی سے ہوئی۔ عرشی شاید پہلے سے قوال ہیں۔ میں نے ان کی قوالی کا ایک گراموفون ریکارڈ ریڈیو پر سنا ہے، وہ خاصا اچھا گاتی ہیں، لیکن قوالی وہ جتنا اچھا گاتی ہیں شاعر کی حیثیت سے ان کا ترنم اتنا اچھا نہیں ہے کلام کا تو ذکر ہی کیا خاتون شعرا کا ترنم تو تالیں بٹورتا ہوتا ہے۔ کلام نہیں بہ نوع عرشی کما حقہ نے بڑی بلند آواز میں ایک غزل گائی اور اپنے ایک شعر پر داد لے کر چلی گئیں۔

شایان ضبط سب کا مقدر نہیں یہاں
غم بھی کسی کسی کو ملا ہے نصیب سے

عرشی صاحبا کے بعد صابر دت تشریف لائے، پھول کو جوڑے میں سجانا، جھنجلا کے مٹانا ۔۔۔ نہ جانے کیا کیا فرماتے رہے۔ جب بغیر داد پائے چلے گئے تو اناؤنسر حاجی بے کل کی زبانی معلوم ہوا کہ دت جو کچھ فرما رہے تھے وہ قطعات تھے، پھر اناؤنسر نے شرمیلی بسنی سنگھ کو متعارف کرتے ہوئے کہا بسنی سنگھ اگرچہ آج کل کے فلموں میں گیت لکھ رہی ہیں، مگر اردو غزل بھی خوب کہتی ہیں ممکن ہے انہوں نے چند غزلیں اچھی بھی کہی ہوں، لیکن اس مشاعرے میں انہوں نے جو کچھ سنایا وہ تو قابل تعریف چیز نہیں تھی، اور نہ ترنم ہی دل کش تھا، بس آئی اور چلی گئیں۔

وہ سکندر علی وجد جو مہاراشٹرا اردو ترقی انجمن کے دروازے سے پارلیمنٹ کے ہال میں پہنچ چکے ہیں، اس مشاعرے کی اسٹیج پر اندراہی سے نمایاں تھے، گورنر صاحب کو آداب بجا لائے، اور فراق سے بڑبڑ کر باتیں بناتے ہیں وہ اپنی اداکاری کو کچھ اتنا نیچرل دکھانے کی کوشش کر رہے تھے، جیسے ہندستانی فلم کا کوئی ہیرو کہانی کے سارے کرداروں کو کہنی مار کر کیمرے کے سامنے آجانے کی کوشش کرتا ہے۔ وجد کا اصرار تھا کہ انھیں جلد پڑھا جائے، چنانچہ اناؤنسر نے تھوڑی سی تمہید کے بعد وجد کو پیش کیا۔ وجد ناسازی طبیعت کا عذر کرتے ہوئے بیٹھ گئے اپنی (ظاہر) ان شعر (فراق) کا عذر کرتے ہوئے سامعین جو عام فہم نہیں تھی، اور وجد داد سے محروم رہے سامعین کی فرمائش کے بغیر ہی انھوں نے ظلم کے بعد اپنی ایک تازہ غزل کے چند شعر سنائے۔ جن میں یہ شعر کسی قدر پسند کیا گیا۔

کچھ کلاہوں کی سادگی پہ نہ جا
اک ادا یہ بھی بانکپن کی ہے

مشاعروں میں جو شعر پسند کیے جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ اچھے اور درست ہوں۔ جیسے وجد کا یہ شعر معنی کے اعتبار سے قطعی نادرست ہے۔ پہلے حصۂ کے معنی میں بلا کا تضاد ہے جو کچ کلاہ ہوگا اس کو سادگی سے تعلق ہی نہیں ہوگا، اس لیے کہ کج کلاہ کہتے ہیں ترچھی ٹوپی پہننے والے کو یعنی خدا مغرور مت بن کہ اس کے سر پر ٹیڑھی ٹوپی کی کلاہ قدیر

شامان ایران کا لقب بھی رہا ہے، اور پھر بائیسن کہتے ہیں "مشہدے بین مدکو"، کہاں کچ کلاہی کہاں بائیسن، اور کہاں سادگی غرض کہ یہ شعر نا صرف نادرست ہے بلکہ انتہائی واہیات ہے۔

معتبر ضاطور پر ایک بات سینئے، وحید نے اپنی نظم سنانے سے پہلے فرمایا یہ فراق کی نذر ہے ۔۔! مشاعرے کے اسٹیج پر سامعین سے رجوع ہو کر شاعر جو کچ سناتا ہے، وہ دراصل سامعین کی خدمت میں نذرانا ہوتا ہے، اور خصوصی طور پر وہ سامعین جو ٹکٹ خرید کر مشاعرہ گاہ میں داخل ہوتے ہیں، اور جن کے خریدے ہوئے ٹکٹوں کی مجموعی رقم سے شاعر نے اپنا معاوضہ وصول کیا ہے۔ اگر شاعر اپنے سامعین کو نظر انداز کر کے اپنی نظم یا غزل یا اپنا کوئی شعر کسی مفاد کے تحت جیسے فراق کسی اکاڈیمی کے رکن ہوں، اور آئندہ اوارڈ کے وقت ناچیز کو یاد رکھیں، اپنے ہم نشین یا کسی دی۔ آئی۔ پی کی نذر کرتا ہے تو وہ مرچی طور پر سامعین کی توہین کرتا ہے۔ وحید کو چاہیے تھا کہ فراق کو وہ اپنے یہاں مدعو کرتے، ان کی شان میں ایک کاک ٹیل پارٹی دیتے اور پھر نہ صرف اپنی ایک نظم، بلکہ اپنا سارا دیوان ان کی نذر کر دیتے۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہوتا، مگر عوامی مشاعرے میں ایسا کرنے کا مطلب ہے پرائے چھپڑے پر شکرانا بانٹنا۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ بوڑھا شخص اپنی ہی نسل پر بار نہ ہو، مگر ہوتا یہی ہے کہ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنی بزرگی کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگتا ہے، چنانچہ جب بزرگ شاعر فراق گورکھپوری کے سامنے مائیک رکھا گیا، تو انہوں نے ایک ہزار ایک بار سنائی رباعیاں اور مختلف اشعار سنائے اور اپنی نشست کو آتا طول دیا کہ مشاعرے کی یہ سٹ واقعی شب فراق سی محسوس ہونے لگی، سامعین اکتانے لگے اور اکتا کر تالیاں بجانے لگے، تالیوں کا مطلب تھا کہ فراق جا بیے، مگر فراق اپنے بڑا جانے کی بنا پر بہت دیر تک یہی سمجھتے رہے کہ داد و تحسین ہی ہے جب کہ ان کو صرف اسی ایک شعر پر داد ملی جو انکے حسب حال تھا۔

اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں آؤ سنبھالو ساز غزل
نئے ترانے چھیڑو میرے نغموں کو نیند آتی ہے

بات یہ بھی قابل غور تھی کہ محترم عرشی حیدرآبادی جو فراق کو ان کے ایک ایک لفظ پر غور غور بڑبڑ کر داد دے رہے تھے، فراق کے فوراً بعد محترم سرور کے آنے پر کیا ایسی خاشی ہوئی جیسے مون برت رکھ لیا ہو ۔۔۔ سارا سرور داد کی حد تک برداشت کر لے گئے کہ نہ سامعین بے زار ہوئے، اور نہ دوسری بار کے لیے ان سے اصرار کیا گیا۔ مشاعرہ کمیٹی کے چیرمین خاجا صاحب نے جو میلا باز ار لگایا تھا اسے کام میں لانا تھا اور ان کے شوق کو نبھانا اس لیے موقع شناس اناؤنسر نے ایک خاتون شاعر کے بعد دوسری خاتون کو پیش کر دیا یعنی فخر مانو نور جہاں نور تشریف لائیں، وہ شاعرہ دائرہ قوالیاں تھیں، بس مائیک پر گلے بازی کرنے آئی تھیں، جھنگر کے بے مزے نالے کی طرح ان کا ترنم بار خاطر بنا ہوا تھا۔ غرض کہ وہ اپنی الفت کے واقعات میں ڈنکے کی چوٹ پر بیان کر کے جانیں تو یوسف ناظم تشریف لائے، اور اپنی وہ نظم سنائی جو شلاً معاہدے کے پس منظر سے تعلق رکھتی ہے اور کہ دور و زمانوں میں شاید بھی ہو چکی ہے۔

ناظم صاحب کے بعد اناؤنسر نے گیتش بہاری طرز کو پیش کیا انھوں نے چھوٹی بحر میں ایک غزل سنائی خلاف توقع ان کی غزل کا ہر شعر پسند کیا گیا۔ خصوصی طور پر یہ دو شعر۔

گردش دوراں یہ کیا بات ہے — روز سحر سے پہلے رات
اے غم جاناں ساتھ نہ چھوڑ — دور ہے منزل کم ہے حیات

اپنے سادا اور با معنی اشعار کی بنا پر شرما کی طرز اس مشاعرے کے پہلے شاعر تھے جو کامیاب رہے، انہوں نے مشاعرے میں جو حرارت پیدا کی اس کو محترما بینا رائی ناز لے آگر نہ صرف برقرار رکھا، بلکہ انہوں نے اپنی ایک سنجیدہ غزل سے ایک خوش گوار اضافہ بھی کر دیا، انھیں اپنی غزل کے ان دو شعروں پر خاصی داد ملی ؎

چمن ہے رنگیں، بہار رنگیں، بہار کی ہر ادا ہے رنگیں
ازل سے دل جس کو ڈھونڈتا ہے چمن میں وہ پھول ہی نہیں ہے

یہ میں نے مانا مرے مقدر میں عیش و عشرت نہیں ہے لیکن
تری قسم ہے ترے فراق سے میرے لب پہ گلہ نہیں ہے

اب محترمہ ناز کا فنی ارتقا اور کلام کے اعتبار سے سنجیدگی پختگی اور متانت کی منزل میں پہنچ رہا ہے۔ ڈائیس پر خاتون شعرا کا جو ڈھیر رکھا ہوا تھا، بیشتر رانی ناز ان میں سب سے زیادہ کامیاب رہیں۔

حاصل مشاعر اشعر

مجھے ہمیشہ کے نوجوان شعرا میں فلحال تین شاعر پسند ہیں، عزیز جاوید، حسن کمال۔ اور عزیز جاوید۔ حسن کمال نے مائیک پر آکر مختصر ہی میں جو غزل پڑھی اس کا ہر شعر سادا تھا با معنی تھا اور آج کے احساسات کا ترجمان تھا اس لیے ساری غزل خوب خوب پسند کی گئی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

تو اسی تلاش کا انجام بھی رہی نکلا
میں دیوتا جسے سمجھا تھا آدمی نکلا
میں زندگی کو کوئی نام دینے والا تھا
بہت تلاش پہ نکلا تو تشنگی نکلا

اور یہ شعر تو حاصل مشاعرہ نکلا، اس لیے بار بار سنا گیا ؎

میں رفتہ رفتہ ہر اقتل جس کے ہاتھوں سے
وہ بدقماش وہ قاتل میں آپ ہی نکلا

پھر کوئی ممتاز راشد آئے اور ناز اور کمال نے مشاعرے میں جو گرمی پیدا کی تھی، اسے پیس پیسے شعروں سے اس پر اوس ڈال کر چلے گئے۔ اناؤنسر نے کرتے ہوئے مشاعرے کو کھڑا کرنے کی کوشش کی اور حسن عزیز جاوید کو پکارا۔ انھوں نے خاصی اچھی غزل پیش کی جو پسند کی گئی۔ ان کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

الفاظ زخم زخم ہیں معنی لہو لہو
پتھر اور وہ بھی ایسے کہ کچھ سوجھتا نہیں

کہتے ہیں کہ محمود غزنوی نے سومنات کو فتح کیا، اور محمود درانی نے کمسن زیب النساء کو تسخیر کیا۔ بیچارے عزیز جاوید کے بعد ہی محمود درانی تشریف لائے، شاید سامعین پر پسندیدگی کی کیفیت طاری تھی اس لیے انہوں نے محمود درانی کی اوسط درجے کی غزل کو خوب خوب پسند کیا۔ شعر ؎

غزل کا ایک شعر مجھے بھی اچھا لگا ؎

اچھا ہوا کہ راہ میں ٹھوکر نہیں لگی
ہم گر پڑے تو سارا زمانہ سنبھل گیا

محمود درانی مشاعرے کے پہلے شاعر تھے جن کو سامعین کے اصرار پر اناؤنسر نے دوبارہ بلایا اور ایک اور غزل سنانے کے لیے درخواست کی۔

جہاں محمود درانی۔ عزیز جاوید اور حسن کمال اپنے حسن کمال سے جہاں شاعر ثابت ہوئے تھے، وہاں صیغم جلال آبادی قطعی طور پر جہاں گوٹا نکلے اور اپنے پہلے ہی شعر سے سامعین کے لیے اس حد تک ناقابل برداشت ثابت ہوئے کہ مرقع شناس اناؤنسر کو درمیان میں دخل دے کر کہنا پڑا۔ صیغم کی غزل کا مقطع سماعت فرمایئے! خلاصہ یہ کہ صیغم اٹھا دیے گئے۔ مشاعرے کی فضا کو ناخوشگوار بنانے میں صیغم صاحب کا کوئی دوش نہیں، اصل میں ذمہ دار ہیں مشاعرہ کمیٹی کے چیرمین خاجا عبدالغفور، ہیں! وہ خون کا بدلا لعلوں کے متعدد احسان کے بدلے احسان کرکے اپنی مندی کا ثبوت دیتے رہے ہیں، وہ چیرمین مشاعرہ کمیٹی کی حیثیت سے روزناموں سے متعلق آئی شعرا کو کبھی فراموش نہیں کرتے جو اکثر ان کے کام آتے رہتے ہیں۔ جیسے قتیل شفائی پر اچھا مضمون دینا بھی ایک کام ہے اور اپنے اخبار میں شکوفہ زار کا مختصر استشہار شائع کرنا بھی ایک کام، لیکن خاجا صاحب کی خدمت میں اطلاعاً عرض ہے کہ جو شاعر روزناموں میں ملازم ہیں وہ اخباری شاعر تو ہو سکتے ہیں، مگر ضروری نہیں کہ وہ مشاعرے کے بھی مقبول شاعر ہوں۔

ڈائیس پر ایک خاتون شاعر اور بھی دکھی ہوئی تھیں، بھکالے لگانے کی خاطر اناؤنسر نے انھیں بھی پکارا، وہ تھیں عزیز نساں صاحبہ رامپوری۔ فرمانے لگیں ؎

مجھے قتیل نہیں درد دل کی رسوائی
تم اپنے دل میں ابھی دل کی بات رہنے دو

چونکہ تازہ ولایت تھیں، اس لیے مذاق کو مذاق اور قہقہوں کو قبول فرما رہی تھیں، چنانچہ داد سے محروم رہیں، بھالا آئی تھیں بے حال گئیں۔

عزیز قتیلی اچھے اور بہت اچھے شاعر ہیں، اور جو تیسرے کا شعر نہ ذکر کرتا تو بھول آدھے سامعین

نے جو غزل سنائی اس کے پہلے شعر پر ان کو داد ملی آج کی شہری زندگی سے متعلق تھا۔ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہنٹے پاتھ پر جو لاش پڑی ہے اسی کی ہے
جس کا دل کو یقین تھا کہ روزی رساں ہے شہر
ٹپکا ہوا ٹرین کے ڈبوں سے صبح و شام
لگتا ہے اپنی موت کے منہ میں رواں ہے شہر

تیسرے دور بار بلائے گئے اور پھر انہوں نے ایک نظم بعنوان "آئینہ" سنائی اور داد پائی۔ اناؤنسر نے مظفر شاہجہاں پوری کا نام لیا اور وہ مائیک پر آ گئے۔ مظفر بزرگ ہو چلے ہیں ان کے مونہہ سے اب ہوا نکل جاتی ہے، اس لیے ان کا ترنم اب اتنا موثر نہیں رہا جتنا پہلے تھا، مگر ان کا کلام اور پڑھنا اور بے جھول بن چکا ہے، انہوں نے جو مرصع غزل سنائی اس کا یہ شعر پسند کیا گیا ؎

نہ ہار دو صلا یار دو غزل تم مسکرانے کا
ہمیں محکن نہیں ہے سر جھکانا ہے زمانے کا

آسی لکھنوی کے صاحبزادے دانی آسی کا بھی میں یہ پہلا مشاعرہ تھا کہ جس میں وہ مدعو کیے گئے، انھوں نے جو غزل سنائی وہ بری نہیں تھی پسند کی گئی۔ اناؤنسر نے سامعین کو گوشتی کے کنارے سے فوراً واپس کے رنگ زار میں لا رکھا، آسی لکھنوی کے بعد انجم جے پوری کو پیش کر دیا، انجم نے دو قطعہ سنائے جو افزا تھا مگر بعد میں جو غزل سنائی وہ تو فریب پوری نہیں اتری اور انجم زمانہ چل سکے، انتظار اعظم گڑھی نے تو آکر لٹیا ہی ڈبو دی، انہوں نے ایک جدید نظم سنائی وہ سمجھ یا ان کے اہل محلہ سمجھے سامعین تو کچھ بھی سمجھ نہ سکے۔ پھر زبیر رضوی آئے وہ بمبئی میں کئی بار آ چکے ہیں، لیکن اس بار وہ بھی معنی میں کامیاب رہے، ان کو ایک ہی دار میں تین بار سنا گیا جناب زبیر رضوی کی شاعری کا پہلا باب بھی ترنم سے اور آخری باب بھی ترنم ان کے کلام کو فن شعار یا کہنا مشق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا انہوں نے اس مشاعرے میں جو غزل سنائی اس کا ایک شعر ہے ؎

جو نہ اک بار بھی چلتے ہوئے مڑ کے دیکھیں
ایسی مغرور تمناؤں کا پیچھا نہ کرو

کوئی بتائے کیا معنی ہیں اس شعر کے، لیکن زبیر کی لے اتنی مدھر لطیف، دل کش اور دل آویز ہوتی ہے کہ سامع مسحور ہو کر ان کے شعر کے معنی درست یا نادرست ہونے پر غور ہی نہیں کر پاتا غرض کہ زبیر بہت سی داد تالیوں کی فرحت بخش آواز وصول کرنے کے بعد اپنی جگہ بیٹھے تو قاضی سلیم کھڑے ہوئے قاضی جی کو دیکھتے ہی بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ قاضی جی کا یہ بلا پس منظر کے انداز نشیئے ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے، قاضی جی نظریاتی اعتبار سے مسلم لیگی اسمبلی کے نام زد ممبر ہونے کی بنا پر کانگریسی اور فن کے اعتبار سے جدید ہیں۔ انہوں نے اپنی وہ نظم جو پچھلے فساد کے موقعہ پر کہی تھی، اور کئی بار جو وہ سنا بھی چکے ہیں، اس بار پھر سنائی، ساری بات تو سمجھ میں نہیں اتنا یاد ہے کہ ستر اونٹ تھے، اور کاغذوں سے لدے ہوئے تھے، اور اپنی اسی نظم کی ایک سطر کو انہوں نے اس طرح ادا کیا جیسے کوئی دھماکہ ہوا ہو، قاضی سلیم حیدرآبادی کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نظم پھر دہرانا صرف پرندے کے لیے آسکتا ہے سانپ چھپکلی یا کیڑے مکوڑے کے لیے نہیں۔

قاضی جی کے بعد اناؤنسر نے مجھ صاحب کا نام لیا وہ اہل بمبئی کے لیے نئے تھے یعنی پیروفیسر نثار الہ آبادی کہتے ہیں کہ نثار حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہیں انہوں نے غزل پیش کی، غزل خوش طور پر پسند کی گئی۔

نثار کے بعد فاضل اناؤنسر نے غبار بھٹی کا نام لیا، غبار صاحب بزرگ شاعر ہیں اور اساتذہ میں سے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ بمبئی میں پہلی بار آئے تھے، مگر انہوں نے اپنی غزل کا ہر شعر بڑے اعتماد کے ساتھ پڑھا غزل مرصع تھی، اور تقریباً ہر شعر قابل داد تھا دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

دیر و حرم بھی مل کے پکاریں جنت اپنے باغ دکھائے
کیا دیکھے وہ مڑ کر جس نے تیری ڈگر کو دیکھ لیا ہے
سچائی کے دیش میں کیا تھا اجڑے گاؤں اجڑے شہر
پنچھی کی بستی میں آکر روپ نگر کو دیکھ لیا ہے

حضرت غبار پیشے کے اعتبار سے طبیب ہیں شاید اس لیے انھیں سامعین کے مذاق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی، اگرچہ ترنم ان کا اتنا تھا، مگر رہنما مگر پسند کیا گیا۔

حضرت غالب کے بعد کرشن بہاری نور وارد ہوئے، مگر افسوس کہ وہ اپنے آپ میں نہیں تھے، ان کی غزل کے شعر تو اچھے تھے، مگر ان کے لہجے نے ان کے ہر شعر کو غیر سنجیدہ بنا دیا تھا، جس انداز سے نور اپنا کلام سنا رہے تھے، اس سے سامعین پر نہیں، خود ان پر رقت طاری تھی، آخر ہچکیاں ہونے لگی، وہ بچے کی طرح غوں غاں کرتے مائیک پر آئے تھے، اور روتے ہوئے چلے گئے، اور پھر کوئی حکیم وفا لکھنوی چھیلا بنے ہوئے کچ اپنی سنانے لگے، کسی نے نہیں سنی، وفا ناکام و نامراد اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔

بڑے لمبے چوڑے تعارف کے ساتھ اناؤنسر نے تسنیم فاروقی کا نام لیا۔ تسنیم نے یوں تو بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی غزل سنائی، مگر ظاہر ہے کہ اعتماد فن کار کی مہارت یا فن کی پختگی کی ضمانت نہیں ہوتا، چنانچہ تسنیم کی غزل کے کئی شعر لے معنی تھے، اور کئی شعروں کے معنی بہت سطحی تھے، اور یہ شعر تو قطعی طور پر مہم ثابت ہوا ؎

ریشمی کے پھول برسا کر مجھے زخمی کرو نہ دو
یاد سے تم کو جنوں میں آگ لگ جائیگی رات

مولانا آزاد نے کہا تھا شاعر کو فکر اور جستجو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، اور آج کا نوجوان شاعر فکر اور جستجو میں پڑ کر اپنی جان کھپانے کے لیے تیار نہیں۔

ایک بج چکا تھا آدھے سے زیادہ سامعین جا چکے تھے، باقی جا رہے تھے کہ نام رائچ کے مشہور کوی کامریڈ کیفی اعظم گنڈاسی کھڑے اور ایک گیت نما غزل سنائی، اور پھر اناؤنسر حاجی بیگ اتنا ہی کو ایک غزل سنا کر پوت پوت کرنا پڑا، اور اس طرح رات کے ڈیڑھ بجے یہ سرا سر ناکام مشاعرہ جو کافی تضیع اوقات (ساڑھے چار گھنٹے) کا باعث ہوا اپنے اختتام کو پہنچا۔

بمبئی میں ہر سال میں کئی آل انڈیا سطح کے مشاعرے منعقد ہوتے ہیں، مگر سمجھ اور بڑے لکھے سامعین سرسنگار سمدھی کے مشاعرے جیسے اچھی توقع رکھتے

کی چیرمین شپ خاجا عبدالغفور کے ہاتھ لگی ہے) سر سنگار کا مشاعرا توقع پر نہیں اترتا تا۔ سب وجہ کا چھپا نہیں ہے، یعنی یہ کہ ناچار اس اہم فوجدار کے ٹھانے کے قابل نہیں ہیں، وہ محض اپنی عہدے دارانہ شان کیا تھ اپنی اس ذمے داری کو نبھا رہے ہیں!

خاجا صاحب اور ان کے نصیف درمن مشیروں کی خدمت میں عرض ہے کہ شعرا کے انتخاب میں وہ احتیاط سے کام لیا کریں، اور انتخاب کے وقت یہ ملحوظ رہے کہ وہ ایک ایسے پبلک مشاعرے کے لیے شعرا کو مدعو کر رہے ہیں کہ جس میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوگا اور سنگار کے اسی دور میں مشاعرے کے ایک دو ٹکٹ خریدنے کا مطلب ہے گھر کے بجٹ میں کٹوتی اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ ہندستان میں صرف ایک شہر حیدرآباد ہی نہیں ہے، بگڑے ہوئے خیر کے اور بہت سے شہر ہیں جہاں سے شاعر پیدا ہوتے ہیں، اور یہ بھی کہ آٹے میں نمک جتنی ایک ہی خاتون شاعر مشاعرے کی اسٹیج پر رکھی ہوئی اچھی معلوم ہوتی ہے، آدھا واحد کا معاملہ کر واحد پیدا کرتا تھا۔ آخا صاحب جب اپنے ڈرائنگ روم میں کوئی محفل مشاعرہ منعقد کریں تب انھیں اس امر کا پورا پورا اختیار ہوگا وہ شاعر کی حیثیت سے عرشی حیدرآبادی کو مدعو کریں یا شکیلا بانو بھوپالی کو، لیکن پبلک مشاعرے کے سلسلے میں اقربا پروری علاقہ پرستی یا دوست نوازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی!

پنڈت جوشؔ ملسیانی

خونی بھیڑیئے

آدمیت کیا شرافت سے بھی جو واقف نہیں
وہ بھی پیسے کی بدولت مرد کامل ہو گئے
خون پینے والے کل تک تھے جو خونی بھیڑیئے
دم کٹا کر آج وہ بھیڑوں میں شامل ہو گئے

اسفندار۔فروردی اردی بہشت ۱۳۵۲ف ہندستانی ادب جنوری۔فروری۔مارچ ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر وی راگھون

سنسکرت ہمارا کرانقدر ورثا

سنسکرت زبان کے ممتاز اسکالر ڈاکٹر وی۔ راگھون کو لسانی ادب پر کافی عبور حاصل ہے۔ آپ مدراس یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں موصوف نے سنسکرت کے تدریجی ارتقا کا ایک اجمالی جائزہ لیا ہے۔

یوں تو ہندستان کی تمام زبانیں قومی زبانوں کا درجہ رکھتی ہیں، تاہم بعض وجوہ ایسی ہیں جن کی بنا پر سنسکرت زبان پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ آزادی سے پہلے کے دنوں میں ہندستانی ادب و زبان کی ترویج و فروغ کے لیے کوئی مخصوص سرکاری منصوبا نہیں تھا۔ ان دنوں سب سے زیادہ زور انگریزی زبان پر، اور اس کے بعد ہندستانی زبانوں اور ان سے وابستہ، جدید ادبیات کے ارتقا پر دیا جاتا تھا۔ آزادی کی جدوجہد کی ابتدا کے بعد ملک کے مختلف علاقوں کی مادری زبانوں کا بڑے پیمانہ پر استعمال نہایت ضروری ہوگیا، کیوں کہ یہی واحد طریقہ تھا جس کے ذریعے رہنمایان وطن عوام کے ساتھ رابطہ قایم کرکے ان تک آزادی کا پیغام پہنچا سکتے تھے۔ اسی رجحان کی بدولت علاقائی زبانوں میں نئے اخبارات و جرائد کا فروغ عمل میں آیا۔

اس زمانے میں پرائمری اسکولوں اور کالجوں کے نصابات میں دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت پڑھی اور پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کئی یونیورسٹیوں میں سنسکرت کی عالا تعلیم اور تصنیف و تالیف کی غرض سے تحقیقی شعبے بھی قایم تھے۔ سنسکرت علوم کے تحفظ میں مصروف دیسی ریاستوں کی کالجوں اور سنسکرت کے قلمی نسخوں کے کتب خانوں کی کفالت اور فیاضی کرتی رہی تھیں۔ ٹراونکور۔ میسور اور بڑودہ وغیرہ ریاستوں نے مسعودوں کی مدد سے سنسکرت کی طبع زاد درسی کتب کی اشاعت کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا۔ ملک کے مختلف مراکز مثلاً کلکتہ، بمبئی اور پونا میں کئی تحقیقی ادارے قایم کیے گئے۔ یورپ۔ امریکہ اور جاپان میں سنسکرت علوم کی روز افزوں مقبولیت کی بدولت بلواسطہ طور پر ہندستان میں بھی سنسکرت کے تئیں ایک نئی دلچسپی پیدا ہوگئی۔

حصول آزادی کے بعد حکومت نے علوم و فنون سے متعلق اکادمیاں قایم کیں۔

ساہتیا اکاڈیمی نے اپنے سنسکرت بورڈ کے توسط سے سنسکرت زبان میں تصنیف و تالیف کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس اکاڈیمی نے نئی تدوین اور ترتیب کے ساتھ کافی داد سی کی تنقیحات کی اشاعت نیز سنسکرت ادب کی تمام اصناف کے انتخابات کے ایک بیش قیمت مجموعے کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہندستانی زبانوں اور ادبیات کی تواریخ اور مختلف کی سوانح عمری کی اشاعت بھی اس اکاڈیمی کے کاموں کا ایک اہم جز ہے، اور اس میں سنسکرت بھی شامل ہے۔

ساہتیا اکادمی نے سنسکرت میں ایک دوسالہ جریدہ "سنسکرت پرتبھا" نکال کر اس زبان کی تشہیر و اشاعت کے ضمن میں ایک قابل ذکر کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ رسالہ مکمل طور پر سنسکرت زبان معاصر تخلیقی ادب پاروں کی اشاعت و فروغ کے لیے وقف ہے۔

اس رسالے کا دسواں شمارا شایع ہو چکا ہے۔ عمومی طور پر "سنسکرت پر بیتھا" موجودا ہندستان کے سنسکرت شعرا اور تمثیل نگاروں کو منظر عام پر لانے کا ایک بہترین وسیلہ ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے قیام کی بدولت متعدد نئی یونیورسٹیاں وجود میں آئیں، اور یونیورسٹیوں میں سنسکرت کے بہت سے نئے شعبے قایم کیے گئے۔

ہندستان کے دستور کے مطابق ہندی کو بھی طور پر قومی زبان تسلیم کیا گیا، اور سنسکرت کے گراں مایہ سرمایے کی بنا پر اسے زبان کی تدوین و ترویج کے لیے کاوشیں آغاز کیا گیا، لیکن سہ لسانی لائحۂ عمل کے تحت مرحلاتی اسکولوں میں تین زبانیں پڑھانا ضروری ہے۔ سنسکرت کی پوزیشن کو ایک حد تک غیر مستحکم کر دیا۔

ہندی قومی زبانوں کی حیثیت سے ہندی کی ترویج ضروری تھی۔ انگریزی بھی چھوڑی نہیں جا سکتی، اور علاقائی زبان کی اہمیت بھی اپنی جگہ مانی ہوئی تھی۔ ماہرین تعلیم کا خیال تھا کہ اس صورت میں ایک چوتھی زبان کا بوجھ بچوں کے کندھے پر زیادہ بار کر دینے کے مترادف ہے۔ سنسکرت کی حمایت میں طلبا کی تعداد کم ہوتی گئی۔ عام طور پر اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر صورت حال یہی رہی تو ایک دن یہ زبان اسکولوں کے نصاب سے غائب ہو جائے گی اور اس کا اثر کالجوں کے نصاب پر بھی پڑے گا۔

سائنسی اکادیمی کے سنسکرت سے متعلق مشاورتی بورڈ نے ان تمام امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ تجویز رکھی کہ ہندستانی سرکار ایک کمیشن کا تقرر کرے جو ملک میں سنسکرت علوم کی موجودا صورت حال کا جایزا لے کر اس زبان کے مطالعے کے تحفظ اور فروغ کے لیے اپنی تجاویز حکومت کے سامنے پیش کرے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور اس وقت کے ہندستان کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس تجویز کی بھرپور تائید اور حمایت کی۔ اوپر کی تجویز کے مطابق ۱۹۵۶ء میں سنسکرت کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیشن نے ایک سال تک پورے ملک کا دورا کیا۔ اور اس کے بعد اپنی روداد حکومت کو پیش کر دی۔ (۱۹۵۷ء)

صفحات پر مشتمل اس روداد میں سنسکرت کی تعلیم کے روایتی اور جدید طریقوں کا جایزا لیا گیا۔ اس روداد میں اوپر کے کمیشن نے حکومت میں چند تجاویز پیش کی تھیں، جن میں سے ایک تجویز کے مطابق حکومت نے وزارت تعلیم کے ایک حصے کے طور پر ایک مرکزی سنسکرت بورڈ قایم کیا، جس میں اس وزارت کے افسران کے علاوا سنسکرت سے متعلق اداروں کے نمایندوں، نیز سنسکرت کے متجر عالموں ہی کو نمایندگی دی گئی۔

۱۹۵۹ء میں قیام کے بعد سے مرکزی سنسکرت بورڈ نے سنسکرت کے مطالعے کے فروغ اور تحفظ کے ضمن میں متعدد اقدامات کیے ہیں۔ اس بورڈ نے اب تک سنسکرت میں اساتذا کی تربیت، ترقی یافتا سنسکرت شاستروں کی تدریس، نیز تحقیق اور توسیع واشاعت کی سہولتیں دستیاب ہیں۔

ترویج میں قایم سنسکرت کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ وسیع و عریض آگم سانیتا کی ایک قانونی صورت کرنے کا ایک بڑا پراجیکٹ قایم کیا ہے۔ سنسکرت کی تدریس کے طریقوں کو بہتر بنانے، سانسکرتی اور عمرانیات کے جدید موضوعات پر سنسکرت کی لغاتی کتب کی تدوین اور ترتیب اور انگریزی نیز دوسری زبانوں میں ہندستان سے متعلق علوم کے مواد کے سنسکرت میں ترجمے وغیرا اوپر بیان کیے گئے اداروں کے پروگراموں میں شامل ہیں۔

مرکزی سنسکرت بورڈ نے حال ہی میں اوپر کے تعلیمی اور علمی اداروں کے سنسکرت امتحانات کو مرکزی نظام کے تحت لے لیا ہے۔ اور ایک مرکزی امتحانی کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔ یہ کمیٹی "ودیرسی" کے نام سے ایک تحقیقی جریدا شایع کرے گی، اور "ملاے مدرست" کے عنوان کے تحت ایک اور رسالا بھی نکالے گی۔

حکومت اس بورڈ کے توسط سے ان پنڈتوں کی امداد کرتی ہے جنھیں سنسکرت کے علم کے مختلف موضوعات پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ حکومت کی جانب سے ان پنڈتوں کو سالانا وظایف اور راشٹرپتی کے اعزازات دیے جاتے ہیں۔

جہاں تک یونیورسٹیوں کے شعبہاے سنسکرت

کا تعلق ہے، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ان شعبوں کو اور ان کے شروع کیے گئے پراجیکٹوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ مرکزی سنسکرت بورڈ کو سنسکرت کے متعلق رضاکار تنظیموں، نیز ان پاٹ شالاؤں اور گوروکلوں کی خیر گیری کی ذمے داری دی گئی ہے، جہاں قدیم انداز میں سنسکرت پڑھائی جاتی ہے۔ ان رضاکار تنظیموں کو درس و تدریس کے طلبا کے لیے وظائف، لائبریری، کتابوں اور تحقیق و اشاعت کے خصوصی پراجیکٹوں کے لیے سالانہ امداد بھی دی جاتی اور پرگیا پاٹھ بورڈ سنسکرت کی کتابوں یا مقالوں کی اشاعت، سنسکرت کے مخطوطوں کی ترتیب اور نایاب کتابوں کی دوبارہ اشاعت کے لیے بھی امداد دیتا ہے۔

اس وقت ملک میں مختلف سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کی سرپرستی میں سنسکرت کے لیے ایسے متعدد اہم پراجیکٹ چل رہے ہیں، جن کو جنہیں اس بورڈ کی طرف سے ملوا سلایا ملوا واسطا مالی امداد ملتی ہے۔ بورڈ کے پروگراموں میں سنسکرت کے ایک مرکزی کتب خانے کا قیام اور ملک بھر میں ذاتی یا سرکاری تحویل میں پڑے ہوئے سنسکرت کے مخطوطوں کا جائزہ، ان کا حصول، تحفظ اور اشاعت بھی شامل ہے۔

علم ہیئت اور علم طب کے شعبوں میں سنسکرت کے پاس معلومات کا جو بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، اس کی افادیت دورِ حاضر میں بہت زیادہ ہے۔ مرکزی وزارت صحت کے تحت ایک شعبہ دیسی طب سے متعلق امور کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ یہ شعبہ آیورویدک اور طب کے دوسرے ہندستانی طریقوں، مثلاً طب یونانی، اور سدھ، کے فروغ کے لیے پوری کوشش کر رہا ہے۔ وزارت تعلیم کے تحت بھی ایک شعبہ سنسکرت ادب میں موجود ہندستانی علوم کے مطالعے کے لیے قایم کیا گیا ہے۔

سنسکرت کے مرکزی بورڈ کا سب سے زیادہ قابل ذکر اور شاندار کارنامہ سنسکرت کی وہ پہلی بین قومی کانفرنس ہے، جس کا انعقاد نئی دہلی میں مارچ ۱۹۶۱ء کے آخری ہفتے میں ہوا، اس کانفرنس میں (۱۰) سے زیادہ ملکوں کے نمایندوں نے شرکت کی۔ ہندستانی اداروں کے نمایندوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی اس کانفرنس میں حصا لیا۔ اوپر گنائی گئی کانفرنس میں موضوعات اور دستاویزات کے ایک منصوبا بند سلسلے کے ذریعے سنسکرت اور ہندستان نیز غیر ممالک کی زبانوں اور ادبیات کے باہمی تعلق پر زور دیا گیا۔ کانفرنس کے شرکا نے اس تعلق پر بھی غور کیا کہ سنسکرت زبان و سنسکرت ادب اور فلسفہ باہم آہنگی اور اتحاد اور عالمی یکجہتی کے جذبے کے فروغ میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔

سنسکرت کی ترقی کے مسئلے کے بارے میں دو باتیں مختصر کہہ سکتے کہ اس کا تعلق خاص طور پر دو باتوں سے ہے۔ ایک یہ کہ اسکولوں میں اس کی تعلیم کی سہولتیں مہیا کی جائیں، اور دوسرے یہ کہ سنسکرت کے طلبا کو مناسب مقام دیا جائے، اور اس کے بعد ان قدیم پاٹ شالاؤں کو بھی پھر سے مستحکم بنانے کی ضرورت ہے، جہاں روایتی مطالعے سے پیدا ہونے والے نقطۂ نظر اور عام معلومات کے لیے سنسکرت کی کمی پائی جاتی ہے۔

سنسکرت کے مرکزی بورڈ نے آچاریا اور شاستری درجات کے لیے ایک نیا نصاب تعلیم مرتب کیا ہے، جو نہ صرف جدید موضوعات، بلکہ تقابلی اور تنقیدی مطالعے پر مشتمل ہے۔ بورڈ کی جانب سے قدیم اور روایتی پاٹ شالاؤں کو تحقیقی کاموں اور مقالے لکھنے کے لیے خصوصی وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔ حکومت نے حال میں منصوبے میں سنسکرت زبان کے فروغ کے لیے اوپر کے بورڈ کو ایک کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم مختص کی ہے۔

اس سلسلے میں وزارت اطلاعات و نشریات کی پبلی کیشنز ڈویژن کی خدمات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ اس ادارے نے متعدد اشاعتوں میں سنسکرت علوم کی تمام شاخوں سے متعلق بہت سی کتابوں کو زیبا مقام دیا جاتا ہے۔ پبلیکیشنز ڈویژن نے اب ثقافتی موضوعات پر کتابیں شایع کرنے کا ایک کا ایسا سلسلہ شروع کیا ہے، جس میں سنسکرت کے شعبے کا مکمل احاطا کیا گیا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹیشنوں سے سنسکرت ادب پر وقتاً فوقتاً مقالے نشر کیے جاتے ہیں، اور سنسکرت کے ڈرامے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو اس زبان کے مشہور شاعروں مثلاً کالیداس سے متعلق سے خصوصی پروگرام بھی نشر کرتا ہے۔

سنسکرت سے متعلق مرکزی بورڈ ہر سال سنسکرت میں تقریروں کا اہتمام کرتا ہے۔

کے۔ام۔منشی نے سنسکرت و شویر پریشد اور بھارتی ودیا بھون کی بنیاد ڈالی۔ سنسکرت کے پرچار کی غرض سے ملک کے اہم مراکز پر ان دونوں اداروں کی شاخیں قایم ہیں۔ بھارتیا ودیا بھون سرل سنسکرت امتحان منعقد کرتا ہے۔ دوسری تنظیمیں مثلاً چیتوڑ سنسکرت بھاشا پرچارنی سبھا، اور رمنوب میں قایم امر بھارتی سنسکرت کے پراٹیوٹ امتحانات کا اہتمام کرتی ہیں۔

سنسکرت کی قدیم کتابوں کے خاص خاص اقتباسات کو ملک اور حکومت کے تمام شعبوں کے نصب العین کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان ہی میں "ستیامیو جیتے" بھی ہے، جس کا مفہوم ہے سچائی کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔"

ایک نئے ہندستان کی تعمیر کے لیے، جن عوامل اور خصوصیات کی ضرورت ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سنسکرت زبان اور اس کے فلسفے اور افکار اور ثقافت کو مضبوط اور مستحکم بنایا جائے، تاکہ سنسکرت کی آبیاری و احیا محض ملک کے اس قدیم ورثے کی ایک کوشش تک محدود ہو کر نہ رہ جائے بلکہ یہ زبان آج کے ہندستان کی تعلیم کے سرچشمے کے ایک اٹوٹ حصے کی حیثیت سے برقرار رہ سکے۔

ساگر نظامی

رباعی

کہنے کو تو دلربا بڑی ہے دنیا
پھولوں کی حسین پنکھڑی ہے دنیا
لیکن اس ایٹمی ترقی کے طفیل
بارود کے ڈھیر پہ کھڑی ہے دنیا

ملکیت وغیرہ سے متعلق تفصیلات نسبت ماہوار رسالا

"ہندستانی ادب"

تحت ضابطہ فارم۔۴۔قاعدہ نمبر (۸)

۱۔ مقام اشاعت ۹۹۔اے۔اعظم پورہ اشرقی۔ حیدرآباد ۳۶ (اے۔پی)

۲۔ چھپائی کا وقفہ ماہوار

۳۔ پرنٹر کا نام عبدالرحیم
قومیت ہندستانی
پتا چھتا بازار۔حیدرآباد ۲ (اے۔پی)

۴۔ پبلشر کا نام جی۔ام۔خان
قومیت ہندستانی
پتا ۹۹۔اے۔اعظم پورہ اشرقی حیدرآباد ۳۶۔(اے۔پی)

۵۔ ایڈیٹر کا نام، قومیت، پتا پبلشر ہی ایڈیٹر بھی ہے۔

۶۔ دوسرے شریک کار حضرات کے نام اور پتے وغیرہ اس کام میں ہمارا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

میں جی۔ام۔خان اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ اوپر دی گئی تفصیلات صحیح ہیں۔ پبلشر کی دستخط

تاریخ پہلی مارچ ۱۹۷۳ء

سید ضیاء الحق

عثمانیا میڈیکل کالج حیدرآباد

انیسویں صدی کے آخر آخر زمانے تک بھی دکن میں عوام "انگریزی دوا" کے نام سے بڑی حد تک ناواقف تھے۔ شاہان آصفیا کی سرپرستی اس کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ امرا بھی اس طریقے علاج سے کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ لے دے کر اس کا دائرے عمل انگریزی فوج اور انگریزی حکام تک ہی محدود تھا۔ قادر مطلق اگر کسی چیز کو کوئی شے گمنامی سے نکال کر بام شہرت پر پہنچانا چاہے تو اس کو کون روک سکتا ہے، چنانچہ قدرت نے ایک عجیب و غریب طور پر "انگریزی دوا" کے دکن میں ظہور و عروج کے سامان پیدا کر دیے۔

روایت ہے کہ قریب بازار میں عبدالقادر صاحب رہتے تھے۔ یہ ڈینٹن صاحب لفٹیننٹ کے چپراسی تھے۔ اور موصوف کی انگریزی ڈسپنسری میں کام کرتے تھے۔ کام کرتے کرتے انہیں کونین اور دوسری عام ادویا مثلاً جلاب وغیرہ کی گولیوں سے بہت کچھ واقفیت ہو گئی تھی۔ یہ مریضوں کا علاج بھی کرنے لگے اور ان ہی ادویات سے کام لینے لگے۔ بہتیرے مریضوں کو ان ادویات سے شفا ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان کے علاج کی بڑی شہرت پھیل گئی۔ مریضوں کا مجمع بڑھ گیا۔ عبدالقادر صاحب نے اپنی بڑھی ہوئی شہرت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ کافی دولت کمائی اور نام آوری حاصل کی۔

۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں نواب ناصر الدولہ بہادر نظام چہارم کا مزاج "مرض حرقت بول" سے ناساز ہو گیا۔ درباری حکما و حیدرآباد کے نامی گرامی اطبا نے بہتیرا علاج کیا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ طب یونانی دکن میں عروج پر تھی۔ شاہان آصفیا کی سرپرستی اس کو حاصل تھی۔ امرا اس کے بے حد قدر داں تھے۔ ایران، عرب اور شمالی ہندستان سے یونانی طبیب کشاں کشاں ہندستان چلے آرہے تھے۔ ان میں سے بعض نے اپنے مطب بھی کھول لیے تھے اور کامیابی کے ساتھ علاج معالجے میں مصروف تھے۔ بعض نے دربار شاہی یا امرائے عظام کی پیشی میں بہ حیثیت معالج ملازمت اختیار کر لی تھی، اور منصب و جاگیرات و خلعت سے بھی سرفراز تھے۔

یونانی علاج سے مایوس ہو کر حضور نظام کسی دوسرے طریقے علاج کے متلاشی تھے۔ اسی اثنا میں علالت کی خبر سن کر جنرل اسٹیورٹ فیریزر ریذیڈنٹ حیدرآباد مزاج پرسی کے لیے حضور نظام کے پاس حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں انگریزی علاج کا تذکرہ بھی ہوا۔ حضور نے فرمایا "آپ کا علاج بھی انگریزی دوا میں ہے۔" صاحب عالی شان نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا کہ اگر حکم ہو تو ڈاکٹر حاضر کیا جائے گا۔ حضور نے ڈاکٹر سے علاج کروانا تو منظور فرمایا لیکن یہ شرط عاید کی کہ ڈاکٹر موصوف اسی طرح علاج کرے گا، جس طرح حکیم علوی خان نے نادر شاہ کا علاج کیا تھا۔

علوی خان کے علاج کی اپنے انوکھے پن کے باعث تاریخ طب میں بڑی شہرت ہے۔ یہ اس زمانہ کے نامی گرامی طبیب تھے۔ اودھ دلی میں مقیم تھے۔

جہاں اپنے حیفان قلب سے ہزاروں مرنیوں کو نامۂ اعمال بھیجا رہے تھے۔

۱۷۳۹ء میں جب نادرشاہ نے دلی پر حملہ کیا، یہ بھی دلی میں موجود تھے۔ شہر پر قبضہ کرنے کے بعد مفسدوں کی فتنہ پردازی کے باعث نادرشاہ نے قتل عام کا حکم دے دیا تھا، پھر کیا تھا کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ لوٹ اور غارت گری کا بازار بھی گرم ہو گیا۔ محمد شاہ اور دوسرے ارکان کی منت وسماجت پر کشت وخون تو رک گیا، لیکن شہر دلی تباہ وتاراج ہو گئی۔ نادرشاہ اور اس کے سپاہیوں کو کثیر مال غنیمت ہاتھ لگا۔

نادرشاہ نے جب ایران واپس جانے کا قصد کیا تو مال غنیمت کے ساتھ ساتھ دلی کے اہل کمال ہستیوں میں سے وہ بعضوں کو چن چن کر اپنے ساتھ لے لیا۔ موسیقی اور مال غنیمت کی طرح اہل بھی نادرشاہ کے ساتھ بندے بندائے ایران روانہ ہوئے۔ دوران سفر نادرشاہ کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی۔ اس کو یاد آیا کہ دلی کا ایک باکمال طبیب بھی ہم سفر ہے۔ حکم ہوا کہ حکیم کو فوراً حاضر کیا جائے۔ علوی خاں کی آمد پر نادرشاہ نے اپنی ناسازی طبیعت کی کیفیت سنائی اور کہا کہ میرا علاج کرو مگر شرط یہ ہے کہ میں کوئی دوا نہیں پیوں گا۔ بیرونی طور پر کوئی ضماد وغیرہ کا بھی استعمال نہیں کروں گا۔ نبض اور شوربے کا امتحان بھی نہ ہوگا۔ اس کے باوجود حکیم صاحب میرا علاج کریں گے، اور میرے مرض کو دور کریں گے تو رنا ان کے سر کی خیر نہ ہوگی۔

اس حکم نادرشاہی کو سن کر علوی خاں گھبرا گئے کہ بغیر شناخت مرض علاج کیسے ہو سکتا ہے، نیز بغیر استعمال دوا مرض کا ازالہ کیسے ممکن ہے، لیکن حکیم صاحب بلا کے فرنسی اور ذہین تھے، فوراً عرض کیا خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا، نادرشاہ کے چہرے پر ایک گہری فکر وتابی دیکھی کہ آنکھیں لال لال ہیں، چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔ اس دن شدید گرمی بھی تھی۔ علوی خاں نے اندازہ لگایا کہ شاہ درد سر میں مبتلا ہے۔ دربار سے اپنے مقام پر واپس ہوئے تو خدمت گار کو بلا کر حکم دیا کہ "سدا گلاب" کا پنکھا تیار کرو، اور اس کو عطر شمس میں شرابور کر دو۔

جب پنکھا تیار ہو گیا تو علوی خاں نادرشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت حاصل کر کے پنکھا جھلنے لگے۔ پھولوں کی خوشبو بادشاہ کے دماغ میں پہنچی، اور عطر کے بھیگے بھیگے قطرے بادشاہ کے چہرے اور پیشانی پر ٹپک کر سکون اور فرحت کی کیفیت پیدا کرنے لگے۔ بادشاہ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ غفلت کی نیند سو گیا۔ علوی خاں بادشاہ کو سوتا دیکھ کر اپنے خیمے میں واپس چلے گئے۔

پرسکون نیند اور آرام کے بعد نادرشاہ کا درد سر جاتا رہا۔ خوش ہو کر نادرشاہ نے علوی خاں کو خود مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا۔ حکیم صاحب بادشاہ کی تلون مزاجی سے خوب واقف تھے۔ اس لیے اول ایفائے عہد کا پیمان لیا، اور پھر عرض کیا کہ غلام کو اپنے وطن دلی واپس جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ سچ ہے "حب الوطن از ملک سلیمان خوشتر"۔

نادرشاہ نے غالباً یہ خیال کیا تھا کہ حکیم صاحب کچھ زر وجواہر طلب کریں گے، لیکن یہاں تو ان کے پیش نظر ہی کچھ اور تھا۔ "گھر کی لاج" نادرشاہ نے حد متفکر ہوا کہ ایک بے مثل طبیب اس کے قابو سے نکل جا رہا ہے، لیکن کیا کرتا شاہی عہد وپیمان کی لاج ضروری تھی۔ نہایت عزت واحترام کے ساتھ حکیم صاحب کو واپس کر دیا۔ حکیم صاحب ایک بے کرم ظالم کے پنجے سے چھوٹ کر خوشی خوشی دلی واپس ہوئے۔

نواب ناصر الدولہ بہادر کی یہ خواہش تھی کہ ان کا علاج بغیر کسی امتحان وبغیر کسی دوا کے ہو، شاید یہ اس زمانے کے شکوک وشبہات کا نتیجہ تھا۔ اس زمانے میں عام طور پر بادشاہ کی قریب میں چند خاص امراء وملازمین کے سوا دوسروں کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ خوف تھا کہ کوئی دشمن موقع پا کر خنجر نہ بھونک دے، دوا کے بہانا زہر نہ پلا دے۔ بہر حال کسی نہ کسی وجہ سے نواب ناصر الدولہ تشخیص اور دوا کے استعمال پر آمادہ نہ تھے۔

جنرل فریزر نے جب دہلی میں ایک انگریز ڈاکٹر

بنام، ولیم کیمل میکلن، کو ناصر الدولا کی خدمت میں پیش کیا۔ ڈاکٹر میکلن رزیڈنسی سرجن تھے، اور انگریزی علاج کی حد تک طبیبِ انگریزی فوج اور انگریزی حکام میں بہت مشہور تھے۔ موصوف نے ناصر الدولا سے پوچھ گچھ کر کے مرض کا پتا چلایا اور علاج کے سلسلہ میں صرف غذا کا پرہیز اور اس کے روک تھام کی ہدایات دیں۔ نواب معزز نے تین مہینے تک ان ہدایات کی پابندی کی، اور اس کے بعد مکمل صحت فرمایا۔

ڈاکٹر میکلین کے علاج سے ناصر الدولا نے حد خوش ہوئے اور صحت یابی کی مسرت میں دربار منعقد ہوا۔ رزیڈنٹ مبارک باد عرض کرنے حاضر دربار ہوئے۔ ناصر الدولا نے انھیں خلعت عطا فرمائی۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر ایک سرجن میں انگریزی دوا یعنی الیوپیتھک علاج کیا جائے تو یہاں کی رعایا کو بہت زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔

نواب سراج الملک دیوان وقت نے الیوپیتھک علاج کی مخالفت کی۔ دسویں کا نزل ہندستانی دوا کے طباح انگریزی علاج سے موافقت نہ کر سکیں گے۔ اس خصوص میں طول طویل بحث و مباحثہ ہوا۔ آخر حکیم ان کی تحریک اور صاحب عالی شان کی تائید کے بعد یہ ناممکن تھا کہ اسکیم کو رد یا عمل نہ لایا جائے۔ آخر یہ طے ہوا کہ الیوپیتھک کی تعلیم شروع کی جائے۔

اس طرح میڈیکل اسکول کی بنیاد رکھی گئی۔ میر امام علی خاں صاحب حضور کو طلب کر کے امیدواروں کے انتخاب کا حکم دیا گیا۔ انتخاب کے شرائط یہ تھے کہ امیدوار سربرآوردہ منصب سے وابستہ ہو، عمر ۱۴ یا ۱۵ سال ہو، ہوشیار اور پڑھا لکھا ہو۔ ڈاکٹر میکلن نے تو کے سانچے لے کر تیار کیے، اور کل نے صاحب کا مکان تین روپے کرایہ پر لیا۔ دو چراغی، ایک منشی (امیر علی) اور ایک مترجم (مسٹر مرے) کو مامور کیا۔ ان تیاریوں کے باوجود بھی کوئی منصب دار شریک اسکول نہیں ہوا، اور یوں ہی ایک سال گزر گیا۔ اس نوبت پر اشتہار بھی جاری ہوا کہ بلدہ حیدرآباد میں ایک ڈاکٹری مدرسہ قائم ہوا ہے، جو شریک ہونا چاہتے ہوں حاضر ہوں، صرف تین یا چار امیدوار حاضر ہوئے۔ شرکا کی کمی کے باعث تعلیم کا آغاز نہیں ہو سکا۔

کچھ عرصے کے بعد نواب ناصر الدولا کے پاس یہ کارروائی مکرر پیش ہوئی۔ نواب معزز نے میر امام علی خان سے دریافت فرمایا کہ کیوں اب تک امیدواروں کا انتخاب نہیں ہوا، اور کیوں وہ میرے ملاحظے میں پیش نہیں ہوئے۔ اس وقت نواب شمس الامرا کے وکیل (غلام محی الدین) حاضر دربار تھے۔ انھوں نے عرض کی کہ اگر خادم کو حکم ہو تو ابھی امیدواروں کو حاضر دربار کرتا ہے۔ نواب شمس الامرا کے مدرسے میں منصبداروں کے چار سو بچے پڑھتے ہیں، ان میں اکثر فارغ قضا ہو رہے ہیں، آسانی سے حسب ضرورت امیدواروں کا انتخاب اسی جماعت سے ہو سکتا ہے۔ اجازت حاصل کر کے غلام محی الدین ۲۶ رمضان ۱۲۶۷ھ کے آٹھ بجے شب شمس الامرا کی خدمت میں پہنچے، اور سارا واقعہ بیان کیا۔ نواب صاحب نے اسی وقت مدرسے کے استادوں کو بلا کر مدرسے کے چند قابل لڑکوں کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ تیس (۳۰) لڑکے حاضر ہوئے۔ نواب صاحب نے دوسرے دن سبھ کو ان کا امتحان لینا اور نو عمر لڑکے منتخب فرمائے، ان کو ہیئت سے تشریح وتحلیل دے کر اور انعام مرحمت فرما کر ایک چیلا اسی کے ساتھ مڈیکل اسکول بھیجا جائے۔ منتخب لڑکے ۲۷ رمضان ۱۲۶۷ھ بجری روز دوشنبہ اسکول میں حاضر ہوئے۔

مڈیکل اسکول کا ماحول یوں بھی دوسرے مدارس سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں تو مدرسے، انسانی ڈھانچے اعضائے بدن پر تعلیم اور تجربات ہوتے ہیں۔ پہلا امیدوار ہی لڑکوں کا ان چیزوں اور گھناؤنی چیزوں سے کیا کام۔ لڑکے ڈھانچوں کو دیکھ کر چیخ اٹھے، اور کانپنے لگے، ان میں سے دو تو اسی وقت بھاگ گئے کہ مارے وحشت کے ان کو بخار چڑھ آیا، اسی کے بعد یہ پھر کبھی مدرسے نہ آئے۔

آخر کار مدرسے میں تعلیم شروع ہو گئی، آہستہ آہستہ تعداد طلبا بھی بڑھنے لگی۔ ربیع الثانی ۱۲۶۸ھ بجری یعنی افتتاح کے چھ ماہ بعد ناصر الدولا کی ایما پر نواب شمس الامرا بہادر نے حیدرآباد مڈیکل اسکول کا معائنہ

فرمایا اور خوش ہو کر دو سو روپیے بطور انعام عطا فرمائے۔ آٹھ سال بعد دس طبیب میڈیکل سے فارغ ہو کر نکلے، اور انھیں لیاقت نامے سرکاری عطا ہوا، اور تیس روپے ماہوار سے مامور کر کے انھیں اضلاع پر بھیج دیا گیا۔

میڈیکل اسکول میں ابتدا تعلیم کا ذریعا ہندستانی زبان تھا۔ ڈاکٹر سکلین جب اسکول پر مامور ہوئے تو انہوں نے ہندستانی زبان سیکھ کر تعلیم دینی شروع کی تھی، ان کی مدد کے لیے، ایک مترجم بھی تھا۔ صفر ۱۲۷۲ھ میں میڈیکل اسکول کی جانب سے ایک رسالا بنام رسالۂ طبابت" ڈاکٹر جارج اسمتھ مہتمم مڈیکل اسکول کی ادارت میں نکلتا رہا۔ حیدرابا د کے طبی رسالوں میں سب سے پہلا یہی رسالا ہے۔ یہ رسالا نواب سالار جنگ کے چھاپے خانے سے طبع ہو کر شایع ہوا کرتا تھا

۱۸۸۷ء کے بعد مڈیکل اسکول کی تعلیم کا ذریعا بجاے ہندستانی کے انگریزی ہو گیا۔ طلبا کا امتحان منشی سکندرابا د مڈیکل بورڈ ہوتا تھا۔ چھ مہینے کے بعد تحریری امتحان کے پرچے مدراس یا بمبئی کے مڈیکل کالجوں سے آنے لگے۔ زبانی امتحان کے لیے سکندرابا د میں ایک مڈیکل بورڈ قایم ہوتا تھا۔ نصابی تعلیم مدراس کے ال۔ ام۔ یس اور ال۔ ام۔ پی کے معیار پر ہوتی تھی۔

ابتدا میں رزیڈنسی سرجن ہی حیدرابا د مڈیکل اسکول کا پرنسپل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر سکلین حیدرابا د مڈیکل اسکول کے پہلے پرنسپل تھے۔ موصوف کے بعد ۱۸۸۵ء میں ڈاکٹر جارج اسمتھ مہتمم ہوے، اور ۱۸۹۱ء میں جارج نیلنگ نے مہتممی کا چارج حاصل کیا۔ مزدی مدارج طے کرنے کے بعد حیدرابا د مڈیکل اسکول ترقی کرتے کرتے ایک معیاری مڈیکل کالج میں تبدیل ہو گیا، اور حکمران وقت نواب میر عثمان علی خاں نے سابق کے نام پر اس کا نام عثمانیا مڈیکل کالج رکھا گیا ۱۹۲۶ء میں اس کا الحاق عثمانیا یونیورسٹی سے عمل میں آیا، اور ایم۔ بی۔ بی۔ یس اور دوسری ڈگریوں کی تعلیم دی جانے لگی۔ اسی طرح ایک چھوٹے مدرسے سے ترقی کرتے کرتے حیدرابا د مڈیکل اسکول ایک عالا مڈیکل کالج بن گیا۔ ڈگری کلاسوں کے علاوا اس کی پوسٹ گریجویٹ جماعتیں بھی قایم ہیں۔ اس کی تعلیمی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ سکم، بھوٹان اور نیپال سے بھی کچھ طلبا آکر اس کالج میں شریک ہوے تھے۔ اس وقت اس کے پرنسپل ڈاکٹر ہرنیش چندرام۔ بی۔ بی۔ یس۔ یف۔ آر۔ سی۔ پی، ڈی۔ سی۔ ایچ، یف۔ اے۔ ام۔ یس ہیں، اور وائس پرنسپل ڈاکٹر معین الدین خان سندوزئی ام۔ بی۔ یس۔ آر۔ سی۔ پی، ام۔ یس۔ سی ہیں۔ ان دونوں ماہران الوپیتھی کی سرپرستی عثمانیا مڈیکل کالج تیزی کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ اور ہندستان کے چوٹی کے مڈیکل کالجوں سے بہت آگے نکل چکا ہے۔

حمید قیصر (دھولیا)

شکوۂ مدرس

(رہنماے قوم کی خدمت میں معذرت کیساتھ)

رہنما ہے گیا معلوک مدرس کو صلہ
حق جو مانگے تو ملے اس کو عتابوں کی سزا
شوق بیدار نہیں اس کی کمند لی کوئی خو
کوسا جاتا ہے فقط ایک مدرس گر گر
بھوک سے ہو گا مدرس ہی اگر کج منڈھال
خاک کیا تم کو بتاے گا وہ تعلیمی کمال
ہم سے بیدار زمانے کی لیاقت ہو گی
ملک اور قوم کی سچی یہ عبادت ہو گی
تیری تعلیم نے ابھی یہ گواہی دی ہے
ملک کو صرف مدرس نے تباہی دی ہے

بادل استاد عبث ایں سبق آموز جہاں
ہر چہ سوزد ز معلم او ہمہ سوخت جہاں

اسفندار۔فروردی اردی بہشت ۱۳۵۲ف ہندستانی ادب جنوری۔فروری۔مارچ ۱۹۷۳ء

رابرٹ ٹال۔برکلے

رچرڈ ایم۔نکسن پریسیڈنٹ آف امریکا

(پریسیڈنٹ آف امریکا جو آیندہ چار سال کے لیے دوبارا صدر منتخب ہوے ہیں)

رچرڈ نکسن نہایت معمولی شروعات سے صدارت کے عہدے جلیلہ تک پہنچے ہیں۔ نکسن ۹ جنوری ۱۹۱۳ء کو یوربالینڈا (کیلی فورنیا) کے ایک باغبان کے ہاں پیدا ہوے تھے۔ نکسن ماں باپ فرینک اور ہنا نکسن کے پانچ بیٹوں میں منجھلے ہیں۔

جب (۹) برس کے تھے تو ان کے گھر والے وہٹیر (کیلی فورنیا) میں منتقل ہو گئے، جہاں ان کے باپ نے کھانے پینے کے سامان کی ایک دکان اور اس کے ساتھ ایک پیٹرول سروس اسٹیشن کھولا۔ کالج میں پڑھتے ہوے نکسن اسی اسکور میں کام کرتے رہے۔

نوجوان نکسن نے وہٹیر کالج میں آنرز کے ساتھ گریجویشن کیا، اور ڈیوک (نارتھ کیرولائنا) کے ڈیوک یونیورسٹی لا اسکول میں اسکالرشپ حاصل کیا۔ یہاں سے انہوں نے ۱۹۳۷ء میں آنرز کے ساتھ قانون کی ڈگری لی۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک رچرڈ نے وہٹیر میں وکالت کی، اور پھر واشنگٹن (ڈی۔سی) چلے گئے۔ جہاں انھوں نے قیمتوں کے انتظام سے متعلق دفتر میں امریکی حکومت کی ملازمت اختیار کر لی۔

آٹھ مہینے بعد نکسن امریکی بحری بیڑے میں بھرتی ہو گئے، جہاں ان کو لفٹننٹ جونیئر گریڈ کا عہدا دیا گیا، اور دوسری عالمگیر جنگ میں انہوں نے تین جہازوں کے ایگزیکٹو افسر کے طور پر جنوبی بحرالکاہل میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۶ء میں جب وہ بحری بیڑے سے ڈسچارج کیے گئے تو اس وقت لفٹننٹ کمانڈر کے عہدے پر تھے۔

اسی سال سے انھوں نے اپنی سیاسی زندگی شروع کی۔ اور کیلی فورنیا سے ایوان نمائندگان کا انتخاب جیتا، اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں آپ دوبارا منتخب ہو گئے۔

۱۹۵۰ء میں نکسن نے ایوان نمائندگان کی ایک رکن مسز ہیلن گیگن کو شکست دے کر غالب اکثریت سے سینیٹ کا انتخاب جیتا۔

۱۹۵۲ء میں آئزن ہاور نے صدارت کے لیے ری پبلکن پارٹی کی نامزدگی حاصل کی تو انہوں نے مسٹر نکسن کو نائب صدارت کے لیے اپنا انتخابی ساتھی چنا، دونوں نے آسانی سے انتخاب جیت لیا، اور پھر ۱۹۵۶ء میں دوبارا منتخب ہوے۔

اس عرصے میں نکسن نے عملاً صدر کے کچھ فرائض بھی انجام دیے، تین مرتبہ انھیں علیل صدر آئزن ہاور کی قائم مقامی کرنی پڑی، تو انھوں نے کبھی یہ تاثر نہیں دیا کہ وہ صدارت کا عہدا سنبھال رہے ہیں۔

مسٹر نکسن کی سیاسی زندگی ۱۹۶۰ء میں ایک نقطۂ عروج پر پہنچی، جب کہ گذشتہ (۱۲۴) سال کی تاریخ میں وہ پہلے ایسے نایب صدر تھے، جنھوں نے برسر عہدا رہتے ہوے صدارت کے لیے اپنی پارٹی کی نامزدگی حاصل کی۔

اپنی انتخابی مہم کے دوران وہ امریکا کی سبھی (۵۰) ریاستوں میں گئے۔ اور اپنے اس پیغام کو لوگوں کے ذہن نشین کرتے رہے کہ بقول ان کے آئزن ہاور کے دور صدارت میں جو ترقی ہوئی تھی اسے وہ جاری رکھیں گے۔

ان کے ڈیموکریٹک حریف جان۔ایف۔کینڈی نے بھی وسیع پیمانے پر مہم چلائی، اور یہ کہ آیسی باتوں پر زور دیا، جنہیں انھوں نے ملک کے معاشی نظام کے زوال پذیری اور عالمی معاملات میں اپنی امریکی ساکھ کی گراوٹ سے تعبیر کیا۔

نکسن صرف (۱۱۲۸۰۳) عوامی ووٹوں سے ہار گئے، جو (۲۰) ویں صدی کے کسی بھی صدارتی انتخاب میں سب سے کم فرق تھا۔

اس وقت تک نکسن کے عروج کی رفتار حیرت انگیز رہی تھی۔ صرف (۳۳) سال کی عمر میں وہ ایک معمولی وکیل کی حیثیت سے ترقی کرکے امریکی ایوان نمایندگان کے رکن بن گئے تھے۔ (۳۷) سال کی عمر میں سینیٹ کے ممبر ہو گئے، (۳۹) سال کی عمر میں نائب صدر۔

کیلی فورنیا واپس آکر نکسن نے اپنی کامیابی پھر شروع کر دی۔ پھر ۱۹۶۰ء میں انہوں نے ڈیموکریٹک گورنر پاڈمنڈ جی۔ براؤن کے مقابلے پر کیلی فورنیا کی گورنری کا انتخاب لڑا اور ناکام رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے محسوس کیا کہ "ایک سیاسی طاقت کے دور پر ان کا زمانہ ختم ہو گیا ہے"۔

دوسرے سال وہ نیویارک کے ایک قانونی فرم میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی ملکوں کے کئی دورے کیے۔ اپنی فنی اور کارکردگی میں نکسن آج تک (۸۰) سے زیادہ ملکوں کا دورہ کر چکے ہیں۔

۱۹۶۶ء کی انتخابی مہم کے دوران نکسن نے ری پبلکن پارٹی کے امیدوار بننے کے دعوے کا باضابطہ رسمی رد اعلان کیا۔ ملک بھر میں پارٹی کی مہم چلائی اور چندا جمع کیا۔ ری پبلکن امیدواروں نے ایوان میں ۴۷، سینیٹ میں ۳ گورنر اور آٹھ گورنریاں حاصل کیں۔

چار سال بعد تعجب کی بات نہیں کہ جب ۱۹۶۸ء کے انتخابات قریب آئے تو بہت سے پارٹی لیڈروں نے نکسن سے اپیل کی کہ وہ پارٹی کے سرکاری لیڈر بن کر اور دوبارہ صدارت کے لیے مقابلہ کرکے پارٹی کو مزید ترقی دیں۔

تقریباً دو سو سال کی امریکی تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا کہ کسی امیدوار کو صدارتی انتخاب میں شکست ہو گئی ہو، اور پھر بعد کے انتخاب میں اسے نامزد کرنے سے انکار کر دیا گیا ہو۔ جیسا کہ ۱۹۶۰ء میں نکسن کے ساتھ کیا گیا، اور اس کے باوجود وہ اتنی کافی سیاسی طاقت حاصل کر سکا ہو کہ انتخاب جیت جائے جیسا کہ ۱۹۶۸ء میں نکسن نے کر دکھایا۔

۵ نومبر ۱۹۶۸ء کو امریکی عوام نے ووٹ ڈالا، اور ڈیموکریٹک امیدوار نائب صدر ہیوبرٹ ہمفری اور ایک آزاد امیدوار گورنر والیس سے مقابلے پر نکسن کو منتخب کیا۔

اپنے دور صدارت میں صدر نکسن نے عالمی امن کی جانب دو دلیرانہ قدم اٹھائے۔ وہ پہلے امریکی صدر ہیں جو دوسری عالمگیر جنگ کے بعد چین خاص کے دورے پر گئے، اور وہ ہی سوویت روس جانے والے پہلے امریکی صدر بھی ہیں۔ ان دو ملکوں میں جانے کا فیصلہ ایک دلیرانہ قدم تھا جس سے دنیا امن کے قریب تر آ گئی ہے۔ صدر نکسن نے "امن کی ایک پینگ" کا جو مقصد اپنے سامنے رکھا ہے اس کے قریب تر آ گئی ہے۔

صدر نکسن نے جو انتخابی خطبہ پڑھا تھا، وہ ان کے اوصاف کا آئینہ دار تھا۔ ان کی ثابت قدمی، ہمت، کشادہ دلی، دانشمندی، احتیاط پسندی اور مشاہدے کی بینی ثبوت تھی۔

صدر نکسن نے کہا تھا کہ "ہم نے امریکی زندگی کی ایک لمبی اندھیری رات جھیلی ہے، لیکن اس وقت جب ہماری آنکھیں صبح صادق کی پہلی ہلکی کرن سے دوچار ہو رہی ہیں ہمیں بجائے اس کے کہ تاریکی کو کوسنے کی اس روشنی کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہیے۔

امجد حیدرآبادی

رباعی

کب تک ہے بقائے تن فنا کو معلوم
کب تک ہے یہ زندگی قضا کو معلوم
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے جاتے جاتے
جاتی تو ہوں واپسی خدا کو معلوم

اسفندار۔ فروردی۔ اردی بہشت ۱۳۵۲ اف ، ہندستانی ادب ، جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۷۳ء

جگناتھ آزاد ایم۔ اے

اقبال کی فارسی شاعری

سرزمین ایران کے علاوہ اگر کوئی ملک فارسی شعر و ادب کا گہوارا رہا ہے تو وہ ہندستان ہے۔ یوں تو جو فنی یا تخلیقی تحریک مشرق کے نام سے ایک تحریک چلی تھی، جس کے ذریعے حافظ اور سعدی کے کلام کو اہل ملک سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی، اور انگلستان میں بھی فارسی ادبیات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن جس طرح سے فارسی شعر و ادب کو ایران کے باہر ہندستان کی آب و ہوا ساز گار آئی وہ تاریخ ادبیات عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔

جن دنوں ایران کی فضائیں خاصا حافظ شیرازی کے نغموں سے گونج رہی تھیں، بنگال کے شعرا فارسی میں کچھ اس طرح داد سخن دے رہے تھے کہ خاجا حافظ نے بے اختیار ہو کے کہا تھا ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
این قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

ادھر کشمیر تمور یوں کے دور میں فارسی شعر و ادب کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں بقول مولانا شبلی مرحوم مرزا حامد، اور رفتی کاشمیری مدت تک ہمدم و ہم قلم رہے تھے، جن کی بدولت یہاں فارسی کے مشاعرے گرم رہتے تھے، لیکن ہندستان میں فارسی شعر و ادب کی دنیا فقط بنگال یا کشمیر تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ ملک کے گوشے گوشے میں فارسی کے ایسے نامور شعرا پیدا ہوئے، جن کے کمال فن کو جلد یا بدیر اہل ایران نے تسلیم کیا۔ خسرو، فیضی، بیدل، غالب، ناصر علی اورنگ زیب مخلص، منیر، شیخ چاند بہاری، خان آرزو اور چندر بھان برہمن بعض ایسے نام ہیں جو ہندستان میں فارسی ادب کی تاریخ کا مستقل جزو بن چکے ہیں۔

اقبال اسی سلسلے کی جدید ترین اور اہم ترین کڑی ہیں۔

اگرچہ علامہ اقبال کا نام آج دنیا بھر میں ہندستان کے سب سے بڑے شاعر کے طور پر مشہور ہے، لیکن فارسی شاعر کی حیثیت سے بھی اقبال آج اس مقام پر نمایاں ہیں، جس پر ایران کے دوسرے شعرا ہمیں متمکن نظر آتے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں جب اقبال کی کتاب "جاوید نامہ" شایع ہوئی تو سلیمان ندوی مرحوم نے لکھا تھا کہ اس وقت تک فارسی میں مثنوی ادب کے چار مجموعے تھے، مثنوی مولانا روم، شاہنامہ فردوسی" دیوان حافظ اور بوستان سعدی، لیکن اب "جاوید نامہ" کی اشاعت کے بعد ان کی تعداد پانچ ہو گئی ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا ہندستانی میں کی، لیکن جب انہوں نے کلام کو مرتب کر کے کتابی صورت میں شایع کیا تو ایک کے بعد ایک، انھوں نے تین مجموعے فارسی ہی میں اہل ملک کے سامنے پیش کیے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں "اسرار خودی" شایع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں "رموز بے خودی" اور ۱۹۲۲ء میں "پیام مشرق"۔ ہندستانی مجموعے "کلام" بانگ درا" کی باری تو اس وقت آئی، جب ملک میں ہر طرف سے تقاضا ہوا، کہ ہندستانی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ بھی جلد از جلد چھپنا چاہیے، تاکہ ہندستانی دان حضرات بھی مستفید ہوں۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء تک جب کہ ان کا انتقال ہوا۔ علامہ مرحوم کے چار مجموعے "زبور عجم" جاوید نامہ" پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" مع واقف، اور "ارمغان حجاز" فارسی میں چھپے، اور رموز بے خودی" اور ضرب کلیم" ہندستانی میں۔ ہاں "ارمغان حجاز" کے آخر میں بھی چند متفرقات ہندستانی کلام کے لیے وقف

ہیں۔ آج اقبال کے طالب علموں کے لیے واقعی یہ سوال حیرت کا باعث ہے کہ جب اقبال نے اپنی شاعری ابتدا ہندستانی سے کی، اور بہت جلد ہندستان میں انہیں ایک نہایت ممتاز مقام اور مسلم الثبوت مقبولیت حاصل ہو گئی، اور ہندستان کے بارے میں ان کی یہ رائے تھی کہ ؎

گیسوے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

تو وہ کیا حالات اور اسباب تھے جن کی بنا پر اقبال نے اپنی توجہ مگر ہندستان سے فارسی کی جانب موڑی۔ سر عبدالقادر مرحوم "بانگ درا" کے دیباچے میں اسی بات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہو گی، اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب فلسفۂ عجم" کے لیے، جو کتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغیر مذاق میں دخل ہو گا۔ اس کے علاوہ جو ان کا مطالعہ علم فلسفے کے متعلق گہرا ہوتا گیا، اور بوقت حالات کے اظہار کو جی چاہا تو انھوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلے میں ہندستانی کا سرمایا بہت ہی کم ہے، اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق ہندستانی میں ایسے فقرے ڈھالنا آسان نہیں، اس لیے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے۔"

مگر لطف جس چھوٹے سے واقعے سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمایش ہوئی، اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں۔ انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ انھوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی، مگر اس وقت ایسا وقت تھا، اور اس فرمایش نے ایسی تقریب ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آ کر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے، اور صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں، جو انھوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انھیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا، جس کا پہلے انھوں نے امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے کے بعد گو کبھی کبھی ہندستانی کی فرمائش بھی کہتے تھے، مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہو گیا۔"

ہو سکتا ہے سر عبدالقادر مرحوم کا یہ خیال بھی ہو، مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے اسباب کچھ اور بھی ہیں۔ اقبال کا تعلق متحدہ ہندستان کی اس نسل سے تھا جو اپنی تہذیب و تمدن کی تکمیل کے لیے صرف فارسی کی تعلیم ہی نہیں، بلکہ فارسی شعر و ادب کا رچا ہوا ذوق پیدا کرنا اپنے لیے ضروری سمجھتی تھی، دوسرا یہ کہ اہل کشمیر قدرتی طور پر فارسی زبان کے ساتھ ایک مناسبت رکھتے ہیں، چنانچہ کشمیر کو ایران مشرقی صرف اسی بنا پر ہی نہیں کہا جاتا کہ دونوں حسین قدرتی مناظر کی دولت سے مالا مال ہیں، بلکہ اس لیے بھی کہ ان میں باہمی ایک اندرونی رشتہ موجود ہے، اور پھر اقبال کی تعلیم و تربیت مولوی سید میر حسن ایسے فارسی کے ماہر اہل کی زیر نگرانی خالص قدیم مکتبی نظام میں ہوئی۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

"لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیونکر آ گئی جب کہ انہوں نے اسکول یا کالج میں یہ زبان نہیں پڑھی۔ انھیں معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے اسکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اٹھائی، اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا۔"

لیکن اس کے باوجود اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نہ کبھی اپنی فارسی دانی پر بے جا ناز کیا اور نہ فارسی شاعری پر۔ "اسرار خودی" میں کہتے ہیں ؎

ہندی ام از پارسی بیگانہ ام
ماہ نو باشم تہی پیمانہ ام
حسن انداز بیان از من مجوے
خوانسار و اصفہان از من مجوے
گرچہ ہندی در غذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیریں تر است
نکتہ من از جنوبش عور گشت
تا نہ من شاخ نخل طور گشت

سفندار۔ فروردی۔ اردی بہشت ۱۳۵۲ھ ش ہندستانی ادب جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۷۳ء

یہ اصل میں اقبال کا شاعرانہ انکسار ہے، ورنہ ان کی فارسی شاعری کے متعلق ایرانی علما اور فضلا کی رائے بہت بلند رہی ہے۔ سید محیط طباطبائی جو ایرانی مصنفوں میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں لکھتے ہیں۔

"اقبال ہندستان کی سرزمین پر پیدا ہوئے، لیکن ان کی ذہنی تربیت و پرورش ایرانی زبان اور افکار کی آغوش میں ہوئی۔ اگر بظاہر وہ لاہور کی خاک میں مدفون ہیں، ان کا اصلی مزار اہل دل کے سینوں میں ہے، جو ان کے ساتھ فارسی دیوانوں میں ان کی ابدی زندگی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔"

ایک اور بلند مرتبا ایرانی مصنف پروفیسر سعید نفیسی لکھتے ہیں "اقبال اس طرز کا خود ہندی طرز کے نام سے منتہو رہے، آخری بڑا شاعر ہے۔"

اگرچہ شروع شروع میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ اہل ایران اقبال کے فارسی کلام سے نا آشنا تھے، لیکن یہ دور بہت مختصر تھا، اور جب اقبال کا کلام بھی معنی میں اہل ایران تک پہنچا تو متبدر ایرانی ادیبوں نے اس کے بارے میں نہایت اونچی رائے کا اظہار کیا۔

ایک مدت تک بعض حلقوں میں یہ خیال بھی عام تھا کہ اقبال کی فارسی شیعاری فارسی نہیں، اور اہل ایران کے نقطۂ نگاہ سے اس میں خامیاں ہیں۔ یہ خیال اصل میں معترضین کی اپنی کم علمی پر مبنی تھا۔

[illegible] چھوٹا سا واقعہ یاد آرہا ہے۔ مدت کی بات ہے میں جب لاہور میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ دو ایک اور حضرات بھی موجود تھے۔ اقبال کی شاعری کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک صاحب نے اقبال کے ایک مصرع

موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت

پر اعتراض کیا، اور کہا یہ خرام تو آہستہ روی کو کہتے ہیں، یہ تیز خرام کیا ہوا۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایک لمحہ خاموش رہے، اور بولے کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مصرع کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؎

آہستہ خرام، بلکہ خرام

کیوں کہ خرام کے معنی اگر آہستہ روی کے ہیں تو آہستہ خرام کیا ہوا۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے خندہ کے اس نکتہ جواب سے محفل میں سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے خود اس موضوع کو چھیڑتے ہوئے کہا کہ اقبال کی فارسی شاعری پر اعتراض وہی کرے جو حافظ اور سعدی کی شاعری پر بھی اعتراض کرنے تیار ہو۔

استاتذۂ سخن کی جانشینی کے بارے میں کسی پرانے شاعر کی ایک مثنوی ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

زعنصر چو نوبت بہ جامی رسید
بہ جامی سخن را تمامی رسید

غالب نے اس پر یہ اضافہ کیا ؎

زجامی بہ عرفی و طالب رسید
زعرفی و طالب بہ غالب رسید

اس پر سید محمد علی داعی الاسلام جن کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندستان میں گزرا، لیکن جو ایران کے ادبا اور فضلا میں شمار ہوتے ہیں، یوں اضافہ کر دیا ؎

چو غالب زہندوستاں رخت بست
بجائے وے اقبال دانا نشست
یقین داں سخن دانی باستاں
بماند بہ ہندوستاں جاودان

یہاں آقائے محمد حسین فرید نی کے بھی دو ایک فقرات ملاحظہ کیجیے۔ آپ لکھتے ہیں "اقبال نے فارسی زبان کو اس زمانے میں جب کہ یہ زبان قدردانوں یا مزاروں کے کتبے یا لوحیں لکھنے یا یونانی حکیموں کے نسخوں تک محدود ہو گئی تھی، ایک ادبی زبان کی حیثیت سے دوبارہ زندہ کیا۔"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شاعری کا ذکر ختم کرنے سے پہلے اقبال ہی کے بعض فارسی شعری شاہکار یہاں پیش کر دیے جائیں۔ "فصل بہار" کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

خیز در باغ دراغ تا نائہ گل رسید
باغ بہاراں دزید مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید حسن گل تازہ چید
عشق تمنا نو خرید
خیز کہ در باغ راغ تا نائہ گل رسید

اسفندار۔ فروردی۔ اردی بہشت ۱۳۸۶ف ہندستانی ادب جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۷۷ء

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

لفظ گجری کی تحقیق

(ناقدین ہندستان کے نظریوں کی روشنی میں)

دکنی اور گجری دو مختلف زبانیں نہیں ہیں، بلکہ گجری، دکنی زبان کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، کہ ہندستانی زبان سب سے پہلے دکن دیش کے ساجنوں میں ڈھلی، اور یہیں پھلی پھولی، اور پروان چڑھی، اسی لیے اس کا نام "دکنی" ہوا۔ اس زمانے میں گجرات کے بادشاہ ہندستانی زبان کے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کر رہے تھے، چنانچہ دکن کے کئی ایک شاعر اور ادیب گجرات گئے، اور وہیں رہ بس گئے۔ ان شاعروں میں ولی دکنی بھی تھا۔ دوسرے شاعر اور ادیب تو مستقل طور پر گجرات میں رہ گئے، لیکن ولی کو گجرات کی فضا ساز گار نہ ہوئی تو اپنے وطن دکن لوٹ گیا، اور مستقل طور پر یہیں رہ گیا۔ ولی دکنی کے اس عارضی نقل مقام کے باعث بعض تذکرہ نویسوں اور تاریخ نگاروں نے اس کو ولی گجراتی کا غلط نام دیا ہے۔ دکن واپس آنے کے بعد تو ولی کی شاعری لفظ عروج کو پہنچ گئی تھی، اور وہ بجا طور پر سارے ہندستان میں ولی دکنی کے نام سے مشہور ہوا۔

چنانچہ ہمارے اس نظریے کی تائید پروفیسر محمود شیرانی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ "جب ہندستانی زبان دکن میں رائج ہوئی تو اس کا نام دکنی رکھا گیا، اور جب وہ گجرات پہنچی تو "گجری" کہلائی۔" اسی زبان کے گجری یا گجراتی ہونے کے ثبوت میں شیرانی نے گجرات کے ایک شاعر شیخ محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" (۹۸۶ھ) کا یہ شعر پیش کیا ہے ؎ جیوں دل عرب عجم کی بات
سن بولی، بولی، گجرات

اس سے صاف ظاہر ہے کہ گجراتیوں نے اپنی زبان کو گجراتی یا "گجری" کا نام دے رکھا تھا۔ گوجری کے لفظ سے ہمیں اختلاف ہے۔ کسی بھی گجراتی شاعر یا ادیب نے اپنی زبان کو "گوجری" نہیں لکھا ہے، بلکہ ہمیشہ "گجری" لکھتے آئے ہیں، اور وہ اپنی گجراتی زبان کو "گجری" کہنے میں فخر بھی محسوس کرتے تھے۔ جس کے ثبوت میں کئی ایک شاعروں اور ادیبوں کے اشعار اور بیانات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لفظ "گوجری" کی بابت ہمارا یہ خیال ہے کہ ابتدائی تذکرہ نویسوں میں سے کسی ایک تذکرہ نویس نے اپنی جدت طبع دکھانے کی خاطر "گجری" کو "گوجری" لکھ دیا، جس کو ہم "ریکارڈ بنانا" سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ افسوس کا مقام ہے کہ آگے چل کر بعض قابل تذکرہ نویسوں نے یا ہندستانی زبان کے نگاروں نے بھی غلط لفظ "گوجری" کے اظہار کی ضرورت محسوس کی۔ یہ طے ہے کہ قدیم زمانے میں ہندستانی زبان کے دو نام رہے ہیں۔ ایک دکنی جو خطۂ دکن میں پھلی پھولی، دوسرے گجری، جو گجرات میں شاہوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب گجرات کی شاہی حکومت ختم ہو گئی تو گجراتی شاعر اور ادیب ہندستان کے ایسے شہروں میں چلے گئے، جہاں ان کے فن اور کمال

کی قدر ہو سکتی تھی، چنانچہ گجرات کے زیادا تر شاعر اور ادیب بیجاپور چلے آئے۔ ہمارے اس استدلال کی تصدیق ڈاکٹر زور کے نیچے کے بیان سے ہو سکتی ہے، چنانچہ اپنی کتاب "ہندستانی لسانیات" میں وہ لکھتے ہیں۔

"گجرات کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ شاعر اور ادیب بے سروسامانی کی حالت میں ادھر ادھر مارے مارے پھرنے لگے۔ ایسے نازک موقع پر دکن کی ایک سلطنت بیجاپور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فیاضی دکھائی اور اپنے آدمیوں کو بیش بہا تالیف اور سوغات دے کر گجرات روانہ کیا، تاکہ وہاں کے علما اور شعرا کو بیجاپور کے دربار میں آنے کی دعوت دیں۔ اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں گجرات کی ادبی عظمت کا پرچم بیجاپور پر لہرانے لگا۔ مشہور و معروف ہستیوں کے علاوہ اکثر عام لوگ بھی بیجاپور آ گئے۔ ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہو گیا تھا کہ بعض دکنی مصنف اپنی گجراتی آمیز ہندستانی کو "گجری" کے نام سے موسوم کرنے لگے۔"

ڈاکٹر زور کا یہ استدلال یا CONTENTION بلکل بجا ہے، اور یہ صوفی مدعی ہے کہ بیجاپور کے دربار میں گجراتی شاعروں، ادیبوں اور علما وغیرہ کی کثرت تھی اور اکثریت کا اثر اقلیت پر ہونا لازمۂ فطرت سے ہے، اس لحاظ سے یا اس نظریے کے تحت، اگر بعض دکنی ادیبوں نے اپنی گجراتی آمیز دکنی زبان کو "گجری" کے نام سے موسوم کیا ہے تو اس سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

پروفیسر اکبرالدین صدیقی نے ڈاکٹر زور کے بیان سے جو اختلاف کیا ہے، وہ بھی ہو سکتا، اس لیے کہ اکثر تذکرہ نویسوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ برہان الدین جانم کا انتقال ۱۰۴۳ھ ہجری میں ہوا، اور وہ مظفر شاہ ثالث گجرات کی خدکشی کے بعد چار سال تک زندہ رہے، چنانچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو بھی اس سے پورا پورا اتفاق ہے اور انھوں نے جانم کا سنہ وفات ۱۰۴۳ھ بتایا ہے۔ مولوی عبدالحق جانم کی زبان کے گجراتی ہونے کے مارے میں اس طرح رقم طراز ہیں۔ "برہان الدین جانم کا اپنی زبان کو خصوصیت کے ساتھ "گجری" کہنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر وہ زبان جس میں ان کا کلام ہے، ہندستانی ہے، لیکن "گجری ہندستانی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کلام کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجراتی کا اثر ہے، اور یہ قدرتی بات ہے۔ اس کو گجری کہو یا ہندستانی، جہاں بھی گئے مقامی محاورے اس میں ضرور آ گئے۔"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور دونوں ماہر لسانیات بھی "گجری" کے بارے میں ہم خیال ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے، اس لیے کہ انھوں نے بمبئی میں رہ کر ہندستانی زبان کی اصل اور حقیقت کے بارے میں باقاعدہ ایک ریسرچ کی تھی، جس کو کتابی شکل میں چھپوا دیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں "ہے ہندستانی کی ابتدا اور نشو و نما میں گجرات کے کارناموں کو دیکھنے کا موقع ملا، اور ایک سال کی تلاش و جستجو اور غور و فکر کے بعد ہمارے یہ کہنے کی جرأت کی کہ ہندستانی یا گجراتی کی ابتدائی تعمیر میں گجرات کو بڑی حد تک اولیت کا درجہ حاصل ہے۔" یہ بحث ہوئی کہ ہندستانی زبان کے محققین نے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ نجیب اشرف کے بیان سے بھی ظاہر ہے کہ ہندستانی زبان کا دوسرا نام "گجری" تھا، اور یہ زبان گجرات کے بادشاہوں کی سرپرستی میں خوب پھلی پھولی اور ترقی بھی کی۔

بمبئی کے مہاکوی چڑھی مشہور ماہر لسانیات نے "گجری" کا تعلق گجرانوالا اور گجرات واقع پنجاب

سے بتا کر فاش غلطی یا BLUNDER کیا ہے۔ ہمارے نزدیک چٹرجی کی "گجری" زبان کے بارے میں یہ ایک ادنیٰ ایک ناقابل معافی جرم اور گناہ ہے۔ ہمیں سخت افسوس تو ان ادیبوں اور تذکرا نویسوں پر ہوتا ہے جو "گجری" کے بارے میں چٹرجی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "گجری" کا تعلق پنجاب کے علاقے گوجران والا یا گجرات سے ہے۔ چٹرجی نے ایسی اہم غلطی کرکے "گجری" کے بارے میں اگر اپنی معصومیت اور عدم معلومات نیز عدم قابلیت کا ثبوت دیا ہے تو دوسروں کو چاہیے کہ اس کے بیان کو سراسر نظر انداز کردیں اور حوالے کے طور پر ہرگز ہرگز نقل نہ کریں۔ اس سرزنش کے باوجود، ہم بھی چٹرجی کے اس غلط مہمل، بے معنی، لغو اور لچر بیان کو نقل کرنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں اور دوسروں پر یہ واضح کریں کہ چٹرجی نے آخر کونسی بھاری غلطی کی ہے، چنانچہ "گجری" کے بارے میں چٹرجی لکھتے ہیں

"گجری" کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نام گجران والا اور گجرات (پنجاب) کے دکنی وارد سپاہیوں کا عطا کردہ ہے، چنانچہ دکنی شاعر شاہ برہان الدین جانم اور امین الدین دکنی نے اپنی زبان کو "گجری" کہا ہے۔"

پنجاب سے دکن میں کتنے سپاہی آئے تھے، اور کتنے عرصے تک رہے، یہ سب مہمل سی باتیں ہیں، چنانچہ خود مضمون نگار احتشام احمد نے اس بات کا اعتراف کیا ہے، اور وہ اپنے مضمون میں اس طرح پر لکھتے ہیں۔ "دسویں گجرات چٹرجی کا نظریہ یا اس لیے قابل غور ہے کہ ضلع گجران والا کے سپاہی اتنی تعداد میں دکن نہیں آئے، جس کی بنا پر زبان کا نام بدل جائے۔ اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ خود جن میں دلی اور پنجاب کے سپاہی تھے۔ اصل میں چٹرجی کو یہ شبہ دکنی کے پنجابی پن سے ہوا ہے۔"

مضمون نگار نے آگے چل کر پروفیسر اکرام الدین صدیقی کا زبان کے بارے میں ایک اور نظریہ بھی پیش کیا ہے، یعنی پروفیسر صدیقی نے برہان الدین جانم کی تصنیف "ارشاد نامہ" کے مقدمے میں لکھا ہے کہ "دکن میں اکثر قصبات میں چاہے وہ حیدرآباد ریاست کے ہوں، یا بمبور ریاست کے، ہر شاہ راہ پر، کسی مخصوص جگہ روزانہ بھاجی ترکاری یا دیگر ضروریات زندگی کے مستعمل سامان کی دکانیں لگتی ہیں، اور بازار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، چونکہ یہ دکانیں مستقل نہیں ہوتیں، اس لیے ان کا کاروبار دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا، اور چونکہ یہ دکانیں گزرگاہوں پر ہوتی ہیں، اس لیے ان کو گزری کہا جانے لگا۔ اور گشت استماں سے "گجری" ہوگیا۔ ان بازاروں کی زبان فصیح نہ ہوتی تھی، گاہکوں کی آسانی کے لیے دو تین زبانوں کے الفاظ ملا کر گفتگو کی جاتی تھی، اس لحاظ سے برہان الدین جانم نے اپنی زبان کو "گجری" قرار دیا ہے، یعنی گزرگاہ کی آسان زبان جس کو ہر شخص سمجھ سکے۔"

پروفیسر صدیقی نے اپنے اوپر کے بیان میں "فالتو" آزاد" کا سا رنگ تو پیدا کر دیا ہے، لیکن وہ اپنے استدلال کو نباہ نہ سکے! صدیقی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ حیدرآباد اور بمبور میں، اگلے زمانے میں تھوڑے وقفے کے لیے بازار لگتے تھے، جہاں پر خرید و فروخت کی غرض سے مختلف قسم کے لوگ جمع ہوتے تھے، اور دو تین زبانوں کے الفاظ ملا جلا کر اپنا مطلب نکال لیتے تھے۔ صدیقی چونکہ پروفیسر بن گئے ہیں، انہیں بازار جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی اس لیے وہ اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ سبزی ترکاری وغیرہ کی خرید و فروخت کے سلسلے میں آج بھی حیدرآباد کے مختلف

حصوں میں ایسے وقتاً بازار لگتے ہیں، جہاں بقول صدیقی مختلف کے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول کر اپنا مطلب ادا کر لیتے ہیں، جس کا عملی تجربہ روزانہ خدمیں بھی ہوتا ہے، اور ایسے بازاروں کی وہی ملی جلی زبان، اس وقت بھی ہندستانی کہلاتی تھی، اور آج بھی ہندستانی ہی کہلاتی ہے۔ عوام یا جنتا کی اس ملی جلی بھاشا یا زبان کو "گزری" کا نام کبھی بھی نہیں دیا گیا۔ نہ معلوم ڈاکٹر احتشام احمد نے بلا چون وچرا، صدیقی کے اس انوکھے اور اچھوتے اسرار بے معنی اور مہمل اور بے نظیر کو کیسے اور کیوں کر قبول کر لیا؟ صدیقی کا یہ کہنا کہ اگلے زمانے میں بازار گزر گاہوں پر لگتے تھے، اور یہ جو لفظ کے عارضی بازار ہوتے تھے، اس لیے ان گزرگاہوں کے بازاروں میں جو زبان بولی جاتی تھی، اس کا نام "گزری" تھا، یہ سراسر بے معنی اور مہمل سا استدلال ہے، جس کو سوائے صدیقی اور احتشام احمد کے، دوسرا کوئی بھی صاحب فکر و صاحب نظر ہرگز ہرگز قبول نہیں کر سکتا، اس سلسلے میں صدیقی اور بھی لے تک اور بھی نئی باتیں کہہ گئے ہیں، یعنی یہ کہ اسی "گزری"، زبان کا نام برہان الدین جانم نے "گجری" دیا، اور اس "گجری" زبان میں لکھا کرتے تھے۔ جانم نے ہرگز ہرگز "گزری" زبان کو "گجری" کا نام نہیں دیا، بلکہ گجرات کی بولی گجراتی کو "گجری" کا نام دیا تھا، اور وہ اسی "گجری" زبان میں شاعری بھی کرتے تھے۔ نہ صرف جانم بلکہ گجرات اور بیجاپور کے دوسرے شعرا بھی اسی "گجری" زبان میں لکھتے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ آپ خود ہی غور کیجیے، پروفیسر صدیقی کے اس بے معنی اور مہمل دعوے یا استدلال کو ہم پھر سے نقل کرتے ہیں، یعنی وہ لکھتے ہیں "ان بازاروں کی زبان فصیح نہ ہوتی تھی، گاہکوں کی آسانی کے لیے دو تین زبانوں کے الفاظ ملا کر گفتگو کی جاتی تھی، اس لحاظ سے برہان الدین جانم نے اپنی زبان کو "گجری" قرار دیا ہے، یعنی گزرگاہوں کی آسان زبان، جس کو ہر شخص سمجھ سکے"، دیکھ لیا آپ نے کتنا ہی مفوکا خیز، اور لے تک بے بیان، یعنی اس میں کوئی ربط اور جوڑ ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ گزرگاہوں کی زبان "گزری" تھی، چونکہ یہ آسان زبان ہوتی تھی، اسی لیے برہان الدین جانم نے اس میں شاعری شروع کر دی، اور اسی کو "گجری" زبان قرار دیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ "گجری" سے متعلق اوپر اور نیچے کے مضمون میں جتنے بھی نظریے بیان کیے گئے ہیں سب پر پانی پھر گیا، اور رہ صرف ایک مہمل، بے معنی، اور بے تک نظریہ پروفیسر صدیقی کا کہ "گزری" کا دوسرا نام "گجری" ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کسی بھی قسم کی بحث یا تحقیق و تلاش کی کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اپنا یہ بے معنی اور بے مقصد بیان لکھتے وقت صدیقی نے شاید اس مشہور پرانے محاورے کو بھلا دیا تھا کہ "سیر کو سوا سیر" (موجودہ اصطلاح میں کہیں تو سوا کیلو) لگا ہوا ہے۔ اگر صدیقی پروفیسر ہیں تو دوسرے بھی صاحب قلم ہیں، جو بعض پروفیسروں کے مہمل اور بے معنی بیانات اور استدلالات کا دندان شکن یا دانت توڑ جواب دینے کے لیے تیار ہیں۔ پروفیسر صدیقی اور ڈاکٹر احتشام احمد کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا بھی اپنا الگ ایک اسکول ہے، اور وہ اسکول آج (۳۴۳) سال سے ہندستانی زبان اور ادب کا پرچار اور اس کی ترویج کر رہا ہے۔ "ہندستانی ادب" ۱۹۳۱ء میں انجمن ترقی اردو کا آرگن ہے، اور یہ آرگن نہ صرف ہندستان اور پاکستان، بلکہ ساری دنیا کا واحد علمی، ادبی ماہوار رسالہ ہے، جو ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جاتا ہے۔ آوازی اصول سے ہماری مراد صوتی اصول یا

ڈھال رہے ہیں۔ انگریز اگر چہ امریکا کہ اس جدید اور سائنٹفک اصول کا سخت مخالف ہے، لیکن امریکن اب کام یا مشن برابر لیرا کیے جا رہے ہیں۔ اب تک امریکنوں نے ہزاروں انگریزی الفاظ کو آوازی اصول پر ڈھال لیا ہے۔ بلکل اسی طرح ہم نے بھی ہندستانی زبان کے سینکڑوں الفاظ کو آوازی سانچوں میں ڈھال دیا ہے، اور یہ الفاظ آئے دن "ہندستانی ادب" کے مضامین میں پیش ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے اپنے اس زرین یا سیزے اور مضمد، نیز سائنٹیفک۔ آوازی اصول پر "ہندستانی ادب" میں اب تک کئی اداریے یا ایڈیٹوریلس بھی لکھے ہیں۔ ہم یہ پورے طور پر محسوس کرتے ہیں، اور بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ فی اردو کے دیوانے اور متوالے ہماری ہندستانی زبان اور اس کے آوازی اصول کے سخت ترین مخالف اور دشمن ہیں۔ ہمیں اس لیے وحوخانا اندھا دھند مخالفت کی مطلق پروا نہیں ہے، اس لیے کہ ہم یہ بہتر طریقے پر سمجھتے ہیں کہ اردو کے ان پاگلوں اور مجنونوں کی ہم سے، اور ہمارے رسالے "ہندستانی ادب" سے مخالفت، ایک شریف آدمی پر غنڈوں کے کیچڑ اچھالنے کے برابر ہے، اور ایسی کیچڑ ہم پر ہرگز ہرگز نہیں گرتی، اس لیے کہ زبان کے سلسلے میں، ہم ایک مشنری کی حیثیت سے کام کیے جا رہے ہیں، اور ایک مشنری کا مقام بہت ہی بڑا اور بلند و برتر ہوتا ہے، اس کا ہر لفظ سند کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ ہندستانی زبان اور ادب کے سلسلے میں کہا ہوا، ہمارا ہر لفظ بھی سند کی حیثیت رکھتا ہے، اور ہندستانی زبان اور ادب کے سلسلے میں، ہم سنجیدا قسم کے اداریوں وغیرا سے اس بات کی پوری پوری توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے متعلق قطعی طور پر یہ رائے رکھتے ہیں "مستند ہے آپ کا فرمایا ہوا"۔

آگے چل کر ڈاکٹر احتشام احمد نے لکھا ہے کہ۔ "میں نے اس سلسلے میں جو کچھ معلومات مشاہدات کی روشنی میں جمع کی ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ "گڑی" کے نام سے آج بھی ہندستان کے کئی شہروں میں بازار موجود ہیں، مثلاً بمبئی میں ایک بازار گڑی کہلاتا ہے، کانپور میں بھی گڈری بازار ہے، البتہ الہ باد میں ایک بازار گڈری بازار کہلاتا ہے، اس سے پروفیسر صدیقی کے نظریے کی تائید ہوتی ہے، مگر یہ مسلہ ہندستانی زبان کے ماہرین لسانیات کی توجہ کا مستحق ہے"

ڈاکٹر احتشام نے چھ سے یہاں بری طرح سے ٹھوکر کھائی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں "الہ باد میں ایک بازار، گڈری بازار کہلاتا ہے"، اے بھلے سے یا احتشام احمد، "گڈری" اور "گڑی"، پر لکھتے لکھتے یہ "گڈری"، کہاں سے پیدا کر لی آپ نے۔ معلوم ہوتا ہے پھر سے آپ پر خبط کا دورا پڑا ہے، گڈری بھی "گڈری" اور "گڑی" کے بلکل ہم معنی کوئی نیا جانور ہے۔ نہ صرف الہ باد بلکے مانگپور اور بمبئی میں بھی گڈری بازار ہیں، اور ہندستان کے دوسرے شہروں میں بھی گڈری" بازار موجود ہیں، مگر اس گدڑی کے معنی "گڑی" زبان کے سے طرح نہیں ہیں، لغات فیروزی، مرتبہ فیروز الدین آف لاہور، صفحہ (۱۸۵۸) اس کے معنی فقیروں کا کپڑا۔ پھٹا پرانا کپڑا ہے، اور لکھے ہیں، عام طور پر "گدڑی" غریبوں یا فقیروں کی بھی پرانی اور بوسیدا رضائیوں اور لحاف کو بھی کہتے ہیں، اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ فقیر جاڑوں کے زمانے میں اسی "گدڑی" کو اپنے جسم پر ڈالے بھیک مانگتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک مشہور عام محاورا بھی ہے "یعنی گدڑی کے لال"، یہ محاورا

مثال کے طور پر ہم جنوب تمر حیدرآبادی کا نام پیش کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ "گدڑی" کے سے ماحول میں پیدا ہوئے تھے، اسی وجہ سے آج تک بھی ان کے خاندان والے اور عزیز اقربا، نیز دوست احباب وغیرہ بھی انہیں "گدڑی کے لال" کے سے پیارے نام سے پکارتے ہیں، چونکہ یہ واقعہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے، اس لیے وہ اپنے اس حسین اور پیارے عرف عام سے ناخوش نہیں ہوتے بلکہ خوش ہوتے اور زیادہ خوش ہوتے ہیں اور فخریہ طور پر کہتے ہیں کہ ــــ جی ہاں! "میں تو واقعی "گدڑی کا لال ہوں!" اگر آپ کو ان "گدڑی کے لال" کا پتا چاہیے تو ایڈیٹر "صبح امید" بمبئی کے توسط سے لکھیے، اس لیے کہ ان دونوں کے بڑا پڑے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں میں "من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو" والا معاملہ ہے!

"گدڑی کے لال" سنو، قمر! کان کھول کر سنو، اور غور سے سنو کہ انس تو ہمیں پر ہم سب یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جی۔ ام۔ خان جیسے صاحب قلم ادیب مشکل سے پیدا ہوتے ہیں، انہیں کے قلم میں بلا کی روانی اور تیزی ہے اور لکھتے وقت قرطس کے اوراق آنے والے گھوڑے کی طرح دوڑتا رہتا ہے، نیز اپنے سحر آفریں اور جادو نگار قلم سے لکھتے وقت الفاظ کی حسین گلکاریاں اور کرشمہ سازیاں بھی کرتا جاتا ہے، اور جب کسی کی مداح سرائی پر اتر آتا ہے تو بلا مبالغہ تعریف و ستائش کے پل باندھ کر رکھ دیتا ہے۔ تعریف کرتے کرتے جب کسی کی مذمت پر اتر آتا ہے تو اپنے معتوب کے پرخچے اڑا کر رکھ دیتا ہے، اور اگر چاہے تو پھر سے اپنے ممدوح کی تعریف و مدح کر کے اس کو شہرت دوام ہی کے ساتویں آسمان پر بٹھا دیتا ہے۔ اس کے مجمو نما قلم کا انتہائے کمال یہ ہے کہ اس انتہائی اختلافی شکل اور تضاد بیانی کے باوجود، بیان میں کوئی بے ربطی نہیں آنے پاتی، بلکہ "آب لڈور" کی طرح روان دوان چلا جاتا ہے!

"گدڑی کے لال" انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ادب میں، جی۔ ام۔ خان کے دو خاص موضوع ہیں۔ ایک تنقید دوسرے ڈراما۔ ہماری تنقید کے معرکا آرا نمونے دیکھنا چاہتے ہو تو "ہندستانی ادب" کی پچھلی جلدوں کا مطالعہ کرو تو "ا" اور "آوارا" کے نام سے جتنی بھی تنقیدیں نظر آئیں گی، وہ سب ہمارے قلم کا نتیجہ ہیں۔ اگر تمہاری طرح ہماری بھی جیب گرم ہوتی تو "تنقیدات جی۔ ام۔ خان" کے نام سے ضخیم کتاب شائع کر دیتے۔ اس کے علاوہ "مضامین جی۔ ام۔ خان" کی بھی ایک ضخیم جلد شائع کی جاتی، جس میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۷۲ء تک کے سب مضامین شامل ہوتے، جانتے ہو کہ چالیس سال سے ہم مضمون نگاری کر رہے ہیں، جن میں بیشتر مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا یہ بھی پلان اور پروگرام ہے کہ سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی ہندستانی کے نام سے "ہندستانی ادب" کی (۳۰) سالہ علمی و ادبی خدمات کو مختلف جلدوں کی شکل میں پیش کریں۔ مثلاً "ہندستانی ادب" کے مضامین۔ "ہندستانی ادب" کے افسانے۔ "ہندستانی ادب" کے ڈرامے۔ "ہندستانی ادب" کے مقالے وغیرہ، مگر مالی اعتبار سے ہم جو ہڑنے "غالب نہ انا" اس لیے "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" کہتے ہوئے

بات مل کر رہ گئے۔ اے برلا اور ٹاٹا ئے دکن ۔ گدڑی کے لال سخت افسوس کے ساتھ ہمیں یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اسی تنگدستی اور افلاس کے باعث ہماری ایک تازا ترین آرزو پر بھی پانی پھر گیا، یعنی ہم یہ چاہتے تھے کہ "ناول شہزادی کا رومان" کی پانسو کاپیاں زیادہ نکلوائیں۔ اس رسالے کی مفروضہ تعداد کی چھپائی کے بعد یہ کام آسانی سے انجام دیا جا سکتا تھا، یعنی پہلی قسط سے لے کر آخری قسط تک ہر نمبر کی تعداد (۵۰۰) کا کاغذ زیادہ دینا پڑتا تھا۔ آخری قسط کی چھپائی کے بعد (۵۰۰) عدد زائد رجسٹرڈ کاٹا ئیٹل چھپوا کر یہ رومانی پرورد اور یادگاری ناول مارکیٹ میں لایا جا سکتا تھا، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زاید کاغذ کی فراہمی ہمارے بس کا روگ نہیں تھا، اس لیے ہم دل مسوس کر رہ گئے!

اے دانایانِ حیدرآباد ۔ "گدڑی کے لال" جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، ہم ڈراما نگار بھی ہیں، اور اسٹیج اور اسکرین کے ملاکر، تقریباً ایک درجن ڈرامے لکھے ہیں، لیکن ہم اپنی مالی مجبوریوں کے سبب ایک بھی ڈرامے کو کتابی شکل نہ دے سکے۔ اسٹیج کے ڈراموں کو اسٹیج کرنے کی نوبت نہیں آئی، اور اسکرین پلیس کو آج تک کسی بھی ڈائرکٹر اور پروڈیوسر نے ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔ اسکرین سے ہماری گہری دلچسپی کا بھی صحیح اندازا اس سے ہو سکتا ہے کہ آج سے تقریباً (۵۵) سال پہلے موجودہ گرامر اسکول۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد کے بڑے ہال میں "آئین بائیسکوپ" کے نام سے سینما ہاؤز قائم ہوا تھا، تو ہم نے پہلی بار امریکن فلم دیکھی تھی۔ اس کے بعد جرمن فلمیں بھی دیکھتے رہے، اور بابا۔ قلم یا اسکرین داد اچھالکے کی بنائی ہوئی پہلی ہندستانی فلم بھی دیکھی تھی۔ اس کے بعد پہلی امریکن ٹاکیز فلم "کنگ جاز" بھی دیکھی تھی، اور بعد میں پہلی ہندستانی ٹاکیز فلم "عالم آرا" بھی دیکھی تھی، اور اسی طرح سائیلنٹ کے دور میں مسلسل سائیلنٹ فلمیں دیکھتے رہے، اور اسی طرح ٹاکیز کے دور میں مسلسل انگریزی اور ہندستانی ٹاکیز فلمیں دیکھتے رہے، چونکے ہمیں فن ڈراما سے دلچسپی تھی، اور ہم نے کئی ایک اسٹیج کے ڈرامے لکھے تھے، اور چونکے ہمیں فلمی دنیا سے بھی گہری لگن تھی، اس لیے ہم نے اسکرین پلیس بھی لکھے تھے۔ ان پلیس کے مناظر یا SCENARIOS اور مکالمے یا DIALOGUES تک خود ہم نے لکھے ہیں۔ "ہندستانی ادب" کے باعث ہم ہمیشہ ہی آسان زبان لکھنے کے عادی ہیں، اس لیے ان اسکرین پلیس کے جو بھی مکالمے لکھے ہیں وہ مختصر اور شیریں یا SHORT AND SWEET ۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ اگر کوئی ماہر فن ہمارے اسکرین پلیس کو دیکھ پائے گا تو یقیناً تعریف کرے گا، اور ان کو فلمائے جانے کی طرف توجہ دے گا، مگر کسی ماہر فن کی اس طرف توجہ نہ ہوئی تو کس طرح؟ یہ آج تک ہماری سمجھ میں نہ آ سکا۔ ہم نے کوشش تو ضرور کی تھی۔ ان پلیس سے متعلق انگریزی میں ایک نیٹ لکھ کر چھپوایا تھا، اور ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں کے بیچ تعلیم کرنے کے بعد سنہ ۱۹۶۲ء سے آج تک تقریباً چار سو لیٹر پیڈ بھرائے ہیں، مگر ایک نے بھی اس کا جواب نہیں دیا۔ اب آپ ہی بتائیے "گدڑی کے لال" ہم کریں تو کیا کریں۔

قدیم ہندستانی زبان کے ناموں میں ایک نام گجری یا گوجری بھی ملتا ہے۔ یہ امر بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ہندستان کے مشہور صوبے گجرات سے قائم کیا جائے، اور اس رشتے سے اس کو گجری کہا جائے، مگر یہ مسلا اتنا آسان نہیں ہے، چونکہ دکنی اور گجری کے علاقے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، اس لیے ان دونوں زبانوں میں مشابہت اور اشتراک کے باعث غلط فہمی کے بڑے مواقع ہیں۔ اس سلسلے میں بڑا مسلا اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب کہ دکنی کے ادیب اور شاعر اپنی زبان کو گجری کہنا شروع کر دیتے ہیں، جس کی تاویل خاصی پیچیدہ، اور اہم ہے۔ محققین ہندستانی نے اس بارے میں مختلف نظریے قائم کیے ہیں، اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان نظریوں کے بارے میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔

اب میں ہندستان کے ان محققین کے افکار کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نظریہ پروفیسر محمود شیرانی کا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندستانی زبان دکنی میں رائج ہوئی تو اس کا نام دکنی رکھا گیا، اور جب وہ گجرات پہنچی تو مقامی زبان کے اثر سے گجری کہلائی، وہ لکھتے ہیں۔

"ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ جب اہالی دکن نے ہندستانی کا نام دکنی رکھا، اہالی گجرات نے اس کا نام گجری یا گوجری رکھدیا۔ لطف یہ ہے کہ خود ان ممالک کے باشندے اسی کو ان ناموں سے پکارتے رہے۔ شیخ خوب محمد چشتی نے مثنوی "خوب ترنگ" ۹۸۶ھ میں لکھی ہے۔ اس تصنیف کی زبان گجراتی کے مقابلے میں زیادہ تر ہندستانی کے قریب ہے، لیکن شیخ اس کو گجراتی لوٹی کہتے ہیں۔

جیوں دل عرب عجم کی بات
سن قولی، لوٹی گجرات

پروفیسر شیرانی کا یہ خیال صحیح ہے کہ دکن اور گجرات دونوں نے تعلقوں کے دوری ہندستانی کو رواج دیا ہے، اور بعد میں ہندستانی کے مرتبہ میں جو تبدیلیاں ہوئیں، ان سے وہ کسی حد تک محروم رہے، البتہ شیرانی مرحوم نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ برہان الدین جانم اور دوسرے دکنی ادیبوں نے اپنی زبان کو گجری کیوں کہا ہے۔ انھوں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ دکنی ادیبوں نے بھی اپنی زبان کو گجری کہا ہے، مگر اس مسلے کے حل کرنے سے انھوں نے گریز کیا ہے۔

"گجری" کی تاویل اور تفسیر میں ایک نظریہ وہ ہے جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب "ہندستانی لسانیات" میں پیش کیا ہے، یہ عقل کو زیادہ اپیل کرتا ہے، اور واقعات سے مناسبت رکھتا ہے، اس میں اس بات کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ دکنی شاعروں نے اپنی زبان کو گجری یا گوجری کیوں کہا؟ ان کا بیان خود ان کی زبان سے سنیے۔

"گجرات کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، شاعر اور ادیب بے سروسامانی کی حالت میں ادھر ادھر مارے مارے پھرنے لگے، ایسے نازک موقع پر دکن کی ایک سلطنت بیجاپور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ نے فیاضی دکھائی، اور اپنے آدمیوں کو بیش تحائف اور سوغات دے کر گجرات روانہ کیا، تاکہ وہاں کے علما اور شعرا کو بیجاپور کے دربار میں آنے کی دعوت دیں اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں گجرات کی ادبی عظمت کا پرچم بیجاپور پر لہرانے لگا۔ مشہور معروف ہستیوں کے علاوہ اکثر عام لوگ بھی بیجاپور آ گئے۔ ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہو گیا تھا کہ بعض دکنی مصنف اپنی گجراتی آمیز ہندستانی کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے۔"

بظاہر یہ دلیل دل کو لگتی نظر آتی ہے، مگر پروفیسر نورالحسن انصاری اس نظریے پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کے یہ دلائل میرانجی شمس العشاق یا برہان الدین جانم کے متعلق صحیح نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ اکبر اعظم نے مظفر شاہ والی گجرات کے مقابلے کے لیے عبدالرحیم خانخاناں کو مامور کیا، جس نے اس کو شکست دے کر گجرات پر قبضہ کر لیا، اور مظفر شاہ کو آگرہ روانہ کر دیا، مگر اس نے اثنائے راہ میں خودکشی کر لی۔ گجرات کی تسخیر ۹۸۰ھ مطابق ۱۵۷۲ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں جانم کے سنہ وفات کے لحاظ سے ان کا انتقال ہو چکا تھا، مگر ان کی تاریخ وفات

میں اختلاف ہے، اس لیے ایک روایت کے مطابق وہ اس واقعے کے پانچ برس بعد تک زندار رہے۔

مولوی عبدالحق صاحب "ارشاد نامہ" کا سنہ تصنیف ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء کو قرار دیتے ہیں، برہان الدین جانم کا سنہ وفات ایک روایت کے مطابق ۹۸۰ھ ہے، اور ایک بیاض کی درج تاریخ کے مطابق ۹۹۳ھ ہے۔ ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گجرات کی حکومت کا زوال اس وقت ہوتا ہے، جب گجراتیوں کے بیجاپور آنے کا اثر حضرت جانم کی زبان پر اتنا نہیں پڑ سکتا کہ وہ اپنی زبان کو دکنی کے بجائے گجری کہنا شروع کر دیں!

اب مسئلہ پھر وہیں رہ جاتا ہے کہ دکنی شاعروں نے اپنی زبان کو گجری کیوں کہا؟ اس سلسلے میں ہندستانی زبان کے محقق مولوی عبدالحق نے اس بارے میں اپنے خیالات بڑے مدلل طریقے سے پیش کیے ہیں۔ انہوں نے ان قیاسوں میں جو وقتاً فوقتاً قدیم ہندستانی کے بارے میں شائع ہوتے ہیں، اس بحث کو بڑی اہمیت دی ہے، اور بتایا ہے کہ گجراتی زبان کے اثرات اور الفاظ ہی بنا پر برہان الدین جانم اپنی زبان کو گجری سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ برہان الدین جانم کا اپنی زبان کو خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ "اگر وہ زبان جس میں ان کا کلام ہے، ہندستانی ہے، لیکن گجری ہندستانی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کلام کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجرات کا اثر ہے، اور یہ قدرتی بات ہے، اس کو گجری کہو یا ہندستانی، یہ جہاں گئی مقامی رنگ کی جھلک اس میں ضرور آ گئی۔"

قدیم دکنی پر اور خاص اس زبان کی جو شاعر گجرات اور بیجاپور میں بولی جاتی تھی، گجراتی زبان کا اثر پڑا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسے بعض اوقات گجری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، گجری سے مطلب ہندستانی کی اس شاخ سے ہے جو گجرات میں بولی جاتی تھی، اور جس میں مقامی گجراتی کے لفظ مل گئے تھے۔

اسی طرح ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور مولوی عبدالحق کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ گجری ہندستانی کی ایک شاخ ہے، جس میں گجراتی زبان کے الفاظ کی آمیزش ہے۔ دونوں اس بات پر بھی متفق ہیں کہ بیجاپور کے شاعر اپنی زبان کو گجری اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے یہاں گجراتی زبان کے الفاظ ملتے ہیں، البتہ ڈاکٹر زور اس کی تاویل زوال سلطنت گجرات اور گجری ادیبوں کی بیجاپور میں آمد سے کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اتنے ادیب بیجاپور آ گئے کہ مقامی لوگ بھی اپنی زبان کو گجری کہنے لگے۔ مولوی عبدالحق بغیر کسی خاص واقعے کے حوالے کے کہتے ہیں کہ گجری زبان کا رواج گجرات اور بیجاپور میں تھا، جہاں گجراتی زبان کے الفاظ ہندستانی سے مل جل گئے تھے۔ انہوں نے اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ان کی بحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیجاپور کے علاوہ دوسرے دکنی علاقوں کے لوگ اپنی زبان کو گجری نہیں کہتے تھے، اس لیے اس کی جہاں بین بھی ضروری ہے کہ کتنے دکنی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے؟

پروفیسر اکبر الدین صدیقی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ برہان الدین جانم کے والد سید ان جی حسینی العشاق نے اپنی زبان کو کبھی گجری نہیں کہا ہے، جو نکے گجرات کا زوال میراں جی کے زمانے میں نہیں، بلکہ برہان الدین جانم کی عمر کے آخر میں یہ واقعہ پیش آیا، اس لیے ایک حد تک ان کے گجری لکھنے کی اس تاویل کو تسلیم کیا جا سکتا تھا، جو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور نے پیش کی ہے، چونکہ ان کی تصنیف "ارشاد نامہ" کا سال تصنیف ۹۹۰ھ ہے، اور اس کے دو یا سو لا برس بعد ان کی وفات ہوئی، اس لیے ڈاکٹر زور کے بیان کیے ہوئے واقعے کا اثر ان پر پڑنا ناممکن ہے۔

اس بحث میں ایک مائز دکنیات اور گجریات کا نام لینا ضروری ہے، جس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندستانی ادب کے چراغ کو برسوں روشن رکھا، یعنی پروفیسر نجیب اشرف ندوی۔ انھوں نے کچھ مخطوطات کا

"لغات گجری" کے مقدمے میں اس زبان پر کافی روشنی ڈالی ہے، اور تفصیل سے بتایا ہے کہ گجرات اور دکن کے سیاسی حالات نے ہندستانی کی عظمت کو بڑھایا، ان دونوں علاقوں کے حکمرانوں نے بدیسی چیزوں کے مقابلے میں دیسی چیزوں کو اہمیت دینی شروع کی، اسی اصول کے تحت انھوں نے فارسی کے مقابلے میں ہندستانی کو اہمیت دی۔ اور دکن اور گجرات میں فرق صرف یہ ہے کہ گجرات میں طویل عرصے تک پروان چڑھنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے علاوہ دکن میں مختلف مسلم حکومتیں مدت دراز تک قایم رہیں، جس کی وجہ سے صدیوں تک ہندستانی سرکاری سرپرستی میں ترقی اور عظمت کی منزلیں طے کرتی رہی۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ گجرات میں جو ادبی ہندستانی پروان چڑھی اس کے تین نام ملتے ہیں (۱) گوجری (۲) گجری (۳) بول گجرات۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مجھے ہندستانی کی ابتدا اور نشو نما میں گجرات کے کارناموں کو دیکھنے کا موقع ملا، اور ایک سال کی تلاش و جستجو اور غور و فکر کے بعد میں یہ کہنے کی جرات کی کہ ہندستانی کی ابتدائی ادبی تعمیر میں گجرات کو بڑی حد تک اولیت کا درجہ حاصل ہے، میں محسوس ہوں کہ ہندستانی کے محققین نے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔

اب تک جو نظریے گجری زبان کے بارے میں پیش کیے گئے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ گجری ہندستانی کی وہ شاخ ہے جو علاقے گجرات میں بولی جاتی ہے، اور گجری میں گجراتی زبان کے الفاظ شامل ہیں، مگر ان نظریوں سے بالکل مختلف ایک نظریہ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا ہے۔ ڈاکٹر گجری چند جینی نے چٹرجی کے نظریے کی تشریح اس طرح کی ہے۔

"اس کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نام گجراں والا اور گجرات (پنجاب) کے دکنی وارد سپاہیوں کا عطا کردہ ہے، چنانچہ [illegible] نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔

سنیتی کمار چٹرجی کا نظریہ قابل غور ہے کہ ضلع گجراں والا کے سپاہی اتنی تعداد میں دکن نہیں آئے، جس کی بنا پر اس کا نام ہی بدل جائے، اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی، فوج میں دلی اور پنجاب کے سپاہی تھے، اصل میں چٹرجی کو یہ شبہ دکنی کے پنجابی پن سے ہوا۔ یہ وہی شبہ ہے جو اس سے قبل محمود خاں شیرانی کو بھی ہوا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام علامتیں جو دکنی کے پنجابی پن کو ظاہر کرتی ہیں، کھڑی بولی والے گروہ کی ساری زبانوں میں موجود ہیں، جن کو پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی ہندستانی زبان سے متعلق مشہور کتاب کے آخری باب میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ پنجاب کے لوگ ہندستانی کو لہندی یا ہندی، مگر ان کی اصل زبان پنجابی ہی رہی ہے، جو وہ اپنے گھروں میں ہمیشہ استعمال کرتے ہیں، اس بنا پر یہ خیال کی نہیں معلوم ہوتا۔

گجری کے سلسلے میں ایک بالکل نیا نظریہ پروفیسر محمد اکرام الدین صدیقی نے پیش کیا ہے۔ حال ہی میں انھوں نے "ارشاد نامہ" مصنفہ برہان الدین جانم کو مرتب کر کے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، اس مقدمے میں وہ اپنے نظریہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

دکن میں اگر قصبات میں، دیہات میں، ریاست کے ہوں یا ریاست کے ہوں یا ریاست کے [illegible] شاہراہ، پر کسی مخصوص جگہ روزانہ یا ہفتہ واری ترکاری یا دیگر ضروریات زندگی کے مستقل سامان کی عارضی دکانیں لگتی ہیں، اور بازار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو کہ یہ دکانیں مستقل نہیں ہوتیں، اس لیے ان کا کاروبار دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا، اور چونکہ یہ دکانیں گذرگاہ پر ہوتی ہیں، اس لیے ان کو گذری کہا جانے لگا اور کثرت استعمال سے گجری ہو گیا۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "ان بازاروں کی زبان ٹھیٹھ نہ ہوتی تھی، گاہکوں کی آسانی کے لیے، دو تین زبانوں کے الفاظ ملا کر گفتگو کی جاتی تھی، اس لحاظ سے برہان الدین جانم نے اپنی زبان کو گجری قرار دیا ہے، یعنی گذرگاہ کی آسان زبان جس کو ہر شخص سمجھ سکے۔"

لفظ گجری تجارت کرنے کے معنی میں ہندستانی میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ "باغ و بہار" میں خاجۂ سگ پرست کے قصے میں یہ لفظ اسی معنی میں میر امن نے استعمال کیا ہے۔

میں نے اس سلسلے میں یکجا معلومات مشاہدات کی روشنی میں جمع کی ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ گجری کے نام سے آج بھی ہندستان کے کئی شہروں میں بازار موجود ہیں، مثلاً بھوپال میں ایک بازار گجری کہلاتا ہے، کانپور میں بھی گذری بازار ہے، البتہ الہ باد میں ایک بازار "گدڑی بازار" کہلاتا ہے، اس سے پروفیسر صدیقی کے نظریے کی تائید ہوتی ہے، مگر یہ مسلہ ہندستانی کے ماہرین لسانیات کی توجہ کا مستحق ہے۔ اصل میں صدیقی صاحب نے گجری کی اصل، تاریخ اور عام روایتوں سے صرف نظر کر کے لسانیات کے میدان میں تلاش کی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دکنی ادیبوں کے گجری لکھنے کی تاویل تسلیم کر لی جائے، جیسا کہ بعض حقائق اسی طرف اشارا کرتے ہیں تو پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ گجری کوئی زبان نہیں، اور یہ دکنی ہی کا دوسرا نام ہے، یا پھر گجری کے دو مفہوم تسلیم کرنے پڑیں گے، یعنی ایک وہ زبان جو گجرات میں سلم دور حکومت میں رائج تھی، دوسری دکنی جو گذری سے گجری بن گئی۔

یہاں یہ سوال بھی ذہن میں اٹھتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اکثر دکنی ادیب اور شاعر اپنی زبان کو "گجری" کہتے، صرف ادبائے بیجاپور ہی نے کیوں اپنی زبان کو گجری قرار دیا، یہی اعتراض سنیتی کمار چٹرجی کے نظریے پر بھی وارد ہوتا ہے۔

اصل میں گجری زبان کے اتنے شواہد ہیں کہ اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں، خصوصاً محمد حسینی خوب محمد چشتی — وجہی کی تخلیقات اس زبان کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ دکنی شعرا اپنی زبان کو گجری کیوں لکھتے ہیں؟ اس سلسلے میں جو نظریے اس مقالے میں زیر بحث آئے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) ڈاکٹر زور اور مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ گجراتی زبان کے اثرات کی بنا پر ایسا ہے۔

(۲) چٹرجی کہتے ہیں کہ گجران والا ضلع پنجاب کے دکن جانے والے سپاہیوں کا دیا ہوا نام ہے۔

(۳) پروفیسر اکبرالدین صدیقی لکھتے ہیں کہ گجری اصل میں گذری تھا جو کثرت استعمال سے گجری بن گیا، مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ بعض شعرا اول گجرات یا تو لی گجرات لکھتے ہیں تو اس کی کیا تاویل ہو سکتی ہے، نیز یہ کہ دوسرے دکنی شعرا، اپنے آپ کو گجری کیوں نہیں لکھتے۔

اس میں شک نہیں کہ صدیقی صاحب کے دلائل کافی وزنی ہیں، اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے ان کا نظریہ غور و فکر کا مستحق ہے۔

اصل میں دکنی اور گجری کے علاقے اتنے متصل ہیں کہ، ان میں فرق بہت کم ہے، اور راقم کا نظریہ ہے کہ زوال سلطنت گجرات کے بعد جب شمالی اور ادیب کثرت سے بیجاپور آ گئے تو کچھ دن تک تو گجری کا نام باقی رہا، اور بیجاپوری ادیب اس سے متاثر ہوئے، مگر بعد میں وہ دکنی میں ضم ہو گئی، اور اپنی انفرادیت کھو بیٹھی۔ اس بنا پر دکنی اور گجری میں اختلافات ایک خاص دور تک رہے، پھر بعد میں ہندستانی کی وہ شاخ جو گجری کے نام سے گجرات میں پروان چڑھ رہی تھی، دکنی میں ضم ہو گئی۔ اسی بنا پر دکنی مشہور ہوئے، حالانکہ تمام تذکروں سے ان کا گجراتی ہونا ثابت ہے۔ سید ظہیرالدین مدنی نے اپنے رسالے "ولی گجراتی" میں اسی موضوع پر تذکروں سے ناقابل انکار شہادتیں پیش کی ہے کہ ولی گجراتی تھے، نہ کہ دکنی یا اورنگ آبادی، مگر چونکہ ولی کے دور میں گجری، دکنی میں ضم ہو چکی تھی، اس لیے وہ دکنی کے شاعر مشہور ہوئے نہ کہ گجری کے۔

انوار انجم
ایڈیٹر
تو لاکھ مصیبت سے اک مرد آلیدر
سخت مشکل میں ہوں کہ زر و سیم
میں بھی تلاش، تم بھی ہو مفلس
تم کو زلیخوں کہ اپنا گھر دیکھو

اسفندار فروردی ۔ اردی بہشت ۱۳۸۲ سنہ ہندستانی ادب جنوری ۔ فروری ۔ مارچ ۱۹۷۳ء

پرویز یداللہ مہدی

کٹی پتنگ

کچھ عرصہ پہلے ہم نے "گدڑی کے لال" منجو قمر کی ایک نظم "شعلۂ حوالا" "صبح امید" بمبئی سے "ہندستانی ادب" کے کسی پچھلے نمبر میں شائع کی تھی ۔ اس نظم کے ایک مصرع میں انھوں نے پتنگ کو بند کر باندا تھا ۔ ہم نے ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے منجو قمر کو اطلاع دی کہ پتنگ کو آپ نے مذکر باندا ہے ، حالانکہ پتنگ کو عام طور پر مونث کہا جاتا ہے ، اور دوسرا پوسٹ کارڈ ہم نے "صبح امید" کے ایڈیٹر کے نام لکھا کہ آپ نے شاید منجو قمر کی نظم "شعلۂ حوالا" نہیں دیکھی ، اور سہو نظری سے پتنگ کا لفظ غلط طریقے پر مذکر ہی چھپ گیا ہے ، ورنہ آپ بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ پتنگ اصل میں مونث ہے ۔ ایڈیٹر "صبح امید" نے ہمارا وہ خط آنے والے نمبر میں چھاپ دیا ، جس کو دیکھ کر "گدڑی کے لال" ، چراغ پا ہو گئے اور ہمیں لکھا کہ آپ کا نا اہل ، نا قابل ، جاہل مطلق ، اور نام نہاد ایڈیٹر ہے ۔ جس کو حقیقت میں ٹھک سے قلم تک پکڑنا نہیں آتا ۔ جی ۔ ام ۔ خان کی یہ ہمت کے گدڑی کے لال منجو قمر کے منھ لگے ، اور یہ کہنے کی بے جا جرات کرے کے قمر نے اپنی نظم میں پتنگ کو مذکر غلط طریقے پر باندا ہے ۔ وہ جی ۔ ام ۔ خان ، جو علم و ادب کی ٹانگ سے بھی واقف نہیں ہے ، منجو قمر جیسے عالا یائے کے شاعر کو مشورا دیتا ہے کہ پتنگ کو اپنی نظم میں چھوٹے باندو ، اور مونث بولا کرو ۔ اپنے جواب کے سلسلے میں اس خط میں قمر نے جی ۔ ام ۔ خان کی بری طرح سے درگت بنائی ہے ، اور خوب خوب ہی مذاق بھی اڑایا ہے ، اور جی ۔ ام ۔ خان کو علم و ادب سے کوسوں دور ایک غیر علمی ادبی آدمی ثابت کر دیا ہے ، چنانچہ ہماری علمی ادبی عدم واقفیت کا مذاق اڑاتے ہوئے ہمارے خط کے مضمون کو دیکھ کر اس لکھے (۱۲) پڑھے لے ساختہ ہنس پڑے ، اور کہہ اٹھے کہ پپا ، کتابی و قوف ہے آپ ، کا جاہل ملاقاتی ، جی ۔ ام ۔ خان ، جو پتنگ کو ، آپکے مذکر لکھنے کے بعد بھی مونث کہنے کی جرات کرتا ہے ۔

ہنر سنو اور کان کھول کر سنو ! تم نیٹ لے وقوف ہو ، اور تمہارے بچے جاہل اور پاگل ہیں ۔ تم صرف سوا در جن لے وقوفوں کے پتنگ کو مذکر کہنے سے کیا ہوتا ہے ۔ پتنگ کو سارا زمانا مونث کہتا ہے ۔ صرف دلستان لکھنؤ ، اور دلی ہی نہیں ، بلکے سارا اتر پردیش ہی پتنگ کو مونث کہتا ہے ، ارے او لے وقوف اور بھی سن لو صرف اتر پردیش ہی نہیں ، بلکے سارا مدھیا پردیش اور آندھرا پردیش

بھی بیگ کو مونث ہی کہتا ہے۔ اے وہ نادان اور تنگ نظر منجو قمر صرف یہی دیش ہی نہیں، بلکہ دوسرے سارے دیش بھی، مثلاً مہاراشٹر، گجرات، گوا، دمن، دیو، دیفا، منی پور، اروناچل، بہر حال ہندستان کے تمام چھوٹے بڑے اسٹیٹس، بشمول دلی اور نئی دلی کے تقریباً پچپن کروڑ آدمی، اسّی فی ہندرا عدد تم جیسے ضدی باپ بیٹوں کے، بیگ کو سب ہی "مونث" کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمہارا دعوا لایعنی اور ہمارا دعوا بامعنی ہے، جس کو بہر حیثیت سے اور ہر صورت میں، اور ہر ایک سے منوانے کے لیے ہم تیار ہیں۔ کہو اب بھی تم پاگل باپ بیٹوں کی عقل ٹھکانے لگی یا نہیں ——؟

تم بیگم بازار میں رہتے ہو اور بازاری قسم کی باتیں کرتے ہو، اور تمہاری زبان بھی بازاری قسم کی ہے، چنانچہ تمہاری ایک مشہور بازاری غزل کا یہ چیچے کا شعر زبان زد عام ہے ؎

پاپڑ، بھجیے، بڑے مزیدار بھول گئی لمڈی بیگم بہار

تمہارا یہ انسانہ مشہور غزل کو تمہاری ہی خلف اولاد سندھی کلال خانوں اور شراب خانوں کے آگے گاتے گئی لوگوں نے سنا ہے، اور اس کے علاوا خود تم کو کئی ایک کلال خانوں میں، کئی ایک لوگوں نے، کلالوں سے مخاطب ہو کر اپنا یہ شعر دھڑلے سے پڑھتے سنا ہے ؎

ڈالو کلال سندھی دارو ہلا ہلا کر پیتے ہیں ہم خوشی سے مستا گھما گھا کر

لوگوں کا کہنا ہے کہ سندھی تمہاری مرغوب شراب ہے، اور تم شہر کے ہر کلال خانے میں، سندھی کی تعریف میں نظمیں اور غزلیں گا گا کر کلالوں سے سندھی کی بھیک مانگا کرتے ہو، تاکہ وہ خوش ہو کر تمہاری مانگیں پوری کرتے رہیں۔ سنا ہے کہ تم "مرغ مسلم" کھانے کے عادی ہو، اور بیوی کو بار بار مجبور کرتے رہتے ہو کہ بیوی آج تو ہمیں "مرغ مسلم" کے سوا کچھ نہ کھاؤں گا، اور بیوی بے چاری تمہاری خواہش کو روز روز کیسے پوری کر سکتی ہے۔ ایک روز اس نے "مرغ مسلم" کی بجائے بھونی کھچڑی کے ساتھ پاپڑ لا کر رکھ دی، تو تم کچھ بھی نہ کہہ سکے، اور اپنے دل کو تسلی دے لی، اور یہ شعر کہتے ہوئے آخر، بھونی کھچڑی کھا ہی لی ؎

دو نوالے تو کھانے اے قمر بھونی کھچڑی کے ساتھ پاپڑ ہے

تم بیگم —— بازاری آدمی جو ٹھہرے، تمہاری زبان بھی —— بازاری ہے، اور تمہاری شاعری بھی —— بازاری قسم کی ہے، تم جیسے نالائق، اور جاہل مطلق، علم و ادب کو کیا جانیں —— ارے بے وقوف گدڑی کے لال تمہیں تو علم و ادب کی ہوا تک نہیں لگی ہے، پھر تم علم و ادب کی بہکی بہکی باتیں کیوں کرتے ہو۔ نٹ بے وقوف اور گدھے —— گدڑی کے لال منجو قمر سنو۔ اور خوب خوب ہی سنو کہ جی۔ ام۔ خان کون ہے اور کیا ہے۔ اے وہ جاہل مطلق

منمو قمر آنہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جی۔ ام۔ خان، ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم)
ڈاکٹر سجاد (مرحوم) ڈاکٹر زور (مرحوم) احمد پروفیسر سروری (مرحوم) کاشگرو
خاص رہا ہے، اور اپنے قابل اور مشہور زمانا اساتذا کی نگرانی اور سرپرستی
میں ہندستانی ادب اور زبان میں، عثمانیا یونیورسٹی سے ام۔اے کی
ڈگری حاصل کی ہے، اور اپنے ان تمام لائق و فائق اور قابل ترین پروفیسروں
کی زبانی ہے، ایک سے زیادا مرتبا پتنگ کو "مونث" کہتے سنا ہے۔
نالائق قمر۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے یہ تمام پروفیسر ہندستانی
زبان اور ادب کے سلسلے میں سند اور مانے ہوے اساتذا ہیں کی زبان
سے نکلا ہوا ہر لفظ سند کی حیثیت رکھتا تھا، اسی بنا پر قابل ترین جی ام خان
نے ایک نالائق اور جاہل مطلق گدڑی کے لال منمو قمر کو اس کی نادانی،
جہالت اور کم مائیگی کی طرف توجہ دلائی تھی کہ اے بے وقوف، اے نادان،
اور اے جاہل مطلق تو نے جس پتنگ کا لفظ مذکر نہیں، بلکہ مونث ہے،
اور تم نے پتنگ کو اپنی نظم "شعلۂ جوالہ" میں مذکر باندھا ہے وہ سراسر
غلط ہے، اس لیے تم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے صبح امید، کے
کسی آنے والے نمبر میں اس قسم کا نوٹ شائع کروا دو کہ میں نے اپنی نظم
میں لفظ پتنگ کو غلطی سے مذکر باندھا تھا، ایک لائق اور قابل شخص
جی۔ام۔خان، ام۔اے (عثمانیا) ایڈیٹر "ہندستانی ادب" نے مجھ کو اپنی
فاش غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے، جس کے لیے میں اس قابل ترین ہستی
کا ممنون احسان ہوں، اور اس بات کا پکا وعدا کرتا ہوں کہ آیندا سے
ایسی جاہلانا غلطی پھر کبھی نہیں کروں گا!

تمر تم اور تمہارے نالائق لونڈوں کے سے جاہل مطلق لوگ دنیا میں کم
ہوں گے۔ اے منحوس کے بچے، پتنگ بازی تو ہر سال ہوا کرتی ہے، اور اس
سال کی پتنگ بازی کو گذرے تھوڑا ہی عرصا ہوا ہے، اور وہ شور و غوغا
اور وہ آوازیں اب تک ہمارے اور دوسروں کے کانوں میں گونج رہی
ہیں — یہ میری پتنگ ہے — وہ پتنگ اڑ رہی ہے — اس کی پتنگ
کٹ گئی — تمہاری پتنگ چھوٹی ہے — میری پتنگ اچھی ہے — اس کی پتنگ
کٹ کر نالے اس پار گری ہے — میری پتنگ نے کیوں پھاڑ دی — اس
کی پتنگ کیسے ہی میں لوٹ لے آؤں گا — تمہاری پتنگ کا ڈھڈا خراب ہے۔
اس کی پتنگ کا کاغذ خراب ہے — یہ پتنگ بھاری ہے — زیادا اونچی نہیں
اڑے گی — میں اپنی پتنگ کو تمہارے حوالے کرتا ہوں، کچھ دیر اڑاتے
رہنا، تھوڑی دیر بعد میں اپنی پتنگ [illegible] گدڑی کے لال منحوس تو نے کیوں پھاڑ ڈالی، سنو، اس کو
فوراً جوڑ دو، ورنا وہ بالکل [illegible] خوب ہی تمہاری درگت بنائے
گا — [illegible] اپنی پتنگ کو کبھی
میں دیکھنا گوارا [illegible]

سن رہے، ہو بے وقوف اور جاہل مطلق قمر کہ یہ بچوں، بڑوں، مردوں، عورتوں اور ہر ایک کے نعرے اور آوازیں ہیں، جو پتنگ بازی کے زمانے میں ہر ایک کی زبان پر ہوا کرتی ہیں، اور اب تک بھی ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ نادان، لاعلم، اور کم عقل گندڑی کے لال مخمور قمر یہ نہ سمجھا کہ یہ صرف ہمارے محلے، اعظم پورا شرقی ہی کی آوازیں ہیں، بلکہ ہمارے محلے شنطانی پورا، اور "بیگم بجار" کی بھی یہی آوازیں ہیں، سارے حیدرآباد اور سکندرآباد، اور سارے آندھرا پردیش، اور سارے ہندستان کی بھی یہی آوازیں ہیں۔ کہ پتنگ بازی کے زمانے میں جو نعرے لگائے جاتے ہیں، اس وقت ہر شخص پتنگ کو ہر شخص "مونث" ہی کہتا ہے۔ کہو نالائق گندڑی کے لال۔ اب کیا جواب ہے تمہارا؟

قمر۔ گندڑی کے لال۔ تم جیسا نادان، جاہل مطلق، بے وقوف، نالائق اور "مرغے" گوشت" آدمی نما جانور ہم نے آج تک نہیں دیکھا کہ تم نے اپنے علمی گیت کار پتنگ کو مونث نہیں باندھتے ہیں۔ گیتوں میں پتنگ کی بھر ہے، بلکہ طوطا ہے، اس لیے غلط العام فصیح ہو گئی ہے"

یعنی بے وقوف قمر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ صرف اکیلے ہم نے پتنگ کو "مونث" نہیں لکھا ہے، بلکہ تمام فلمی گیت لکھنے والے متفقا طور پر یہ پتنگ کو گیتوں میں مونث ہی باندھتے ہیں۔ گیت کاروں کے کثرت استعمال کو جاہل مطلق اور پرلے بے وقوف قمر غلط عام فصیح سے تعبیر کرتے ہوئے یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ سب شاعر پتنگ کو لازمی طور پر مونث باندھتے ہیں، مگر یہ ان کی غلطی ہے، اور ان سب لائق و فائق اور قابل ترین گیت کاروں کے مقابل پاپڑ بیلنے والا "بیگم بجار" کا دوکوڑی کا شاعر اپنی جہالت اور نادانی اور کم فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے، پتنگ کو سو فی صد غلط طریقے پر مذکر باندھتا ہے، اور ایک قابل ترین شخص جی۔ ایم۔ خان، ایم۔ اے (عثمانیا) ایڈیٹر "ہندستانی ادب" نے اس مجنوں اور پاگل کو اس کی فاش غلطی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اپنی نادانی، نالائقی اور کم علمی کے سبب غلطی کا اعتراف کرنے کی بجائے اس قابل قابل شخصیت کی ذات پر، نارواء، نامناسب، بے جا، رکیک، سفلے اور کمینے پن کے حملے کرتا ہے۔ اس کندۂ ناتراش اور خر مغز کے رکیک، اور ذلیل حملوں کا جواب دینے پر ہم اس لیے بھی مجبور ہو گئے کہ اس سفلے کمینے اور اوچھے آدمی نما جانور کو یہ معلوم ہو کہ جی۔ ایم۔ خان ایک، مانا ہوا صاحب قلم اور ادیب اہل ہے، جس کے قلم میں ایسے سفلوں کے نازیبا اور گندے حملوں کا پورا پورا دندان شکن یا دانت توڑ جواب دینے کی پوری پوری قوت اور صلاحیت موجود ہے۔ اگر ہم اس کے ناپاک اور کمینے حملوں کا یہ معقول جواب نہ دیتے تو وہ بچے خر یہ کہہ اٹھتا کہ دیکھا آپ نے ہمیں نے سچ کہا تھا نا۔ کہ جی۔ ایم۔ خان، علم و ادب سے عاری اور نالائق شخص ہے، جس بے علم میں میرے حملوں کا جواب دینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ارے وہ گدھے کے بچے۔ لول۔ جواب دے۔ سکتا کیوں طاری

ہو گیا تھا جس پر کہ خدا تو نے اپنی بے وقوفی، جہالت، نادانی اور کم مائیگی سے
سے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ ملکی دنیا میں ہر گیت لکھنے والا "تینگ"
کو لازمی طور پر "مونث" مانتا ہے۔ اس آئینا تا حقیقت کے باوجود
آیا اب بھی تو پسند ہے کہ وہ نسب شاعر "تینگ" کو "مونث" لکھ کر غلطی کرتے رہے
ہیں، اور تو تنہا تینگ کو مذکر لکھنے والا حق بجانب اور صحیح پر ہے۔ شاعروں
اور گیت نگاروں کے اس متفقہ فیصلے یا VERDICT کے بعد بھی تینگ کو
"مونث" تسلیم کرے گا ۔۔۔ یا پھر تیری "مرغ کی ایک ٹانگ" کے مصداق
۔۔۔ بھی نہیں ۔۔۔ تینگ ۔۔۔ تو ۔۔۔ مذکر ۔۔۔ ہی ۔۔۔ ہے، کہے گا!

سنا آپ نے کہ گڈریا کا لال مسخرہ کتنا ہی جاہل مطلق اور نیٹ بے
وقوف نرا نالائق آدمی نما جانور ہے کہ صحی ضرب المثل سے تک واقف نہیں
ہے "صبح امید" ستمبر ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۱۹ پر "مجسم شہرت" عنوان کے تحت
اس گوز شتر نے لکھا ہے ۔۔۔ "پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ والی بات"، تمہاری
سمجھ میں بات تب آئے گی، جب تم میرے مذہب کا نام سنو گی، تمہارے مذہب
کا نام تو ہے ہی عورت"

ارے نادان اور جاہل مطلق تو یہ تک نہیں جانتا کہ صحی ضرب مثل "مرغ کی
ایک ٹانگ" ہے نہ کہ "مرغی کی ایک ٹانگ"۔ تو نے تو غلط ضرب مثل
لکھ کر اپنی نیٹ جہالت کا ثبوت دیا ہے، اور لوگ ہنسیں گے کہ ایک طرف تو
اپنی نام نہاد فائلیت کا دعوا کرتا ہے، اور دوسری طرف اپنی کم علمی اور جہالت
اور نادانی کا ثبوت دیتا ہے۔ ارے وہ پاگل اور نادان، اور جاہل مطلق ایک
ان پڑھ اور نادان بچے کی طرح تجھکو یہ ہدایت و تلقین کرنی پڑ رہی ہے "لمحات فوزی"
کا صفحہ ۹۵ الٹ اور اپنی جاہلانہ آنکھیں کھول کر دیکھ کہ "مرغ کی ایک ٹانگ"
کے معنی ہیں ۔۔۔ کہ کسی بے جا بات پر اڑ جانے کے موقع پر بولتے ہیں" ۔۔۔ ارے جرثومہ
کی اولاد BORN OF A WITCH تو نے اپنی ساٹھ سالہ عمر ایسی نری جہالت
میں گنوا دی کہ تجھ کو یہ تک نہیں معلوم مرغ ٹانگ اٹھا کر کھڑا ہوتا ہے، نہ کہ
مرغی" جیسا کہ تو نے اپنی جہالت اور نادانی سے لکھا ہے۔ ارے وہ بے وقوف
اور پاگل گڈریا کے لال ۔۔۔ اور گدھے کے بچے مسخرہ اس ضرب المثل کو بچے اور
عورتیں تک جانتی ہیں، اور کہتی ہیں پھر وہی "مرغ کی ایک ٹانگ" یعنی تیرے جنسے اڑیل
ٹٹوؤں کے بارے میں یہ ضرب المثل کہی گئی ہے کہ تو اپنی یا دیسی مرغیاں پالتا
ہے، اور ان کے انڈے چوک اور موتی مارکٹ، اور بیگم بازار مارکٹ، اور معظم جاہی
مارکٹ لے جا کر بیچا کرتا ہے۔ بچ رہے تو ٹوکری سر پر رکھ کر انڈے لیو ۔۔۔ انڈے
محلے محلے پکارتا پھرتا ہے، اور گھر کی مرغیوں کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے، ان کی بیٹ
اٹھاتا ہے، اور مرغیوں کے کھڈاروں کو دھوتا، دھلاتا اور صاف بھی کرتا ہے۔
مرغیاں بیمار ہو جائیں تو دوا بھی کھلاتا، اور ان کا انجکشن بھی دیتا ہے، اور جو مرغیاں
مر جاتی ہیں، انھیں حلال کر کے باہر لے جا کر کم دام میں بیچتا ہے، اور لوگوں سے یہ جھوٹ
بول کر دھوکا دیتا ہے کہ ان مرغیوں کو بلی یا بلا دوڑنے نوچ ڈالا تھا، اس لئے میں نے

حلال کردیا ہے، اس لیے آپ اس کو کم دام پر خرید لیجیے۔ سنا ہے کہ تو نے جھوٹ، دھوکے، مکر اور مکر و فریب کو اپنا پیشا بنا رکھا ہے، اور تیری اور تیرے گدھے نما لونڈوں کی زندگی اور پرورش ایسی ہی حرام کی کمائی پر ہو رہی ہے۔ دیکھا آپ نے اس سکیم بھاری۔ "شطانی بورے" والے عرفی والے اور انڈے والے گدڑی کے لال مجوتر کی جہالت اور بے وقوفی کا حال کہ خدا اس کے گھر میں سینکڑوں مرغیاں اور مرغ موجود ہیں، اور نہ معلوم کتنی دفعا اس نے مرغ کو ایک ٹانگ پر کھڑے ہوتے دیکھا ہے، مگر اس مشاہدے یعنی کے باوجود اس کے گدھے پن کا یہ حال ہے کہ اس نے "صبح امید" میں ترجمہ خدا یہ لکھ مارا ہے کہ "پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ"، ارے وہ پاگل گدڑی کے لال، آ مے جاہل مطلق مجوتر۔ لعنت ہے تجھ پر کہ بچے اور عورتیں تک اس حقیقت سے واقف ہیں، کہ مرغی نہیں، بلکہ مرغ ایک ٹانگ پر کھڑا ہوتا ہے۔ ارے پاگل اور دیوانے آدمی سے وہ گدھے کے بچے بچا پچا تک اور جاہل سے جاہل عورت تک "مرغ کی ایک ٹانگ کہتی ہے" بنہ کہ تیری طرح "مرغی کی ایک ٹانگ"۔ سن، الو کے پٹھے! شاید سعدی شیرازی نے تیرے ہی جیسے گدھے کے لیے یہ بامعنی، بامقصد اور حق آموز متعرکہا تھا۔ گلستان میں ایک حکایت کے سلسلے میں انھوں نے نیچے کا شعر لکھا ہے ؎

آدمی را عقل باید در بدن ورنہ جان در کالبد دارد "حمار"

الو کے پٹھے، گدھے کے بچے، اور جاہل مطلق، انڈے سینے والے مجوتر عمر بھر میں تو نے کبھی سعدی کی گلستان پڑھی ہے۔ اے جاہل مطلق گلستان تو کیوں پڑھنے چلا، اور تو اوپر کے فارسی شعر کے معنی کب سمجھ سکتا ہے، اس لیے صرف تجھ جیسے نا اہل اور نالائق گدھے کے بچے کے لیے ہم اس شعر کا مطلب آسان ہندستانی میں سمجھا دیتے ہیں۔ اے وہ نالائق اور ناخلف سن، بچا سعدی کا کہنا ہے، آدمی اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کے بدن یعنی دماغ میں عقل ہو، عقل چاہیے ورنا کالبد، یعنی جسم یا ڈھانچے میں جان تو حمار، حمار کے معنی جانتا ہے تو کیا جانے۔ گدھے کا بچا جو ٹھہرا۔ اے تیرے جیسے گدھے کو فارسی میں حمار کہتے ہیں، یعنی گدھا بھی کہتا ہے۔ اب گدھے کے بچے اور تو خدمی گدھے، اب کان کھول کر سن کہ شاعر یہ کہتا ہے کہ وہ لوگ ہم آدمیت یا "انسانیت" کا دعوا کرتے ہیں وہ سراسر غلطی پر ہیں، اس لیے کہ ان کے طریقہ اعمال و کردار وغیرا جلد یا گدھوں کے سے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کو آدمیت یا انسانیت کا دعوا نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس صرف وہ لوگ آدمیت یا انسانیت کے علمبردار ہو سکتے ہیں، جن کے اعمال اور کردار اچھے، بھلے اور قابل تعریف ہوں، ورنا، شاعر یہ کہتا ہے کہ وہ لوگ اچھے اور بھلے نہیں ہیں، اور وہ سمجھ اور عقل نہیں رکھتے ہیں تو ایسے لوگ شاعر کے نزدیک (تیرے جیسے) گدھے کے برابر ہیں، اس لیے کہ گدھے کے جسم میں بھی جان ہے، اور ان نام نہاد آدمیوں یا انسانوں" کے جسم میں بھی جان ہے ــــ پھر دونوں میں فرق کیا ہوا؟ فرق صرف یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی یا "انسان" تو موقع بہ موقع اور عقل و فہم و فراست سے کام لے کر اچھے اور بھلے کام کرتا جائے، جس سے دونوں کو

کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے، صرف ایسی ہی شکل میں وہ لوگ آدمی یا "انسان" کہلانے کے مستحق ہیں۔ ابے تیرے "کالبد" یا ڈھانچے یا جسم میں جان ہے؟ نہیں۔! سچ کہا، اس لیے کہ تیرے "کالبد" یا ڈھانچے یعنی "دماغ میں تو "گوبر" بھری پڑی ہے، اسی وجہ سے تو خد، خار یا گدھا بن گیا ہے، اور گدھے پن کی خرکیتی کر رہا ہے، اور ہر موقع پر اپنے پرلے درجے کے گدھے پن کا ثبوت بھی دے رہا ہے اور ہم نے سنا ہے کہ غصے کی حالت میں قہر قہر کرتا، اور گدھے کی طرح چیختا چلاتا بالکل گدھے کی طرح دوسروں کو "دولتی" بھی لگا دیتا ہے!

ارے وہ — شراب خانوں اور کلال خانوں میں بھیجے، پاپڑ، چاکنا اور چوار کی روٹی بھیجنے والے نام نہاد قمر — اس موقع پر ہم تجھے ایک مخلصانہ "ہمدردانہ" سنہرا وزریں، و نیز مفید مشورہ دیتے ہیں کہ تو آج سے اپنا تخلص بدل دے۔ تو جانتا ہے کہ امریکا کی اپالو APOLLO مہم کی وجہ سے قمر یا چاند کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اپالو نمبر (۱۱) کے دو اسٹرونالٹس ASTRONAUTS نے دنیا کے وجود سے کروڑوں یا اربوں سال بعد پہلی بار قمر چاند یا MOON پر قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد اپالو نمبر (۱۲-۱۴-۱۵-۱۶) کے دو اسٹرونالٹس نے بھی چاند پر قدم رکھا تھا۔ اے "حمار"، مطلق تو سمجھ بھی رہا ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں — ؟ ارے الو کے پٹھے تو جو بڑا گدھا تو ان بڑی باتوں اور رموز و نکات کو کہاں سمجھنے چلا! خیر تو سمجھے یا نہ سمجھے — دوسرے قابل لوگ تو ہمارے اس بیان کو بہتر طریقے پر سمجھ رہے ہیں۔ ہاں ہیچ جیسے گدھے کے لیے ہم اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ ۱۱ تا ۱۶ اپالو نمبروں میں اپالو نمبر (۱۳) کا وجود نہیں ہے۔ سن اے بے وقوف اور نادان گدھے کہ اپالو نمبر (۱۳) خلا یا SPACE میں گیا ضرور تھا، مگر چاند کے اطراف چکر لگاتے وقت اس کے LIQUID FUEL TANK میں LEAKAGE ہو گیا۔ یہ شکل خطرناک تھی، اور اگر ان میں سے دو اسٹرونالٹس غلطی کر کے چاند پر اتر جاتے تو وہ ہمیشا ہمیشا کے لیے وہیں رہ جاتے، اور اپالو نمبر (۱۳) میں بیٹھا ہوا اسٹرونالٹ بھی اپالو کے ساتھ ختم ہو جاتا۔ اس خطرناک شکل سے امریکا کے شہر ھاوسٹن HOUSTON کا اپالو اور اسپیس سنٹر کا ٹیلی ویژن کے ذریعے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اس لیے ان تینوں اسٹرونالٹس کی تینوں جانیں بچانے کے لیے ھاوسٹن کے سنٹر نے اپالو نمبر (۱۳) کے اسٹرونالٹس کو حکم یا ORDER دیا کہ چاند پر جانے کی کوشش نہ کرنا، بلکہ فوراً زمین کی طرف واپس چلے آؤ، چنانچہ سنٹر کے حکم کی تعمیل میں اپالو نمبر (۱۳) کو زمین کی طرف لوٹا لیا گیا، اور عین پر وگرام تحت اوقیانوس PACIFIC OCEAN میں پیراچوٹ PARACHOTE کے ذریعے گرایا گیا، اس کے بعد یہ تینوں اسٹرونالٹس بھی سالم اپنے وطن امریکا چلے گئے۔ سمجھا بے الو کے پٹھے ہم نے کیا کہا — تو کہاں سمجھتا — تو جو بڑا — "خر مغز"!

تو سمجھ رہا ہو گا کہ ہم بھٹک گئے ہیں۔ ارے بے وقوف ایسا نہیں ہے، آمدم بر سر مطلب یہ کہ اپالو کی مہموں کو ہم نے اس لیے گنایا کہ چاند کی اہمیت سمجھ پر جائے، اور یہ واقعہ ہے آدمی کے چاند پر اترنے کے بعد سے قمر یا چاند کی اہمیت بہت زیادہ

بڑ گئی ہے، اس لیے اس نوبت پر تجھکو ہمارا مخلصانا اور ہمدردانا مشورا ہے کہ آج سے تو اپنا پرانا تخلص "قمر"، ترک کردے، یا چھوڑ دے، اور اس کی بجائے "حمار"، یعنی گدھا یا "خمار" یعنی گدھے والا اپنا نیا تخلص اختیار کرلے۔ اس میں اگر تو نے یا خفا ہونے کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ ہم نے سنا ہے کہ تو نے اپنے گھر میں (نہا) گدھے بھی پال رکھے ہیں، اور ان گدھوں پر محلے محلے کے میلے کچیلے کپڑے لاد کر موساندی کے دھوب گھاٹ لے جاتا ہے، اور وہاں دھوبیوں کی طرح پٹھے رگا کر کپڑے دھوتا ہے، اور پھر سے اپنے گھر کے انھیں (نہا) گدھوں پر لاد کر اپنے گھر لے آتا ہے۔ بعض لوگوں سے ہم نے سنا ہے کہ تو استری کرنا بھی بہتر طریقے پر جانتا ہے، اور محلے والوں کے دھلے ہوئے کپڑوں کی استری اجرت لے کر کرتا ہے، چنانچہ اس طرح سے تیری آمدنی میں بہت زیادا اضافا ہوگیا، چنانچہ اس غیر معمولی آمدنی کی بنا پر سنا ہے کہ تو نے سندھی شراب بھی پینا شروع کردیا ہے، اور ہر روز شام کے وقت شہر کے کسی نہ کسی سندھی خانے یا شراب خانے میں جاکر سندھی ماشراب پیتا ہے، اور وہاں دوسروں سے لڑنے جھگڑنے اور مار پیٹ کرنے کے بعد پولیس کے حوالے ہوا کرتا ہے۔

اس لیے آدب گستاخ نے ہم جیسے کہنہ مشق ادیب شہیر کی شان میں اس "صبح امید" کے صفحہ پر، یوں گستاخی اور بے ادبی کی ہے، چنانچہ لکھا ہے "صرف ایک گوشے سے تذکیر و تانیث کی دھمی آواز گونجی ہے۔ چاہیے تھا کہ جی۔ ام۔ خان کے ادب کی بات کرتے" ارے وہ بے ادب، اور نامعقول اور ناشکنندے ناتراش، تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ "تذکیر و تانیث" کی دھمی آواز گونجی" ابے ہماری آواز دھمی نہیں، بلکہ ہم جو کچھ بھی کہتے ہیں، ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں، اور نقارے سے بھی زیادا گونجدار ہماری آواز ہوتی ہے۔ اگر ہمارے اعتراض میں وزن نہ ہوتا تو ہم ہرگز ہرگز اعتراض نہ کرتے، مگر ڈنکے ہمارا اعتراض اپنی جگہ بجا تھا، اور اس میں پورا وزن بھی تھا، اور قوت بھی تھی اس لیے ہم نے ایک چھوڑ دو ایوسنڈ کارڈ لکھے، تاکہ تجھ کو اور ایڈیٹر "صبح امید" کو تیری نالائقی، جہالت، بے وقوفی، نادانی، کم مائگی اور خصوصیت کے ساتھ تیری "بے ادبی" کی طرف توجہ دلائیں۔ ہم یہ بہتر طریقے پر جانتے تھے کہ لفظ "پتنگ" قطعی طور پر مونث ہے، اور تو نے اپنی نظم "شعلۂ جوالہ" میں اس کو مذکر باندھ کر اپنے نرے گدھے پن اور نیٹ جہالت، اور کرسوفی ضد "بے ادبی" کا ثبوت دیا ہے۔ اب تو ہی بتا کہ ادب کی شان میں "بے ادبی" تو نے کی ہے یا ہم نے؟ ہم نے تیری گستاخی اور "بے ادبی" اوپر گنائی ہے، اس کے ثبوت میں تیرے ہی قول سے کئی ایک فلمی گیت کاروں اور شاعروں کے حوالے گنا دیے کہ "پتنگ" مذکر نہیں، بلکہ قطعی اور متفقا طور پر "مونث" ہے۔ آیا اس آئینا نما حقیقت کے بعد بھی تو "مرغ کی ایک ٹانگ" کے مصداق بضد ہے کہ جی نہیں ــــ "پتنگ" تو مذکر ہی ہے ــــ نامعقول، گستاخ اور بے ادب" گدھا جو طرا تو!

ابے الو کے پٹھے سن اور کان کھول کر سن کہ تیرے جیسے بازاری اور گھٹیا شاعر آئے دن

جیسے صاحب قلم۔ادیب شہیر۔ممدوحوں میں پیدا نہیں ہوتے۔ جی۔ام۔خان نہ صرف ایک "ادیب اجل" ہی نہیں بلکہ جی۔ام۔خان ایک انسان کامل بھی ہے، اور جی۔ام۔خان وہ "انسان" ہے جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے ؎

سخت مشکل ہے ہر ایک چیز کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں "انسان" ہونا

اے "حسن مطلق" دیکھ لی تو نے ہماری "انسانیت" نما دریا دلی کریم جیسے "حلال خور" کو جی۔ام۔خان جیسے "حلال دوراں" "ہندستانی ادب" کا ایک سو صفحے کا معرکہ آرا نمبر ہر وقت کھلا رہا ہے، اور تو اپنی فطرت جبلی، اور عادی مفت خوری کرتا رہا۔ حالانکہ تیری "محمار منزل" سے بھی ایک نامبارک الانکلتا ہے، جس کا انکشاف اور اعتراف تو نے اسی "صبح امید" کے صفحہ ۲۱ پر ان لفظوں میں کیا ہے "ایک دکھا، تو نگاہ" جیسے ہی ہمارے کالم کا ایڈیٹر ہے "ارے یقال زنا ما" اے وہ تنہا ہے بیگم بازار۔اور کومتی "شعاع فجر" اور اے "مین دوران" اور اے روح نوا ہیر کہ تیرے کالے اور سیاہ تاب نمبر نے تیری اس مفت خوری "دھوکہ بازی اور مکاری اور دغا اور فریب کی لعنتوں کو مسلسل کیسے گوارا کرتا رہا کہ ہر وقت "ہندستانی ادب" کا ایک معرکہ آرا نمبر حاصل کرتا رہا اور اس کے بدلے "نگاہ" کا ایک چھوٹا سا حقیر ترین نمبر بھی نہ بھجوائے۔ اس موقعہ پر تو ہم بلا تکلف اور بلا تامل یہ سمجھنے پر مجبور کہ دوسرے معنی میں تو نے "حلال خوری" کی ہے ارے وہ بدخصلت، بدخو، بدخلق، بدمعاش، بداخلاق، بدفطرت، بدزبان، بدخصال، بدسلیقہ، بدتمیز لڈوں کے لالچ میں تو ہمارا ہر وقت پورے ایک سو صفحے کے ضخیم معیاری علمی ادبی ماہوار رسالے "ہندستانی ادب" کے چالیس نمبروں کے بدلے اپنے چھوٹے سے سنگے اور غیر معیاری بکواس نامے کا ایک ہی نمبر ہمارے نام نہیں بھجوایا۔ کیوں بھجوائے چیلا، تو چوہڑا اور نکمی جوس" جو گندے نالے میں گرے ہوئے روپے یا نوٹ کو نکالنے کے لئے دانتوں سے اٹھاتا ہے۔ اسی لئے ہم تجھ کو "حسن الملک امیر دشمن الدولہ" کے اسفل ترین خطابات سے سرفراز فرماتے ہیں، اس لئے اے "منحوس ہمارے حضور میں آن کر دست استمزا سے عقدت پیشی کر" اور ہمارے الطاف و عنایات و کرامات گرانمایہ سے سرفراز ہوتے سن اے غافل مطلق کہ ہمارے حکم محکم کی فوری تعمیل کرلے، ورنہ یاد رکھ "گی وقت پھر بات آتا نہیں!"

اے "رذیل ادیب" اور اے نالائق، اور جاہل مطلق، اے کندۂ ناتراش، اور اے وہ "بیگم بمار" کے پاپڑ بھیجنے والے "حمار"، "وحمار"، اور وہ شیطانی پورے کے حلال خور اور اے وہ حیدرآباد کے نام نہاد منحوس شاعر، تیرے جیسے بدتمیز اور بدذوق شاعر تو گوبر کے ہزاروں کیڑوں کی طرح آئے دن پیدا ہی ہوتے رہتے ہیں، اور فنا، ملیا میٹ بھی ہو جاتے ہیں، مگر جی۔ام۔خان جیسا صاحب طرز اور صاحب قلم "ادیب اجل" اور ادیب شہیر مشکل سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے ہم تجھ کو خوب کہتے ہیں کہ "دشت است پر از دیدۂ عالم دوام ما"

نہ صرف نظم، بلکہ مضمون میں لوگ عام طور پر "تنگ کو تنگ" لکھتے ہیں بعض کے ثبوت میں ہم نیچے مضمون پیش کر رہے ہیں، غالب پرویز یا ابن مہدی ایسی گدھے کا لڑکا ہے جس نے اپنے مضمون میں

بازیاں ویسے کئی قسم کی ہوتی ہیں، مثلاً مرغ بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی، بلبل بازی، وغیرہ وغیرہ، لیکن بازی چاہے کوئی بھی ہو ہر بازی کے دو رخ ہوا اور دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک روشن دوسرا تاریک یعنی ایک ہار ایک جیت۔ البتہ جہاں تک بازیوں کی تاریخ کا تعلق ہے غالباً کسی نے اس سلسلے میں کوئی خاص چھان بین نہیں کی، تاہم شواہد یہ بتاتا ہے کہ ہر قسم کی بازی تاریخ سے پہلے کا دین ہے۔

ویسے بازی چاہے کوئی بھی ہو لیکن کھیلنے والے نہ صرف تن من دھن بلکہ عزت و شہرت کو داؤ پر لگا آئے ہیں اور آثار بتاتے ہیں کہ حشر تک لگاتے رہیں گے۔ بازیاں ہوتی ہی ایسی ہیں کہ لوگ ان پر سب کچھ گنوا کر بھی ان بازیوں سے باز نہیں آتے۔ ویسے فی زمانہ بازیوں کے رنگ بدلتے رہے ہیں (سوائے عشق بازی کے) مرغوں، بٹیروں، بلبلوں کی بازیاں جنہوں نے دور کی یادگار رہیں اور تقریباً ناپید ہو گئی ہیں اور آج ان کی جگہ مجاہ بازی ریس، جوا، سٹہ، ٹکا وغیرہ نے لے لی ہے، لیکن بازی چاہے مرغوں اور بٹیروں کی ہو یا ریس اور جوے کی ہر بازی کے پیچھے ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اور اپنے اسی جذبے کی تسکین کیلئے، جہاں صاحب حیثیت لوگ اپنا سب کچھ داؤ پر لگاتے ہیں وہیں وہ بیچارے جن کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی، ریس کا میدان اور جوے خانا جن کی پہنچ سے باہر ہوتا ہے اور جو مرغے، بٹیر اور بلبل بھی نہیں لڑا سکتے ہیں، انسان کو انسانوں سے لڑا کر اپنے اس جذبے کی تسکین کا سامان کر لیتے ہیں۔

ویسے ہر قسم ہر بازی کا مخصوص سیزن ہوتا ہے (دیکھ بازیاں اس قید سے آزاد ہوتی ہیں) جیسے سٹا جوا، ٹکا وغیرہ) اگر بچے بڑے سبھی آسمان کی طرف سر اٹھاتے ہوئے نظر آئیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ پتنگوں کا سیزن ہے۔ پتنگ بازی آج بھی ملک کے طول و عرض میں اسی طرح متصول ہے۔ ہر فرد ملک کے چاہے کسی بھی حصے سے تعلق رکھتا ہو، اس بازی میں ضرور حصہ لیتا ہے (چاہے پتنگ اڑا کر یا پتنگ لوٹ کر)

بعض سیاسی قسم کے پتنگ بازوں کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں امن و شانتی کا پرچار کرنے کے لیے، پتنگ سے سستا آسان کوئی اور ذریعہ نہیں، دنیا کے ایک کونے سے پتنگ اڑایئے اور دوسرے کونے میں جھوٹا کھلا کر اپنا پیغام اس حصے کے عوام تک پہنچا دیجیے۔ ا

یوں دیکھیے تو پتنگ کوئی بھاری بھر کم چیز نہیں، دو پتلے پتلے بدوں (ٹھڈوں) پر مڑھا ہوا ایک باریک کاغذ، بس یہی کل کائنات ایک بے دم ہلکی پھلکی دھان پان سی شے پتنگ ملاحظہ فرمایئے۔ آسمانوں میں، جنوبی ہندستان میں خصوصاً دکن میں پتنگ عام ہے، جب کہ شمالی ہندستان میں خصوصاً لکھنؤ اور اس کے اطراف پتنگ کو پیار سے "گڈا" کہتے ہیں، اور غالباً اسی محاورے "گڈا بڑھانا" سے ماخوذ ہے۔ [illegible]

حضرات کو بھی گن کوا" کہا جاتا ہے۔

دکن میں خصوصاً حیدرآباد میں پتنگوں کے سیزن میں کافی رونق رہتی ہے۔ یہاں پتنگوں کو ان کے ڈیزائن اور رنگوں کے مطابق بڑے ہی دلچسپ اور موزوں ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے چاند تارا، دلہن پچیسی، آنکھیں، گلہری، چوپان، آدھی روٹی، لنگا، بڈھی، لنگوٹ وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایک قسم بڑی سائیز کے پتنگوں کی ہوتی ہے جنہیں یہاں اداما یا ونڈ کا پتنگ کہا جاتا ہے۔

پتنگ بازی میں حصا لینے والوں کو ان کی دلچسپیوں کے لحاظ سے کئی شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، جیسے پتنگ اڑانے والا شعبا، پرچ لڑانے والا شعبا، پتنگ لوٹنے والا شعبا، ہنڈورا مارنے والا شعبا، پتنگ بنانے والا شعبا وغیرہ۔

شاطر پتنگ بازوں کا کہنا ہے کہ پتنگ اصل میں ایک کاغذی جہاز ہے، اور اس کی پرواز کا سارا دارومدار کنوں (کنڈوں) پر ہوتا ہے، گویا کنے پتنگ کا اسٹرنگ ہوتے ہیں، اگر کنوں میں کوئی خاص نقص رہ جائے تو پتنگ کسی ایک جانب اس بری طرح کن کھانے لگتی ہے (جھکنے لگتی ہے) کہ پتنگ باز کے لاکھ سنبھالے سنبھلے اونچے محلی کے تاروں، کسی درخت کی گھنی شاخوں یا کسی اونچی عمارت کے ایریل کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے بلکہ اس بری طرح الجھا کر رہ جاتی ہے کہ پھر اس سے ہاتھ دھونا ہی پڑتا ہے۔ بعض اوقات یہی صورت حال اس وقت بھی پیش آتی ہے، جب پتنگ کا کوئی باز زخمی ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مرہم پٹی کرنے کے بعد اگر دوسرے باز کے ٹھڈے پر ایک "چندی" باندھی جائے تو یہ خطرہ کسی حد تک کم ہو سکتا ہے، مگر اس کی کوئی گارنٹی نہیں۔ بعض منفرد قسم کے پتنگ بازوں کا کہنا ہے کہ پتنگ بھی عورت کی طرح مونث ہوتی ہے۔

"کنوں" کے بعد اگر کوئی چیز اہمیت کی حامل ہے تو وہ ہے ڈور۔ ڈور بلکے پتنگ اور ڈور میں توجولی اور دامن کا ساتھ ہوتا ہے (لیکن حقیقت "توجولی اور دامنی جو کبھی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے" اب ان میں اس قدر ان بن ہو گئی ہے کہ صلح و صفائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی) بہر حال پتنگ اور ڈور ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں، چنانچہ ان کے انتخاب کے سلسلے میں بڑی باریک بینی اور ذہانت سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر پتنگ ہلکی اور ڈور بھاری ہو تو پھر پتنگ اس قدر ہٹیلا چھوڑتی ہے کہ دوسرے اس سے ناحق خائف ہو اٹھا کر پٹھے مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کانچ لگے بھوؤں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے، اور دو شاخی کا بھی۔ دو شاخی اصل میں ایک بانس بھر کی [illegible] ہے جس کے دونوں [illegible] جھوٹے چھوٹے

بندھے ہوتے ہیں۔ دوشاخ کی مدد سے پتنگ کو بچاتے ہیں۔ وہی کامیاب ہوتے ہیں جن کا نشانہ اچھا ہوتا ہے۔

پتنگ اڑانے سے پہلے ہوا کا رخ دیکھ لینا ضروری ہے۔ خصوصاً ایسے اصحاب کے لیے کہ جو اس میدان میں تازہ وارد ہوئے ہیں، کہتے ہیں، ایک پتنگ، چاہے اس کا تانیا کتنا ہی اچھا ہو یا پتنگ، اس شاعرانہ اصول پر کاربند ہوتی ہے۔

تم بھی چلو ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

الٹا ہوا کا رخ دیکھنے کے لیے کسی تقلب نما کی ضرورت نہیں، پیر سے زمین پر ٹھوکر لگا کر ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی دھول سے ہوا کے رخ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"دھلکاری" قسم کے پتنگ باز ہوا کا رخ دیکھے بغیر ہی "تے ٹھکے" دے کر بغیر کسی کی مدد کے پتنگ کو راکٹ کی طرح خلا میں پہنچا دیتے ہیں، البتہ نو سکھیے اور کچے پتنگ باز کسی ایسے اور محتاج مفتی کی طرح کسی ایسے بچے کی تلاش میں نظریں دوڑاتے رہتے ہیں جو ان کی پتنگ کو کچھ فاصلے تک لے جا کر ہوا میں چھوڑ سکے۔ ایسے پتنگ باز اکثر نقصان میں رہتے ہیں، بعض بچے پتنگ چھوڑنے کے بہانے پتنگ لے کر رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ پتنگ بازی کا اصل مزا پیچ لڑانے میں ہے۔

اور پیچ عموماً دو طرح سے لڑائی جاتی ہے۔ ایک کھینچ، دوسری ڈھیل۔ ڈھیل لڑانے والے پتنگ بازوں کی پوزیشن ہر طرح سے محفوظ ہوتی ہے، چاہے میدان میں لڑائے یا کسی محفوظ سی چھت پر سے۔ البتہ کھینچ کے سلسلے میں ایک پتنگ باز کو ہر وقت ہوشیار و حواس رہنا پڑتا ہے۔ میدان کی حد تک تو ذرا سی بھول چوک کچھ دیر کے لیے عالم بالا کی سیر کرا لاتی ہے، لیکن جہاں تک کسی مخصوص جہت کا تعلق ہے تو ذرا سی بھول کا نتیجہ دو پیسا کھائے بغیر ہی بھگتنا پڑتا ہے، یعنی آنکھ کھلنے پر خدا کو منتقل عالم بالا میں پایا جاتا ہے۔ پیچ لڑانے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں جن پر بہت کم پتنگ باز کاربند رہتے ہیں اور نوے فیصدی پتنگ باز محض "جھک" مارتے ہیں۔ پتنگ میں سب کے حاشیے پر عمل کرتے ہوئے دو انگلیوں یا مضبوط ٹوپل استعمال کر کے حریف کی پتنگ کو ساری میں سے کاٹ کر اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے "ملکۂ وکٹوریہ" کے ہاتھ کا مارا سالے آئے ہوں۔

پیچ لڑانے والوں میں ایک کھینچ تار سیا ہوا اور دوسرا ڈھیل کا یا دونوں ہی کھینچ کے رسیا ہوں تو نتیجا جلد ہی سامنے آجاتا ہے، لیکن اگر دونوں ہی ڈھیل کے لڑانے والے ہوں تو پھر پیچ کبھی کبھی اس قدر طول کھینچتی ہے کہ دیکھنے والے اطمینان سے بورئیے بستر لپیٹ کر چلتے بنتے ہیں، بلکہ لیٹ جاتے ہیں ایسی پیچ پر۔ پیچ میں جیت اسی کی ہوتی ہے جو مستقل مزاج ہوتا ہے اور جس میں صبر و تحمل کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے ویسے شاطر پتنگ بازوں کا کہنا ہے کہ ایک پتنگ باز جانے کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو، لیکن اچھے "اوڑ کاٹ دار" کے لیے اس کی حالت "ناکوں" کی سی ہوتی ہے جس کی کشتی کے چیتھڑے کار ہو گئے ہوں، گو مارلفد کے چھلے چھڑانے میں اچھے مانجھے کو بڑا دخل ہوتا ہے اور اس سلسلے میں گزار حوض کا مانجھا دھیمے سوکھا حوض ہے، حیدرآباد میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ ماہر پتنگ کا کہنا ہے کہ مانجھا ہوتا ایک مستقل ترین فن ہے اور اس میں مہارت اسی حاصل ہوتی ہے جو مانجھے کے ساتھ ساتھ غذا بھی ہوتے جاتے ہیں۔ سنا ہے مانجھے تیار کرنے کے لیے سو سو تنے کے کئی نادر نسخے جو بعد نسخے سینہ بہ سینہ بعض خاندانوں میں چلے آرہے ہیں۔ مانجھا بنانے والوں کے بارے میں طرح طرح کی روایتیں مشہور ہیں کوئی کہتا ہے کہ فلاں مانجھا بغیر لاسنسی کی تلوار ہے تو کوئی کہتا ہے کہ فلاں مانجھے کے آگے تلوار بھی پانی بھرتی ہے۔ ماہر پتنگ کا خیال ہے کہ اچھے اور کاٹ دار مانجھے کے ساتھ اگر ایک پتنگ باز مختلف پینترؤں سے اچھی طرح واقف ہو، اور حسن کی ڈھیل میں "ٹھمکا" اور کھینچ میں "چھٹکا" ہو، ایسے طرحدار خاں پتنگ سے لوہا لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ جس طرح مختلف کھیلوں کے میدانوں میں مختلف قسم کے ریکارڈ قائم کرنے والوں کو سرکاری طرف سے مختلف خطابات سے نوازا جاتا ہے، اس طرح پتنگ بازوں کو ان کی کامیابیوں پر مختلف قسم کے خطابات سے نوازا جانا چاہیے۔ جانے کیوں سرکار نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ پتنگ بازوں کو چاہیے کہ سرکار کی توجہ اس طرف مبذول کروائیں۔ ویسے غیر سرکاری طور پر پتنگ باز آپس میں ایک دوسرے کو "فوٹر شیر واق" کے خطابات سے اسی وقت نوازتے ہیں جب کوئی پتنگ باز ایک ہی پتنگ کی مدد سے تین پتنگوں مسلسل تین پتنگوں کا صفایا کرتا ہے۔ ویسے پتنگ باز چاہے کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو، لیکن پتنگ آخر پتنگ ہے جس کے نصیب میں کبھی نہ کبھی کٹنا لکھا ہوتا ہے۔ پھٹنے کی صورت میں تو خیر معذوری ہے۔ البتہ کٹ جانے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ جو درپیش ہوتا ہے وہ ہے بچے کچے مانجھے اور ڈور کو بھی سلامت واپس لینا۔ اگر اس دوران میں حواس بجا نہ ہوئے تو پھر پتنگ تو گئی ہی ہے بچے کچے مانجھے اور ڈور سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں لہٰذا ایسے عالم میں پھرتی کے ساتھ حواس کی بحالی ہونے ضروری ہیں پتنگ کٹ جانے کے بعد بچا کچا مانجھا اور ڈور اس سپاہ فوج کی طرح واپس ہوتے ہیں جو بادشاہ دھیان جنگ میں ہار چکا ہو۔ ڈور کھینچتے وقت اگر حواس بجا نہ ہوئے اور پھرتی سے کام نہ لیا گیا تو پھر ہاتھ سما مانجھا اور ڈور دونوں ہی مار کھا لیتے ہیں جو اس نیت سے راستے میں گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ کٹ کر ڈور سے ... گرے ...

اپنی آنکھوں کیوں چھپاتے ہیں ہم چھوٹے سے صرف رہی پتنگ
باز محفوظ رہتے ہیں جو دنیا مانجھے کے فن میں ماہر ہوتے ہیں اور
اسی فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ہر سال سینکڑوں نئے شائقین پتنگ
بازوں کی چرخ پکڑتے ہیں اپنی عمر کھو بیٹھتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مخصوص
موسموں میں ہر سن و سال کی آبادی آسمان کی طرف ہوتی
ہے اور سبھی کی کیفیت ایسی ہوتی ہے [illegible]
ہم وہاں ہیں [illegible]
البتہ سا [illegible]
میں ہی کٹی ہوئی پتنگ [illegible] ہونے کی کوشش کرتے
ہیں۔ یعنی پتنگ [illegible] کوشش کرتے ہیں اس
کے لیے کسی تند و تیز [illegible] ہوتی ہے
مانجھا دار [illegible] ایسے
میں جب کہ آسمان [illegible]
[illegible] ہو جاتے ہیں
[illegible] ڈھیل [illegible]

کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس سیزن کے دوران
خاص طور سے یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ
پتنگ اڑانے والوں سے زیادہ پتنگ لوٹنے والوں
کی تعداد ہوتی ہے۔ نتیجتاً کوئی بھی کٹی ہوئی پتنگ
بھی سلامت کسی کے ہاتھ نہیں لگتی۔ سوائے ان
پتنگوں کے جو کٹ کر کسی کے گھر میں جا گرتی ہیں،
ورنہ کسی کی چھت پر، کسی کے صحن میں، کسی محلے کے شریر بچوں
میں ان کی مہربانیوں کا شکار ہو کر زمینوں کی خاطر
میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔

ویسے دیکھیے تو پتنگ بازی کا شوق ہنگامی
ہی ہے اور وقت گزاری کی البتہ بعض ایسے بچے بڑے
بھی ہوتے ہیں جن کی جیب اس شوق کی قطعی متحمل نہیں ہوتی
یا میرے سے جن کے جیب ہی نہیں ہوتی، وہ "انڈور"
اڑا کر کسی حد تک اپنے اس جذبے کی تسکین کا
سامان کر لیتے ہیں۔ اور ایسے ہی مخلوق
اجاڑ پڑے محلے محلے کٹی ہوئی پتنگوں کو لوٹ کر اپنے
شوق کی تکمیل کیا کرتے ہیں۔!

کٹی پتنگ

مجروح سلطان پوری

نہ کوئی امنگ ہے نہ کوئی ترنگ ہے
میری زندگی کیا ہے ایک کٹی پتنگ ہے!

نہ کوئی امنگ ہے نہ کوئی ترنگ ہے
آسمان ہے گہری میں اک بار کٹ کے دنیا سے کوئی
پھر نہ پوچھ لوٹا ہے مجھ کو کیسے کس کا ساتھ ہے نا سنگ ہے
میری زندگی کیا ہے ایک کٹی پتنگ ہے!

لگ کے گلے سے اپنے بادل کے میں نارنگی ڈولی اٹھی بوندا
جیسے ارتھی اٹھی ہو کوئی
یہی کہہ تو آج بھی میرے سنگ سنگ ہے
میری زندگی کیا ہے ایک کٹی پتنگ ہے!

میری زندگی کے دیوتا تجھ کو کروں کیا میں
ارپن
آنسوؤں کا دیپ یہی میرا سندیپ یہی میرا رنگ ہے
میری زندگی کیا ہے ایک کٹی پتنگ ہے!

REGD.NO. H.384.

HINDUSTANI-ADAB

89-A, AZAMPURA-SHARQI,

Hyderabad-36, (A.P.),

INDIA.

EDITOR,

G.M. Khan,

M.A. (OSMANIA).

ایڈیٹر۔جی۔ام۔خان ام۔اے (عثمانیا)

۹۹۔اے۔اعظم پوراشرقی۔حیدرآباد ۳۶۔آندھراپردیش (انڈیا)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۳۸۴)
خرداد۔ تیر۔ امرداد ۱۳۸۲ف
چند اسالانا

جلد (۳۳) نمبر (۷۔۸۔۹)
اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۷۳ء
بارا روپے

ہندستانی ادب

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)

۹۹۔ اے، اعظم پور، اشرقی۔ حیدرآباد ۳۶۔ آندھرا پردیش۔ انڈیا۔

لیڈیز فرسٹ نمبر

ہندستان کے دشمن۔ ہندوؤں کے دشمن۔ ہندو لیڈروں کے دشمن۔ ہندوؤں کے اوتاروں کے دشمن۔ ہندوؤں کی دیویوں اور دیوتاؤں کے دشمن، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوؤں کی جان سے زیادہ اعزیز اور قابل احترام "گاؤ ماتا" کے جانی دشمن، اور ان سب کے ازلی اور پیدائشی دشمن کے ناگ کے خطرناک زہر سے کہیں زیادہ زہریلے، نفرت آمیز اور حقارت آمیز خیالات، آدمی نما جانور حیرت بدایونی کی، پاگل اور مجنون رضا کارانا دور میں لکھی گئی، انتہائی ذلیل اور حد درجہ ناپاک کتاب "لیڈیز فرسٹ" پر لاحظ فرمایئے۔

اس مانی ہوئی "ہندو دشمن" کتاب کے چند اقتباسات "مشتے نمونہ از خروارے" صفحا (۳۳) سے صفحا (۵۳) تک پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اسی مشہور زمانہ "ہندو دشمن" اور قابل نفرت اور قابل ملامت کتاب کو "ہندستانی ادب" کے آیندا نمبروں میں مسلسل قسط وار پیش کیا جائے گا تاکہ نہ صرف ہندستان کے (۵۰) کروڑ ہندو، بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہنے بسنے ہندوؤں کو یہ معلوم ہوسکے کہ ملے پلی۔ حیدرآباد۔ آندھرا پردیش۔ انڈیا۔ میں، ان کا ایک ناگ کے زہر سے بھی زیادا خطرناک اور زہریلا جانی دشمن موجود ہے، جو موقع ملے تو ہندوؤں کو بری طرح سے ڈس ڈس کر صفحۂ ہستی سے ملیامیٹ کردینا، اور ساری دنیا سے نام "ہندو" کو مٹادینا چاہتا ہے!

نمبر	عنوان	نام	صفحا	شکریہ کے ساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۳	
۲	شہزادی کا رومان	جی۔ ایم۔ خان، ایم۔ اے (عثمانیہ) ایڈیٹر	۹	
۳	پانچ سالا یوجنا	پنڈت نرمل دت، ایڈیٹر ڈیفنس سوسائٹی آوٹ لک	۳۲	ڈیفنس سوسائٹی
۴	خونی لوہری	ماسٹر بلبل بسواتی	۳۲	حریم
۵	حیدرآباد اور اس کی ذلیل اور ناپاک کتاب "ایڈیٹر نکٹ"	جی۔ ایم۔ خان، ایم۔ اے (عثمانیہ) ایڈیٹر "ہندستانی ادب"	۳۳	
۶	سرفروشان وطن کا پیام غداران اور دشمنان دیس کے نام	فضل الرحمان فضل	۵۳	صبح امید
۷	چھچھی بی	عفت موہانی	۵۴	زیور
۸	مرزا غالب اور مدرسۂ سرکار کمپنی	پروفیسر محمود الکریم مصنوی، ریڈر مدرسہ عالیہ کلکتہ	۶۰	برہان
۹	پنرل	محمد۔ آر۔ نیر	۷۰	شان ہند
۱۰	مولانا حالی کے خطوط مولوی عبدالحق کے نام	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	۷۱	قومی زبان
۱۱	حب وطن	الطاف حسین حالی پانی پتی	۸۱	دیوان حالی
۱۲	رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے	فلک مظفر نگری	۸۷	آزاد بھارت
۱۳	سہاگ رات	خاجا احمد عباس	۸۸	بانو
۱۴	مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا	خدیجا انصاری داس گپتا۔ موہنی انجم	۹۷	بانو
۱۵	قانو بلا	ابوتکیہہ خکاہی	۱۰۰	پیام تعلیم

مجلہ۔ ایم۔ خان، نے دائرہ ابریشم بھون بازار میں حصہ اکر ۹۹ اے، انظم نور راستہ قی۔ حیدرآباد ۳۶ سے شائع کیا۔

ہمارے خیالات

ہندستان دشمن۔ ہندو دشمن۔ ہندو لیڈر دشمن۔ ہندو اونار دشمن۔ ہندو دیویوں دیوتاؤں، اور سب سے بڑھکر یہ ہندوؤں کی جان سے بھی زیادہ عزیز اور مقدس و قابل احترام گاؤ ماتا دشمن، اور ساری دنیا کے (۵۵) کروڑ ہندوؤں کے بیدلیشی، ازلی اور ناگ سانپ کے زہر سے بھی زیادہ اخطرناک اور زہریلے جانی دشمن، آدمی نما جانور، عبرت بدایونی کی ذلیل ترین اور ناپاک ترین کتاب۔

لیڈرز فرسٹ

کے صرف اور صرف ہندوؤں پر گندے۔ اوچھے۔ ذلیل کینے۔ سفلے، اور ناپاک حملے اور کارنامے ملاحظہ ہوں!

اپنی یہ گندی اور ناپاک ہندو دشمن کتاب اسی ذلیل اور کمینے اور نام نہاد اور آدمی نما جانور عبرت بدایونی نے الیکشن سے پہلے کے تجزیہ نانا اور پاگل دور میں لکھی تھی۔ جس طرح رضا کار لیڈر قاسم رضوی کا دماغ خراب ہو گیا تھا بالکل اسی طرح ہزاروں، بلکہ لاکھوں میں نام نہاد رضا کاروں کے دماغوں میں سرانڈ پیدا ہو گئی تھی جس کی چند ایک مثالیں موقع محل سے ہم یہاں پیش کیے دیتے ہیں۔

ہمارا دفتر ان دنوں تباہی خبروں کا مرکز خاص بنا ہوا تھا۔ روز انا سینکڑوں اور خاص قسم کی بے بنیاد جاسوسی خبریں سننے میں آتی تھیں۔ جس روز ہندستان کی خبروں نے پولیس ایکشن کی کارروائی شروع کی تو آپ یقین جانیے کہ صبح سے شام تک ڈیڑھ سو آدمی سڑک اور فٹ پاتھ پر ڈٹے رہتے تھے، اور یہ بے ہنگم مجمع سر شام سے رات کے دو ڈھائی بجے تک دو ڈھائی سو کے لگ بھگ ہو جاتا تھا، ریڈیو ہی لگا رہتا تھا، ریڈیو پر بھی جو بھی خبریں سنا کرتے اپنے دلوں کو تسلی اور تشفی دے لیتے تھے، اور یوں بھی لوگ جھوٹی اور واہی تباہی خبریں سنایا کرتے تھے کہ فلاں محاذ پر دشمن کو پسپا کر دیا گیا، اور ایک دوسرے محاذ پر دشمن نے بری طرح مونھ کی کھائی ہے، اور اسی قسم کی بے بنیاد خبروں کو سن سنا کر لوگ اپنے مونھ جھوٹی تسلی دے لیا کرتے تھے۔ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے ورنہ ایسے اہم سائل کے متعلق میں اسی کے نام کنوائے جاتا، لیکن آج ہم موقع محل سے بعض باتوں کے ظاہر کرنے میں اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

ہمارے دو چہیتے شاگرد سید ضیاء الدین خاں نوشی اور سید حمید الدین خاں نوشی (مسرت نگاہ ہوٹل کی شہرت والے) مع ایک ڈاکو اور رضا کار کے ہمارے لیڈر قاسم رضوی کے دست راست تھے۔ پولیس ایکشن کے تیسرے روز تو ہمارے دفتر کے سامنے کا مجمع اور بڑھ گیا تھا۔ سامنے کے فٹ پاتھ پر تقریباً سو ڈیڑھ سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ اسی کے بعد نالے کے فٹ پاتھ پر بھی لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ اسی روز چار سو آدمیوں سے بھی زیادہ آدمی جمع ہو گئے تھے۔ تقریباً ۶ بجے شام کا وقت تھا ہم اپنے فٹ پاتھ کی سنٹری پر دیوار سے ٹیکا لگائے بیٹھے تھے اور لوگ آپس میں واہی تباہی باتیں کر رہے تھے۔ ہم آپ کو یقین کامل دلاتے ہیں کہ نوشی برادران یعنی حمید اور ضیاء الدین اس وقت تک

[illegible] کے متعلق ہم نے ان اہم ملکی اور سیاسی مسائل کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا تھا، اس لیے کہ ہم جانتے تھے کہ اگر ہم ان کے کچھ کہیں بھی تو ہمیں بری طرح سے بھگتنا پڑے گا، اس لیے بالکل سکوت اور خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ایک روز شام میں تقریباً ۶ بجے ہمارے دونوں چہیتے آ گئے، اور وہ دو سارے مجمع کو یہ خبر سنا گئے کہ انگلستان میں ہمارے ہوم سکریٹری معین نواز جنگ نے ایک تحریر پائیلٹ مذکی کاٹن SYDNEY COTTON سے یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ وہ ہمیں دو ہوائی جہاز بھر کر ہتھیار سکلم پیٹے کے ہوائی اڈے پر پہنچا دے گا، چنانچہ آج اس کی پہلی کھیپ آ چکی ہے اور ڈپٹی ملٹری قاسم رضوی بذات خود سکلم پیٹ کے ہوائی اڈے پر گئے تھے اور سڈنی کاٹن سے ملاقات بھی کی ہے جس نے ہمارے فیلڈ مارشل کو یقین دلایا ہے کہ وہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ ہفتے میں تین ٹرپ ہتھیار یہاں آ جائیں۔ یہ سچ ہے کہ انگلستان یا یورپ میں ہمارے حیدرآباد کے مخفی ایجنٹ کے ذریعے معین نواز جنگ نے تین کروڑ روپیہ کی حد تک ہتھیار خریدنے کے لیے، اور ہوائی جہازوں کے خریدنے کے سلسلے میں ایک کروڑ روپیہ کا مخفی طور پر کھا تھا، چنانچہ اسی سلسلے میں ڈنمارک کی ہوائی کمپنی کے مالک اور نامور پائیلٹ سے ملنے کے لیے گیا تھا کہ وہ اپنے ایک یا دو جہازوں کے ذریعے حکومت حیدرآباد کے خریدے ہوئے ہتھیار جلد سے جلد حیدرآباد کے ہوائی اڈے یا سکلم پیٹے پر پہنچا دے گا۔ صرف دو ٹرپ ہتھیار کے سکلم پیٹے آئے تھے، ایسے میں ہندستان کی فوجیں چاروں طرف سے حیدرآباد میں داخل ہو گئیں، اور سید راہ کے کمانڈر انچیف اور سپاہ سالار اعظم الیدروس نے ہندستانی فوج کے کمانڈر انچیف میجر جنرل چودھری کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد سنا ہے کہ معین نواز جنگ نے [illegible] کے ساتھ وہ ہتھیار کمپنیوں کو واپس کر دیے، اور رقم حساب بانک میں محفوظ کروا دی تھی۔

خرداد۔ تیر۔ امرداد ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۷۳ء

جب ہمارے بھتیجوں نے بیگم پیٹ کے ہوائی اڈے پر ہتیاروں کی بارش کی خبر ہمیں سناتے ہوئے کہا کہ ہماری فوج بڑی منظم ہے، اس کو صرف جدید آلات حرب یا ہتیاروں کی کمی تھی، اب جو نئے ہتیار مسلسل آرہے ہیں، اس لیے دشمن تعینی ہندستان کے مقابل فتح ہماری ہے۔ اسی پر سب ہی باگوں نے خوشی کے نعرے لگائے، اور نیا فیلڈ مارشل قاسم رضوی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بھی لگائے۔ اس نوبت پر ہمارے صبر کا پیالا چھلک اٹھا، اور ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم نے اپنے بھتیجوں کو یہ جواب دیا کہ ہوش کے ناخن لو، ذرا سوچو کہ کی باتیں کرو۔ ایک ہوائی جہاز میں کتنے ہتیار آئیں گے، حیدرآباد کی پوری فوج کو سپلائی کیے جائیں گے، ہمارا تو خیال ہے کہ ندوری سے تیری لڑپ کی نوبت تک نہیں آئے گی، اور اس وقت ہندستان کی خونیں شہر حیدرآباد میں داخل ہو چکی ہوگی، اور ساتھ ہی ہم نے یہ بھی کہا کہ آپ لوگ اتنے کم عقل اور نادان واقع ہوئے ہیں، جو یہ تک نہیں جانتے کہ ملک کی تقسیم کے بعد ہندستان کی فوج کتنی ہے، اس کو ہتیار کتنے ملے ہیں، اور اس ملک میں ہتیار بنانے کے کارخانے کتنے ہیں؟ ایک ہی سانس میں ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ پولیس ایکشن کے سلسلے میں ہندستانی فوج کو کارخانوں سے مزید ہتیار حاصل کرنے کی مہلت نہ دے گی، بلکہ حیدرآباد کی فوج کو زیر کرنے کے لیے اس کے موجودہ ہتیار ہی کافی ہیں۔

ہماری یہ صداقت آمیز باتیں سنتے ہی دونوں بھائی آگ بگولا ہو گئے اور بڑے بھتیجے ضیاء الدین نے اپنے کوٹ کے جیب سے ریوالور نکالا، اور کہنے لگا، بھائی! یہ دونوں بھتیجے ہمیں بھائی کہنے کا اس بجا اس مت کرو، ورنہ ابھی کچھ ثانیوں میں شعیب اللہ خان جنجاہ گے ہیں ہم فوراً ہم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، اور اس کی طرف آگے بڑھے، اور سینا تان کر کہا شعیب اللہ خان نے بھی حق بات پر جان دی ہے، اور اس وقت ہم بھی حق بات پر اپنی جان دینے کیلیے تیار ہیں، مارو، ہمیں ابھی اس وقت شوٹ کر ڈالو۔ ایسے میں دونوں نے بیچ بچاؤ کیا، ہمیں اپنی جگہ پر لا بٹھایا، اور ان دونوں بھائیوں کو اپنے گھر بھجوا دیا!

یہ پولیس ایکشن کے بعد جس طرح لاکھوں بھگوڑے پاکستان بھاگ گئے تھے، یہ دونوں بھائی بھی اپنے خاندان کے ساتھ کراچی چلے گئے تھے۔ مائی بلڈ پریشر کے سبب دو تین سال پہلے ضیاء الدین کا انتقال ہو گیا، اور چھوٹا بھائی وحید بقیدِ حیات ہے۔ سنا ہے کہ حیدرآباد کو حقیقی معنی میں تباہ و برباد کرنے والے صدر ڈاکو قاسم رضوی کا لاہور میں انتقال ہو گیا ہے!

قاسم رضوی کو تمام خونیں رضاکار اور دوسرے بھاگ مسلمان اور صرف دو مٹھی بھر ہندو، ونکٹ راؤ اور شیام سندر بی۔ اے، ال ال۔ بی (علیگ) فیلڈ مارشل کے نام سے پکارتے تھے۔ قاسم رضوی بھی کی تحریک پر دارالسلام میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کے مجمع یا "قوم" نے (بشمول دو مٹھی بھر ہندو) قاسم رضوی کو فیلڈ مارشل کا عہدہ یا RANK دیا تھا، اور مسلمانوں کی اس دینی براس نے "قوم، کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ وہ اپنے اس حالا ترین فوجی عہدے یا RANK سے بے حد خوش اور نازاں بھی تھا۔ رضوی کا مکان ملک پیٹ میں تھا، جب وہ اپنے مکان سے دارالسلام یا شہر کے کسی اور حصے میں جاتا تھا تو اس کی کار کے آگے اور پیچھے کئی ایک موٹر سیکلوں پر اتنے ہی رضاکار سوار ہوا کرتے تھے، جو کسی گورنر جنرل یا پریذیڈنٹ آف انڈیا کی کار کے ساتھ رہا کرتے ہیں۔ قاسم رضوی کو ان محافظ رضاکار نہ تھا، بلکہ غلام عثمان کا بی۔ اے، ال ال۔ بی تھا، اور حیدرآباد کے سرپٹواڈا ضلع عثمان آباد کے صدر مقام پر وکالت کرتا تھا، اس لیے وہ بہتر طریقے پر جانتا تھا کہ ایک فوجی عہدے دار کو فیلڈ مارشل کب بنایا جاتا ہے، چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے ختم پر انگریز حکومت نے جنرل منٹگمری اور امریکی حکومت نے جنرل ڈیک آرتھر کو ان کے کارہائے نمایاں کے صلے میں فیلڈ مارشل کا رینک RANK دیا تھا، اور ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے خلاف جنگ جیتنے کے صلے میں، ہندستانی حکومت نے جنرل مانک شا کو فیلڈ مارشل کا رینک دیا تھا، اور ہندستان کا پہلا فیلڈ مارشل ہے! مگر رضاکاروں کا یہ صدر تو کو ہندستان سے جنگ جیتنے سے پہلے ہی حیدرآبادی فوج کا "فیلڈ مارشل" بن بیٹھا تھا، اور اس نام نہاد "فیلڈ مارشل" کے کئی ایک جنرلس، لفٹننٹ جنرلس، کرنلس اور کیپٹنس وغیرہ بھی تھے، جن کے عہدے، سالار اعظم، سالار جالا سالار اولا اور سالار میزا تھے۔ ان میں حضرت بدالرزاق، لویس سلیم، اور ہمارے سگے چھوٹے بھائی صلیم خان، سالار اعظم کے رینک RANK رکھتے تھے۔ یہ تینوں قاسم رضوی کے خاص، بادی اور اس کے علاوا خود بھی رضاکاروں کو ساتھ لے کر شہر کے اطراف و جوانب میں RAID پر جایا کرتے تھے۔ RAID کے معنی تھے، دھاوا بولنا، اور یہ دھاوا ایسے کہ مٹی کسان، یا ٹیلی پیڈاری ہندوؤں کے گھروں اور بستیوں پر بولا جاتا تھا، جہاں ان کو یقین ہوتا تھا کہ یہ لوگ سرمایہ دار اور مالدار ہیں۔ یہ سب رضاکار ہندوؤں سے لیس ہوتے تھے، اس لیے دھاوا بولتے ہی یہ غنڈے رضاکار، ان معصوم مظلوم اور نہتے لوگوں سے سب کچھ اپنے ساتھ رکھا لیتے تھے، اور جیپ کاروں میں بیٹھ کر پھر سے شہر حیدرآباد میں واپس آجاتے تھے۔ RAID کا لوٹ مار سا اور زور زبردستی والا مطلب

کے خرچ نے میں جمع ہوتا تھا جو رضاکارانا تحریک پر خرچ ہوتا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ ہر RAID کا آدھے سے زیادہ پیسا RAID کرنے والے ڈاکو رضاکاروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، اور باقی آدھا یا اس سے بھی کم پیسا اور زیور وغیرہ دارالسلام کے خزانے میں داخل کروایا جاتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ قاسم رضوی کو اس ناجائز تقسیم کا علم مطلق ہونے نہیں پاتا تھا، ورنہ وہ ایسے نابکار رضاکاروں کو شوٹ کر دیتا۔ اس کے رضاکارانا غنڈے پن سے ہٹ کر قاسم رضوی حقیقت میں ایک با اصول اور صاحب کردار شخص تھا، جس کی سوفی صد تصدیق خود ہمارے سگے بھائی سالار اعظم سلیم خاں نے ایک سے زیادہ مرتبہ کی ہے، اور اس زمانے میں ہم نے سینکڑوں افراد کی زبانی بھی سنا تھا کہ قاسم رضوی نے دارالسلام کے خزانے سے اپنے ذاتی خرچ کے لیے ایک روپیہ تک نہیں لیا۔ اسی طرح ہم اپنے سگے چھوٹے بھائی سلیم خاں تک سالار اعظم کے بارے میں بھی آپ کو بیکا، کامل اور سو فی صد تصدیق دلاتے ہیں کہ وہ صرف ایک بار RAID پر گئے تھے، مگر اس دھاوے کی تقسیم میں سے انھوں نے اپنا حق ہرگز ہرگز نہیں لیا۔ اس تحریک کے سلسلے میں، الٹے انہوں نے اپنا ذاتی پیسا پانی کی طرح بہایا اور سالار اعظم کا کریمی کلر قیمتی اور بھاری ریشمی کپڑے کا ڈریس تیار کروایا تھا۔ اس ڈریس کے تیار ہوتے ہی وہ اپنے بنگلے اور باغ "سعادت ولا" واقع سلیم نگر کالونی سے اپنی کار میں اپنے دو رضاکار لڑکوں کے ساتھ سیدھے ہمارے گھر آئے۔ اس وقت ہم اپنے دیوان خانے میں بیٹھے دوسروں سے باتیں کر رہے تھے، خیر خدا نے کی بھی دوست تھے۔ وہ تینوں مل کر اندر آئے، اور سلیم خاں نے ہم سب کو آداب کیا، اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔ چند خیریت کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اور اس میں پندرہ بیس بھی ہو گئے۔ وہ واپس جانا چاہتے تھے، اور رکنے کی جیسی سی محسوس کی۔ ان سے رہا نہ گیا، آخر وہ بول اٹھے "کیجیے بھائی صاحب، یہ ڈریس کیسا لگتا ہے نئے۔ اس وقت ہم نے خیال کیا یہ بے چارے ان کی طرف اس سلسلے میں تھے۔ ہم نے خود جواب دیا۔ "کیا کہنے بھائی صاحب، آپ جیسے قد آور اور چوڑے چکلے انسان کو یہ ڈریس واقعی بھلا معلوم ہوتا تھا" پھر ظاہر ہے اس کے ساتھ رضاکار کا لیبل نہ لگا ہوا تھا [illegible]

ہی غصے کی حالت میں کہنے لگے کہ آپ ہمارے رضاکار تحریک کے دشمن جو ہوئے، آپ سے سوائے برائی کے اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ہم نے ہنس کر ٹال دیا، اور وہ بھی بغیر آداب کیے واپس چلے گئے۔ اس کے بعد ہم موجود حضرات سے بہت دیر تک اس سلسلے پر گفتگو کرتے رہے، اور یہ کہہ دیا تھا کہ رضاکاروں کی ممنوعاتی اور باغیانہ حرکتوں کا پھل حیدرآباد کے لاکھوں معصوم شہریوں کو بھگتنا پڑے گا اور آخر میں بری طرح سے بھگتنا ہی پڑا۔

یوسف سلیم اور حیدر یزدانی دونوں بھی سالار اعظم کے رینک کے رضاکار تھے۔ یہ دونوں کئی بار RAID پر گئے تھے۔ انھوں نے اپنی سرکردگی میں کئی بار کئی ایک مستول بستیوں اور دیہاتوں اور قصبوں وغیرہ کو لوٹا یا تھا، اور اس سلسلے میں خود بھی بہت کچھ کمایا، اور اندوختا بھی کیا تھا۔ ایک بار یہ دونوں سالار اعظم، قاسم رضوی کی سرکردگی میں، نئی نئی نگر کی ڈکیتی کے سلسلے میں بھی گئے تھے۔ نئی نگر میں مالدار کوئی، سیٹ ساہوکار اور مارواڑی بھی رہتے تھے۔ اس RAID میں لاکھوں روپیا اور لاکھوں روپے کے زیورات وغیرہ بھی ملے تھے، کیونکہ یہ RAID قاسم رضوی کی موجودگی میں ہوا تھا، اس لیے کسی بھی رضاکار کو ایک روپیہ تک نہ مل سکا، اور وہ تمام رقم اور زیورات وغیرہ دارالسلام کے خزانے میں داخل کروا دیے گئے تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد اسی نئی نگر کے ڈکیتی کے سلسلے میں قاسم رضوی پر حیدرآباد ہائی کورٹ میں مقدمہ چلایا گیا تھا، جس کے نتیجے کے طور پر رضوی کو سات سال کی قید کی سزا دی گئی تھی۔ اس نے اپیل بھی کی تھی، مگر اپیل میں بھی ناکام رہی، اور آخر کار چنچلگوڑہ جیل میں اسی نے سات سال گزارے، اور رہائی کے بعد پاکستان چلا گیا تھا۔ پہلے کراچی میں تھا، اس کے بعد اپنی بیوی بچوں کے ساتھ لاہور منتقل ہو گیا تھا، جہاں آج سے دو سال پہلے اس کا انتقال ہو گیا۔

ہم نے رضاکارانا [illegible] کے پاکستان اور [illegible] کے دور [illegible] آپ خود ہی بتا سکتے ہیں کہ رضاکاروں [illegible] تمام [illegible] حرکتیں، یا کوں اور [illegible]

چلیے چند ایک رضا کاروں اور دوسرے مسلمانوں کا یہ سمجھنا ہی پاگل پن کی دلیل تھی کہ حیدر اباد کی فوج ڈٹ کر ہندستانی فوج کا مقابلہ کرے گی، اور آخر میں ہندستانی فوج کو ہرا دے گی۔ قاسم رضوی کے سر میں اتنی سڑانڈ پیدا ہو گئی تھی کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا، اور ایک روز اپنی تقریر میں حیدر اباد ریڈیو پر یہ کہہ اٹھا کہ "ہنرو اور سردار پٹیل کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دن دور نہیں جب کہ حیدر اباد ریاست کا پرچم ہمالہ کے لال قلعے پر لہراتا نظر آئے گا"

آیا اس پاگل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہندستان کا دو تین لاکھ فوج جدید ترین آلات حرب سے لیس ہے، جس کے ہاں سینکڑوں گنیں بھی ہیں، توپیں بھی ہیں، ٹینکس یا دبابے بھی ہیں، اور سینکڑوں ہوائی جہاز بھی ہیں۔ ریاست حیدر اباد ایک خشکی کے جزیرے کی حیثیت رکھتی ہے، جو چاروں طرف سے ہندستانی سرحدوں سے گھری ہوئی ہے۔ ہندستانی حکومت اگر چاہے تو چاروں طرف سے گھیر کر ریاست حیدر اباد کو زیر کر سکتی ہے۔ حیدر اباد کی جملا بارہ ہزار فوج تھی، جس کے ہاں صرف پندرہ توپیں اور چند جدید قسم کی توپیں دیزا بھی تھیں، مگر ان کے لیے کارتوس تک ازکار اق سے آیا کرتے تھے۔ ایسی نکمی فوج ہندستان کی دو تین لاکھ فوج کا مقابلہ کیسے اور کیونکر کر سکتی تھی؟ جب یہ خیال رہ رہ کر ہمیں ستاتا تھا تو ہمارا یہ کہنا ہے کہ دوسرے لوگ اسی زاویے نگاہ سے کیوں نہیں سوچتے تھے؟ اس کا واحد جواب یہ ہے کہ تنگ نظری، اور تعصب کے انتقامی جذبے نے ان رضا کاروں اور غیر رضا کاروں کی عقلوں کو زہر آلود کر دیا تھا، اسی لیے ان پاگلوں یا دیوانوں نے سنجیدگی کو اپنے ہاتھ سے دے دیا تھا، اور جو بھی سوچتے تھے، متعصبانہ اور انتقامی جذبے کے تحت سوچتے تھے، جس کا دوسرا نام ہم نے پاگل پن یا جنون دیا ہے۔ اب یہ سوال نوبت پر آیا ہم ان دیوانوں اور جنونوں کو پاگل کہنے کے مستحق ہیں یا نہیں؟

حیرت بدایونی کی کتاب "لیڈیز فرسٹ" بھی ایک ایسے ہی [illegible] اور پاگل پن کے نظر اور متعصب دور کی یادگار ہے! اس کے اپنی یہ ناپاک اور ذلیل کتاب "لیڈیز فرسٹ" انسی پاگل پن کے دور سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ ہم نے اس کتاب کو دیکھا تھا کہ دو ہزار تعداد کا ایڈیشن ہاتھوں ہات نکل گیا تھا، اس لیے کچھ ہی عرصہ بعد اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھاپنا پڑا۔ دوسرے پاگلوں اور جنونوں کے ذریعے ہم نے اس کتاب کی بہت تعریف سنی تھی، مگر اس کو دیکھا نہیں تھا۔ ایسے میں حیدر اباد کا تاریخی اور یادگار دن پولیس ایکشن ہو گیا! اس کے بعد تو اس کتاب کا نہ کہیں ذکر سننے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ہمیں پرانی کتابیں خریدنے کا شوق شروع ہی سے تھا۔ پولیس ایکشن سے پہلے ہم حیدر اباد کے مشہور "جمعرات بازار" جا کر پرانی کتابیں خریدا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اتوار کو بھی جایا کرتے تھے، جہاں پرانی کتابوں کی ایک دوکان سے زیادہ کتابیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۵۸ء میں ہم کتابوں کی غرض سے گھوم رہے تھے۔ ایک دکان میں کتاب "لیڈیز فرسٹ" سامنے ہی رکھی تھی۔ ہم نے وہ کتاب بات چیت کی، اور اس کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا کتاب زیادہ استعمال تھی، اور اس کی جلد بھی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ ہم نے دکاندار سے قیمت دریافت کی تو اس نے قیمت دو روپے بتائی، جو کتاب کی اصل قیمت ہے۔ ہم نے اپنی جیب سے چلتے سے دو نوٹ نکالے اور دکاندار کے حوالے کرتے ہوئے وہ کتاب گھر لے آئے، اور شروع سے آخر تک اس کو پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد کہیں ہمیں پتا چلا کہ دیوانے رضا کار اور غیر رضا کار [illegible] کتاب کی کیوں تعریف کرتے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے مصنف حیرت بدایونی نے اس کتاب میں ہندوؤں کے خلاف کافی سے زیادہ زہر اگلا ہے، اور یہ ظالم نہ صرف ہندوؤں، ان کے لیڈروں اور ان کی دیوی دیوتاؤں، اور سب سے بڑھ کر ان کی جان سے زیادہ عزیز "گاؤ ماتا" کا بھی دشمن ہے، بلکہ ہمارے سیکولر دیش ہندستان کا بھی جانی دشمن ہے، اور ہر طرح سے وہ ہندستان کی برائی اور تباہی اور بربادی چاہتا ہے، چنانچہ اسی وقت ہم نے اپنے رسالے "ہندستانی ادب" میں زیر لیے [illegible]

پیش کر کے عوام کو آگاہ کیا کہ ہندستان کے (۵۰) کروڑ ہندو بھائیو! اپنی ہندو انگیٹھی کھول کر دیکھو کہ حیرت بدایونی کون ہے — آپ کا جانی دشمن کون ہے "جو ساری دنیا کے ہندوؤں کو تہس نہس کر کے مٹیا میٹ کر دینا چاہتا ہے" اور جو ہندوؤں کو ذلیل سمجھتا اور گری ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے" اور ان کی دیوی، دیوتاؤں، اوتاروں، اور ان کی "گاؤ ماتا" کا مذاق اڑایا ہے!

۱۹۶۳ء میں ہم نے اخباروں میں یہ خبر دیکھی کہ شاعر حیرت بدایونی کو آندھرا پردیش ساہتیا اکادمی سے انعام دیا جانے والا ہے تو اسی وقت ہم نے اس سلسلے میں تین نمبروں میں اداریے لکھے اور اکادمی کو توجہ دلائی کہ اس ہندستان دشمن اور ہندو دشمن نام نہاد شاعر حیرت بدایونی کو اکادمی کا انعام ہرگز نہ دیا جائے مگر ہماری آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی، اور اس "ہندو دشمن" کو ساہتیا اکادمی کا انعام دیا گیا!

"لیڈر فرسٹ نمبر"

چونکہ اس نمبر میں اداریے اور مضمون "حیرت بدایونی اور اس کی ذلیل اور ناپاک کتاب "لیڈر فرسٹ" ملا کر بہت زیادہ صفحے صرف ہوئے ہیں، اس لیے ہم نے اس پرچہ "لیڈر فرسٹ نمبر" کا مہورتوں تریتا نام دیا ہے، جس سے خدا کرے کبھی اتفاق ہو گا۔ اس کے علاوہ یہ نمبر ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ پولیس ایکشن سے پہلے کے دور میں ہندو انتہا کار تفریق کا اصل مقصد کیا تھا، یعنی یہ تفریق حقیقت میں ہندوؤں کے خلاف تھی، جس کا سچی مچی خاکہ ہندوؤں کے حقیقی جانی دشمن حیرت بدایونی نے اپنی ذلیل اور ناپاک کتاب "لیڈر فرسٹ" میں کھینچا ہے۔ اور جس کا خدا کرے دل کی گہرائی سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

اس کتاب کا مطالعہ ہندوؤں ک

دفاتر تھے جہاں ایک بھی ہندو ملازم نہیں تھا، انتہا یہ کہ وہاں کے چپراسی تک مسلمان تھے۔ اس لکیری تحت کا ہجوم مسلمانوں کے قائد ملت بہادر یار جنگ مرحوم جاگیردار یہ دیا کرتے تھے کہ چونکہ ریاست کے تمام پٹیل، پٹواری، مالی پٹیل، پولیس پٹیل، مقطعے دار، پٹے دار اور کاشت کار وغیرہ سب ہندو ہیں، اس لیے مسلمانوں کی زندگی کا واحد سہارا صرف سرکاری ملازمت ہی ہو سکتی ہے، جس کا تناسب کسی صورت (۸۰) فی صد سے کم نہیں ہو سکتا، اور اپنے اس غیر منصفانہ حق کو وہ لوگ حکومت سے لڑ جھگڑ کر منواتے تھے۔ عوض میں بھی سیئر جونیئر کے کوئی تفریق طبقے تھے۔ سینیر ملازمین اپنے مقام جونیئر ملازمین کو گرا ہوا سمجھتے تھے، اور یہ تھا گویا احساس برتری SUPERIORITY COMPLEX اور یہ مرض ریاست حیدرآباد کے ہر کونے گوشے تک ایک بڑی وبا کی طرح پھیلی گئی تھا۔ نتیجہ یہ کہ مرض حیدرآباد سیول سروس H.C.S. کے ملازمین میں تو کثرت سے تھا، یعنی سینیر H.C.S. جونیئر H.C.S. کو برابر کے نکموں سے بھی نہیں دیکھتا تھا، اسی طرح بڑے جاگیردار چھوٹے جاگیرداروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اسی طرح بڑے منصبداروں اور جمعداروں کو چھوٹے منصبداروں کے مقابل میں احساس برتری تھا۔ اب آپ خود ہی بتایئے کہ حیدرآباد ریاست کا کون طبقہ احساس برتری کے منحوس مرض سے عاری تھا؟ اس متعدی اور قابل ملامت مرض نے حیدرآباد کے اکثر دیسی باشندوں کے دماغ خراب کر دیے تھے، جن میں حکومت، تکبر، غرور کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا، اور چونکہ بقول شاعر ع "تکبر عزازیل را خوار کرد"، اسی تکبر نے حیدرآبادیوں کو حیدرآباد کے تاریخی اور یادگار "پولیس ایکشن" کی شکل ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا!

وہ کہیں کے نہ رہے، ان کے دماغ ٹھکانے لگ گئے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں پاکستان کو بھاگ گئے، اور جو یہاں رہے حالات زمانہ کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کی جاگیریں، زمینداریاں، منصب اور عہدداری وغیرہ جاتی رہیں، اور وہ محنت مزدوری اور ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے! اور اسے بارگاہ کی اولاد در عیاں اور انڈے بیچ رہی ہے، اور حیدرآباد کے ایک ناعور اور مشہور زمانہ انجنیئر کی اولاد کسی کارخانے میں ملازم ہے! ہم جو نکتے شروع ہی سے حیدرآبادیوں کی مفت خوری کے خلاف تھے، اور ان کے ہر جتھی احساس برتری سے سخت نالاں تھے، اور سخنوران حیدرآباد کے سخت خلاف تھے، اسی لیے ہم نے حیدرآباد کے "پولیس ایکشن" کو "فیض آمد" کہا!

ان مفت خور جاگیرداروں، منصبداروں اور جمعداروں کے خلاف ہم نے اسی وقت قلم نہیں چلایا ہے، بلکہ ہمارا یہ نعرا آج سے چالیس بیالیس سال پرانا ہے۔ حیدرآباد کے مشہور روزنامہ "اخبار" (رہبر دکن)، میں ہم کبھی کبھار مضامین بھجوایا کرتے تھے، اسی سلسلے میں، ہم اخبار کے موجود دفتر افضل گنج ہی جایا کرتے تھے، اور اس کے ایڈیٹر احمد محی الدین (علیگ)، سے ہمارے اچھے تعلقات تھے۔ ایک بار ہم نے "ہمارا جاگیردارانہ نظام حقایق کی روشنی میں"، ایک مضمون بھجوایا تھا، جس میں نہ صرف جاگیرداروں کی خبر لی تھی، بلکہ ان تمام مفت خوروں کو نام نام گنوایا، جن کا اوپر ذکر کیا ہے۔ ہماری توقع کے خلاف یہ مضمون اخبار میں نہیں چھپا، اور چونکہ کافی سے زیادہ اخبار چھپ چکا تھا، اس لیے ہم ایک روز "رہبر" کے دفتر گئے، اور ایڈیٹر صاحب سے اس بارے میں بات چیت کی۔ انہوں نے کہا آپ کا مضمون پہنچا ہے، اور میں نے اس کو ٹھکانا نہیں ہے۔ اس بارے میں کچھ کہنے کہلوانے سے پہلے آپ ہمارے اخبار کے جنمدے کی تفصیل پڑھ لیجیے، جس میں لکھا ہے کہ سرکار برطانیہ سے سالانا اتنے روپے، سرکار آصفیا سے اتنے روپے۔ ہز پاشگاہ سے اتنے روپے۔ جاگیرداروں اور طبقۂ امرا و عہدہ داران عظام اتنے روپے اور عوام سے بارانہ پے سالانا، تو پھر جناب آپ ہی انصاف سے فرمایئے خان صاحب، کہ حکومت اور جاگیرداروں کے خلاف آپ کا مضمون چھاپ کر آپ میں اپنی سالانا آمدنی پر پانی پھیر دوں، یہ کہتے ہوئے تیز کے خانے سے ہمارا وہ مضمون نکالا، اور ہمارے بات میں ٹھکاتے ہوئے کہا ع

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے دیس اور قوم کو قومی ترانا "جنا۔ گنا۔ منا دیا ہے تو ہم نے دیس اور قوم کو "قومی لوری" دی ہے، جس کو گا کر ہندستان کی ہر عورت، بلا تفریق مذہب وملت، بچوں کو سلا سکتی ہے۔ یہ لوری اصل میں تری اور سو فیصد مذہبی ہے، جس کو راشٹر بھاشا سمیلن بسواپی آکمتور ۱۹۷۲ء کے "عوض"، میں بھیجوایا تھا۔ ایک "قومی لوری"، کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ہم نے اسلامی ناموں کی بجائے ہندستان کے بڑے لیڈروں کے نام دیے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے دو صفحے کا تفصیلی نوٹ لکھا تھا، لیکن اداریہ میں گنجائش نہ ہونے کے سبب وہ نوٹ رد کر دیا۔ لکھنے والے مزید معلومات بہم پہونچا دیں گے۔ یہ "قومی لوری" اس مذکر کے صفحہ ۳۲ کالم ۲ پر

جی آرنلڈ فرنانڈز ترجمہ جی۔ ام خان ام اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

شہزادی کا رومان

رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA

تیسری قسط

باب (۹)

تقریباً شام کے ۷ بجے کا وقت تھا، اندھیرا ہو گیا تھا، اور چراغ سنگ چکے تھے۔ دیوڑی کے دوسرے ملازمین نے رحیم النسا کے کمرے کے چراغ سلگا دیے تھے، اور دو ایک جوان لڑکیاں کمرے میں موجود تھیں، اور رحیم النسا بیانو بجانے میں مصروف تھی۔ ایسے میں دو عورتوں ماما جی صاحبزادی کے قریب گئیں، اور جھک کر آداب بجا لائیں۔ بیانو بجانا بند کر کے رحیم النسا نے ماما جی کی طرف پلٹ کر دیکھا، اور ہر ایک دونوں آ گئیں! ہاں ہاں شہزادی صاحبہ ہم دونوں آ گئی ہیں۔ انہیں جھروکے کی طرف چل کر بیٹھیں، یہ کہتے ہوئے رحیم النسا آگے آگے اور وہ دونوں ماما جی پیچھے چلتی رہیں۔ اس کے بعد رحیم النسا کورچ پر ٹیکا دے کر بیٹھ گئی، اور دونوں ماما جیں نیچے بیٹھیں، اور بڑی ماما جی کا سر اور بات کورچ پر ٹکا ہوا تھا، اور چھوٹی ماما جی اس کے بازو بیٹھی تھی۔ اس کے بعد رحیم النسا نے بڑی ماما جی سے دریافت کیا، "تمہاری واپسی میں اتنی دیر کیوں ہوئی آپ جانتی نہیں شہزادی پر پولیس والے بڑے خراب آدمی ہوتے ہیں، بغیر مزدوری سوالات کر کے اپنا اور دوسروں کا قیمتی وقت خراب کرتے ہیں۔ ان کے پنجے سے نجات ملتے ہی ہم دونوں سیدھے دیوڑی آ گئیں۔

ہاں ماما جی، میں نے سنا ہے کہ یہ تو بیس والا بڑا ہی ظالم ہوتا ہے، اس نے دونوں کو

فلم وزیادتی بھی کرلیتے ہیں۔ جی ہاں سرکار آپ سچ کہتی ہیں، یہ ظالم پولیس والے تو ہم جیسے غریبوں پر تو بہت ہی ظلم ڈھاتے ہیں، بڑی ماماجی نے شہزادی کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد بڑی ماماجی نے شہزادی سے کہا، بادشاہ پرسوں جو عورت آئی تھی، آج پھر سے آئی ہے۔ افضل خان سرکار نے آپ کے لیے مٹھائی کا تحفہ بھجوایا ہے۔ گاڑی میں رکھ کر تین کشتیاں لائی ہے۔ انہیں نے کہا نہیں، ہم نہیں بادشاہ بیٹھے رہو، ہماری شہزادی کی اجازت لے کر آتا ہوں، اگر سرکار آپ اجازت دیں تو ہم دونوں باہر جا اس عورت کے ساتھ مٹھائی کی تینوں کشتیاں اٹھا لے آئیں گے۔ افضل خان کا نام سن کر رضیہ النسا کے پژمردہ چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی، اور انہوں نے اچھل کر بڑے پر صدیق ہو گئی کہا اور ماماجی سے کہا، ماں کی آپ ماماجی آپ نے کہا افضل خان نے میرے لیے مٹھائی کا تحفہ بھجوایا ہے۔ اس پر بڑی ماماجی نے بھی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، جی ہاں، سرکار آپ کے لیے یہ تحفہ بھجوایا ہے۔ اچھا تو باہر جاؤ اور رضیہ النسا نے خوشی سے اجازت دی، اور اس عورت کے ساتھ وہ تینوں کشتیاں مٹھائی کی لے لینے آ گئے۔ اجازت پاتے ہی دونوں [illegible] کرنے باہر گئیں، اور اس عورت کے ساتھ مٹھائی کی تینوں کشتیاں سروں پر رکھ کر اندر لے آئیں، جیسے ہی مٹھائی کی کشتیاں نظر آئیں، رضیہ النسا کی خوشی اور مسرت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ تینوں عورتیں رضیہ النسا کے سامنے کھڑی ہو گئیں، اور ہی عورت نے جھک کر شہزادی کو آداب کیا اور کہا، ہمارے سرکار نواب افضل خان بہادر نے ان تین کشتیوں میں مٹھائی کا تحفہ آپ کے لیے بھیجا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہلوایا ہے کہ میں [illegible] خاص تازہ میں شاہی حلوائی سے یہ مٹھائی [illegible] لیے آپ [illegible] ہیں، اور [illegible] ہی کھائیں۔ اس کر کھائیں تو یہ خراب نہ ہو گی، اور نہ ہی اس کا مزا بدلے گا، یہ کہتے ہوئے تینوں نے کشتیاں ایک خالی میز پر رکھ دیں، اور خدمتیہ میں بیٹھ گئیں۔ ہاں! میری اچھی عورت تم جب تصویر لے آئی تھیں، اس وقت بھی میری نظروں میں تمہاری قدر و منزلت تھی، اور آج جب کہ مٹھائی کا یہ نادر تحفہ لے آئی ہو، اس وقت بھی میں تمہیں بڑی ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھتی ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے سرکار کو میرا بہت کچھ خیال ہو گا۔ یہ سن کر اس مصنوعی عورت نے اپنے دہنے ہاتھ کی پہلی انگلی اپنے سیدھے گال پر رکھتے ہوئے ایک خاص انداز میں کہا، اوئی میری شہزادی بادشاہ کیا باتوں کہ جب سے ہمارے سرکار نے آپ کو پہلی بار لاکر میں دیکھا ہے، بس دیوانے ہو گئے ہیں، اور رات دن آپ ہی کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں۔ نہ انہیں کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی پینا۔ نہ سیر و تفریح ہی کو جاتے ہیں، اور نہ کسی بھی تقریب میں۔ آپ ہیں کہ ایسے گھر میں آپ ہی کی طرح کنیزیں دیکھتے رہتے ہیں، یا پالکو کا باجا بجاتے رہتے ہیں۔ سرکار تو بڑی مٹھائی اس وقت اگر آپ اس لونڈی باندی کے سامنے کھا لیں تو پھر میں اپنے سرکار سے کہہ سکوں گی کہ آپ کا بھیجا ہوا تحفہ شہزادی بادشاہ کو بہت پسند آیا، اور انہوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ بڑی ماماجی اور چھوٹی ماماجی نے اس کی تائید کی تو رضیہ النسا اٹھ کر اس میز کی طرف گئی۔ ان تینوں کشتیوں پر سے سرپوش ہٹا دیے گئے۔ کشتیوں میں علاحدہ علاحدہ کے خانوں میں ہر قسم کی مٹھائی الگ الگ رکھی تھی۔ اس کو دیکھ کر رضیہ النسا بیحد خوش ہو گئی اور ان بڑی ماماجی کو حکم دیا کہ سامنے کی الماری سے ایک عالی دان بھجوا کر اور چاندی کا چمچا لے آئے۔ اس پلیٹ کے آنے پر [illegible] مٹھائی [illegible] اس میں سے یہ [illegible] اس نے [illegible] اس [illegible] اس [illegible] اس

میں رکھ دیا۔ رحیم النسا نے وہ پلیٹ اپنے ہاتھ میں لی اور پھر اسے مٹھائی کھانی شروع کر دی اور تعریف پر تعریف کرنے لگی کہ واقعی یہ مٹھائی تو لے حد لذیذ ہے۔ اس کے بعد اس نے بڑی ماما جی سے مخاطب ہو کر کہا، ماما جی، مٹھائی تو بہت زیادہ ہے، میں اتنی ساری مٹھائی کیسے کھا سکتی ہوں، تم ہماری پلیٹ میں لے آؤ کہ تم تینوں بھی میرے ساتھ مٹھائی کھاؤ تو مجھے بھی خوشی ہو گی۔ یہ سن کر بڑی ماما جی نے جواب دیا، شہزادی پاشا ہم کسی کی ڈیوڑھی کے ملازم نہیں ہیں۔ ہمارے سرکار تو اب آسمان جاہ بہادر کی ڈیوڑھی کے ملازم ہیں اور ان کی صاحبزادی صاحبہ کی خدمت میں ہر وقت گھنٹے رہتے ہیں، اس لیے ہمیں ہر وقت ریچ نہ کھانے کے لیے مل ہی جاتا ہے۔ یہ مٹھائی تو چونکہ افضل خان سرکار نے خاص طور پر آپ کے لیے بھجوائی ہے، اس لیے اس کی حقدار آپ ہی ہیں۔ میں تو یہ عرض کرتی ہوں کہ آپ یہ مٹھائی بڑے سرکار کے لیے نہ بھجوائیں۔ سرکار پوچھ بیٹھیں گے کہ یہ مٹھائی کہاں سے آئی ہے تو پھر آپ کے اور ہم سب کے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ مٹھائی کھا لے، ہوئے رحیم النسا نے کہا، ماما جی، پانی لے آؤ۔ یہ سن کر بڑی ماما جی اٹھ کر گئے اور سامنے کے چبوترے پر رکھے ہوئے مٹکے سے کٹورے گلاس میں پانی لا کر پیش کیا۔ پانی کا گلاس لے کر رحیم النسا نے پانی پی ڈالا اور گلاس اس طشتری پر رکھ دیا۔ پلیٹ کی مٹھائی ختم ہوتے ہی صاحبزادی نے کہا کہ ماما جی آج رات میں آپ نے معمول کا کھانا نہیں کھانا ہے بلکہ اسی مٹھائی پر اکتفا کرنی ہے، اس لیے کہ یہ مٹھائی میرے جہیز کی بھی ہوئی ہے لے آؤ اور مٹھائی دو۔ اس پلیٹ میں۔ پلیٹ لے کر بڑی ماما جی غور ہی کشتی کی طرف گئی اور پلیٹ بھر مٹھائی لا کر رحیم النسا کے سامنے پیش کی۔ اس کے بعد رحیم النسا نے باتیں کرتے ہوئے ساری مٹھائی کھا ڈالی۔ اس کے کچھ دیر بعد اس پر غشی طاری ہو گئی۔ پلیٹ غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

دونوں ماما جی سخت پریشان ہو گئیں اور تھوڑی بعد صاحبزادی کے مونہہ سے کف جاری ہو گیا، اور اس کے سر خ اور سپید چہرے پر نیلگونی آ گئی، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس کی حالت غیر سے غیر تر ہوتی گئی اور وہ بلکل اسی حرکت کوچ پر پڑی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر اس مصنوعی عورت نے اپنی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ اور یہ دونوں ماما جی، ہائے میری شہزادی، ہائے میری شہزادی کہتے ہوئے رونے چلانے لگیں، جس پر اس تیسری مصنوعی عورت یعنی عبدالقادر نے بڑی طرح ان دونوں کو ڈانٹ پلائی کہ خبردار ایک لفظ بھی زبان سے نکالا، تم دونوں کو یہیں ختم کر دوں گا۔ چلو اور چلے چلیں۔ اس کو اسی حالت میں مرنے کے لیے چھوڑ دو اور وہ کشتیاں لے کر ہم تینوں یہاں سے رفو چکر ہو جائیں گے، اور یہ باقی مٹھائی کنوئیں میں پھینک دیں گے۔ ورنہ باہر پھینک دیں تو جو بھی کھائے گا مر جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ تینوں کشتیاں لے کر باہر چلے گئے اور اس سے پہلے مٹھائی کھائی پلیٹ اور چمچا وغیرہ سامنے کے میز پر رکھ دیا تاکہ کسی کو شبہ تک نہ ہو کہ صاحبزادی مٹھائی کھائی تھی۔

آسمان جاہ روزانہ تڑکے اٹھتے ہی چائے پینے کے بعد حقہ پیا کرتے تھے، اور آج بھی حسب عادت چائے پینے کے بعد حقہ پی رہے تھے، اور ایک ملازم پنکھا جھل رہا تھا، اور دوسرا چائے کا سامان اٹھا رہا تھا، اتنے میں وہ دونوں ماما جیاں داخل ہوئیں، اور آسمان جاہ کے سامنے ادب سے آداب بجا لایا۔ اس پر آسمان جاہ نے کہا، کیا بات ہے۔ جی ہاں سرکار، بڑی ماما جی نے کہا، پولیس والے بڑے ہی ظالم ہوتے ہیں۔ ہمارے یہ کہنے کے باوجود کہ سرکار کی ڈیوڑھی کے ملازم ہیں کل دن بھر اندر رات بھر بٹھانے میں بٹھائے رکھا اور اب صبح ۶ بجے جانے کی اجازت دی تو دونوں سب سے پہلے سرکار کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اپنے آنے کی اطلاع کر دیں۔ تم دونوں ابھی صاحبزادی کے ہاں آ جاؤ۔ آسمان جاہ نے یہ کہا جس پر بڑی ماما جی

تو ہم دونوں ضروریات سے فارغ ہو کر کھانے کے بعد شہزادی صاحبا کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے انھیں جانے کی اجازت دیدی، اور سامنے کے ایک ملازم سے کہا کہ عبدالقادر کو بلا لاؤ، صاحبزادی کے ہاں بھجوا کر کیفیت منگوانی ہے۔ یہ سنتے ہی وہ ملازم عبدالقادر کے کمرے میں گیا۔ اس وقت عبدالقادر لیٹا ہوا تھا، ملازم سے سرکار کا پیام سن کر بیان کیا کہ سرکار سے میری طرف سے معذرت چاہنا اور یہ کہنا کہ کل رات سے مجھکو بخار بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ میں اس کمرے میں تنہا رہتا ہوں۔ بیماری کے باوجود میرا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ یہ سن کر ملازم دوڑے دوڑے آسمان جاہ کے حضور میں آن کر بات جوڑ کر سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے کہا۔ خیر میں خود ہی صاحبزادی کے ہاں جاتا ہوں، اس لیے کہ کل سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ یہ کہتے ہوئے بات سے مجلے کا نیچا رکھ دیا اور اپنی آڑ کی کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

آسمان جاہ جب پہنچے ہیں، رحیم النسا کے کمرے کا دروازا ادھ کھلا تھا۔ آسمان جاہ نے دروازے پر سے آہستہ آہستہ مارا۔ کوئی آواز نہ پا کر انہوں نے باپ کی محبت کے انداز میں دھیرے دھیرے کہا، میری بیٹی، میں تمہارا پیارا باپ ہوں، کہو میں اندر آسکتا ہوں۔ اس کے بعد بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ میری لڑکی کیا تم ابھی سو رہی ہو یا کسی کام میں مصروف ہو، تمہارا پیارا باپ تم سے ملنے آیا ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی جواب نہیں پایا۔ تب پریشانی کی حالت میں آسمان جاہ نے دروازا کھولا اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی عزیز از جان لڑکی رحیم النسا کوچ پر بری حالت میں لیٹی ہوئی ہے۔ قریب جاتے ہی میری لڑکی میری اچھی لڑکی کہتے ہوئے آسمان جاہ نے دیوانا وار رحیم النسا کے ہاتوں کو اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا، اور سر پیشانی اور سارے جسم کا تمیز لیتے ہوئے کہا کہ [illegible]

ہے، اور اس کے منہ سے یہ جھاگ کیوں بہہ رہا ہے۔ وہ زندا ہے یا مردا۔ یا خدا رحم کر رحم، میری بیٹی کا سارا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔ یہ کہتے ہوئے آسمان نے زور سے للکارا۔ ارے کوئی ہے، اس آواز پر دیوڑھی کے کئی ایک ملازم دوڑتے دوڑے چلے آئے۔ آسمان جاہ نے کہا، ارے دیکھو، جلد ڈاکٹر کو میری لڑکی کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ بلک بلک کر روتے ہوئے آسمان خاں نے کہا کہ کہیں میری عزیز بیٹی مر تو نہیں گئی یا خدا ایسا نہ ہو، تو رحم کر رحم کر اس ضعیف انسان پر۔ یہ میری ایک ہی جیتی لڑکی ہے یا پروردگار۔ ان ملازمین میں سے ایک معمر عورت نے جسم کو ہاتھ لگا کر دیکھا اور پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، سرکار شہزادی کی حالت خطرناک معلوم ہے، فوراً لیڈی ڈاکٹر بلوایا جائے تو مناسب ہے۔ اس پر آسمان جاہ نے ملازمین سے کہا جاؤ دوڑ فوراً لیڈی ڈاکٹر کو لے آؤ، مگر میں تو یہ منظر نہیں دیکھ سکتا کہتے ہوئے، اور روتے ہوئے وہ اپنے دیوان خانے میں چلے گئے اور باقی سب ملازم یہاں ہڑبڑے رہے۔

باب (۱۰)

اس وقت تک شہزادی کی پیشی کی دونوں ماماجی بھی آچکی تھیں، اس لیے ان میں سے بڑی ماماجی نے کہا، تم سب لوگ یہیں ٹھہرے رہو، شہزادی کو چھوڑ کر نہیں جانا۔ میں لیڈی ڈاکٹر صاحب کے گھر کی میں بیٹھ کر جاتی ہوں اور ابھی فوراً یہاں لے آتی ہوں۔ یہ لیڈی ڈاکٹر مس کرک پیٹرک تھی، جو قریب ایک سال سے دیوڑھی میں علاج معالجے کے لیے آیا جایا کرتی تھی، چنانچہ بڑی ماماجی دیوڑھی سے باہر کی جانے میں گئیں اور دربان سے کہا کہ ہماری شہزادی لے ہوش ہو گئی ہے۔ تم گلی میں محکو لیڈی ڈاکٹر کے گھر لے چلو، میں ابھی یہاں فوراً لے آؤں گی، تاکہ ہماری شہزادی کا علاج کرنے سے اس کی جان [illegible]

کے گھر کی طرف روانا ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں لیڈی ڈاکٹر کے گھر پہنچ گئی، اور دوڑتے دوڑتے روتے ہوئے بڑی ماما جی لیڈی ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوکر۔ ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب! جلدی چلیے، ہماری شہزادی کی حالت بہت خراب ہے، سرکار آسمان جاہ بہادر نے آپ کو جلد آنے کے لیے کہا ہے۔ یہ سن کر مس کرک پیٹرک نے ماما جی سے دریافت کیا، کون شہزادی، صاحبزادی رحیم النسا، جی ہاں ڈاکٹر صاحب، ماما جی نے جواب دیا، آپ کی صاحبزادی سخت بیمار ہوگئی ہے۔ اس پر ڈاکٹر نے معلوم کیا، کب سے بیمار ہے، اور بیماری کیا ہے۔ ماما جی نے جواب دیا، ڈاکٹر صاحب رات بھر بے ہوش رہیں اور اب تک بھی بے ہوش ہیں، ان کا گورا گورا جسم نیلگوں ہوگیا ہے، اور منھ سے کف بہہ رہا ہے، ڈاکٹر صاحب لوگوں کو شبہ ہے کہ، ہمارے حسین اور خوبصورت شہزادی کو زہر دے دیا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی لیڈی ڈاکٹر ایک دوسرے کمرے میں گئی اور اپنا ہینڈ بیگ اور دوائیں وغیرا لے کر ماما جی کے ساتھ بگی میں سوار ہوکر آسمان جاہ کی دیوڑھی پہنچ گئیں۔ یہاں پر سب ملازم دیوڑھی اسی حالت میں بیٹھے رو رہے تھے، کوئی افسوس ظاہر کرتا، تو کوئی ہائے، وائے کے نعرے لگاتا، کوئی کرتا تو کوئی، ہائے میری شہزادی کہتے ہوئے کف افسوس ملتا۔

ایسے میں لیڈی ڈاکٹر کرک پیٹرک اور بڑی ماما جی ہینڈ بیگ اور دواؤں کا کیس لیے ہوئے رحیم النسا کے کمرے میں داخل ہوئے۔ لیڈی ڈاکٹر کے آنے سے پہلے آسمان جاہ اپنے دیوان خانے سے اٹھ کر یہاں آکر اپنی لڑکی کے کوچ کے بازو ایک آرام کرسی پر سخت حیران اور پریشان اور مغموم حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرک پیٹرک کے آنے کے بعد انہوں نے اٹھ کر اس کا استقبال بھی نہیں کیا، بلکہ اپنی بیمار لڑکی کی طرف بات بتاتے ہوئے آنکھ مالیسانا انداز میں کہا، دیکھو ڈاکٹر تمہاری دوست صاحبزادی کس بری حالت میں پڑی ہے۔ ڈاکٹر نے بیگ نیچے رکھ کر رحیم النسا کے کوچ پر انا دھنا گھٹنا ٹیک دیا اور دونوں ہاتھ سے مریضہ کی دونوں آنکھیں کھول کر بار بار دیکھا، اور آسمان جاہ کی طرف ملتفت ہوکر کہا، نواب صاحب! کیس بہت ہی خطرناک یا SERIOUS ہے، مجھکو تو زہر کا شبہ ہوتا ہے۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے روتے ہوئے کہا، ڈاکٹر ڈاکٹر بچاؤ، میری عزیز از جان بچی کو بچاؤ۔ نہیں معلوم کس ظالم نے میری معصوم بھولی بھالی لڑکی کو زہر کھلا دیا ہے۔ ڈاکٹر کرک پیٹرک اس بڑے کے حال پر بہت رحم کرکے، اور تم سے جو کچھ بھی ہوسکتا ہے، اس اکلوتی لڑکی کے بچانے میں اپنی تمام تر مہارت صلاحیتیں خرچ کردو۔ ڈاکٹر میں تم کو روپے پیسے اور زر و جواہرات سے مالا مال کردوں گا۔ میں تم سے اپنی معصوم بچی کی بھیک مانگتا ہوں ڈاکٹر۔

یہ سن کر کرک پیٹرک نے کہا، گھبراؤ نہیں نواب صاحب! ہمت سے کام لو، مجکو جیسے کا لالچ نہیں ہے، آپ مجکو چاہیں دیں یا نہ دیں، مگر میں اس لڑکی کی جان بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ جب سے میں نے آپ کے محل میں آنا جانا شروع کیا ہے، خدا مجکو اس خوبصورت اور معصوم لڑکی سے محبت سی ہوگئی ہے، اور میرے اس کے بلکل ہی دوستانا تعلقات ہیں، اس لیے بھی میں اس کی قیمتی اور عزیز جان بچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گی، کہتے ہوئے کرک پیٹرک نے دواؤں کا بیگ کھولا، دوا پلائی اور انجکشن بھی دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے آسمان جاہ سے کہا، نواب صاحب! میرا اندازا ہے کہ کسی نے صاحبزادی کو افیون کھلا دی ہے۔ یہ پورے علامات افیون کے زہر کے ہیں، اپنے وطن انگلستان میں بھی میں نے ایسے کئی کیسس CASES ٹھیک کیے ہیں، اس لیے مجکو یقین ہے کہ اس کیس میں بھی مجکو کامیابی ہوگی۔ میں اب یہاں سے نہیں جاؤں گی، رات بھر جاگتی رہوں گی، اور وقفے وقفے سے دوا اور انجکشن دیتی رہوں گی۔ آپ کو میرا مشورا ہے کہ آپ اپنے دیوان خانے میں تشریف رکھیں۔ صرف یہ دو مامائیں، جو ہر وقت صاحبزادی کی خدمت سے رہتی ہیں، میرے ساتھ رہیں گی۔

اس کے علاوہ اگر ضرورت محسوس ہو تو میں ایک آدھ اور بھی عورت کو بلوالوں گی۔ آپ جس وقت چاہیں آن کر اپنی لڑکی کو دیکھ سکتے ہیں یا میں آن ماماؤں کے ذریعے کھنٹے کھنٹے کے وقفے سے مزاج کی کیفیت معلوم کراتی رہوں گی۔ یہ سن کر آسمان جاہ جانے کے لیے اٹھے اور اٹھتے ہی سامنے کھڑی عورتوں اور ملازمین سے کہا، سنو! کہتے ہی سب ملازم ہاتھ جوڑ کر سامنے حاضر ہوئے اور جو حکم کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ آسمان جاہ نے کہا، ڈاکٹر صاحب، یہاں رات بھر یا کل دن میں بھی رہیں گے، اسی لیے ان کے کھانے، اور چائے، شربت وغیرا کا پورا پورا انتظام ہونا چاہیے۔ لائبریری سے انگریزی کتابیں اور میگزین بھی لاکر رکھ دو، اور ڈاکٹر صاحب کے بیٹھنے اور لیٹنے کا بھی کافی انتظام کر دیا جائے، تاکہ ڈاکٹر صاحب کسی بھی قسم کی تکلیف محسوس نہ کریں۔ سب ملازمین نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی، جو حکم سرکار! آپ اطمینان رکھیں، سرکار کے ایک ایک لفظ کی تعمیل کی جائے گی اور ڈاکٹر صاحب کو ذرا برابر بھی تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ یہ سن کر آسمان جاہ اپنے دیوان خانے کی طرف چلے گئے۔ آسمان جاہ کے جانے کے بعد فوراً ہی دو تین ملازم عورتیں دو بڑی کشتیوں میں چائے، کیک پیسٹری، بسکٹ، پلم کیک اور سینڈوچیز وغیرا لے کر آئیں۔ اس کے بعد ایک چھوٹے خوبصورت میز پر یہ سارا سامان جما دیا گیا۔ کرک پیٹرک نے ہاتھ دم سے فارغ ہو کر منھ ہاتھ دھویا اور ایک قیمتی تولیہ سے منھ پونچھتے ہوئے آن کر میز کے کرسی پر بیٹھ گئی، اور دو تین کپ کافی کے ساتھ اپنی من بھائی چیزیں کھا پی، اور اسی کے بعد ان دونوں ماماؤں سے کہا کہ تم دونوں بھی چائے پی لو، مگر یہاں سے میری اجازت کے بغیر باہر نہیں جانا۔ کرک پیٹرک کو فرج کے بازو ایک آرام کرسی پر لیٹ کر انگریزی کتاب دیکھ رہی تھی اور دونوں ماما چائے پی رہی تھیں۔ مغرب کے بعد ڈاکٹر نے حریض کو پیر سے انجکشن دیا۔ اور بڑی ماما سے کہا، ماما، تم جاؤ اور دیکھو کہ ڈیوڑھی کی ڈسپنسری کھلی ہے، اور کمپونڈر بھی موجود ہے یا نہیں۔ یہ سنتے ہی بڑی ماما فوراً گئی اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آکر کہا کہ ہاں ڈاکٹر صاحب دواخانا کھلا ہے، اور کمپونڈر بھی موجود ہے۔ یہ سنتے ہی اس ماما کے ساتھ خدا کرک پیٹرک ڈسپنسری پہنچ گئی اور وہاں سے بعض ضروری آلات اور دوائیں اور انجکشن وغیرا لے آئی۔ ان دونوں ماماؤں کی مدد سے ڈاکٹر مریض کے پیٹ میں موتھ سے پمپ کرنا شروع کیا۔ اس کو ڈاکٹری اصطلاح میں STOMACH PUMP کہتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکی کو دو تین بار الٹا یا لٹایا، پھر سے مریض کو کرسی پر تکیے کا ٹیکا دے کر بٹھا دیا اور اپنے دونوں ہاتھ سے پیشانی، چہرے، گالوں اور پیٹ وغیرا پر مساج مالش کرنے لگی، تاکہ اعضاء کا زہریلی مادہ جسم میں جم نہ جائے، پیروں پر بھی یہی عمل جاری رہا۔ اس کے بعد ربر کی تھیلی میں گرم پانی بھر کر سارے جسم پر سینکا دیا گیا، الٹے لٹا کر پیٹھ اور پیروں پر بھی یہی عمل کیا۔

جب ڈاکٹر کا یہ عمل ہو رہا تھا، آسمان جاہ خود ہی لڑکی کو دیکھنے کی غرض سے چلے آئے، اور لیڈی ڈاکٹر سے انگریزی میں بات چیت کی، اس پر ڈاکٹر نے آسمان جاہ کو سمجھایا کہ افیون کا زہر نسوں، رگوں اور پٹھوں وغیرا میں بری طرح سے جم جاتا ہے اس لیے جسم کے سارے اعضاء معطل اور بے کار ہو جاتے ہیں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ مسلسل مالش اعضاء میں گرمی پیدا کی جائے اور گرم پانی کی تھیلی کا استعمال کیا جائے تو زہر جمنے نہیں پاتا اور اپنا اثر زائل کر دیتا ہے۔ اس نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ فکر نہ کریں، ڈنر کھانے کے بعد وہ گالوانک کرنٹ GALVANIC CURRENT کا مریض پر عمل کرے گی، جس سے بہت جلد مریض بے قابو پا لیا جائے گا۔ اور نواب صاحب کو یقین دلایا وہ کسی قسم کا اندیشہ یا فکر نہ کریں، بلکہ اپنے دیوان خانے میں جاکر رات کا کھانا کھائیں اور آرام فرمائیں

ڈاکٹر صاحب کو ڈائننگ ہال لے جاؤ تاکہ وہ رات کا کھانا کھالیں یہ کہتے ہوئے آسمان جاہ چلے گئے، اور ادھر کرک پیٹرک نے دونوں ماماؤں کو مریض کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر ایک تیمرے ملازم کے ساتھ ڈائننگ ہال چلی گئی۔

ڈنر سے فارغ ہو کر کرک پیٹرک پھر سے رحیم النسا کے کمرے میں چلی آئی، اور رات دیر تک انگریزی کتاب دیکھتی، اس کے تھوڑی دیر بعد ایک عورت ایک خوبصورت کشتی میں تیار کافی لے آئی۔ کرک پیٹرک نے کافی پی، اور اس کے بعد پھر سے مریض کی طرف رجوع ہو گئی۔ اب کی دفعہ اس نے گال وانالک کرنٹ کا استعمال کیا۔ اس کرنٹ کے مسلسل اور لمبے دورانیے استعمال سے مریض نے خفیف حرکت کرنا شروع کر دی، یعنی وہ رحیم النسا جو اب تک بلکل بے حس و حرکت تھی، خفیف الٹا پلٹنا شروع کر دی۔ مریض کی یہ حرکتیں دیکھ کر ڈاکٹر کی باچھیں کھل گئیں کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اگر مریض نے حرکت کی تو اس کی جان بچ جائے گی، اور وہ مریض جو گھنٹوں سے لکڑی کے تختے کی طرح پڑی ہوئی تھی، اب ربر کے گولے کی طرح حرکتیں کر رہی ہے۔ جیسے جیسے ڈاکٹر نے گال وانالک کرنٹ کا استعمال تیز سے تیز تر کر دیا، اسی رفتار سے رحیم النسا کے مردہ اعضاء حرکت میں آنے لگے، اور ساتھ ہی ڈاکٹر اور دونوں ماماجی اور دوسری ملازم عورتوں کے چہروں پر خوشی اور مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اب اپنی کامیابی سے پھولے نہ سما کر لیڈی ڈاکٹر نے ایک اور ترکیب یہ سوچی کہ مریض کے اعصاب میں ارتعاش پیدا کرنے کے لیے دونوں ماماؤں سے رحیم النسا کے دونوں کانوں میں "صاحبزادی، صاحبزادی، شہزادی شہزادی، سنیے میں آپ کی ماما ہوں، اٹھیے شہزادی اٹھ کر بیٹھیے، اور آنکھیں کھول کر میری طرف ذرا دیکھیے تو سہی" وغیرہ کے نعرے لگوانے شروع کر دیے۔ یہ آوازیں سن کر رحیم النسا نے بے چینی کا اظہار شروع کر دیا اور جلد جلد ادھر ادھر الٹنے پلٹنے لگی۔ مریض کے اس غیر متوقع عمل سے ڈاکٹر اور ماماؤں کی خوشی اور بھی بڑھ گئی۔ رات کے تقریباً ایک بجے، جب کرک ڈاکٹر کرک پیٹرک کافی پی رہی تھی، بڑی ماما جی نے رحیم النسا کے کان میں "شہزادی، میری شہزادی، اٹھو میری پیاری شہزادی" کے نعرے لگائے تو کروٹ لیتے ہوئے رحیم النسا نے ہاں ماما جی کہا۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر خوشی سے اچھل پڑیں، اور دونوں ماما جی سے کہا "پھر سے پکارو" اور ان کے پکارنے پر مریض نے ہاں ماما جی، ہاں ماما جی کہتے ہوئے دو بار جواب دیا۔ ڈاکٹر نے ایک سانس کھڑی خادمہ سے کہا "جاؤ اور فوراً دو کپ علاالدرجے کی کافی تیار کر کے اسی وقت لے آؤ" اور خود مریض کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں کشتی میں علاالدرجے کی کافی تیار ہو کر آ گئی۔ ڈاکٹر نے دونوں ماماؤں سے کہا کہ رحیم النسا کو تکیے سے بٹھاؤ اور کان میں شہزادی، شہزادی، اٹھو، کافی پیو کے نعرے لگاؤ، چنانچہ دونوں ماماؤں نے دونوں کانوں میں اسی قسم کے نعرے لگائے اور رحیم النسا نے ہاں ماما جی، اچھا ماما جی کہتے ہوئے منہ کھولا، جس پر خود ڈاکٹر نے مریض کو گرم گرم کافی پلائی، اور مریض نے آنکھیں بند کیے ہوئے پورا کپ کافی پی لی، اس کے بعد ڈاکٹر نے مریض کو اسی طرح ایک اور کپ گرم گرم کافی پلائی اور مریض نے خود سے دوسرا کپ کافی بھی پی لی۔ دو کپ گرم گرم کافی نے مریض رحیم النسا کو سانس لینے، اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں کھلتے ہی ڈاکٹر اور ماماؤں کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور ساتھ ہی بڑی ماما جی نے کہا، "میری پیاری شہزادی دیکھو، میں آپ لونڈی کی باندی بڑی ماما جی ہوں، بولو تم مجھ سے باتیں کرو، خاموش کیوں ہو گئیں۔ یہ سن کر رحیم النسا نے صرف اتنا جواب دیا۔ ہاں ماما جی، اور یہ مختصر سا جواب بھی ڈاکٹر کی کامیابی پر تھا۔ ڈاکٹر نے دونوں سے تاکید کی کہ تم دونوں مسلسل بیچ بیچ میں باتیں کرتی رہنا، صاحبزادی کو سونے نہ دو، میں تمہارے آسمان جاہ بہادر کو یہ خوش خبری سنا کر فوراً ہی واپس آتی ہوں۔

لیڈی ڈاکٹر آسمان جاہ کے دیوان خانے پر گئی، دروازے پر جو دربان تھا، اس سے دریافت

کی، اسی وقت نواب صاحب کیا کر رہے ہیں، اس نے لاعلمی ظاہر کی کہ میں اندر نہیں جا سکتا، اندر جانے والی ایک خادمہ کو بلوا کر دریافت کرتا ہوں، چنانچہ اس نے آواز دے کر ایک عورت کو بلوایا، اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب سرکار سے ملنا چاہتے، اس وقت سرکار کیا کر رہے ہیں، اس نے کہا کہ سرکار آج رات سوئے نہیں ہیں، میں جا کر اطلاع کرتی ہوں، چنانچہ وہ عورت اندر گئی اور سرکار سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ سرکار نے اجازت دی کہ انھیں یہاں بلا لاؤ، اور وہ عورت باہر آئی اور ڈاکٹر سے کہا کہ سرکار نے آپ کو اندر آنے کے لیے کہا ہے۔ یہ سنتے ہی کرک پیرٹک گئی۔ اس وقت آسمان جاہ بہادر ایک انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف، ڈاکٹر کے جاتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور بات ملا کر قریب کے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد دونوں میں انگریزی میں بات چیت رہی۔

اوپر جو کچھ گزرا ہے، ڈاکٹر نے ایک ایک لفظ کی تفصیل کہہ سنائی، اور جب ڈاکٹر نے یہ کہا کہ مریض نے ماماؤں کا جواب دیا، اور ڈاکٹر کے بات سے دو کپ کافی پی لی، تو آسمان جاہ کی خفگی اور مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، بار بار ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آسمان جاہ نے اعتراف کیا کہ واقعی میری مردانہ لڑکی کے لیے جس وجہ کی قالب میں آپ نے واقعی جان ڈال دی جس کے لیے میں عمر بھر آپ کا احسان مانوں گا، اور ڈاکٹر یقین جانو کہ اس صلے میں میں آپ کو مالا مال کر دوں گا۔ اس کے بعد آسمان جاہ نے کہا کہ ڈاکٹر اگر آپ مناسب سمجھیں تو آپ کے ساتھ چل کر اپنی لڑکی کو ایک نظر دیکھ لوں۔ اس پر کرک پیرٹک نے جواب دیا، نہیں نواب صاحب رات بہت گئی ہے، اور کل صبح سویرے میں خود ہی آپ سے ملنے کی بات چیت کر دوں گا۔ اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک صحت یابی ہو گئی ہے، لیکن جو کسر باقی رہ گئی ہے، میں اس کا تکملہ بھی کر نا چاہتا ہوں۔ اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ [illegible]

رحیم النسا کے کمرے میں چلی آئی۔ آتے ہی ماما جی سے دریافت کیا کہ اب کیا کیفیت ہے، تو اس نے جواب دیا، ڈاکٹر صاحب شہزادی ہماری ہر بات کا جواب دے رہی ہیں، اور کبھی کبھار آنکھیں کھول کر دیکھتی اور پھر کسے بند کر لیتی ہیں، اور ہاں ماما جی، ہاں ماما جی ضرور کہتی ہیں، ان پر ابھی تک غنودگی سی طاری ہے۔ یہ کہتے ہوئے ماما جی نے کہا، ڈاکٹر صاحب اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ آپ رات بھر کی جاگی ہوئی ہیں، تھوڑی دیر اس الگ کمرے میں آرام فرمائیے۔ آپ کے بستر کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا گیا ہے، ہم دونوں ماما جی باقی رات تک جاگتی رہیں گی۔ اس پر ڈاکٹر نے کہا، نہیں ماما جی، ڈاکٹر کا یہ کام نہیں ہے کہ مریض کو ایسی خطرناک حالت میں چھوڑ کر سو جائے۔ ہمارے پیشے کے فرائض منصبی میں یہ ہے کہ ہم مریض کے علاج کے وقت اپنے حسن و آرام کو اپنے پر حرام کر دیں، ورنا وہ ڈاکٹر، ڈاکٹر نہیں جو رحیم النسا جیسی خطرناک مریضہ کو اس بری حالت میں چھوڑ کر نیند کے مزے لیتا رہے۔ ماما جی، بلکہ میرا تو یہ کہنا ہے کہ آپ میں سے ایک ماما جی تھوڑی دیر آرام کریں اور میں اور دوسری ماما جی جاگتے رہیں گے۔ یہ سن کر ماما جی نے کہا، نہیں ڈاکٹر صاحب! اپنی صاحبزادی کو اس بری حالت میں چھوڑ کر ہم دونوں میں سے کوئی ایک بھی آرام نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں بھی اپنی شہزادی کی عزیز جان پر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ بہرحال رات بھر باتوں کا یہی سلسلہ چلتا رہا اور صبح سویرے تقریباً ۵ بجے لیڈی ڈاکٹر نے خود بھی کافی پی اور رحیم النسا کو بھی دو کپ بہترین اور لذیذ کافی اپنے ہاتھ سے بنا کر دی۔ اس وقت تک مریضہ کی حالت میں بڑی حد تک تبدیلی ہو چکی تھی۔ مریضہ نے آنکھیں بالکل ہی کھول دی تھیں، اور آنکھوں کی پتلیاں بھی اپنی اصلی حالت پر آ چکی تھیں، اور اس وقت مریضہ سانسی حسب سابق اور معمول سے رہی تھی، یعنی تنفس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے مریضہ کے دل کا بھی امتحان سکوپ سے جائزہ لیا تو معلوم

دونوں ہاتوں اور پیروں میں، جو ایک طویل عرصے سے غیر معمولی ٹھنڈک تھی، وہ جاتی رہی تھی، اس کی بجائے ہاتھ اور پیر اور سارا جسم اپنی اصلی حالت پر آچکا تھا، جیسا کہ کامل صحت اور تندرستی کی حالت میں ہوا کرتا ہے۔

مریض کے جسم میں اس غیر معمولی تبدیلی کے لیڈی ڈاکٹر نے جلد بازی سے کام نہیں لیا، رد و کد سے بات اس کی حالت کو اور بہتر سے بہتر بنانے کی تدبیریں کرتی رہی، اور اس کام میں دونوں ماما جی اور ڈیوڑی کی دو ایک اور بھی ملازم عورتیں برابر کی شریک رہیں۔ کچھ عرصا پہلے تک رحیم النسا کے ہاتھ پیر جو مفلوج سے اور نہ لے حس و حرکت ہو گئے تھے، لیڈی ڈاکٹر کے معقول اور تدبیر علاج کے باعث اب حرکت کرنے لگے تھے، چنانچہ مریضا نے کروٹ بھی لی اور اپنے ایک ہاتھ کو حرکت دیتے سینے کی طرف رکھا، اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے بار بار ہاتوں اور پیروں کو حرکت دینے لگی، یہ گویا ایک نئے جان اور بڑی حد تک مردا قالب میں پھر سے جان پڑ جانے کا بین ثبوت تھا، اس لیے اپنی اس کامیابی پر مسز کرک پیٹرک بار بار خوشی کا اظہار کر رہی تھی، اور وہ عورتیں بھی، ڈاکٹر کے اس لاجواب اور کامیاب علاج پر تعریف کیے بغیر نہ رہیں۔ جب مریضا کے ہوش و حواس اس حد تک بجا ہو گئے تو لیڈی ڈاکٹر نے بڑی ماما جی سے کہا، تم صاحبزادی، صاحبزادی کہہ کر بار بار پکارو، اس پر بڑی ماما جی نے، شہزادی، شہزادی اور صاحبزادی ادھر دیکھیے، میں آپ کی بڑی ماما جی ہوں، اٹھیے شہزادی صبح ہو گئی ہے، اٹھیے، بیدار ہوئیے۔ ہاں ماما جی، نہایت ہی کمزور آواز میں کہتے ہوئے رحیم النسا نے آنکھیں کھول کر بڑی ماما جی کی طرف دیکھا۔ صاحبزادی کی اس حالت کو دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر مارے خوشی کے اچھل پڑی اور بڑی ماما جی کو ذرا آگے کے جا کر کہا، ماما جی! میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ اب تمہاری صاحبزادی نہیں مرے گی، اس لیے کہ وہ اپنی پہلی سی اصلی حالت پر لوٹ آئی ہے۔ بوڑھی ماں نواب آسمان جاہ

کو بھی سنائے دیتی ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ایک اور ملازم عورت آئی اور یہ کہا کہ سرکار نے کہلوایا ہے کہ آپ ضروریات سے فارغ ہو کر سرکار کے ساتھ ناشتا کریں، اور اس کے بعد بھی یہاں آئیں۔ یہ سنتے ہی لیڈی ڈاکٹر نے ماما جی سے کہا، تم دونوں ماما جی یہیں بیٹھی رہیں، میں ضروریوں سے فارغ ہو کر نواب صاحب کے ساتھ ناشتا کر کے آتی ہوں۔ ماما جی نے کہا، آپ جائیے ڈاکٹر صاحب، اور سرکار کو بھی یہ خوش خبری سنا دیجیے۔ ہم دونوں ماما جیں یہاں بیٹھی رہیں گی۔ یہ سن کر کرک پیٹرک باتھ روم کی طرف چلی گئی۔

کرک پیٹرک ضروریات سے فارغ ہو کر اور نہا دھو کر نواب آسمان جاہ کے ڈائننگ ہال کی طرف گئی۔ نواب صاحب اس کا سخت کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ ناشتا ایک عالا در جے کے میز پر چنا گیا تھا، اور پورے ٹیلر و عزا سب ہی سروس کے لیے تیار کھڑے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر کے داخل ہوتے ہی نواب صاحب نے اٹھ کر بات ملایا، اور انگریزی میں بات چیت کر کے ڈاکٹر کو اپنے مقابل کی کرسی پر بٹھایا۔ اس کے بعد بریک کی سروس شروع ہو گئی۔ دونوں کھا بھی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے، چنانچہ لیڈی ڈاکٹر نے رات بھر کی تفصیل کہہ سنائی کہ کس طرح سے اپنی مکمل تدبیروں سے اس نے ان کی صاحبزادی کے ایک مردا جسم میں پھر سے جان ڈال دی، جس پر نواب آسمان جاہ نے ڈاکٹر کے تدبیر اور لاجواب علاج کا بار بار اعتراف کیا، اور کہا کہ ڈاکٹر واقعی میں تو اپنی لڑکی کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا، اور حقیقت میں آپ نے میری عزیز ترین لڑکی کو مرے سے پھر سے ملا دیا۔ ناشتے کے بعد کافی کا دور چلتا رہا اور لیڈی ڈاکٹر نے کہا، میرے واقعی تدبیر اور لاجواب علاج میں کافی کو بھی کرامات اور جان بخشنے میں بڑا دخل رہا ہے۔ حد آسمان جاہ نے بھی کافی کی کرامات کی بے حد ستائش کی۔ اس کے نواب صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر اگر آپ کی اجازت ہو تو میں خدمت

آپ کے ساتھ حاضر ہو کر اپنی لڑکی [illegible]

اس پر ڈاکٹر نے کہا کہ نواب صاحب، آپ حقا
پیتے رہیے، اور کوئی کتاب یا اخبار دیکھیے،
میں خدا جانے مریضا کو بھی سے دیکھتی ہوں کہ اس
کے ہوش و حواس کس حد تک عود کر آئے ہیں۔
ایسا نہ ہو کہ آپ کو دیکھ کر وہ ایک دم اٹھنے کی
کوشش کرے اور اس کے نازک جسم کو غیر معمولی
دھکا لگے اس کی حالت پھر سے غیر ہو جائے گی۔
میں اس کوشش میں ہوں کہ پہلے مریض کچھ کھانے
کے قابل ہو جائے کہ اس کو دودھ دغیرہ پلایا جائیگا،
جس سے اس کے جسم میں قوت برداشت پھر سے
لوٹ آئے گی۔ اس کے بعد جب میں مناسب سمجھوں
گی خود ہی آن کر آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔
آپ جانتے ہیں کہ رات بھر میں نے ایک منٹ
کے لیے بھی آرام نہیں کیا ہے، اور اب دن میں بھی
میں نہیں سو سکوں گی، جب تک مجھ کو یقین نہ ہو جائے
کہ آپ کی لڑکی کی زندگی خطرے سے باہر ہو گئی
ہے۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے بار بار ڈاکٹر کا
شکریہ ادا کیا، چنانچہ آسمان جاہ اپنے دیوان خانے
کی طرف گئے اور لیڈی ڈاکٹر رحیم النسا کے کمرے
کی طرف گئیں۔

لیڈی ڈاکٹر کے جاتے ہی دونوں ماما جی اٹھ
کر کھڑی ہو گئیں اور لیڈی ڈاکٹر کے دریافت کرنے
پر کہا کہ اب تم دونوں جاؤ اور غسل وغیرہ سے اور
ناشتے سے فارغ ہو کر چلی آنا، اسی وقت تک
میں یہاں بیٹھی صاحبزادی کی دیکھ بھال اور نگرانی
کرتی رہوں گی۔ یہ سن کر دونوں ماما جی کمرے کے
باہر چلی گئیں اور لیڈی ڈاکٹر ایک آرام کرسی پر
بیٹھ کر ایک انگریزی کی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں دونوں ماما جی ناشتے سے
فارغ ہو کر پھر سے آ گئیں، اس وقت تک مریضا کی
حالت بہت بہتر ہو چلی تھی، اس لیے ڈاکٹر نے
بڑی ماما جی سے کہا، باورچی خانے جا کر شکر ملا
ہوا ایک کپ گرم دودھ لے آؤ، اس لیے کہ اب
ہم صاحبزادی کو دودھ پلا سکتے ہیں۔ یہ سن کر ماما
جی چاندی کی کشتی میں جگ میں گرم دودھ اور
شکردان اور دو تین خالی کپ سلیقے سے رکھے،
اور اس پر اطلس کا سرپوش ڈھانک کے لے آئی۔
ڈاکٹر اور دونوں ماما جی کے صاحبزادی، صاحبزادی
بار بار پکارنے سے شہزادی نے ہاں ماما جی کہا،
اس پر ماما جی نے صاحبزادی کو تکیے سے سنبھالا،
اور خود ڈاکٹر نے ایک کپ میں دودھ اور شکر
ڈال کر اپنے ہاتھ سے صاحبزادی کو دودھ پلایا،
چمچے صاحبزادی نے بلا تکلیف کپ بھر دودھ پی
لیا۔ اس کے بعد ماما جی نے کہا ڈاکٹر صاحب! ہماری
شہزادی نے برسوں سے کچھ نہیں کھایا ہے، پیٹ
بلکل ہی خالی ہے، اس لیے ایک اور کپ دودھ
پلانا چاہیے۔ یہ سن کر ڈاکٹر نے کہا، ایک دم نہیں،
بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پلائیں، اس لیے
یہ کشتی باورچی خانے میں واپس لے جاؤ، چنانچہ
ماما جی نے وہ کشتی باورچی خانے میں لے جا کر واپس
دیدی اور خود فوراً ہی لوٹ آئی۔ اس عرصے میں
رحیم النساء خود سے پھر سے لیٹ گئی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا کہ تم دونوں ماما جی، دوا فاصلے
پر میرے ساتھ چلو، میں تم سے کچھ دریافت کرنا
چاہتی ہوں۔ اسی کمرے میں تھوڑے سے فاصلے
پر یہ تینوں عورتیں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر
نے تعجب کے ساتھ دریافت کیا کہ آخر اس معصوم
بچی کے گناہ کی گواہیوں کس نے کھلا دی ہوگی؟
اس پر بڑی ماما جی نے مکاری کے ساتھ جواب دیا،
کون جانے ڈاکٹر صاحب، واقعی ہماری پرستان
کی پری شہزادی کو کسی حرداد اور حرامزادے
نے افیون کھلائی ہوگی۔ یہ سن کر چھوٹی ماما جی سے
نہ رہا گیا، اور اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب!
نواب ذوالفقار خان بہادر نے ہماری شہزادی
کے لیے سنکھیا بھجوائی تھی، اس کے کھانے کے
بعد ہی شہزادی بے ہوش ہو گئی اور ان کے
سارے جسم میں سرد پڑ گیا۔ یہ سن کر بڑی
ماما جی کے ہوش جاتے رہے، اور اس نے بات

نافن لو، کیا افضل خان بہادر ہماری شہزادی کے دشمن ہیں جو مٹھائی میں افیون یا زہر ملا کر بھجوائیں گے۔ اس پر لیڈی ڈاکٹر نے بڑی مامی سے کہا، اگر یہ سچ نہیں ہے تو کیا تم یہ باور کرتی ہو کہ ڈیوڑھی کے ملازمین میں سے کسی نے کھانے میں افیون ملا کھلا دی ہے، جس کے یہ زہریلے اثرات نمایاں ہو گئے۔ چھوٹی مامی نے ڈاکٹر کو یقین دلایا، نہیں صاب، نہیں ڈاکٹر صاحب! ہماری معصوم شہزادی ساری ڈیوڑھی میں بہت ہی ہر دلعزیز عزیز ہے، میں آپ کو بلکا یقین دلاتی ہوں کہ یہ ذلیل اور رذیل کام ڈیوڑھی کے کسی بھی ملازم کا نہیں ہے۔ تب ڈاکٹر نے بیان کیا کہ پھر یہ اثرات مٹھائی کے ضرور ہوں گے۔ اس پر بڑی مامی نے پھر سے اس خیال کی نفی کی اور چھوٹی مامی نے پھر سے زور دیا کہ ہاں ڈاکٹر صاحب یہ زہریلے اثرات اسی مٹھائی کے ہیں۔

یہ ساری داستان سننے کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے ان دونوں مامیوں سے دریافت کیا کہ تم نے یہ نہیں بتایا کہ مٹھائی تحفتاً بھجوانے والا یہ افضل خان کون شخص ہے؟

ڈاکٹر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے چھوٹی مامی نے کہا، ہاں ڈاکٹر صاحب، میں جانتی ہوں، افضل خان بہادر، نواب میر علی خان بہادر کے اکلوتے اور بڑے ہی حسین و جمیل اور خلیق نوجوان ہیں۔ یہ لوگ بڑے جاگیردار ہیں۔ میر علی خان بہادر اور ہمارے سرکار نواب آسمان جاہ بہادر کے بڑے ہی گہرے دوستانہ تعلقات ہیں، اور وہ نواب صاحب اور وہ نواب صاحب، ہمارے سرکار سے ملنے اکثر و بیشتر ڈیوڑھی آیا کرتے ہیں، اور کبھی کبھار ان کے ساتھ نواب افضل خان بھی آیا کرتے ہیں، اس طرح ہمارے سرکار ان دونوں باپ بیٹے سے بہتر طریقے پر واقف ہیں۔

یہ سن کر لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ جب ان دونوں کے آپ کے سرکار سے اتنے گہرے تعلقات ہیں تو پھر یہ زہریلی مٹھائی افضل خان [illegible] اس پر چھوٹی مامی نے کہا، یہ ہم کیا جانیں، یہ تو تھانہ عبدالقادر بہتر طریقے پر جانتے ہیں، جس کے ذریعے مٹھائی بھجوائی گئی تھی۔ ڈاکٹر نے معلوم کیا یہ عبدالقادر کون شخص ہے، مامی نے کہا، ہمارے سرکار کا بہت ہی قدیم ملازم ہے، جس پر سرکار کو پورا پورا بھروسا ہے، ڈیوڑھی کے تمام ملازمین اس کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔

باب (۹)

کرک پیٹرک اور چھوٹی مامی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں، اتنے میں بڑی مامی ضرورت سے جانے کا بہانا کر کے وہاں سے چلی گئی۔

اس کے بعد کرک پیٹرک نے چھوٹی مامی سے کہا، میں سمجھتی ہوں، بڑی مامی کچھ گھبرائی ہوئی سی ہیں، اس لیے وہ بہانا کر کے یہاں سے چلی گئی ہے، اور مجھ کو یقین کامل ہے چھوٹی مامی کہ تم مجھ سے جھوٹ باتیں نہ کہو گی، اور جو سچ بیان کرو گی، وہ صداقت پر مبنی ہوگا۔ چھوٹی مامی نے ڈاکٹر کو یقین دلایا کہ وہ خدا بھی جھوٹ کہنے کی عادی نہیں ہے، اور ڈاکٹر جو بھی دریافت کرے وہ سچ سچ بتا دے گی۔ اس پر ڈاکٹر نے کہا ہاں میں خود بھی یہی محسوس کرتی ہوں، اور تمہارے بشرے سے بھی ظاہر ہے کہ جھوٹ نہیں بولیں گی، اس لیے بڑی مامی سے زیادہ میں تمہاری دل سے قدر کرتی ہوں۔ یہ سن کر چھوٹی مامی نے بیان کیا، واقعی یہ میری بڑی شفقت اور عزت افزائی ہے کہ ایک انگریز اور پردیسی عورت اور مشہور ڈاکٹر کی نظروں میں میرا کچھ مقام ہے، اس لیے اب میں جو کچھ بھی بیان کروں گی، اور آپ کو اجازت ہے، ڈاکٹر صاحب آپ مجھ سے چاہے جس قسم کا سوال کریں، میں اس کا سچی سچی جواب دوں گی۔ مامی جی، لیڈی ڈاکٹر نے کہا، میں تمہاری صاف گوئی سے نہ صرف خوش ہوں، بلکہ کسی خاص موقع پر نواب صاحب سے تمہاری سفارش [illegible] بڑی مامی کی خدمت پر ترقی دلوا دوں گی [illegible] یقین ہے [illegible] صاحب [illegible] مامی نے [illegible] کا آپ کے دل [illegible] اور میرا آپ سے کہنا ہے،

سرکار سے سفارش کر کے مجکو ترقی دلوا دیں گی۔

اچھا ماما جی یہ تو بتاؤ کہ عبدالقادر کی رسائی افضل خان کے ہاں کیسے ہوئی اور اس نے وہاں سے مٹھائی کیسے حاصل کی۔

مجھے نہیں معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب، مگر یہ ضرور ہے کہ عبدالقادر نے مٹھائی لا کر دی اور کہا یہ افضل خان سرکار نے ہماری شہزادی کے لیے بھجوائی ہے، اور یہ کہنا کہ وہ خود کھائے، کسی دوسرے کو نہ دے۔ یہ سن کر کرک پیٹرک نے کہا، سنو! ماما جی! تم دونوں ماما جی تو صاحبزادی کی نگرانی اور حفاظت کرتی ہو، جب یہ مٹھائی بھجوائی گئی تھی تو تم دونوں نے اس کو کھا کر کے آزمایا نہیں۔ ماما جی نے جواب دیا نہیں ڈاکٹر صاحب، ہم دونوں میں سے کسی نے بھی مٹھائی نہیں کھائی۔ شہزادی کو لے جا کر دیدی اور وہ عشقی ساری مٹھائی کھا گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب کچھ خدا پر بھی ظاہر ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ ماما جی، لیڈی ڈاکٹر نے کہا، افضل خان، صاحبزادی رحیم النسا سے کیوں کر واقف ہوا؟ اوہ! ڈاکٹر صاحب یہ تو ایک بڑی ہی لمبی چوڑی کہانی ہے، اور یہ ایک قسم کا راز بھی ہے، اس لیے اپنی صاحبزادی کا راز بیان کر کے میں نمک حرامی کا ثبوت نہیں دوں گی۔ اجی۔ ماما جی تمہیں تو بیچ دھوکا سا معلوم ہو رہا ہے۔ ارے تم نہیں جانتیں کہ میرے اور صاحبزادی کے تو بڑی دوستانا تعلقات ہیں، اگر وہ اس مصیبت میں مبتلا نہ ہو تو سب سے پہلے یہ راز مجھ سے کہے دیتی۔ تم بھی عجیب قسم کی عورت ہو، یہ سمجھ کر بیان کرو کہ تمہاری صاحبزادی کی اجازت ہے۔

اس پر مجبوری ماما جی نے کہا، اگر ایسی بات ہے تو سنو، ڈاکٹر صاحب! ہماری شہزادی نے افضل خان کو ۵ محرم کو پہلی بار لنگر میں دیکھا۔ دیکھتے ہی فوراً اس کے بادۂ تحسین کا شکار ہو گئی۔ اس روز سے بے چین سی رہنے لگی، اس کی حالت یہ تغیر ہوتا گیا، ایک عرصے تک اس نے رازِ سب سے چھپائے رکھا، جونکہ اس کی صحت دن بدن گرتی چلی جا رہی تھی، ماں نے اس کے راز کو معلوم کر لیا۔ ہمارے ملک کے بادشاہ کو بھی اپنی لڑکی کی صحت کی فکر ہو گئی، وہ سخت پریشان ہو گئے، اور ایک سے زیادہ امرتا ان کی گرتی صحت کے بارے میں دریافت کیا، مگر شہزادی باپ سے یہ کہہ کر ٹالتی رہی کہ نہیں سرکار! کوئی خاص بات نہیں ہے، آپ فکر کیوں کرتے ہیں میں تو پہلے کی طرح بھلی چنگی اور صحت مند ہوں۔ ایک روز یہ راز اس نے ہم دونوں ماما جی پر ظاہر کر دیا تو ہم نے کہا کہ شہزادی کھا جا آپ اس قدر فکر مند کیوں ہیں۔ ہمارے شہر میں، کٹارہ وڈ کے قریب ایک محلے میں مرزا، علی عامل رہتے ہیں، اور بلا تامل لغاوہ ہر مشکل آسان کیے دیتے ہیں۔ اب تک ہزاروں ہی آدمیوں کی مراد ہیں ان کے ذریعے بر آچکی ہیں۔ ہم دونوں مل کر ان کے ہاں جائیں گے، اور آپ کی دکھ بھری داستان ان کو سنا کر اس کا حل ان سے معلوم کریں گے۔ یہ سن کر ڈاکٹر نے محمد سے کہا، ہاں ماما جی، اور کہیے جاؤ، پوری داستان سناؤ۔ مگر اس سے پہلے ماما جی، مجکو سخت تشویش ہے، پہلے یہ تو بتاؤ کہ آیا صاحبزادی رحیم النسا کی طرح افضل خان خدا بھی رحیم النسا سے محبت کرتا ہے یہ سن کر ہنستے ہوئے ماما جی نے کہا، یہ تو عجیب بات کہی آپ نے ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کو اس بارے میں کچھ علم نہیں، اجی ڈاکٹر صاحب سارے شہر میں ان دونوں کی محبت کے ڈنکے پٹ رہے ہیں، بچے بچے کی زبان پر تک ان دونوں کے عشق کے چرچے ہیں۔ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر نے کہا، نہیں ماما جی میں نے تو اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سنا ہے، اچھا یہ تو بتاؤ کہ آیا اس عشق کی داستان کا علم نواب آسمان جاہ بہادر کو بھی ہے۔ یہ سنتے ہی سخت پریشانی کی حالت میں ماما جی نے کہا، نہیں ڈاکٹر صاحب، آپ ایسا نہ کہیے بڑے سرکار کو ابھی اس کی ہوا تک لگنے نہیں پائی ہے، اگر انھیں علم ہو جاتا تو پھر ہم سب ملازمین کی خیر نہیں تھی۔ لیجیے کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا، ماما جی، ابھی تم نے کہا ہے کہ ان دونوں کے عشق کی داستان کے سارے شہر میں ڈنکے بج رہے

ہیں، اور بچے کی زبان پر اسی کے چرچے ہیں، تو بڑے سرکار کو اس کا علم کیسے نہیں ہو سکتا۔ اچھی ڈاکٹر صاحب! آپ بہت ہی معصوم عورت معلوم ہوتی ہیں، ہماری سرکار کی اپنی دنیا الگ ہے، یہاں پر ڈگ ڈگ پر پہرے ہیں، خدا ان کی اپنی موج ہے، درباں ہیں، اور مراصبین و غیرا بھی ہیں۔ سرکار کے ہاں کسی کی رسائی کب ہو سکتی ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ شہر کے بڑے کوتوال اور بالا سے عالا عہدے دار، اجازت لینے کے بعد جب سرکار کے ملنے آتے ہیں تو جھک کر باریاب آداب بجا لاتے ہیں، اور دست بستا کھڑے ہو کر عرض معروض کرتے ہیں، اگر ہمارے سرکار نے کسی عہدے دار کو صوفے پر بیٹھنے کا حکم دیا تو اس کو وہ شخص اپنی عین خوش قسمتی سمجھتا ہے۔ آپ شاید معلوم نہیں، ڈاکٹر صاحب ہمارے سرکار کون ہیں۔ حضور اشرف جاہ نواب میر محبوب علی خان بہادر کی بڑی بہن شہزادی پاشا کے شوہر ہیں۔ حضور نظام کی بڑی بہن ہمارے سرکار نواب آسمان جاہ بہادر کو بیاہی گئی تھی، جن کے دو لڑکے ایک لڑکی یہی میری شہزادی رحیم النسا بیگم صاحبا ہیں، ان کی ماں کا انتقال ہو گیا، اس لیے مرحوم سرکار اپنی چہیتی بیٹی سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ حضور نظام کی دوسری حقیقی بہن نواب خورشید جاہ بہادر کو بیاہی گئی تھیں، جو اب تک بقید حیات ہیں۔ نواب آسمان جاہ بہادر اور نواب خورشید جاہ بہادر دونوں سگے بھائی ہیں، اور ان دونوں کی لاکھوں روپے کی جاگیریں ہیں، جو ہمیں امرا کے پائیگاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر دونوں امرا میں سے کوئی بیمار ہو جائے تو مزاج پرسی کیلئے خود حضور نظام تک تشریف لایا کرتے ہیں، ان کی قدر و منزلت کا اندازا خود ہی آپ لگا لیجیے۔ آپ جس انگلش فرم کی ممبر ہیں اور دوسرے یہ کہ لیڈی ڈاکٹر ہیں، اس لیے ہمارے سرکار آپ سے ملنے، چلتے طریقے پر آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ ہمارے سرکار شہر کے ہر شخص سے بالکل اسی طرح بے تکلفانہ انداز میں ملتے ہیں، اور شہر کی ہر خبر سے وہ باخبر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کی بڑی بھول ہے۔ ہمارے سرکار کو اس واقعے کا مطلق علم نہیں۔ خیر یہ بات تو بالکل ٹھیک رہی، اب میں سب کچھ سمجھ گئی، اچھا یہ تو بتلاؤ بھوپی ماما جی کہ جب پہلی بار صاحبزادی نے افضل خان کو تنکر میں دیکھا تھا، اس وقت سے آج تک ان دونوں نے ملاقات بھی کی ہے نہیں۔ ؟

ارے یہ کیا بچوں کی سی باتیں کر رہی ہیں آپ ڈاکٹر صاحب! ہنستے ہوئے اور رکرک پیڑک کا مذاق اڑاتے ہوئے ماما جی نے کہا، افضل خان اور صاحبزادی کی ملاقات — کیسے اور کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے ڈاکٹر صاحب! نہ یہ باہر جا سکتی ہیں اور نہ ہی افضل خان بہادر اس بڑی ڈیوڑھی میں قدم رکھ سکتے ہیں، اب پھر ملاقات ہو تو کیسے ؟ یہ ممکن ہی نہیں، چونکہ دونوں دل ایک ہو گئے ہیں، اس لیے وہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ یہ کہہ کر چپ ہو لیتے ہیں کہ ؎

من تو شدم تو من شدی، من تن تو شدم تو جان شدی
تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

ہاں! ڈاکٹر صاحب! یہ ضرور ہے کہ نواب افضل خان بہادر کا ایک فوٹو ہماری شہزادی کے پاس موجود ہے، اس کو (۲۴) گھنٹے اپنی نظروں کے سامنے رکھ کر وہ زندہ اور خوش بھی رہتی ہیں یہ سنتے ہی انتہائی حیرت اور استعجاب کے انداز میں کرک پیڑک نے کہا، کیا کہا ماما جی آپ نے — فوٹو کس کا فوٹو — افضل خان کا فوٹو — سوالیہ انداز میں اس نے ماما جی سے دریافت کیا۔ اس پر ماما جی نے بڑی متانت کے ساتھ ایک خاص انداز میں کہا — ہاں ڈاکٹر صاحب! افضل خان بہادر کا فوٹو ہماری شہزادی کے پاس ہے، اس پر آپ کو تعجب کیوں ہو رہا ہے!

یہ سن کر لیڈی ڈاکٹر نے کہا، نہیں ماما جی، تعجب کی کوئی بات نہیں، بلکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ

چونکہ میں نے آپ سے وعدا کر لیا ہے، ڈاکٹر صاحب کہ کوئی بات بھی میں آپ سے راز میں نہ رکھوں گی، اس لیے یہ بتائے دیتی ہوں کہ یہ فوٹو عبدالقادر نے لاکر ہماری شہزادی کو دیا تھا۔ کہاں سے وہ فوٹو، ذرا مجھکو تو دکھائیے، اس پر ماما جی نے کہا، جیسے شہزادی کے تکیے کے نیچے سے، یہ کہتے ہوئے دونوں رحیم النسا کے کوچ کے قریب گئے تو رحیم النسا کروٹ لیٹی ہوئی تھیں، اس کے تکیے کے نیچے سے فوٹو نکال کر ماما جی نے ڈاکٹر کو دیا۔ ڈاکٹر نے فوٹو کو دیکھ کر تصدیق کی اور بہت ہی غور سے اس کو دیکھا بھی، اس کے بعد اس نے ماما جی کو واپس دیدیا اور ماما جی نے فوٹو کو پھر سے تکیے کے نیچے رکھ دیا، ایسے میں بڑی ماما جی حضرت کے بہانے بڑی دیر تک غایب ہو گئی تھی، واپس آگئی اور اب پھر سے یہ تینوں باتوں میں مصروف ہو گئے۔

اب لیڈی ڈاکٹر نے پھر سے مریض کی نبض دیکھی اور دل کا بھی معائنا کیا، اور سارے جسم کو چھو کر دیکھا تو گرم پایا، اور بڑی ماما جی سے کہا، ذرا تم صاحبزادی کو اٹھا کر دیوان کو پھر سے دودھ اور کافی دیدی جائے گی، جس پر بڑی ماما جی نے زور سے شہزادی پاشا اٹھو، اٹھ کر بیٹھو، کہا اور ادھر ڈاکٹر کے چلے سے چھوٹی ماما جی دودھ وغیرہ لینے، باورچی خانے گئیں، اور تھوڑی دیر میں ملکہ اور عورت کے ساتھ دو کشتیاں چھوٹی ماما جی لیتی آئیں، اور یہ کہا کہ سرکار نے آپکو لنچ پر یاد فرمایا ہے۔ ماما جی کے بار بار پکارنے پر رحیم النسا نے آنکھیں کھولیں، کروٹ بھی لی اور ہاں ماما جی بھی کہا۔ اتنا دفعا اس کی آواز میں کچھ قوت سی پائی گئی، اس لیے ڈاکٹر اور دونوں ماماؤں بہت زیادا خش ہو گئیں۔ صاحبزادی کو دونوں ماماؤں نے سہارے سے بیٹھایا اور دودھ اور بسکٹ کھلانا شروع کیا۔ وہ بغیر تکلف کے دودھ اور بسکٹ کھاتی رہی۔ اس کے ساتھ ہلکا کیک بھی کھلایا گیا۔ بڑی ماما جی نے کہا، شہزادی ذرا ادھر تو دیکھو، یہ کون کھڑی ہیں آپ کے سامنے۔ ہاں کہتے ہوئے رحیم النسا نے انگریزی میں ہیلو صاحبزادی، گڈ آفٹرنون، یعنی انگریزی طریقے پر زوہیر کا آداب کیا، اس کے جواب میں رحیم النسا بھی گڈ آفٹرنون کہتے ہوئے انگریزی ہی میں دریافت کیا ڈاکٹر تم کب آئیں یہاں، مجھکو تو معلوم ہی نہیں۔ ڈاکٹر نے کہا میں ابھی ابھی ہوں۔ اس کے بعد خدر حیم النسا نے ڈاکٹر سے دریافت کیا، کیا مرا مزاج خراب ہو گیا ہے؟ ڈاکٹر نے جواب میں کہا، نہیں صاحبزادی کوئی خاص بات نہیں، آپ کو کچ چکر سا آگیا تھا تو نواب آسمان جاہ بہادر نے مجھکو فوراً یہاں بلوایا۔ آنے کے بعد میں نے آپ کا معائنا کیا تو کوئی پریشانی کی بات نہیں پائی۔ قوت کے برقرار رکھنے کے لیے ایک دو انجکشن دیے، اور جب کہ آپ ہوش میں آگئی ہیں تو آپ کو دودھ اور بسکٹ کھلائے جا رہے ہیں اس کے بعد میں جلد ہی آپ کو اسپیشل کافی پلاؤں گی، پہلے آپ لنچ کیک اور بسکٹ تو کھا لیجے، مگر رحیم النسا نے اور زیادا کھانے سے انکار کر دیا، جس پر لیڈی ڈاکٹر نے اسپیشل کافی کا کپ لے کر مریض کو خود ہی پلایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے کہا، اگر آپ ایک اور کپ پی لیں تو بہتر ہوگا، لیکن، دوسرا کپ پینے سے صاحبزادی نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے کہا، صاحبزادی، نواب صاحب نے مجھکو لنچ پر بلایا ہے، میں وہاں جاکر لنچ کھانے کے بعد پھر سیدھے آؤں گی، اور اس وقت آپکی دونوں ماما جی آپ کے ساتھ باتیں کرتی بیٹھی رہیں گی، کیا میں جا سکتی ہوں، اس پر رحیم النسا نے کہا، ڈاکٹر تم شوق سے جا سکتی ہو، اور سرکار کے ساتھ لنچ کھانے کے بعد پھر سیدھے چلی آنا۔ آل رائٹ یا پیت اچھا کہتے ہوئے کرک پیٹرک نواب صاحب کے ڈائننگ میں چلی گئی، اور ادھر دونوں ماما ہیں، اپنی صاحبزادی کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گئیں۔

لیڈی ڈاکٹر کرک پیٹرک کے جاتے ہی نواب آسمان جاہ بہادر نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا، اور ہاتھ ملانے کے بعد اس کو اپنے مقابل کرسی

کرسی پر بیٹھ گئی۔ بٹلر سن نے پھر وہی شروع کردی۔ آسمان جاہ نے کہا ڈاکٹر جی مجھے آپ پر حیرانی اور دم کا مرغ اور کباب بہت شوق سے کھاتی ہیں، اس لیے میں نے میز خانے کے ماورچی کو بلوا کر خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ یہ چیزیں خاص طور پر تیار کی جائیں۔ نواب صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا، ہاں نواب صاحب آپ کے ہاں کے مغلائی کھانے مجھے بہت زیادہ پسند ہیں، اور جیسا کہ آپ نے کہا، بریانی، دم کا مرغ اور سیخ کباب بڑے شوق سے کھاتی ہوں۔ نہ صرف رات میں بلکہ آج رات ڈنر میں بھی میں اپنی پسند کی یہی چیزیں آپ کے ساتھ کھاؤں گی۔ اس کے جواب میں نواب صاحب نے بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ بڑی خوشی سے۔ رات ڈنر میں بھی یہی چیزیں کھا سکتی ہیں۔ دونوں میں یہ گفتگو لنچ کھاتے ہوئے ہو رہی تھی۔ نواب صاحب نے اپنی بڑی کی صحت اور کیفیت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس پر ڈاکٹر نے وہ سارا واقعہ اور ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح سے ابھی تھوڑی دیر پہلے بڑی ماما جی کے آواز دینے پر صاحبزادی نے جواب دیا اور انھیں ٹیکے سے اٹھا کر دودھ، بسکٹ اور بیم کیک کھلایا گیا، اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر کو بلوایا اور ان دونوں میں آپس میں باتیں چیت رہی۔ آخر میں خود ڈاکٹر نے صاحبزادی کو اسٹرانگ کافی پلائی۔ جب دوسرا کپ پینے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے آنے سے کہا کہ بڑے سرکار آسمان جاہ نے انھیں لنچ پر یاد فرمایا ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑی دیر میں لنچ سے فارغ ہو کر آتی ہوں، اس کی بنا پر صاحبزادی نے بھیجا جانے کی اجازت دی، اس ادھر چلی آئی ادھر دونوں ماما جی صاحبزادی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

آسمان جاہ نے ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ اس کے ہوش و حواس کیسے ہیں؟ ڈاکٹر نے کہا، بالکل ٹھیک ہیں نواب صاحب، آپ اس بات میں کچھ بھی فکر نہ کریں۔ آسمان جاہ نے پھر سے کہا، اچھا ڈاکٹر یہ تو بتاؤ کہ اب آواز میں کچھ کمزوری سی ہے؟ اس پر ڈاکٹر نے کہا، نہیں نواب صاحب، یہی تو بڑی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ صاحبزادی کی آواز میں کسی قسم کی کمزوری نہیں ہے۔ آسمان جاہ نے مکرر دریافت کیا، ڈاکٹر جب اس کے ہوش و حواس ہیں تو آیا اس کو اپنی بیماری کا علم ہے؟ ڈاکٹر نے جواب دیا، ہاں نواب صاحب مذاہنوں نے سچ سے سوال کیا، ڈاکٹر آیا میں بیمار تو نہیں ہوں، میں نے ان سے کہا، صاحبزادی بیماری کیسے آپ کو چکر آ گیا تھا، اور آپ بے ہوش ہو گئی تھیں، تو نواب صاحب نے مجھ کو گاڑی بھیج کر فوراً بلوایا۔ آنے کے بعد میں نے آپ کے سارے جسم کا معائنہ کیا، مگر کوئی خاص بات نہیں پائی، لیکن احتیاطاً تھوڑے تھوڑے وقفے سے آپ کو قوت کے دوا انجکشن دیے، اور دو کپ اسٹرانگ کافی بھی پلا دی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ جب تک آپ کی کامل صحت نہ ہو جائے میں آپ کی نگرانی اور علاج کے لیے ڈیوٹی ہی میں رہوں گی۔ یہ سن کر آپ کی صاحبزادی نے بہت خوب کہا، اور میرا شکریہ بھی ادا کیا۔ نواب صاحب نے جب یہ دریافت کیا کہ ڈاکٹر اپنی بڑی کو میں کب دیکھ سکتا ہوں تو اس کے جواب میں کرنل پیرک نے کہا، نواب صاحب صرف آج کی رات آپ صبر کر لیجیے، اور کل آپ اپنی لڑکی سے خوشی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ آج رات میں انھیں معمولی غذا بھی کھلانے کی کوشش کروں گی، اس سے ان میں کچھ شکتی، اور قوت نوٹ آئے گی۔ اب مجھے اجازت دیجیے، بہت دیر سے میں وہاں سے غائب ہوں۔ اس پر نواب صاحب نے پھر سے ڈاکٹر کی خدمات کا شکریہ ادا کیا، اور آداب کرنے کے بعد وہ اپنے دیوان خانے میں چلے گئے اور لیڈی ڈاکٹر صاحبزادی کے کمرے میں گئی۔

جب کرنل پیرک [illegible] کے کمرے میں گئی تھی، صاحبزادی لنچ پر بیٹھی ہوئی تھی اور دونوں

ماماؤں بیٹھی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ جاتے ہی ڈاکٹر نے ماماؤں سے دریافت کیا، کیسو کیا حال ہے صاحبزادی کا۔ بڑی ماما جی نے جواب دیا آرام کی نیند سو رہی ہیں۔ یہ سن کر ڈاکٹر نے کہا، تم میں سے ایک ماما جی دوپہر کے کھانے کے لیے جاؤ، اور دوسری یہیں بیٹھی رہنا، پھر اسی طرح سے دوسری ماما جی بھی کھانے کے لیے جائیں، صاحبزادی کو کسی حالت میں بھی اکیلی نہ چھوڑنا، تین رات بھر کی جاگی ہوئی ہوں، دو ایک گھنٹے اسی میز پر لیٹے آرام کرنی ہوں، اگر میری ضرورت محسوس ہو تو فوراً اٹھا دینا۔ یہ سن کر دونوں ماما جی نے ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب کہا، ان میں سے ایک ماما جی اٹھ کر کھانے کے لیے گئی اور دوسری اسی طرح اپنی جگہ بیٹھی، اور لیڈی ڈاکٹر کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی خالی میز پر جا کر لیٹ گئی اور سو رہی۔

اب ذرا آپ کو کرک پیٹرک کا حال احوال بھی سن لیجیے۔ مس کرک پیٹرک کی عمر اس وقت (۲۴) سال کی تھی۔ اس کا چہرا بہت ہی جاذب نظر تھا۔ اس کے ماں باپ اگرچہ انگریز تھے، مگر ملازمت کے سلسلے میں نیویارک (امریکا) ہی میں رہتے تھے۔ کرک پیٹرک ان کی صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ ہائی اسکول تک تو نیویارک ہی میں تعلیم دلائی، مگر ڈاکٹری کا امتحان پاس کرنے کے لیے انھوں نے کرک پیٹرک کو اٹلانٹک پار انگلستان بھجوایا۔ یہاں پر برائی ٹن BRIGHTON میں کرک پیٹرک اپنی چچائی لیڈی بیٹرس بوائس LADY BEATRICE BOYCE کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی چچائی نے کرک پیٹرک کو ڈگری کورس کے میڈیکل کالج میں شریک کروا دیا۔ ہر سال امتحان کامیاب کرتے ہوئے لاڈونا کرک پیٹرک نے آخری امتحان بھی کامیاب کر لیا اور میڈیکل پریکٹس شروع کر دی، لیکن برائی ٹن کے لوگ بڑے مالدار اور ناصر وغیرہ نہیں تھے، اسی لیے اس کی پریکٹس جیسا کہ چاہیے نہ چل سکی، چنانچہ اس نے اپنے ماں باپ کو ایک خط میں شکایتی طور پر لکھا، اس کے جواب میں دونوں نے اس کو امریکا نیویارک جانے کا مشورہ دیا، لیکن کرک پیٹرک امریکا جانا نہیں چاہتی تھی، اس لیے اس نے ہندستان جا کر پریکٹس کرنے کا ارادہ کیا، ادھر ماں باپ کو بھی خط کے ذریعے اطلاع کر دی اور ادھر اپنی چچائی لیڈی بوائس سے اجازت لے کر ہندستان چلی آئی۔ ہندستان میں خاص طور پر حیدرآباد کا انتخاب اس لیے کیا کہ اس کا ایک ہندستانی علاقی افضل خان حیدرآباد میں رہتا تھا، اور ان دونوں میں بڑی گہری دوستی بھی ہو گئی تھی، اور افضل خان نے کرک پیٹرک سے شادی کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اسی امید پر کرک پیٹرک حیدرآباد آئی اور یہاں اس نے اپنی میڈیکل پریکٹس بھی شروع کر دی تھی۔ دو ایک گھنٹے تک آرام کرنے کے بعد تقریباً (۵) بجے شام کرک پیٹرک رحیم النسا کے پاس آئی، اس وقت دونوں ماماؤں بھی موجود تھیں اور رحیم النسا کو چ پر بیٹھے دونوں ماماؤں سے باتیں کر رہی تھی، اور یہ دیکھ کر کرک پیٹرک کو بڑی غصہ ہوئی، پھر کرک پیٹرک اور رحیم النسا دونوں نے انگریزی میں بات چیت شروع کر دی، ایسے میں ملازم عورتیں دو پیالیوں میں کافی، دودھ، کیک، پیسٹری اور میوا وغیرہ لے کر آئیں۔ لیڈی ڈاکٹر اور رحیم النسا دونوں نے مل کر کافی بھی پی، کیک پیسٹری بھی کھائی اور میوا بھی کھایا۔ اس کے بعد لیڈی ڈاکٹر آسمان جاہ کے پاس گئی اور یہ خوش خبری سنائی کہ آپ کی لڑکی بالکل ہی بھلی اور تندرست ہو گئی ہے، اس لیے کہ اس کی آواز میں کوئی کمزوری نہیں ہے، اور اس نے میرے ساتھ کافی بھی پی، کیک پیسٹری بھی کھائی اور میوا بھی کھایا۔ اب آپ چل کر اپنی لڑکی سے مل سکتے ہیں، اور رات میں اس کو معمولی غذا بھی دی جا سکتی ہے، یہ سن کر آسمان جاہ بے حد خوش ہوئے، اور کرک پیٹرک کے ساتھ رحیم النسا کے کمرے میں دونوں مل کر گئے۔ باپ کو دیکھتے ہی رحیم النسا کوچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سر کا دامن، سر کا دامن کہتے ہوئے گلے لپٹ گئی اور باپ نے بھی پدرانہ شفقت سے میری بیٹی، میری اچھی بیٹی، تم جیو، تم سلامت رہو، تم نے آرام

جیتی رہو، خوش و خرم رہو، پھلو پھولو دعا کرتے ہوئے اپنی دلی مسرتوں اور انتہائی خوشی کا اظہار کیا، اس کے بعد بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا، کہو میری عزیز از جان بیٹی، اب تمہاری طبیعت کیسی ہے، تو اس کے جواب میں رحیم النسا نے کہا، دیکھئے نہیں سرکار ابا، میں تو بھلی چنگی اور بالکل ہی صحت مند ہوں، لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ چکر سا آگیا تھا اور کمزوری سی محسوس ہوئی تو آپ نے انہیں بلوا بھیجا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ قوت کا انجکشن دیا اور میں بالکل ہی ٹھیک ہو گئی۔ ہاں میری بیٹی کہتے ہوئے آسمان جاہ نے پھر سے رحیم النسا کو گلے لگا لیا، اور کہا کہ وہ ایک معمولی سا دورہ تھا، فکر کرنے کی کوئی بات نہیں، چونکہ لیڈی ڈاکٹر نے قوت کے انجکشن دیے ہیں، بہت جلد قوت لوٹ آئے گی اور انہوں نے رات میں معمولی غذا کھانے کی بھی ہدایت کی ہے۔ یہ کہتے ہوئے آسمان جاہ نے کرک پیٹرک سے مخاطب ہو کر کہا، ڈاکٹر اب آپ اور ہماری لڑکی نہ دونوں مل کر باتوں میں اپنا وقت گذاریں، اور رات میں (۸) بجے ڈنر ہم تینوں مل کر کھائیں گے۔ ڈنر کے بعد ہماری لگی میں بیٹھ کر آپ اپنے گھر چلی جائیں، اس لئے کہ اپنی دوست ہماری صاحبزادی کی خاطر آپ کو بہت زحمت اٹھانی پڑی۔ یہ سن کر کرک پیٹرک نے کہا، نہیں زحمت کے کیا معنی، یہ تو میرا فرض ہے کہ وقت ضرورت میں مریضوں کی خدمت کروں۔ اب آپ کے حکم مطابق میں دو تین گھنٹے اور پڑے رہوں گی اس کے بعد آپ کے ساتھ ڈنر کھانے کے بعد اپنے گھر چلی جاؤں گی، اور ڈنر کے وقت تک ہم دونوں باتوں میں وقت گزار دیں گے۔ یہ سن کر بہت خوب کہتے ہوئے آسمان جاہ اپنے دیوان خانے کی طرف چلا گئے اور ادھر لیڈی ڈاکٹر اور رحیم النسا باتوں میں مصروف ہو گئے۔

ٹھیک رات کے (۸) بجے آسمان جاہ نے ملازم کو بھیجا کہ سرکار ڈنر پر آپ دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ دونوں مل کر ڈنر ہال گئے اور آسمان جاہ کے ساتھ ڈنر کھانے کے بعد رحیم النسا اپنے کمرے کی طرف گئی اور ڈاکٹر اپنے کرک پیٹرک کے ساتھ [illegible]

آسمان جاہ نے اپنے ایک ملازم سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو بگی میں بٹھا کر ان کے گھر چھوڑ آؤ، چنانچہ کرک پیٹرک اس ملازم کے ساتھ ڈیوڑی سے باہر گئی۔ بگی کے آتے ہی اسکی میں بیٹھ کر روانا ہو گئی۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے کوچوان سے کہا کہ دیکھو دارالشفا میں مجھ کو ایک مریض کے ہاں جانا ضروری ہے، اس لئے میرے گھر جانے کی بجائے مجھ کو وہاں چھوڑ دو، چنانچہ کوچوان نے بگی کا رخ موڑا، اور لیڈی ڈاکٹر اس کے بتائے ہوئے مکان پر چھوڑ کر ڈیوڑی واپس چلا گیا۔

کرک پیٹرک جس مکان پر اتری تھی، وہاں ایک پہرے دار بیٹھا ہوا تھا، دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوا، اور باقاعدہ SALUTE کیا، ڈاکٹر نے سلیوٹ کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا، کیا تمہارے سرکار گھر میں ہیں۔ اس پر پہرے دار نے کہا، جی ہاں میم صاحب، ہمارے سرکار گھر ہی میں ہیں۔ یہ سنتے ہی کرک پیٹرک تیزی سے مکان کے اندرونی حصے میں چلی گئی، اور یہ چلی وہ چلی یعنی جاتے جاتے ایک ایسے کمرے میں پہنچی جہاں ایک حسین اور خوبصورت اور جوان شخص بیٹھا اپنے تاریخ کے ریسرچ RISE AND FALL OF MOHAMMADAN RULE IN INDIA. کے کام میں مصروف تھا۔ کرک پیٹرک کے داخل ہوتے ہی اس نے اس کی طرف دیکھا اور ہلو ڈیئر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت وہ اپنے مغلانی لباس، کرتا اور پاجامے میں تھا۔ اس کے کمرے میں ایک شاندار قسم کا چراغ جل رہا تھا، جس کی روشنی تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کرک پیٹرک اس کے گھر آیا جایا کرتی تھی، مگر آج اس کو بقدر اس بات پر ہوا کہ رات کے دس بجے وہ یہاں کیسے چلی آئی؟ آگے بڑھتے ہوئے اس نے کرک پیٹرک کا استقبال کیا، اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، اڈیئر نا آپ کے آنے سے مجھ کو بے حد خوشی ہوئی، لیکن ساتھ ہی مجھ کو تعجب اس بات کا ہے کہ خلاف عادت دیر گئے رات میں تم یہاں کیسے چلی آئیں!

[illegible]

اچانک آنے پر تمہیں تعجب سا ہو رہا ہو، کہتے ہوئے اس نے اپنا بات کہنا روک لیا۔

خیر یوں ہی سہی، جب تم میرے گھر آئی ہیں تو آؤ اس صوفے پر میرے پاس ذرا بیٹھو، مگر اڈنا میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آج تم وہ اڈنا نظر نہیں آ رہی ہو، جس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ اور خوشی کھیلتی رہتی تھی، اس کے برخلاف اس تمہارے چہرے سے غصے اور تردد کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ سن کر اڈنا کرک پیٹرک نے کوئی جواب نہیں دیا، اور افضل خان سے کچھ دور ہٹ گئی، اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی۔ پھر تھوڑے سے وقفے سے نہایت ہی جوشیلے انداز میں اور کچھ اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس نے سوال کیا، افضل خان یہ تو بتاؤ کہ تمہارا کوئی اپنا عزیز اور خدا بھی ہے؟

یقیناً اڈنا، میں بھی رکھتا ہوں اور میرا خدا بھی ہے۔ اس سوال کے سنتے تو محکوم پتا چلتا ہے کہ خدا تمہارے ضمیر کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ آؤ میرے قریب آؤ، اور میری طرف نفرت کی نظروں سے مت دیکھو اڈنا۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے لڑنے جھگڑنے کے لیے نہیں آئی ہو، آؤ میرے قریب آؤ ہم دونوں مل کر اس صوفے پر قریب قریب بیٹھیں گے، اور ہنسی خوشی سے باتیں کریں گے۔ تمہارا زیادہ تک کھڑا رہنا میرے لیے تکلیف دہ ہے اڈنا۔

یہ سن کر اڈنا کرک پیٹرک نے اور بھی غصے کا اظہار کیا، اور کہا کہ ہاں یہی سچ ہے کہ میں تم سے لڑنے آئی ہوں اور میری آمد سے لڑائی ناواقفیت نہیں بلکہ واقفیت پر مبنی ہوگی۔ یہ کہتے ہوئے اڈنا نے اپنے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے کہا، سنو اور خوب غور ہی کان کھول کر سنو افضل خان، میں ایک ایسے اہم مسئلے پر بات چیت کرنے آئی ہوں جس کا تعلق تمہارے اور میرے مستقبل سے ہے۔

اہا! یہ بات ہے میری پیاری اڈنا، تب تو بہت ہی ٹھیک ہے، اور یقین جانو میری ساری کوشش ہوگی کہ تمہارے ساتھ اپنے مستقبل کے سنوارنے میں، میں ہر گز ہرگز کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا، کہتے ہوئے افضل خان نے اپنا دہنا ہاتھ اڈنا کے گورے گٹھے جسم کے اطراف ڈالا، اور یہ کہا کہ چلو ہم دونوں مل کر اس صوفے پر بیٹھ کر خوب خوب ہی باتیں کریں گے۔ اس کے باوجود اڈنا غصے کی حالت میں افضل خان سے الگ ہو گئی، اور اس کے مقابل اپنے دہنے پیر کو جماتے ہوئے ایک خاص انداز میں کھڑی ہو گئی، اور چند سکنڈ تک افضل خان کو غضب آلود نظروں سے گھورتی رہی۔

اڈنا کرک پیٹرک کی اس غیر متوقع حالت کو دیکھ کر افضل خان خود بھی پریشان ہو گیا، اور آخر کار اس کو مجبوراً کہنا پڑا کہ اڈنا، میں سخت حیران اور پریشان ہوں، تم مجھ پر کسی سی حرکتیں کر رہی ہو، بتاؤ تو سہی کہ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیوں بے وجہ غصے کا اظہار کیے جا رہی ہو۔ آج پہلی بار تم کو اس غیر معمولی غصے کی حالت میں دیکھ کر میرا دماغ چکرا گیا ہے۔ میں ہر وقت تمہارے سینے کے اطراف بات ڈالا کرتا ہوں، اور آج کئی بار میں نے بات ڈالنے کی کوشش کی، مگر ہر وقت تم نے بری طرح سے میرے بات کو ادھی گردن اور سینے سے نکال دیا۔ تم سچ سچ بتاؤ پیاری اڈنا، مجھ سے کون سا قصور ہوا ہے، جس کی سزا تم مجھے اپنے غیر معمولی غصے سے دے رہی ہو۔

یہ سن کر اڈنا نے زبان کھولی، اور قہر آلود نظروں سے افضل خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، کہ تم اپنے خدا اور رسول کی قسم کھا کر سچ سچ بتاؤ کہ تم نے میرے دل اور دماغ کی روح اور میرے ضمیر کو دھکا پہنچانے کے لیے کوئی پاپ کیا ہے یا نہیں؟ تم سچ سچ بتاؤ اور معصومیت کے ساتھ میرے ساتھ پیش آ رہے ہو، میں اس کو بہتر طریقے پر سمجھتی ہوں، اچھا افضل خان، بتلاؤ یہ تو بتاؤ کہ آیا تم آسمان جاہ کی لڑکی رحیم النسا کو جانتے ہو؟

ہاں اڈنا! میں رحیم النسا سے بہتر طریقے پر واقف ہوں، مگر اس قسم کا سوال کرنے کی تمہیں ضرورت کیوں پیش آ گئی؟

یہ سن کر اڈنا نے افضل خان سے سوال کیا کہ پہلے تم یہ تو بتاؤ کہ رحیم النسا سے کس طرح پیرو آشنا ہوئے؟

یہ تو بلکل ہی معمولی سا سوال ہے، میں ایک عرصۂ دراز سے رحیم النسا سے واقف ہوں، اور اس کے متعلق کوئی ایک لوگوں سے بہت کچھ سنا بھی ہے وہ بڑی ہی حسین اور خوبصورت لڑکی ہے۔

خیر وہ حسین ہوگی، مگر تمہارے دوستانہ تعلقات اس سے کیسے ہوئے۔ آیا تم اس کے باپ آسمان جاہ کو بھی جانتے ہو۔ آیا آسمان جاہ سے بھی تمہارے دوستانہ تعلقات ہیں، اس سوال کا تو جواب دو پہلے!

اڈنا تم جانتی ہو کہ نواب آسمان جاہ بہادر میرے باپ کی عمر کے ہیں۔ میرے باپ اور نواب صاحب میں نہایت ہی گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ جب بھی میرے باپ اپنی جاگیر سے حیدرآباد آتے ہیں، نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر روزانہ حاضری دیا کرتے ہیں، اور کبھی کبھار خود نواب صاحب بھی ہمارے گھر آیا کرتے ہیں۔ وہ مجھکو اپنے بچے کی طرح سمجھتے ہیں، اور محبت بھی کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے میں ان کی لڑکی رحیم النسا سے بھی واقف ہوں۔

افضل خان کی یہ داستان سننے کے بعد کرک پیٹرک نے گلے شکوے کے طور پر اس سے طنزاً کہا، مگر افضل خان، میں تو ایک سال سے تمہارے گھر آتی جاتی ہوں، اور تمہاری میری اتنی لمبی تکلف ہے، لیکن آج تک بھی تم نے آسمان جاہ اور ان کی بیٹی رحیم النسا کے اتنے گہرے تعلقات کا ذکر تک نہ کیا۔

اڈنا تم نے بلکل ٹھیک کہا کہ میں نے تم سے نواب صاحب اور ان کی لڑکی سے اپنے تعلقات کا قطعاً ذکر نہیں کیا، اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس قسم کے تذکرے کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، اسلیے کہ میں تمہارے سنگ یا سوسائٹی میں کچھ ایسا کھو گیا ہوں کہ سوائے تمہارے مجھکو کسی اور کا خیال تک نہیں آتا۔

پورا بھروسا کرتی ہوں۔ خیر! یہ تو بتاؤ کہ بہتیں صاحبزادی رحیم النسا کی اچانک سخت بیماری کا بھی معلوم ہے؟

نہیں اڈنا، اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے افضل خان نے کہا، یقین جانو مجھے اس معصوم لڑکی کی بیماری کا مطلق علم نہیں ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ وہ کب اور کیسے بیمار ہوگئی؟ میں نے جہاں تک سنا ہے عام طور پر یہ شکایت ہے کہ زنانے میں رحیم النسا کی دیکھ بھال اور نگرانی بہتر طریقے پر نہیں ہے۔

نہیں ایسا نہیں ہے، اس کی دیکھ بھال تو بڑے بہتر طریقے پر ہوتی ہے، لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ سخت بیمار ہوگئی تھی تو کیا تم کو یہ سن کر دکھ پہنچے گا، اڈنا کرک پیٹرک نے بغور دیکھتے ہوئے افضل خان سے سوال کیا!

ہاں اڈنا، یہ حقیقت ایک انسان کے اور نواب آسمان جاہ بہادر کے دیرینہ تعلقات کی بنا پر یہ معلوم کرکے مجھکو سخت تکلیف پہنچے گی کہ ان کی ایک لڑکی چہیتی اور حسین ترین لڑکی سخت بیمار ہوگئی تھی یقیناً ان کے باپ کو بھی بڑا دکھ پہنچا ہوگا، اور ان سے تعلقات کی بنا پر میں بھی اظہار افسوس کیے بغیر نہ رہونگا۔

افضل خان کے اس بیان کو کرک پیٹرک بغور سنتی رہی، اور اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا، لیکن اس نے ساتھ ہی یہ محسوس بھی کیا کہ افضل خان بشرے سے کسی قسم کے باپ یا گناہ کے آثار ظاہر نہیں ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد خود کرک پیٹرک نے افضل خان سے کہا تم کو یہ معلوم کرکے شاید دکھ پہنچے گا کہ دو چار روز پہلے کسی نامعلوم شخص نے رحیم النسا کو زہر کھلا دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ سخت بیمار ہوگئی تھی، اور دو تین روز تک بے ہوش بھی رہی۔ زہر! اور رحیم النسا، کیا تم سچ کہتی ہو اڈنا، کسی نے اس معصوم لڑکی کو زہر کھلایا تھا۔ سخت تعجب اور دکھ بھرے انداز میں افضل خان نے لیڈی ٹاکرڈ سے سوال کیا؟

ہاں زہر دیا گیا تھا۔ آج سے تقریباً چار

تھی اور وہ زہریلی مٹھائی صاحبزادی رحیم النسا نے نامعلوم طریقے پر کھالی تھی، اور اس پر زہر کا فوری اثر ہو گیا تھا۔ انتہائی تعجب خیز لہجے میں افضل خان نے کرک پیٹرک سے دریافت کیا، "کیا یہ سچ ہے اڈنا؟"

کرنگ پیٹرک نے سختی کے ساتھ جواب دیا "گیا تم اس کو جھوٹ سمجھتے ہو۔ زہر کا اثر جسم میں سرایت کرتے ہی مجھکو بلوا لیا گیا تھا، اور میں نے اس معصوم اور حسین لڑکی کا علاج کیا ہے، اور میں اپنے علاج میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہی!"

یہ سن کر افضل خان نے حقارت آمیز انداز میں کہا، "اڈنا کرک پیٹرک، نہ معلوم کسی کمینے اور ذلیل آدمی نے یہ نازیبا اور نادرست حرکت کی ہے، اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ رحیم النسا کا یہاں پر کوئی بھی دشمن نہیں ہے، اس کے ساتھ جان لیوا حرکت پرلے درجے کے سفلے پن کی دلیل ہے، مجھکو یہ معلوم کرکے بڑا ہی دکھ ہو رہا ہے، اڈنا"، افضل خان نے درد انگیز لہجے میں کہا۔

جی ہاں، خدا مجھکو بھی اس لڑکی سے بڑی ہی ہمدردی ہے، اور میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ رحیم النسا کا کوئی بھی دشمن نہیں ہے، مگر پھر بھی زہر دینے کی ذلیل اور کمینی حرکت ضرور کی گئی ہے۔ مٹھائی میں افیون زیادہ ملا دی گئی تھی، اس لیے زہر کا اثر فوراً ہو گیا اور دیر تک بھی رہا جس وقت میں نے لڑکی کا معائنہ کیا تھا، زہر بری طرح سے سارے جسم اور رگ و ریشے میں سرایت کر چکا تھا، رحیم النسا بالکل ہی بے ہوش اور بے حد بڑی ہوئی تھی، اس کا گورا گورا جسم نیلگوں ہو گیا تھا، اور اس کے موضع سے مسلسل جھاگ مائل بہہ رہا تھا۔ مجھکو تو اس کے جینے اور بچنے کی کوئی توقع نہ تھی، مگر میں نے اپنی تمامتر ماہرانہ ڈاکٹری صلاحیتیں اس معصوم اور حسین ترین لڑکی پر صرف کر دیں۔ میں نے تین روز تک حسین آرام اپنے اوپر حرام کر دیا تھا، اور ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سویا۔

درمیان میں افضل خان نے قطع کلام کرتے ہوئے دریافت کیا، "اچھا اڈنا یہ تو بتاؤ کہ کیا لڑکی کے باپ کو بھی اس کا علم نہیں ہے کہ اس کو زہر دیا گیا تھا، اور وہ موت اور حیات کی کشمکش سے دوچار ہو گئی۔"

اس پر اڈنا کرک پیٹرک نے کہا "کیوں نہیں خدا میں نے انہیں بتایا تھا کہ جو لفافے پر ہے اور جسم کی کیفیت سے افیون کے زہر کے اثرات نمایاں ہیں، اور میں نے آسمان جاہ بہادر کو یقین دلایا تھا کہ انگلستان میں، خدا میں نے افیون کے کئی ایک کیس کے علاج پیش کامیاب رہی تھی، اس لیے میں نے فوراً ہی پہچان لیا کہ یہ بھی افیون کے زہر کا کیس ہے، مگر نواب صاحب کو اس پر یقین نہیں آتا تھا، اس لیے کہ ان کا کہنا تھا کہ اس لڑکی کا کوئی بھی دشمن نہیں ہے۔"

ہاں اڈنا۔ یہ بالکل سچ ہے، میں خدا بھی نواب آسمان جاہ کی رائے سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں کہ رحیم النسا کا کوئی بھی دشمن نہیں ہے، اور جس کسی شخص نے یہ سفلی اور ذلیل حرکت کی ہے وہ بڑے درجے کا کمینا، ذلیل اور رذیل شخص ہے۔

موضوع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کرک پیٹرک نے فوراً کہا کہ تم سچ کہتے ہو کہ جس کسی نے رحیم النسا کو زہر دیا ہے، وہ بڑا ہی ذلیل اور کمینا شخص ہے۔ کیوں ہے نا ٹھیک یہ بات!

افضل خان نے جواب دیا، ہاں میں خدا بھی تم سے اتفاق کرتا ہوں اڈنا، ایسا شخص بڑا ہی ذلیل اور کمینا ہے۔ کیا تم اس شخص کو جانتی ہو، اڈنا کرک پیٹرک؟ یہ سن کر ایک خاص انداز میں اڈنا نے کہا، افضل خان تم تو بڑے ہی بھولے اور معصوم بنے جا رہے ہو؟ جیسا کہ خدا تم کو بھی معلوم نہیں ہے اس بارے میں ——!

نہیں اڈنا، میں سچ کہتا ہوں، میں حقیقت میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں۔

افضل خان، شاید تمہیں یہ معلوم کرکے سخت تعجب ہوگا کہ جو شخص حسین رحیم النسا سے محبت کا

بھجوائی تھی، اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

یہ سن کر افضل خان نے جواب دیا، یہ تو اور بھی عجیب ہوئی کہ جو شخص اس معصوم لڑکی سے محبت کا دعوا کرتا ہے، وہی اس کو زہر بھی کھلائے، تب تو وہ شخص قابل گردن زدنی ہے، اس کے لیے تو میں یہی سزا تجویز کرتا ہوں!

ہاں بات تو ٹھیک ہے افضل خان، تم خدا ہی قابل گردن زدنی ہو!

کیوں اڈنا، میں کیوں قابل گردن زدنی ہوں، افضل خان نے تعجب سے دریافت کیا؟

اس لیے کہ کرک پیٹرک نے پوری قوت کے ساتھ کہا، تم ہی اس لڑکی کے عاشق زار ہو، اور تم نے ہی افیون ملی ہوئی مٹھائی بھجوائی تھی۔

افضل خان نے انتہائی غصے کی حالت میں کہا، زبان سنبھالو کرک پیٹرک، تم کیا کہہ رہی ہو، ہوش میں آؤ۔ نہ میں اس لڑکی کا عاشق ہوں، اور نہ ہی میں نے اس کو زہر ملی ہوئی مٹھائی بھجوائی تھی۔ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟

ہاں ثبوت ہے، بغیر ثبوت کے اتنی اہم اور ذمے دارانہ بات کون کہتا ہے، اڈنا کرک پیٹرک نے بیان کیا!

تکلیف میں کیوں توڑتی ہو، آخر بتاؤ بھی تو سہی کہ میرے بارے میں تم کو کیوں شبہ ہوا، چلیے میں تو اس معاملے میں بالکل ہی پاک صاف اور بے گناہ و بے خطا ہوں۔ افضل خان نے اپنی برات کی خاطر کرک پیٹرک سے کہا۔

افضل خان، یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ آج سے آٹھ دس روز پہلے تم نے اپنے گھر کی ایک ماما کے ذریعے تین کشتیوں میں رکھ کر عالا درجے کی مٹھائی، رحیم النسا کو بھجوائی تھی اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی تھی کہ وہ ساری مٹھائی خود رحیم النسا ہی کھائے اور کسی دوسرے کو نہ دے، اور اس مٹھائی میں تم نے افیون اس لیے ملا دی تھی کہ اس کے کھاتے ہی رحیم النسا ختم ہو جائے، اور تم اس کا خاتمہ اس لیے چاہتے تھے کہ تم اس حسین لڑکی پر دل و جان سے فدا ہو گئے تھے، مگر تم اس کو پا نہیں سکتے تھے

یہ سن کر افضل خان نے کہا اڈنا، یہ سب سے سو فی صد جھوٹ ہے، میں نے آج تک رحیم النسا کی صورت تک نہیں دیکھی ہے، اور نہ میں اس کا عاشق ہی ہوں، اڈنا، تم سے میں نے پہلی بار انگلینڈ میں محبت کی تھی، اور آج تک میں اسی محبت پر قائم ہوں، اور مجھ کو اس بات پر فخر ہے کہ میں نے تمہارے سوا، نہ انگلینڈ ہی میں، اور نہ ہی ہندستان میں کسی دوسری لڑکی سے محبت کی ہے، اڈنا کرک پیٹرک تمہیں چاہیے کہ تم ایک شریف انسان کی سچی باتوں پر بھروسا کریں، اس لیے کہ خدا میں بھی جھوٹ موٹ اور لغو باتوں کے کہنے سے گریز کرتا ہوں۔

ہاں افضل خان، خدا مجھ کو بھی یہ معلوم کر کے تعجب ضرور ہوا تھا، اس لیے کہ مجھ کو وہ دن بار بار یاد آتا ہے، جب برائیٹن BRIGHTON انگلینڈ میں میرے چچا کی لیڈی نیپٹرس لوائس LADY BEA TRICE BOYCE ہمیشہ ہی مجھ کو ڈانٹا کرتی تھی کہ میں ہمارے سنگ یا SOCIETY میں اس قدر گھلی ملی اور زیادہ اتنے زیادہ دیر تک کیوں رہا کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ میرے ہم وطن لڑکے اور لڑکیاں بھی اس بارے میں مجھ پر طعنے کیے بغیر نہ رہتی تھیں، کہ میں ایک ہندستانی کی محبت میں اس قدر وقت کیوں گذارا کرتی ہوں؟ ان کا خیال تھا کہ میں ایک انگریز لڑکی کی حیثیت میں نہایت ہی حسین اور خوبصورت ہوں، اور تم ایک ہندستانی کی حیثیت میں سراپا حسن کا لاجواب اور بے نظیر نمونہ ہو، اور ان کو اس کا احساس تھا کہ دونوں حسین دل ایک دوسرے سے قریب تر ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کی باتوں کی مطلق پروا نہ کی، بلکہ تم سے برابر محبت کرتی رہی، اور تم بھی برابر میری محبت کا جواب دیتے رہے۔ تم جب ہندستان آ گئے تو بھی میں نے تم کو نہیں بھلایا۔ ڈاکٹری کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد میں وہاں پریکٹس کرتی رہی، لیکن اس کے باوجود تمہاری یاد محو نہ ہو

رہی، اس لیے اپنے ماں باپ اور چچا کی مرضی کے خلاف، یہ بہانا کر کے ہندستان چلی آئی کہ ہندستان میں انگریز ڈاکٹروں اور خصوصاً لیڈی ڈاکٹروں کی زیادہ وقعت و قدر و منزلت ہوتی ہے۔ یہ تو سب بہانے ہی بہانے تھے۔ ان باتوں کا سہارا لے کر میں ہندستان چلی آئی اور وائسرائے کے دفتر کی سفارش سے میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ کے نام سفارشی چٹھی لے آئی تھی تاکہ وہاں ایک نئے مقام حیدرآباد میں ہر طرح سے رہنے سہنے کی سہولتیں میسر آئیں، اور یہ جانتے ہو، افضل خان یہ سب سہولتیں محض تمہاری خاطر تھیں۔

یہ ساری کہانی افضل خان نہایت ہی خاموشی سے سنتا رہا، اور آخر میں کہا، اڈنا، مجھکو تمہیں انکار ہے اپنی باتوں۔ میں تمہارے ایک ایک لفظ کی تائید کرتا ہوں، اور تمہیں پھر سے یقین دلاتا ہوں کہ میں وہی افضل خان ہوں جس نے پہلی بار برائی ٹی میں تم سے محبت کی تھی، وہاں رہنے تک صرف تم سے محبت کرتا رہا، ہندستان آنے کے بعد بھی اس کو تمہارے یاد دستاتی رہی، اور جب تم حیدرآباد آگئیں، اس وقت سے آج تک بھی میں تم سے اسی طرح محبت سے پیش آتا ہوں، اور میں تمہیں پکا یقین دلاتا ہوں کہ آیندہ بھی مرتے دم تک میں تم سے اور صرف تم ہی سے محبت کرتا رہوں گا۔

یہ سب دھوکے اور فریب کی باتیں ہیں افضل خان، کرک پیٹرک نے حقارت آمیز انداز میں کہا۔ اگر تم کو مجھ سے سچی محبت ہوتی تو پھر تم کسی دوسری لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھتے۔

میں کسی طرح سے تمہیں یقین دلاؤں اڈنا کہ تم بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہو، میں نے بالکل صاف صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے سوا کسی بھی لڑکی سے محبت نہیں کرتا ہوں، مگر تمہیں یقین ہی نہیں آتا ہے۔

میں دھوکے اور غلط فہمی میں مبتلا ہوں یا تم خود ہی غلط فہمی کا شکار بن گئے ہو، تم تو مجھ کو دھوکے اور فریب سے الو بنانا چاہتے ہو کہ تم حقیقت میں محبت تو کرتیں کسی اور لڑکی سے اور بظاہر میری محبت کا دم بھریں، سنو، افضل خان، کہتے ہوئے کرک پیٹرک نے غصے کے انداز میں کہا، میں کوئی اناڑی اور ان سمجھ یا نادان اور بے وقوف سی لڑکی تو نہیں ہوں، جس کو تم دھوکے میں رکھ کر اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے ہو! تمہاری یہ کوشش تھی کہ تم رحیم النسا سے شادی کرنا چاہتے تھے، اور جب یہ کوشش میں ناکام رہے تو مٹھائی میں افیون ملا کر بھجوائی اور یہ کہلوایا کہ ساری مٹھائی رحیم النسا خود کھا لے اور مر جائے، جب میری کوششوں سے رحیم النسا بچ گئی اور جب میں نے یہ سارا واقعہ تم پر واضح کر دیا، تو تم حیران اور پریشان ہو گئے اور پھر مجھ سے بچ سے محبت کا ناٹک رچانے لگے، یہ دھوکا اور فریب نہیں تو اور کیا ہے ——؟

یہ سب جھوٹ ہے، سفید جھوٹ ہے، صریح جھوٹ ہے، اڈنا کرک پیٹرک، کو انکارتے ہوئے افضل خان نے نہایت ہی عقلمندانہ انداز میں کہا، اور اس کا کردار تک ایک خاص جذبے کی وجہ سے سرخی میں تبدیل ہو گیا، اور شائستہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے افضل خان نے کہا، اڈنا یہ باتیں تو میرے خواب و خیال میں تک نہیں ہے، اور نہ آج تک رحیم سے کسی نے رحیم سے شادی کے بارے میں کوئی ذکر مذکور کیا ہے۔ اس لیے پھر سے یقین کامل دلاتا ہوں کہ شادی تو رہی ایک طرف، ہم دونوں کے درمیان پیام سلام کی بھنک میرے کانوں میں نہیں پڑی، اس لیے تمہاری کہی ہوئی جھوٹ موٹ باتوں کو میں کسی طرح سے باور کر لوں اڈنا کرک پیٹرک۔

یہ سن کر اڈنا کرک پیٹرک نے غصیلے انداز میں کہا، تمہاری جھوٹی اور بناوٹی باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا افضل خان، اور میں تم کو کہہ رہی ہوں [illegible] سے کہہ رہی ہوں کہ اس لمحے سے میں تمہارے مقابل تن تنہا ہوں، اور اس وقت سے اور

جذبے کی حالت میں تم مجھ سے جو چاہے بدلا لے سکتے ہو۔ مجھ کو سخت تعجب ہو رہا ہے افضل خان کہ رحیم النسا کو اپنوں ملی ہوئی منگنی سے متعلق انکار ہے، حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے، اور اس سلسلے میں تمہارے خطرناک فعل کے بارے میں مستند گواہ بھی پیش کر سکتی ہوں۔ اب جب کہ تم نے رحیم النسا سے اپنی محبت اور نامزدگی پیام کے بارے میں بالکل ہی انکار کر دیا ہے تو میں اس کو تمہاری سفید جھوٹ پر محمول کرتی ہوں، اس لیے کہ اس جھوٹ میں تیرے ہاں کافی سے زیادہ ثبوت موجود ہے۔ اس کے بعد بتاؤ کہ تم اپنی برات کس طرح چاہتے ہو!

اڈنا۔ مس کرک پیٹرک! تم اپنی زبان کو لگام دو، اور ہوش و حواس کو بحال رکھتے ہوئے سوچو کہ تم نے میرے بارے میں کس گستاخی کی ہے۔ تم حد سے تجاوز کر گئی ہو، اس لیے میں، ہم دونوں کے درمیان دوستی اور محبت کے بندھنوں کو توڑتے ہوئے سختی کے ساتھ تم سے کہتا ہوں کہ تمہیں جو رہنا ہے، انسانیت کے دایرے میں رہ کر اور شوخی سے گریز کرو۔ کسی بھی شریف شخص پر بے جا اور ناروا اور غیر شریفانہ حملے تم جیسی قابل لیڈی ڈاکٹر عورت کو زیب نہیں دیتے!

افضل خان کہتے ہوئے ہنس کرک پیٹرک گورے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا، اور ایک غصیلے انداز میں اس نے کہا، میں تو پورے طور پر ہوش میں ہوں، تم حد ہوش میں آنے کی کوشش کرو، اور دوسروں کو برا بھلا کہنے سے باز آؤ، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میری رگوں میں بھی میرے شریف انگریز ماں باپ کا خون دوڑ رہا ہے، اس لیے ایک شریف خون تمہاری بدتمیزیوں سے ڈر نہیں سکتی، اور دیکھو اگر وقت آن پڑے تو کہتے ہوئے اڈنا کرک پیٹرک نے اپنے کرتے میں چھپے ہوئے نیام سے ایک تیز اور چمکدار چیز نکالی، اور اپنے دہنے ہاتھ میں تھماتے ہوئے سیدھا جانب اٹھا کر کہا کہ اپنے بچاؤ کی خاطر اس کو میں اپنے کسی بھی دشمن کے سینے میں بھونک سکتی ہوں!

مس کرک پیٹرک، افضل خان نے سنجیدگی کے ساتھ کہا، اس وقت آدھی رات کو میں ایک عورت سے تن تنہا آزادی کے ساتھ بات چیت نہیں کر سکتا، تم کو میرا یہ مخلصانہ مشورا ہے کہ تم وہ خنجر نیام کرتے ہوئے اس وقت اپنے گھر چلے جاؤ۔ پھر کسی روز ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھ کر تفصیلی بات چیت کریں گے!

بہت خوب کہتے ہوئے اڈنا کرک پیٹرک نے اپنے خنجر کو نیام کیا، اور شب بخیر کا نعرہ لگاتے ہوئے دیوان خانے کے کمرے سے باہر ہو گئی، اور پھر اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد افضل خان بیڈ صوفے پر لیٹے ہوئے حقے کے کش پر کش لگا رہا تھا، اور اس کے چہرے پر فکر و تفکر کے گہرے آثار نمایاں تھے، اور اسی عرصے میں اس کے ذہن و دماغ میں وہ تمام پرانے اور دیرینا تعلقات کے خیالات اور تصورات دوڑنے لگے کہ انگلستان اور برائٹن میں کس طرح سے ان دونوں کے تعلقات بہتر تھے۔ اس نے اپنے دل ہی دل میں کہا کہ وہ ایک ہندستانی افضل خان ہی تھا، جس نے ایک خوبصورت انگریز لڑکی مس کرک پیٹرک کا دل موہ لیا تھا، اور وہ افضل خان ہی تھا، جس نے لندن میں اڑے وقت میں کرک پیٹرک کی مدد کی تھی، اور وہ افضل خان ہی تھا جس نے کرک پیٹرک کو ہندستان اور حیدرآباد میں آکر رہ بس جانے کا مفید مشورا دیا تھا۔ افضل خان ایک امیر کبیر جاگیردار گھرانے کا فرد تھا، جو تعلیم کی غرض سے انگلستان گیا تھا، اور ہر مہینا کافی سے زیادا رقم اس کے باپ حیدرآباد سے لندن بھجوایا کرتے تھے، اور وہ لندن جیسے مہنگے شہر میں بھی بلا تکلف امیرانا اور رئیسانا ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کر رہا تھا، اور ساتھ ہی وہ اپنی منتظر نظر اور نجیبانا مس کرک پیٹرک کی بھی تعلیم کے سلسلے میں کافی مدد کرتا تھا۔ مس کرک پیٹرک کے ماں باپ متوپارک میں ملازم تھے، انہوں نے اپنی لڑکی کو پابند ہدایت کی کہ وہ لندن سے نہ جائے۔ لیکن کرک پیٹرک لندن چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ رہی تو اپنی چچازاد بہن

برائیوں کے ساتھ برائی تھی میں، لیکن برائی جیسے خشک مقام کو وہ پسند نہیں کرتی تھی، بلکہ ہر وقت اور ہمیشہ لندن ہی میں رہا کرتی تھی۔ لندن میں افضل خان نے تعلیم کے سلسلے میں اور اس کے دوسرے اخراجات کے لیے بھی کافی سے زیادہ مدد کی۔ افضل خان کا قیام لندن میں پورے سات سال تک رہا۔

چونکہ وہ اڈنا کرک پیٹرک کو اپنا دل دے چکا تھا، اس لیے وہ خدا بھی لندن سے واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ ان دونوں کی محبت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ آپس میں شادی بیاہ کا معاہدا بھی طے ہو چکا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، بلکہ دونوں کے ملنے جلنے والے، یہاں تک کہ اڈنا کرک پیٹرک کی چچا زاد بہن بھی اس معاملے سے واقف ہو چکی تھی، اور اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی بھتیجی اڈنا کو ایک ہندستانی افضل خان کے ساتھ شادی کرنے سے منع کر دیا تھا، لیکن اڈنا نے اپنی چچا کی ہدایتوں کو بری طرح سے ٹھکرا دیا، اور افضل خان کو زبان دے چکی تھی کہ وہ شادی کرے گی تو صرف افضل خان سے، کسی اور سے نہیں۔

اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد افضل خان اپنے وطن حیدرآباد آنے پر مجبور ہو گیا، اور واپسی سے پہلے اڈنا کرک پیٹرک سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ صرف اسی کے ساتھ بیاہ رچائے گی، اور کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہرگز ہرگز شادی نہیں کرے گی۔

افضل خان کے واپس آنے کے بعد دونوں میں خط و کتابت ہوتی رہی، اور بار بار اڈنا کرک پیٹرک افضل خان کو یقین دلاتی رہی کہ اب بھی وہ اپنے پہلے وعدے پر قائم ہے اور حیدرآباد آ کر اس سے بیاہ رچائے گی۔

پنڈت خوشحال پانچ سالہ لوچنا

جن کے قول و فعل میں یکسانیت بالکل نہیں
وہ مکمل کیا کریں گے پانچ سالہ لوچنا
نائید الحق سے غریبوں کو تو ہو سکتا ہے کیا
یہ غریبوں کی ہے ماں اور مالہ لوچنا

مارٹر باسط بسوانی

قومی لوری

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منہ دھونے والے

ماں کے دلارے باپ کے پیارے — لخت جگر اے آنکھ کے تارے
گھر کی رونق گود کی زینت — مال مرے اے میری دولت
سو جا سو جا میرے پیارے — سو جا سو جا راج دلارے
تجھ پہ تصدق تجھ پہ واری — چھوڑ دے پیارے گریہ و زاری

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منہ دھونے والے

قوم کا اپنی نام کرے تو — دنیا میں وہ کام کرے تو
قوم کا سچا جانباز بنے تو — بیکس کا دمساز بنے تو
قوم کا اپنے پاس ہو تجھ کو — ملت کا احساس ہو تجھ کو
علم و ہنر کا ذوق ہے تجھ میں — فن ادب کا شوق ہے تجھ میں

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منہ دھونے والے

بخت کا تیرے تارا چمکے — تجھ سے نام ہمارا چمکے
دل سے ہر ہندی کا خواہی — دیس کے ہر کام کا حامی
گاندھی کی تقلید کرے تو — پنڈو کی تمہید کرے تو
خضر راہ و چند ہو تو — رہبر منزل گولانا ہو تو

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منہ دھونے والے

نام پتا کا لیتی ہوں میں — جگو اوری دیتی ہوں میں
سیپ ہو موتا پتا سن کر — سو جا میرے ننھے دلبر
سو جا میرے جان سے پیارے — سو جا میرے راج دلارے
گود میں آ کے آ نے سو جا — اے میرے نیند کے ماتے سو جا

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منہ دھونے والے

جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

"گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"

حیرت بدایونی اور اسکی ذلیل و ناپاک کتاب "لیڈرز فرسٹ"

حیرت بدایونی مانا ہوا ہمارے دیس ہندستان کا سخت ترین دشمن ہے!
حیرت بدایونی ہندستان کے (۵۰) کروڑ ہندوؤں کا جانی دشمن ہے!
حیرت بدایونی ایک خطرناک زہریلا ناگ ہے، جو ہندستان کے بڑے بڑے نیتاؤں ۔۔۔ دیس پتا مہاتما گاندھی۔ وزیر اعظم جواہر لال نہرو۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ راج گوپال چاری۔ پرشوتم داس ٹنڈن۔ وغیرہ وغیرہ کو ڈس کر ختم کر دینا چاہتا تھا!
حیرت بدایونی نے اپنی اس ناپاک اور ذلیل کتاب "لیڈرز فرسٹ" میں ہندوؤں کے اوتاروں اور دیوی دیوتاؤں کا مذاق اڑایا ہے!
سب سے بڑھ کر یہ کہ حیرت بدایونی نے ہندوؤں کی عزیز از جان "گاؤ ماتا" کی اپنے زہریلے نوک قلم سے دھجیاں ادھیڑ کر رکھدی ہیں!
ہمارے ان بامعنی اور بامقصد دعووں کا ثبوت، اس ناپاک اور

ذلیل ترین کتاب "لیڈیز فرسٹ" کے نیچے دیے گئے اقتباسات میں پڑھیے

"شان ہند دہلی" "ہندستانی دنیا" کے تبادلے میں آتا ہے۔ فروری ۱۹۷۳ء کے "شان ہند" کے صفحہ ۱۷ پر ہم نے یہ خبر دیکھی "دنیائے شاعری میں اپنی آپ مثال اگر آپ کو دیکھنا ہے تو علامہ حیرت بدایونی کا مجموعہ کلام دیکھیے اور پڑھیے گا۔ جو طباعت کی بہترین سے بہتر سے طے کر رہا ہے مفصل اعلان آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں۔ منیجر "شان ہند ــ دہلی ۶"

اس وحشت ناک خبر کو دیکھتے ہی، ہم نے کہا کہ دویا پرکاش سرور تونسوی، ایڈیٹر "شان ہند" محض پیسا کمانے کی خاطر ایک ماننے ہوئے ہندستان دشمن۔ ہندو دشمن۔ ہندو نیتاؤں دشمن۔ ہندو اوتار دشمن۔ ہندو دیوی دیوتاؤں دشمن۔ اور سب سے بڑھ کر ہندوؤں کی "مقدس گاؤ ماتا دشمنی" کو زہریلے اور خطرناک ناگ اور آدمی نما جانور حیرت بدایونی سے پورے پورے طور پر واقف ہوتے ہوئے اس ذلیل۔ کمینے۔ سستے نام نہاد شاعر کے کلام کا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ حالانکہ سرور تونسوی بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ایڈیٹر "ہندستانی ادب دہلی" ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۶ء تک "ہندستانی ادب" میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس ذلیل اور کمینے ہندو دشمن شخص اور آدمی نما جانور حیرت بدایونی کے بارے میں لکھا ہے، اور اس کی ذلیل ترین اور ناپاک کتاب "لیڈیز فرسٹ" کے اقتباسات بھی پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حیرت بدایونی مانا ہوا ہندو دشمن آدمی نما جانور ہے، جو ہندوؤں کو کبھی بھی بہتر نظر سے دیکھنا گوارا نہیں کرتا، اور ہر وقت ان کے اوتاروں اور دیوی دیوتاؤں اور ان کی مقدس اور جان سے زیادہ عزیز "گاؤ ماتا" کا مذاق اڑایا کرتا ہے

دویا پرکاش ایڈیٹر "شان ہند" کے لیے یہ کوئی راز نہ تھا اور کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہ تھی۔ اس لیے کہ "ہندستانی ادب" کے مختلف نمبروں میں ایک ہندو دشمن خطرناک شخص اور آدمی نما جانور حیرت بدایونی کی لکھی ہوئی ذلیل اور ناپاک کتاب کے کمینے اور سستے قسم کے اقتباسات کو ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھا ہوگا۔ دویا پرکاش سرور تونسوی "ایڈیٹر "شان ہند" ہندو ہیں، اس لیے ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ ایک ہندو آپ کے جانی دشمن اور ہندستان کے پچاس کروڑ ہندوؤں کے ازلی دشمن آدمی نما جانور حیرت بدایونی کے ان نازیبا، ناروا، ناپاک، ذلیل، کمینے اور سستے حملوں کو آپ کیسے اور کیونکر گوارا کیا؟ آپ کو تو چاہیے یہ تھا کہ "ہندستانی ادب" میں ایک ہندو دشمن اور ہندستان دشمن شخص حیرت بدایونی کے ان ذلیل اور کمینے حملوں کا "شان ہند" میں فوراً ہی دندان شکن یا ذلت توڑ جواب دیتے، اس لیے ہمیں سخت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حیرت بدایونی جیسے خطرناک اور کمینے شخص کے

دیا۔ آپ اپنے رسالے "شان ہند" میں کھلے طور پر اور دھڑلے سے یہ لکھتے
کہ تم ہندستان کے پچاس کروڑ ہندو بشمول ودیا پیکاش سرور تونسوی (ہندو)
ایڈیٹر "شان ہند"، دلی، ایڈیٹر "ہندستانی ادب"، حیدرآباد کے دل کی گہرائیوں
سے ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے اپنے موقر ماہوار رسالے "ہندستانی ادب"
کی مختلف اشاعتوں میں، ایک مارے ہوئے ذلیل اور کمینے، نیز سفلے اور خطرناک
اور بدالیشی ہندو دشمن یا دوسرے معنی میں آدمی نما جانور اور نام نہاد شاعر حیرت
بدالیونی کی ذلیل ترین، سفلی، ناپاک اور قابل حقارت اور ٹھکرائے جانے کے قابل
کتاب "لیڈیز فرسٹ"، کے اقتباسات پیش کر کے تمام ہندو برادری کو واقف کرایا
ہے کہ وہ حیرت جیسے ذلیل، کمینے اور سفلے شخص سے ہندو ہمیشہ ہی چوکنے رہیں،
اور کبھی بھی اس کمینے کو اپنے منہ لگنے نہ دیں۔ بجائے اس کے سرور تونسوی جیسی
ایک ہندو نے خدا اپنے مانے ہوئے جانی دشمن اور زہریلے خطرناک ناگ کو بری
طرح نظر انداز کر دیا اور اب اس ذلیل اور کمینے ہندو دشمن، ہندستان دشمن، ہندوؤں
کے اوتار دشمن، ہندوؤں کی دیوی دیوتاؤں کے دشمن اور سب سے بڑھ کر یہ کہ
ہندوؤں کی عزیز از جان مقدس گاؤ ماتا کے دشمن نمبر (۱) اور زہریلے اور خطرناک
شخص اور بری طرح ڈسنے والے زہریلے ناگ اور آدمی نما جانور اور نام نہاد شاعر
حیرت بدالونی کے ناپاک ترین کلام کا مجموعہ شائع کر کے **حرام کی کمائی** کمانے
پر تل گیا ہے۔ اس **کمائی** کو **حرام کی کمائی** کا نام ہم نے غلط نہیں دیا ہے،
اس لئے کہ ایک مانے ہوئے حرام زادے کا کلام بھی اسے حلال نہیں کر سکتا۔ حرام
اس اعتبار سے ایک **حرام** کے کلام کو شائع کر کے اس سے مالی استفادہ کرنا
صحیح معنی میں **حرام کی کمائی** ہے۔ کسی صورت میں ایک ہندو، ودیا پیکاش سرور
تونسوی کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ آیا اس کا یہ فعل مستحسن ہے۔؟ آیا
اس نے ایک مانے ہوئے حرام زادے ہندو دشمن، آدمی نما جانور کا کلام شائع کر کے
کوئی اچھی خدمت کی ہے۔؟ نہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔! ہمیں یقین کامل ہے
کہ ہر طرف سے یہی جواب ملے گا کہ خدا ایک ہندو دشمن، ودیا پیکاش سرور
تونسوی نے ہندوؤں، ان کے اوتاروں، ان کے لیڈروں، اور ہندو دیوی
دیوتاؤں، ہندوؤں کی مقدس گاؤ ماتا کے خطرناک اور بدالیشی دشمن اور خطرناک
ناگ اور آدمی نما جانور حیرت بدالونی کی سرپرستی کر کے کوئی قابل تعریف کام
کا ثبوت نہیں دیا، بلکہ اس کو تو چاہیے تھا کہ ایڈیٹر "ہندستانی ادب"، کی
طرح اپنے رسالے "شان ہند"، کے صفحوں میں بھی "لیڈیز فرسٹ"، کے
اقتباسات کو نقل کر کے زیادہ سے زیادہ ہندو برادری کو واقف کراتا کہ اے
میرے ہندستان کے (۵۰) کروڑ ہندو بھائیو، اپنی آنکھیں کھول کر دیکھو
اور عقل کی عینک لگا کر دیکھو کہ نام نہاد شاعر حیرت بدالونی کون ہے، اور
کیا ہے۔؟ وہ ایک نہایت ہی خطرناک شخص ہے جس نے حیدرآباد کے
پولیس ایکشن سے پہلے مجنوں اور پاگل قسم کے رضاکار نامی دل [illegible] اس نے اپنی ناپاک

صدر ڈاکو قاسم رضوی نے لکھا تھا، مگر اس کتاب کو پڑھ کر قاسم رضوی، جیسے ظالم شخص کا دل دہل گیا، اور اس کو مجبوراً اپنے مقدمے میں لکھنا پڑا کہ "لیڈیز فرسٹ" میں ہندوؤں پر حملے حد سے زیادہ تجاوز کر گئے ہیں"، اس کے باوجود وہ ذلیل اور ناپاک کتاب اپنے اصل متن کے ساتھ چھپی، اور اتنی ہندو دشمن دور کے ہندو دشمن رضاکاروں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور تھوڑے ہی عرصے میں اس ذلیل کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آگئی، چنانچہ اپنی پیدائشی اور ازلی دشمنی کے سبب اس ذلیل کمینی نیز ناپاک ہندو دشمن کتاب کی جوتوں کے طفیل آدمی نما جانور حیرت بدایونی نے ہزاروں ہی روپیہ حرام کے طریقے پر کمایا۔ ہم نے اس ذلیل اور کمینے ہندو دشمن شیطان محمد عمر کو بار بار آدمی نما جانور لکھا ہے، یہ غلط نہیں ہے، اس لیے کہ اس کی شکل و صورت بندر یا ریچھ کی سی ہے، اور وہ عزا بھی ریچھ کی طرح ہے!

ودیا پرکاش تم خدا بھی ہندو ہوتے ہوئے ایک ہندو دشمن نسل حرام حیرت بدایونی کے ہندو دشمن خطرناک کارناموں کو کیوں بھلا دیا، اور خدا بھی ایک بات کہتے ہوئے ہندو دشمن حرام زادے نام نہاد اردو نقاد تم مشاعرہ کے کلام شعرو شاعری کر کے اس سے ناجائز اور غلط قسم کا استفادہ کرنے پر کیوں تل گئے؟ یہ ہمارا کھلا سوال ہے — اس کا پورا پورا جواب دو ورنہ یا یہ تسلیم کر لو کہ تمہیں ہندو دشمن حیرت بدایونی کا کوئی خیال نہیں ہے، اور تم تو صرف پیسا کمانا جانتے ہو۔ چاہے وہ حلال کے طریقے پر ہو یا حرام کے طریقے پر کیوں یہ سچ ہے نا، ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم حیرت بدایونی کو ایک ہندو دشمن جانتے ہوئے بھی اس کا کلام ہرگز ہرگز شایع نہ کرتے!

پیسے کے مرید اور زر پرست (ہندو) ودیا پرکاش، ایڈیٹر "شان ہند" محض پیسا کمانے کی خاطر ایک ظالم خبر مخبرے۔ حرام زادے اور نسل حرام آدمی نما جانور یا ریچھ حیرت بدایونی کی غلط طریقے پر سرپرستی مت کرو بلکہ یہ دیکھو کہ ذلیل سفلے کمینے نام نہاد شاعر نے اپنی ذلیل۔ کمینی اور سفلی کتاب "لیڈیز فرسٹ" میں کیا لکھا ہے — تم یقین جانو کہ اس نے ہمارے دیس ہندستان کی اور دیس کے تمام ہندو نیتاؤں، اور ہمارے ہر دلعزیز ہندو لیڈروں، نیز مشہور مشہور ہندو ہستیوں، مختصر یہ ہے کہ ہندستان کے کروڑوں ہندو بھائیوں، ان کی مقدس دیویوں اور دیوتاؤں، ان کے بزرگ اور قابل احترام اوتاروں، اور کروڑوں ہندوؤں کی جان سے بھی زیادہ گاؤ ماتاؤں، اور ہندو ماؤں اور بہنوں، نیز ہندو پاک استریوں، اس کے علاوہ ہندوؤں کی صدیوں پرانی تہذیب اور کلچر اور ان کے رہن سہن کے طریقوں، نیز ان کے خاص اور مخصوص بھوجن یا کھانے پینے کے طریقوں، اور ان کے لباس، اور خصوصت کے ساتھ ہندو تہذیب اور کلچر کی واحد نمائندہ چوٹی وغیرہ وغیرہ کا کھلے طور پر اور بڑی طرح سے مذاق اڑایا ہے، جس پر ودیا کی طرح بار بار عزا اور اس پر فخر و مباہات بھی کرتا ہے! ودیا پرکاش خدا نہ ہندو ہوتے ہوئے، اور پیدا کیے گئے ہندوؤں کو کیسے

خرداد۔تیر۔امرداد ۱۳۵۲ اف ہندستانی ادب اپریل۔مئی۔جون ۱۹۷۳ء

اور انسان دوست آدمی ہرگز ہرگز گوارا نہیں کر سکتا، اس لیے بحیثیت "ایک انسان کامل" اور "انسان دوست" خدا میں بھی سخت تکلیف ہوئی، چنانچہ اس نفرت کی ناپاک اور ذلیل کتاب "لیڈیز فرسٹ" کے پڑھنے کے بعد ہمیں سخت ناگوار گذرا، اسی وجہ سے اس کے بیدلی کے برے گنون، بد باطنی، اور ہندو دشمنی سے واقف ہونے کے فوراً بعد ہم نے موقع موقع سے "لیڈیز فرسٹ" کے اقتباسات "ہندستانی ادب" کے نمبروں میں دینا شروع کر دیئے، تاکہ ہندستان کے کروڑوں ہندو، ایک نیٹ گدھے، نرے بے قوف، سراسر پاگل، حد درجہ مجنون، الو کے پٹھے اور خر مغز ے، آدمی نما جانور اور ریچھ کی فطرت اور جبلت سے واقف ہو سکیں کہ حیرت بدایونی حقیقت میں سو فی صد ازلی اور پیدائشی ہندو دشمن شخص ہے، جو ہر طرح سے ہندوؤں کی تباہی اور بربادی چاہتا ہے، نیز ان کو نہ صرف ہندستان، بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا ہے، جس میں تم خود بھی شامل ہو۔ ہندو، ودیا پرکاش، ایڈیٹر "شان ہند" دلی، بتاؤ، اور فوراً جواب دو کہ آیا ایک ظالم اور غنڈے ہندو دشمن کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونا گوارا کر سکتے ہو۔ ؟ نہیں، تم اپنی تباہی بھی نہیں چاہتے ہیں، اور دوسری طرف تمہیں پیسے کا لالچ بھی ہے، مگر تم نے اس حقیقت کو بھلا دیا ہے کہ تم جس کو اپنا دوست سمجھتے ہو، وہ حقیقت میں تمہارے حق میں مار آستین بنا ہوا ہے، جو خدا نہ کرے کسی آن، اور

کسی بھی لمحے بھی ڈس کر ڈھیر کر دیگا! آخر میں ہم ساری دنیاے ہندو برادری سے پرزور طریقے پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایک ہندو، ودیاپرکاش سرور تونسوی، ایڈیٹر "شان ہند" نئی دلی ۶ کو ایک پیدائشی ہندو دشمن حیرت بدایونی کی سرپرستی اور دوستی سے باز رکھیں! واضح رہے کہ کچھ عرصہ پہلے ایک چار صفحے کے خط کے ذریعے اطلاع دی تھی کہ ہم نے فروری ۱۹۷۳ء کے "شان ہند" میں آپ کا یہ اعلان دیکھا ہے کہ آپ ایک پیدائشی اور ازلی ہندو دشمن آدمی نما جانور اور نام نہاد شاعر حیرت بدایونی کا مجموعے کلام شایع کرنا چاہتے ہیں جس کے انتظامات تیزی کے ساتھ ہو رہے ہیں۔ ہم نے ودیاپرکاش (ہندو) ایڈیٹر "شان ہند" کو آگاہ اور متنبہ کیا کہ آپ فوراً اپنے اس حریص اور لالچی، ناپاک اور گندے ارادے سے باز آئیں، آپ دوسرے نیک نام شاعروں کا کلام اور ان کے مجموعے شایع کر کے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایک پیدائشی ہندو دشمن نام نہاد شاعر کی غلط سرپرستی کر کے خدا بچائے ہندو دشمنی ہے۔ آیا ایک ہندو سے ہم یہ توقع رکھیں کہ خدانخواستہ ہندو برادری کو زہریلا اور خطرناک ناگ بن کر ڈس دے گا! ہم نے آخر میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ ——

IF YOU TOTALLY IGNORE OUT OUR REQUEST, YOU WILL HAVE TO BEAR THE DIRE CONSEQUENCES. ——

اور وہ ہیں یہ DIRE CONSEQUENCES جو ایک ہندو اور حریص اور لالچی نیز زرپرست ودیاپرکاش، ایڈیٹر "شان ہند" کو بھگتنے پڑ رہے ہیں —— اور —— آگے چل کر بھی —— بھگتنے پڑینگے، جس کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ!

پیسے کا لالچ [illegible] اور طاغ، اور بنیا اور بقال، صفت زرپرست اور ہندو دشمن دلہا

اور کمینے فرعون صفت نام نہاد شاعر اور آدمی نما جانور
حیرت بدایونی کے نام نہاد دوست، مربی، اور سرپرست
تمہیں شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔ خدم تم بھی ہندو دشمن
سرور اپنی مفرور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ ایک ہندو دوست
"انسان کامل" "ایڈیٹر" ہندستانی ادب" نے ۱۹۵۸ء
سے ۱۹۶۶ء تک، ہندستان کے کروڑوں ہندوؤں کو
ان کے ایک ازلی اور پیدائشی دشمن آدمی نما جانور حیرت
بدایونی کی ناپاک ترین، ذلیل ترین، سفلی اور قابل
حقارت، نیز ٹھکرا دی جانے والی کتاب "لیڈیز فرسٹ"
کے اقتباسات موقع موقع سے پیش کر کے کس طرح سے
آگاہ اور ہشیار کیا تھا کہ اے ہندو بھائیو، آپ ہمیشہ ہی
اس ذلیل ترین ہندو دشمن حیرت بدایونی سے چوکنے
رہیں، اس لیے کہ وہ آپ کا پیدائشی دشمن ہے، اور
ایک خطرناک ناگ بھی ہے جو بروقت ڈس ڈس کر
اس کو بھسم اور ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اس شیطان مجسم
اور ظالم حرامزادے کو ہندوؤں سے ازلی نفرت ہے
اور اپنی اس فطری، ازلی، اور پیدائشی نفرت کو

خدا اس نے اپنی اس ناپاک کتاب "لیڈیز فرسٹ" سے دیا ہے۔ اب ہم سنہ وار اور سلسلہ وار "ہندستانی ادب" کے متعدد نمبروں سے وہ اقتباسات پیش کرتے ہیں جو کچھ عرصا پہلے ہم نے "ہندستانی ادب" کے مختلف نمبروں میں شایع کیے تھے۔ عقل کے اندھے ــــ ہندو ودیا پرکاش ــــ سب سے پہلے تم اپنی حرص اور ــــ لالچی اور بند آنکھیں کھول کر دیکھو کہ ذلیل اور دیوانا کتا RABID DOG ہندوؤں کے خلاف کس طرح سے بھونکتا ہے۔! ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

ہمارے خیالات
"ہندستانی ادب" جلد (۱۹) نمبر (۱)
بابت اکتوبر ۱۹۵۸ء
صفحا (۶) اور (۶) سے آگے

"لیڈیز فرسٹ"

از حضرت بدایونی

"لیڈیز فرسٹ"، کیا ہے، اور اس میں کتنی ناپاکی اور گندگی بھری پڑی ہے، اور اس سے ہندو تعصب اور ہندو دشمنی کی کتنی ہی کراہت آمیز مجلوت آئی ہے، اس سے پورے طور پر واقف کرنے سے تو مجبور رہیں، لیکن اس کی فرعون نمائی کے چند اقتباسات بطور "مشتے نمونہ از خروارے" ضرور نقل کریں گے۔ ــــ سو جس کا سہی ابتدا

آگ کے شعلوں سے کی گئی ہو، اس کی انتہا کیا کچھ ہوگی!

"اقتباس" (یعنی ڈیڈیکیشن) اس آگ کے نام جو آج کل ہمارے دلوں میں لگی ہوئی ہے ــــ حیرت" (لیڈیز فرسٹ صـ۳) حیدرآباد کے مشہور رضا نگار لیڈیز تاسم رضوی نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے، ابتدائی ریمارکس میں ا۔ بنطلماب کہا اور لکھتے ہوئے ہم نے بھی شمار کرا تو نے لکھا ہے کہ ــــ

"اس جدید کتاب میں حیرت صاحب نے ہندستان کی سیاسی جدوجہد اور سیاسی حرکات پر ایک شدید قسم کا طنز کیا ہے، جو میری رائے میں کہیں کہیں اعتدال سے باہر بھی ہے" (ص۱)

"الامان! الحذر!! تاسم رضوی جیسے شدت پسند کے قلم سے یہ الفاظ کہ "جو کہیں کہیں اعتدال سے باہر بھی ہے"، اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مصنف نے کیا کچھ زہر نہ اگلا ہوگا، اور حقیقت بھی یہی ہے ــــ اس کتاب کے چند ایک کردار بھی ہیں، جن میں سے دو کی تعریف مصنف نے یوں کی ہے ــــ

مرد ــــ "گاؤں کے وہ مجبور باشندے، جو چودھری (یعنی انگریز) سے پہلے اس گاؤں (مراد ہندستان) کے زمیندار (یعنی مالک) تھے۔ مردانگی جن کا سلسلہ پیشا ہے (کیا کہنے مردانگی کا کافی ثبوت مل چکا ہے) مرد پیدا ہوتے ہیں، مرد جیتے ہیں، اور مرد ہی مرتے ہیں، خدا کے سوا نہ کسی کو مانتے ہیں اور نہ کسی سے ڈرتے ہیں۔"

(ظاہر ہے کہ مرد سے مراد مسلمان ہے) ص۲۱

ایک دوسرے کردار کی مدح سرائی نیچے کے لفظوں میں کی گئی ہے ــ

عورت ــــ "اس گاؤں کی وہ خانہ نشین پوڑھی دارجتا جس نے جنم بھر کبھی گھر سے باہر پاؤں نہیں رکھا، ہمیشہ کسی نہ کسی مرد کی نگرانی میں ہی رہی" (مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ ہی ہندوؤں پر حکومت یا راج کرتے رہے)

اوہام پرستی جس کی گھٹی میں ہے۔ زر و زیور پر جان دیتی ہے، مظلوم و معصوم بن کر مردوں کو فریب دینا جس کی فطرت ہے۔ (غور تو فرمایئے کتنے شدید حملے اور کتنی ہی سخت چوٹیں ہیں) گھر کی رانی بننے کے لیے مردوں کی جان لینے میں بھی جس کو دریغ نہیں، جیو ہتیا کو پاپ کہتی اور بن سمجھتی ہے" (عورت سے مراد ہندو ہے) ص۲۲،۲۱

کتاب کے بارے میں مصنف کی خدا ہی جانے سن لیجیے ــ ارشاد فرماتے ہیں ــــ

"میری کتاب، میرے دل کی ترجمان، میرے ضمیر کا عکس، میرے خیالات کا آئینا اور میری روح کی آواز ہے" ص۲۵،۲۴

کیا کہنے! "روح کی آواز" کے، اب ذرا اس آواز کو بھی سن لیجیے آپ ــــ

ــــ (مخاطب نشان مرد کے کردار کا ہے)

اجی دیوی جی۔ تم تو دنیا کی تاریخ میں پہلی میدان میں آنے کی کوشش کر رہی ہو (ہندستان کی تقسیم سے پہلے کی سیاسی کشمکش کو ہر وقت پیش نظر رکھیے، اس وقت ہر چیز آسانی سے سمجھ میں آجائے گی)

اور وہ بھی چودھری (انگریز) کے بل بوتے پر۔

ظاہر ہے کہ عورت (ہندو) کسی نہ کسی مرد (مسلمان) ہی کے سہارے جیتی ہے، سچ سچ (اگر) گنگا تو آج تک نہ بہی ہے نہ بہے۔ اور یہاں تو ایسے کھیل کھیلتے تیرا سو برس ہو گئے (غور طلب ہے) اکثریت سے ڈرتے تو رہگستان (مراد عربستان) سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل نہیں سکتے تھے۔ خدا اس گاؤں (یعنی ہندستان) میں آئے ہوئے بھی ہزار سال سے زیادہ ہو گئے۔ یہی تم اور یہی ہم۔ کل تک ہم برے نہ تھے۔ آج تم برے ہو گئے۔ جب ہم ہزاروں کی تعداد میں تھے، تب ہم اقلیت میں نہ تھے۔ اب ہم دس کروڑ ہیں تو ہماری اقلیت کا سوال اٹھا اور تمہاری سبھا (مراد قوم) کو تم نے بڑھاوا یا تو بڑھتی (انتہائی غور طلب جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوؤں کی تعداد کو حیرت بدایونی جیسے مردود مسلمانوں نے بڑھایا) ص۳۳

مرد (یعنی مسلمان) کے دل کی حقیقی آواز تو ملاحظہ ہو ــــ

ــــ اس میں شک بھی کیا ہے گذشتہ چھ سات سو برس میں ہی اگر ہمارے بہادر بادشاہ (مراد مسلمان بادشاہ) اپنی تبلیغی مہم شروع کر دیتے تو آج عجائب خانے میں تمہاری (مراد ہندو) صورت نظر نہ آتی۔ ہماری اقلیت اور اپنی اکثریت کا سوال اٹھانے والی ایک ہستی بھی دنیا میں موجود نہیں ہوتی۔ ہمارے بزرگوں نے ہمارے ساتھ نیکی کر کے حقیقت میں ایک زبردست گناہ کیا، جس کا خمیازہ اب ہمیں بھگتنا

پڑ رہا ہے۔ کہنے والے نے بلکل سچ کہا ہے کہ ؎

نکوئی با بداں کردن چناں است

کہ بد کردن بجائے نیک مردان ؎

آگے چل کر پھر سے وہی مرد کہتا ہے ــــ

"جب تک وہ (مراد ہندو) ہمارے رہے، ہم نے ان کو سر پر بٹھایا، چار چاند لگائے، مگر جس دن سے انھوں نے ہم سے علحدگی اور جداگانہ کی پوجا میں اپنا فائدہ دیکھا، ہم نے ان کو ٹھکرا دیا۔" (کشتی زور دار سے ٹھوکر آپ کی ــــ کیوں نہ ہو، آخر مرد جو ٹھہرے) صفحہ ۴۱ مرد (مسلمان) کی دلی تمنا کی ایک اور ناسی مثال دیکھیے ــــ

"ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ گاؤں (مراد ہندستان) میں مردانا مکان الگ (مطلب یہ کہ مسلمانوں کا ملک الگ) اور عورتوں (ہندوؤں) کا گھر (ملک) الگ ہو، کی ہم اپنے گھر خوش، تم اپنے گھر خوش (تقسیم ہندستان کی ڈیمانڈ اور تڑپ تھی) کھانے کو ملے (آزادی سے رہنے کے لیے) آپس کے جھگڑے سے ایک دوسرے سے ملتے رہیں تو اچھا ہے، ورنہ نتیجہ تو کہ اتنا بڑا گاؤں (مراد سارا ہندستان) تم (مراد عورت یا ہندو) آسانی سے ہضم نہیں کر سکتی۔ ابھی چودھری (انگریز) کے علاج سے اولاد نکلا بھی نہیں، اور ہم سے تکرار کرنے لگیں۔" صفحہ ۴۲

"چودھری کو یہ بھی معلوم ہے کہ اپنی قوتِ برداشت اور نا اہلیت کو اپنا کے کھیر اسے تم نے چھپایا ہے۔ بچے کو میرا نہ پیدا کا تو کون بچائے گا ــــ ابھی آج اتنی اور بچی کاریں ملک بیت جائیں گے اور طلے ملائے کا خانہ بھی نہیں۔ رہی تو بچی (مراد ہندو) کی بات (مراد ہندو) یعنی ہندو سے بات بنانے کی بات بھی بند۔" صفحہ ۴۲

"یہ ناممکن ہے کہ ــــ چودھری کی غلامی سے ہماری غلامی میں منتقل ہو جائے۔ (مراد ہندو کی غلامی) مصنف اور دعوے دار مرد، ہماری غلامی میں منتقل ہو چکے ہیں اور ہماری [illegible] کی [illegible] غلامی [illegible]" صفحہ ۴۲

بہادر "مرد" کی نیت تو دیکھیے ــــ

"فی فی مینڈک کی (مراد عورت یا ہندو) تمہیں زکام ہو گیا ہے۔ اس زکام کا علاج ہم جانتے ہیں اچھی طرح سن لو۔ تم ہی میں سے چھٹ کھنے اسے مان لیں تو مان لیں، کوئی مرد تو مانے گا نہیں، مرد (مسلمان) گاؤں (ہندستان) میں رہے گا تو خود مختار و آزاد ہو کر رہے گا۔ ورنا ایک یہ گاؤں کا کیا دنیا کو ٹھکرا دے گا" (ارے واہ رے مرد! خدا ہی ٹھوکریں کھاتا پڑا ہے) ہمارا حصا ہم سے کوئی چھین لے سکتا ہے، صفحہ ۴۵

اب ذرا "مرد" (مسلمان) تیری گھن گرج بھی سن لیجیے!

اچھا اب یوں آئیے دیوی جی ــــ تو سنو، ہم نے اس ملمی چوڑی دنیا میں تیرا سو برس سمجھن گا کا کر ہنس گذارے ہیں۔ ہماری رزم بزم کی داستانوں سے تاریخ کے صفحے سیاہ ہیں۔ ہم نے عیش بھی کیے ہیں، اور فاقے بھی، ہم نے بکریاں بھی چرائی ہیں اور فوجیں بھی بٹھائی ہیں، تاج بھی پہنے ہیں اور خنجر بھی، شکستیں بھی دی ہیں اور شکستیں کھائی بھی ہیں، لڑائیاں ہاری بھی ہیں اور جیتی بھی ہم شہ رگ کے چشموں سے خون کے فوارے چھوڑ کر دریا بہائے ہیں۔ عید و گلال کی پچکاریوں سے ہولی کھیلنا ہم مردوں کا شیوہ نہیں۔ اس بڑی دنیا کے میدان میں ہماری طرح بھی تم نے قدم رکھا ہو تو بتاؤ ــــ ایسا شہ تیرِ نظر کھیں آتا، ہمارا تو کا دکھتی ہو خنجر دار ہو جاؤ کہ سینا شہ مرد انہیں ہے، اس کو چھیڑ کر جنگا نا موت کو بلانا ہے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ شیر کا جنگل شیر کے لیے چھوڑ دیا جائے اور گائے اپنے گاؤں میں رہے۔ شیر اور گائے کیسے برابر ہو جائیں گے۔ جن کی فطرت اور خصلت بلکل ایک دوسرے کے خلاف ہے۔ ایک شیر کے مقابلے میں جتنی گائیں ہیں کی اکثریت بھی اکثریت ہے یا در کھو اگر شیر کو گاؤں کی اکثریت [illegible]

شیر اس کی پروا نہیں کرتا۔ لومڑیوں اور گیدڑوں کو بدنام کرنے کے سوا، اور آتا ہی کیا ہے، وہ اس سے زیادہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ بندروں کی بھپکیوں اور لومڑیوں کی مکاریوں کو شیر خوب سمجھتا ہے۔ مویشیوں کے بنائے ہوئے پرامن قانون کے رنگین فریب میں اگر شیر آگیا ہوتا تو تاریخ عالم کے صفحات سے شیر کا نام ہی نیست و نابود ہوگیا ہوتا ــــ گیدڑوں اور بندروں کے گڑھے ہوئے اصول وضوابط پر طاعت گذاری کے ساتھ کاربند رہنا شیر کی توہین ہے۔" ص ۲۷

"شیر کتا نہیں ہے جو ٹریننگ کے بعد مہذب بن جائے اور مالک کے پیچھے دم ہلاتا پھرے۔ وہ بندر نہیں ہے جو مداری کے اشاروں پر ناچے۔ وہ شیر ہے، شیر۔ اس کی شاہانہ خصلت۔ اس کی بے تصنع معاشرت، اس کی عسکری شجاعت ساری دنیا سے جدا ہے۔ وہ اپنے خصوصی و فطری امتیازات کو مٹا کر بیل نہیں بن سکتا ــــ دودھ دینے والی گیو ماتاؤں کے گلے میں بھوکے شیروں کو کیوں رکھنا چاہتی ہو، غلامی کے زمانے کی بات اور تھی گائے بھی پنجرے میں اور شیر بھی، لیکن آزاد ہونے کے بعد تم چاہتی ہو کہ شیر گائے کی غلامی کرے، آخر آزادی کیا ہے، شاید شیر پر شکار کا الزام لگا کر بند و بست جلوا دینے کا خیال ہے۔ گوشت کھانے والا جاندار گھاس کھانے والے جانور کے ساتھ ہرگز نہیں رہ سکتا۔ اس کی ٹکروں میں گرج اور گردن میں اکڑ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ دونوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ گائے اپنے گاؤں میں رہے اور شیر اپنے جنگل میں رہے۔ شیر اور گائے کا ساتھ ہوا [illegible] ہو۔" ص ۲۸

شیر کا [illegible] جنگل [illegible]!

"مدعا یہ ہے کہ ہم تمہاری خاطر
اپنی فطرت بدل دیں، یہ تو نے

گایوں کی تعداد زیادہ ہے، لہذا
گاؤں کی رانی بنیں گیو ماتا" اور
اپنی کمی تعداد کے لحاظ سے میاں
شیر خاں بن جائیں رانی کی پرجا
اور ماتا جی کے پجاری ــــ واہ
واہ کیا قانون ہے۔ اچھا دیوی،
تمہیں مہادیوی کی سوگند، دھرم
سے کہنا یہ تمہاری کاغذ کی ناؤ،
جس کو تم گنگا جی کے دھارے پر
چھوڑ رہی ہو، کیا پار لگے گی؟ یہ
سانجھے کی ہنڈیا جو تم پکانا چاہتی
ہو، کیا چوراہے پر نہ پھوٹے گی؟" ص ۹

کھونٹے سے بندھے رہنا ایک عام محاورا ہے جو موقع محل کے لحاظ سے مختلف معنی میں استعمال ہوتا ہے، یہاں جن معنی میں استعمال ہوا ہے ــ سمجھ لوگے۔ بہتر طریقے پر سمجھ سکتے ہیں ــ

"گائے کو تو کسی نہ کسی کھونٹے
سے بندھے رہنے کی عادت ہے،
بندھی رہے گی، لیکن شیر اگر
پنجرے میں رہے تو آزاد نہیں،

اگر آزاد رہے تو شیر کو گائے کے گوبر سے نفرت اور گائے کو شیر سے ہیبت۔ گائے کا خوف اور شیر کا غصا دونوں اپنی اپنی جگہ قایم۔ اس اجتماع ضدین کا نتیجا ظاہر ہے کیا ہوگا، لہذا شکاری اور چکاری جانوروں کا مل کر رہنا ممکن ہی نہیں۔ ہاں اس حیلے سے شیر کو آسانی سے مقید کیا جا سکتا ہے۔ اس کی آزادی سلب کی جا سکتی ہے، ہم پھر جتاتے ہیں کہ دیوی یہ بیل منڈوے نہیں چڑھے گی۔ بھیڑیوں اور چیتوں کی آواز، شیروں کی آواز نہیں ہے۔ شیر کی کھال پہن لینے سے سچ مچ کوئی شیر نہیں ہو جاتا۔ شیر کا دل، شیر کی آنکھیں، شیر کے دانت اور شیر کے پنجے کہاں سے لاؤ گے، مشترکہ قومیت کے جال میں، اگر شیر کو پھانسنے کی کوشش کی گئی تو رسیوں کے پرزے اور زنجیروں کے ٹکڑے کر دیے جائیں گے۔" ص ۴۹، ۵۰

"ہمیں بھی اور چودھری (انگریز) کو بھی معلوم ہے کہ تم (عورت یعنی ہندو) میں کتنا دم ہے۔ دو چار ہاتھوں کے بعد ایک پانسا ایسا پھینکیں گے کہ لکشمی کی دی ہوئی ساری مایا ایک ہی ہاتھ میں پھر سمیٹ لیں گے (حسن ظن ملاحظہ ہو، یعنی یہ کہ پھر سے انگریز قبضا جالیں گے) آنکھیں پھاڑ کر رہ جاؤ گی کہ بھگوان یہ کیا ہو گیا۔" ص

ہمیں نہیں آتا کہ ہم کہاں تک ایسی ناپاک خیالیوں پر پیش کریں، ہندی کی کتاب ہی اس قسم کی گندگیوں اور [illegible] سے بھری ہوئی ہے، اس

کتاب کے ہر لفظ سے گھن سی آتی ہے، ہر جملے سے عفونت ٹپکتی ہے اور اس کے ہر صفحے سے نرا تعصب اگلتا محسوس ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس بدنفس اور بدباطن فرد نے ہندو بھائی بہنوں کی توہین اور ہتک کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ ان کی عزت و آبرو اور ننگ و ناموس پر نہایت ہی نازیبا سخت اور شدید قسم کے حملے کیے ہیں۔ ان کی دیویوں دیوتاؤں کا کھلے طور پر مذاق اڑایا ہے اور ان کی عزیز از جان مقدس گاؤ ماتا کا بھی مذاق اڑایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام صورتوں سے ہمارے ہندو بھائی بہنوں کو بڑا ہی دکھ اور دلی صدمہ پہنچا ہوگا اور ان کی "حیثیت عرفی" ہر طرح پر آوزری طرح سے متاثر ہوئی ہوگی۔ اس کے ازالے کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ اس ہندو دشمن، دیوی دیوتا دشمن، گاؤ ماتا دشمن، ہمارے عزیز لیڈر دشمن، اور سب سے بڑھ کر "ویس پتا" مہاتما گاندھی دشمن شخص پر مذکورہ بالا ۵۰۰ اور ۵۰۶ (آئی۔ پی۔ سی) کے تحت "ازالے حیثیت عرفی" DEFAMATION کا کیس چلایا جانا چاہیے۔ ہمارے نزدیک ہندو مسلمان سب برابر ہیں، ہم کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے، ہم "انسان" ہیں، "انسانیت" پرستی ہمارا شیوا ہے، اس لحاظ سے بحیثیت انسان دوست، اس مقدمے میں ہم اپنے ہندو بھائی بہنوں کا ساتھ دینے کے لیے ہر وقت تیار ہیں، اور اگر حالات اور واقعات اجازت دیں تو ہم خود ہی اس مہاتما دشمن" کے خلاف مقدمہ دائر کر دنیا پر یہ واضح کر دیں گے کہ "انسان دوست" شخص بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک کا ساتھ دیتا اور ہر ایک کی حمایت کر سکتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں سے ہماری عرض!

ہندو مسلمان بھائی بہنوں سے ہم یہ عرض کر [illegible]

کو جذباتی نقطے نظر سے ہرگز نہ جانچیں، بلکے دونوں بھی ٹھنڈے دل سے غور کریں، اور ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کو خوب خوب سوچیں سمجھیں اور یہ کہ بلکل ہی صاف دلی سے اس مسئلے پر دھیان دیں۔ ہم کھلے طور پر یہ کہے دیتے ہیں یہ مسلہ ہرگز ہرگز فرقہ وارانہ نوعیت کا نہیں ہے، اس لیے اس اعتبار سے اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی جائے۔ ہندو برادری سے ہمیں پکا یقین ہے وہ اس بحث کو جماعتی یا فرقہ واری رنگ نہ دے گی، اور مسلم بھائیوں سے بھی ہمیں آشا ہے کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ اس پر آشوب دور اور پریشانی میں ایک نیا فتنا کھڑا کیا گیا ہے، جس کے نتیجے کے طور پر عام مسلمان متاثر ہوں گے۔ یہ خیال سراسر غلطی پر مبنی ہوگا، اس لیے کہ یہ کسی جماعت یا فرقے کا فعل نہیں ہے، بلکے صرف ایک بدنفس شخص کی ہیجانی کا مظاہرا ہے۔ خصوص جب کہ یہ بدبخت آدمی بار بار پھیچ پھیچ کر، ایک سے زیادہ مرتبا چلا چلا کر اور برخد غلط طریقے پر پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ۔

"مجھے کسی جماعت کی نمایندگی کا فخر حاصل نہیں ہے۔" (۱۸، ۱۹ لیڈیز)

صرف یہی نہیں، بلکے زیر بحث کتاب کے خود اس کی دلی آواز ہونے کا ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے، جس کو ضرورت نیچے بھی دہرایا جاتا ہے۔

"میری کتاب، میرے دل کی ترجمان، میرے خیالات [illegible]

کا آئینا اور میری روح کی آواز ہے۔"

(ص ۲۵ لیڈرز فرسٹ)

جدید مصنف کو اس بات کا علم نہ ہے کہ اس کی کتاب اس کے دل کی آواز ہے تو پھر عام مسلمانوں کو ان گندے خیالات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ جس نے کیا وہی بھگتے گا۔ وہ چاہے جل بھن جائے یا جہنم میں، اپنے کرتوتوں کا بدلا پائے گا۔ یہ محض شخصی بحث اور شخصی سوال ہے، اس لیے عام مسلمانوں کو کسی اور نقطۂ نظر سے ہرگز غور نہ کرنا چاہیے اور نہ ہندو ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں — ہندو بدلا لیں گے تو صرف حیرت بدایونی سے!

ہمارے خیالات
"ہندستانی ادب" جلد (۲۳) نمبر (۹)
بابت جون ۱۹۶۴ء
صفحہ (۲) اور (۲) سے آگے
(پہلی قسط)

شاعر حیرت بدایونی غدار وطن اور دیس دشمن نمبر (۱) ہے! حکومت ساہتیا اکادمی اور جنتا ہشیار رہے!

ہم نے سنا ہے کہ حیرت بدایونی کے کلام پر ساہتیا اکادمی کے انعام اور اعزاز کی سفارش کی گئی ہے۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ حیرت بدایونی قومی مشاعروں میں شرکت کر رہا ہے، اور اپنے کلام سے اپنی وطن دوستی کا ثبوت دے رہا ہے۔ چین کو برا بھلا کہنا تو اور بات رہی، لیکن اس کا "وطن دوستی" کا دم بھرنا کیا معنی رکھتا ہے —؟

حقیقت میں دیس دشمن اور غدار وطن سے یہ اس کا پہلا کارنامہ بالکل ہی سیاہ اور تاریک ترین ہے۔ حیدرآباد کے پولیس ایکشن سے پہلے اس نے "لیڈرز فرسٹ" نامی کتاب لکھی تھی، جس کے ہر ہر صفحہ سے تعصب کا زہر ٹپکتا ہے۔ اس ناپاک کتاب میں اس نے ہندستان کے چوٹی کے لیڈروں اور نیتاؤں کا مذاق اڑایا ہے۔ ہندوؤں اور ان کے دیوی دیوتاؤں کی توہین کی ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی فطرت اور رگ رگ میں تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہو، دیس۔ حکومت اور عوام کا دوست کیسے بن سکتا ہے؟ یہ اصل میں مار آستین ہے، اس سے ہمیشہ ہشیار اور چوکنے رہنا چاہیے۔ اس کا وظیفہ بند کر دیا جائے۔ جیسا کہ ہم نے سنا ہے، اگر ساہتیا اکادمی میں انعام کے لیے اس کے نام کی سفارش کی گئی ہے تو دیس کے دشمن ایسے خونخوار درندے کو انعام ہرگز ہرگز نہیں دینا چاہیے!

مشاعروں میں شرکت کی اس کو اجازت نہیں دینی چاہیے۔ جس بدکردار شخص نے دیس اور دیس والوں کو چند ہی سال پہلے کھلم کھلا کر برا بھلا کہا اور گالیاں دی ہوں۔ اور جس بدنفس نے دیس کے چوٹی کے نیتاؤں پر گندی کیچڑ اچھالی ہو، اور جس بدبخت نے ہندوؤں کی دیوی دیوتاؤں کا کھلا مذاق اڑایا ہو — وہ آج ان سب کا دوست کیسے بن سکتا ہے —؟ اس کی فطرت کیسے بدل سکتی ہے، اور وہ ذلیل آدمی قابل معافی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ "لیڈرز فرسٹ" اس کی رذالت، کمینے پن اور انتہائی زہریلے تعصب کا بیتا جاگتا کارنامہ ہے، اس لیے سماج اور سنوسائٹی کا اہم فرض ہے کہ حیرت بدایونی جیسے غنڈا عنصر (۱) آدمی کا سوشیو بائیکاٹ کرے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس پر "عمد ماجلوا کیس" "غمر حیدر" کی پاداشت سزا دلوائے تاکہ اس کو احساس ہو کہ برائی کا بدلا حقیقت میں برائی ہوتا ہے۔ اس بدباطن کے سیاہ کارنامو[illegible]

کے انہیں صفحوں میں لکھا تھا، اور اس کا نوٹس لینا بند کر دینے کے سلسلے میں حکومت کو توجہ دلائی تھی۔ اس کے بعد ہم خاموش ہو رہے، مگر اب جب کہ ہمیں یہ پتا چلا ہے کہ اسے ہر پیلے ناگ کو اکادمی اعزاز AKADEMI AWARD کے لیے چنا گیا ہے یا چنا جا رہا ہے تو ہم نے اپنا وطنی فرض سمجھا کہ اس "مار آستین" کا کچا چٹھا کھول کر سب کے سامنے رکھ دیں، تاکہ غلط فہمی میں، عوام اور حکومت دونوں کبھی دشمن کو دوست سمجھ نہ بیٹھیں!

یہ ہے کا اقتباس اکتوبر ۱۹۵۸ء کے ہندستانی ادب سے پیش ہے، جس سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ حیرت بدایونی کون اور کیا ہے۔ ؟

ہم نے حیرت بدایونی کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ ہماری یہ رائے سنی سنائی باتوں پر مبنی تھی، چونکہ اوروں نے انھیں بھلا آدمی کہا تھا، اس لیے ہم نے بھی ان کے متعلق اوپر کی رائے قائم کی تھی، لیکن جب ہمیں اس بات کا علم ہوا کہ اس نے کچھ عرصا پہلے ایک کتاب "لیڈیز فرسٹ" لکھی تھی جس میں ہمارے دیس، ہمارے نیتاؤں، ہمارے ہر دلعزیز لیڈروں اور وطن کی مشہور مشہور ہستیوں، کروڑوں ہندو بھائیوں، ان کی مقدس دیویوں، دیوتاؤں، ان کی جان سے زیادہ عزیز گاؤ ماتاؤں، ان کی پاک استریوں، ماؤں اور بہنوں، ان کی تہذیب ان کے کلچر ان کے رہن سہن کے طریقوں وغیرہ وغیرہ پر نہایت ہی گندے اور ناپاک حملے کیے گئے ہیں، اور بری طرح سے ان کا مذاق اڑایا گیا ہے، جس کو کوئی بھی سچا انسانیت پرست اور انسان دوست آدمی گوارا نہیں کر سکتا، اس لیے بہ حیثیت ایک انسان دوست کے ہمیں بھی سخت ناگوار گذرا، اور حیرت بدایونی کے پیٹ کے گھٹ اور بد باطنی سے واقف ہونے کے بعد ہم اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے، چنانچہ ان کے بارے میں ہم نے جو رائے قائم کی تھی وہ لاعلمی اور نادانی پر مبنی تھی، اس لیے اب ان حقائق کی روشنی میں، ہم اپنی رائے کو واپس لیتے ہیں۔

"لیڈیز فرسٹ"

از حیرت بدایونی

"لیڈیز فرسٹ" کیا ہے، اور اس میں کتنی ناپاکی اور گندگی بھری پڑی ہے، اور اس سے مذہبی تعصب اور ہندو مسلم کی کتنی ہی کراہیت آمیز غضونیت آتی ہے، اس سے پورے طور پر واقف کرانے کے لیے تو مجبور ہیں، لیکن اس کی فرعون سامانی کے چند اقتباسات بطور نمونہ از خروارے، ضرور پیش کریں گے۔ ملاحظا ہو جس کتاب کی ابتدا آگ کے شعلوں سے کی گئی ہو اس کی انتہا کیا کچھ ہو گی!

"انتساب (یعنی ڈیڈیکیشن) اس آگ کے نام جو آج کل ہمارے دلوں میں لگی ہوئی ہے۔ حیرت" لیڈر آباد کے مشہور رضاکار لیڈر قاسم رضوی نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے، ابتدائی حصے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ــــ

"اس جدید کتاب میں حیرت صاحب نے ــــ نے ہندستان کی سیاسی چپقلش اور سیاسی

حرکات پر ایک شدید قسم کا طنز کیا ہے، جو میری رائے میں کہیں کہیں اعتدال سے باہر بھی ہے۔

الامان الحذر! قاسم رضوی جیسے شدت پسند کے قلم سے یہ الفاظ کہ "جو کہیں کہیں اعتدال سے باہر بھی ہے" ۔۔۔ اب آپ خود اندازا لگا سکتے ہیں مصنف نے کیا کچھ زہر نہ اگلا ہوگا، اور حقیقت بھی یہی ہے ۔۔۔ اس کتاب کے جتنے کردار بھی ہیں، جن میں سے دو کی تعریف مصنف نے یوں کی ہے۔

اس نمبر میں بھی "لیڈیز فرسٹ" کا متن وہی ہے جو اوپر دیا گیا ہے، اس لیے تکرار کے خیال سے اس کو دہرایا نہیں گیا ہے۔

> اس غدار وطن اور دیس دشمن نمبر (۱) اور "مار آستین" کے اور بھی زہریلے کارنامے آنے والے نمبر میں دیکھیے!

ہمارے خیالات
"ہندستانی ادب" جلد (۲۳) نمبر (۱۰)
بابت جولائی ۱۹۶۳ء
صفحہ (۲) اور (۲) سے آگے
(دوسری قسط)

شاعر حیرت بدایونی غدار وطن اور دیس دشمن نمبر (۱) ہے، حکومت، ساہتیا اکادیمی، اور جنتا ہشیار رہے!

پچھلے نمبر میں اپنے کالموں میں، ہم نے غدار وطن اور دیس دشمن نمبر (۱) کی گندی اور ناپاک "لیڈیز فرسٹ" کے حوالے سے اس خطرناک دشمن کے ہندوؤں کے خلاف حقیقی جذبات، خیالات، ارادے اور تعصب بھرے عزائم کا ایک ہلکا سا نمونا پیش کیا تھا، جس کے ہر ہر شد سے ہندوؤں ان کے لیڈروں اور نیتاؤں، مہاتماؤں، اور ان کی دیوی اور دیوتاؤں کے خلاف انتہائی اور شدید قسم کے تعصب کا زہر ٹپکتا ہے۔ اس بدنفس اور بدبخت کا کھلا یہ دعوا ہے کہ یہ کتاب اس کے دل اور ضمیر کی آواز اور آئینہ دار ہے۔ اس کے باغی دل کی جلن اور تڑپ کا ہلکا سا اندازا خدا اس ملعون کے ان شبدوں سے ہوتا ہے "انتساب (یعنی ڈیڈیکیشن) اس آگ کے نام جو آج کل ہمارے دلوں میں لگی ہوئی ہے۔ حیرت (لیڈیز فرسٹ ص ۳)

ہمارے ان خیالات کے بارے میں بعض نادان لوگوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ بات پرانی ہے، آئی گئی ہو گئی ہے، اب آپ گڑے مردے اکھیڑنے کی ناکام کوشش کیوں کر رہے ہیں؟ ہم نے کہا غلط، آپ کا کہنا سراسر غلطی پر مبنی ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بعض متعدد بار کیس میں ضرورت کے تحت واقعی گڑے مردے بھی اکھیڑوا دیے جاتے ہیں، جس کا علم ہم کو، آپ کو اور ساری دنیا ہی کو ہے! آپ دیکھیے کہ دوسری عالمی جنگ کے ختم کے کئی سال بعد، جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام یا MASS MURDER کے سلسلے میں اسرائیلی حکومت نے قاتل اعظم ADOLF EICHMANN کو ایک دوسرے ملک سے پکڑ منگوایا اور اسرائیلی عدالت میں مقدما چلا کر موت کی سزا دی۔ اسی طرح اسی سلسلے میں خود مغربی جرمنی کی حکومت نے ہٹلر کے دست راست GEORG HEUSER پر BONN کی عدالت میں مقدما چلا کر (۱۵) سال قید بامشقت کی سزا دلوائی۔ یہ واقعات بکل حال ہی کے ہیں۔ اخباروں میں دور و نزدیک یہ خبریں چھپا کرتی تھیں، جن سے آپ، ہم سب ہی واقف ہیں۔

وقت کے فعل یا طویل وقفے کے سبب ایک حقیقی ملزم کسی طرح بھی بچ نہیں سکتا۔ اس کے گندے، ہتک آمیز اور غیر قانونی کارناموں کی ایک نہ ایک روز اس کو سزا مل کر رہے گی۔ یہ نظر غنڈے کے بدفطرت اور سخت قسم کے متعصب شخص حریت بدالونی پر پوری پوری اترتی ہے، وہ اس وقت زد میں ہے اور موجود ہے، اس لیے ہماری حکومت پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اس کو قانون کی رو سے گرفتار کروائے اور حیدرآباد کی عدالت میں مقدمہ چلوا کر اس بدطینت، بدفطرت، متعصب، غدار وطن اور دیس دشمن نمبر (۱) کو باشقت عمر قید کی سزا دلوائے، تاکہ زندگی بھر اس لعنتی انسان نما حیوان کو اس بات کا احساس رہے کہ دوسرے مذہب والے بعضوں پر تعصب کی گندی کیچڑ اچھالنے کا بدلا کیسے اور کس بری طرح ملتا ہے!

ہم حکومت کو آگے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے بجائے دیتے ہیں کہ حریت بدالونی جیسے تعصب بھرے زہریلے خیالات والا شخص نہ صرف غدار وطن، دیس دشمن نمبر (۱) ہی ہو سکتا ہے، بلکہ مذہبی جذبات کی رو میں اندھا دھند یہ کر وہ جاسوسی جیسا خوفناک کام بھی انجام دے سکتا ہے، ہو سکتا ہے کہ مذہبی جذبے کے تحت وہ ایسا ناپاک اور خطرناک کام کر بھی رہا ہو، اس لیے ہر گز بہ گشت ذی روز اول" پر عمل کرتے ہوئے اس شیطان صفت خبیث کو فوراً ہی دھر لینا چاہیے۔ آخر ہے کہ جنتا اور حکومت ہمارے ان وچاروں پر ضرور بغور دھیان دے گی۔ حکومت کا سب سے پہلا اور اہم فرض یہ ہے کہ اس نمک حرام کا وظیفہ فوراً بند کر دے اور ساتھ ہی عدالت میں مقدمات چلوا کر اس خطرناک وحشی درندے غدار وطن، اور دیس دشمن نمبر (۱) کو عمر قید باشقت کی سزا دلوائی جائے تاکہ اس ظالم کو زندگی بھر اپنے بد کردار دیں اور اپنی حیوانیوں کا احساس رہے!

اب آپ کے سامنے اپنی کتاب لیڈیز فرسٹ کے سلسلے کا [illegible]

وہ اس طرح پر تعصب کا زہر اگلتا ہے، اور اس کے مضمون کے ہر بند سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ہندوؤں کے خلاف آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں جن کی لپیٹوں سے وہ ساری دنیا کی ہندو برادری اور ان کی دیوی دیوتاؤں کو جھلسا دینا چاہتا ہے۔

اس نمبر میں بھی "لیڈیز فرسٹ" کا متن وہی ہے جو اوپر دیا گیا ہے اس لیے تکرار کے خیال سے اس کو دہرایا نہیں گیا ہے مگر اس کے نئی مذہبی اور سو فی صد ہندو دشمن، نیز زہریلے خطرناک اور متعصبانہ نعرے کو دہرائے بغیر نہ رہیں گے، یعنی ہندو گائیوں کو چھاڑ کھانے والا شیر یوں للکارتا ہے!

"انتساب (یعنی ڈیڈیکشن) اس آگ کے نام جو آج کل ہمارے دلوں میں لگی ہوئی ہے۔ حیرت (ایڈیٹر) "میری کتاب، میرے دل کی ترجمان، میرے ضمیر کا عکس، میرے خیالات کا آئینہ اور میری روح کی آواز ہے۔" (ص ۲۵، ۲۶ لیڈیز فرسٹ)

اس غدار وطن، دیس دشمن نمبر (۱) اور ملعون [illegible]

ہمارے خیالات
"ہندستانی ادب" جلد (۲۳) نمبر (۱۱۔۱۲)
بابت اگست ستمبر ۱۹۶۳ء
صفحہ (۳) اور (۲) سے آگے
(تیسری قسط)

جشن آزادی کا ادار یا "غدار وطن" کے نذرانہ

جوش اگر غدار وطن ہے تو حیرت بدایونی غدار وطن اور دیس دشمن نمبر (۱) ہے!

جنتا اور حکومت غداروں اور دشمنوں سے ہشیار!

"ہندستانی ادب" کے پچھلے دو نمبروں میں، ہم نے حکومت کے وظیفہ یاب، نمک حرام میر حیرت بدایونی کے ہندوؤں اور ان کے لیڈروں، نیز ان کی دیوی دیوتاؤں سے دلی بغض و حسد اور نفرت آمیز حد تک شدید ترین تعصب کے کارنامے انہیں کالموں میں کھول کر رکھ دیئے تھے۔ حیرت بدایونی نے اپنی لعنتی کتاب "لیڈیز فرسٹ" میں ہندوؤں وغیرہ پر تعصب کی جو بوچھاڑ کی ہے، اس کے صرف چند ایک نمونے ہم نے پیش کیے تھے۔ یہ اصل میں، ہندوؤں سے متعلق اس کی دلی آگ کے بھڑکتے شعلوں کا "عشر عشیر" بھی نہیں ہے۔ اس ننگ انسانیت نے تو حقیقت میں ہندوؤں وغیرہ سے متعلق بغض و حسد اور تعصب کے دریا بہا دیے ہیں!

معلوم ہوتا ہے، ہندوؤں سے متعلق بغض و حسد اور نرے تعصب کے گندے جذبات اس کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور جنم دن سے یہ زہریلے اثرات اس کے متعصب دل و دماغ میں پرورش پا رہے تھے۔ آخر ایک دن اس کے صبر کا پیالا چھلک اٹھا اور بقول خود "دل کی آگ کے شعلوں میں بھڑک اٹھے!" غالباً اس کی غیر ہی بغض و حسد اور تعصب کی گندگی سے گوندی گئی تھی، اس لیے اس کے رگ و ریشے میں تعصب کی سرایت کر گئی تھی اور آخر کار ایک روز "لیڈیز فرسٹ" کے عفونت لادے کی شکل میں اور ناپاک کتاب اس ملعون اعظم اور فرعون نے سامان نے ہندستان کی تقسیم سے پہلے لکھی تھی، اس لیے اس کتاب کا ہر ہر شذرہ پکار پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ ہندوؤں کا دنیا میں کوئی مقام نہیں ہے۔ ہندو حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ہندستان کو حکمران قوم (انگریز) اگر کچھ دیدے گی تو وہ ایک قسم کی بھکشا ہوگی، جو حیرت بدایونی جیسے متعصب، خونخوار اور درندہ صفت مسلمانوں کی دیا اور مہربانی پر منحصر ہوگی۔

اپنے آپ کو شیر کہنے والے اس شیر نما تمر کا یہ دعوا ہے کہ ہندو حکومت کرنا نہیں جانتے اس لیے کہ انھوں نے کبھی بھی ہندستان سے باہر قدم نہیں رکھا ہے، یہ دوسرا سر نہیں کیے اور دوسروں پر حکومت نہیں کی، مطلب یہ کہ اگر ہندستان کو آزادی مل جائے تو ہندو حکومت نہیں چلا سکیں گے! یہ گویا ہندوؤں کے اس دیرینہ اور کینہ دشمن کی دلی تمنا اور آرزو تھی کہ ہندوؤں کو آزادی اور حکومت ہرگز ہرگز نہ ملے۔

ہم حیران ہیں کہ ہندوؤں، ان کے لیڈروں اور ان کی دیوی دیوتاؤں سے متعلق بغض و حسد اور تعصب کا زہر اس شیطان صفت پیرانا لبغ کی رگ رگ میں اس بے پناہ طور تھے کیسے سرایت کر گیا تھا؟ غور تو کیجیے کہ اس نے ہندوؤں کے خلاف صرف "لیڈیز فرسٹ" ہی نہیں لکھی ہے، بلکہ اس سے پہلے اور ہر رسل کے تحت

ہندوؤں پر چوٹیں چلی ہیں اور ہلکے پھلکے قسم کے بعض وحشیانہ تعصب کے مظاہرے بھی کیے ہیں۔

اب تو آپ کو یہ کہنا یقینی ہو گیا ہو گا کہ اس تنگ انسانیت اور بھیڑیا صفت حیرت بدایونی کے سر میں تعصب کا سودا پہلے ہی سے سمایا ہوا تھا، جس کو وہ ہندوؤں کے خلاف ڈائنامائٹ کرنے کے لیے بے چین اور بے کل ہوا جا رہا تھا اور اسی کا یہ جنون ایک چھوٹ دو گندی اور ناپاک کتابوں کی شکل میں ظاہر ہو کر رہا!

مجھوں کی کتاب کا ذکر ہم نے ضمناً کر دیا ہے، اس کتاب کے بارے میں آئندہ کبھی موقع پر لکھیں گے، تاکہ آپ کو بھی علم ہو جائے کہ ہندوؤں کے خطرناک اور پیدائشی دشمن نے اس کتاب میں بھی ہندوؤں کے خلاف کیا گل کھلائے ہیں!

ہم نے مانا کہ یہ دونوں خطرناک کتابیں آج کے تقریباً اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندستان کو ابھی آزادی نہیں ملی تھی۔ ادھر پاکستان کے قیام کی بات چیت ہو رہی تھی، ادھر حیدرآباد کی خدمختاری کے بلبلے سینے دیکھے جا رہے تھے۔ جذبات اور پاگل پن کا ہر طرف دور دورا تھا، اور حیرت بدایونی جیسے غنڈوں کی کھلے طور پر ہمت افزائی اور سرپرستی کی جا رہی تھی۔ ایسے میں ہندستان کی تقسیم عمل میں آئی، جس کے نتیجے کے طور پر حیدرآباد کی آزادی کا جوش اور بھی زور پکڑ گیا، ہلکے پاگل پن کی انتہا یہ ہو چلی تھی کہ کوئی حیدرآباد کو خدمختار اور آزاد ہوگا دیکھے! ایسی موقعیتی میں یہ کتابیں لکھی گئی تھیں، اس لیے ان کی سرپرستی بھی ہوئی۔

حیدرآباد کی آزادی کی کوشش کا نتیجہ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو پولیس ایکشن کی صورت میں نکلا۔ پولیس ایکشن کے بعد کا زمانہ حیدرآباد کے لیے نازک دور کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نازک دور میں بلوے دنگے کی آگ کبھی بجھنے نہ پائی کہ کوئی نہ کوئی حال میں [illegible] اس پریشان کن دور میں حیرت بدایونی کی ناپاک کتابوں کی حکومت اور عوام کو خبر نہ ہو سکی، اس لیے یہ کتابیں [illegible] لطف دوز [illegible] اور ہندوؤں [illegible]

اس لیے ہم نے انسان دوستی کی خاطر اکتوبر ۱۹۵۸ء کے "ہندستانی ادب" میں حکومت اور جنتا کو توجہ دلائی، گویا اپنا انسانی فرض ادا کیا اور خاموش ہو رہے!

لیکن اب جب کہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ایک غدار وطن اور دیسی دشمن نمبر (۱) کا نام اکادمی انعام کے لیے پیش کیا جا رہا ہے، اور یہ کہ ایک دشمن حقیقی اپنے آپ کو دیسی اور ہندوؤں کے دوست کی شکل میں پیش کر رہا ہے، قومی مشاعروں میں حصہ لے رہا ہے، اور اپنی جان نثاری کے راگ الاپ رہا ہے، تو پھر ہم نے اپنا انسانی فرض محسوس کیا اور حکومت اور عوام کو خبردار کر دیا کہ حیرت بدایونی دوستی کے روپ میں بھیڑیے کا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ یہ دوست نہیں، بلکہ دوغلا منافقت اور سخت قسم کا خطرناک دشمن ہے!

بہرحال ایک ایسے جانی دشمن سے بدلا لینے کے لیے وقت یا طویل وقفے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا جس کی تلافی کرنے کے لیے ہم نے پچھلے نہ ہیں۔

EICHMANN اور دوسرے جرمن ظالموں کی مثالیں ہمیں کافی ہیں کہ انہوں نے اصل میں دوسری جنگ کے دوران یہودیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے، لیکن تقریباً بیس سال کے طویل عرصے کے بعد جب وہ جرمن حکومت اور یہودیوں کے ہاتھ آئے تو عدالتوں میں مقدمے چلوا کر انہیں موت کی سزائیں دلائی گئیں۔ ہم اپنے انسانیت [illegible] کے تحت سزائے موت CAPITAL PUNISHMENT کے قائل نہیں ہیں، پھر بھی ہمارے اصول اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ خائنوں کو سزا ضرور ملنی چاہیے اور [illegible] سزا عمر قید یا نظربندی کی ہونی چاہیے [illegible] ہماری رائے میں غداروں اور دیسی دشمنوں [illegible] حیرت بدایونی بھی بالکل اسی سزا کا مستحق ہے [illegible] اس لیے حکومت اور عوام [illegible]

خرداد۔ تیر۔ امرداد ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۷۳ء

آپ یقین جانیے کہ آج ہم نے واجبی طریقے پر حیرت بدایونی جیسے پاگل کے خلاف قلم چلایا ہے، بلکل اسی طرح سختی اور بھی غدار وطن اور دیس دشمن کے خلاف برابر لکھیں گے، بشرطیکہ وہ ظالم ٹھیک سے طریقے پر ہماری زد میں آسکے۔ مطلب یہ کہ کوئی شاعر، مضمون نگار، افسانہ نویس، ڈراما نگار، مصنف، مولف وغیرہ ہو اور وہ غلط فکر لیے ہے اور وہ غلط طریقے پر انعام کا مستحق قرار دیا جارہا ہو یا یہ کہ حکومت اس کو کسی اور کو لیے پر نوازنا چاہتی ہو۔

چانچے اتفاق سے جوش ملیح آبادی بھی ہماری زد میں آگئے ہیں اور ان کا شمار بھی "غداران وطن" میں ہے۔ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ ہندستان، ہندستانی حکومت اور ہندستانی عوام نے جوش کی بڑی ہی ناز برداری اور سیوا کی، مگر افسوس کہ جوش نے ہماری ان تمام مخلصانہ مہربانیوں، عنایتوں، نوازشوں اور کرپاؤں کو بہت ہی بری طرح سے ٹھکرا دیا، جس کا داغ آج تک بھی ہمارے دلوں میں ہرا ہے۔ جوش پاکستان گئے اس لیے کہ انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل تھا، لیکن ہندستانی اصطلاح میں اس کا لازمی نتیجہ "غداری" کی شکل میں نکلا ــــ جی ہاں اس کو غداری نہیں تو اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ کسی کے ان گنت احسانوں کو بھلا کر اس سے روگردانی کرنا ہی تو غداری ہے۔ اس لحاظ سے جوش ملیح آبادی بھی "غداران وطن" کی فہرست میں شامل ہیں۔ جوش کی بانی ہوئی شاعرانہ عظمت اور برتری، نیز اپنے گہرے شخصی تعلقات کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے جوش کی حد سے زیادہ ناز برداری کی، دوسرے معنی میں جوش کے بڑے نخرے بھی سہے اور انتہا یہ کہ جوش کو اپنے پر خلوص اور محبت بھرے دل کی گہرائیوں میں جگہ دینا چاہی ــــ مگر ملاحظہ ہو بدبختی کہ جوش نے جواہر لال کی عنایتوں کو نہیں، بلکہ سچ پوچھیے تو ہندستان اور ہندستانیوں کی نوازشوں اور کرپاؤں کو ٹھکرا دیا، اس کا اعتراف جوش نے اپنے ایک مضمون "مہذب شاہد بازی" میں کیا ہے۔ یہ مضمون چند مہینے پہلے "ہندستانی ادب" میں چھپا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ جوش کو ہم نے "آپ" سے مخاطب کیا ہے اور حیرت بدایونی کو "تو" سے۔ اول تو جوش پاکستانی ہیں ہندستانی نہیں۔ دوسرے یہ کہ جوش نے ہندستان سے غداری کی ہے یہ ایک کھلی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا، گویا جوش صرف غداران میں شامل ہیں، لیکن وہ ہمارے دیس کے دشمن تو نہیں! حیرت بدایونی کی شاعری دوسری ہے، یہ شخص گو شت ہندستانی ہے، اس لیے ایک ہندستانی کے قلم سے ہندستان اور ہندستانیوں کے خلاف جو بھی جائے وہ سو فیصد غداری اور دیس دشمنی ہے۔ دیس دشمن کو تو سولی پر لٹکا دینا چاہیے (رنج نکلا "انسانیت" کے ذریں اصول اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر یہ ظالم تمام ہندستانیوں کے خلاف لکھتا تو یہ باور کرلیا جاتا کہ یہ پاگل ہے، بکواس کررہا ہے، دماغی امراض کے ہسپتال بھیج دیا جاتا۔ لیکن شعنف یہ ہے کہ صرف اور صرف ہندوؤں کے خلاف لکھ کر اس نے اپنے اندر کی بغض و حسد اور جانبداری کا ثبوت دیا ہے اس لیے سب کی نظروں میں ذلیل ہوگیا ہے، اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ اس کمینے کو "ہمارا" سے مخاطب کرنا بجا ہے یا نہ بجا۔ اس کے برعکس ہم جوش کو "آپ" سے مخاطب کرتے ہیں اور جوش کی غداری کو تسلیم کرتے ہوئے معاصر "مسلیس سیوک"، "ٹریبیون"، پہلی اگست ۱۹۷۳ء سے اس کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔

غداری ــــ کا ــــ انعام

"جوش ملیح آبادی کے تمام وظیفے بحال کردیے گئے"

معلوم ہوا ہے کہ پنڈت نہرو نے جوش ملیح آبادی کا جائیداد ضبط کرلینے کے احکامات منسوخ کردیے ہیں۔ پنڈت نہرو نے اس وقت کے وزیر داخلہ گوند ولبھ پنت کے اعلان کے برعکس جوش کے تمام سابقہ وظائف بھی بحال کردیے ہیں۔ پنڈت نہرو اس وقت بھارت کے وزیر داخلہ تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جوش کراچی سے دہلی آئے تھے اور ہندستان کی شہریت کے لیے درخواست دی تھی۔ ملک کے ڈکٹیٹر نہرو نے

اس لیے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں اور نہ ہی کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جس سے ہندستانی عوام اور سچے وطن پرست لوگوں کی نظروں میں ان کی پوزیشن مضحکہ خیز بن کر رہ جائے۔ کون نہیں جانتا کہ جوشی صاحب محض اس لیے یہاں سے پاکستان گئے تاکہ وہ ہندستان کی سیکولر اور جمہوری حکومت کو بدنام کر سکیں اور دنیا پر یہ ظاہر کر سکیں کہ جوشی جیسے آزاد خیال مسلمان پر بھی بھارت میں عرصۂ حیات تنگ ہے۔ اگر جوشی صاحب کسی اور ملک سے غداری کرکے مزے سے ہوتے اور دو بار وہاں جاتے تو یقیناً یا تو گولی سے اڑا دیا جاتا یا ساری عمر کے لیے جیل میں ٹھونس دیا جاتا لیکن یہ ہندستان جہاں نئے نئے ایمان کے اصولے اور بدشعار لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور غداروں کو انعامات دیے جاتے ہیں جوشی صاحب جیسے خدپرست اور غدار لوگوں کے لیے بہترین ملک تھا۔

پنڈت جوشندل ایڈیٹر "روشنی سوک"

اگر اوپر کی تحریر سے تو ہم اپنے معاصر پنڈت جوشندل کے اس بیان کی تائید کرتے ہیں کہ ایک غدار وطن کے بارے میں پنڈت جوشندل نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل ٹھیک اور صحیح صادق آتا ہے۔ جو جانتے ہوئے غدار وطن ہیں، اس پاک سرزمین کو ایسی اور ایسی قابل نفرین گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں، ہرگز سزا سے بچ نہیں سکتا۔ اگر وزیر اعظم جواہر لال نہرو جوشی جیسے غدار سے اپنی غلط ہمدردی اور امداد کی حقیقت کا [illegible] جانتے ہیں۔ وہ کہ ہر جمہوری [illegible] BLUNDER کا [illegible] ہوگا اور نہرو کو وطن پرستی اور وطن دوستی کے دائروں سے باہر نہیں جانا چاہیے کہ "غدار ان وطن" کے ساتھ [illegible] اور نہرو بابو اصل میں وطن دشمنی کے مرادف ہے۔ نہرو ہرگز ہرگز ایسی بھول نہ کریں گے اور "وطن پرستی" کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگ جائے گا۔ اس لیے پنڈت جوشندل کی ہر سرشد کی بھرپور انکبار تائید کرتے ہوئے ہم مرکزی حکومت ہندستان اور خصوصیت کے ساتھ وزیر اعظم سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ غدار وطن جوشی کو ہندستان آنے کی اجازت نہ دیں ممادر نہ ان کے وظائف بحال کریں ہمارے اس تازہ بیان کی روشنی میں اصحاب لوگ کی یہ غلط فہمی ضرور دور ہو گئی ہوگی کہ ہم نے غدار وطن اور دلیس دشمن [illegible] حیرت بدایونی کا بلاوجہ بھی پیچھا کیا ہے۔ اور آپ یہ پڑھ کر ہنس پڑیں گے ہوگا کہ ہم نے حیرت بدایونی کے خلاف کیوں یہ مہم چلائی تھی اس لیے کہ وہ غدار وطن تھے۔ چنانچہ ہم نے جوشی کے خلاف بھی ہم نے لکھا ہے، اس لیے کہ وہ بھی غدار ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جوشی نے وطن چھوڑ کر غداری کا ثبوت دیا اور حیرت بدایونی دلیس

فضل الرحمان فضل

سرفروشان وطن کا پیام غداران اور دشمنان دیس کے نام

سورماؤ، نوجوانو! زندگی کے نوجوانو
ہند کے اے پاسبانو
ایک سب ہو جاؤ اٹھو کاٹ دو دست ہوس کو
سورماؤ، نوجوانو
آدم کی اولاد ہو تم ابھینو کی یاد ہو تم
آہن ہو، فولاد ہو تم
جارحیت کو مٹا دو بربریت کو مٹا دو
سورماؤ، نوجوانو
تم ہو رانا، تم شواجی تم ہو ٹیپو تم ہو توپی
تم ہو ہنر مو، تم ہو گاندھی
تم متاع کارواں ہو وارث ہندستاں ہو
سورماؤ، [illegible]
قوت تسخیر ہے تم [illegible] تم
قوم کی [illegible]
تم ہو عشق کا دل وطن کا [illegible] مستقبل وطن کا
سورماؤ، نوجوانو
[illegible] ہے [illegible]
[illegible] یہ گنگا [illegible]
سورماؤ [illegible]
سورماؤ، نوجوانو
دل میں ہے جوشِ شجاعت [illegible]
آنکھ قدم میں [illegible]
حملہ آور کے نشاں کو اپنی برچھی سے مٹا دو
سورماؤ، نوجوانو
مشعلِ آتش فشاں ہو [illegible] ہو نوجوانو ہو
سورماؤ، نوجوانو
سینۂ شب چھید ڈالو نور آزادی بچا لو
سورماؤ، نوجوانو
[illegible]

جاگتے رہنا جوانو! [illegible]

جذبۂ دل سینہ جائے [illegible]

[illegible]

سورماؤ، نوجوانو

خرداد۔ تیر۔ امرداد ۱۳۸۲ اف ہندستانی ادب اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۷۳ء

عفت موہانی

چچی بی

چچی بی نے دروازے کے باہر رک کر ایک میرتبا اور چاروں طرف دیکھا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے کے بھگدڑ سے میں دبکی سہمی عورتوں کے سناٹے کے پردوں میں غروب ہو چکے تھے۔ مرد لاحول پڑھتے اور موچھ ہی موچھ میں بڑبڑاتے اپنی سائیکلیں سنبھالتے نکلے چلے گئے۔ اب گلی میں کوئی بھی تہتیں لگا حوان کا بات لگاتا، تسلی دیتا یا کم سے کم مڑ کر دیکھ ہی لیتا کہ جس پر گھر کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں اب اس پر کسی اور دروازے کھلے ہوئے نہیں رہ گئے۔

چچی بی نے جھکراتا ہوا شکستہ اینٹوں کی دیوار پر رکھ دیا۔ جھر جھر بہنے والے آنسو لحیف برقعے سے پونچھے اچھا ہی ہوا کہ یہاں کوئی نہیں، ورنہ شوکت کی اماں کا یہ ظلم تماشا بن جاتا۔

پتا نہیں کون سی مرتبا لے چاری چچی بی پر برہمی تھیں۔ کبھی چچی بی کی خاطر مل گئی، کبھی رفعت میاں بیچ میں پڑے اور ہوی کو الگ بٹا لے گئے۔ چچی بی کا لے لمبی کا غصا آنسو بن کر بہہ نکلا۔ تھوڑے دنوں پہلی سوچی انھیں پھر دیورانی جٹھانی میں بات چیت ہونے لگی۔ گھر کی فضا ہموار ہو جاتی۔ غضب تو یہ ہوا تھا کہ رفعت کا چھوٹا بچا ان سے بیحد مانوس ہو گیا تھا۔ وہ تو ماسا کی ماری تھیں ہی، ارے غریب بچوں کو اٹھا کر سینے سے لگا لیتیں، موہ محبت، یہ تو ایسے دیور ہی کا بچا تھا۔ وہ بلا دعوہ بھی ہمکا، اور چچی بی نے اسے اپنی گود میں چھپا لیا۔ تین سال کے ننھے کو بساط کیا تھی، ماں اور دیور نے بچوں کی نوچی کسوٹی سے تنگ آ گئے تھے۔ کسی کو بھی نہ تھر کے بہلا نہ کر سکی۔ جو کچھ سمجھ دار تھے وہ بہل گئے مگر شوکت کچھ زیادہ ہی ضدی نکلا۔

چچی بی شور اور بچوں کو بھگت کر دلور سی کے گھر میں ایک کمرے میں پڑی زندگی کے دن گن گن کر کاٹ رہی تھیں، کھاتی پیتی اپنا تھیں، مگر جب تک گھر کے کاموں میں ہاتھ نہ لگاتیں، حلق سے نوالا بھی نہیں اترتا۔ شوہر کی پنشن روپے پینشن ملتی تھی۔ لاکھ بات روک روک کر خرچ کرتیں، مگر مہینے کے آخر دنوں میں چاول کی مٹکی اور آٹے کا ڈبا کھڑکھڑا اٹھتے۔ تب وہی لعنے زہر مار کرنے پڑتے جو شوکت کی امی کے ملغوظ میں سمجھے اور چچی بی کے آنسو میں گھلے ملتے تھے۔ بٹھا کر کوئی نہیں کھلاتا، پھر وہ کون سی سوسے، چڑیا تھیں۔ جن سے آس ہوتی۔ بیکار کا بوجھ تھیں، تھیں ایک وقت کی چائے دیتے ہوئے شوکت کی امی کا دم نکلتا تھا۔ عمر ہی چلچلاتی دھوپ نے وقت سے پہلے اضمحلا دیا تھا۔ بال سن سفید، کمر جھکی ہوئی، نظر دھندلی، پچاس کے سن میں پچھتر برس کی بڑھیا نظر آتیں، لیکن امکان بھر خدمت کھینچے جاتیں۔ بھاوج ہی کے گھر میں ماما کی طرح رہتی تھیں۔ بچے تو مڑ کر بھی نہ پوچھتے۔ انھیں ان کے پاس جانے ہی کون دیتا تھا، مگر شوکت نہ مانا، اور اسے کوئی روک بھی نہ سکا۔ پہلے تو چچی بی اسے پیار لگاتے ہوئے ڈریں۔ دل پر پتھر رکھ کر لے رہی تھیں، موہ سے نہ لوٹتیں، لیکن وہ آتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ ماما بھری آغوش میں سما گیا۔

وہ اپنے بچوں کا دکھ بھول گئیں، جو بلکل شوکت ایسے تھے، گوزنے گورے گول مٹول، جو کسی ان دیکھی بیماری سے یوں چٹ پٹ ہو گئے تھے جیسے سرمئیاں سرتی ہیں۔ ذرا نڈھال ہوئے، پھول سے

چہرے کھلائے اور دوا علاج سے پہلے ہی گردن ڈھال دی۔ بھرے بھی نہیں، جیسے پھول ہوا سے گر کر مرجھا گیا ہو، اسی طرح انھوں نے اپنے چھ دل کے ٹکڑے منوں مٹی میں چھپا دیے تھے۔ گویا خزانا دفن کر رہی ہوں، وقت پر نکال لیں گی۔ انھوں نے کیسے اس نایاب دفینے پر آنسوؤں کے چراغ جلائے تھے، کسی طرح آہوں کی چادر اڑائی تھی۔ یہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ان ماؤں نے ہی ان کا کلیجا نہیں محسوس کیا، جن کی گودیاں سرسبز تھیں۔ دنیا میں وہ سب سے زیادہ مست ہو کر رہ گئیں۔ جانے ان پر کس بلا کا سایا تھا یا گود میں کسی کی نظر لگ گئی تھی۔ ماں نے اپنے بچے ان سے دور کر دیے، اور شوکت کی ماں زہرا کو تو برے برے وہم ستاتے تھے۔ بھی تو سدا کے لیے محروم ہو گئی۔ کون جانے کس کی ہری بھری پھلواری کو ٹوٹ کر اجاڑ دیں، نور کے بچے کا بھی حال ہوا تھا۔ وہ ان سے بہت ہلا ہوا تھا۔ مگر اچانک اس کی طبیعت خراب ہوئی، صبح کو گرا گرا سا رہا، دوپہر تک جھٹکے میں گرفتار کیا، اور پھر تیسرے دن چل بسا۔ اور تبھی سے بچی بی کو ڈھکے چھپے ڈائنوں کا خطاب مل گیا، جو نہ صرف دوسروں کے بچے کھاتی، بلکہ اپنے بچے بھی کھا جاتی ہے۔

رفعت نے بیوی کی دوا بھی تو ہر گز نہیں دی تھی، زیادہ جہالت پر وہ جھنا اٹھے تھے۔

"بھی کسی کی خوشامد سے کوئی مرتا جیتا نہیں کی جہالت کرتی ہو، میں تو کہتا ہوں کہ شوکت کو ان سے جدا نہ کرنا، رو رو کر ختم ہو جائیگی غریب۔"

"مر جائیں۔ باپ رہے۔ مجھے تو وہم چڑتا ہے۔ جانے کیا کھلا پلا کر شوکت کو اپنا کر لیا ہے۔ مجھے تو مڑ کر پوچھا بھی نہیں۔" زہرا نے کہا اور امتحان شوکت کو آواز دی۔ وہ بچی بی کے ٹلائے ہوئے کھلونوں میں مگن تھا۔ چیخ کر بولا "امی ہم نہیں آتے۔"

"دیکھا آپ نے، زہرا کا پارا چڑھ گیا۔ بڑبڑاتی رہیں، کچھ آوازیں بچی بی کے کان میں بھی پڑیں۔ دیکھ لیجیے گا سچ کھلا کر سلا دیں۔ منحوس کو

پھل پائے" بلا سے بچے کو۔ نہیں تو سر پکڑ کر روئے گا"

"کاہے اس بدنصیب کو" وہ برہم آواز میں بولے۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ بھاوج کی کوئی برائی نہیں سن سکتے۔ ایسا جادو آپ پر بھی چلا ہے۔ خدا کی شان۔"

رفعت نے اس جواب پر وہ ڈانٹا ہے کہ زہرا کلیجا تھام کر رہ گئی۔ ان کا تو کچھ نہ بگاڑ سکی، مگر دل کا کریدوا غبار بھی نہ نکالا۔

رفعت خفا ہو کر باہر چلے گئے تھے۔ زہرا نے مورچا سنبھالا۔ طوفان کی طرح بے چاری بڑیا کے سر پر آئی۔ دیکھا کہ ننا بیٹھا کھیل رہا تھا۔ اس کے سامنے دال مونٹ، برفی اور بسکٹ طشتریوں میں رکھے تھے۔ بچی بی ہنس رہی تھیں، اور کبھی کبھی اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں کچھ کھلا دیتی تھیں۔ اچانک زہرا کی آواز ہم بن کر دونوں پر چھٹی "زہر ملا دو۔ زہر، زندا دیکھا نہیں جاتا تم سے۔ ارے کیا وہ تمہارا بھوکا ہے کہ خیرات مانگ مانگ کر بچے کو کھلا رہی ہو؟"

خیرات کہاں، دلہن؟" بچی بی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "یہ تو میرے ظریف کے بچے تھے۔ آج وہ ظریف لاوارث تھی، سوچا کر اپنے [illegible] کچھ لیتی چلوں۔"

"مجھے نہیں [illegible]" زہرا نے حلق پھاڑ کر کہا، اور طشتریوں کو لات مار دی تو وہ ردی کاغذ کی طرح بکھر گئیں۔ بچی بی نے سہمی سہمی نگاہ سے دیکھا، آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ بچے کو [illegible] دیکھتے [illegible] ہاتھ کھینچ لیا۔

"یہ عورت کیوں میرے شوہر کی، میرے بچوں کی دشمن بن بیٹھی ہے۔ میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا۔ یہ میرے گھر سے کیوں نہیں جاتی، جیسے یہاں کھاتی ہے، کہیں اور جا کر کھائے۔"

زہرا کی آواز نے ہمسائے محلے والیوں کو اکٹھا کر لیا۔ اب تو سب اپنی اپنی توپیں لگا رہے تھے۔ شوکت رو رہا تھا۔ بچی بی [illegible] کر رہی تھیں۔ زہرا شوکت کو [illegible] کرنے لگی۔ [illegible] کرنے ہوئے کہ [illegible] بچی بی [illegible] ان کے پاس زر [illegible] زور [illegible] تصرف

آنسوؤں پر چلتا ہے۔ گالوں کی بھریوں پر گدلے گدلے موتی بکھرتے رہے۔

شوکت بری طرح رو رہا تھا۔ امی نہیں، امی نہیں میں چچی جی کے پاس جاؤں گا۔ امی۔ امی۔

خدا غارت کرے تیرے چچی جی کو، چپ ہو جا، ورنہ رسید کرتی ہوں ایک تھپڑ۔

اتنے میں رفعت آ گئے! گھر کی فضا ہنس سی گئی، چچی جی نے دھندلی سی نظر سے انھیں دیکھا۔ شاید مرحوم بھائی کی مظلوم بیوی پر انھیں ترس آ جائے، مگر خون کی حدت سے سوا لائے ہوئے ان کے جوان چہرے پر بے رحمی، ناگواری اور غصے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ یا پھر ان کی نظروں ہی نے یہ سب کچھ دیکھا ہوگا۔

شاید روز روز کے جھگڑوں سے ان کا بھی ناک میں دم آ گیا تھا، زہرا کی شکایت پر اسے جھڑک دیا، اور چچی جی سے بولے۔

بہتر ہوگا بھابی کہ آپ اس محلے میں کہیں اور اپنا انتظام کر لیجیے۔ آپ خود بھی روز کے ان جھگڑوں سے تنگ آ گئی ہوں گی۔ اور یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلے گئے۔

زہرا اپنا رونا بھول گئی۔ اب وہ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کھلا رہی تھی۔ شوکت روتا رہا، مگر ماں اسے گھسیٹ لے گئی۔ چچی، کھیکی دیوار کی طرح بیٹھ گئیں۔ آنسو خشک تھے دل میں دھواں سا اٹھ رہا تھا اس وقت انھیں بہت کچھ یاد آیا۔ اگر آج رحمت زندہ ہوتے — آنسو تیزی کے ساتھ بہنے لگے — میاں بیوی دالان میں اب بھی لڑ رہے تھے، شوکت رو رہا تھا۔

چچا اچانک ایک عزم کر کے اٹھ گئیں۔ عزت سماجت تو نہ کریں گی، جو ہو سو ہو۔ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے تکیہ دری لپیٹی۔ بیٹی کی صندوقچی اٹھائی، اور یوں گرتی پڑتی گھر سے نکلیں، جیسے دل سے خون کی آخری بوند بھی نکل جائے۔

اب گلیارے میں کوئی نہیں تھا۔ خدا جانے کتنی دیر بعد اٹھ کر چلیں۔ ہائے کوئی دیکھ جائے، اللہ کی اتنی بڑی زمین پر ایک بیوہ کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ جب کوئی نہ آیا تو چپکے چپکے گھر سے نکلیں، اور دوسری گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک چوکھٹ پر سانس لینے بیٹھ گئیں۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی، تب دروازا کھلا اور سعیدا کامیاں ہاتھ میں لوٹا لٹکائے باہر نکلا، پھر وہ دروازے ہی پر ٹھٹھک گیا۔

"بائیں" وہ پاس آ کر جھکا، "چچی جی۔ آپ، خیریت تو ہے، ارے آواز دے کر اندر نہیں آتیں؟ آپ ا،

نہیں بیٹا، رحمت محسوس کو یہیں رہنے دو۔ یہی نہیں کہ نادیا والے کہ رحمت میاں کی بیوی کی لاش سڑک پر ہوئی، سو اب اس کا غم بھی نہیں! اور کہہ کر بہت روئیں

"ارے واہ۔ غضب کرتی ہیں آپ بھی۔ اٹھیے اندر چلیے۔ ظفر نے کہا اور ہاتھ تھام کر اٹھا دیا، گھر میں آ کر سعیدا کو آواز دی، وہ کنگی کرتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ سفید سفید معصوم چہرا بھرا ہوا بدن، وہ ان حالوں میں بھی، جہاں مرد تو مرد عورتوں سے بھی بیاہی مرتبا شرم آتی ہے۔ پردا تھام کر آڑ سے انھیں سلام کیا۔ ظفر نے انھیں دالان میں بچھے فرش پر آرام سے بیٹھا یا، پھر میاں بیوی میں کچھ اشارے ہوئے۔ ظفر تو بازار چلا گیا۔ سعیدا ان کے پاس آ بیٹھی۔ بھری تو ہوئی تھیں۔ سعیدا نے کیا چھیڑا کہ بادلوں کی طرح برس گئیں۔ سعیدا نے ساتھ میں آنسو بہائے، اور دل دہی کی، پھر جب انھیں کھانا کھلایا، چائے پلائی تب ان کی آنکھیں کھلیں، سعیدا کو سر سے پاؤں تک دیکھا، یکبارگی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

یہ تقدیر کہاں سے لے آئی۔ یا اللہ۔ اب کیا اور کوئی کڑا امتحان ہمارا منتظر ہے، اللہ نے لرز کر پھر اپنی بوڑھی ساس کی

"اماں چچی، کیا پھر کچھ سوچا ہے۔ اب کہاں چلیں، آپ نے" سعیدا کو بولی "ان کے آنے تک تو ہم سے وہ رہے خفا ہوں گے"

"بس بیٹی! تو نے جو بھی حسن سلوک میرے ساتھ کیا یہی بہت ہے، اللہ اجر دے مگر رحم متنوس کو تو اب جانے ہی دے۔"

"ایسے بے زار ہو گئیں آپ!"

اس کے آنسو بہنے لگے "یہی گناہ تو رحمت سماں

کے یہاں ہوا۔ شکو چھوڑتا نہیں تھا۔ دلہن کو دیکھ سمایا۔ دور کرو یا معصوم کو مجھ سے ہائے کس طرح کے سے رو رو کر مجھے پکار تا رہا تھا۔ میرے ہی پاس تو سوتا تھا۔ میرے ہی ہاتھ سے کھاتا تھا۔ میری ہی بھائی سے اکثر جھڑ جاتا تھا۔ سمجھ رہا ہوگا چچی نے رکھ لینے کی ہوں گی۔ واپس آجائیں گی۔ رات کو جب دیکھے گا کہ میری کوٹھری بھائیں بھائیں کر رہی ہے میں وہاں نہیں ہوں تو بے چارا، میرا بچا کیسے کیسے ملکے گا؟" یہ کہہ کر وہ بلکنے لگیں۔

"اچھی کی خبر منگوا لیجیے۔" سعیدا نے کہا۔

مگر یوں اپنی طبیعت کو ہلکان نہ کیجیے۔ جب آپ کا خیال رنجت ماموں نے نہیں کیا تو آپ کو ان کے بچوں سے کیا کام ہے۔ شکو بچا ہے، روئے دھوئے کہیں ہی جائے گا، البتا آپ کی جان مفت میں جائیگی۔"

اتنے میں ظفر آگیا۔ "لو بھئی، آج خوب ٹھاٹ دار دعوت ہونی چاہیے"، وہ چچی کے پاس ہی ٹک گیا، اور اپنی باسکٹ کو زمین پر اوندھا کر کے مختلف نکل کر بھاگا اس سے۔

"چچی دیکھا آپ نے" سعیدا نے موضوع بدلا کرنے کی۔

"کچھ نہیں لائے میرے لیے یہ سب، اچھا اب میں اب پکاؤں گی بھی نہیں۔"

"اندازے میں کوئی تمہارا محتاج ہوں اپنی چچی کے لیے میں خود پکاؤں گا۔" ظفر اسے گھورنے لگا۔ دونوں کی لڑائی وہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں، تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی اپنا غم بھول گئیں۔

ظفر نے سب کچھ زمین سے سمیٹا اور اٹھ گیا۔

"بیٹی جاؤ تم آرام کرو۔ میں دیکھوں وہ کیا کر رہا ہے۔" چچی اٹھنے لگیں۔

"تو آپ بیٹھیے وہ تو یوں ہی آپ کے سامنے کہہ رہے تھے۔ مجھے خود بھی وہ کسی کام میں ہاتھ لگانے نہیں دیتے۔ وہی پکاتے ہیں سعیدا شرما فرما کر بولی۔

چچی نے کواپنا زمانا یاد آگیا۔ یہی حال تھا رحمت میاں کا۔ پہلے جیسے کے وقت بلکل ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا ایسی ہی محبت کرتے تھے۔ رات کو اگر پانی پینے اٹھتیں تو خدا سے لپک کر پانی لے آتے، جیسے ساری رات سوتے ہی نہ ہوں۔

سعیدا کمین میں چلی گئی، اور وہ چالیس سال پہلے والی دنیا میں پہنچ گئیں۔ یہ دن کہاں سے آتے ہیں، کہاں چلے جاتے ہیں، چراغ کی لو کو کب کسی نے تھاما ہے۔ یہی حال ماضی کا ہے۔ ہوا کا جھونکا ادھر آیا ادھر گیا۔ خوشبو بس چھوڑ گیا۔ انسان کا ماضی چاہے چاہے جیسا بھی ہو، وہ اسے بھول نہیں سکتا۔

رات کا کھانا سب نے مل کر کھایا، اور دیر تک صحن میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سعیدا کی ہنسی ظفر کی چھیڑ چھاڑ! کیسے مخلص لوگ ہیں، ان سے زیادہ نہ ناطا، مگر کتنوں کو طرکر رہے ہیں، اور وہ، جن سے ناطا تھا، انھوں نے یوں دھتکارا۔

ان میں رہتے بس ایک کانٹا چچی کے دل میں کھٹکتا رہتا، پہلا بچا ہے، ان کا قدم ذرا سا ہی آگے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کہیں کچھ ہو جائے، کانپ جاتی انھوں نے تمام اندیشے ظفر کے سامنے رکھ دیے تھے، اور التجا کی تھی کہ انھیں کسی مناسب خانے میں چھوڑ آئے۔ وہ اپنا سایا سعیدا پر ڈالنا نہیں چاہتیں۔

ظفر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "ہم پر کیوں نہ پڑھا ہے گا آپ کا سایا، صرف بچے پر کیوں پڑے گا۔ ارے یہ سب واہیات ہے۔ مجھے رنجت ماموں کی ذہنیت پر افسوس ہوتا ہے، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ بڑا نظر قرآن کی آیات آپ کے سامنے موضع کھنے کی نہ ہوتی، اور آپ کا یہ حشر بھی نہ ہوتا۔ خیر اب سب کچھ بھول جائیے چچی! موت وحیات اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ انسان کا کسی پر بس نہیں۔" سمجھانے والے جانتے تھے کہ ظفر نے چچی کو پناہ دی ہے۔ رنجت تک بات پہنچی تھی، انھوں نے کہا تھا، میں اپنی سبکی محسوس کی، لوگ نہ جانے کیا کیا باتیں بنائیں گے، زہرا بدنام ہوں گی، انھوں نے ایک دن ظفر سے کہا "یہاں لوگ بلاوجہ کسی کا سر نہیں سہلاتے، تجربا ہی زبان کھلواتا ہے۔ عورتیں تو کہتی ہیں کہ بھائی کی گود پر سایا ہے، اس لیے سب آگے تمہاری حمایت ظفر رکھتے میں ان کا دور کا بھانجا ہوتا تھا۔

ان کا ادب بھی کرتا تھا، مگر اب طنز یا لہجے میں بولا، "میں تو اتنا جانتا ہوں، جو بڑے بڑے مرد، عاقل عورتوں کی بکواس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے ہیں، ان کے دماغ پر عورتوں کا سایا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ سورج کی روشنی کو بھی تاریکی کہنے سے باز نہیں آتے۔"

محلے والیوں کو اپنے بچے عزیز تھے، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بچی فی کی ایک سرسری نگاہ بھی کسی بچے پر پڑ جائے۔ پہلے وہ عورتیں جو سعیدا کی خبر لینے اس کے گھر آتی تھیں، انہوں نے آنا جانا بند کر دیا، اس طرح اس گذرگاہ سے ڈرنے لگیں، جیسے وہاں بھوتوں کے ڈیرے لگے ہوں۔ ظفر کی طبیعت ان دقیانوسی خیالات سے الجھتی تھی کہ کہیں سعیدا پر اس کا ناگوار اثر نہ پڑے، لیکن جب سعیدا نے کسی قسم کا اندیشہ ظاہر نہیں کیا تو وہ بھی خاموش ہو رہا۔

دونوں میاں بیوی بچی کی بڑی خاطریں کرتے، انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوتی، کبھی کبھار انھیں شوکت کی خبر بھی مل جاتی تھی۔ وہ پہلے پہل بچی فی کی یاد میں بہت رویا تھا، ہفتوں ان کے لیے ہڑکتا کیا، مگر بچا تھا بہلا دیا گیا۔ بچی تو بچا نہیں تھیں وہ بہل نہ سکیں۔ شوکت کی جدائی کا زخم انھیں دن بدن کمزور کرتا گیا، رات کو جب سب سو جاتے تو وہ بچی فی کی طرح رو دو پا کرتیں۔ انھیں سب خبر تھی محلے والے کیا کہتے تھے، مگر ظفر ان کی دل داری میں لگا تھا، ان سے سب کچھ برداشت کرتا تھا۔ مگر وہ سب کچھ جانتی تھیں۔ اب تو وہ اس سے سے کینے کی فرد تھیں، مخلص اور ہمدرد کنی کی طرح وہ ہر وقت ظفر کے آرام اور سعیدا کی دیکھ بھال کا خیال رکھتیں۔ سعیدا دھوکا تھا اس کی ماں نہیں تھی، کون پہلی بار خوش ہوگا، سوا گھر بیٹھے قدرت نے ماں کا انتظام کر دیا، اب وہ بھی خوش تھی۔

اس کی بدیشانی کے دن قریب آ رہے تھے، یکایک ایک انوکھا واقعہ پیش آ گیا، شام کو سعیدا کی سہیلی اس کی خیریت معلوم کرنے آ گئی تھی۔ اس کی گود میں سال بھر کا بچا تھا۔ دونوں سہیلیاں باتیں کرنے لگیں، اور سمونا نے اپنا بچا بچی کو تھما دیا۔ بچی دونوں سہیلیوں کی باتیں سنتی رہی تھیں، پھر جب سمونا واپس جانے لگی تب اس نے محسوس کیا کہ سمو کو حرارت ہو رہی تھی، اس نے خیال بھی نہ کیا، اور سب سے مل کر چل دی۔

رات سے سعیدا بے چینی محسوس کر رہی تھی، اسے ہسپتال پہونچانے کا انتظام ہو رہا تھا کہ دفعت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ظفر استفسار کے لیے باہر گیا، اور واپس آ کر ایسی خبر سنائی کہ بچی فی تو خیر دم سادھ لیا، مگر سعیدا نے چیخ کر دل دل سنبھال لیا، اور کانپنے لگی۔

"سمو مر گیا۔ کیسے۔ کیوں کر۔ کچھ پتا نہیں، بس اسے بخار آیا تھا۔ اندازا ہوا کہ خسرہ ہے، پوری کھلتے کھلتے ختم ہو جائے گی، مگر وہ جسم پر ابھری اور غائب ہو گئی۔ تیسرے دن بچا چل بسا۔

بچی فی اندھیرے غار میں گری جا رہی تھیں۔

یا الٰہی! ڈس لیا میرے زہر نے معصوم بچے کو۔ انھیں رونا بھی نہ آیا۔

سعیدا کی حالت ابتر تھی۔ وہ تھر تھر کانپتی ہوئی ظفر سے لپٹ گئی، اور اجنبی سی آواز میں بولی "انھیں نکال دیجیے۔ خدا کے لیے۔ اس کے دشمن نہ بنیے جو اچھا نہیں ہوتا۔ ہائے مجھے کتنی تکلیف ہے۔ میں کیا کروں۔ کیا اپنے بچے کو بھی مرنے کے لیے جنم دوں؟ میرے اللہ" ظفر کی باہوں میں بے ہوش ہو گئی۔

اسی رات اس نے ایک خوبصورت اور صحت مند بچے کو جنم دیا، ظفر بھی خوش تھا بار بار بچے کا منھ دیکھتا اور بہت سوچ کر رہ جاتا۔

وہ سعیدا! میں گھر نہیں جاؤں گا، سعیدا نے کیا وہ یا تو الگ گھر لے گا یا پھر نہیں نکالے!

ظفر کے چہرے پر بیدلی کے آثار ظاہر تھے وہ چپ رہا۔

میں نے دیکھا تھا [illegible] کرتے لگی تھی۔ سوٹر کی [illegible] ان کی گود میں سو رہا تھا۔

میرے اللہ وہ میرے بچے کو بھی گود میں لیں گی۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ظفر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے بولا۔

"مطمئن رہو سعیدا! وہ خدا کہیں چلی گئیں۔ تم ہسپتال آئیں۔ مجھے خیال نہ رہا، واپس جاکر دیکھا وہ غائب تھیں۔"

سعیدا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یا اللہ شکر ترا۔ پھر وہ ہسپتال سے اپنے بچے کو لے کر گھر آئی۔ بہت خوش تھی۔ ظفر کو ملال تھا۔ پتا نہیں مظلوم بڑیا کہاں گئی۔ کیا باپ سمیٹا لوگوں نے اس کا۔

پانچویں دن اس نے بڑی دھوم سے بچے کی چھٹی کی تھی۔ سارا محلہ گھر میں جمع تھا، کھانا پک رہا تھا، مراثنیں گا رہی تھیں۔ روشنی ہو رہی تھی، عورتیں چمک دار کپڑوں میں لپٹی، زیورات لادے ہوئے ہی ادھر ادھر پھر رہی تھیں، یکایک طرب انگیز مجمع میں اضطراب آمیز ہلچل مچنے لگی۔

سعیدا نے دیکھا کہ اس کے نوزائیدہ لال کے رنگ نیلے رنگ ہیں۔ وہ بلا وجہ ہی ڈر رہا ہے، اور کوئی سیہ چیز اس کے نامکمل چہرے سے عیاں تھی۔

خود ڈاکٹر بلوائے گئے، ظفر نے دل تھام لیا، سعیدا کے حواس گم تھے، بچا دفعتہً کسی ناقابل شناخت مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"ہائے میرا بچا۔" سعیدا کی بے قراری دیکھی نہ جاتی تھی۔

"کسی کی بد دعا ہے بڑی ہے" محلے کی ایک عورت بولی "یہ کیا ہو رہا ہے۔ آئی خان۔" خوشی کی محفل، ماتم کی مجلس میں بدلنے لگی تھی، بچے کے سرہانے ڈاکٹر کھڑے تھے، مراثنا کو آشا میں بدلنے کی تدبیریں جاری تھیں۔

اور اس وقت جب کہ تمام مخبر لوگ گھر میں جمع ہو کر رہ گئے تھے، باہر دیکھیں کھٹک رہی تھیں، ظفر کو اس دکھیا کا خیال آیا جو گھر سے نکال دی گئی تھی۔

اس نے ایک عورت سے دریافت کیا، اس نے بڑا سا موہ بنا کر کہا "ارے اچھا کہ کلموہی بڑ بانگو نکال باہر کیا، بھلا پاک ہوگیں، سنا ہے حوالدار صاحب کے کریج میں ہے، کوئی ڈائن کو موہ نہیں لگاتا۔"

ظفر کسی سے کچھ کہے بغیر چلا گیا، حوالدار صاحب تو اسی کے ہاں مدعو تھے، مگر گھر کھلا تھا۔ کریج میں اسے جانی پہچانی شخصیت نظر آ ہی گئی۔

عجیب حالت تھی۔ بال بکھرے ہوئے، میلا سا لباس، وحشت زدا سی آنکھوں میں آنسوؤں کا ہجوم ظفر کو دیکھتے ہی رو پڑیں۔

"چچی جانا" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔ جواب میں انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر فریاد کی۔

"بار ڈالو مجھے، میرے بچے، تمہیں خدا کا واسطا تجھے کہیں سے زہر لاکر کھلا دو۔ ہائے میں کسی کا گھر نہ آباد سکوں، کسی میں میری نظر نہ لگے، میرے بیٹے، رحم کر میرے حال پر، ارے میں تو خدا مانگتی کی ماری ہوں۔"

"کوئی اپنا پھول سا لال مجھے دے دے، میں کسی کے بچے کیوں کھاؤں گی، اپنے بھی تو مجھ گنوائے۔"

"چلیے، چچی جی گھر چلیے" اس نے زبردستی کھڑا کر دیا۔ "مجھ سے یوں انتقام نہ لیجیے۔ آج میرے بچے کو آپ کی ضرورت ہے۔"

اور جب عورتوں نے دیکھا کہ وہ شکستہ حال برباد اور کھنڈر سی بڑھیا ظفر کے بازو کا سہارا لیے پھر آ رہی ہے تو انھیں یک لخت سانپ سونگ گیا۔

گھر میں خاموشی تھی، اس سے پتا چلتا تھا کہ بچا خطرے کے دور سے گزر گیا، سعیدا اسے لیے بیٹھی تھی، ڈاکٹر اطمینان دلا کر جا چکا تھا۔

چچی جی ہر قدم پر لڑکھڑا رہی تھیں، ظفر نے انھیں بیچ محفل میں لاکر بٹھا دیا، سعیدا کچھ کہنے چلی تھی کہ ظفر کی آواز گونجی۔

"میں کہے دیتا ہوں کہ آج سے چچی جی ہمیشا کیلئے اسی گھر میں رہیں گی، جسے کو منظور نہ ہو وہ ان سے نہ ملے۔"

پھر اس نے سعیدا کو حکم دیا۔

"سعیدا بچے کو لاؤ۔" اور چچی جی کے گود میں دے دو

پروفیسر ابو محفوظ الکریم معصومی، ریڈر مدرسۂ عالیہ، کلکتہ

مرزا غالب اور مدرسۂ سرکار کمیٹی

مرزا غالب کی سوانح زندگی میں شاعرۂ کلکتہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فروری ۱۸۲۸ء میں مرزا وارد کلکتہ ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر (۳۱) سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بہرحال کم و بیش دو سال مرزا کلکتہ میں مقیم رہے، اور نومبر ۱۸۲۹ء کے آخر تک دہلی واپس آئے۔

قیام کلکتہ کے دوران یہ ظاہر کہ کئی آنکھ مشاعروں میں مرزا کی شرکت سے جان پڑ گئی ہوگی، لیکن ان میں سے صرف ایک مشاعرے کا انھوں نے بار بار ذکر کیا ہے، اور ان اعتراضات کی تفصیل جتائی ہے جو اس بزم سخن کے بعض اشعار پر کیے گئے تھے۔ مشاعرے کی یہ مجلس جس ادارے میں منعقد ہوئی تھی، اس کے متعلق اصحاب علم کا ایک طبقہ خاموش نظر آتا ہے اور ایک طبقہ "غالب شناسی" کے ممتاز اراکین پر مشتمل ہے، یہ صراحت کرتا ہے کہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ جو ۱۸۲۷ء میں قایم ہوا، اور ۱۸۲۷ء تک اپنی موجودہ عمارت واقع ویلزلی اسکوایر (موجودہ حاجی محمد محسن اسکوایر) میں منتقل ہو چکا تھا، مدرسے کی اسی عمارت میں مشاعرہ منعقد ہوا، اور وہ ہنگامہ برپا ہوا جس نے غالب کی سرگزشت حیات میں ایک مستقل باب کا اضافہ کیا۔

اس ہنگامہ خیز مشاعرے کی مفصل روداد کسی قدیم ماخذ میں یکجا نہیں ملتی۔ خود مرزا غالب نے اس کا ذکر متفرق طور پر کیا ہے۔ مرزا کے ہم عصر حقہ پیر علی عبرت عظیم آبادی نے فارسی شعرا اور ان کے کلام پر الگ الگ دو تذکرے مرتب کیے تھے، منتخب الخبار اور ماخذ الافکار۔ [illegible]

دونوں تذکروں میں مرزا غالب کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے، اور مشاعرے میں ہنگامہ برپا کرنے والوں کی مذمت کی ہے، لیکن جگہ کے تعین کا مسئلہ ان تذکروں سے بھی حل نہیں ہوتا۔

میرا خیال یہ ہے کہ خود مرزا کے بیان کا پھر سے جائزہ لینا چاہیے، اور ان کے بیان میں جو اشارات ملتے ہیں، ان پر اور کچھ ایک دوسرے خارجی دلایل و قراین پر اچھی طرح غور کر لینے کے بعد مشاعرے کی جگہ کا تعین کرنا چاہیے۔ یہ مضمون خاص اسی مقصد سے سپرد قلم کیا گیا ہے۔

(الف) مرزا غالب کا ایک فارسی مکتوب اس مشاعرے کے سلسلے میں بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے۔ مکتوب الیہ مولوی حمد علی خاں صدر امین ہیں۔ اس کا اقتباس نیچے پیش ہے۔

از نوادر حالات این کہ سخن ور[illegible]
نکتہ رسان این بقعہ [illegible]
خاکسار بزم سخنے آراستہ [illegible]
در سہ ماہ شتمی انگریز [illegible]
نخستیں، سخن گویان در [illegible]
کمپنی [illegible]
ہندی رختار سی خواندند [illegible]
گران مایہ مردے کہ [illegible]
سفارت رسیدہ [illegible]
نوای رسیدہ و اشعار [illegible]
بلندی ستاید و بہ کلام [illegible]
این قلم [illegible]

است - ہمگنان حمد می برند و کلانان انجمن و فرزانگان
من دو بیت من اعتراض نادرست بر آوارد و
آں را شہرت می دہند - ولے آنکہ زبان پارسی آشنا
شود - از ہمہ انشوران کہ مخزونی و ملاذی نواب علی
اکبر خان و مکرمی و مطاعی مولوی محمد محسن از آغاز تا
حجر ابہامی یا بند"

(کلیات نثر فارسی ص۱۷ حالی یادگار غالب ۳۶۲-۳۶۳)

غالب کے کلکتہ پہنچنے کے بعد بقول مولانا ہر
غالب کے اعزاز میں ایک خاصی شاعر منعقد کیا گیا۔
(غالب ص۱۱۵) کو اس اعزاز کا کوئی واضح ثبوت نہیں
ملا۔ زیادہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعرے کا یہ
سلسلا غالب کے کلکتہ پہنچنے کے بعد شروع کیا گیا تھا،
اگرچہ سیاق کلام اس بارے میں بھی قطعی نہیں ہے۔
بہرحال منشور ۱۲ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ۔

۱- مشاعرہ ہر انگریزی مہینے، پہلے اتوار کو منعقد
کیا جاتا تھا۔
۲- نشست مدرسے سرکار کلکتہ میں ہوتی تھی۔
۳- شاعرے میں ہندستانی اور فارسی غزلیں
پڑھی جاتی تھیں۔
۴- جس مجلس میں غالب شریک ہوئے اس
میں اچانک سفیر ایران بھی پہنچ گئے تھے۔
۵- سفیر ایران نے غالب کے کلام کی تعریف
کی، اور ان کو جی کھول کر داد دی۔
۶- مقامی شعرا کے کلام پر سفیر زیر لب مسکراتے رہے۔
۷- مقامی شعرا کو جو خفت اٹھانی پڑی اس کا نتیجہ
یہ نکلا کہ غالب ہدف اعتراض بنائے گئے۔
۸- اعتراض غالب کے دو شعر پر کیے گئے۔
۹- غالب کی حمایت میں نواب علی اکبر خان اور
مولوی محمد محسن نے جوابات دیے (مولانا ہر
نے دوسرے شخص کا نام محمد حسن لکھا ہے
دیکھیے (غالب ص۱۱۶، ۱۱۷، ص۱۱۳، ص۱۱۴)

(ب) چودھری عبدالغفور سرور کے نام خط میں حاجی عالم
مارہروی کو لکھتے ہیں "یہ مثنوی جس میں یہ
مصرع ہے ع وصحاش لند کہ بدنمی گویم"
کلکتا میں میں نے لکھی ہے۔ پانچ ہزار اشرفی

فراہم تھے، اور جو اعتراضات مع پر کیے گئے تھے،
ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ (ہمہ عالم) غلط
ہے، (ہمہ) کا لفظ (عالم) کے ساتھ ربط نہیں پا
سکتا، قتیل کا حکم یوں ہے۔ عرض کیا گیا کہ حافظ
کہتا ہے کہ ہمہ عالم گواہ عصمت اوست۔ سعدی
کہتا ہے ع عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دست۔
عرض اس تحریر سے یہ ثابت ہے کہ مثنوی وہاں
لکھی گئی، اور ایک ایک نقل مولوی کریم حسین بلگرامی
اور مولوی عبدالقادر رامپوری اور مولوی نعمت علی
عظیم آبادی اور ان کے امثال و اظائر کے پاس بھیجی
گئی۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کتھا یاد دھر طوالت
(عود ہندی ص۱۴۵ طبع مرکز ۱۹۶۷ء) ص۱۴۶ کملی گ
اس بیان سے معلوم ہوا کہ شاعرے میں پانچ
ہزار کا مجمع تھا۔ معترضین نے (ہمہ عالم) کی ترکیب
پر اعتراض کیا تھا۔ کلکتہ کے سربرآوردا ادبا میں
کریم حسین بلگرامی، عبدالقادر رامپوری اور نعمت علی
عظیم آبادی اس پایہ کے لوگ تھے کہ مثنوی یا مؤلف
کے تسکین مرزا غالب نے ان کی خدمت میں بھیجی تھی۔
معترضین کی صف میں ان کے شامل ہونے کی صراحت
نہیں ملتی ہے۔ لیکن اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے
کہ موقع ملنے پر ان میں سے ایک بھی چوکنے والا نہیں
تھا، جیسا کہ خود مرزا نے واضح کر دیا ہے
بہ ظاہر اسی عبارت کی بنا پر شیخ اکرام نے
غالب کے معترضین میں ان کا نام شمار کیا ہے،
اگرچہ مولانا ہر نے "غالب نامہ" کے حوالے
سے ان کے نام نقل فرما کر آخر میں لکھا ہے کہ مجھے
اس بیان کا ماخذ معلوم نہ ہو سکا (غالب ص۱۲۲ حاشیہ)
مولوی کریم حسین بلگرامی وہی بزرگ معلوم ہوتے
ہیں جن کی فرمائش پر غالب نے برجستہ قطعہ "کیجی"
یہ کہا تھا۔ ان کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ ہمہ بیان
قاطع، بقیہ کے آخری مرحلے سے انہی کے ہاتھوں
گزر رہی تھی۔ فارسی دیباچے میں حمد لکھتے ہیں۔

واپس جست۔ حسب اشارہ فیض بشارہ، جناب مستطاب
الالقاب، تنقیح الفاظ متن عبارات و فقرات درمتن
تصحیح ہمدوف ایشان از آغاز تا انجام داشتہ"

(بہ بیان قاطع چھپا چاہئے) اس کے بعد ٹامس روبک THOMAS ROABUCK کی باری آتی تھی۔ برہان قاطع کے انگریزی دیباچے نے روبک نے ان کی تعریف و تعارف کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ کرم حسین بلگرامی فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ عربی و فارسی میں منشی کے عہدے پر کالج کے شروع زمانے ہی سے فایز تھے، اور ٹامس روبک سے پہلے۔ IHAN BAILTIE اور N.B.EDMONSTO کی ماتحتی میں مصروف خدمت کامیابی سے انجام دے چکے تھے۔ غالب کے ورود کلکتہ تک وہ یقیناً فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ عربی و فارسی میں میر منشی کے عہدے پر سرفراز ہو چکے تھے۔ لغت و زبان دانی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ برہان دیکھنے سے جس کی ان کو عقیدت ہو گئی، وہ ظاہر ہے۔ ایسی شکل میں غالب کا ان کی طرف سے خائف ہونا کچھ بیجا نہ تھا۔ کرم حسین ۱۸۳۱ء تک یقینی طور پر بقید حیات رہے۔ صراح کے ضمیمے (مطبوعہ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء) کے خاتمے میں حکیم عبدالحمید مرتب مہیا نے جن اصحاب علم و فضل کے نام (اسلامی مدد گاران) کے زیر عنوان گنائے ہیں، ان میں مولوی کرم حسین میر منشی کالج کا نام شامل ہے۔ (ص ۱۰۶)

دوسرے صاحب مولوی عبدالقادر رامپوری کے بارے میں کوئی خاص بات مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔ شوق نے تذکرے کا ملان رامپور میں مفتی عبدالقادر نمکین کا ذکر کیا ہے جو مراد آباد رہتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوئے، اور اجمیر، راجستان جیلپور، ناگپور میں بڑے بڑے عہدوں پر فایز رہے۔ کمپنی نے خطاب خان بہادری اور خلعت دیا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں ملازمت ترک کر کے دہلی گئے اور شاہ ظفر کے پاس کچھ مہینے رہے۔ یہ قول شوق اسی زمانے میں ایک موقع پر غالب کے کلام سے ظرافت کی تھی (کا ملان رامپور۔ ص ۲۳۴) قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے قیام کلکتہ کے

نعمت علی عظیم آبادی کے بارے میں ہماری معلومات صفر کے برابر ہیں۔

(ج) غالب کا شیدا ایمان مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں ملتا ہے، اللہ اللہ جو کلکتا میں مشہور اٹھا تھا، یہ شعر ہے

جزوے از عالم و از جملہ عالم بیشتم
بچھ موئے کہ بتالی رانی کمر بر انگیزد

"اعتراض" غالب کے اس شعر پر ہے کہ "عالم" جزو ہے اس کا رابط (جملہ) کے ساتھ بسبب اجتماع متشابہ متشابہ ہے۔ بقیاً اس زمانے میں شاید اکا دکا ایرانی گورنمنٹ میں آ یا تھا۔ کفایت خان اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قطعہ بھیجا (اس نے اساتذۂ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے جس میں (جملہ عالم)، (جملہ روز) و (جملہ جا) مرقوم تھا، اور وہ اشعار اس مطلع برہان میں مندرج ہیں۔" (عود ہندی، ص ۱۶۶، الیضاً ص ۱۷۱ آگرہ)

اس عبارت میں جس کفایت خان کا نام آیا ہے، غالب اس سے حضرت مراد ہے، جس کے نام فی مراحت کلیات نثر فارسی میں بھی کئی گئی ہے، لیکن عود ہندی کی عبارت غماز ہے کہ کفایت خان مجلس مشاعرہ میں حاضر نہیں ہوئے جب کہ کلیات نثر فارسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیر ہرات بارگاہ مجلس مشاعرہ میں وارد ہو گئے تھے۔ عبارت منقولہ بالا میں اگر چہ اسی ایک اعتراض کا ازالہ کیا گیا ہے جس کا ذکر عبدالغفور سرور کے خط میں آ چکا ہے، تاہم اس شعر کو (خستہ حراحتہائے اعتراض) کہہ کر غالب نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس شعر پر کچھ اور اعتراضات بھی کیے گئے تھے، جن کی تفصیل ہمیں مشکل سے یاد مخالف" میں ملتی ہے۔

مثنوی یاد مخالف، جو اس ہنگامے کے بعد نواب علی اکبر خان اور مولوی محمد حسن کے اشارے پر لکھی گئی، اس کے بعد کے اشعار مجلس مشاعرہ کے خاتمہ اعتراضات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

(ہمہ عالم) غلط گرگفت نخست یارۂ دُر بن غلط گر گفت نخست
(بیش) را عشرہ گر گفت بمن بدر زمیں بیشتر گر گفت بہ من
موئے را برکمر گر گفت غلط شعر را سر بسر گفت غلط

اس مصرع سے ع بزم اشعار را کہ بر ہم کرد،
صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہنگامۂ بزم مشاعرہ ہی
میں برپا ہوا تھا اور کم سے کم (ہمہ عالم) کی ترکیب
پر (نشر طپکے) غالب کا بیان محمول ہو سر بزم ہی
اعتراض کر دیا گیا تھا، اس لیے مہر صاحب کا یہ
بیان محتاج نظر ثانی ہے کہ اسی مشاعرہ میں یا
کسی دوسری مجلس میں اعتراض کیا گیا کہ (ہمہ عالم)
کی ترکیب "درست نہیں" (غالب: ص ۱۱۶)

کلیات نثر فارسی کی عبارت سے معلوم ہو چکا
ہے کہ بدف اعتراض غالب کے دو شعر تھے۔
دوسرا شعر بہ ظاہر اس غزل کا تھا جس کی ردیف
تھی (زدہ) گویا کے ساتھ مخالفین کا ایک اعتراض
اسی کی ردیف پر تھا جس کو نیچے کے اشعار ظاہر کرتے ہیں
والے باآنکہ شعر من صاف است

(زدہ) را کسرہ از ظرافت نیست
یائے وحدت بود اضافت نیست
واضع طرز ایں زمیں نہ منم
در خور سرزنش ہمیں نہ منم
دیگراں نیز گفتہ اند چنیں
گر ہر راز سفتہ اند چنیں

وہ شعر جس میں (زدہ) کسرہ کے ساتھ آتا ہے،
یوں ہے ؎

شہور اشکے بہ شمار بن مژگاں دارم
طعنہ بر لے سرو سامانی طوفان زدۂ

(کلیات فارسی ص ۸۳ نول کشور ۱۹۲۵ء)

"غالب نامہ" کے حوالے سے اس شعر کو نقل
کرنے کے بعد مولانا مہر فرماتے ہیں کہ مجھے غالب
کے کلام میں یہ شعر نہ مل سکا، اس زمین میں غالب
کی ایک غزل موجود ہے، لیکن اس میں منقول شعر
موجود نہیں ہے۔" (غالب: ص ۱۱۶ حاشیہ ۲)

سرسری طور پر رجوع فرمایا ہوگا، ورنہ اس زمین
غالب کی دو غزلیں ملتی ہیں، ردیف ہائے ہموز کی
پہلی غزل میں یہ شعر موجود ہے، دوسری غزل ہائے
ہوز کے اواخر میں ثبت ہے، تو یقیناً مولانا مہر کی نظر
گذری ہوگی۔ منقولا بالا شعر اس غزل کا نہیں ہے،
لیکن "طوفان زدہ" کی ترکیب اس میں بھی ملتی ہے ؎

خواہم شکوہ بیداد تو انشا کردن
از خرشی رقم شد حسن طوفان زدۂ

(کلیات فارسی، غالب: ص ۴۸۸)

اوپر کے اقتباسات سے جو باتیں معلوم ہوتی
ان میں سے چند چیزیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔
مدرسۂ سرکار کپتی، پانچ ہزار، اور ہرکارہ انگریزی مہینے
پہلے اتوار کو بزم مشاعرہ کا منعقد ہونا۔

غالب کے معاصرے علم میں وزیر علی عبرتی کا بیان
اس مشاعرے کے سلسلے میں قدیم تر ماخذ ہے جو
ہماری دست رس میں ہے۔ عبرتی نے فارسی مضمون
کا تذکرہ معراج الخیال ۱۲۶۸ھ تک مرتب کیا ہے
اس سے پہلے ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں انھوں نے نثر نگاروں
کا تذکرہ اوتاد الاقطار مرتب کیا تھا گویا دونوں تذکرے
مرزا غالب کے دوران حیات میں لکھے گئے۔ بعد
کے تذکرے عبرتی نے اپنا ماخذ میر ذوالفقار علی
کو بیان کو قرار دیا ہے، اور یہ سلسلۂ مشاعرہ مرزا غالب
کے ایک معترض کا نام امان علی خاں بتایا ہے۔ تذکرے
"معراج الخیال" میں ان کا ماخذ ایک بیاض کے علاوہ امان
خاں (کذا) شاگرد غالب کا بیان ہے۔ مواد کے
اعتبار سے دونوں تذکرے ایک جیسے ہیں۔ اور
یہ کہ معراج الخیال میں مرزا امان علی خاں کا نام پر موقع
نہیں آتا۔ عبرتی بہرحال معترضین سے ناخوش نظر آتے
ہیں، لیکن وہ مرزا غالب کو قصور پر ترجیح دینا روا
نہیں رکھتے، چنانچہ متعلقہ عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

"سخن فہمان نکتہ سنج ہمہ دانی آں حیف
لسانی شیرہ حرفانہ آویزند بادگر دند۔
چوں آں معتبر روزگار خیلے سخن رسا و
ماہر ایں فن بود، کسے را از آں جماعۃ

برلب بیان نہاد چنانچہ مختصر مثنوی کہ در مناظرہ اہل لکنا، نظم در آورد، شاید این مقال است، مگر بعضے فن شناسان کہ بر مرزا فضیل آن عالی افکار را ترجیح می دہند، خالی از تکلف نمی نماید۔"

(معراج الخیال ص۱۵۱ بہ۔ زیر شمارہ ۱۵۱ کرزن)

عبرتی کے دونوں تذکروں کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) غالب کا مولد دارالسلطنت دہلی ہے (یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ غالب متقضا طور پر اکبر آباد میں پیدا ہوئے)

(۲) معترضین بدمذاق اور حاسد تھے دوسرے خیال میں تفاوت سن وسال اور مرزا کے بلند آہنگ دعووں کو ہدف سنگ ملامت بنانے کی بنیادی اسباب کی حیثیت حاصل رہی ہے)

(۳) اعتراض کرنے والوں میں مرزا امان علی خان پیش پیش تھے (ریاض الافکار۔ ص۱۵۲ ظ۔ رقم ۹۳ فارسی، لوہار)

(۴) امان علی خان کو غالب سے کوئی نسبت نہیں تھی (ریاض الافکار)

(۵) فتیل پر غالب کو ترجیح دینا تکلف سے خالی نہیں (معراج الخیال)

میرے علم میں عبرتی کی ریاض الافکار سے سب سے پہلے جناب احمد خان نے استفادہ کیا، ان کا مضمون (غالب کا فالتو) ماہ نو شمارہ فروری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اسی مضمون سے عبرتی اور ان کی ریاض الافکار کا علم ہوا، اور اسی زمانے میں نسخے لوہار کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔

خان صاحب، امان علی خان کے متعلق لکھتے ہیں کہ معترضین میں سب سے زیادہ بلند آہنگ ایک صاحب بنام نواب مرزا امان علی خان تھے۔ یہ بھی غالب تخلص کرتے تھے۔ عظیم آباد کے رہنے والے تھے اور بڑے عرصہ پہلے کلکتہ میں آکر رہے تھے (ماہ نو ص۲۷، شمارہ فروری ۱۹۵۰ء)

معلوم نہیں ریاض الافکار کی عاجلانہ مراجعت نے خان صاحب کو [illegible] کار دیا ہا، اگر [illegible]

بنا پر انھوں نے امان علی خان کو غالب کا ہم تخلص لکھ دیا ہے۔ بہرحال اس کی نشان دہی نہ ان کے مقالے میں ملتی ہے نہ کسی اور ذریعے سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔ عظیم آباد کے امان علی خان نے بیخ تخلص کرتے تھے۔ مرزا ابراہیم خان اصفہانی کے لڑکے تھے، یعنی غالب اگر سلجوقی ترک ہو کر بیخ اصفہانی کے گھرانے سے ہو سکتے تھے تو یہ بھی اصل اصفہانی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ غالب کی طرح ان کا مولد اکبر آباد ہی تھا، البتہ نشو و نما عظیم آباد میں ہوئی تھی۔ غزل رختہ میں قادر کلام ہونے کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ عبرتی نے ان کو خاص دوستوں میں لکھا ہے اور بڑے اچھے الفاظ میں ان کا ذکر دو تین جگہوں میں کیا ہے (ریاض الافکار کی تالیف کے زمانے میں یقیناً عظیم آباد ہی میں مقیم تھے۔ فاضل خوشدل نام بہزاد قناعت بعظیم آباد میں گذارد۔ ریاض الافکار) عبرتی نے ان کی آزاد اور صنع اور خانہ بدوشی کی طرف خاص طور پر اشارا کیا ہے، اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ کلکتہ میں بھی کچھ زمانا بسر کیا ہو، تاہم حیرت ہوتی ہے کہ عبرتی نے مرزا فتح کے تذکرے میں غالب سے ان کی آویزش کی حالت اشارا کرنا تو ایک طرف کبھی کلکتہ میں ان کا ذکر تک نہیں کیا، اس کے علاوا غالب کے فارسی کا ایسا فقرا لکھنا گوارا کیا (خصوص مرزا امان علی خان کہ اصلاً بآن مستعد روزگار جادو بیان نسبتے ندارد۔" (ریاض الافکار)۔ بہرحال یہ احتمال اپنی جگہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عظیم آباد کے یہی امان علی خان اعتراض کرنے والوں میں سب سے زیادا بلند آہنگ رہے ہوں گے، لیکن ان کا تخلص فریح تھا نہ کہ غالب۔ ان کے نام کے ساتھ نواب کا لقب بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ فرزند علی خان یکتا کے شاگرد امان علی خان کی تخلص بھی فریح عظیم آبادی ہے، یہ بھی ریاض الافکار، [illegible] معراج الخیال ۸۲ ظ)

[illegible] کار غالب [illegible]

وہ مدرسۂ عالیا کے ذکر سے خالی ہے۔ (یادگار غالب ص۱۸۰، علی گڑھ) محمد حسین آزاد کو بھی اس سے سروکار نہیں کہ مشاعرہ کس ادارے میں منعقد ہوا تھا۔ آزاد اور حالی کے بعد معلوم نہیں کس طرح غالب کے تذکرہ نگاروں نے مشاعرے کی جگہ مدرسۂ عالیا کو قرار دینا شروع کیا۔ شیخ اکرام نے حیات غالب میں بہ ظاہر کلیات نسخۂ فارسی کی اوپر کی عبارت کی بنیاد پر لکھا ہے۔ "کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مدرسہ جاری کیا تھا، اس سے متعلق انہی دنوں وہاں ایک بزم سخن قایم ہوئی تھی، جہاں ہر مہینے پہلے اتوار کو مشاعرہ ہوتا، اور ہندستانی، فارسی غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا نے بھی اس میں غزلیں پڑھیں۔" (حیات غالب ص۸۰، دلی) ہر موقع حاشیے پر مدرسے کے قیام کی مختصر تاریخ بتا کر شیخ صاحب نے متعین کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک "مدرسے سرکار کمپنی" سے مدرسۂ عالیہ مراد ہے۔ جس کو گورنر جنرل وارن ہسٹنگز نے قایم کیا۔" (ذکر غالب ص۸۰ حاشیہ ۱)

ہر صاحب نے مدرسۂ سرکار کمپنی کو مدرسۂ کلکتہ لکھا ہے۔ اس سے ان کی مراد مدرسۂ عالیا واضح ولیزلی اسکوائر سے ہو گی، اور اس میں شک نہیں کہ آج تک مدرسۂ عالیا کے لیے کاغذات میں "کلکتہ مدرسہ" لکھنے کا دستور ہے، اور جیسا کہ ابتدا معلوم ہوگا خود مرزا غالب اسی مدرسے کو آمدرسۂ کلکتہ (کے نام سے جانتے تھے۔

محمد اللہ خان نے اپنے مضمون (غالب کا کلکتہ میں مدرسۂ کلکتہ سے ہمارے اسی مدرسے کو مراد لیا ہے، اور اسی سلسلے میں لکھا ہے۔

"۱۹۲۸ء میں جب میں کلکتہ میں تھا، مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مجلس میں مجھ سے کہا کہ مدرسہ اپنی موجودہ عمارت میں ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں منتقل ہوا۔"

غالب کو مثنوی باد مخالف والا سنگا مدرسے کی پہلی عمارت میں پیش آیا جو سیالدا میں بیٹھک خانا روڈ پر تھی۔ (ماہ نو ص۲۷ فروری ۱۹۵۰ء)

محمد موسا کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو مشاعرے ۱۸۲۸ء میں ہوے ان کا ذکر مدرسے کے پرانے کاغذات میں نہیں ملتا ہے۔ اس باقاعدہ اطلاع کے باوجود خان صاحب کو مولانا آزاد کے بیان میں کسی قسم کی گنجایش نظر نہیں آئی، اور انھوں نے مولانا کے بیان کو صرف اسی ترمیم کے ساتھ کہ مشاعرہ پہلی عمارت میں نہیں ہوا، تسلیم کر لیا ہے۔

"ذکر غالب" میں مالک رام یوں رقمطراز ہیں ان دنوں کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسے عالیا کے زیر اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے کو ایک بزم سخن منعقد ہوتی تھی۔" (ذکر غالب: ص۹۳ جامعہ ۱۹۵۵ء) بر موقع حاشیے پر یہ عبارت بھی ملتی ہے۔ "یہ مشاعرہ مدرسۂ عالیا کی موجودہ ولزلی اسٹریٹ والی عمارت میں ہوا تھا، اس سے پہلے مدرسہ بیٹھک خانے میں تھا۔ ولزلی اسٹریٹ والی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۵ر جولائی ۱۸۲۷ء کو رکھا گیا۔ پوری عمارت تین سال کی مدت میں تیار ہوئی، اور غالب کے کلکتہ پہنچنے سے صرف چند ماہ پہلے اگست ۱۸۲۷ء میں عجائب خانہ نئی جگہ میں منتقل ہوئی تھی، مشاعرے میں نشست کا انتظام یوں تھا کہ شعرا کرام اندر کے مغربی برآمدے میں تشریف فرما ہوتے۔ حاضرین کی مڑھی تعداد ماہر کھلے صحن میں فرش پر بیٹھتی تھی۔" (ذکر غالب ص۹۳ حاشیہ ۱)

مالک رام نے اصل میں گویا غالب کے مدرسۂ سرکار کمپنی کا ترجمہ کر دیا ہے، پھر حاشیے میں اس کی توضیح کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے کہ "مشاعرہ مدرسۂ عالیا ولزلی اسٹریٹ میں منعقد ہوا تھا۔" انھوں نے اسی پر کسی نہیں کی کہ کس شعرا کو نشست تک کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے جیسے خود چشم دید گواہ ہوں، مگر حیرت ہے کہ مالک رام صاحب نے کسی ماخذ کی نشان دہی نہیں کی۔ بہت کافی تلاش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ مولانا آزاد مرحوم کا بیان جناب حمید احمد خان کے حوالے سے گزر چکا ہے،

ملک رام کے معلومات کا سرچشمہ ہو۔

مدرسۂ عالیا کلکتہ جو اعضا د وقات محمڈن کالج اور سرکاری کاغذات میں عام طور پر "کلکتہ مدرسہ" کہلاتا ہے، اس کی روایات میں کسی مشاعرے کا ذکر سنا نہیں گیا، اور کم سے کم حالی کی "یادگار غالب" تک یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس مشاعرے کے سلسلے میں کلکتہ کے مدرسۂ عالیا کا تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔

ہمارے استاد مولانا عبدالستار صاحب، جن سے بڑھ کر مدرسۂ عالیا کے پرانے کاغذات اور قدیم وثائق کا مطالعہ کسی اور نے شاید ہی کیا ہوگا، وہ بھی اپنی کتاب "تاریخ مدرسۂ عالیا" میں کسی مشاعرے کا ذکر نہیں کرتے، صرف آغا احمد علی کے تذکرے میں ان کے یہ الفاظ ملتے ہیں: "۱۸۶۴ء میں سر کوڈیل کی سفارش سے کرنل ناسو لیز پرنسپل مدرسۂ عالیا نے مدرسے کے فارسی مدرس کی جگہ پر آپ کو (آغا احمد علی) مقرر کر دیا۔ یہی زمانہ ہے جب مرزا غالب کلکتہ آئے ہوئے تھے، اور مسلم انسٹی ٹیوٹ میں ایک مجلس تھی۔ اس مجلس میں آغا صاحب بھی موجود تھے۔ ان دونوں میں کسی علمی مسئلے پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جب مرزا غالب نے اپنی کتاب "قاطع برہان" تالیف کی، جس میں "برہان قاطع" اور اس کے مصنف پر سخت اعتراضات کیے گئے تھے، تو آغا صاحب، مرزا غالب کے مقابلے میں اور "برہان قاطع" کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوئے، اور مرزا غالب کے خلاف ۱۸۶۹ء میں "موید برہان" لکھا (تاریخ مدرسۂ عالیا ص ۱۸۴، ۱۸۵ حصۂ دوم۔ ڈھاکا ۱۹۶۵ء)

اوپر کے اس بیان کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔

۱۔ غالب کے سلسلے میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کا ذکر کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کا قیام ۱۹۰۲ء میں عمل میں آیا۔ اس سے پہلے نالتلا میں Mohammaden Library Society جو اپریل ۱۸۶۳ء میں نواب عبداللطف مرحوم کی سعی سے قائم ہوئی اور Society for the Mutual Improvement of young men۔ ان دونوں کی جگہ بعد میں مسلم انسٹی ٹیوٹ نے پر ہوئی۔

۲۔ غالب سے آغا احمد جان کی ملاقات محتاج ثبوت ہے۔ اس قدر یقینی ہے کہ جس زمانے میں غالب کلکتہ میں مقیم تھے، آغا احمد علی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، آغا کی پیدائش جہانگیر نگر ڈھاکا میں ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۴۰ء ہوئی، یعنی کلکتہ سے غالب کی واپسی کے دس گیارہ سال بعد۔

کچھ اسی قسم کا وہم بعض لوگوں کو سید محمود آزاد کے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ ڈاکٹر شادانی لکھتے ہیں "جس زمانے میں مرزا غالب اپنے مقدمے کے سلسلے کلکتہ آئے ہوئے تھے، آزاد بھی ان سے ملنے کلکتہ گئے تھے۔" (وفاداری بشرط استواری ص ۲۹)۔ محمود آزاد کا سنہ ولادت ۱۸۴۵ء ہے اور مرزا کا سفر کلکتہ ٹھیک پندرہ سال پہلے کا واقعہ۔

۳۔ آغا احمد علی اور غالب کی نثلی معرکہ آرائی ایک تاریخی حقیقت ہے، لیکن یہ معرکہ جس وقت شروع ہوا، اس وقت تک غالب کے سفر کلکتہ (۳۲) سال بیت چکے تھے۔ غالب نے ۱۸۶۰ء میں "قاطع برہان" کا مسودہ مکمل کیا، اور ۱۸۶۲ء میں اس کی طباعت واشاعت کے ذریعے نبرد آزماؤں کو دعوت مبارزت

منشی حبیب اللہ خان کے نام ایک رقعے میں لکھتے ہیں "کلکتہ سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسۂ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا موید برہان ہے۔ اس رسالے میں رفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کیے ہیں، اور تیری تحریر پر کیے اعتراضات وارد کیے ہیں، اور اہل مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔" (اردوئے معلی ص ۱۳۱ الہ آباد ۱۹۲۷ء) رقعے کی تاریخ ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ ہے یعنی دسمبر ۱۸۶۶ء۔

لکھا ہے "مدرسے سرکار کمپنی نہیں لکھا۔
مولانا ظہیر نے مشاعرے میں ہنگامہ برپا کرنے والوں میں احمد علی گرپامیر مدرس مدرسۂ عالیا اور وجاہت علی کو شرکا شمار کیا ہے۔ ان کا ماخذ مولانا آزاد کا ایک بیان ہے (غالب ص ۱۳۱، ص ۱۲۲ حاشیہ ۱۰۷) اس فہرست میں احمد علی مدرس مدرسۂ عالیا (یعنی آغا احمد علی) کا ذکر جیسا کہ ذکر کیا گیا درست نہیں۔

مدرسۂ سرکار کمپنی، مدرسۂ عالیا یا مدرسۂ عالی کا اطلاق صرف موجودہ مدرسۂ عالیا یا محمڈن کالج پر نہیں ہونا چاہئے۔ یہ قصہ جس وقت پیش آیا اس وقت تک ملک خانہ زوٹی یا ویلزلی اسکوائر کے مدرسۂ عالیا کے فورٹ ولیم کالج پر بھی ہندستانی فارسی کے اہل قلم انہی الفاظ کا اطلاق کرتے تھے۔ اس دعوے کے ثبوت میں فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات اور مخطوطات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا کافی ہوگا۔

کلیات میر تقی میر ۱۸۱۱ء میں طبع ہوا۔ سرورق پر عبارت ملتی ہے "مدرسۂ عالیا کے لیے نوازش تفضلات سے صاحبان عالی شان کالج عالیان ــــ یہ تھی نمرزا کاظم علی خاں نامور مرزا خان طپش و مولوی محمد اسلم و قادر فی چرن متر ــــ ۱۸۱۱ء میں مطابق ۱۲۲۶ھ ہجری ہندستانی چھاپے خانے میں چھاپا گیا ہوا"۔

رقعات عالی کا پہلا ایڈیشن مولوی الہ داد نے ۱۲۲۶ھ ۱۸۱۱ء میں شائع کیا تھا، اس کے خاتمے کا اقتباس یہ ہے ــــ

برشرف نگاہان ــــ پوشیدہ نماند کہ چون برائے صاحبان عالیشان جماعہ متعلمین مدرسۂ عالیہ، کہ درصدد کسب مہارت بزبان فارسی اند، از اتمام نشر اکبر ــــ خلل بہمہ دانستن واخلاق حسنی، و اشراق انوار فضائل و اخلاق جلالی، در مکمت طبع در آمد خواستم کہ برائے طبع نسخے برسہیم ــــ [illegible]

مطبع ایشیاٹک لیتھو گرافک کمپنی)

ظاہر ہے کہ صاحبان عالیشان جس مدرسۂ عالیا کے متعلم تھے، وہ فورٹ ولیم کالج ہی ہو سکتا ہے یا کلیات میر کی طباعت جس مدرسے کے لیے ہوئی تھی اس سے بھی کالج مراد لیا جا سکتا ہے نہ کہ محمڈن (یہاں قاطع مطبوعہ ۱۸۱۸ء، قصۂ حاتم طائی ۱۸۱۸ء مطبوعہ)

وغیرہ کے سرورق اور دیباچے میں مدرسۂ عالیا، فورٹ ولیم، مدرسۂ عالیا، اور مدرسے عالیا کے الفاظ ملتے ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے لیے لکھے گئے ہیں۔

"مکتب الغواید" مرتبہ خلیل علی خاں اشک کی قابل قدر تالیف ہے، جو اصل میں کتاب "آداب الحرب والشجاعۃ" کا ترجمہ ہے، جس کا دوسرا نام "اوصاف الملوک و طرق حسن السلوک" ہے۔ اس کے دیباچے میں مترجم کا یہ بیان ملتا ہے "فاحقر العباد محمد خلیل علی خان نے کہ از خاصہ خیل کا اشک ہے سنہ بارہ سو اسی ہجری کے درمیان مطابق ۱۸۱۱ء سیوس عیسوی کے وقت میں محمد اکبر بادشاہ غازی کے اور عصر میں ــــ لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر حافظ محروسے سرکار کمپنی انگریز ــــ اور حکومت میں خداوند کے حمت کپتان ٹامس صاحب دام حشمتہ، انتظام میں ــــ ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دولتہ کے، کتاب اوصاف الملوک و طرق حسن السلوک کو، کہ سلطان الحشم کے حکم سے بہ ترجمہ منصور سید الوالمفرخ خلیل نے بہ شدت تمام بڑی جد وجہد سے ہزاروں کتابوں کا انتخاب کر کے تالیف کیا تھا، زبان میں موافق محاورے کے اردو سے بدلے عالیا کے ترجمہ کیا ــــ نام اس کا مکتب الغواید رکھا" (یہیں کہ تاریخ بھی اس کی [illegible] (مخطوطہ نمبر ۱۲۰ اردو انڈیا آفس لائبریری)

[illegible] عبارت مدرسۂ عالیا فورٹ ولیم کالج کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ [illegible] میں گردانا ہے [illegible] مترجم [illegible]

"بعد حمد و نعت کے شیخ حفیظ الدین احمد بن شیخ ہلال الدین محمد بن شیخ محمد خاکر صدیقی، کہتا ہے کہ اس فقیر کے جد اعلیٰ پہلے عرب سے دکن کو آئے، بعد دو تین پشتوں کے شیخ حسن منتظور، جنت البلاد بنگالے کو تشریف لائے ــــ اس حقیر نے بیس برس کے سن تک مدرسۂ کیننگ میں رہ کر علوم فارسی و عربی سے فراغت کی، چونکہ فطرت کی انسان کو لازم ہے، تحصیل علم کے بعد تلاش معاش میں در آیا، اور کیننگ بہادر کے اس مدرسے میں نوکر ہوا کہ جس کی بنا امیر تدابیر اشرف الاشراف مارکوئس ولیزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے عہد میں ہوئی۔" (مخطوط نمبر ۱۱۸، اردو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

اس عبارت میں مدرسے سرکار کیننگ سے جہاں شیخ حفیظ الدین نے تحصیل علم کی، یقیناً مدرسۂ عالیا یا محمڈن کالج مراد ہے جو اس وقت تک ٹھک خانا روڈ پر واقع تھا، اور کیننگ کے مدرسۂ عالی سے جس کی بنا گورنر جنرل ولیزلی کے عہد میں ہوئی فورٹ ولیم کالج مراد ہے۔

"فتاویٰ قاضی خاں" کی چار جلدیں ۱۸۲۵ء میں ایشیاٹک لیتھو گرافک پریس میں طبع ہوئی تھیں ناشر کی حیثیت سے ان والوں میں ایک نام مولوی حافظ احمد کبیر، امین مدرسۂ کیننگ بہادر کا ملتا ہے۔ انگریزی سرورق پر ان کے نام کے ساتھ SUPERINTENDSNT OF THE GOVERNMENT MADRASA لکھا ہے سامنے مدرسۂ کیننگ بہادر سے محمڈن کالج کے عہدے نائب سکریٹری کی طرف اشارا ہے جس پر حافظ صاحب ۱۸۲۵ء میں ہوئے تھے۔

سید منصور علی بن عبدالامام بخش حسینی موسوی سبزواری نے قصۂ سیف الملوک کا ترجمہ سحر عشق کے نام سے کیا تھا اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں "کلکتے میں وارد ہو کر بصیغۂ منشی گری صاحبان عالیشان نوآموزوں کی تعلیم و درس کے واسطے، مدرسا میں کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہٗ کے تفریق ہندوی میں سرفراز ہوا ــــ سن بارا سو اکھار ہ ہجری میں ریختہ نثر میں ترجمہ کیا (ورق ۲، مخطوط نمبر ۱۱۰) یہاں مدرسۂ کمپنی انگریز بہادر سے فورٹ ولیم کالج مراد لیا گیا ہے۔

اقتباسات منقولۂ بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مدرسۂ عالیا، مدرسۂ عالی، مدرسۂ کیننگ کا اطلاق فورٹ ولیم کالج پر بھی ہوتا تھا اور کبھی محمڈن کالج سے تمیز کرنے کے لیے فورٹ ولیم کالج کو مدرسۂ جدید کہتے تھے (دیباچۂ انتخاب سلطانا ــــ مخطوط نمبر ۱۹، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) لیکن کسی قید احترازی کا التزام ہر حال غیر ضروری تھا۔

مرزا غالب کی تحریر میں "مدرسۂ سرکار کیننگ مدرسۂ عالیا یا محمڈن کالج" کی طرح فورٹ ولیم کالج بھی مراد لیا جا سکتا ہے، اور جب دونوں باتوں کا احتمال ہے، کوئی وجہ نہیں کہ مشاعرے کی جگہ خاص طور پر محمڈن کالج یا مدرسۂ عالیا کو قرار دیا جائے۔ اس ترجیح کے لیے کسی خارجی دلیل یا قرینے کا پایا جانا ضروری ہے۔ ہمارے علم میں اہل تحقیق میں سے جن لوگوں نے مراعت کے ساتھ مدرسۂ سرکار کمپنی سے ولیزلی اسکول یا مدرسۂ عالیا کو مراد لیا ہے، ان کی تحریریں دلائل و قرائن سے یکسر خالی ہیں۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر دوسرے احتمال کو تسلیم کر لیں، اور غالب کے مدرسے سرکار کمپنی سے فورٹ ولیم کالج کو مراد لیں تو ہمارے خیال میں یہ ایسا احتمال ہے جسے مستبعد قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ تمام تر قرائن سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی روایات میں مشاعرا بجا طور پر شامل رہا ہے۔ اس کالج کے تحت ترجما اور تالیفا جو صیغا قایم ہوا، اس سے ہندستانی زبان کے نثر نگار اور شاعر دونوں قسم کے ادبا اور منشا تھے، اور منتخب اصحاب علم اور شاعروں کی خاص جماعت فراہم ہو گئی تھی، جس نے اپنے ادنیٰ رجحان اور شاعرانہ مذاق کے لحاظ سے کلکتا میں مشاعرے کی بنا ڈالی۔ یہ مشاعرا ہر سال بڑے اہتمام کے ساتھ ۲۵ جولائی کو منعقد ہوتا تھا۔ اس میں کلکتا کے تمام

ہندستانی کے محسن اور ولدادا انگریز بھی اس میں دلچسپی لیتے تھے، اور ان کی نگرانی میں یہ مشاعرا ایک باضابطا شاعرانا مقابلا اور علمی دنگل ہوگیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں جو مشاعرا ہوا تھا، اس میں کالج نے مرزا جان طپش کے کلیات کا نسخا خریدا، اور اس کی شاعرانا قابلیت کے اعتراف میں گراں قدر صلا دینے کے علاوا کلیات کو شایع کیا۔ (ملاحظا ہو، ارباب نثر اردو ص ۲۵۶ - ۲۵۷)

منشی بینی نرائن جہاں کی تالیف دیوان جہان میں جس کا قلمی نسخا برٹش میوزیم میں محفوظ ہے ۲۵ جولائی ۱۸۱۵ء کے مشاعرے کی غزلیں گلدستے کی شکل میں درج ملتی ہیں۔ غزل سرا ول میں کاظم علی خان، میر حیدر بخش حیدری، سید جعفر علی راوان، افتخار الدین علی خان شیرت، مرزا ماسم علی جان (پسر جوان)، ابو قاسم خان قاسم، مرزا ماسم علی ممتاز (پسر جوان)، مرزا لطف علی ولد نظر آتے ہیں۔

سالانا مشاعرے کے علاوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کالج سے منسلک حلقے مشاعرے کے اہتمام میں ہر مہینے مشاعرے ہوتے ہوں گے، جن میں ہندستانی اور فارسی کی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ ظاہر یہی سلسلا غالب کے قیام کلکتا کے زمانے تک باقی رہا، جس کا تذکرا انھوں نے صدر امین باندا کے خط میں کیا ہے۔

مدرسے عالیا کلکتا یا محمڈن کالج میں کبھی مشاعرا کا منعقد ہونا غالبا ہوجاے تو بات دوسری ہے، ورنا پابندی کے ساتھ ہر مہینے کے پہلے اتوار کو بزم سخن کا آراستا کیا جاتا، جو خاص اہتمام چاہتا ہے، وہ کسی مدرسے کے علما اور اصحاب فن کے مذہبی ماحول، دینی مذاق اور مدرسی مزاج سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتا، اس کے برعکس فورٹ ولیم کالج کے حلقے ادب سے وابستا اصحاب شعر و سخن کے زیر اہتمام، ان کے ذوق، میلان طبع، مخصوص ادبی رجحان اور شاعرانا ماحول کو مدنظر رکھتے ہوے ہر مہینے ایک مقرر دن میں بزم سخن منعقد کرنے کی بات ہر طرح سے صحی معلوم ہوتی ہے۔

مرزا غالب کے بیان سے معلوم ہوچکا ہے، کہ یہ مشاعرا ہر مہینے پہلے اتوار کو ہوتا تھا۔ مدرسے عالیا (محمڈن کالج) میں جمعہ کے سوا ہر روز تعلیم ہوتی تھی، اتوار کا دن بھی درس و تدریس کے ایام میں شامل تھا۔ ۱۸۶۹ء کی ترمیم کے بموجب مدرسا اتوار کو پورے دن بند رکھا جانے لگا۔ اس طرح مدرسے کا اسٹاف کو ویلزلی اسکوایئر کی نئی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد بھی اتنی فرصت کہاں ملتی ہوگی کہ ہر مہینے پہلے اتوار کو بزم سخن آراستا کرنے کا اہتمام کرتے، علاوا اس کے مدرسے کا اسٹاف غالب کے قیام کلکتا کے بعد تک اس قدر محدود تھا کہ اس کے ایسے مشاعروں کا اہتمام کرنا خاصا دشوار کام تھا۔ غالب اس وقت تک بہ عضویت مدرس اور کالج پارچ استاد اور خطیب و موذن اسٹاف میں ہوتے تھے۔ (تاریخ مدرسۂ عالیا: ۶۷ - ۶۵ حصہ اول) پھر مشاعرے کی مجلس معمولی نہیں ہوتی تھی کہ بلکے سامعین کی خاصی کثرت ہوتی تھی اور ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی، آپ خود مرزا کی زبانی سن چکے ہیں کہ جس مشاعرے میں ان پر اعتراضات کیے گئے تھے اس میں پانچ ہزار کا مجمع تھا۔ میرا اندازا ہے کہ مدرسے کا اندرونی صحن پانچ ہزار کے لگ بھگ مجمع کے لیے "جاے تنگ است و مرد ما بسیار" کا مصداق ہے۔ اس صحن میں اتنے بڑے مجمع کے لیے گنجایش نہیں نکل سکتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ نکتا بھی قابل توجہ ہے کہ مرزا غالب نے کلکتا کا سفر جس مقصد سے کیا تھا، اس میں کامیابی کا راستا کچھ اس طرح ہموار ہوسکتا تھا فورٹ ولیم کالج کے ارباب علم و ادب سے تعلق و تعارف پیدا کیا جاے، اس لیے یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ غالب فورٹ ولیم کالج سے یکسر بے تعلق رہ گئے ہوں، مجھے تو جب یہ بھی یہ معلوم ہے کہ فورٹ ولیم [illegible]

کی مراجعت کے بعد بھی ایک عرصے تک کمپنی کے ارباب بسط و کشاد کی مخالفتوں کے باوجود اپنی پیشہ روایات کے ساتھ قایم رہا۔ مثنوی "باد مخالف" کے نسخے جن لوگوں کے پاس گویا بطور معذرت نامہ بھیجے گئے تھے، ان کے نام خدیو زا غالب نے بتا دیے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا تعلق مدرسے عالی کلکتہ سے ثابت نہیں، اس کے برعکس مولوی کرم حسین بلگرامی فورٹ ولیم کالج کے قدیم کارپرداز نظر آتے ہیں جو اواخر مئی ۱۸۳۱ء تک یقیناً کلکتہ کے میرمنشی رہے، اور تمام جون ۱۸۳۱ء سے سعید و پیشکش پر متعلقاً خدمت سے اسبکدوش کیے گئے۔ مثنوی عبدالقادر رامپوری اگر دہی عبدالقادر عاشق ہیں جن کا ذکر شوق نے کیا ہے۔ تو وہ بھی قطع کمپنی کے کارپردازان قدیم سے تھے۔ صرف مولوی نعمت علی عظیم آبادی کا حال کچھ نہیں کھلتا، پھر بھی کلکتہ مدرسے سے ان کا کارشتہ جوڑنا خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

اگر یہ مشاعرہ مدرسے عالیہ کلکتہ کے زیر اہتمام ہوا تھا تو مثنوی کے نسخوں کا مدرسے والا حصہ ان میں سے کسی ایک کے پاس نہ بھیج کر فورٹ ولیم کالج اور کمپنی کے راست خدمت گذاروں کے پاس بھیجنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں!

اوپر کے دلایل و وجوہ کی روشنی میں ہمیں اس عام خیال سے اتفاق کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا غالب نے جس مشاعرے میں شرکت کی تھی، وہ مدرسے عالیہ یا لٹریری اسکوائر میں منعقد ہوا تھا۔ جب کے پیش کردہ دلایل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس مدرسے کا ذکر کمپنی میں ہر انگریز کی جینے مرنے کے لیے اقوار کو مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا تھا اس سے فورٹ ولیم کالج ہی مراد لیا جا سکتا ہے۔

ڈی۔ آر۔ نیر

ہنگل

تماشا بہ ہے یہ تقدیر جو اک بار ہو جائے
کہ جس [illegible]

خرداد۔ تیر۔ امرداد ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۷۳ء

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مولانا حالی کے خطوط عبدالحق کے نام

منجو حمار (سابق منجو قمر حیدرآبادی) کے بے معنی اور مہمل اعتراض کا گدان شکن یا دانت توڑ جواب

ہم نے "ہندستانی ادب" کے پچھلے کسی ایک نمبر میں معاصر "صبح امید" بمبئی سے منجو حمار حیدرآبادی (سابق منجو قمر حیدرآبادی) کی ایک نظم شائع کی تھی۔ اس نظم کے ایک مصرع میں ایک لفظ غلط لکھ دیا گیا تھا جس کی طرف حمار نے ہمیں ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے سختی کے ساتھ توجہ دلائی تھی کہ ہم الفاظ کی صحت کا خیال نہیں رکھتے ہیں، اور غلط لفظ کے استعمال سے شعر کا حقیقی مفہوم اور مطلب ہی جاتا رہتا ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ واقعی صرف ایک لفظ کی وجہ سے شعر کا اصل مطلب جاتا رہتا ہے اور حقیقت میں خصوصیت کے ساتھ نظم میں لفظی غلطی نہ ہونی چاہیے، مگر یہ کہنے بتانے کہ نظم ہو یا نثر میں سوفی صد صحت کی ذمہ داری ایڈیٹر وار کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ہماری ایڈیٹر برادری کی طرف سے تمام رسالوں اور اخباروں کے پڑھنے والوں کو یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ کوئی بھی ایڈیٹر اپنے رسالے وغیرہ میں ایک بھی لفظ غلط چھپنے دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود ہر رسالے میں غلطیاں موجود رہتی ہیں، جس کا علم ایڈیٹر کو چھپنے کے بعد بھی نہیں ہوتا، جب تک کہ مضمون نگار یا شاعر یا پڑھنے والا ایڈیٹر کو ان غلطیوں کی طرف توجہ نہ دلائے۔ رسالے میں اس قسم کی متعدد غلطیوں کی طرف مسلسل توجہ دلانے سے ہی تو ہمارا ایک ماہوار رسالہ جان نثار اختر کے ایڈیٹر نے صاف طور پر لکھ دیا تھا کہ ہمارے رسالے میں غلطیاں ہوا کرتی ہیں، ہمیں پتہ ہے ہم ناواقف نہیں ہیں، لیکن ان غلطیوں سے ہمارا پالا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے، اس لیے کوئی صاحب ایسی غلطیوں کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دلائیں۔

ایڈیٹر جان نثار، کے اس شدت پسندانہ جواب سے ہم [illegible] نہیں کر سکتے، بلکہ ایڈیٹر کے اخلاقی اور مذاقی فرض کو [illegible] کا شکریہ ادا کرے، اور آئندہ نمبر میں اس غلطی کے متعلق ایک نوٹ [illegible] ایڈیٹر کے اس مضحکانہ عمل کے باوجود بعض نام نہاد شاعر [illegible] میں نام نہاد شاعر ہمارے ایڈیٹر کی طرح [illegible] میں ہمارے ساتھ کیسا نازیبا [illegible] مضمون کو دوبارہ چھاپنا پڑے، اس [illegible] پاک صاف نہیں رہتا ہے [illegible] ہمارے [illegible]

کاتب نے غلطی سے شاعر کا نام یا تخلص ہی نہیں لکھا۔ کتابت کے بعد ایڈیٹر نے کاپی دیکھی اور نام اور تخلص لکھنے کی طرف اشارا کیا ہوگا، مگر اس کے باوجود کاتب نے صحت نہیں کی، اور کاپی جوں کی توں پریس ایڈیٹر کے ہاتھ میں آیا، اور ایڈیٹر نے اس غلطی کو پروف میں بھی دیکھا یا، مگر اتفاق سے سنگ ساز نے بھی وہ غلطی نہیں بنائی، اور اس غلطی کے ساتھ رسالا چھپ کر شایع ہوگیا۔ جب شاعر اختر نے یہ غلطی دیکھی تو ایڈیٹر "صبح امید" کو اس طرف توجہ دلائی، چنانچہ "صبح امید" بابت مئی ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۴۳ پر یہ نوٹ موجود ہے۔ "اختر لنسنوی ام۔ اے۔ "فروغ صبح امید" کا مارچ اور اپریل ۱۹۷۲ء کا شمارا ملا۔ اس میں اپریل والے میں آپ نے میری نظم "اندھیرے اجالے" شایع کی ہے، لیکن اس پر میرا نام سرے سے چھپا ہی نہیں۔ انتہائی مشکور ہوں گا اگر آپ آیندہ شمارے اس کی تصحیح شایع کردیں۔"

اصول ایڈیٹر "صبح امید" کو تو چاہیے یہ تھا کہ مئی ۱۹۷۲ء کے شمارے میں اس خط کے بعد ہی یا کسی اور صفحے پر اس غلطی کی تصحیح شایع کردیتے، مگر انھوں نے نہ معلوم کس مصلحت کی بنا پر، جون ۱۹۷۲ء کے "صبح امید" کے صفحہ ۵ پر اپنی طرف سے یہ نوٹ دیا ہے "تصحیح — اپریل ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں صفحہ پر حضرت اختر لنسنوی کی نظم "اندھیرے اجالے" پر سہو کتابت سے ان کا نام چھپنے سے رہ گیا۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔"

"اس اشاعت میں صفحہ پر افضل راجملی کی غزل مجیب لنسنوی کے نام سے چھپی ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔"

کتابت کی غلطیوں کی انتہا دیکھیے کہ آپ نے — یعنی اپنے اصلاحی نوٹ میں ایڈیٹر نے تخلص اختر لکھا ہوگا، مگر یہ سہو غلطی سے کاتب نے اس کو اثر لکھ دیا، اور اس وقت بھی غلطی میں چوک ہوگئی، اور ایڈیٹر کے صحت کرنے کے باوجود کاتب نے حقیقی تخلص "اختر" نہیں بنایا، اور اسی طرح سنگ سازی کا مرحلا بھی طے ہوگیا، اور اصلی تخلص "اختر" ایک غلط تخلص "اثر" کے ساتھ چھپ گیا۔ نہ معلوم شاعر اختر لنسنوی نے اس غلط در غلط اصلاح کا کتنا برا اثر لیا ہو۔ شاعر یا مضمون نگار تو ایسی غلط اصلاحوں کا اثر لے سکتا ہے، لیکن ایڈیٹر برادری ایسی سہوی غلطیوں کا کوئی اثر نہیں لیتی، اس لیے کہ کاتبوں کے ایسے غلط مظالم سے ایڈیٹر کو ہر نمبر میں سابقہ پڑتا ہے۔ کسی ذریعے اگر علم ہوگیا تو آیندہ نمبر میں اصلاحی نوٹ دے دیا ورنہ خاموش ہورہے۔ ا۔ ج۔ ام خاں جیسے مانے ہوئے (۳۳) سالا پرانے صحافی اور ادیب اجل، اور ماہنامہ "ادیب" جیسے شہر کو "قبیلے ادب" کہنے والے حاہل حطق اور "ہندستانی ادب" کی کتابت کی متعدد غلطیوں کو گنوانے والے کدھے — حال منجو خار اور سابق (منجو قسم حیدرآبادی) اپنی بند آنکھیں کھول کر دیکھ کہ ادیب کے مدیح (حنیف) کے ایک ہی اطلاعی نوٹ میں غلطی در غلطی ہے، یعنی سن اے نے [illegible] کے سقطے اور حرف سے اسم با مسمّا تخلص کرنے والے [illegible]

کے اپنی غلطیوں کے ظلم کے مسلسل دو آرے چلائے ہیں۔ سمجھا ہے تو نے کچھ
کہ ہم نے کیا کیا۔ اے "گوزشتہ"، تو کیا سمجھ سکتا ہے تیری مثال تو وہی ہے
"چہ پدید چہ پدی کا شوربا"، یعنی تو دنیائے شاعری کا "پدی"، جو "ٹیرا" اور "پدی"
کا بھیجا ہی کتنا جو کسی لحاظ سی بات کو سمجھ بھی سکے! اچھا تو خیر اب سن لے۔ غد
ہم ہی سمجھائے دیتے ہیں تجھکو اے "بیگم بہار"، کے جینے بٹانے اور پاپڑ بھجیے بیچنے
والے نام نہاد شاعر کہ ایڈیٹر "صبح امید"، کے اوپر کے ایک ہی نوٹ میں ظالم کاتب
نے ایک فاش غلطی یہ کی کہ اختر کی بجائے اثر غلط تخلص لکھ مارا، اس کے نیچے ایڈیٹر نے
ایک دوسرا اصلاحی نوٹ یہ دیا تھا کہ "اس اشاعت میں صہ پر افضل اجملی کی غزل
مجیب بستوی کے نام سے چھپ گئی ہے"، یعنی کاتب نے صفحے کا نمبر ہی نہیں لکھا، اور وہ
صفحے کا نشان صہ جوں کا توں بلا تک یا معرا ہی چھپ گیا۔ ایسی ناقابل اصلاح غلطیوں
کو ایڈیٹر لے چارا کیا کر سکتا ہے۔ دوسرے ایڈیٹروں کی اصلاح اور محنت کے طریقوں
کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، مگر ہم اپنی اصلاح کا طریقہ آپ کو بتائے دیتے
ہیں، یعنی کاپیوں کے لکھے جانے کے بعد ہم ہر صفحے کو سلسلہ وار یا نمبر وار بغور دیکھتے ہیں،
اور لکھائی کی جو بھی غلطیاں ہوں، بازو میں ہی یا نیچے اوپر کاپی میں پنسل سے بتا دیتے
ہیں۔ کاتب کے صحت کرنے کے بعد پھر سے دیکھتے ہیں، اور اس دفعہ جو غلطیاں رہ جاتیں،
اُن کے اطراف دائرے لگائے جاتے ہیں۔ دو بار اور دو دائرے اور تیسری مرتبہ تین دائرے،
اور چوتھے دائرے کی تک نوبت آجاتی ہے، لیکن اس کے باوجود بعض فاش غلطیاں
بھی رہ جاتی ہیں۔

کاپیاں جانے کے بعد جب ہمیں پروف ملتا ہے تو ہم پروف کو نمبر وار یا سلسلہ وار
نہیں دیکھتے، اس لیے کہ مضمون یا نوٹ وغیرہ سلسلہ وار لکھا گیا ہے یا نہیں، اس کی صحت
کا کامل اور یکا یقین ہم کاپیوں کی صحت کے وقت کر لیتے ہیں، اور کاتب نے ایسی
کوئی غلطی کی ہے تو اسی وقت دوبارا لکھا کر اس کی صحت کیے دیتے ہیں، اسی تیقن
کی بنا پر ہم پروف کا جو بھی صفحا ہماری نظروں کے سامنے آجائے دیکھ ڈالتے
ہیں۔ پروف میں ہمیں کاتب کی غلطیوں کا خیال رہتا ہے، اور جو بھی غلطیاں باقی رہ جاتی
ہیں، ہم پروف میں دکھائے دیتے ہیں۔ صحت اور غلطی کا یہ آخری مرحلہ تا مرتب تک
سازکی اہم ترین ذمے داریوں پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر سنگ ساز ہماری گنائی گئی غلطیوں
کو بنا دے تو رسالہ غلطیوں سے پاک صاف رہتا ہے، اور اگر سنگ ساز تن آسانی
یا نکمے پن کا ثبوت دیتے ہوئے غلطیوں کو نہ بنائے، چھوڑ دے، یا دوسرے معنی میں
نظر انداز کر دے تو رسالہ اکثر و بیشتر معمولی اور بعض فاش اور اہم یا قابل اعتراض
چند ایک غلطیوں کے ساتھ بھی چھپ جاتا ہے، جس کے دیکھنے کے بعد بعض سنجیدہ قسم کے
مضمون نگار اور منجو مجار جیسے، گدھے نام نہاد شاعر، ہم جیسے بے قصور و خطا معصوم
ایڈیٹروں کی درگت بنا دیتے ہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ منجو مجار نے "مرغ مسلم" (مرغ مسلّم) کھانے کا بہت
زیادہ شوق تھا۔ جب تک کسی وقت [illegible] کو کسی نہ کسی طرح
PEONS یا TIPS ملا کرتے ہیں، خصوصی چپراسیوں کے مخدار یا HEAD PEON کو زیادہ

TIPS ملا کرتے ہیں، اور چونکہ منجو چمار HEAD PEON تھا، اس لئے شتاہ کے علاوہ ذاتا TIPS یا انعام اکرام کے ذریعے کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ جب انعام زیادہ ملتا تو وہ خفیہ خفیہ اپنی بیوی کے ہاتھ میں پیسے دے کر کہتا، "بی بی آج تو میں مرغ مسلم" ضرور کھاؤں گا۔ بیوی پیسے تو لے لیتی، مگر بری طرح ڈانٹ پلاتی کہ ہوش کے ناخن لو، ٹھیک سی باتیں کرو، کیا تک رہے ہو، اس وقت رات کے سمے دم کا مرغ کیسے تیار ہو سکتا ہے۔ خاموش رہو، کل تیار کر دوں گی۔ بیوی کی یہ ڈانٹ سنتے ہی خاموش ہو جاتا، اور اپنا سا موٹھ لے کر دال روٹی جو بھی ملتا کھا لیتا۔ بیوی اس کا لحاظ ضرور کرتی تھی، اور دوسرے تیسرے روز جب فرصت ہو دم کا مرغ یا "مرغ مسلم" تیار کر دیتی تھی، اور یہ ظالم بچوں سے چھپا کر تنہائی میں بیٹھ کر سارا مرغ ہضم کر جاتا تھا۔ وظیفے کے بعد اس نے کچھ رقم COMMUTE کر دی، جس کی آمدنی سے ایک بچی کی شادی کر دی۔ اب اس کی ماہکار آمدنی ایک چوتھائی رہ گئی تھی روزانہ خرچ میں تکلیف ہونے لگی، اور ادھر بیوی کی کالیاں سنتے سنتے تنگ آ گیا تھا بیوی کا یہ کہنا کہ دن بھوکھ مارتے گھر میں بیٹھے رہتے ہو، جاؤ باہر جا کر محنت مزدوری کرو، اور جس طرح بھی بنے کما کر لے آؤ، تاکے گھر کا خرچ ٹھیک سے چلے۔ بیوی سے بڑھ کر خود منجو چمار کو رہ رہ کر یہ خیال ستاتا تھا کہ آمدنی کم ہونے سے وہ مرغ مسلم سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کے قلم میں صلاحیت تھی، خط بہت اچھا تھا، کسی زمانے میں وہ خطاطی کی مشق بھی کرتا تھا، چنانچہ اس نے دوات قلم اور سیاہی وغیرہ خریدی، اور اپنے گھر سے ایک پرانا بوریا لے کر چار مینار چلا گیا، اور ایک نمایاں مقام پر عینک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی لوگوں نے پہچان لیا، اور منشی صاحب، منشی صاحب کہنا شروع کر دیا۔ چند سال پہلے چار مینار کے اندر کئی ایک منشی صاحبان بیٹھا کرتے تھے، جو اہل غرض کی درخواستیں اجرت لے کر لکھا کرتے تھے۔ اس کا علم منشی منجو چمار کو بھی تھا، اس لیے اس نے اپنی بیٹھک کے لیے چار مینار کا پرانا اڈا انتخاب کیا تھا۔ یہاں اس کی آمدنی بڑھ گئی تھی، اور وہ روزانہ زیادہ سے زیادہ پیسے دے کر اپنی بیوی کو خوش رکھتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز اس کو "مرغ مسلم" کھلاتا۔ آج کل چار مینار دیکھنے کے لیے TOURIST یا سیاح بہت زیادہ آیا کرتے ہیں، اور ادھر منشی منجو چمار کے پاس درخواستیں لکھوانے والوں کا مجمع بھی زیادہ ہونے لگا ہے۔ پولیس نے اس کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے منشی منجو چمار کی گردن میں ہاتھ دے کر اس کے بوریے اور دوات قلم وغیرہ کے ساتھ چار مینار سے نکال باہر کیا، اور یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ آئندہ یہاں نظر نہ آئے۔ منشی منجو چمار گھر آیا تو اس نے بیوی سے کہہ سنایا کہ پولیس نے اس کو بازار مار کر بھگا دیا ہے۔ بیوی نے کہا کہ بھگا دیا تو بھگا دیا، تم بھی مرکزی مقام سے اور زیادہ دور جا کر بیٹھا کرو۔ منشی منجو چمار نے بھی درخواستیں لکھنے والے خانہ بدوش جیسے آ کر بیٹھتے ہیں، اسی طرح کا عمل کیا ہے، اور اپنے ایک صاحب [illegible] اور ایک پرانی ٹوٹی کرسی لے کر بھاگم بھاگ کر بیگم بازار کی سڑک پر فٹ پاتھ پر اپنا اڈا جما رہا ہے، مگر سنا ہے کہ یہاں روزانہ [illegible]

کی سی نہیں ہے، پھر بھی ہفتے میں ایک بار "مرع مسلم" کھانے کے قابل آمدنی ہو جایا کرتی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ اس نے باقاعدہ طور پر کتابت بھی شروع کر دی ہے، دعوت کے رقعے، اشتہار، اور پوسٹر وغیرہ بھی لکھ لیتا ہے، اور دو چار صفحے کے ہفتہ وار اخبارات بھی لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی بنا پر، ہم نے یہ طے کیا تھا کہ "ہندستانی ادب" کے ہر نمبر کی ایک سو صفحے کی کتابت اسی سے کروائیں گے تاکہ اس کو ہمارے معیاری اور معمر کا آزاما ہوا رسالے میں غلطیوں کی شکایت نہ رہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ چلو اسی کی جھاڑی کی خدمت سے وظیفے پر الگ ہونے کے بعد سے اس کی آمدنی بہت ہی کم ہو گئی ہے، اور اس کے گھر میں گدھے گدھیوں کی تعداد زیادہ ہے، جس کے باعث اس کی بیوی کو گھر چلانے میں بڑی ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لیے وہ حرف کو اپنے رسالتی لکھائی کا کام دینے کا امداد اہم نے محض غربا پروری اور بندانوازی کے نقطۂ نظر سے کیا تھا، اور اپنا یہ خیال ہم نے بیگم بازار کے اپنے ایک ملاقاتی سے ظاہر کیا تھا، جس پر انھوں نے سختی کے ساتھ منع کرتے ہوئے کہا کہ آپ اپنا کام اس گدھے کاتب کو ہرگز ہرگز نہ دیجیے، اس لیے کہ وہ پرلے درجے کا غلط نویس ہے۔ اس کو آتا جاتا کچھ بھی نہیں ہے۔ بچپن میں کچھ معمولی سی تعلیم پائی تھی، اس لیے چپراسی کی نیابت سے ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا تھا، اور کر وظیفے کے قریب چپراسیوں کا جمعدار بن گیا تھا۔ وظیفے کے بعد سے آمدنی بہت ہی کم ہو گئی ہے، اس لیے منشی بن کر بیٹھ گیا ہے۔ معمولی درخواستیں وغیرہ لکھ لیتا ہے، اور اس میں بھی بیسیوں غلطیاں کر جاتا ہے۔ جو لوگ غلطی کر کے اس سے ہفتاوار وغیرہ لکھواتے ہیں، اور جب غلطیاں زیادہ کرتا ہے تو پیر میں کانات میں لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور خوب خوب ہی اس کی درگت بنا سے لیتے ہیں، اور گالی گلوچ پر تک اتر آتے ہیں۔ انہی صاحب نے یہ واقعہ بھی بیان کیا کہ بیگم بازار کے ایک شاعر نے اپنے کلام کا انتخاب اس سے لکھوایا، جس میں اس نے بیسیوں ہی غلطیاں کی تھیں، جس میں ایک خاصی غلطی اس نے یہ کی کہ شاعر نے ایک مصرع میں "کوڑا" لکھا تھا "کاوڑ" اس کو گردانے کے بعد کاف کا مرکز نہیں لکھا، یعنی "کوڑا" بغیر کاف کے مرکز کے چھپ گیا۔ جب وہ مجموعہ چھپ گیا، اور شاعر نے اس کو چند کاپیاں اپنے دوست احباب اور ملاقاتیوں کو تحفتاً دیں، تو ان میں سے ایک نے شاعر کو اس طرف توجہ دلائی کہ آپ کے فلاں شعر کے مصرع اولا میں لفظ "کوڑا" بغیر کاف کے مرکز کے چھپا ہے، اور اس اہم ترین، فاش اور ناقابل معافی غلطی کو دیکھ پاتے شاعر کے تن بدن میں آگ لگ گئی، وہ چاہتے تو اس نام نہاد شاعر منشی غمخوار منشی کو اتنے جوتے رسید کرتے کہ اس کی نانی سے بھی یاد آ جاتا، مگر دوستوں کے سمجھانے منانے سے چونکہ گھر بیٹھ کر خاموش ہو رہے، مگر اس کی مذمت میں شعر لکھ کر بدلا ضرور لیا۔

"کوڑا" لکھا تو کاف کا مرکز اڑا دیا منشی گیری کے نام کو بٹا لگا دیا

اے غمخوار ۔۔۔ سوا اور کیا کہوں کہ خوب خوب ہی سوگ میرے جیسے اہل

نالائق، ان پڑھ، جاہل مطلق غلط نویس کاتبوں قابل شرم اور قابل ملامت، بلکہ قابل گردن زدنی غلط اور مہمل نویسی کے کارناموں سے تنگ آکر ماہر القادری، ایڈیٹر "فاران" کراچی نے "کاتبوں کی ستم ظریفیاں" ایک مضمون ہی لکھ مارا، جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کاتب عموماً تیرے میرے پڑھے لکھے نہیں ہوتے، بلکہ جاہل مطلق ہوا کرتے ہیں، اور محض پیسا کمانے کی خاطر کتابت شروع کر دیتے ہیں، وہ یہ تک نہیں جانتے کہ مضامین میں کیا لکھا ہے، صرف صورت نویسی کرتے ہیں، چونکے الفاظ کی اصل اور حقیقت سے قطعاً واقف نہیں ہوتے، اس لیے کچ کا کچ لکھ مارتے ہیں، اگر کوئی کاتب الفاظ کے معنی اور مفہوم سے واقف ہو تو وہ ہرگز ہرگز غلطیاں نہیں کرتا ہے، مگر تو جو ہڑا چپلی اسیوں کا جمعدار، اور نالائق اور گدھا نما خمار جو محض پیسے کی خاطر کتابت کرتا ہے، تو خ جیسے گدھے اور بے وقوف کاتب کو اس سے کیا بحث کہ مضمون میں کیا لکھا ہے، اور الفاظ کے صحیح صحیح معنی کیا ہیں؟ تیری نالائقی اور جہالت کی انتہا یہ ہے کہ تو نے ایک مصرع میں "کوڑا" لکھ کر کاف کا مرکز اڑا دیا ہے! اے وہ "بگلم بجار" کے چنے بٹانے اور پاپڑ بیچنے والے نام نہاد شاعر خمار اور بدنام زمانہ منشی آفتاب کتابت جیسا تریف پیشہ چھوڑ دے، اور اس کی بجائے پہلے کی طرح سینڈ خانوں میں بیٹھ کر چنے بٹانے، پاپڑ بیچے اور تلا ہوا گوشت اور "بھینس کے اگلے انڈے" بیچنا شروع کر دے۔ تجھ کاتب تو نے، ہم نے کیا کہا۔ اے وہ گدھے کے بچے بڑی بطخ کے بڑے انڈوں کو اصطلاح "بھینس کے انڈے" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تو کہاں سمجھا، جاہل مطلق جوہڑا! اے وہ نام نہاد شاعر خمار، اور "کوڑا" کو "لیز کاف کے مرکز" کے لکھنے والے منشی بدنام سن کہ رسالوں میں غلطیاں تو زمانے قدیم ہی سے ہوتی چلی آرہی ہیں، چنانچہ مولانا حالی نے ۹ مئی ۱۹۱۰ء کو مولوی عبدالحق ایڈیٹر "دا فسر" حیدرآباد کو اپنے خط میں تو یوں توجہ دلائی ہے "مولوی چراغ علی مرحوم کے مضمون "استبرائق" اور "تسری" میں اسی قدر غلطیاں ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتیں۔ اس صورت میں بہتر تو یہ ہے کہ اس مضمون کو از سر نو صحیح کر کے چھپوایا جائے۔ ورنہ کم سے کم ان کے آئندہ اضافتین میں صحت کا زیادہ اہتمام کیا جائے۔ اگر صحت کا اچھا انتظام نہ ہوگا تو آپ کا رسالہ بدنام ہو جائے گا۔"

سمجھا تو کس کے بارے میں کہا تھا مولانا حالی نے ــــ مولوی عبدالحق، ایڈیٹر "دا فسر" حیدرآباد کے بارے میں۔ عبدالحق علی گڑھ کالج کے بی۔ اے تھے، مطلب یہ کہ نا قابل نہیں تھے رسالے میں کاتب غلطیاں کرتا ہوگا، وہ صحت بھی کرتے ہوں گے، مگر ایڈیٹر کہاں تک صحت کرے گا، جب تیرے جیسے گدھے، جاہل اور نالائق کاتب غلطیوں کی بھرمار کرتے ہیں تو حقیقت میں پوری پوری صحت ایڈیٹر کے امکان سے باہر ہو جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسالہ بجائے سو، بلکہ بعض اوقات سو سو غلطیوں کے ساتھ چھپ جاتا ہے۔ یہ شکل کبھی نہیں ہے، نا گوار شکل ضرور ہے مگر صبر کے گھونٹ پی کر ایڈیٹر اور قاری یا پڑھنے والے دونوں کو بھی گوارا کرنا پڑتا ہے، جیسے اونٹ کو [illegible]

آمرکار اور بادل ناخاستہ تیرے جیسے نالایق اور جاہل مطلق کاتب کے قابل ملامت اور شرم ناک کارنامے کو گوارا ہی کیا!

ہمارا تو خیال تھا کہ تیری سرپرستی کریں، اور گدھے منجو چمار کو اپنے حالا یا اور ایک معیاری رسالے "ہندستانی ادب" کے ایک سو صفحوں کی لکھائی کا کام دے کر تیرے، اور تیری بیوی اور تیرے چھوٹے بڑے گدھے اور گدھیوں کی پرورش اور غربا پروری کا باعث بنیں، مگر افسوس کہ تیری غلط نویسی کے باعث ہم نے یہ خیال ترک کر دیا!

منجو نے اپنے ڈرامے "بہادر شاہ ظفر" پر فخریاطور پر لکھا ہے کہ "اس ڈرامے کو آندھرا پردیش ساہتیا اکادمی نے بہترین ڈراما قرار دیا ہے۔"

اس خوشی میں، ہم اس کو "انجمن ترقی ہندستانی" کی طرف سے

چمار یار جنگ۔ چمار الملک۔ چمار الدولا

اور

چمار یار جنگ۔ چمار الملک۔ چمار الدولا

(اور)

منحوس یار جنگ۔ منحوس الملک۔ منحوس الدولا

جیسے عالا اور بہتر خطابات سے نوازتے اور سرفراز فرماتے ہیں، اور اس کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ آیندہ اسے اپنے روکھے پھیکے اور سطحی مزاح خیز نام "منجو" کی بجائے فخریاطور پر ان نئے بامعنی، بامقصد اور باجلالت خطابات کو استعمال کرے! جس ڈرامے "بہادر شاہ ظفر" کو آندھرا پردیش اکادمی نے انعام دیا ہے، اس کی لکھائی چھپائی بدترین ہے۔ یہ ہم نے مخالفانہ انداز میں نہیں لکھا ہے، بلکہ حقیقت حال ہم نے بیان کی ہے۔ یہ ڈراما اس ہمارے نظروں کے سامنے موجود ہے، اس کو دیکھ کر اس کا بھی بھی خاکا کھینچ رہے ہیں۔ یہ کتاب مجلد ہے، مگر اس کی جلد کنکوے کی طرح مڑ گئی ہے اور جلد کے سارے ٹنکن پڑ گئے ہیں۔ اس جلد پر ایک لیٹا یا گرد پوش بھی ہے، جس نے متعلق منجو نے اپنی بڑی بے وقوفی، جہالت، نادانی اور کور ذوقی کا ثبوت دیا ہے یعنی گرد پوش کا اگلا صفحہ زعفرانی رنگ میں ہے، اور اس کے پس منظر میں ڈرامے کا نام "بہادر شاہ ظفر" اور لکھنے والے گدھے کا نام "منجو چمار" ہے، کاغذ کی سفیدی کے نذر ہو گئے ہیں! جس کو ہرگز کسی نے کسی پڑھ نہیں سکتا۔

[illegible] غلط [illegible] توجہ دلاتے ہیں ہمارے

بری طرح سے خبر لی تھی، اس کے ڈرامے "بہادر شاہ ظفر" میں غلطیوں کی بھرمار کا حال سنیئے۔ ڈرامے کے ختم پر اس نے غلطیوں کی صحت یا اصلاح کے سلسلے میں باقاعدہ ایک "صحت نامہ" دیا ہے۔ یہ صحت نامہ صفحہ ۱۸۵ سے صفحہ ۱۸۹ پورے پانچ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، جس میں اس نے (۹۱) غلطیاں گنائی ہیں، مگر صورت حال یہ ہے کہ اور بھی متعدد غلطیوں کو نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً صفحہ ۱۸ پر ACTOR کی بجائے Actor لکھا ہے، اور صفحہ ۲۶ پر CHARACTER کی بجائے CHARECTER ہے، اسی کے علاوہ صفحہ ۶۱ پر خطۂ خموشاں کی بجائے قطعۂ خموشاں موجود ہے۔ پتا نہیں کہ یہ غلطی کاتب نے کی ہے یا یہ مصنف ہی خطہ اور قطعہ کے اسم فرق کو نہیں جانتا ہے اور خطۂ خموشاں کی بجائے قطعۂ خموشاں لکھ مارا! بہرحال یہ حال ہے ایک ساہتیا اکادیمی کے انعام یافتہ ڈرامے کا۔ ڈرامے "بہادر شاہ ظفر" کے بارے میں بیگم بلونت کے اپنے ایک ملاقاتی سے ہم نے یہ سنا تھا کہ یہ ڈراما لکھ کر اس نے چھپوا بھی لیا، اور اس کی پچیس پچاس کاپیاں بے کر بھی دی گئی، اور وہاں ساہتیا اکادیمی کے عہدے داروں اور ممبروں کو اپنے ڈرامے کی کاپیاں دیں اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کے ڈرامے کو فلاں سنہ کا بہترین ڈراما قرار دیتے ہوئے ساہتیا اکادیمی کا انعام دیا جائے، مگر ان سب لوگوں نے اس کو یہ کہتے ہوئے دھتکار دیا کہ تمہارا ڈراما اسٹیج ہونے کے قابل بھی نہ تھا جس کو تم نے بلاوجہ اسٹیج کر دیا ہے، معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، حیدرآباد جانے کے بعد ایرا گڈا کے MENTAL HOSPITAL میں شریک ہو جاؤ۔ یہ سن کر بیگم اپنا سا موٹھ لے کر حیدرآباد واپس آ گئی، اور آئندہ ساہتیا اکادیمی میں اپنے ڈرامے کے لیے انعام حاصل کرنے کی پروپیگنڈا کوشش شروع کر دی۔ اکادیمی کے عہدے داروں اور ممبروں کو ایک ایک کر کے مختلف اوقات میں دیناہوٹل لے جا کر بریانی اور "مرغ مسلم" یا "مرغ مسلم" کھلاتا ہے بیٹھے، آئس کریم اور جانے وغیرہ سے ان کی خاطر مدارات کرتا، پھر پان اور بڑیا فسی سگریٹ سے ان کی تواضع کرتا اور دونوں بات چیت کے دوران کی جدوجہد شاید چاپلوسی کرتے ہوئے اپنے ڈرامے "بہادر شاہ ظفر" کے لیے اکادیمی انعام یا AWARD کی بھیک مانگتا رہتا ہے کہ ان انفرادی دعوتوں کے بعد اس نے اکادیمی کے تمام متعلقہ عہدے داروں اور ارکان کو کسی ہوٹل میں ایک ریسٹورنٹ عمدہ نے یا ٹاپ ہوم کی دعوت دی تھی، اور سلکش ڈنر سے صرف ایک رات پہلے شہر کے ایک اچھے ہوٹل میں ڈنر بھی دیا تھا، اور ان سب کا فوٹو بھی کھنچوایا تھا، جس کے نتیجے کے طور پر ارکان نے دوسرے ہی روز اس کے ڈرامے "بہادر شاہ ظفر" کو آندھرا پردیش کی حد تک اس سال کا بہترین ڈراما قرار دیتے ہوئے پانچ سو روپے کے انعام کا مستحق قرار دیا۔ انعام کی یہ رقم اس کے ہاتھ نہیں آئی، کیونکہ عہدہ داران اور تمام ارکان کمیٹی نے ہمدرد کی۔ یہ بات ان لوگوں نے منٹو سے پہلے طے کر لی تھی کہ جس کا ڈراما انعام پانے کے قابل نہیں ہے، لیکن منٹو کی مقدر شاید اور چاپلوسی اور کئی ایک دعوتوں کے بعد ارکان اور عہدہ داروں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے ڈرامے کو انعام کا اعلان تو کر دیا جائے گا، مگر فی الحال رقم اس کو نہیں دی جائے گی، بلکہ

بھی منجو نے منظور کر لیا تھا۔ وہ صرف یہ جاننا تھا کہ اس کے انعام کا اعلان اخباروں میں ہو جائے، اور اپنے ڈرامے بھی لکھنے کی اجازت مل جائے۔

اکادمی کے فیصلے کے بعد یہ خبر نیوز ایجنسی کو بھجوائی گئی، تاکہ مقامی اخباروں میں شایع ہو سکے، اور عوام کو معلوم ہو کہ منجو قمر نے اکادمی کا انعام حاصل کیا ہے، لیکن نیوز ایجنسی کے ایڈیٹر کو منجو کے کمزور پہلو کا علم تھا، اور اس نے اکادمی کے عہدیداروں اور ارکان کو جتنی بھی دعوتیں دیں اس سے بھی وقفیت تھی، اس لیے اس نے یہ خبر روک رکھی، اور اشاعت کی غرض سے اخباروں کو نہیں بھجوائی۔ دوسرے روز منجو نے ایک دو، تین، سارے اخباروں کا جایزہ لیا، مگر خبر کسی بھی اخبار میں موجود نہیں تھی، اس لیے دوڑے دوڑے نیوز ایجنسی کے دفتر گیا، اور ایڈیٹر سے شکایت کی کہ ایسی اہم خبر اس نے اخباروں کو نہیں بھجوائی۔ ان دونوں میں پہلے سے ملاقات اور بے تکلفی تھی، اس لیے نیوز ایڈیٹر نے بے تکلفی سے کہا۔ کیوں منجو تمہیں کیا بات زیادہ اہم نے، اور اب ہم تم کو بات دیں اور ایک میں تفصیلی طور پر یہ بتائیں کہ اکادمی کے عہدے داروں اور ارکان کو ہوٹل میں مختلف اوقات میں کتنی دعوتیں دیں اور "مرغ مسلم" کبھی کھلایا، اور فلاں ہوٹل میں ایک عمدہ نا دیا اور فلاں ہوٹل میں ایک بڑ دیا اور گل ابو شی کی اور ان سب کا گروپ فوٹو بھی لیا۔ اے منجو قمر الو کے پٹھے بے وقوف، تم جانتے ہو کہ ہم کون ہیں۔ ایڈیٹر نیوز ایجنسی جس کو راز کی باتیں بھی معلوم ہوا کرتی ہیں، یعنی یہ کہ اکادمی انعام کا صرف اعلان ہوا ہے، اور اس کی رقم تمہارے پلے نہیں پڑی، بلکہ بعض خاص عہدے داران اکادمی اور ارکان نے آپس میں تقسیم کر لی ہے جس کے لیے پہلے ہی سے تم نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔ کہو تیار ہو اس کے لیے، آج یہ تفصیلی راز کی خبر سارے اخباروں کو بھجوا دیں، مکار اور بدمعاش کہیں کا، ایک طرف تو ہم سے دوستی کا دم بھرتا ہے، اور دوسری طرف ہم کو دھوکا دیتا ہے۔ یاد رکھ منجو ایک ہی خبر میں تیری حیثیت بگاڑ کر دوں گا۔ یہ کہہ کر انٹ شنٹ بکتے ہی منجو اس کے پیروں پر گر پڑا، اور اپنی دوستی کا دم بھرتے ہوئے اپنے سینے سے چمٹا لیا، اور کہنے لگا، چل ابھی چل، میرے ساتھ اسی وقت چل، مدینا ہوٹل لے جا کر تجھ کو بریانی کے پلیٹ پر پلیٹ کھلاؤں گا اور میرا پسندیدہ "مرغ مسلم" بھی کھلاؤں گا، ارے چل یار موقعہ کیا تاکتا ہے، تجھکو ایک نہیں دس بار کھلاؤں گا۔ دونوں مل کر مدینا ہوٹل گئے، اور حسب وعدا منجو نے نیوز ایڈیٹر کو بریانی بھی کھلائی اور "مرغ مسلم" بھی کھلایا، ڈبل کا میٹھا بھی منگوایا، اور چائے بھی پلائی، اور باہر نکلنے کے بعد پان اور سگریٹ سے بھی تواضع کی۔ عالا قسم کے سگریٹ کی ایک ٹھوڑ دو ڈبیا خرید کر دیں، اور اپنے گلے سے لپٹا کر کہنے لگا تم کھول ہو گئی معاف کرنا، ایسا تو ہوتا ہی ہے، تو نے اتنا برا اثر لیا، اتنی معمولی سی بات کا۔ میں کل تیرے دفتر آؤں گا، اور فلاں ہوٹل جا کر ہم دونوں ایک پسندیدہ اور چائے پاکا فی پیئیں گے، اچھا اب میں جاتا ہوں، مگر سن اب دیر نہ جانے بھی زیادہ خبر بھجوا دے، تاکہ کل شہر کے سارے اخباروں میں آجائے۔ دونوں اپنے اپنے گھر چلے گئے، اور نیوز ایڈیٹر نے وہ خبر سارے اخباروں کو بھجوا دی، اور دوسرے روز شہر کے تمام

کو سال کا بہترین ڈراما قرار دیتے ہوئے پانسو روپے کا انعام دیا ہے" دوسرے روز صبح سویرے اخباروں میں یہ خبر دیکھتے ہی منجو نے ہر اخبار کی (۵۰-۵۰) کاپیاں خرید لیں، اور سیکل کے پیچھے رکھ کر سارے شہر کا چکر کاٹتا رہا، اور اپنے ملنے جلنے والوں کو اخبار کی ایک کاپی دے کر کہتا کہ "دیکھو آندھرا ناٹیہ اکادمی نے میرے ڈرامے بہادر شاہ ظفر کو اکادمی کا انعام دیا ہے!

دیکھیے کسی کے ساتھ برائی کرنے کا بدلا کس بری طرح ملتا ہے۔ اس کے ایک دوسرے ڈرامے "نیل کی ناگن" میں صفحہ ۸۷ پر قلوپطرا کہتی ہے "عیروس، سیب کی ٹوکری پیش کی جائے (عیروس سیب کی ٹوکری پیش کرتا ہے" حالانکہ یہ سانپ کی ٹوکری ہے، مگر دونوں جگہ غلط طریقے پر "سیب" کا لفظ لکھ دیا گیا ہے، چنانچہ آگے چل کر اس کا ثبوت یوں ملتا ہے "ملکا ٹوکری اپنے شانے کے قریب لے جاکر ڈھکن کھولتی ہے، ٹوکری سے چھوٹا سا زہریلا سانپ نکل، اس کے شانے کو ڈس لیتا ہے ــ سانپ اٹھاتا ہوا، عیروس کی پیشانی کو بھی ڈس لیتا، اور مر جاتا ہے۔"

دیکھ لیا آپ نے ضرور کا نتیجا کہ صرف دو سطروں میں مسلسل دو فاش غلطیاں موجود ہیں، یعنی سانپ کی بجائے "سیب" لکھ دیا گیا ہے۔ اب اس نرے گدھے سے آپ ہی پوچھیے کہ آیا یہ غلطیاں، غلطیاں ہیں یا نہیں، اور ہندستانی ادب" میں اس کی ایک نظم میں ایک غلطی تھی تو اس نے ہمیں بری طرح سے ڈانٹ پلائی تھی، اور لکھ مارا تھا کہ رسالے میں زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں، صحت کا خیال رکھتا!

یہ شخص دوسرے ڈراموں کے پلاٹ چرا کر ڈرامے لکھا کرتا ہے۔ اس نے اپنے ڈرامے "نیل کی ناگن" کے (۸۸) صفحے میں ایک جگہ بھی ہلکا سا تک اشارا نہیں کیا ہے کہ یہ پلاٹ اس نے کہاں سے لیا ہے۔ ساری دنیا کو اس مکار اور محل ساز نیز فریبی نے یہ دھوکا دیا ہے کہ یہ ڈراما اس کی اپنی ذہنی کاوشوں کا نتیجا ہے، حالانکہ اس کا ڈراما "نیل کی ناگن، ولیم شیکسپیر کے مشہور آفاق ڈرامے "انتونی کلیوپیٹرا" کا سراسر چربا یا خاکا ہے۔ "نیل کی ناگن" کے تمام تر کردار اور مناظر و عناصر بالکل وہی ہیں، جو "انتونی کلیوپیٹرا" میں بیان کیے گئے ہیں مثال پڑتا ہے کہ "نیل کی ناگن" ہندستانی زبان میں ایک ناول بھی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ ناول عبدالعلیم شرر یا راشد الخیری یا کسی اور ناول نگار کا ہے۔ ہم نے یہ ناول پڑھا ضرور ہے، مگر اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ یہ معرکہ آرا ناول کس کے قلم کا نتیجا ہے؟ بہرحال اس طرح دوسروں کے ڈراموں اور ناولوں سے پلاٹ چرا چرا کر اس نے اپنے نام نہاد ڈرامے لکھے ہیں، اور لکھے جا رہا ہے۔ ہمیں سخت تعجب "ڈاکٹر زبانی پر ہے، جنھوں نے ہندستانی مجرموں پر معرکہ آرا مقالا لکھ کر Ph.D کی جیسی اعلا ڈگری حاصل کی اور انہوں نے "نیل کی ناگن" کے اپنے صرف پانچ سطری مقدمے میں اس بات کی طرف اشارا تک نہیں کیا ہے کہ یہ ڈراما ایک ناول "نیل کی ناگن" اور شیکسپیر کے مشہور زمانا انگریزی ڈرامے "انتونی کلیوپیٹرا" کا چربا یا خاکا ہے، اور وہ اس بات کا بھی حوالا دے سکتے تھے کہ منجو کا ڈراما "نیل کی ناگن" فلاں مصنف کے ناول "نیل کی ناگن" اور مشہور زمانا انگریزی ڈراما نویس ولیم شیکسپیر کے لافانی شاہکار ڈرامے "انتونی کلیوپیٹرا" کو پیش نظر یا سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، اس لیے کہ منجو کا یہ ڈراما ایک ناول اور ایک ڈرامے کا سو بہو چربا یا خاکا ہے۔ ناچی نے منجو کے اس راز کو فاش کر دیا اس لیے ضرورت

خرداد - تیر - امرداد ۱۳۸۲ف، ہندستانی ادب اپریل - مئی - جون ۱۹۷۳ء

یا گوشت خور ہو تو ملوہ میں ... کر اسے بریانی ۔ مرغ پلاؤ اور "مرغ مسلم" کھلایا کرتا ہے، اور جب کبھی وہ حیدرآباد آتے ہیں، تو ... MEATRIAN یا گوشت خور مانیا ... ہوٹل میں لے جا کر ان ... کرتا ہے!

بہرحال اپنے آپ کو ایک ... اور کامیاب ... ثابت کرنے کیلئے ہر طرح کے جائز و ناجائز اور نامناسب حربے ... کیے جا رہے ہیں!

ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

۱۸۹۷ء میں نواب امین الدولہ نے حیدرآباد دکن سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس کا نام "افسر" رکھا۔ ۱۸۹۹ء کے آخر میں نواب صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب کو خواجہ کی وقت ریاست میں ملازم تھے۔ اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ مولوی صاحب نے ایڈیٹر ہوتے ہی مولانا حالی کے نام اعزازی طور پر پرچہ بھیجنا شروع کر دیا اور ان سے اس پرچہ پر ریویو کی درخواست کی۔ مولانا نے اس رسالے پر مختلف اوقات میں پانچ مرتبا اپنے خیال کا اظہار فرمایا، چنانچہ پانچوں مرتبا کی تحریریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ محمد سماعیل پانی پتی

خط نمبر (۱)

"افسر" کا پہلا نمبر موصول ہوا۔ اس وقت دو تین میگزین ملک میں اچھے نکل رہے ہیں۔ جیسے "معارف" اور "ادیب" وغیرہ۔ آپ کا کام یہ ہے کہ اپنے میگزین کو سب سے فائق کر دو۔ مگر یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس کی جانچ نواب اعلیٰ دارالملک کا مضمون ہے۔ یہ مضمون انگریزی میں کسی مرتبے کا ہوگا؟ جبکہ اردو میں اس سے اس قدر لطافت باقی ہے۔ ترجمہ بھی نہایت عمدہ کیا گیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ پبلک کے مذاق کے موافق کس قسم کے مضامین ہونے چاہئیں؟ اگر میرے مذاق کے مطابق ایسے پانچ سات مضمون آپ کے رسالے میں نکل گئے تو اس رسالے کی بہت شہرت ہو جائے گی۔ میں صحت تک مرتبہ کی اوقات سے فارغ نہ ہو لوں اس رسالے کے لیے کچھ نہیں لکھ سکتا۔

الطاف حسین حالی پانی پتی ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۰۰ء

خط نمبر (۲)

"افسر" ... پہنچا۔ نہایت افسوس ... اس ... صحت ... خیال کیا جاتا۔ اول تو صحت ... ضرور ... وہ ... مضامین ... مضامین ... وہ ... مذہبی خیالات کے ... خلاف ... ہوتے ہیں۔ صحت ... مولوی ... مرحوم کے مضمون "استرقاق" اور "... عملی ... ہو سکتیں (اس صورت میں بہتر تو یہ ہے کہ اس مضمون کو ... میں ... ہو جائے۔ ورنہ ... ان کے آئندہ انشاء میں صحت کا ... ہوگا۔ اگر صحت کا ... تو آپ کا رسالہ ... ہو جائے گا۔

... سنہ ۱۹۰۰ء

فرمایا ہے۔ اس کو میں نے بہت غور سے پڑھا۔ شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے۔ ایڈیٹر "اخبار" "پنجاب آبزرور" (لاہور) نے یہ اسے میرے پاس بھی بھیجا تھا۔ مگر چونکہ وہ انگریزی میں تھا۔ اس لئے میں اس کے مضمون سے مطلع نہ ہو سکا۔ ہاں سرسری طور پر جس زمانے میں صاحب کا یہ مضمون "پنجاب آبزرور" میں چھپ رہا تھا۔ میں نے یہ سنا تھا کہ یہ (فلاں) (فلاں) اشخاص کے پڑھنے کے لئے ہے اور کسی ۵۴ پر کچھ ہے۔ اور جو کچھ میری نسبت لکھا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ اس کا بھی کسی دوست نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔

شیخ عبدالقادر صاحب تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ممتاز شخص ہیں۔ اور میرے دوست ہیں۔ ان کو نہ صرف انگلش لٹریچر سے بلکہ اردو لٹریچر سے بھی ایک خاص مناسبت ہے۔ اور اس کا ثبوت یہی اسی سے ہے جو انہوں نے حدیث اردو لٹریچر کے متعلق یہ لکھا ہے۔ اور اس بات میں شمال مغربی اضلاع کے لوگوں پر جو کہ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں فوقیت ثابت کر دی ہے۔ کیونکہ آج تک دلی سے لے کر لکھنؤ تک کسی شخص نے بھی [illegible] مضمون پر قلم نہیں اٹھایا۔

رہی یہ بات کہ بعض جزئیات میں آپ نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ سو یہ اپنا اپنا مذاق اور یہ اپنا اپنا سٹینڈ پوائنٹ ہے۔ مجھے بھی ان کی رائے سے کسی قدر اختلاف ہے۔ نہ اس نظر سے کہ ان کی رائے میری رائے کی نسبت اچھی نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اردو لٹریچر کے ہیروز کا انتخاب جو انہوں نے کیا ہے وہ نہ جامع ہے اور نہ مانع۔

میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے (رسالہ انسپر میں) میری نثر کی نسبت کئے ہیں۔ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائے اس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں۔ قائم نہیں ہو سکتی۔ مگر خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اشعار میں کونسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے۔

می گریم و از گریہ چو طفلم خبرے نیست
در دل کہ سوے ہست و نداند کہ کدام است

(آپ) اس رسالے کے ترقی دینے میں جہاں تک ہو سکے کوشش کیجئے اور نہایت استقلال کے ساتھ اس کو برابر جاری رکھئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آخر کار خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔

الطاف حسین حالی از پانی پت ۹ جون ۱۹۰۰ء

خط نمبر (۴)

مئی اور جون (۱۹۰۰ء) کا "افسر" بھیجا (جس میں) "حیات جاوید" پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بہ تقاضائے محبت تصنیف اور مصنف میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ اگرچہ میں اپنے تئیں اس کا مستحق نہیں سمجھتا۔ لیکن بہرحال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہل ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک چھڑک کہہ بیچنا کہتے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کو خوش رکھے اور اپنے تمام مقاصد میں کامیاب کرے۔

مئی کے پرچے میں مسئلہ ازدواج پر جو مولوی محمد اختر صاحب کا مضمون چھپا ہے۔ اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف میں نے بلکہ جس شخص نے (اس کو دیکھا) اس کو زیادہ سے زیادہ ناپسند کیا۔ "

"من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"

الطاف حسین حالی ۲۸ نومبر ۱۹۰۱ء

خط نمبر (۵)

کیا "افسر" بالکل بند ہو گیا۔؟ (افسوس ہے کہ) ہندوستان میں کوئی عمدہ رسالہ نہیں چل سکتا۔ "معارف"، "ادیب"، "وحسن"، اور "پیر عمدہ" عمدہ میگزین چند روز کی دنیا کی ہوا کھا کر فوت ہو فوت ہو رائی ملک عدم ہو گئے۔ پھر "افسر" کے چلنے کی کیا امید ہو سکتی تھی؟ (بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں) جس چیز کی خریداری کا علاء زیادہ تر مسلمانوں پر ہو گا۔ اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم؟

الطاف حسین حالی ۱۰ر محرم الحرام ۱۹۰۲ء

الطاف حسین حالی پانی پتی (مرحوم)

حب وطن

مولانا الطاف حسین حالی پانی پت میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی تعلیم اور نشوونما بھی وہیں ہوئی۔ حالی کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا، اس لیے وہ اپنا کلام ساتذہ سے وقت کو دکھلا کر اصلاح لیا کرتے تھے۔ انہوں نے انہیں مشورہ دیا کہ ان میں شعر کہنے کی بہترین صلاحیت ہے، اس لیے وہ شوق براہ راست جاری رکھیں۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے شیفتہ کی شاگردی کی، اور اپنا کلام مستقل طور پر انہیں دکھاتے رہے۔ دلی میں زیادہ تر وہ داغ کے پاس جاتے تھے، غالب کے کلام سے بھی متاثر تھے، اور ان سے بھی ملتے ملاتے رہتے تھے، آگے چل کر وہ غالب کے کلام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ غالب کی شاگردی اختیار کر لی، اور اصلاح سخن غالب سے لیا کرتے تھے۔ غالب خود بھی حالی کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بے حد متاثر تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت حالی دلی میں تھے، اور انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں کی "جنگ آزادی" کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ ہندستانیوں کے "حب وطن" کے جذبے سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ اس کے نتیجے کے طور پر ایک نظم بھی لکھ ڈالی۔ یہ نظم حقیقت میں حالی کی شاعری کا "ماسٹر پیس" ہے!

ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

خرداد۔ تیر۔ امرداد ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۷۳ء

اے سپہر بریں کے سیارو!
اے بیابانوں کی دلفریب فضا!
اے غماں دل کے نغمۂ سحری!
اے نسیم بہار کے جھونکو!
تم ہر اک حال میں ہو لوں کو عزیز
جب وطن میں ہمارا ڈیرا تھا
تم ہمیں دلکشی کے ساماں تھے
تم سے گھٹتا تھا رنج تنہائی
آن اک اک نہاں بھائی تھی
کرتے تھے جب تم اپنا غم خواری
جو ہوا کھانے باغ جاتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لب آب
کوہ، صحرا و آسماں و زمیں
پر چھٹا جب سے اپنا ملک دیار
نہ نگاہوں کی وہ اداخوشی آتی ہے
سیر گاہ ہے جی کا اک جنجال
کوہ صحرا سے تالب دریا
کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور
گو وہی ہم ہیں، اور وہی دنیا

اے وطن! اے میرے بہشت بریں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
تیری دوری ہے مورد آلام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا
ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال
سچ بتا تو سب ہی کو بھاتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جاں نثار
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں؟
جن و انسان کی حیات ہے تو
ہے نباتات کو نمو تجھ سے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما

اے فضائے زمیں کے گلزارو!
اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے شب ماہتاب تاروں بھری!
دیر نا یا شناسائے کے دھوکے
تھے وطن میں تو کچھ اور ہی چیز
تم سے تھا باغ باغ اپنا دل
تم میرے درد دل کے درماں تھے
تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
جو ادا الحق وہ حق بھاتی تھی
دھو دی جاں فشانیاں تھیں کل
ہو کے خوش حال گھر میں آتے تھے
دھو کے اٹھتے دوائے داغ نشاں
سب میری دلکشی کی شکلیں تھیں
جی ہوا ہے سے خود بخود بیزار
نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
شب مہتاب جاں کو ہے دوماں
جس طرف جائیے جی ہنستا ہے
تم میں اب الگنی سی اب ہیں باتیں
یا ہمارے ہی کچھ مدار تھے طور
یہ نہیں لطف تم کو دنیا کا

کیا ہوے تیرے آسمان و زمیں
وہ زمیں اور وہ آسمان نہ رہا
تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
گل، ہیں نظروں میں داغ ہیں تیرے
تجھ سا تھا لطف زندگانی کا
اب کو کیا ہو گا زندگی کا مزہ؟
تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال
یا کہ تجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار
اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں!
مرغ ماہی کی کائنات ہے تو
رو کہ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

حملہ جب قوم آریا نے کیا
امن بچا ان کا ہند پر ڈٹ کا
ملک والے بہت سے کام آئے
جو بچے وہ غلام کہلائے
شودر کہلائے راکشش کہلائے
رنج پردیس کے مگر نہ اٹھائے
گو غلامی کا ننگ کیا دھبا
نہ چھٹا ان سے دیس پر نہ چھٹا
قدر اے دل وطن میں رہنے کی
پوچھ پردیسیوں کے جی سے کوئی
جب ملا راجیندر کو بن باس
اور نکلا وطن سے ہو کے اداس
باپ کا حکم رکھ لیا سر پر
پیر جلا ساتھ لے کے داغ جگر
پاؤں اٹھتا تھا اس کا جس کی طرف
اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
گذرے غربت میں اس قدر مہ و سال
پر نہ بھولا اجودھیا کا غزال
دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا
دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا
تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا
آتی تھی جب اجودھیا کی ہوا
کہتے تھے وہ برس ہوئے کہ حال
گویا ایک ایک چلہ تھا ایک ایک سال

ہوئے شب کی سمت جب راہی
سیدیں بطحہ کے ہمراہی
رشتے الفت کے سارے توڑ چلے
اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا
پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل لگی کے بہت ملے ساماں
پر نہ بھولے وطن کو یہ ناداں
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے
سنگریزے زمین بطحہ کے
گھر حفاظوں سے جی کی چھوٹا تھا
دل سے رشتہ نہ انکا ٹوٹا تھا

ہوئیں یوسف کی سختیاں جس دور
اور ہوا ملک مصر پر جب مہمور
مصر میں چار سو تھا حکم رواں
آنکھ تھی جانب وطن نگراں
یاد کنعاں جب اس کو آتی تھی
سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دکھ اٹھائے تھے جس وطن میں سخت
تاج بھاتا تھا اس لیے نہ تخت
جن سے دیکھی تھی سخت لے مہری
لو تھی ان بھائیوں کی دل کو لگی
ہم بھی چھوڑے وطن ہیں گو کہ ہیں غرق
ہم میں اور ان میں ہے مگر فرق
ہم ہیں نام وطن کے دلوانے
وہ تھے پہلے وطن کے پروانے
جس نے یوسف کی داستاں ہے سنی
جانتا ہو گا رود اس کی
مصر میں جب قحط پڑا آ کر
اور ہوئی قوت بھوک سے مضطر
کر دیا ان پہ وقف بیت المال
لب تک آنے دیا نہ حرف سوال
کھیتیاں اور کوٹھے کھتاں دیے
مفت سارے ذخیرے غلے دیے
قافلے خالی ہاتھ آتے تھے
اور بھر پور یاں سے جاتے تھے

اے دل اے وطن کے وطن ہوشیار
او شراب خودی کے ستوانے
نام ہے کیا اسی کا مذہب و طن
کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے
یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی
نقش ہیں دل پہ جو ترے دلنواز
کیا وطن کی یہی محبت ہے؟
اس میں انسان سے کہیں بڑھ کر
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں
جا کے کابل میں آم کا پودا
آ کے کابل سے یاں بہی دانار
پھلی جب چھوٹی ہے پانی سے
آگ سے جب ہوا سمندر رو
گھوڑے جب کیسے سے چھوٹتے ہیں
گائے یا بھینس، اونٹ یا بکری
کیجئے جب وطن اسی کو اگر
ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
جس پہ اطلاق آدمی ہو صحیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
سمجھیں اپنا ہی دکھ درد جہاں
رنج کو ان کے سمجھے مایۂ غم
بھول جائے سب اپنی قدر جلیل
جب یہ ان پہ گزرے دشمن اخلاق
بیٹھے فکر کیا ہو ہم وطنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
جب کوئی رنج زندگی کا لطف اٹھاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک
کھانا کھاؤ تو بیچ میں شرماؤ
کہتے بھائی تمہارے ہیں نادار
نوکر و رنگی تمہارے ہیں بندے
جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو
کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ
ایک ڈوا ہے سب میں مرگ نوش

سب کو ہے ایک اصل سے پیوند
نصیحتوں کو یاد کرو
جاگنے والے غافلوں کو جگاؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر
تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو
ہندرستی کا شاکی کیا ہے تو
تم اگر چاہتے ہو بھلائی کی خیر
ہوں مسلمان اس میں یا ہندو
جعفری ہو یا کہ ہو حنفی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد
ہند میں اتفاق ہو تا گر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بد خواہ
بھر گئے جا بجا سے جب بھائی
کبھی تورانیوں نے لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا
سب سے آخر کو لے گئے انگریز
یہ خدا کا ہے خدا ہی مالک
ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم
ملک روندے گئے ہیں غیروں سے
قوم سے ہیں تمہارے جو بیرے
اہل دولت کو ہے یہ استغنا
شہر میں بھوکا کی دوہائی ہے
جس میں ہے کہ ہاتھ اٹھا لیوے
ایک کہرام ہے کہ نیلا ہے
کوئی پھرتا ہے مانگتا در در
یہ جو ہیں ان
کہ جنہیں
جتنے دیکھو گے یاد گے بیدرد
عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات
قوم مرتی ہے بھوک سے تو ترے
ان کو اک تک خبر نہیں اصلا
علما ان میں
کفار کیا جیتے ہے کس کو کہتے ہیں

خواب غفلت سے ہو خبردار ابھی
گھر کی چھوٹے کو چھوٹنے والے
جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
تو کبھی اہل شہر کی ہے لگی
پھرے آنکھوں میں
یہ بھی الفت ہیں
اس سے خالی
سو کہ جانے ہیں
کبھی
ہو نہیں سکتے
ہاتھ دھوتا ہے
اس کو جینے کا
جان سے لاکھوں
اپنے اپنے
ہم سے
نوع انساں کا
جس کو حیواں
قوم کا حال
قوم سے
وہاں جو
وہاں اگر
دیکھ کر
اپنی آسائشوں
اٹھ اہل وطن
ورنا کہاں
دل کو
کر دامن
ٹھنڈا پانی
زندگی سے
ان کو وہ
وہاں
جن پہ
ہے انہیں

کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند
خوش دلو، غم زدوں کو شاد کرو
تیرنے والو ڈوبتوں کو ترا دو
لو جو بلی جہاز کو روکو کہ خبر
لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو
رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
بود و ہند مذہب ہو یا کہ ہو یہ ہو
جتنی ہمت ہو سے یا ہو یقینی
سمجھ آنکھوں کی پتلیاں سب کو
شہر ہیں اتفاق سے آباد
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کب تک
اپنی ڈفلی سے ہاتھ جھٹ بیٹھی
لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
جو نہ آئی تھی وہ بلا ہے ہی
کبھی نوشیروں نے زر لوٹا
کبھی محمود نے غلام کیا
ایک تیمور قوم مغرب کی
کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام
جس کو ملا ہے غیروں سے
سو جو لے پیار و اور شاد
کہ تمہیں کھا گئیں یہ خواہ
جاتی ہیں یہ آنی ہے
عورت کی مانند ہے کوئی دعا
رو لے ہاں رو لے
ہے کہ
ان میں
اپنی
دل کے
علماء
کفار کیا جیتے ہے کس کو کہتے ہیں مفلوک

سیر بھر کے کی قدر کیا سمجھے
اس کے نزدیک سب ہیں پیلیگرے

اہل دولت کا سن چکے تم حال
اب سفر روداد اہل کمال

ناملوں کو ہے فاضلوں سے عناد
پیڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد

ہے طبیبوں میں نوک جھونک صدا
ایک سے ایک کا ہے حوکا جدا

رہتے دو اہل علم ہیں اس طرح
پہلوانوں میں لاگ ہو جیسے طرح

عہدہ والوں کا ہے اگر یہ حال
شیخ والوں میں جا نہیں سکتا

شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار
خوشنویسوں کو ہے یہی آزار

لاکھ نکتوں کا کیوں نہ ہو ملک تک
دیکھ سکتا نہیں ہے ایک کو ایک

اس پہ طرہ یہ ہے کہ اہل ہنر
دور سمجھے ہوئے ہیں اپنا گھر

گو ملی ایک کانٹھ ہندی کی
اس نے سمجھا کہ میں ہوں بنیادی

نسخہ اک طب کا جس کو آتا ہے
سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے

جس کو آتا ہے پھونکنا کشتہ
ہے ہماری طرف سے وہ گونگا

جس کو ہے کچھ رمل میں معلومات
وہ نہیں کرتا منہ سے ریکھا بات

باپ بھائی ہے یا کہ ہو بیٹا
لھد یاتا نہیں سنجم کا

کام کنڈیلے کا جس کو ہے معلوم
ہے زمانے میں اسکے جانی کی جھوم

الغرض جس کے پاس ہے جو ہنر
جان سے بھی سوا ہے اسکو عزیز

قوم پر ان کا کچھ نہیں احسان
ان کا ہرگز نا ہو نا ہے گمان

سب کی الات اور منتر ان کے
قبر میں ان کے ساتھ جائیں گے

قوم کیا کہہ کے ان کو روئے گی
نام پر کس کے جان کھوئے گی

تربیت یافتہ ہیں جو یاں کے
خواہ نخواہ ان میں یا اپنے

بھرتے جب وطن کا گو دم ہیں
پر محب وطن بہت کم ہیں

قوم سے ان کو جا حیدیں کیسی
اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں

ہر بڑی اور ان کی جا گر فی
سات پردوں میں رہنہ دیکھے پڑی

ہند اس قفل میں ہے علم ان کا
جس کی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا

رستے ہیں اپنے دل ہی دل میں مزے
گویا گونگے کا گڑ ہیں کھائے ہوئے

کرتے پھرتے ہیں سیر گل تنہا
کوئی پاس ان کے جا نہیں سکتا

اہل انصاف شرم کی جا ہے
اگر نہیں تجھ پہ قہر کیا ہے

تم نے دیکھا ہے جو وہ منہ کو دکھاؤ
تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ

یہ جو دولت تمہارے پاس ہے آج
ہم وطن ہیں اس کے ہم محتاج

منہ کو اک ایک تمہارے ہے تکتا
کہ نکلتا ہے منہ سے ایکے کیا

آپ شائستہ ہیں تو اپنے لیے
کچھ سلوک اپنی قوم سے بھی کیجے

میز کرسی اگر لگاتے ہیں آپ
قوم سے پوچھیے تو ہیں نہ پاپ

مینڈھا ہوتا اگر آپ کو ہے پسند
قوم کو اس سے فائدہ اگر نہ

کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو
پیٹ میں جو ہے سب اگل ڈالو

علم کو کر دو کو بہ کو ارزاں
ہند کو گر دکھاؤ انگلستاں

سنتے ہو سامعین بات مکیں
سنتے ہو حاضرین صدر نشیں

جو ہیں دنیا میں قوم کے ہمدرد
بندۂ قوم ان کے ہیں نا مرد

باپ کی ہے دعا سے اے پسر
قوم کی میں بناؤں اس کو سپر

ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد
قوم پر سے نثار ہو اولاد

بھائی آپس میں کرتے ہیں یہاں
تو اگر مال دے تو دوں میں جاں

اہل ہمت کمی کے لاتے ہیں
ہم وطن فائدہ اٹھاتے ہیں

کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری
دخل اور خرچ جن کے ہیں بھاری

اور کہیں ہوتے ہیں کلب قایم
جن سے حکمت و ادب قایم

بنتے ہیں سیکڑوں شفاخانے
بنتے ہیں سیکڑوں شفاخانے

قوم پر ان کی ذہین ہے تدبیر
ملک میں ہر طرف ہے عالمگیر

کہ کوئی نسخہ ہاتھ آئے عجیب
ہیں سراسر اثر دھیرج میں طبیب

ملک میں پھیلیں فائدے جس سے
قوم کو پہنچے منفعت جس سے

جلسے پر حملہ اس پہ ہونے لگا
برسم بد کا اثر جہاں پایا

کہیں مجلس میں ہوتی ہے تقریر
کہیں مضمون ہوتے ہیں تحریر

ایک ناٹک بنا کر لاتا ہے
دوسرا اس کو کر دکھاتا ہے

لاکھ تدبیریں کر کے جوڑتے ہیں
آخر اس کو مٹا کے چھوڑتے ہیں

قوم کی خاطر ان کے سب ہیں کام
خواہ نخواہ ان میں سفر ہے خواہ مقام

سیکڑوں نکلرخ اور سہ یارے
لاڈلے ماں کے باپ کے پیارے

جان اپنی ہے ہتھیلی پہ
کرتے پھرتے ہیں کر و فر کا سفر

شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے
پر کوئی جان کام کی ہاتھ آئے

جس سے مشکل ہو کوئی قوم کی حل
ملک کا آئے کوئی کام نکل

کھپ گئے سیکڑوں پہاڑوں میں
مر گئے سیکڑوں پہاڑوں میں

لکھے جب تک جیئے سفر نامے
جیل دیے ہاتھ میں قلم تھامے

گو سفر میں اٹھائے رنج کمال
کر دیا پر وطن کو اپنے نہال

ہیں اب ان کے گواہ حب وطن
در و دیوار پریس و لندن

جیسے دنیا کا جس کو باغ جناں
ہے فرانس آج یا ہے انگلستاں

کام ہے سب سے بہتر کے ہم وطنو
تم سے بھی ہو سکے قوم مرد بنو

جھوڑ آسائش دنی کو جوش میں آؤ
بہت سوئے ہو اٹھ کے ہوش میں آؤ

ڈالئے تم سے بڑھ گئے کوسوں
رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں

قافلوں سے اگر ملا چاہو
ملک اور قوم کا بھلا چاہو

گر رہا چاہتے ہو عزت سے
جاؤ ان کو نکالو ذلت سے

ان کی عزت تمہاری عزت ہے
ان کی ذلت تمہاری ذلت ہے

خرداد - تیر - امرداد ۱۳۸۲ھ ش۔ ہندستانی ادب اپریل - مئی - جون ۱۹۷۳ء

قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز ... ہے فقیروں کا جو وہ ہے آغاز
عزت قوم چاہتے ہو اگر ... جاکے پیشہ وران میں علم و ہنر
ذات کا فرق اور نسب کا غرور ... اٹھ گئے جہاں سے اب دستور
اب نہ سید کا افتخار صحیح ... نہ پیر شیخ کو شرف پر ترجیح
ہو گئی قرقی تمام خانوں کی ... کٹ گئی جھوٹ ہے خاندانوں کی
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے ... علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن وہ بھی دور آئے گا ... بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات ... یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قول حالی کا ... پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

از: مظفر نگری

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

یوں تو آزاد ہوا ملت بیضا ہے مگر
فرنگ سے جینی ہیں بیڑیاں کیا کیا ہیں
قلب مسلم کا ہے ہر قصر بڑا گہرا سے
ایسا لگتا ہے کہ اس ملک کی قسمت ہی نہیں

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

روح تہذیب جھلکتی ہے یہاں کی ہر چیز
دیکھو ہر عید کی ہر شب ہے محرم ہے
ہائے یہ کیسو ... میں ... کھو
... ...

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

لفظ ایماں ہے گریباں ہے وضاحت کا مزاج
شمع کردار سیاست نے بجھا ڈالی ہے
اب تو باتوں پہ گذارہ ہے کوئی کیا کرے
آدھی دیکھ لو میاں آدھی خالی ہے

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

دیکھو دیکھو وہ لپکتا ہوا فاقوں کا ہجوم
آؤ بازار میں انداز گرانی دیکھو
اپنے محلات کی کھڑکی سے اٹھا کر پردہ
چشم انساں سے یہ مفلس کی جوانی دیکھو

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

ذرے ذرے کو ترستے ہیں ہزاروں انسان
لاکھوں نادار حکومت کو دعا دیتے ہیں
چند سکوں پہ یہ بکتے ہوئے اجسام حسیں
قوم کس حال میں ہے یہ پتا دیتے ہیں

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

نیتوں جرموں کے پلڑے میں سمٹ آئی ہیں
اور سیاست میں بغاوت کا تماشا دیکھو
یہ کورٹ شپ کی بلا اور یہ میرج کی وبا
ہائے اماں یہ مری تہذیب کا تماشا دیکھو

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

درد اخلاص سے ہر شخص نہ جانے کیوں ہے
تم جو ہنستے ہو سنے آؤ تو اچھا کر دو
دیکھو وہ لاش کئی دن سے پڑی ہے شاید
ہو سکے تم سے تو کفنا اس کو بھیجا کر دو

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

تم تو مطلب نہ ... قوم ...
تم نے تو خواہش ... کی ...
اپنے اعمال کی ... کو دیکھو تو ...
عزت قوم کو بازار میں لے آئی ہے

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

... ...
اپنے اسلاف کی ہر بات ... دہراتے ہیں
حیف صد حیف کہ ہم نے ... کھو دیا ہے
ناخدا ... ہے ...

رہبرو آؤ ذرا اور بڑھو تو آگے

خرداد۔ تیر۔ امرداد سنہ ۱۳۸۲ اف ہندستانی ادب اپریل۔ مئی۔ جون سنہ ۱۹۷۳ء

خاجا احمد عباس

سہاگ رات

خاجا احمد عباس کا شمار، نہ صرف ہندستان، بلکے دنیا کے مشہور افسانا نگاروں اور فلم کاروں میں ہے۔ عباس نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۳۵ء میں ایم۔ اے، ال ال۔ بی کیا، مگر ملازمت اختیار نہیں کی، بلکے سیدھے چلے آئے اور فلموں کے لیے کہانیاں اور ڈائلاگس لکھتے رہے۔ اس کے علاوا معتدد فلمی اور علمی ادبی رسالوں میں ان کے افسانے بھی چھپا کرتے تھے، چونکے ان کے تمام تر افسانے اصلاحی اور سبق آموز ہوا کرتے تھے، اس لیے دنیاے افسانا میں انہوں نے بہت جلد شہرت اور نام آوری حاصل کر لی، اور فلمی دنیا میں ان کی کہانیوں کی مانگ بڑھ گئی۔ ان کے افسانوں اور کہانیوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ روز اول انہوں نے قوم اور سماج کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا تھا، اس کو کسی بھی قیمت پات سے نہیں جانے دیا، چنانچے زیر بحث افسانا "سہاگ رات" ہمارے اس استدلال کا بین ثبوت ہے، جس میں سماج کی گندگیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

عباس نہ صرف ایک مانے ہوے افسانا نگار اور فلم کہانی رائیٹر ہیں، بلکے وہ اچھے خاصے ادیب بھی ہیں، جن کے ادبی مضامین وقتاً فوقتاً ہندستان کے متعدد ادبی رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ ان کے افسانوں اور ادبی مضامین وغیرا کے کئی ایک مجموعے چھپ چکے ہیں، جن کے نام اس وقت ہمیں یاد نہیں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے کسی ایک مجموعے کا روسی اور مرہٹی زبانوں وغیرا میں بھی ترجما ہوا ہے۔ اس طرح سے عباس نہ صرف نیشنل، بلکے انٹرنیشنل INTER NATIONAL شہرت کے حامل ہیں۔ غالباً ان کی دو فلموں کو INTER NATIONAL AWARD دیا گیا ہے، جن میں ایک تازا ترین فلم "دو بوند پانی" بھی ہے، اور ایک فلم کو INTER NATIONAL AWARD بھی ملا ہے۔ اس کا ہمیں پکا یقین ہے، لیکن اس وقت ہمیں اس فلم کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔

خاجا احمد عباس اسکرپٹ رائیٹر، ڈائلاگ رائیٹر۔ سینا ریو رائیٹر اور فلم پروڈیوسر اور فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر بھی ہیں۔ نیا سنسار NAYA SANSAR نامی اپنی فلم کمپنی خود ان کی اپنی ذاتی کمپنی ہے۔ جو جدید پروڈکشن میں واقع ہے۔ یہ دوسرے فلم کمپنی والوں کی طرح آے دن، بلا سوچے سمجھے فلمیں نہیں بناتے ہیں، کسی مقصدی یا سبق آموز فلمی کہانی کو فلمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب تک کہ خدا نخواستہ یا کسی اور کی اسٹوری ان کے اپنے معیار پر نہ اترے، اس وقت تک اس کو فلمانے کی طرف قطعی توجہ نہیں دیتے ہیں۔ [illegible] اور یہاں "آسمان محل"

نامی فلم کی شوٹنگ کی تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے فلمی کہانی کسی اور شخص نے لکھی تھی، جس کو عباس نے ڈائرکٹ کیا تھا، اور اس کی شوٹنگ بھی کی تھی۔ غالباً یہ فلم کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ اس کے بعد انھوں نے حیدرآباد کی طرف رخ بھی نہیں کیا، حالانکہ مناظر اور ملے جلے یا مشترکہ تمدن اور تہذیب کے اس تاریخی یادگار شہر میں بہت سارے مواقع حاصل ہیں، جن سے غالباً عباس خوب بہتر طریقے پر واقف ہیں۔ فلمی تعلق کے اعتبار سے عباس نے روس اور دوسرے کمیونسٹ ملکوں کا کئی بار دورہ کیا ہے، اور غالباً انگلستان، کناڈا اور امریکا بھی ایک سے زیادہ مرتبہ ہو آئے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کے متعلق یہ خصوصی نوٹ لکھنے کی ضرورت ہمیں، اس لیے پیش آئی کہ ہم نے اس "نمبر" میں نانا اور نواسے کو ایک جا کر دیا ہے۔ ہم نے اسی نمبر میں پہلے اسماعیل پانی پتی کا منظوم "مولانا حالی کے خطوط مولوی عبدالحق کے نام" دیا ہے۔ اس کے بعد خود مولانا حالی کی ایک معرکا آرا اور مشہور زمانا نظم "حب وطن" دی ہے۔ اس کے بعد اتفاقاً طور پر "آجکل" کے سالنامے ۱۹۷۲ء میں، افسانے "سہاگ رات" پر ہماری نظر پڑی۔ وہ افسانا ہم نے پورے کا پورا پڑھ ڈالا، اور اس کو نقدی اور سبق آموز پایا، اس لیے نانا حالی کی نظم "حب وطن" کے بعد نواسے عباس کا افسانا "سہاگ رات" دھر دیا، گویا نانا اور نواسے کو ایک ہی نمبر میں سمو دیا، اور ایسا اتفاق شاید مشکل ہی سے ہوتا ہے۔

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی ہندستان کے ایک عالا پایا مانے ادیب اور بے نظیر اور عدیم المثال شاعر تھے، جن کی مشہور زمانا نظم "مسدس حالی" دنیائے شاعری کا شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ایک دیوان کی بھی یادگار ہے۔ حالی پہلے شیفتہ کے شاگرد رہے تھے، اس کے بعد غالب کی شاگردی اختیار کی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے نہ ہی شیفتہ کے رنگ میں لکھا اور نہ غالب ہی کے رنگ میں طبع آزمائی کی، بلکہ ان کا اپنا ایک مخصوص اور خاص رنگ جدا گانا ہی ہے، جس کو ہم حالیانا رنگ کہتے ہیں۔ مولانا حالی کے نثر میں بھی درجنوں مشہور و معروف تصانیف (۱) مقدمہ شعر و شاعری اور (۲) حیات جاوید بھی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی کتابیں لکھی ہیں۔

نانا حالی ایک مانے ہوئے ادیب، اہل اور شاعر عدیم المثال تھے تو ان کے نواسے خواجہ احمد عباس ایک مانے ہوئے ادیب، اور افسانا نگار، اور فلم کار بھی ہیں، جنھوں نے اس میدان میں نہ صرف شہرت و ناموری حاصل کی ہے، بلکہ کئی قومی اور بین قومی ایک ایک انعامات اور AWARDS بھی حاصل کیے ہیں۔

خواجہ غلام السیدین، عباس کے بڑے بھائی تھے۔ سیدین نہ صرف ہندستان کے مانے ہوئے تعلیم تھے۔ مرکزی حکومت نئی دلی سے ایجوکیشن سکریٹری کی حیثیت سے وظیفا لیا تھا۔ اس کے بعد UNESCO کے تحت نئی دلی ہی میں بہ حیثیت ماہر تعلیم ایک بڑے عہدے پر تھے۔ آج سے چند سال پہلے نئی دلی میں ان پر HEART ATTACK ہوا تھا، اور وہ اس جان لیوا حملے سے جانبر نہ ہو سکے۔

بہر حال خوشی اور مسرت اس بات کی ہے کہ ہندستان کے ایک مانے ہوئے

خرداد۔ تیر۔ امرداد ۱۳۸۲ف ہندستانی ادب اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۷۳ء

اور قابل ترین ادیب اور شاعر مولانا خاجا الطاف حسین حالی پانی پتی کے دونوں نواسوں نے اپنی اپنی قابلیت سے دنیائے علم و ادب میں خوب خوب نام کمایا، اور صحیح اور حقیقی معنی میں، دنیائے علم و ادب میں، اپنے عالم فاضل اور قابل نانا کے وارث حقیقی قرار پائے، اور ان کے نام نامی کو آسمان شہرت پر پہنچا دیا!

ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

آج ان کی سہاگ رات تھی۔

ٹوٹو شکم چند اور لکشمی دل چند۔

ٹوٹو شکم چند چھبیس سال کا تھا، جس کا سر گنجا تھا، جس پر فقط گنجے فلم اسٹاروں کی ایک لٹ پٹتا تھا، اور جو کر کرٹ کلب میں رمی کھلتا تھا، مہالکشمی ریس کورس پر گھوڑے دوڑاتا تھا، غیر ملکی موٹریں سستے داموں بیچا کرتا تھا، اور اسی دھندے میں اس نے لاکھوں روپے کمائے تھے، اور دو بڑی بڑی موٹریں آج خود اس کے پاس موجود تھیں، انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے اس نے یہ کاروبار اسٹینڈ ٹریڈنگ کارپوریشن کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ اس نے ممبئی ہی میں سیکنڈ ہینڈ کاروں کا دھندا شروع کر دیا تھا۔ اس کی پہلی شادی ایک سیدی سادی تقریب میں ہوئی تھی جب وہ بیس برس کی عمر میں ہو گئی تھی مگر عورتوں کی مہربانی سے دو چند برس بعد ہی کوئی اولاد پیدا کیے بغیر چل بسی تھی اور اس وقت سے سیکنڈ ہینڈ کاروں کے ساتھ اس نے سیکنڈ بیویوں کا بھی دھندا شروع کر دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک، کتنی ہی جوان اور ادھیڑ بیویوں سے اور طلاق شدہ عورتوں سے اس نے دوستی کی تھی۔ جس سے جتنا پیار کر سکتا تھا، اتنا پیار بھی کیا تھا، لیکن اس کے پاسپورٹ میں اور اس کے ٹرنک کلب کے ممبر شپ کارڈ میں "مسز" کا خانہ خالی ہی رہا تھا۔

لکشمی لال چند الٹا بیس برس کی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی تین بیٹیوں اور دو بیٹوں میں سب سے بڑی تھی۔ وہ ڈاکٹری پڑھتی تھی اور اس کے باپ کا انتقال ہوا اور اپنے بڑے بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کا خرچ اور اس کی شادی کے لیے [illegible]

اس کو لکشمی نے بڑی حفاظت سے اپنے باپ کے ایک دوست کے بزنس میں لگا دیا، جس سے دو تین ہزار روپے سال کا منافع [illegible] تین کمروں کا فلیٹ پرانے کرائے پر [illegible] روپے ماہوار پر تھا۔ اس میں سے ایک [illegible] کر دیتے تھے۔ کبھی کوئی اسٹوڈنٹ لے لیتا، کبھی کوئی نیا یا پاسے کاری ملازم، جس سے پہلے ایک پیئنگ گیسٹ آ کر رہی تھی، جس سے لکشمی کو [illegible] ہوا کہ ڈاکٹروں سے زیادہ آمدنی [illegible] کو ہوتی ہے۔ چالیس روپے روز کے ملتے ہیں، اور ڈاکٹروں سے، ہسپتالوں کے نیچروں سے، اور کھاتے پیتے (اور نیا ہوتے ہیں) ملتے ہیں جان پہچان اور دوستی بڑھ جائے تو مہینے میں بیس پچیس دن (یا راتیں) کے لیے تو کام مل ہی سکتا تھا۔ اسی لیے لکشمی بھی [illegible] کام مفت سے ہی [illegible] ہمیار کہتے تھے کہ آدمی [illegible] دیکھ کر ہی غایب ہو [illegible] رہتے تھے۔ آمدنی بھی [illegible] کسی سے [illegible] لکشمی نے اپنے [illegible] کسی سے ایسی لڑکی [illegible] کا اس کو بھی خیال [illegible] دیکھ ہو [illegible] کرے وہ [illegible] جانا [illegible] اس [illegible]

نہ لینا پڑتا۔ نرس کی حیثیت سے، دوست کی حیثیت سے اور عارضی بیوی کی حیثیت سے لکشمی نے رات دن ایک کر دیا تھا۔ کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی اس نے اس بیمار کی تیمارداری میں۔ بالکل اس طرح دیکھ بھال کی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کی کرتی ہے، اور اب لوٹو کو معلوم ہوا کہ زندگی میں سیکنڈ ہینڈ کاروں اور کرسچن کی سیکنڈ ہینڈ عورتوں کے سہارے نہیں گزاری جا سکتی۔ ایک وقت آتا ہے جب انسان کے اکیلے پن کا خلا "دوستوں" اور ملاقاتیوں اور عارضی معاشقوں سے نہیں بھر سکتا۔ برسوں لوٹو نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ جب بازار میں دودھ ملتا ہو تو گائے کیوں پالی جائے، لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ گائے کا پیالہ، گائے کی ممتا، گائے کی سنگت اور چیز ہے اور گائے کے ملک پلوڈر کا ڈبا اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ اس کو دھونے کے لیے زندگی کے خادم برتن کا خانا پھر نا پلٹتا ہے۔ اس کے لیے ایک بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور یوں بیالیس برس کے "کنوارے" نے اکتالیس برس کی "کنواری" سے ہسپتال کے بیڈ کے پلنگ پر پڑے پڑے "پرپوز" کر دیا تھا اور اکتالیس برس کی کنواری، اس سوال سے، اس تجویز سے، بوکھلا سی گئی تھی، سٹپٹا سی گئی تھی اور ایک لمحے کے لیے اس نے اپنا مونہہ پھیر لیا تھا۔ کیا میں اپنی آزادی کو قربان کر دوں؟ اس نے اپنے من سے پوچھا اور وہ "نہیں" کہنے کے لیے سر اٹھا رہی تھی کہ سامنے واش بیسن کے اوپر لگے ہوئے آئینے میں اس کو اپنا چہرا نظر آ گیا۔ بیالیس برس کی محنت کی زندگی نے اپنے نقش بنا دیے تھے۔ اس کے سر پر بندھے ہوئے رومال کے نیچے سے اس کے کھچڑی جیسے بال دکھائی دے رہے تھے، اور اس کو ایک دم یہ خیال آیا کہ سیاہ بال کم ہوتے جائیں گے اور سفید بالوں کی تعداد زیادہ ہوتی جائے گی اور کوئی خضاب یا ڈائی اس کے بیمار سے تھکے ہوئے بوڑھے ہوتے ہوئے [illegible] نہ بنا سکے گا۔ ایک اور خیال آیا کہ یہ سوال [illegible] نہ پیش کرے گا۔ یا اب یا کبھی نہیں کہہ کر اس نے زبان "ہندی" لوٹو سے ملا کر اپنے [illegible] تھے، لیکن لکشمی نے اپنی بوڑھی ماں کے خیال سے سات پھیرے کرنا منظور کر لیا تھا، ورنہ اس عمر میں دلہن بننا اسے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس طرح شادی ہو گئی اور شام کو ایک شاندار ہوٹل میں استقبالیہ پارٹی بھی ہو گئی، جس میں لوٹو کے سب یار دوست اس کی سیکنڈ ہینڈ موٹروں کے خریدار، اس کی سیکنڈ ہینڈ عورتیں اور ان کے سیکنڈ ہینڈ شوہر، لکشمی کے بیمار، اس کے ڈاکٹر، اس کے دوست اور وہ سبھی جو "دوست" سے زیادہ ہوتے تھے، اس کی سہیلیاں جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی تھیں، اور ان کے پہلے یا دوسرے شوہر، سب شریک ہوئے۔ کافی ہنگامہ رہا۔ دہلی کے بعد شمیمین کا دور چلا، اور اب جبکہ وہ بارہ بجے رات کو لوٹو کے ایرکنڈیشنڈ فلیٹ میں آخر اکیلے ہوئے تو ان دونوں کے سر میں جیسا دھیما درد ہو رہا تھا، آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ شاید خمار تھا، مگر ساتھ میں کسی قدر مایوسی کا بھی احساس تھا، جیسے مٹھائی اندر سے کڑوی نکلی ہو۔

آج ان کی بھی سہاگ رات تھی۔

سکھارام جو مہاراشٹر کے گاؤں سے آیا تھا۔

گوری جو راجستھان کے ایک گاؤں سے آئی تھی۔

سکھارام کے گاؤں میں، سارے ضلع میں، سوکھے سے علاقے میں سوکھا پڑ رہا تھا۔ ہزار کسان اپنے گاؤں، اپنے کھیت، اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

گوری کا گاؤں جیسلمیر کے پاس تھا، جہاں چاروں طرف ریت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ وہاں تو ہر سال سوکھا پڑتا تھا۔ سات سات برس تک بارش کی ایک بوند نہ گرتی تھی۔ گوری نے اپنی اٹھارہ برس کی عمر میں صرف دو بار بارش کے بند جھیلے پڑتے دیکھے تھے۔ مگر ان دو بندوں سے بھی ریت کے سمندر میں ہریالی کے جزیرے ابھر آئے تھے۔ ان کی ہری ہری تراوٹ آج بھی گوری کے سینے میں یاد بن کر جب ابھرتی تھی تو گوری کا من کھل اٹھتا تھا۔

سکھارام کے خاندان نے جب اپنا گاؤں چھوڑا تو ان کے [illegible] تھے، خالی پیٹ ان کو نہیں چلنا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ اس سرکاری کیمپ میں پہنچ سکے تھے جہاں سڑک

بنانے کے لیے پتھر توڑنے کا کام ہو رہا تھا۔ بیمار، بھوکی ماں نے تو رستے ہی میں دم توڑ دیا۔ رہ گیا ایک لڑکا باپ اور سکھا رام، ان دونوں نے پتھر توڑنے کی نوکری کر لی۔

دن بھر دھوپ میں محنت کرتے۔ پینے کو پانی تک نہ ملتا۔ شام کو مزدوری ملتی تو راشن لا کر باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں پکا کر کھا لیتے اور ایک ایک روٹی صبح کھانے کے لیے رکھ لیتے۔ دن بھر افسروں، ٹھیکے داروں مقادموں کی ڈانٹ ڈپٹ، چھڑکیاں گالیاں سنتے۔ باپ کو تو برسوں یہ عادت تھی، وہ کہتا تھا۔ "برا ملنے سے کیا فائدا؟ یہ سب تو ہمارے بھاگ ہی میں لکھا ہے۔" مگر سکھا رام نے گاؤں کے اسکول سے چار جماعتیں پاس کر رکھی تھیں اس نے اسکول کے ماسٹر جی سے اور فوجی افسر سے "سوشلزم" "غریبی ہٹاؤ" اور "لوک راج" کے الفاظ سن رکھے تھے۔ دھندلا دھندلا سا کچھ تھوڑا بہت پتا ہو گیا تھا کہ ان لفظوں کا مطلب کیا ہے۔ اس کا باغی دل یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ رات دن سڑک آتے جاتے تھے۔ جن میں سے کئی سیدھے بمبئی جاتے تھے۔ بمبئی شہر جو سکھا رام نے خواب میں کئی بار دیکھا تھا۔ جس کی سنہری جھلک وہ کئی بار سینما کے پردے پر دیکھ چکا تھا۔ ایک رات کو چپکے سے وہ ایک ٹرک میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ رستے میں صبح سویرے ٹرک والے نے ٹرک روکا تو سردار جی ڈرائیور نے اسے پکڑا اور پنجابی گالی دے کر ٹرک سے اتر جانے کو کہا۔ سکھا رام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سردار جی کا دل پسیج گیا۔ انھوں نے رستے میں اسے دو روٹیاں بھی منگا دیں اور بمبئی لا کر چھوڑ دیا۔

گوری پندرہ برس کی ہوئی تو اس کی ماں کو فکر ہوئی کہ لڑکی کا بیاہ کر دیا جائے، مگر موسم کے کارن گاؤں میں نہ صرف کھیتوں کا بلکہ لڑکوں کا بھی کال تھا۔ جیسے ہی لڑکا کمانے لائق ہوتا اس کا ہونا ہوتا تھا، وہ موہنہ اٹھا کر جیسلمیر، جیسے پور، دہلی، کلکتا یا بمبئی کا رخ کرتا تھا۔ گاؤں میں رہتا بھی کیا کھا نہ کھیتی ہو سکتی تھی، نہ آس پاس کوئی کارخانا یا مل تھا۔ جہاں کام کر جاتا۔ جانے والے دو سو تک

گوری کے ماں باپ لڑکے کو ڈھونڈتے رہے جس کے ہاتھ میں گوری کا ہاتھ پکڑا کر وہ اپنا سماجی فرض پورا کر سکیں اور ریٹائر جانے کی تیاری شروع کریں۔

پھر ایک دن پاس کے گاؤں کا ایک چھوکرا (چھوکرا تو نہیں تھا۔ تیس بتیس برس کی ملگی عمر کا آدمی تھا) گھومتا پھرتا آ نکلا۔ اس کی نظر گوری پر پڑی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ صورت شکل سے بھلا آدمی لگتا تھا۔ کپڑے بھی شہر کے فیشن کے پہنے تھا، تنگ موری کی پتلون اور پھولوں والی شرٹ۔ گوری کے باپ نے اس سے بات کی تو اس نے بتایا کہ اس کو بابو کہتے ہیں۔ وہ بمبئی میں ایک مل میں کام کرتا ہے، تین سو روپے ماہوار کماتا ہے۔ گوری کے ماں باپ کے منھ میں تو پانی بھر آیا کھا پھر اگر اس سے شادی کی بات پیت کی تو اس نے کہا "سوچ کے تو میں بھی رہا ہوں کہ ڈھنگ کی لڑکی مل جائے تو اس سے بیاہ کر کے اسے بمبئی لے جاؤں۔" یہ سن کر گوری (جس کو وہ آدمی پہلے کوئی خاص پسند نہ آیا تھا) کے دل میں بھی بمبئی کے لڈو پھوٹنے لگے اور جب اس کے باپ نے کہا "لڑکی تو ہمارے ہاں بھی بیاہ کے قابل ہے، اگر تمھیں پسند ہو تو ——" تو گوری کے سارے تن بدن میں ایک سنسنی دوڑ گئی، اور پھر وہ کتنا اچھا لگا کہ جہیز میں دو سو روپے کی رقم بھی نہیں مانگی۔ کہنے لگا "دیسی باتا ہو کہ ہم بمبئی جائیں۔ پھر تو میں انتظام کریں گا۔" نتیجا یہ ہوا کہ دو دن بعد دلہا دو چار دوستوں کو لے کے آیا اور گوری کو بیاہ کر کے لے گیا۔

ایک رات بابو نے گاؤں میں بتائی، مگر گوری کو بات بھی نہیں لگایا۔ کہنے لگا "جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ ابھی تو تمھیں ساری زندگی بتانی ہے۔" اور گوری کے من میں بھی بات سما گئی۔ کہ اس نے یہ کیوں نہیں کہا کہ دو ابھی تو ہم دونوں کو ساری زندگی ساتھ بتانی ہے۔" اور پھر بابو دوسری طرف چھپر میں سو گیا۔ اگلے دن گوری کو لے کر بمبئی لے آیا اور آتے ہی کچھ سو روپے میں اسے ایک طوائف کے ہاتھ بیچ دیا۔ وہ [illegible]

زیادہ ملنے چاہئیں، اس لیے کہ میری بیاہتا ہوتے ہوئے بھی میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا، تم تو کافی رقم وصول کر لو گی۔"

پھر تو گوری روئی، چیخی، چلائی، بالوکو گالیاں کوسنے دیے، پھر عورت نے اسے کمرے میں بند کر دیا، بھوکا، پیاسا رکھا، لیکن وہ تو بھوک اور پیاس دونوں کی عادی تھی، پھر عورت نے اسے ہنٹروں سے مار مار کر ادھ موا کر دیا تو تنگ آ کر گوری نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ تب جا کر اسے چھوڑا۔ ہنٹروں کی مار پر عورت نے مرہم لگایا، گوری کو نہلایا دھلایا، دھلی ہوئی ساڑی پہننے کو دی اور ایک گہرے گلے کا بلاؤز جس میں سے اس کا راجستانی سینا جھلک رہا تھا۔ پھر باہر کے کمرے میں ایک سیٹھ سے ساڑھے تین سو روپے پیشگی وصول کیے۔ پھر دروازہ کھول کر گوری کو دکھایا۔ گوری نے شرم کے مارے سر جھکا رکھا تھا، پھر عورت نے کہا "شرمائیں نہیں بیٹی۔ یہ تیری سہاگ رات ہے، سیٹھ جی کو اپنا ملھڑا سمجھیں۔"

اس زن عزت نے "سہاگ رات" کے الفاظ استعمال نہ کیے ہوتے تو آج گوری کب کی پیشا کرتے کرتے پرانی بھی ہو گئی ہوتی، لیکن اس کے دل کے اندر "سہاگ رات" کا ایسا انوکھا اچھوتا، پوتر، اور سندر تصور تھا کہ اس بوڑھے سیٹھ کے ساتھ "سہاگ رات" بتانے کے خیال سے ہی اس کا دل کانپ اٹھا۔ سیٹھ نے کہا "موٹر میں گھومنے چلو گی؟ جو ہو سو میں میرا منگلا ہے۔ وہیں رات گزاریں گے، صبح ہوتے ہی نہیں ڈرائیور چھوڑ جائے گا۔"

گوری کے لیے اس کے سوا چارا بھی کیا تھا۔ ساڑھی، لحاف، گھنگھٹ لٹکائے سیٹھ جی کے ساتھ جا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ روشنیوں سے سجے ہوئے شہر کے بیچوں بیچ موٹر دوڑنے لگی اور سیٹھ جی اس کی طرف کھسکنے لگے۔ کھسکتے کھسکتے وہ اس کے بالکل پاس آ گئے۔ اب گوری، ان کے گرم گرم سانس اور ریب آ گیا۔ اس کے ہونٹوں تک آتے آتے گرم سانس کے ساتھ ہی سیٹھ کے مونہہ سے پائیریا کی بدبو کا بھبکا آیا تو گوری کو ابکائی آ گئی۔ سیٹھ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا، پھر بولا "تجھے الٹی آوے ہے کیا؟"

گوری نے سر ہلا کر "ہاں" کی اور سیٹھ نے ڈرائیور کو موٹر روکنے کو کہا۔ سڑک پر روشنی کم اور اندھیرا زیادہ تھا۔ گوری نے موٹر سے سر نکال کر الٹی کرنے کی کوشش کی تو سیٹھ نے اسے کھینچا "ادھر کیا، موٹر کو گندا کرے گی؟ چل باہر نکل۔ سڑک کے کنارے بیٹھ کر الٹی دلٹی کر۔"

گوری موٹر سے باہر نکلی، اور سڑک کے کنارے پیڑوں کے اندھیرے کو غنیمت جان کر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی، اور اس دن سے آج تک بھاگتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن سکھارام نے اسے کاشی کٹھیا ہوا تھا، جو جوان تھا، جس کی رنگت وہ جوب میں کام کرنے سے تانبے کی طرح ہو گئی تھی، مگر جو مسلمانا تھا تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکتے تھے، اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا "اے گوری، مجھ سے شادی کرے گی؟"

وہ دونوں فٹ پاتھ پر رہتے تھے، مگر آج اپنی "سہاگ رات" فٹ پاتھ پر بسر کرنے پر مجبور تھے۔ سکھارام پانچ اور آدمیوں کے ساتھ ایک کھولی میں رہتا تھا۔ جب بہت گرمی لگی تو سکھارام اور دو ایک اور آدمی باہر فٹ پاتھ پر سو جاتے مگر ان کے ساتھیوں کی [illegible] سونے کی ذلت کے مقابلے میں گرمی کے باوجود کھولی میں سونا بہتر سمجھتے تھے، رہی گوری تو وہ شروع شروع میں [illegible] سے فٹ پاتھ پر ہی کسی جگہ پڑ رہتی تھی، سکھارام کے ساتھ سو جاتا تھی۔ دن بھر گھروں میں جا کر جھاڑو برتن مانجھتی، کپڑے دھوتی، پھر ایک عورت کو جب معلوم ہوا کہ وہ فٹ پاتھ پر سوتی ہے تو اس نے رحم کھا کے اپنے گھر کے برآمدے میں گوری کو سونے کی اجازت دے دی، وہاں وہ ایک چٹائی

لیکن جب وہ سکھارام سے ملی اور اس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ نوجوان کھرے سونے کے قابل ہے اور ایسے آدمی کے ساتھ تو گزر بسر ہو سکتی ہے اور سکھارام نے اس سے پوچھا "کیوں تیری شادی تو نہیں ہوئی ہے؟" تو گوری نے سچ سچ کہہ دیا "نہیں تو۔" کیونکہ اس بھیانک نالک کو جو بابو نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ اب شادی نہیں سمجھتی تھی۔

پھر سکھارام نے پوچھا "کیوں ری سچ سچ بول کسی نے تیرے سنہ پر کوئی بات تو نہیں لگایا؟" مسکرا کر چونک کر گوری "نہیں رے۔ تو مجھے کیا سمجھتا ہے؟ میں کوئی ایسی ویسی ہوں؟"

پھر جب سکھارام نے آگے سوال کیا "سچ سچ شادی کرے گی؟" تو اس نے شرما کر گردن جھکا لی اور دھیرے سے کہہ دیا "ہاں!"

کئی دن تک سکھارام کو جب مل سے چھٹی اور گوری کو اپنے کام سے فرصت ملتی تو وہ دونوں جالوں اور جھونپڑیوں کے چکر لگاتے کہ شاید کہیں کوئی کھولی یا کوئی جھونپڑی رہنے کو مل جائے۔ گوری کے پاس سے کوئی سو روپے بچا کر رکھے چھوڑے تھے، اور سکھارام کے پاس تو جانے کتنے سو روپے سے بھی زیادہ رقم تھی۔ لیکن کوئی دو ڈھائی ہزار سے کم "پگڑی" میں نہیں مل سکتی تھی، اور ایک جھونپڑی کے لیے بھی لوگ کم سے کم ڈیڑھ سو روپے مانگتے تھے۔ اور چلتے چلتے ان کے پاؤں تھک گئے۔ ایک سڑک سے گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے موٹے پائپ پڑے ہیں، جن میں چھوٹے قد کا آدمی تو کھڑا بھی ہو سکتا ہے۔ گوری نے یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ ان میں بھی لوگ آباد ہیں۔ دونوں سروں پر میلے گندے بیتھڑوں کے اور ٹاٹ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر پردے لٹکا رکھے ہیں اور ان نو پھر کے بڑے بڑے نلکوں میں لوگ رہتے ہیں۔ عورتیں کھانا پکا رہی ہیں، بچے کھیل رہے ہیں، پوری گرہستی بسی ہوئی ہے۔

"ہم بھی ایک ایسا نلکا کہیں ڈھونڈ لیں؟"

گوری نے کہا "کیا ہم گٹر کے نلکے میں رہیں گے؟"

"گوری دیوی! اب بھی تو گٹر کی میں رہتے ہیں؟"

سکھارام نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا، "مگر ان گٹر کے نلکوں میں سے خالی ایک بھی نہیں ہے۔"

اتنے میں ایک آدمی ان کی طرف گھورتا ہوا ان کے پاس آیا۔ "تم کتوں رہنے کو جگہ چاہیے؟"

گوری نے گھونگھٹ نکال لیا۔ سکھارام نے کہا، "ہاں بھائی چاہیے تو۔"

"سو روپے ہیں تمہارے پاس؟"

"ہاں، وہ تو ہو جائیں گے؟"

"تو کل صبح ہمارا کام جاؤ۔ میں اتنے بڑے پائپ میں اکیلا ہی رہتا ہوں، اس لیے بیچ میں پردا لٹکا لیں گے۔ ایک طرف تم رہنا، دوسری طرف میں، جب تک پائپ گڑ نہیں جاتا رہے جا سکتے تم یہاں رہ سکتے ہو۔"

سکھارام نے اس آدمی کا شکریہ ادا کیا، اور کہا "تو ہم آج رات ہی کو آ جائیں؟"

"ہاں ہاں ضرور، مگر پچاس روپے پیشگی دے جاؤ۔ پائپ تمہارے لیے ایک روز روکے رہے گا۔ بکل جیسے ٹکٹ خرید کر سینما کی کرسی ریزرو کرتی ہے!"

سکھارام نے پچاس روپے اس آدمی کو دیدیے۔

اسی شام کو مندر میں ان کا بیاہ ہو گیا، وہ پتنی بن گئے۔

پھر اپنا سامان ساتھ لے کر وہ اس نلکوں کی بستی میں پہنچے۔

آدمی ان کا انتظار کر ہی رہا تھا۔

"لو جی۔ میں تمہارے لیے سب انتظام کر رکھا ہے۔ ادھر بھارا دھانا ہے۔ ادھر میرا۔"

گوری جلدی سے پائپ کی دوسری طرف چلی گئی۔

آج اس کی "سہاگ رات" تھی۔ اس نلکے میں بسر ہو گی؟ مگر پھر بھی سہاگ رات" تھی۔ گوری نے اپنے شریر میں ایک سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس کی، مگر اس نے پائپ کے منہ پر لٹکا ہوا پردہ اٹھایا ہی تھا اور اپنا سامان اندر رکھنے ہی والی تھی کہ سکھارام بھاگا ہوا آیا اور بولا "چلو گوری، یہیں یہاں نہیں ٹھیرنا۔"

جو ہم نے اس آدمی کو دیے تھے، ان کا کیا ہوگا؟"

"بھاڑ میں گئے وہ روپے!" سکھا رام نے چلتے چلتے زور سے کہا کہ گوری ڈر کے مارے چپ ہو گئی۔ پھر سکھا رام خود ہی بولا "جانتی ہے کیا کہتا تھا وہ مجھ سے؟ بڑی بے شرمی کی بات تھی رے!" گوری پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کیا بات تھی، مگر وہ کچھ نہ بولی۔

پھر سکھا رام خود ہی بولا "کہہ رہا تھا کہ میں نے تمہیں اپنے پائیٹ میں ساجھی بنایا ہے، اب تم مجھے اپنی بیوی میں برابر کا حصہ دار سمجھو۔"

"ہا ہے رے!" گوری کے منہ سے نکلا اور اس نے بے اختیار اپنے گھٹنے سمیٹ لیے۔

"آج رات آج کی رات تو کسی نہ کسی طرح گزارنی پڑے گی ہی۔"

ٹوٹو کے بیڈ روم میں بہت بڑا پلنگ تھا۔ پاس ہی ایک بڑا سا کشمیر کا بنا ہوا لیمپ سٹینڈ تھا جس پر لال لیمپ شیڈ لگا ہوا تھا۔ لال رنگ کا ہی پلنگ پوش تھا۔ چاروں کارنر بھی لال رنگ کے ہی تھے، اور دیواروں پر گلابی پینٹ کیا ہوا تھا۔ ہر چیز "سہاگ رات" کے تیار تھی۔ سوا دلہا دلہن کے۔

لکشمی ہاتھ روم سے شفون کا گلابی نائیٹ گاؤن پہن کر نکلی تو دیکھا کہ ٹوٹو کا گنجا سر گلابی روشنی میں چمک رہا ہے، اور وہ اپنے وگ کو ایک کاٹھ بنے ہوئے سر پر رکھ رہا ہے۔ لکشمی کو وگ کے بارے میں معلوم تھا، مگر آج کی رات اس دھیمی دھیمی گلابی روشنی میں نہ جانے کیوں ایک دم اسے ایسا لگا جیسے ٹوٹو اپنا کٹا ہوا سر ٹورسٹنگ ٹیبل پر سجا رہا ہے، اور کسی اور کا مانگا ہوا گنجا سر اس نے اپنی گردن پر رکھ لیا ہے۔

"ڈارلنگ!" ٹوٹو کی گردن پر رکھا ہوا مانگا ہوا سر کہہ رہا تھا۔ "میں بھی کپڑے بدل لیتا ہوں!" اور پھر ٹوٹو ایک کمرہ باتھ روم میں بند ہو گیا۔

لکشمی نے اپنی کاؤن کا اوپر کا بٹن کھلا رہنے دیا۔ سوچا آج سچ مچ میں نے بہت پی لی ہے؟" اس

تھی، ہر طرف کی کھڑکیاں بھی تو بند تھیں۔ اس نے سڑک کی طرف کی کھڑکی کھول لی۔ تیسری منزل سے نیچے جھانک کر دیکھا تو فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے لوگوں کی چٹائیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے چادریں لپیٹے مردے پڑے ہوں۔ مگر ان مردوں میں بھی ایک جگہ حرکت نظر آ رہی تھی۔ ایک مرد اور ایک عورت پاس لیٹے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر لکشمی نے دیکھا کہ مرد کا ہاتھ آہستہ آہستہ عورت کے ہاتھ کی طرف بڑھ رہا تھا، پھر ان دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھونے لگے، اور اتنی دور سے بھی لکشمی کو محسوس ہوا کہ صرف ایک ہاتھ کو ہاتھ سے چھو لینے سے عورت — یا لڑکی یا جو بھی تھی وہ — کے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اتنے ٹوٹو سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے باہر نکل آیا اور لکشمی کو کھلی کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے دیکھ کر بولا "ڈارلنگ — یہ تم کیا کر رہی ہو؟ گرمی لگ رہی ہے تو ایئر کنڈیشنر کس کام کے لیے ہے؟" پھر اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا — اور لکشمی نے سوچا کہ ٹوٹو کے چھونے سے میرے جسم میں ویسی جھرجھری کیوں نہیں پیدا ہوئی؟ پھر ٹوٹو نے کھڑکی بند کر دی، اور ایئر کنڈیشنر کا بٹن دبا کر اسے چلا دیا۔

"کم آن ڈارلنگ!" ٹوٹو نے پلنگ پر لیٹے ہوئے سوتی ہوئی آواز میں کہا "بہت رات ہو گئی ہے اب سو جانا چاہیے — آج بہت تھک گئے ہیں۔"

لکشمی جھجکتی ہوئی پلنگ کے دوسرے حصے پر اپنے تکیوں پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

ایئر کنڈیشنر میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ ٹوٹو نے یا تیتی سے کمبل اٹھا کر اوڑھ لیا، اور دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

لکشمی نے بھی اپنا کمبل اپنے اوپر ڈال لیا، اور دیر تک کمرے کی گلابی چھت کو، گلابی لیمپ سٹینڈ اور گلابی دیواروں کو تکتی رہی۔

پھر اس نے ٹوٹو کے خراٹے لینے کی آواز آنی ایسا لگتا تھا جیسے اس کی سانس لے رہا ہو۔

لکشمی نے بھی دوسری طرف لے لی، اس کا بات لیمپ کے سوئچ

گلابی دیواروں، گلابی چھت، گلابی بلب اور گلابی قالین پر گلابی روشنی بکھیرتا رہا۔ آخر لکشمی کی نشے سے بوجھل آنکھیں بھر بند ہو گئیں۔

گوری کے ہاتھ میں سکھارام کا ہاتھ تھا۔

سکھارام کے ہاتھ میں گوری کا ہاتھ تھا۔

ایک بات سے دوسرے ہاتھ میں ہوتی ہوئی۔

ایک گرمی۔

ایک نرمی۔

ایک بجلی کی رو۔

ایک سنسنی۔

ایک جھرجھری دوڑتی رہی۔ دوڑتی رہی۔۔۔

اور وہ دونوں لیٹے لیٹے اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے سڑک کے کنارے لگے ہوئے ہنڈے کو دیکھتے رہے۔

اور پرانا سیری بلڈنگ کے صرف ایک فلیٹ کی کھڑکیوں میں گلابی تھی۔ وہ اسی روشنی کو جھلملاتے دیکھتے رہے۔

"کتنے خفیہ وقت ہیں وہ جہاں ہوں، جو اس گلابی روشنی والے کمرے میں ہو رہے ہیں۔" گوری نے سکھارام کے ہاتھ کو ہلکے سے دباتے ہوئے کہا۔

رات کا ایک بجا۔

بسیں آنا جانا بند ہو گئیں۔

رات کے تین بجے۔

نشے ہاتھ پر سنسناتا ہوا۔ یہاں سے وہاں تک مردوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ صرف سکھارام اور گوری [illegible] اوپر بجلی کا ہنڈا اپنی [illegible] آنکھ سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

"بھگوان کرے" سکھارام نے سوچا۔ "اس ہنڈے کی آنکھ پھوٹ جائے۔" دور کہیں چار [illegible] آسمان ملگجی سا دودھیا لگ رہا تھا، اور پھر سکھارام اور گوری [illegible]

ایک دم ہنڈے کی روشنی گاہے گاہے اور پھر ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

اسی وقت زمین [illegible] ایک گڑگڑاہٹ کی سی آواز آئی جیسے کوئی بڑا ہوائی جہاز زمین کے اندر اتر رہا ہو۔ ہوا جیسے رک گئی تھی۔

پھر اسی لمحے سکھارام اور گوری نے محسوس کیا جیسے کوئی ان کے پلنگ کو بڑی زور سے ہلا رہا ہے، گویا وہ پلنگ پر نہیں پتھر پر لیٹے ہوئے تھے۔

گھپ اندھیرے میں لڑکیوں کے چیخنے چلانے اور ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بلڈنگ کے زینے سے سیاہ دوڑتے ہوئے پیر اتر رہے تھے۔ گندگی کی بو کہیں سے آ رہی تھی۔

"[illegible]"

"او زلزلہ! زلزلہ!"

"IT IS AN EARTH QUAKE DAMMNIT"

"[illegible] جیل ہو گئی ہے۔"

پھر ایک عورت کی آواز آئی "ڈارلنگ، ایر کنڈیشنر بھی تو فیل ہو گیا۔"

"میں تو روشنی جلا کر سوتی ہوں۔ وہ بند ہو گئی تو میری آنکھ کھل گئی۔"

زمین نے ایک اور جھٹکا لیا تو عورتیں اور بچے چیخنے لگے۔

"ڈارلنگ، بلڈنگ کی دیوار کے پاس سے ہٹ جانا چاہئے۔"

"ہاں کہیں بلڈنگ ہمارے اوپر نہ گر پڑے۔"

دھندلے ہاتھ سے ٹٹول ٹٹول کر سڑک پر آتے جا رہے تھے۔ صرف دو کالے سایے ہاتھ سے ہاتھ پکڑے ہوئے زینے پر ٹٹول کر چڑھ رہے تھے۔

"یہ تیسرا مالا ہے ان کا۔"

"ہاں ہاں" اس کے کان میں کسی نے کہا "تیسرے مالے پر ہی چل رہے ہیں۔"

ٹٹول ٹٹول کر سکھارام اور گوری بیڈروم میں داخل ہوئے، پیروں کے نیچے انہیں نرم نرم قالین محسوس ہوا۔

اندھیرے میں دونوں کسی چیز سے زور سے ٹکرائے اور پلنگ پر گر پڑے۔

چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ساری دنیا اس وقت اندھیری تھی، اندھی تھی۔

مگر پلنگ پر نرم نرم گداز بچھا ہوا تھا۔

گوری کے جلتے ہوئے گالوں کو تکیے بڑے نرم اور ٹھنڈے لگے۔

زمین کا دم گھٹ رہا تھا۔ زمین کروٹیں لے رہی تھی۔ زمین ہل رہی تھی۔ زمین بے چین تھی، زمین آسمان کی طرف اچھل رہی تھی۔ آسمان زمین کی طرف آتا محسوس ہو رہا تھا۔

سارے شہر میں ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔

"بھیانک آئے! بھیانک آئے!"

"زلزلہ آئے! زلزلہ آئے!"

"بھونچال! بھونچال!"

"بلڈنگوں سے دور رہو۔ نہ جانے کس وقت گر پڑیں۔"

دنیا کی ہر چیز پر اس لمحے رعشہ طاری تھا۔

مگر گوری کو دو مضبوط بانہیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھیں۔

خدیجا النصاری داس گپتا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

موہنی الجسم

خدیجا النصاری داس گپتا

اڑتیس سال پہلے میں لکھنؤ کے مشہور فرنگی محل خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ میرے والد شیخ النصاری عربی کے جید عالم ہیں۔ وہ بنگلہ دیش کے آزاد ہونے تک ڈھاکا کالیزیہ سکول میں مدرسے عالیہ کے پرنسپل رہے تھے۔ میں پانچ برس کی ہی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ فرنگی محل کی حویلیوں میں دادی اور پھپھیوں نے مجھے پالا۔ میرے بچپن کے زمانے میں والد علی گڑھ میں پڑھاتے تھے۔ میں باپ کی چہیتی بیٹی تھی۔ انھوں نے مجھے پندرہ برس تک گھر پر ہی تعلیم دلوائی۔

یوں تو فرنگی محل میں ہر طرح آرام تھا، لیکن نہ معلوم کیوں میرا دل بے چین رہتا تھا۔ فرنگی محل کی اونچی اونچی دیواروں سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ گھر میں نوکروں کی فوج تھی جس کی وجہ سے گھر کا کام کرنے کی تقریباً تمام ذمہ داریوں سے میں آزاد تھی۔ میرا دل ان حالات میں بہت گھبراتا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ کسی طرح سے اونچی دیواریں پھاند جاؤں۔ میرا بچپن کے زمانے میں علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور والدہ وہاں رہتی تھیں، چنانچہ میں نے بھی وہاں جانے کی ٹھان لی۔ یہ خبر عام ہوتے ہی حویلی میں ایک طوفان سا آگیا اور طرح طرح کے زور و شور کے ساتھ میرے باہر جانے کی مخالفت شروع ہو گئی، لیکن میں نے علی گڑھ پہنچ کر ہی دم لیا۔ علی گڑھ پہنچ کر جیسے میری روح کو سکون آگیا۔ وہاں کے لیے لوگ، اور طور طریقے کے مقابلے میں وہاں کی ہر چیز مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں نے بھی اپنی بے چین روح کی تسکین کے لیے ایک راستہ تلاش کر لیا۔ اور میں نے بھی بھائی کے ساتھ ساتھ ان مظاہروں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ علی گڑھ پہنچ کر ہی یہ معلوم ہوا کہ والد مولوی ہوتے ہوئے بھی کمیونسٹ تھے۔ اس سے میرے گھر اور بھی سناٹا ہو گیا۔ انگریزوں کے خلاف مظاہروں کے سلسلے میں ایک دفعہ مجھے جیل بھی جانا پڑا۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ سزا کی میعاد مجھ جیسے لوگ جیل ہمارے گھرانے کے لیے کوئی نئی جگہ نہ تھی۔ والد دادا آزادی کی تحریک کے سلسلے میں کئی دفعہ جیل جا چکے تھے۔ سیاست ہمارے خون میں تھی۔ ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک کمیونسٹ پارٹی کی خفیہ میٹنگ لکھنؤ میں اکثر فرنگی محل میں ہوتی تھی، یا حسین آباد کالج کے پرنسپل داس گپتا کے یہاں۔ یہ پرنسپل داس گپتا کے لڑکے ارون سے میری ملاقت ایک ایسی ہی میٹنگ میں ہوئی، پرنسپل صاحب نے میرے ساتھ بہت شفقت کا برتاؤ کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ تین سال تک میرا آنا جانا ان کے گھر پر رہا، اس عرصے میں ارون اور میں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ وہ مجھ سے عمر میں صرف ایک برس بڑے تھے۔ میرے والد کے کان میں بھنک پڑی، گھر آئے، اور مجھے سیر کے لیے کلکتہ لے گئے۔ وہاں سے وہ خود لکھنؤ چلے گئے اور مجھے کلکتہ بھیج دیا۔ لیکن ڈھاکا جانے سے قبل وہ باتوں ہی باتوں میں مجھے بتا گئے کہ ارون کے متعلق ہی اگر کسی نے بھی دوسرے مذہب میں شادی کی تو وہ اس سے اپنا تعلق توڑ لیں گے۔ ظاہر ہے کہ ارون کا اتنا بڑا خاندان تھا۔

میں لکھنؤ واپس آئی تو میں نے ارون سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ہم دونوں کے خطوں میرے گھر والوں کے ہاتھ لگ گئے۔ اس لیے عدالت میں نوٹس بھیجا گیا۔ ایک دن تو پورے لکھنؤ میں جیسے قیامت سی آ گئی۔ عام مسلمان لڑکی کی بات نہیں تھی، بلکہ یہاں تو فرنگی محل کے ایک مولانا کی لڑکی ایک ہندو سے شادی کر رہی تھی۔ رشتے دار دوڑ پڑے۔ پرانے قدیم خاندانی نظام سے نکال لیے جانے کی دھمکیاں دی گئیں۔ باپ کو ڈھاکا تار بھیجے گئے۔ مگر ابو مسلمان تھے کہ کسی کی بات ہی نہیں سنتے تھے۔ اس لیے یہ شادی رکوائی جا سکتی تھی، مگر میرے باپ نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ خدیجا کو دین بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑی بہنا نے میرا سر پرست بننا منظور کر لیا، اور انھوں نے عدالت میں عام پریس کے کاغذ دستخط کر دیے (اس بہن نے بھی ایک ہندو سے شادی کی تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا) شادی کی مخالفت میں جو رشتے دار پیش پیش تھے وہ میری ننھیال کے تھے، اور وہ لوگ یہ سب کے سب تعلیم یافتہ، اپ ٹو ڈیٹ اور معزز تعلیم اور تہذیب کے دلدادہ تھے۔

میرے سسر نے شادی کی خوشی میں بہت بڑی دعوت دی۔ شادی کے بعد میں خدیجا النصاری داس گپتا بن کر اپنی سسرال میں رہنے لگی۔

چھ سال تک وہیں رہی۔ میرے شوہر اسٹوڈنٹ کو جو فرسٹ کلاس ام۔ اے تھے یونیورسٹی میں کوئی کام نہ مل سکا۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انھوں نے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کی تھی۔ اسی زمانے میں والد بھی ڈھاکا سے لکھنؤ آگئے۔ وہ میری شادی کے بعد پہلی بار لکھنؤ آئے تھے۔ وہ مجھے اور میرے بچے بچے کو لے کر فرنگی محل گئے (تین سال سے میں فرنگی محل نہیں گئی تھی، کیونکہ فرنگی محل میری صورت سے بیزار تھا) فرنگی محل میں میرے بھائی کی شادی تھی، جس روز میں وہاں گئی اسی دن ان کا ولیمہ تھا۔ ولیمے میں آئے ہوئے مہمانوں نے میری موجودگی پر اعتراض کیا، لیکن میرے باپ نے ان کی مطلق پروا نہ کی، مجھ سے کہہ دیا کہ میری بیٹیاں سسرال سے نہیں جائے گی، ہاں اگر مہمان چاہیں تو اپنے تحفے اٹھا لیں اور اپنے گھر چلے جائیں۔ باپ کی مسلمہ یا ان کی علمیت سے مرعوب ہو کر لوگ چپ ہو گئے اور بات وہیں دب گئی۔

لکھنؤ میں اس دفعہ میرے باپ اور میرے سسر کی پہلی ملاقات ہوئی، اور اب وہ ایک دم گہرے دوست بن گئے۔ باپ کے بعد اگر اس دنیا میں مجھے کہیں سے شفقت ملی تو وہ اپنے سسر سے۔ انھوں نے مجھے اپنی بیٹی سے زیادہ سمجھا۔ شاید اس لیے کہ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ ان کی شفقت اور محبت دیکھ کر ان کے اور رشتے داروں نے بھی مجھے سر آنکھوں پر بیٹھایا۔ سسرال میں آکر مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ دنیا میں میری کوئی حیثیت ہے۔ شادی کے بعد میں نے نہ تو اپنا مذہب تبدیل کیا، اور نہ اپنا نام، الفاروی اب بھی میرے نام کا جز ہے۔ میرے سسرال کے لوگ مذہب کے معاملے میں بڑے فراخ دل ثابت ہوئے۔ میرے سسر کے خیال میں مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ شادی کے تین چار سال تک مجھے اور میرے شوہر کو کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ہم دونوں نے مل کر ان پریشانیوں کا مقابلہ کیا۔

میرا ایک ہی لڑکا ہے، سمجھے۔ اس کی عمر اب اٹھارہ سال کی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ دو مختلف مذہب میں شادی کرنے سے بچوں پر برا اثر پڑتا ہے، وہ نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے، لیکن میرے لڑکے کو ایسی کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ عید کے دن خاص طور پر عید گڑھ جا کر نماز پڑھتا ہے، اور کلکتہ جا کر حد گرجا پوجا میں شامل ہوتا ہے۔ ہندستانی اور عیسائی فرنگی بولتا ہے۔ میرے میکے والے بچے سے ابھی تک بیزار ہیں، لیکن سسرال کے عاشق ہیں۔ وہاں اس کی آؤ بھگت مجھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ میری سسرال میں بھی وہ سب کی آنکھوں کا تارا ہے۔ اس معاملے میں وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ثابت ہوا ہے۔

میں نے دلی سے ام۔ اے کیا، اور یہیں سے سوشیولوجی میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی لی۔ اب میں دلی یونیورسٹی میں ام۔ اے کے طلبا کو پڑھاتی ہوں۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ اصل میں شادی کے بعد میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی کا مذہب سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔ خوش گوار زندگی کے لیے ان کے خیالات کی ہم آہنگی ضروری ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی میں سیاست قدر مشترک تھی، جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے قریب آئے اور آج بھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ کچے تنگ نظر سیاسی پارٹیوں نے عوام کے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ مذہبی فسادات میں بھی ان ہی پارٹیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ورنا چاہت اور شادی کی راہ میں مذہب کبھی آڑے نہیں آتا۔ اور نہ اسے آڑے آنا چاہیے۔

آخر میں صرف اتنا اور کہوں گی کہ غیر مذہب میں شادی کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس راہ میں جتنی دشواریاں شادی سے پہلے پیش آسکتی ہیں، اس سے زیادہ شادی کے بعد سامنے آتی ہیں۔ غیر مذہب میں شادی کے بعد گھریلو زندگی کی کامیابی کا تعلق نہ خوب صورتی سے ہے، اور نہ محبت سے، کچھ سمجھ سکے محبت اور خوب صورتی دونوں کا نشا جلد ہی اتر جاتا ہے، اور پھر صرف تلخ حقیقتیں ہی رہ جاتی ہیں۔ سب سے پہلے ضروری چیز میاں بیوی کی مشترک قدریں ہیں۔ اگر انہیں ان قدروں پر صحیح قلب سے ایمان نہیں ہے، اور یہ ایمان آزمائش کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو پھر اکثر صورتوں میں یہ شادی ناکام ہی ہوگی۔ میری مثال ہی لیجیے کہ سیاست میری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ ہمارا گھرانا سیاست کے میدان میں پیش پیش تھا، اور اس میدان میں ہر ممکن قربانی دیتا رہا تھا۔ اپنے خاندان کی یہ روایت مجھ پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی۔ میں نے بچپن ہی سے سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں مجھ کو چھ مہینے جیل میں بھی گزارنے

پڑے۔ اگر علی سیاست میں قربانی کا جذبا ہم دونوں میں مشترک نہ ہوتا تو ہماری شادی کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ سیاست میں ہماری دلچسپی صرف کتابوں اور بحث و مباحثے تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی حد میں جیل کی دیوار دں تک جاتی تھیں۔

موہنی انجم

میرا تعلق لاہور کے بدھ راجا خاندان سے ہے۔ تقسیم سے پہلے میرے والد لاہور میں رہتے تھے، جہاں میں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئی تھی۔ تقسیم کے بعد ہم لوگ ہندستان آگئے اور اور بمبئی میں رہائشی اختیار کی۔ میری ابتدائی تعلیم بمبئی ہی میں ہوئی۔ میرے والد تجارت کرتے تھے، وہ بہت روشن خیال آدمی ہیں۔ والد اگرچہ مذہبی رسوم کی پابند تھیں، لیکن شاید والد کی صحبت میں رہ کر وہ بھی آزاد خیال ہو گئی تھیں۔ اسی آزاد خیالی کی فضا میں پرورش پاکر میں مذہبی تعصب اور چھوت چھات سے بہت دور ہو گئی تھی۔ جہیز کے مسئلے پر بھی میں اسکول میں تقریری مباحثوں میں حصا لیتی تھی۔ بمبئی میں ایک لڑکی جو مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، میری قریبی دوست بن گئی۔ اس دوستی کی وجہ سے مجھے ہندستانی تہذیب، ادب اور مسلم معاشرت سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

جب میں اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوئی تو ہم لوگ دلی میں منتقل ہو گئے۔ یہاں میں نے اندر پرست کالج سے فلسفے کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری لی۔ یہاں بھی میری عزیز ترین سہیلیاں مسلمان ہی تھیں۔ اصل میں مجھے مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن سے دلی انس ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے میں نے کالج میں فلسفے کا مضمون لیا تھا، جس سے میرا ذہنی افق وسیع تر ہوا، اور انسانیت سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اب انسان کا نام اور مذہب مجھے سطحی چیزیں لگتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ انسان میں اصل چیز انسانیت ہے، اگر وہ نہیں تو یہ سب لیبل بے کار ہیں۔

اندر پرست کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد میں دلی یونیورسٹی سے عمرانیات میں ایم۔ اے کیا۔ مجھے ہندستانی ادب سے جو ذہنی وابستگی تھی، وہ اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس ذوق کی تسکین کے لیے میں نے یونیورسٹی میں ہندستانی کی کلاس میں بھی جانا شروع کر دیا۔ یہیں میری ملاقات خلیق انجم سے ہوئی جو ہندستانی کے شعبے میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ رفتار رفتا یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک ہم ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے۔ خلیق انجم خدا بھی نہایت روشن خیال گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا گھرانا نہ صرف تعلیم یافتہ ہے، بلکہ تعلیم پھیلانے میں بھی اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔ والد اکبر شرسلطانا پانچویں سال تک دلی کے زنانا اسکول کی پرنسپل رہیں۔ خلیق ان کے اکلوتے لڑکے ہیں۔ ان کی بہنیں بھی روشن خیال اور تعلیم یافتا ہیں۔ ان کے گھر میں پردے کا رواج نہیں ہے۔

ہوتے ہوتے میری اور انجم کی دوستی اس مرحلے پر پہنچ گئی تھی کہ ہم دونوں نے شادی کا فیصلا کر لیا۔ اب ہم دونوں کے لیے اپنے والدین کو منانے کا مسلا سامنے آیا۔ میرے والدین اگرچہ روشن خیال سہی، لیکن وہ پاکستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں لٹ کر آئے تھے، اس لیے مسلمانوں کے خلاف تھے، چنانچہ جب میں نے ان کے سامنے انجم سے شادی کرنے کا ذکر چھیڑا تو انھیں شدید دھچکا پہنچا۔ میں ان کی اکلوتی لڑکی تھی۔ وہ کسی اچھے ہندو گھرانے میں میری شادی کرنے کے خواب دیکھے تھے، اور اس کے لیے انھوں نے بہت سا جہیز بھی جمع کر لیا تھا۔ ادھر خلیق بھی اپنی بیوا ماں کے اکلوتے لڑکے تھے۔ ظاہر ہے کہ کچھ ایسے ہی خواب انھوں نے بھی دیکھے ہوں گے۔ وہ بھی چاہتی تھیں کہ کسی اچھے مسلم گھرانے میں ان کی شادی ہو۔

ہم دونوں بالغ تھے، اور تعلیم یافتا تھے۔ ہم چاہتے تو اپنے والدین کی رضامندی کے بغیر بھی اسپیشل میرج کر سکتے تھے، لیکن ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس سے ہم دونوں کے والدین کو ذہنی صدمہ پہنچے گا۔ والدین کو راضی کرنا ہم دونوں کے لیے کٹھن تھا، لیکن ہم نے ہمت نہ ہاری۔ اس مرحلے کو سر کرنے میں ہمیں کافی وقت لگا، اور کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خلیق ہمارے گھر اکثر آتے تھے۔ رفتار رفتا انھوں نے میرے والدین کے دل میں جگہ بنا لی۔ اس درمیان انھوں نے والدہ کو بھی آمادہ کر لیا تھا۔

اس طرح ہم دونوں کی مشکل آسان ہو گئی، اور ہم نے عدالت میں شادی کی درخواست دیدی، مگر اب ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ والدین کو منانے کی دھن میں ہم نے اپنے رشتے داروں کی طرف توجہ دی ہی نہیں تھی۔ پتا چلا کہ دونوں طرف کے رشتہ دار اس شادی کے سخت خلاف

ہیں۔ انھوں نے ہمارے خلاف باقاعدہ اتحاد بنا لیا۔ کچھ سیاسی پارٹیوں نے میرے والد کو خط لکھے جن میں ان کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر انھوں نے اپنی لڑکی کی شادی ایک مسلمان سے کی تو ان کے حق میں اچھا نہ ہوگا، ہیرو گئی مرنے مارنے پر بھی تلے ہوئے تھے۔

اس [illegible] سے ہم دونوں کے والدین بھی گھبرا گئے۔ انھیں ڈر تھا کہ سچ مچ کوئی حادثہ ہو جائے۔ صاحب [illegible] کے سوا کوئی چارا نہیں تھا کہ شادی [illegible] عدالت کے گھر میں ہی کی جائے۔ چنانچہ میرے والد کے گھر پر [illegible] رواج کے مطابق کھیے ہوئے، اور خلیق کے گھر پر اسلامی رواج کے مطابق شرعی نکاح ہوا۔ اس [illegible] کے دونوں گھرانے شریک ہو گئے۔ اور یہی جامع [illegible] کالیں جس میں میں اپنی ساسوں میں اکثر رہتے ہیں [illegible] یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ میں نے مسلم [illegible] کا کلچر اچھی طرح سیکھا تھا لیکن عملی زندگی گزارنے [illegible] کلچر کی [illegible] کہاں اور کیسے گھر [illegible] کچھ [illegible] عجیب سی لگی کافی دن [illegible]

میری ساس کو [illegible] یاسمین کے [illegible] نے [illegible] واقعی ساس [illegible] ساس [illegible] میری [illegible] اور [illegible] ساسوک کیا۔ میری [illegible] کوشش رہتی تھی کہ کوئی ایسی بات [illegible] ایک دوسرے کو [illegible] میری ساس [illegible] کوئی [illegible] یار [illegible] دار [illegible] میرے [illegible] العارف کرتی ہیں۔ مجھ کو [illegible] ساس [illegible] میں اس کی شکر گزار ہوں۔ [illegible] آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنا [illegible] اجنبی [illegible] کوئی [illegible] کہہ سکتا تھا کہ میں اجنبی [illegible] قائم کرنی تھی [illegible] اس دوران [illegible] کا نام سنبھالا [illegible] سنبھالا [illegible] اپنی [illegible] [illegible] [illegible]

REGD.NO. H.384.

"HINDUSTANI-ADAB"

99-A, AZAMPURA-SHARQI,

Hyderabad.-36 (A.P.)

INDIA.

EDITOR,

G.M. Khan,

M.A., (OSMANIA).

ماسٹر ٹیلر
ایڈیٹر۔ بی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (
۹۹۔ اے۔ اعظم پورا شرق۔ حیدرآباد ۳۶۔ آندھراپردیش
(انڈیا)

انجمن ترقیٔ ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی رسالا
رجسٹرڈ نمبر ایچ (م ۳۸)
جلد (۳۳) نمبر (۱۰-۱۱-۱۲)
شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۲ ف
جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۳ء
چندہ سالانہ
بارہ روپے

ہندستانی ادب

سکیولرزم نمبر

انسانیت نمبر

۹۹-اے شکم پورہ شرق - حیدرآباد ۳۶ - آندھرا پردیش - انڈیا -
ایڈیٹر
جی - ام - خان ام - اے (عثمانیا)

نمبر	عنوان	نام	صفحہ	شکریہ کے ساتھ
۱	ہمارے خیالات	ایڈیٹر "ادب"	۳	
۲	شہزادی کا رومان	جی - ام - خان ام - اے (عثمانیا) ایڈیٹر ہندستانی ادب	۹	
۳	غزل	ساغر نظامی	۲۱	بنت حوا
۴	قومی لوری	جی - ام - خان ام - اے (عثمانیا) ایڈیٹر ہندستانی ادب	۲۲	
۵	بہار شفق اور کچھ ہماری لال شفق	کالیداس گپتا رضا	۲۴	صبح امید
۶	آئینہ سے سوال	سلام مچھلی شہری	۲۶	
۷	دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز	ہرپال سنگ بانگی ایڈیٹر "آزاد بھارت"	۲۷	آزاد بھارت
۸	عورت جس کے چار نام ہیں		۲۹	پریس سیوک
۹			۳۰	

۱۰	غزل	ڈاکٹر سریندر پال شفقت	۴۲
۱۱	ہندستان ابر کی نظر میں	ڈاکٹر نور السعید اختر	۳۴
۱۲	ایک سہیلی کا خط	رحمن چاچی	۳۸
۱۳	مولانا آزاد کا جمالیاتی ذوق	عیاز انصاری	۳۹
۱۴	غالب تیرے پیچھے	مرزا عکاسی کامیٹیاتی	۴۱
۱۵	دنیا کا سب سے خوبصورت اور ہندستان کا قومی پرندا	سلیم نوری	۴۲
۱۶	رباعی	ڈاکٹر حیدرآبادی	۴۳
۱۷	محبت ہر قدم پر آدمی کے کام آتی ہے	ظفر اکبرآبادی	۴۴
۱۸	نہرو میوزیم لائبریری	سر تاج عابدی	۴۵
۱۹	رباعی	رشید	۴۷
۲۰	شہد کے فائدے	محمد اسحاق	۴۸
۲۱	غزل	نسیم نوری پٹیالا	۴۹
۲۲	علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ	خاجا احمد عباسی	۵۰
۲۳	چراغ علم ضروری ہے زندگی کے لیے	روشن پنیالوی	۵۴
۲۴	وحشت کا تنقیدی شعور	پروفیسر عبدالرؤف	۵۷
۲۵	رباعی	شفیق میتالی	۶۳
۲۶	ولیم اسٹیفورڈ اور مرزا غالب	اداکر دناکر	۶۴
۲۷	پنڈت اگست	گوہر سنجیپوری	۶۵
۲۸	پیرس کا سیر	سلامت علی	۶۶
۲۹	آزادی کا جشن سیمیں	آزاد بارانوی	۶۸
۳۰	ملاوٹ کی کرشمہ سازیاں	ٹی - ایس - براج	۶۹
۳۱	غزل	ضیا رشی	۷۱
۳۲	شیر شاہ سوری کا انصاف	آسی رام نگری	۷۲
۳۳	قطعہ	گوہر سنجیپوری	۷۶
۳۴	ہمارے نوجوانوں کی جوانی دیکھتے جاؤ	ے ڈھرک پارسی	۷۶
۳۵	جوش کی شاعری	مگن لال آزاد	۷۷
۳۶	بیسویں صدی کے سروان	جگن ناتھ کمال کرتارپوری	۸۰
۳۷	سرقتا باللہد	جی - ایم - خان ایم اے (خانیا) ایڈیٹر "ہندستان ہمارا"	۸۱
۳۸	غزل	ظفر صہبائی	۸۴
۳۹	تجھے بھی پوچھتی دنیا جو تو نے کچھ کیا ہوتا	فلیق بدھانوی	۸۴
۴۰	امجد نجمی کے خطوط	پروفیسر کرامت علی کرامت	۸۵
۴۱	غزل	ادیب مالیگانوی	۹۵
۴۲	آزادی کا جشن سیمیں	جاوید احمد خان	۹۶
۴۳	دو بڑی شخصیتیں	انو شا رانی	۹۷
۴۴	شوہر - بیوی	پریم وار برٹنی - شریمتی پریم وار برٹنی	۸۰

	رہنمائے تعلیم		
	شاخسار		
	بنت حوا		
	برہان		
	آزاد بھارت		
	پیام تعلیم		
	بنت حوا		
	زیور		
	مرکزی اطلاعات		
	سب رس		
	مرکزی اطلاعات		
	نشان ہند		
	مرکزی اطلاعات		
	بانو		
	سب رس		
	رہنمائے تعلیم		
	مرکزی اطلاعات		
	رہنمائے تعلیم		
	بانو		
	ہمدرد		
	رہنمائے تعلیم		
	نشان ہند		
	بیسویں صدی		
	رہنمائے تعلیم		
	ویدیش سیوک		
	مرکزی اطلاعات		
	بیسویں صدی		
	زیور		
	آزاد بھارت		
	شاخسار		
	رہنمائے تعلیم		
	پیام تعلیم		
	بانو		
	بانو		

شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۲ ف ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۳ء

ہمارے خیالات

مذہب کے نام پہ لڑتا ہے اک جہاں
انسانیت کی بات کرو میرے مہرباں
(فرمودۂ "انسان کامل" جی - ام - خان)

SECULARISM NUMBER

سیکولرزم نمبر

یا

انسانیت نمبر

ہندستان دنیا کا واحد سیکولر ملک ہے!

ہندستان کا دستور دنیا کا واحد سیکولر دستور ہے!

سیکولر ہندستان کا ہندستانی ادب دنیا کا واحد سیکولر علمی ادبی ماہوار رسالہ ہے!

اس سیکولر رسالے کا ایڈیٹر جی ام - خان (ام - اے (عثمانیا) خود بھی سیکولر ہے!

ہم نے اس نمبر میں خواجہ احمد عباس کے مضمون "[illegible]" پر ایک تفصیلی نوٹ لکھا ہے، جس میں "ہندستانی ادب" کے ۲۳ سالہ دور میں پہلی بار اس رسالے کی [illegible] پالیسی کا واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ "ہندستانی ادب" نے اپنے (۲۳) سالہ دور میں کس

رسالے کی پالیسی اور خود ایڈیٹر کے خیالات مذہبیات سے کوسوں دور ہیں - مذہب سے بیگانہ ہونے پاس رسالے کے (۲۳) سالہ طویل ترین دور میں ام - ۳۰ ای - ۱۰ ٹی - ۱۰ [illegible] - ہمارے مضامین - سبق آموز افسانے (اور بہت کم میسر) کارٹون - اقتباسات - نظمیں - غزلیں - ہزلیں - قصیدے -

ہم اپنی فطرت سے مجبور تھے، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ مذہب جھگڑے نہیں سکھاتا، مگر ہر مذہب کے نام نہاد مذہب پرست مذہب کے نام پر آن واحد میں خون کی ہولی کھیلنے تیار ہو جاتے ہیں، اور آدمی، آدمی کا خون بہانے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے! اس کی مثالیں ہندستان کی تقسیم ۱۹۴۷ء سے پہلے اور بعد بھی ملتی ہیں، جس کے آئے دن مظاہرے ضد ہندستان کے کرنے کے گوشے میں ہوتے رہتے ہیں، اور ایک ایسا ہی اخلاق سوز اور انسانیت کش خونی واقعہ بالکل حال ہی میں ہندستان کے پایۂ تخت، یعنی ملک کی چوتھی بڑی آبادی پر شہر دہلی میں ہوا۔ اس شرمناک اور قبیح اخلاقی خونی واقعہ میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک رہے، جن کے "انسانی خون" میں رنگے گئے ہاتھ آج تک بھی خونی ہیں، چونکہ یہ دردناک، شرمناک، حیا سوز اور انسانیت کش واقعہ دہلی سے متعلق تھا، اس لیے مرکزی حکومت ہندستان نے اسکو دبانے کی بہتیری کوشش کی، لیکن STATESMAN کے دو رنگا انگریزی اخبار کے اشاف رپورٹر نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس اخبار میں تفصیلی واقعات بیان کیے، جن کو ہم روزانہ اڑتی ہی تکلیف، دکھ درد، اور رنج و ملال کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ایسے ہی حیا سوز اور شرمناک واقعات کی روشنی میں، ہم داعیان مذہب سے کھلے طور پر پوچھتے ہیں کہ وہ جواب دیں کہ آخر اس کا کیا حل ہے؟ وہ یہ کہینگے کہ مذہب تو جھگڑے کرنا نہیں سکھاتا، چنانچہ اقبال نے کہا ہے ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

اور اسی اقبال نے آگے چل کر "پاکستان" کا تصور پیش کیا، جس کی آتش فشانی قوت سے اکھنڈ ہندستان کے دو ٹکڑے ہو گئے، اور جس کے نتیجے کے طور پر ہندستان اور پاکستان دو ملک وجود میں آئے جس کا اقبال نے ابتدا ایسی سکیولر اکھنڈ ہندستان کا نظریہ پیش کیا تھا، آگے چل کر اس اقبال کا دماغ اور دل مذہب کے زہریلے اور خطرناک مزیدے سے مفلوج ہو گیا، چنانچہ اس کے تخیل و عملی طور پر محمد علی جناح نے لڑ لڑا کر پاکستان کے علیحدہ قیام کے لیے اس وقت تک لڑتا رہا، جب تک کہ پاکستان وجود میں نہیں آ گیا۔

ہماری اپنی رائے ہے، جناح سے بڑا کر بے وقوف، پاگل، جنونی اور دیوانا سیاست والی دنیا میں کوئی اور نہ ہوگا، جس نے آدھے بنگال کی تقسیم کو مشرقی پاکستان کی حیثیت سے قبول کر لیا، اور اپنی اس کامیابی پر نازاں تھا، مگر اس وقت ہم نے اپنے ملنے والوں سے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات کہی تھی کہ جناح سے بڑا کر بے وقوف سیاست والی دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے، اس لیے کہ سنرل اور شرقی پاکستان میں ایک ہزار سے زیادہ میل کا فاصلہ ہے، اور یہ طویل ترین فاصلہ بھی ہندستان کے رحم و کرم پر مشتمل ہے۔

اگر ہندستان اور پاکستان میں اختلافات پیدا ہو جائیں، اور اتفاق سے دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ جائے تو ظاہر ہے کہ ہندستان ریستاند کر دے گا۔ اس رستے بالکل یہی ہوا، اور ہندستان کے ریستاند کرنے کے بعد سے کراچی سے تمام جہاز سارے ہندستان کا چکر کاٹتے ہوئے براہ کولمبو (سری لنکا) جایا کرتے تھے، لیکن قدرتی کہ پاکستان کی ان امیدوں پر بھی پانی پھر گیا۔ ۱۹۷۱ء کی تاریخی اور سوکا آمرا مشرقی پاکستان۔ ہندستان اور پاکستان کی جنگ کے بعد مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے تقریباً ایک لاکھ فوجیوں نے ہندستانی اور مشرقی پاکستانی فوج کے آگے گھٹنے ٹیک دیے، اور اپنے تمام ہتھیار بھی ڈال دیے، جس کے نتیجے کے طور پر ۷ کروڑ کی آبادی کا ایک نیا ملک "بنگلا دیش" وجود میں آیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد سترا مذ اگاندھی، وزیر اعظم آف انڈیا کی "شملا سمٹ" ہوئی پاکستان کے صدر بھٹو نے سمٹ میں شرکت کی۔ دونوں طرف کے ڈیلی گیشن نے سمٹ کے کامیاب بنانے میں جی کھول کر اور خوب خوب ہی حصہ لیا، آخر میں ایک معاہدہ طے پایا، لیکن آج تک اس معاہدے پر کبھی بھی عمل نہیں ہوا۔ اس کے بعد یعنی کچھ عرصہ پہلے اسلام آباد میں ڈیلی گیشن کی میٹنگ ہوئی تھی، جس میں پاکستان جماعت کے صدر عزیز احمد اسٹیٹ فارمین منسٹر تھے، اور ہندستانی وفد کے صدر پروفیسر ہمنر کے خصوصی نمائندے پی۔ این۔ حاکر تھے، لیکن "نشست و گفتند و برخاستند" کے مصداق نتیجہ صفر سے زیادہ نہ رہا۔ اس کے بعد پھر سے ایک میٹنگ ترتیب پائی تھی، جو ۲۲ راگست ۱۹۷۳ء سے نئی دلی میں ہوتی رہی، اور آخر کار ۲۸ راگست کو بنگلا دیش۔ ہندستان۔ پاکستان میں یہ معاہدہ طے پایا کہ ہندستان اور بنگلا دیش میں جتنے بھی P-D-WS یعنی پرزنرس آف وار قیدی ہیں وہ سب بتدریج پاکستان کو روانہ کر دیے جائینگے، اور پاکستان میں جتنے بھی P-O-WS ہیں ہندستان اور بنگلا دیش کو واپس کر دیے جائینگے۔ اسی معاہدے میں یہ بھی طے پایا ہے کہ پاکستان میں تقریباً چھ لاکھ بنگلا دیشی ہیں، جو بتدریج بنگلا دیش بھجوا دیے جائینگے، اور اسی طرح بنگلا دیش میں تقریباً چار لاکھ وہ بہاری ہیں، جو پاکستان جانا چاہتے ہیں، چنانچہ قصے وقصے وقفے وقفے سے انہیں بھی پاکستان روانہ کر دیا جائے گا۔

۱۹۶۷ء کی ہندستان اور پاکستان کی جنگ کے نتیجے کے طور پر ہندستان نے مشرقی پاکستان کا ہوائی رستہ بند کر دیا تھا، جو آج تک بھی بند ہے۔ خیر ہوائی رستہ کھولنے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، لیکن ہوائی رستے کے لیے پاکستان آج تک بھی ہندستان سے لڑ رہا ہے، چنانچہ WORLD COURT of THE HAGUE میں ہندستان کے خلاف پاکستان کا مقدمہ چل رہا ہے، جس کا فیصلہ آج تک بھی نہیں ہوا ہے!

ان تمام واقعات اور حالات سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستانی حکومت اور پاکستانی عوام کی رگ رگ میں ہندو تعصب کا خطرناک زہر سرایت کر گیا ہے، اور وہ ہندستان کو ترقی کرتے دیکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان تقریباً پانچ چھ کروڑ پاکستانیوں میں سب سے بڑا بے وقوف تو خود ہمارا منسٹر ذوالفقار علی

میں ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں کرتا، اور چین اور امریکا سے ہتھیاروں کی بھیک مانگ مانگ کر ہیں مستقبل قریب میں پاکستان کی کھوئی ہوئی فوجی طاقت کو پھر سے پہلے کہ سیار پر لے آؤں گا، اور وقت آن پڑے تو ہندستان سے پھر سے جنگی ٹکر لوں گا۔ بھٹو کو ہم دیوانا، پاگل، نجوں اور نرالے وقوف نہیں تو اور کیا کہیں۔ ؟ ہمارے اپنے محدود علم کی مدتک نیچے ہم دونوں ملکوں کا سوازنا جدید مقابلہ کیے دیتے ہیں۔

ہندستان کا رقبہ پاکستان سے دگنے سے بھی زیادہ ہے۔ ہندستان کی آبادی (۵۶) کروڑ ہے، اور پاکستان کی آبادی تقریباً ۵ یا ۶ کروڑ ہے، یعنی ہندستان کی آبادی پاکستان سے (۵) کروڑ زیادہ ہے۔ ہندستان میں سترا بڑے اسٹیٹس اور چھ یونین ٹیرٹریز ہیں، اس کے برعکس پاکستان میں صرف پنجاب (یعنی آدھا پنجاب، اس لیے کہ آدھا مشرقی پنجاب ہندستان میں ہے) صوبے سرحد۔ صوبے سندھ اور صوبے بلوچستان، یعنی صرف چار صوبے ہیں۔ صوبے سرحد یعنی فرنٹیر آج نہیں تو کل مشرقی پاکستان کی طرح علیحدہ ہو کر رہے گا، اور صوبے بلوچستان کا بھی ایک ایک دن یہی حشر ہوگا!

اگر یہ دونوں صوبے اتفاق سے الگ ہو گئے تو اب وہ گئے مغربی پاکستان اور سندھ، یعنی مستقبل قریب میں نہ سہی تو مستقبل بعید میں پاکستان صرف ان دو صوبوں پر مشتمل ہوگا۔ کل ہم نہ رہینگے، مگر ہماری یہ سو فیصد صحیح پیشین گوئی ایک غائب کی کامیاب تعبیر ثابت ہو کر رہے گی، اور "ہندستانی ادب" کے یہ پہلے صفحے ساری دنیا کو اس بات کی گواہی دیتے رہینگے کہ ایک صاحب قلم اور ادیب جی۔ ایم۔ خان، ایم۔ اے (دھمایا) ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے عالا دماغ نے ۱۹۴۷ء میں قاید اعظم محمد علی جناح، بانی اور پہلا گورنر جنرل پاکستان کو جس طرح سیاسی بے وقوف قرار دیا تھا، بلکل اسی طرح ۱۹۷۳ء میں اپنے جادو اثر اور معجز نما قلم سے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ آگے چل کر صوبے سرحد یا پختونستان اور صوبے بلوچستان پاکستان سے الگ ہو کر آزاد اور خدمختار صوبے بن جائینگے، جیسے دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان الگ ہو کر ایک آزاد اور خدمختار ملک "بنگلا دیش" بن گیا تھا۔ کیا جواب ہے اس بارے میں پرائم منسٹر بھٹو کا، آیا وہ اس حقیقت سے اب بھی انکار کر سکتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ یہ بے وقوف ایک حقیقت سے آج تک بھی انکار کر رہا ہے، اور ایک آزاد ملک بنگلا دیش کو آج بھی پاکستان کا ایک صوبہ مشرقی پاکستان ہی کہتا ہے، مگر اس کا یہ ضد اور ہٹ بہت جلد ہی ختم ہو جائیگی، اس لیے کہ اس نے حال ہی میں پاکستان کی نیشنل اسمبلی سے بنگلا دیش کو ایک آزاد ملک تسلیم کرنے کی تحریک منوائی ہے۔ اس تحریک کے ذریعے نیشنل اسمبلی نے پرائم منسٹر بھٹو کو [illegible] سمجھ بنگلا دیش کو ایک آزاد اور خدمختار ملک تسلیم کر سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں بھٹو بنگلا دیش کو تسلیم کرے گا، اس لیے کہ اس کا وزیر خارجہ مسٹر چراغ علی سے اس مہینے کے پہلے ہفتے بیجنگ گیا تھا اور چین کے پرائم منسٹر چواین لائی سے اس موضوع پر مشورا کر کے واپس آیا ہے۔ یہ مشورا اس لیے ضروری اور لازمی ہے کہ بھٹو کی تحریک پر چین نے یونائیٹڈ نیشنز سیکیورٹی کمیٹی کونسل میں، پچھلے سال، بنگلا دیش کو شرکت کے لیے کو VETO کر دیا تھا۔ VETO کے بعد وہ تحریک بلکل ہی کالعدم ہو جاتی ہے۔ چین کو اس سے کیا دلچسپی ہے، چواین لائی وضاحت دیں گے، اور بھٹو بنگلا دیش کو ایک آزاد ملک تسلیم کرے گا، اس کے بعد پھر سے U.N.O میں بنگلا دیش کی شرکت کا مسائلہ پیش ہوگا، وہاں پاکستان اور چین اور دوسرے تمام ملک بنگلا دیش کی U.N.O میں شرکت سے اتفاق کرینگے اور بنگلا دیش دوسرے (۱۳۲) ملکوں کی طرح U.N.O میں اپنی سیٹ SEAT حاصل کرے گا!

بھٹو "بھگو" ہے، جس کے خیالات ہمیشا ہی متزلزل رہتے ہیں، اس لیے وہ کبھی بھی اپنی رائے پر قایم نہیں رہتا۔ بھٹو کے متعلق یہ صرف ہماری اپنی رائے نہیں ہے، بلکے دوسروں کے خیالات بھی اس کے بارے میں یہی ہیں اس کے ثبوت میں ہم نیچے دوسروں کے خیالات بھی پیش کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ایک انگریزی ہفتہ وار "ریڈیئنس" نئی دلی کے ایڈیٹر نے اپنے اخبار کی ایک حالیا اشاعت میں بھٹو کے بارے میں یوں نما فرسائی کی ہے۔

"جب بھٹو پاکستان کے صدر تھے انہوں نے برصغیر ہندستان اور پاکستان کی صورت حال کا جایزا لیتے ہوئے کہا تھا کہ "برصغیر میں لڑائی ایک ہزار سال پرانی ہے، اس کو ختم کرنا بہت دشوار اور پیچیدا ہے۔" اس بیان کو ہندستان کے بعض حلقوں نے بنیادی طور پر غلط اور تاریخی حقایق کے سراسر خلاف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ صدر بھٹو نے تاریخی حقایق کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے ممکن ہے کہ مسلمانان ہند کو بھی نقصان پہنچے۔" ایم۔ یوسف صدیقی نے اپنے انگریزی ہفتہ وار اخبار "ریڈیئنس" میں صدر بھٹو کے اس بیان پر تبصرا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "صدر بھٹو پاکستان کو ان مسلم سلطنتوں کا وارث کہتے ہیں، جنہوں نے ایک ہزار سال تک حکمرانی کی ہے۔ انہوں نے اپنے عمامت پیدا کرنے والے اور اشتعال انگیز بیانات کا رخ مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف موڑ دیا ہے۔ صدر بھٹو کے خیالات کی یہ تبدیلی ایک ہزار سالا جنگ کرنے والی بات کی بہ نسبت زیادا خطرناک ہے۔" پاکستانی تجاوزات کی موجودا روش پر تنقید کرتے ہوئے ایڈیٹر موصوف نے لکھا ہے کہ "یہ بات اس سے باہر اور ناقابل فہم ہے کہ صدر بھٹو کو اس حقیقت کا علم نہ ہو کہ ان کا اس قسم کا بیان ہندستان میں فرقا وارانا اتحاد، میل ملاپ اور رواداری چارے کی فضا کو زبردست نقصان پہنچائے گا۔ صدر بھٹو کے سالوں کو صوبہ سرحد [illegible]

میں خطرناک بنادیا ہے، وہ ہندستان پر ایٹمی حملہ آوروں کے بار بار حملے کا موجب ہے" اس کے بعد امریکا کے مشہور اخبار "واشنگٹن پوسٹ" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "جو شخص بھی شمال کے پہاڑوں سے دلی کے میدانوں پر کئے گئے حملوں کو فراموش کرتا ہے، وہ ایسا اپنی نسبت داری پر کرتا ہے" "ریڈ نیشن" کے مطابق صدر بھٹو نے یقین اپنے عوام اور اپنی فوجوں کے حوصلے بڑانے کے لیے ایسا کہا ہے، جو بنگلہ دیش میں ہزیمت اٹھانے کے بعد شکست خوردگی کے احساس میں مبتلا ہیں۔

اخبار نگار نے اپنے مضمون کے اختتام پر یہ سوال کیا ہے کہ "کیا پورے پاکستان میں کوئی بھی شخص ایسا موجود نہیں ہے جو ہندستان کے چھ کروڑ چودہ لاکھ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کسی خیال کا اظہار کر سکے"۔

جمعیۃ العلماء ہند کے ترجمان، روزنامے "الجمعیۃ" کی ایک حالیہ اشاعت میں صدر بھٹو کے اسی بیان پر تنقید کرتے ہوئے مولانا محمد عثمان فارقلیط نے صدر بھٹو کو ماضی کے اوراق الٹنے کی دعوت دیتے ہوئے مستند تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا ہے، تاکہ پاکستان کے صدر مملکت کو یہ علم ہو کہ آٹھ کی اصطلاح میں ایک ہزار سال پہلے برصغیر میں کبھی تصادم کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مولانا فارقلیط صدر بھٹو کے بیان کو تاریخی حقائق کے خلاف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "برصغیر کی تاریخ گواہ ہے اور یہاں کے راجا، نواب، اور بادشاہ بھی گواہ ہیں کہ ایک ہزار سال پہلے پرانے ہندستان میں ہندو مسلمان کے مابین کبھی تصادم نہیں ہوا۔ یہاں دشمن کی یاد سوم کبھی نہیں ملی۔ آریا قوم وسط ایشیا سے سفر کرتے ہوئے ہندستان وارد ہوئی اور اس کو اپنا وطن بنایا۔ ہزاروں سال کے بعد مسلمان بھی آئے اور وہ اسی ملک کے ہو رہے۔ دونوں طرف سے مشترکہ طور پر مسلمانوں کو فوج میں ہندوؤں کی فوج میں مسلم افسر ہیں ہوئے، اور بڑے بڑے فوجی عہدوں پر فائز رہے۔ اگر یہاں کسی وقت بھی ہندو مسلم تصادم ہوتا تو مسلمانوں کی فوج میں ہندو اور ہندوؤں کی فوج میں مسلمان نظر نہ آتے۔ اس کے بعد انگریز یہاں آکر اپنی نیو جمائی اور ہندو مسلمانوں میں نفرت ڈال کر اپنی حکومتی قیادت کو مضبوط کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انگریز کا جادو آج بھی (۲۶) سال کے بعد سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ صدر بھٹو جب بولتے ہیں تو بہت دور نکل جاتے ہیں، اور ان کی دوراندیشی اصابت رائے میلوں پیچھے رہ جاتی ہے۔ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ برصغیر میں محاذ آرائی ایک ہزار سال پرانی ہے، اور یہ بھی غلط ہے کہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں، اور اسے ختم کرنا بہت دشوار ہے، یہ سراسر غلط ہے، اور حقیقی واقعات کے خلاف بھی ہے"۔

مولانا فارقلیط برصغیر کی موجودہ سیاسی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہے کہ اس برصغیر میں محاذ آرائی (۲۶) سال پرانا ہے، اور برصغیر کا معاہدہ اس میں ہے کہ (۲۶) سال کی محاذ آرائی ختم ہو، شملا کانفرنس نے ایک تہائی محاذ آرائی ختم کردی ہے، اور آئندہ ہونے والے مذاکرات میں باقی دو تہائی محاذ آرائی بھی ختم ہو سکتی ہے، بشرطیکہ بھٹو اس مسائل کو دل سے سوچیں"!

اس کے بعد ہم ہندستان کے سب سے بڑے انگریزی اخبار STATESMAN دلی کی ۱۳ جولائی ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں دسوام VISWAM کے سوکا آرا مضمون POLITICAL COMMENTARY سے ہمارے خیالات کی تائید اس کے ایک مختصر سے مضمون کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، دسوام لکھتے ہیں —

"صدر بھٹو نے اپنی تقریروں میں ایک سے زیادہ مرتبہ کھلے طور پر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس کو ہندستان سے اس لیے نفرت ہے کہ وہ ہندستان کو ترقی کرتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس کے باوجود اپریل ۱۹۷۳ء کے میگزین FOREIGN AFFAIRS میں اس نے اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے کہ ہندستان پر حملہ ایک بہانا ہے، اس لیے وہ ہندستان سے بہتر اور دوستانہ تعلقات رکھنے کا متمنی ہے۔ آگے چل کر اس میگزین کے اسی بیان میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد سے اب تک پاکستان اور ہندستان میں جو حالت تعطل ہے، اس کی تمام تر ذمہ داری ہندستان پر ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندستان، پاکستان کو تباہ اور برباد کر دینا چاہتا ہے۔ اس نے اسی مضمون میں کھلے طور پر لکھا ہے کہ ہندستان سے محفوظ رہنے کی واحد صورت یہ ہے کہ پاکستان بڑے ملکوں سے ہتھیار حاصل کرے گا، تاکہ آئندہ جنگ کی شکل میں، ہندستان کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔ یہ خیال بھٹو نے صرف اس میگزین ہی میں نہیں ظاہر کیا تھا، بلکہ پچھلے ہفتے اسلام آباد میں بعض امریکن رپورٹر اخباری نمائندوں سے بھی اس نے صاف طور پر کہا کہ ہندستان سے برابری حاصل کرنے کے لیے پاکستان کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ امریکا اور چین سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں جدید ترین

آلات حرب حاصل کرے، اور وقت آن پڑے، تو ہندستان سے ہماری کی ٹکر لے۔ اپنے اسی بیان کا تکرار رکھتے ہوئے صدر بھٹو نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم ہندستان کی سیاسی برتری اور لیڈرشپ کو ہرگز ہرگز گوارا نہیں کرتے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم ہندستان کو پاکستان سے برتر اور بڑا ملک نہیں تسلیم کرتے! اسی بیان میں اس نے مزید یہ بھی کہا ہے کہ ہم ہندستان کے ساتھ دوستانا اور برابری کا تعلقات قایم کرنا چاہتے ہیں، نہ کہ ہندستان کی برتری اور بزرگی کو تسلیم کرتا ہوا کوئی سیاسی سمجھوتا کریں، اس لیے ایسی کمزور شکل میں ہمارے لیے یہ کیسے اور کیونکر ممکن ہے کہ پاکستان اپنی کمزوریوں کو تسلیم کرتے ہوئے ہندستان کا مرضی کے مطابق ایک حقیر اور ذلیل سمجھوتے پر آمادہ ہو جائے"!

پرائیم منسٹر بھٹو اپنی متعدد تقریروں اور پارسی بیانات میں یہ کہتا چلا آیا ہے کہ وہ ہندستان کی ترقی کو ایک نظر دیکھنا نہیں چاہتا" اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہندستان کو ایک بڑا اور برتر ملک تسلیم کرنے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہے۔ یہ اس کا پرلے درجے کا غیر دانا اور پاگل پن کا بیان ہے، اس لیے کہ ہندستان ہر حیثیت اور صحت سے پاکستان سے بڑا اور برتر ملک ہے۔ ہم بچے ہماری اپنی محدود معلومات کی حد تک ہندستان اور پاکستان کا ہر جہتی موازنہ اور مقابلہ کیے دیتے ہیں، اس سے آپ حضرات خود ہی صحیح نتیجے پر پہنچیں گے کہ بھٹو یا "بھگو" حقیقت میں سیاست داں نہیں ہے، بلکہ وہ نپٹ بے وقوف اور جاہل مطلق ہے، جو ایک حقیقت کی پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے!

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہندستان، پاکستان سے رقبے میں دگنے سے بھی زیادہ بڑا ملک ہے۔ ہندستان میں سترہ بڑے اسٹیٹس اور چودہ یونین ٹرے ٹریس ہیں، اور پاکستان میں صرف چار صوبے، سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد یا پختونستان اور آزاد پنجاب یا مغربی پنجاب ہے، اس لیے کہ پورے پنجاب کا آدھا پنجاب یعنی مشرقی پنجاب ہندستان میں ہے۔ ہندستان کی آبادی (۵۶) کروڑ ہے اور پاکستان کی آبادی پانچ چھ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے، یعنی ہندستان کی آبادی پاکستان سے (۵۰) کروڑ زیادہ ہے، اور یہ آبادی امریکا اور روس کی مشترکہ آبادی سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ صرف اس ایک واقعے سے پاگل اور فجول اور نرے بے وقوف اور جاہل مطلق بھٹو یا "بھگو" بھی بخوبی اندازا لگا لے کہ ہندستان کتنا بڑا ملک ہے، یعنی ساری دنیا میں چین کے بعد (آبادی کے لحاظ سے) آبادی کے اعتبار سے ہندستان کا دوسرا نمبر ہے۔ یہ آدھ بھگو بھی جانتا ہے کہ ہندستان میں لوہے اور کوئلے کی سینکڑوں ہی کانیں موجود ہیں، جن سے جنگی ہتیار بنانے کے ایک درجن سے زیادہ کارخانے موجود ہیں، اور اس کے برعکس پاکستان میں کوئلے کی صرف ایک معمولی کان ہے، جس کا کوئلہ سردیوں کے زمانے میں پاکستانیوں کے آگ تاپنے کے کام آتا ہے۔ لوہے اور کوئلے کی کانیں نہ ہونے کے سبب پاکستان میں ہتیار بنانے کا ایک بھی کارخانہ موجود نہیں ہے۔ انہیں کانوں کی بدولت ہندستان ریل کی پٹریاں، انجن اور ہر قسم کے ڈبے فدھی تیار کرتا ہے، اور دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت بھی کرتا ہے۔ اس کے برخلاف پاکستان اپنی مثل کی تمام ضروریات باہر کے ملکوں سے خرید کر پورا کرتا ہے۔ ہندستان میں ہوائی جہاز بنانے کے دو بڑے زبردست کارخانے ہیں۔ ایک بنگلور میں اور دوسرا کانپور میں ہے، اور اس سلسلے میں SPARE PARTS بنانے کے ایک درجن سے زیادہ بڑے کارخانے ملک کے مختلف بڑے شہروں میں کام کر رہے ہیں۔ ہندستان میں سمندری یا بحری جہاز بنانے کے دو زبردست اور بہت بڑے کارخانے ہیں۔ ایک بمبئی میں، دوسرا وشکا پٹنم میں ہے۔ یہ کارخانے نہ صرف سو طیبی یا مسافروں کے جہاز بناتے ہیں، بلکہ جنگی جہاز بھی تیار کرتے ہیں، چنانچہ حالیہ ۱۹۷۱ء کی ہندستان اور پاکستان کی بحری اور ہوائی جنگ میں، انہیں کارخانوں کے بنے ہوئے جنگی جہازوں نے پاکستان کی ناک میں دم کر رکھا تھا، مگر بھیک مانگی آبدوز یا SUBMARINE "غازی" ڈبو دی تھی، جو آج تک بھی سمندر کی تہہ میں آرام کی نیند سو رہی ہے۔ ہندستان کے دشمن "بھگو" کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہندستان کا بحری وشکا پٹنم کا کارخانہ، تیل لے جانے کے بھاری بھاری ٹینکرس TANKERS بھی بنا رہا ہے، اور دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت کر کے کروڑوں روپے کا فارن ایکسچینج FOREIGN EXCHANGE بھی حاصل کر رہا ہے۔ ہم خدا بھٹو سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان یا کراچی کے سمندر میں آیا جہاز بنانے کا ایک بھی کارخانہ موجود ہے؟

ہندستان کے ازلی اور پیدائشی دشمن بھٹو کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندستان میں ایٹم ATOM بنانے کے دو بڑے کارخانے موجود ہیں۔ ایک بمبئی میں اور دوسرا تارا پور میں ہے۔ ان سے اٹیمک انرجی بنائی جا رہی ہے، جن پر سالانا کروڑوں روپے کا خرچ بیٹھتا ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر یہی کارخانے ایٹم بم ATOM BOMB بھی تیار کر لیں! پاکستان کے ATOM کے کارخانے بنانے کا خواب کبھی نہیں دیکھ سکتا، اس لیے کہ اس کا الو چوپٹ ہو گیا ہے، اور حواس سراسیمہ خدارے میں ہے۔

"بھگو پرائیم منسٹر آف پاکستان۔ تجھکو شاید اس بات کا علم نہیں ہے کہ ہندستان میں اسپیس SPACE پر بھی ریسرچ

شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۲ ہ ش ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۳ ع

اور عملی طور پر کام ہو رہا ہے، چنانچہ کیرالا اسٹیٹ کے ایک ساحلی مقام تھمبا THUMBA پر تقریباً ایک دہائی سے ایک اسپیس کا چھوٹا سا اسٹیشن موجود ہے، جہاں سے موقع موقع سے راکشن ROCKETS داغے جاتے ہیں، تاکہ ریسرچ کے سلسلے میں ان سے اسپیس کے حالات معلوم کرنے میں مدد لیں۔ ہندستان کی ترقی سے جلنے والے بھٹو کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہندستان مستقبل قریب میں نہ سہی، بلکہ مستقبل بعید میں اسپیس SPACE کو دنیا میں بھی اپنا مقام حاصل کرلے گا!

ہندستان کے دشمن "بھٹو" کو شاید اس بات کا علم نہیں ہے کہ ہندستان میں موٹر۔ موٹر سیکل۔ اسکوٹر اور سیکل بنانے کے سینکڑوں ہی کارخانے موجود ہیں۔ ہندستان کی بنی ہوئی سیکلیں، ایشیا، افریقا، یورپ اور امریکا کے کئی ملکوں میں جاتی ہیں، جن سے سالانا کروڑوں روپے کا فارین ایکسچینج حاصل ہوتا ہے! اس کے برعکس پاکستان میں اس قسم کا ایک بھی کارخانا نہیں ہے۔

فلمی صنعت میں امریکا کے بعد دنیا میں ہندستان کا نمبر دوسرا ہے۔ ہندستان ہر سال سینکڑوں فلمیں تیار ہوتی ہیں، جن کی مانگ خدا نے ملک ہندستان کے علاوا بنگلادیش۔ افغانستان۔ ایران۔ عراق۔ شام۔ مصر۔ عربی ممالک۔ سیلون۔ ملیشا۔ انڈونیشیا۔ برما۔ ہانگ کانگ۔ سنگاپور وغیرا وغیرا کے علاوا خدا بھٹو کے دیس پاکستان میں بھی بہت زیادا ہے۔ جنگ سے پہلے ہندستان کی سینکڑوں ہی فلمیں پاکستان جاتی تھیں۔ پاکستان کے بڑے شہر لاہور میں غالباً پنجابی زبان میں، سال میں دو چار فلمیں بنتی ہیں، اور ہم نے سنا تھا کہ کراچی میں بھی سال میں چند ایک فلمیں بنتی تھیں، جو سب کی سب ناکام رہیں، اس لیے پاکستان ہندستان کی فلموں کو پسند کرتے تھے، جن کی مانگ سارے پاکستان میں تھی۔ ان حالات اور حقائق کی روشنی میں کیا جواب ہے، اس بارے میں بھٹو کا۔ آیا ہندستان ایک مانا ہوا بڑا ملک ہے یا نہیں۔؟

ہندستان کی ترقی یافتا سینکڑوں صنعتوں کو ہم ایک ایک کرکے کہاں تک گنائیں، ساری دنیا اس کو جانتی اور مانتی ہے، اور سچ پوچھو تو خود بھٹو بھی بہتر طریقے پر جانتا ہے، لیکن چونکے اس کو ہندستان سے ازلی کد اور بغض وحسد اور پیدائشی اور ازلی دشمنی ہے، اس لیے وہ ہندستان کو دنیا کا ایک ترقی یافتا ملک تسلیم کرنا نہیں چاہتا، اور اس نقطۂ نظر سے وہ ہندستان کی بڑائی اور برتری کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے!

یہی وجہ ہے کہ ہر وقت اپنی تقریروں اور اخبار کے بیانات میں ہندستان کے خلاف زہرناک آمیز بیانات دیتا رہتا ہے، اور کھلے طور پر ترقی یافتا اور بزرگ و برتر ملک ہندستان کی مذمت اور مخالفت کرتا ہے، نیز اس کے خلاف اپنی جبلی اور فطری حقارت کا وہ آتش فشاں لاوا اپنے خطرناک اور زہریلے دل و دماغ سے اگلتا رہتا ہے، جس سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندستان کو جھلس کر رکھ دینا چاہتا ہے، تاکہ ہندستان آیندا ایسی بے نظیر، لاجواب، اور بے مثال ترقی نہ کرسکے! بھٹو کی اس مخالفت کے باوجود، ہندستان دن دونی رات چوگنی ترقی کے منازل طے کرتا رہے گا، اس لیے کہ ہندستان میں معدنی۔ زرعی، اور جنگلاتی وغیرا وسایل ضرورت سے زیادا ہیں، جن سے بھٹو کا دیس پاکستان بالکل ہی محروم ہے!

پرائیم منسٹر بھٹو کو چاہیے کہ وہ ہندستان سے متعلق معاندانا مذبے کو اپنے دل و دماغ سے محو کردے، اور ہر طرح سے ہندستان کے ساتھ دوستی کے نیک جذبے کا اظہار کرے، تاکہ دونوں ملک ہندستان اور پاکستان میں پہلے سے دوستانا روابط قایم ہو جائیں، دونوں ملکوں میں سفارت خانے بھی قایم ہوں، اور ضروری معاہدوں کے تحت دونوں ملکوں کے درمیان پھر سے بری، بحری اور ہوائی سفر شروع ہو جائیں۔ مسافروں کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کا آسان ترین سہولتیں مہیا کی جائیں، اور دونوں ملکوں میں حب سابق مسافروں کے آنے جانے میں پہلے کی طرح سہولتیں فراہم کی جائیں، اور ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے درمیان ہر طرح سے تجارتی سہولتیں بھی بہم پہنچائی جائیں۔ پاکستانی پیداوار کی ہم ایک اونٹ سی مثال پیش کرتے ہیں کہ بنگلادیش کے آزاد ہو جانے سے پاکستان پان سے محروم ہوگیا ہے۔ پاکستان کو پان بنگلادیش ہی سے جایا کرتا تھا۔ اسٹیٹسمین نئی دلی کے نامہ نگار کا بیان ہے کہ راجستان کی سرحدوں سے روزانا لاکھوں روپے کا پان چور دروازوں سے پاکستان میں منتقل ہو رہا ہے، اس کے باوجود پاکستان میں پان کی کمی محسوس کی جارہی ہے، اور ایک روپے میں ایک پان بک رہا ہے۔ اگر بھٹو جلد سے جلد ہندستان کے ساتھ تجارتی معاہدے طے کرلے تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس کے نتیجے کے طور پر پاکستان میں بھی ایک روپے میں پچیس پچاس پان بکنے شروع ہونگے! ہم سمجھتے ہیں کہ ہر حیثیت سے اور ہر صورت سے بھٹو کو ہندستان کی برتری کو ایک نہ ایک دن تسلیم کرنا ہی پڑے گا!

سکیولر ہندستان پایندا باد!
ہندستان کی سکیولر ہستی پایندا باد!

جی - آرنلڈ فرنانڈز ترجمہ جی - ام - خان ام - اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

شہزادی کا رومان

رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA

(چوتھی قسط)

باب (۱۳)

ادھر افضل خان اپنے گھر میں ایک قسم کے کرب و بلا میں مبتلا تھا، تو ادھر مس کرک پیٹرک اپنے مکان پہنچتے ہی سخت پریشانی میں مبتلا ہوگئی تھی کہ اس نے افضل خان سے اس قسم کی سخت کلامی کیوں کی، اور اس کو غیر ضروری طور پر دکھ کیوں پہنچایا - رات بھر سوئی نہیں، اور بار بار کافی پیتی رہی، اور کتابوں کے مطالعے میں ساری رات گذار دی - صبح سویرے ضروریات سے فارغ ہوکر ناشتا کیا اور کافی کا ڈبل کپ پی کر اپنی گجی میں بیٹھکر نواب آسمان جاہ بہادر کو دیوڑی پر گئی - ملازم کے اطلاع کرتے ہی نواب صاحب نے اس کو اپنے دیوان خانے میں بلوا لیا،

اور جاتے ہی اس نے انگریزی طریقے پر گڈ مارننگ نواب صاحب کہا - اس پر نواب صاحب نے اٹھ کر کرک پیٹرک سے مصافحہ کرتے ہوئے گڈ مارننگ ڈاکٹر کرک پیٹرک کہا، اور برابر کے صوفے پر بیٹھنے کا اشارا کیا - دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے، اور خیر خیریت کے بعد کرک پیٹرک رحیم النسا کی بھی خیریت معلوم کی، جس پر آسمان جاہ نے کہا، ڈاکٹر آپ کے لاجواب علاج کے بعد سے میری لڑکی کی صحت اب تو بلکل ہی اچھی ہے، وہ بھلی چنگی بھی ہے، اور غذا وغیرا بھی حسب معمول کھا رہی ہے -

ڈاکٹر ڈنا کرک پیٹرک، آسمان جاہ نے کہا، آپ کا حقیقی شکریا ادا کرنے کے لیے مجھے جو آپ نے زہر خورانی کے جان لیوا اثرات کو زایل کرتے ہوئے میری عزیز از جان ایک سلوتی لڑکی کی جان بچائی - میں ہر وقت اللہ پاک سے آپ کی درازی صحت اور خوشی حال کے لیے پر زور طریقے

یہ عاجزانہ انداز میں دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ تو لیڈی ڈاکٹر کرک پیٹرک کو ساری دنیا کی نعمتوں سے مالا مال کردے اور صدوسی سال باصحت عمر عطا فرما! ڈاکٹر ایک خاص دعوت کے موقع پر میں اپنی لڑکی کے ساتھ آپ کی بھی گلپوشی کی رسم ادا کرنے والا ہوں، جس میں شہر کے بڑے بڑے امرا، جاگیردار، نواب، اور عالا سے عالا عہدے داران حیدرآباد بھی شریک رہینگے، اور اس وقت میں آپ کو ایک لاکھ روپے کی قیمت والی مالا سے عالا اور بڑیا قسم کے موتیوں کی مالا خود اپنے ہاتوں سے پہناؤں گا، اور ایک لاکھ روپے کے برابر اشرفیوں کی کشتی اپنے دونوں ہاتوں سے، سب مہمانوں کے سامنے پیش کردوں گا، اور یہ کہوں گا، کہ لیڈی ڈاکٹر مس کرک پیٹرک رحیم النسا کے باپ آسمان جاہ کی طرف سے یہ حقیر نذرانہ قبول کرکے جی کو خوش اور مسرت کا موقع عطا کرو۔ یہ سن کر کرک پیٹرک نے جواب دیا، نواب صاحب! مجھکو حیدرآباد آئے ہوئے دو سال کا عرصہ ہوا، اور اتفاق سے روز اول ہی میرا اس دیوڑھی سے اور آپ کی گرامی قدر ذات سے راست تعلق ہوگیا، اور اس وقت سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ رہا یہ کہ میں نے آپ کی صاحبزادی رحیم النسا کی جان بچائی ہے، یہ میرا انسانی، اخلاقی، اور پیشا ورانا فرض ہے، یہ سچ ہے کہ مریض کی خطرناک حالت دیکھ کر میں خود بھی گھبرا گئی تھی، اس لیے کہ جان لیوا افیون کا زہر اس معصوم اور حسین ترین پھول جیسی لڑکی کے سارے جسم میں سرایت کرگیا تھا۔ میں آج آپ سے سچ سچ کہتی ہوں کہ خدا مجکو بھی میری دوست اور میری سہیلی رحیم النسا کے بچنے کی بہت کم توقع تھی، اگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور چوبیس گھنٹے جاگتے جاگتے میں مسلسل چار دن اور چار راتیں گذار دیں، اور کافی کا کپ پر کپ پی کر نیند کا ناس کردیا۔ اس میں شک نہیں، خدا میری صحت بھی اس عرصے میں گرگئی تھی، لیکن میں نے اپنی میری حالت کی طرف مطلق توجہ نہیں دی، اور جب آپ کی صاحبزادی کے جسم سے زہر کے اثرات زایل ہوگئے اور وہ بات چیت کرنے اور اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوگئی تو تب جاکر ہی میں نے آرام لیا، اور یہی دو روز تک ایک الگ مسہری پر رات کے وقت سوتی اور دن بھر صاحبزادی سے باتیں کرتے گذار دیا، اور جب صاحبزادی سو فیصد خطرے سے باہر ہوگئی تو میں آپ کی اجازت سے اپنے گھر چلی گئی اور دو تین روز تک میری حالت ضرورت سے زیادہ خراب رہی، آیا یہ سوال کہ حیدرآباد کے سب سے بڑے امیر کبیر، حضور نظام نواب میر محبوب علی خان بہادر کے سگے بہنوئی اور امیر باریگاہ آسمان جاہی، مجکو ایک پرتکلف دعوت کے موقع پر موتیوں کی مالا پہنانا چاہتے ہیں، اور ایک لاکھ روپے کی قیمت کی اشرفیاں بھی دینا چاہتے ہیں تو یہ حضور والا کی بندا نوازی اور ذرا نوازی کی ادنا مثال ہے، جس سے شہر حیدرآباد کا بچا بچا تک واقف ہے۔ میں دلی مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ اس دعوت کو قبول کروں گی، اور میری دوست رحیم النسا کے ساتھ گلپوشی کی تقریب میں بھی موجود رہوں گی، اور اسکے برابر پھول کے ہار پہنوں گی۔ اس طویل گفتگو کے بعد مس کرک پیٹرک نے کہا کہ اگر آپ کی اجازت ہے تو میں آپ کی صاحبزادی سے مل کر اس کی کیفیت اور حالت معلوم کرتی ہوں۔ اس پر آسمان جاہ نے کہا، خوشی سے ڈاکٹر آپ جایئے اور اپنی سہیلی سے ضرور ملیے اور دیکھیے کہ اب وہ کس حالت میں ہے۔ یہ سن کر کرک پیٹرک نے آسمان جاہ کا شکریہ ادا کیا اور بات ملانے کے بعد رحیم النسا کے کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت رحیم النسا ایک انگریزی ناول کا مطالعہ کر رہی تھی، جیسے اس نے مس کرک پیٹرک کو دیکھا، ہیلو ڈاکٹر کہتے ہوئے اپنے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ کرک پیٹرک نے خلوص اور محبت کے انداز میں صاحبزادی کی پیشانی کو آپ بار چوما، اس کے بعد ڈاکٹر نے رحیم النسا کو پلنگ پر لیٹنے کے لیے کہا، چنانچہ اس کے پلنگ پر لیٹتے ہی ڈاکٹر کرک پیٹرک نے رحیم النسا کے سارے جسم کا تفصیلی معائنہ کیا، اور کہا تم اب تو تم میں کسی بھی قسم کی کمزوری نہیں ہے، جس کا جواب رحیم النسا نے اثبات میں دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ دیکھو ڈاکٹر کرک پیٹرک یہ تو اچھی خاصی اور بھلی چنگی ہوں۔ اور واقعی میرے جسم میں اب کسی قسم کی کمزوری نہیں ہے، پھر دونوں ہنستے ہوئے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

مجکو صحیح سویرے یہاں دیکھ کر تمہیں تعجب تو ضرور ہوا ہوگا صاحبزادی، ڈاکٹر کرک پیٹرک نے [illegible]

نہیں ڈاکٹر تعجب کی کوئی بات نہیں، تمہارے آنے سے مجکو تو بڑی خوشی ہوئی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ اگر آپ کو فرصت ہے تو روز روز ہماری دیوڑھی آیا کریں اور میرے یا سرکار ابا کے ساتھ بریک فاسٹ [illegible] فرمایا کریں

شکریہ، آپ کا میری اچھی صاحبزادی، کہتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر نے بیان کیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں ڈاکٹر ہوں میرا پیشہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں یہاں روز روز آکر نواب صاحب یا آپ کے ساتھ کھانا پکاؤں۔ دوسرے گھروں کو بھی جاتی ہوں، اور مریضوں کو دیکھا کرتی ہوں، اسی کے علاوہ میرے گھر پر بھی روزانہ بیسیوں مریض عورتیں آتی ہیں، ان کی دیکھ بھال بھی ضروری امر اپنے فرائض میں ہے۔ کم سے کم میرے ساتھ اس وقت کافی پی لو ڈاکٹر تو لبکو بڑی خفگی ہوگی، چنانچہ اس کے جواب میں کرک پیٹرک نے کہا، ہاں کافی پینے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ یہ سن کر رحیم النسا نے ڈیوڑھی کے ملازمین کو آواز دی، ارے کوئی ہے اس ملکار کو بھیجتے ہی دو تین عورتیں دوڑی دوڑی چلی آئیں، اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی ہوگئیں، اور کہنے لگیں، فرمایئے سرکار کیا حکم ہے۔ یہ سن کر رحیم النسا نے کہا، جاؤ میز خانے میں جاکر بڑے بیئرے سے کہدو کہ ہم دونوں کے لیے علاحدہ درجے کی نہایت ہی اچھی کافی تیار کرکے جلدی جلد روانا کرے۔ وہ عورتیں جو حکم سرکار کہتے ہوئے واپس چلی گئیں، اور ادھر رحیم النسا اور کرک پیٹرک آپس میں باتوں میں مصروف ہوگئے۔ رحیم النسا نے لیڈی ڈاکٹر سے دریافت کیا، ڈاکٹر کیا میں واقعی بری طرح سے بیمار ہوگئی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ میری حالت کسی قدر خطرناک حد تک پہنچ گئی تھی۔ کیا یہ سچ ہے ڈاکٹر۔ یہ سن کر کرک پیٹرک نے جواب دیا، نہیں تو کس نے کہا آپ سے، یہ سب کچھ غلط ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے، اور اب بھی کہتی ہوں کہ آپ بیمار ضرور ہوگئی تھیں، اور لبکو نواب صاحب نے فوراً بلوایا، چنانچہ میں اسی وقت آپ کی ڈیوڑھی میں آگئی اور جب تک آپ کے ہوش بجا نہیں ہوئے میں اپنے گھر نہیں گئی۔ میری پیاری صاحبزادی تم میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں امید توقع کرتی ہوں کہ تم میرے سوال کا بھی صحیح جواب دوگی۔

کیوں نہیں ڈاکٹر، رحیم النسا نے پورے اطمینان کے ساتھ کہا، میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی، کہو کیا معلوم کرنا چاہتی ہیں آپ سے بچ سے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تین عورتیں سروں پر تین کشتیاں لیے داخل ہوئیں اور قریب کے میز پر کشتیاں رکھ کر سرپوش ہٹا لیے۔ ان تین کشتیوں میں سے ایک میں کافی، دوسری میں دودھ اور کافی پینے کی پیالیاں تھیں، دوسری کشتی میں، کیک پیٹری، بسکٹ اور چلم کیک۔ وغیرہ اور تیسری کشتی میں مختلف قسم کا تازا اور خشک میوہ رکھا تھا۔ کشتیاں رکھ دینے کے بعد رحیم النسا نے ان عورتوں سے کہا کہ تم تینوں اب جاسکتی ہو، ہم اور ڈاکٹر صاحبہ کافی بنا لینگے، چنانچہ یہ سنتے ہی تینوں عورتیں جھک کر آداب بجا لاکر واپس چلی گئیں، اور صاحبزادی اور لیڈی ڈاکٹر دونوں چہل اور کیک پیٹری وغیرہ کھانے میں مصروف ہوگئے۔ پھر کیک کا ٹکڑا چباتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا، صاحبزادی بہتر تو یہ تھا کہ اگر میں آپ کے خانگی حالات کے بارے میں کچھ دریافت کروں تو آپ مجھ سے ناخوش تو نہ ہونگیں۔ خشک میوا چباتے ہوئے رحیم النسا نے جواب دیا، نہیں ڈاکٹر خفا ہونے کی کوئی بات نہیں، میں آپ سے وعدا کرتی ہوں کہ آپ جو بھی دریافت کرینگی میں سچ سچ بتا دوں گی۔ یہ سن کر لیڈی نے دو کپ کافی بنائی اور ایک کپ رحیم النسا کو دیا اور دوسرا کپ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے، رحیم النسا سے دریافت کیا، میں نے سنا ہے کہ افضل خان سے آپ محبت کرتی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے ۔ ؟ یہ سنتے ہی رحیم النسا کے سارے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی اور چہرے پر خشی اور مسرت کے آثار نمایاں ہوگئے، اور کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے رحیم النسا نے کہا۔ ہاں ڈاکٹر یہ بالکل سچ ہے، میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتی۔ اس کے بعد کافی کا گھونٹ پر گھونٹ لیتے ہوئے رحیم النسا نے نہایت ہی تفصیل کے ساتھ سارا قصہ کہہ سنایا کہ کس طرح سے اس نے افضل خان کو پہلی بار لنگر میں دیکھا تھا، اور پہلی ہی نظر میں اس کے عشق میں مبتلا ہوگئی تھی، اور کس طرح سے اس نے اپنی وہ نوٹ بک سے اس کا ذکر کیا، اور ان دونوں عورتوں نے اس کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا، وہ فراز علی عامل کے گھر گئیں، اور کس طرح سے اس نے اپنے زیورات وغیرہ ان ماماؤں کو دیے، تاکہ وہ فراز علی سے اس کے بھیانک خواب کی تعبیر معلوم کریں، اور کس طرح سے افضل خان نے اپنی ایک عریضہ ملازم کے ذریعے کشتیوں میں ملازمت کی خاطر سے کی شناسائی رعنا کی تھی اور ساتھ ہی تاکید یہ بھی کہلوایا تھا کہ میں یہ خاص شناسائی خود ہی کھاؤں، کسی دوسرے کو نہ دوں، اس لیے کہ یہ شناسائی ہم دونوں کی بڑی محبت میں رابطہ و میل ملاپ کا

ذریعا بنے گی -

یہ ساری داستان خامشی کے ساتھ سننے کے بعد ڈاکٹر کرک پیٹرک نے کہا، میری اچھی صاحبزادی، تم معصوم تو ضرور ہو، اور بڑی ہی بھولی بھالی بھی معلوم ہوتی ہو، کیا تم یہ باور کرتی ہو کہ افضل خان تمہیں اس حد تک محبت کرتا ہے، جیسا کہ ابھی ابھی تم نے مجھ سے کہہ سنایا! معصوم لڑکی تم یقین جانو کہ مرد بڑے ہی ناقابل اعتبار ہوا کرتے ہیں - یہ زبان سے وعدا کچھ کرتے ہیں، اور ان کا عمل بالکل ہی اپنے وعدے سے الگ ہوا کرتا ہے - میں نے آج تک بھی کسی سے نہیں سنا کہ ایک مرد نے بھی اپنا وعدا ایفا کیا ہو - خدا کی پیدا کی ہوئی تمام مخلوقوں میں، مرد بالکل ہی ناقابل بھروسا قرار دیا گیا ہے -

یہ سن کر انتظار یا انداز میں رحیم النسا نے کہا، نہیں ڈاکٹر افضل خان کے بارے میں ہرگز ہرگز ایسا نہ کہو، وہ شخص دوسرے مردوں سے بالکل ہی مختلف ہے، وہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرتا ہے، جس طرح سے میں خدا سے بے پناہ محبت کرتی ہوں - مجھکو یقین کامل ہے کہ ہم دونوں کی محبت تا مرگ قایم رہے گی، اور وہ کسی طرح بھی سچ سے منھ نہ موڑے گا - میں تو سمجھتی ہوں کہ افضل خان حج سے جلد سے جلد ملنے کے لیے بے چین اور بے قرار ہے، اور میں ادھر اسی کے فوٹو کو دیکھ کر اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں، سنو! کرک پیٹرک، میں اس وقت وہ فوٹو تمہیں بھی دکھاؤں گی، کہتے ہوئے اپنے کوچ کے تکیے کے نیچے سے ایک قریم کیا ہوا فوٹو نکالا اور اس کو چومنے کے بعد کرک پیٹرک کو دکھاتے ہوئے کہا، دیکھو ڈاکٹر کتنا حسین و جمیل اور خوبصورت نوجوان ہے افضل خان -

صاحبزادی، میں آپ سے صاف دلی کے ساتھ یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں نے آپ جیسی کسی اور نوجوان لڑکی کو اپنے عشق کی داستان کسی سے اتنے لمبے چوڑے سے کہتے نہیں سنا ہے، مگر آپ کی صاف گوئی نے مجھکو حیران اور پریشان کر دیا ہے، کہتے ہوئے کرک پیٹرک نے افضل خان کے فوٹو کی طرف نہایت ہی غور سے دیکھا -

یہ سن کر رحیم النسا نے پھر سے اسی دلیرانہ انداز میں لیڈی ڈاکٹر سے بیان کیا کہ سنو مس کرک پیٹرک افضل خان، جو اس وقت میرے لیے سوا ان روح سے کہ ہیں، ۳۱ کے خاکہ اور تصور میں، میں اپنے دن رات نہایت ہی بے چینی کے ساتھ گذار رہی ہوں، اور اللہ پاک سے دن رات، اور رات دن، بلا مبالغہ (۲۴) گھنٹے اسی بات کی دعا کرتی رہتی ہوں کہ اے پروردگار تو ہم دونوں بچھڑے ہوئے دو الگ جسموں کو جلد سے جلد ایک کر دے - ڈاکٹر میں نے افضل خان کو لنگر میں صرف ایک بار دیکھا تھا، اس کے بعد سے آج تک بھی اس سے میری ملاقات نہ ہو سکی، صرف اس کی تصویر کو دیکھ کر میں اپنی زندگی کے دن گذار رہی ہوں، اور میں مایوس نہیں ہوں، بلکہ مجھے یقین کامل ہے کہ ہم دونوں ایک نہ ایک دن ایک ہو کر رہینگے، اس لیے کہ خدا افضل خان کو بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے، جتنا کہ میں اس سے پیار کرتی ہوں، یہ کہتے ہوئے رحیم النسا نے پھر سے کرک پیٹرس کو مجبور کیا کہ وہ افضل خان کے فوٹو کو نہایت ہی غور و خوض سے دیکھے کہ آیا وہ حقیقت میں حسین و جمیل اور نہایت ہی خوبصورت اور دلفریب ہے یا نہیں!

افضل خان کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کرک پیٹرک خدا جانے کیا بات میں ابھی چلی جا رہی تھی، اس لیے کہ وہ اور افضل خان صرف دونوں بہتر طریقے پر جانتے تھے کہ ان دونوں میں کس حد تک عشق و محبت ہے - بے چاری رحیم النسا ایک پردا نشین معصوم شہزادی دنیا والوں کے عشق و عاشقی کے الجھاؤں سے کیسے اور کیونکر واقف ہو سکتی تھی - نہایت ہی مغموم اور ڈری، ہاں ٹھیک ہے صاحبزادی، آپ جو کچھ کہتی ہیں وہ سب سچ بجا ہے، کہتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر نے افضل خان کا فوٹو واپس کر دیا اور رحیم النسا نے اپنے دونوں ہاتوں میں تھامتے ہوئے خفگی اور مسرت کے انداز میں افضل خان کے فوٹو کو بار بار چومنا شروع کیا، اس کا اثر لیڈی ڈاکٹر پر کچھ الٹا ہی ہوا، اور وہ رحیم النسا کے اس جنون فعل کو بری طرح سے محسوس کر رہی تھی -

رحیم النسا نے پھر سے کرک پیٹرک سے سوال کیا، ڈاکٹر کرک پیٹرک ابھی ابھی آپ نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ آپ افضل خان کو بہتر طریقے پر جانتی اور پہچانتی ہیں، اور یہ کہ آپ حج سے بے پناہ محبت سے پیش آتی ہیں، ایسی صورت میں جب میں افضل خان سے محبت کرتی ہوں تو آپ بھی چاہیے کہ انہیں اچھی نگاہوں سے دیکھیں اور کسی قسم کا برا خیال یا قسم ان کے خلاف نہ پیدا کریں - کہ خدا نے آپ کو بھی

مس کرک پیٹرک کہتے ہوئے سوالیہ انداز میں رحیم النسا نے اس کی طرف بغور دیکھا۔ یہ سنتے ہی فوراً کرک پیٹرک نے جواب دیا، ہاں صاحبزادی آپ بالکل ٹھیک اور بجا کہتی ہیں، میں افضل خاں کو بہتر طریقے پر جانتی ہوں، اور آپ کی وجہ سے تو انہیں بہتر سے، بہتر نظروں سے دیکھتی ہوں۔ آپ یقین جانیے کہ ان کے بارے میں میرا کوئی بھی برا خیال نہیں ہے۔

اوہو! یہ بات ہے تو مس کرک پیٹرک آؤ، میرے قریب آکر میری پیشانی کو چوم لو اور بوسا دو، تاکہ تمہارے دل جذبات کا تمکو حقیقی ثبوت بھی مل جائے!

شہزادی کا یہ کہنا سنتے ہی اٹھ کر کرک پیٹرک نے رسمی طور پر رحیم النسا کی پیشانی کو ایک سے زیادہ مرتبا چوما، اور پھر سے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ اس کے بعد رحیم النسا نے ڈاکٹر سے کہا، میری اچھی کرک پیٹرک میں تمکو اپنا راز دار سمجھتے ہوئے مخلصانہ انداز میں ایک خاص بات کہنا چاہتی ہوں، آیا تم میری بات سنوگی؟ اس پر کرک پیٹرک نے دریافت کیجیے شہزادی آپ مجھ سے آخر وہ کونسی راز کی بات کہنا چاہتی ہیں؟ یہ سن کر رحیم النسا نے ایک خاص انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ مس کرک پیٹرک یہ تو ظاہر ہے کہ آپ تمکو اور افضل خاں کو بہتر طریقے پر جانتی ہیں، اور ایک دوسرے کے عشق و عاشقی کے معاملات بھی پورے طور پر واقف ہیں، اور ہم دونوں سے آپ کی بے تکلفانہ ملاقات بھی ہے، جس طرح آپ بار بار بلا تکلف میری ڈیوڑھی کو آیا کرتی ہیں، بلکل اسی طرح، میں نے سنا ہے کہ آپ افضل خان کے گھر بھی جایا کرتی ہیں، اس لیے کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ ہم دونوں میں خط کتابت اور ہوسکے تو ایک دوسرے کی ملاقات کے مواقع فراہم کرنے میں مدد و معاون اور مددگار بن سکیں، اور ہم دونوں کے درمیان راز دارانہ خطوط کے تبادلے میں بھی ہماری معاونت کریں۔

یہ عشق و محبت بھری داستان سن کر لیڈی ڈاکٹر نے رحیم النسا سے دریافت کیا، شہزادی آپ کا یہ کہنا ہے کہ افضل خان نے جب آپ کو مٹھائی کا ٹھا بھجوایا تھا تو اس وقت اس نے کچھ پیام بھی کہلوایا تھا۔ یہ سن کر رحیم النسا نے کہا، ہاں ڈاکٹر انہوں نے یہ کہلوایا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، اور مجھ پر دل و جان سے فدا ہیں، اور مرتے دم تک بھی صرف مجھ سے اور صرف مجھ ہی سے محبت کرینگے اور یہ کہ دنیا کی کسی حور سے حور اور حسین سے حسین تر عورت کا

طرف پلٹ کر تک نہ دیکھینگے! اہا! یہ بات ہے صاحبزادی کہ وہ آپ پر دل و جان سے فدا ہیں، تو آپ یقین جانیے کہ میں آپ کی دوستی اور محبت کی خاطر وہ سب کچھ کرونگا جو مجھ سے ممکن ہے۔

کرک پیٹرک نے اپنا جملا ابھی ختم نہیں کیا تھا کہ رحیم النسا نے دروازے کی طرف گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر کرک پیٹرک نے رحیم النسا کے دونوں شانے ہلاتے ہوئے دریافت کیا تمہیں کیا ہوگیا ہے صاحبزادی، اس طرح بت بنی دروازے کی طرف کیوں گھور رہی ہو، سنو میرے سوالوں کا جواب دو۔ یہ سن کر بھی رحیم النسا ضرورت سے زیادہ پریشانی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، دیکھو ڈاکٹر اس طرف دروازے کی طرف دیکھو، ایک سرخ پوش کھڑا تمکو گھور رہا ہے، کیا تمہیں نظر نہیں آرہا ہے، اور اپنی خونی اور خطرناک آنکھوں سے تمکو بری طرح سے دیکھ رہا ہے۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا ہے مس کرک پیٹرک۔

نہیں، نہیں، صاحبزادی، تمکو تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے، کہتے ہوئے کرک پیٹرک نے رحیم النسا کے دونوں شانے بری طرح سے ہلاتے ہوئے کہا، ہوش میں آؤ، صاحبزادی کہیں تم خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو! میں سچ کہتی ہوں میری اچھی شہزادی، یہاں پر کوئی بھی نہیں ہے، میں سمجھتی ہوں تم وہم اور خلک و شبے کا بری طرح سے شکار بن گئی ہو، اسی لیے ایسی واہی تباہی باتیں کر رہی ہو آپ۔ یہ سن کر رحیم النسا نے پھر سے پوری قوت کے ساتھ کہی، اڈنا میں پورے ہوش و حواس میں ہوں، اور میں سو نہیں رہی ہوں، میں جاگ رہی ہوں اور ہشیار ہوں، مگر ایک حقیقت میری نظروں کے سامنے ہے، اس لیے اس حقیقت کو میں کیسے جھٹلا سکتی ہوں، دیکھو، دیکھو، میری پیاری اڈنا کہ وہ سرخ پوش میری طرف بڑا چلا آرہا ہے، اور تمکو ڈرا رہا ہے، اور یہ کہہ رہا ہے کہ تمکو کچا کھا جائے گا، بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ، تمکو اس خطرناک جنگل سے بچا دو اڈنا کہتے ہوئے رحیم النسا اپنے کو ہوش و حواس سے لیٹ گئی اور بے چینی کے ساتھ کروٹ پر کروٹ بدلنے لگی۔ ایسے میں اڈنا کرک پیٹرک نے اس کو اٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا) اور اپنی دستی سے اس کے چہرے پر پسینا پونچھنے لگی، اور یہ کہہ کر اس کو دلاسا اور تشفی دی کہ گھبراؤ مت میری شہزادی صبح تک یہاں سے

ہوں، تمہارا کوئی بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ تم یقین جانو اگر تم پر کوئی بات اٹھائے تو میں اس کے پرزے پرزے کر کے رکھ دوں گی، ہوش میں آؤ، میری اچھی صاحبزادی کہتے ہوئے اڈنا کرک پیٹرک نے بڑی ہی کرخت آواز میں للکارا۔

ماما جی! ماما جی! ارے کوئی ہے، جلد آؤ یہاں، صاحبزادی بے ہوش ہو گئی ہیں۔ یہ آوازیں، سنتے ہی دو تین مامائیں دوڑی دوڑی چلی آئیں اور شہزادی کو اس حالت میں دیکھ کر سخت حیران اور پریشان ہو گئیں۔ کرک پیٹرک نے کہا، دوڑو جلد، بسکٹ سے کہو کہ فوراً ہی دو کپ گرم کافی بنا کر بھجوائے۔ یہ سن کر ایک ماما جی اس طرف گئی اور دوسری مامائیں پنکھا جھیلنے لگیں، اور اڈنا کرک پیٹرک بے ہوش صاحبزادی کا مسلسل پسینا پونچھ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں گرم کافی وغیرہ اشیاء میز پر رکھ ہوئی آئی۔ میز پر رکھنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے ماما سے کہا، ماما جی، شہزادی کو، کوچ پر تکیے کے سہارے بٹھاؤ، اور میں اپنے ہاتھ سے انہیں گرم کافی پلاتی ہوں؛ چنانچہ صاحبزادی کو اسی طرح تکیے کے سہارے بٹھایا گیا، اور کرک پیٹرک نے صاحبزادی، صاحبزادی، کہتے ہوئے دو چار بار پکارا، اٹھو، آنکھیں کھولو، دیکھو میں نے آپ کے لیے گرم کافی منگوائی ہے، آپ ہم دونوں ملکر پئینگے۔ یہ سن کر رحیم النسا نے آنکھیں کھولیں اور کرک پیٹرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ہاں ڈاکٹر کیا کہا آپ نے، یہ سن کر پھر سے ڈاکٹر نے کہا کہ لو، گرم کافی کا ایک کپ پی لو آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ یہ سن کر رحیم النسا نے اچھا ڈاکٹر کہا، اور کرک پیٹرک نے ایک کپ گرم کافی خود اپنے ہاتھوں سے اس کو پلائی، اور اس کے بعد خود اس نے بھی کافی پی، اور رحیم النسا سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی رہی۔ اس دفعہ کرک پیٹرک نے باتوں کا رخ بالکل ہی بدل دیا، اور انگریزی ناولوں کے بارے میں رحیم النسا کے خیالات معلوم کرتی رہی۔ جب رحیم النسا بالکل ہی اپنے اصلی موڈ میں آ گئی تو اس نے گھر جانے کی اجازت چاہی، اور ماماؤں کی سختی کے ساتھ تاکید کر دی کہ وہ حضرت صاحبزادی کی خدمت میں موجود رہیں اور اس کو ہرگز ہرگز تنہا اور اکیلا نہ چھوڑیں یہ کہتے ہوئے مس کرک پیٹرک نے رحیم النسا سے ملا لیا اور باہر چلی گئی۔

دیوڑھی سے باہر جانے سے پہلے مس کرک پیٹرک نے خیال کیا کہ نواب آسمان جاہ سے ملتی ہوئی جائے، چنانچہ نواب صاحب کے دیوان خانے میں چلی گئی۔ اس وقت نواب صاحب حقا پیتے ہوئے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ کرک پیٹرک کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انگریزی زبان میں خشی آمدید کہتے ہوئے ڈاکٹر سے بات چیت کرنے کے لیے کہا۔ آپس میں دونوں کی خیر خیریت کے بعد نواب صاحب نے صاحبزادی کی خیریت معلوم کی کہ اب اس کا کیا حال ہے۔؟

کرک پیٹرک نے نواب صاحب سے کہا، میں ابھی وہیں سے آ رہی ہوں، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کے چنداں تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف اس بات پر غور کر رہی ہوں کہ افیون سے کیس کو کس طرح سے چلایا جائے۔ یہ سن کر نواب آسمان جاہ نے کہا کہ آپ کے آنے سے پہلے میں نے اپنے ایک وفادار ملازم سے مشورہ کیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ سرکار یہ کیس تو پولیس میں ضرور بھیجنا چاہیے تاکہ ملزم اور جرم کیفر کردار کو پہنچے۔ اس پر مس کرک پیٹرک نے جواب دیا، نواب صاحب! آپ اس کیس کو پورے طور پر مجھ پر چھوڑ دیجیے، میں خود ہی غور کر رہی ہوں کہ یہ کیس کس طرح چلایا جائے۔ افیون کے سلسلے میں آپ کی صاحبزادی کو اس بات کا علم ہو گیا تو اس کو مٹھائی میں ملا کر افیون کا زہر دیدیا گیا تھا۔ تو آپ یقین جانیے کہ اس کی جان کے لینے کے دینے پڑ جائینگے۔ آپ کی معصوم اور حسین مرلی پہلے ہی نازک طبیعت واقع ہوئی ہے، جب اچانک اسکو زہر خورانی کا علم ہو جائے گا تو لازمی طور پر اس کی حالت خراب ہو جائے گی، اس لیے میں آپ سے عرض کرتی ہوں کہ آپ اپنے ہر ملازم کو سختی کے ساتھ تاکید اور ہدایت کر دیں کہ کوئی بھی اس راز کو شہزادی پر واضح نہ کرے۔

ہاں ڈاکٹر کرک پیٹرک تم بالکل ٹھیک کہتی ہو، نواب آسمان جاہ نے فرمایا کہ واقعی میری پیاری بیٹی بڑی ہی نازک دماغ واقع ہوئی ہے اور ہر بات کا جلد سے جلد اثر لیتی ہے۔ تمہاری خواہش کے مطابق میں اب سے تمام ملازمین کو سختی کے ساتھ تاکید کر دوں گا کہ زہر خورانی کے بارے میں کوئی بھی صاحبزادی سے ذکر نہ کرے۔ اللہ مجھکو آپ کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق ہے کہ آپ جب بھی مناسب سمجھیں اس کیس کو چلائیں۔

بہت انگریزی سے واقف ہے، دور کھڑا آسمان جاہ اور سرک پیٹرک کی ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اس دوران میں سرک پیٹرک نے نواب صاحب سے کہا کہ اس کیس کے سلسلے میں مزید چھان بین اور تحقیقات کے سلسلے میں، میں آپ کی دونوں ماماؤں سے کچھ اور واقعات معلوم کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ ان دونوں کو میرے ساتھ کردیں تو میں انہیں اپنے ساتھ گھر لے جاؤنگی اور کچھ سوالات کرنے کے بعد جلد ہی واپس کردونگی۔ یہ سنتے ہی نواب صاحب نے کہا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ دونوں مامائیں آپ جانتی ہیں کہ (۱۲) گھنٹے ہماری صاحبزادی کی پیشی میں رہتی ہیں۔ میں ابھی اپنے ملازم عبدالقادر کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اندر جاکر صاحبزادی کی اجازت سے دونوں ماماؤں کو بلا لائے، یہ کہتے ہوئے نواب صاحب نے سامنے کھڑے ہوئے عبدالقادر کو "یہاں آؤ" کہتے ہوئے للکارا"، یہ سنتے ہی "جی! حاضر ہو سرکار" عبدالقادر کے آتے ہی آسمان جاہ نے کہا، صاحبزادی کی خدمت میں جاؤ، اور ہماری طرف سے دعا کہتے ہوئے کہنا کہ لیڈی ڈاکٹر آپ کی دونوں ماماؤں کو کچھ دیر کے لیے اپنے ساتھ لیجانا چاہتی ہیں، اگر وہ اجازت دیں تو تم ماماؤں کو اپنے ساتھ لیتے آؤ یہ سن کر عبدالقادر نے جو "حکم سرکار" کہا، اور زنانے میں چلا گیا۔ اس کے بعد آسمان جاہ پھر سے سرک پیٹرک سے باتوں میں مصروف ہوگئے۔ ایسے میں عبدالقادر چھوٹی ماما جی کے ساتھ آن کر آسمان جاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا، اور کہنے لگا کہ بڑی ماما جی کی طبیعت خرابہ ہوگئی تھی، اس لیے وہ شہزادی صاحبہ سے اجازت لے کر کل رات سے باہر کمرے میں آرام کر رہی ہے، اور ان چھوٹی ماما جی کو شہزادی صاحبہ نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جانے کی اجازت دی ہے۔ جب بڑی ماما جی کھانے کی کوئی بھی صورت نظر نہ آئی تو سرک پیٹرک نے نواب صاحب سے کہا، نواب صاحب اس وقت تو میں اسی ایک عورت اور آپ کے مرد ملازم عبدالقادر کو اپنے ساتھ لیجانا چاہتی ہوں، اور میں آپ سے وعدا کرتی ہوں کہ بہت جلد یہ دونوں دیوڑی کو واپس آجائینگے۔ یہ سن کر نواب صاحب نے کہا، تمہاری جیسی بھی مرضی ہو، اس میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیڈی

ہوگئے، اور دونوں نے آپس میں بات ملایا، اور گڈ بائی، گڈ بائی کہتے ہوئے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ ساتھ ہی نواب آسمان جاہ نے عبدالقادر سے کہا، سنو، اس نئی گلی میں ڈاکٹر صاحب کو گھر پہنچا دینا۔ اس کے جواب میں عبدالقادر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے "جو حکم سرکار" کہا، اور اس کے بعد لیڈی ڈاکٹر آگے آگے اور چھوٹی ماما جی اور عبدالقادر اس کے پیچھے جارہے تھے۔ باہر جانے کے بعد عبدالقادر نے کوچوان کو سرکار کا حکم سنایا اور یہ تینوں نئی گلی میں ٹھہرے لیڈی ڈاکٹر سرک پیٹرک کے گھر پہنچ گئے۔

باب (۱۵)

گھر پہنچتے ہی سرک پیٹرک ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور بٹلر کو آواز دے کر برف کا ٹھنڈا پانی لے آنے کے لیے کہا بٹلر کے پانی لے آیا وہ گلاس بھر پانی پی کر چند منٹ کے لیے صوفے پر دراز ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد اٹھ بیٹھی، اور عبدالقادر اور چھوٹی ماما جی سے جو اب تک کھڑے تھے بازو کی کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا، وہ دونوں جب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ڈاکٹر نے دریافت کیا آیا تم دونوں پانی یا لیمن وغیرہ پیئینگے؟ اس پر ان دونوں نے کہا نہیں ڈاکٹر صاحب ہمیں ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔ یہ سن کر سرک پیٹرک نے کہا، کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں تم دونوں کو اس وقت اپنے ساتھ کیوں لے آئی ہوں؟ اس کے جواب میں ان دونوں نے کہا، نہیں ڈاکٹر صاحب، ہم کیا جانیں کہ آپ ہم دونوں کو اپنے گھر کیوں لے آئی ہیں!

یہ سن کر لیڈی ڈاکٹر نے کہا، سنو! میں تم دونوں سے افضل خان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم اس کے بارے میں کچھ تفصیلات بتا سکتے ہو؟ یہ سنتے ہی چھوٹی ماما جی نے جواب دیا ڈاکٹر صاحب، ہم کیا جانیں، افضل خان بہادر کے بارے میں، ہم صرف اپنے سرکار نواب آسمان جاہ بہادر کو بہتر طریقے پر جانتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ بغیر سرکار یا ہماری شہزادی کے حکم کے بغیر ہم سب ملازم دیوڑی سے باہر قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔ ایسی صورت میں دوسروں کے حالات سے کیسے واقف ہوسکتے ہیں؟ ماما جی کے بعد عبدالقادر نے بھی یہی بیان دیا کہ ڈاکٹر صاحب یہ بالکل سچ ہے کہ تمام ملازمین دیوڑی سرکار کے حکم کے بغیر باہر جا آ نہیں

واقف بھی نہیں ہیں!

یہ سن کر کرک پیٹرک نے کہا، سنو! عبدالقادر، صاحبزادہ رحیم النسا کی زہر خورانی کے باعث تمہارے سرکار نواب آسمان جاہ بہادر سخت پریشان ہیں، اور وہ اس کیس کے سلسلے میں کوئی تحقیق یا چھان بین خود نہیں کر سکتے، اس لیے انہوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے کہ تنہا میں خود اس بارے میں مکمل تحقیقات کروں، اور اس خصوص میں نواب صاحب نے مجھ کو پورے طور پر مجاز گردانا ہے کہ میں دیوڑھی کے ہر ملازم سے جس قسم کی بھی تحقیقات ہو کروں، اور ضرورت پڑے تو بعض ملازمین کو مزید تحقیقات کے لیے پریسی کے بھی حوالے کر دوں۔ اب تو سمجھ گئے نا تعجب سے کہ میرا کیا مطلب ہے؟ یہ سن کر عبدالقادر نے کہا، خود مجھے بھی اس سے انکار نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب، آپ جس طرح سے چاہیں تحقیقات اور چھان بین کریں، اور آپ ہم سے جو بھی بات دریافت کریں گے، ہم برابر اس کا جواب دینگے، اس لیے کہ ہم سرکار کے حکم کی خلاف ورزی ہرگز ہرگز نہیں کر سکتے۔ اس کا اصل وجہ یہ ہے کہ ہم سب ہمارے بڑے سرکار آسمان جاہ بہادر کے قدیم نمک خوار ہیں، اور ہم اسی طرح اپنی شہزادی کے بھی نمک خوار ہیں، اگر آج ہم ان کے احکام کی خلاف ورزی کرینگے تو کل ان کا نمک ہمارے جسم سے پھوٹ پھوٹ کر نکلے گا۔

یہ سنتے ہی خشی کے ساتھ کرک پیٹرک نے ان دونوں کو شاباشی دی، اور کہا، ہاں تمام نمک حلال ملازمین کا یہی شیوا ہونا چاہیے، میں آپ دونوں سے بھی یہی توقع رکھتی ہوں۔ یہ سن کر عبدالقادر نے کہا ہاں ڈاکٹر صاحب اب آپ جو چاہیں ہم سے دریافت کر سکتے ہیں، یہ سننے کے بعد کرک پیٹرک نے ان دونوں سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ آیا آپ دونوں کو اس بڑی ماما جی پر پورا پورا بھروسا ہے کہ آپ دونوں جو بھی بیان دینگے وہ اس کی سو فیصد تائید کرے گی۔ اس کے جواب میں دونوں نے ایک آواز ہو کر کہا، ہاں ڈاکٹر صاحب! ہم دونوں آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ بڑی ماما جی ہمارے خیالات اور بیانات کی پوری پوری تائید کرے گی۔

اگر ایسی بات ہے تو پھر ہم آپ صاف صاف معاملے کی باتیں کرینگے، یہ تو ہم دونوں اور دیوڑھی کے سب ہی ملازم بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ چند روز پہلے صاحبزادی نے افیون ملی ہوئی مٹھائی کھائی تھی، جسکے خطرناک زہر کا اثر اس کے سارے جسم میں پھیل گیا تھا، اس کا حسین اور خوبصورت چہرا نیلگوں ہو گیا تھا، اور اسکے منہ سے مسلسل جھاگ کا کف بہہ رہا تھا۔ اس وقت پر نواب آسمان جاہ بہادر نے اپنی بگی بھیجکر مجھکو فوراً طلب کیا، اور اپنی لڑکی کی خطرناک حالت زار سے مجھکو پورے طور پر واقف کرایا۔ حسرتی اس معصوم اور میری دوست لڑکی کو دیکھتے ہی فوراً میرے بھی ہوش و حواس جاتے رہے، مگر میں نے دل کڑا کیا، اور اس کا باقاعدہ علاج شروع کر دیا۔ زہر کو زایل کرنے کی دوائیں بھی دیں اور مسلسل انجکشن بھی دیے۔ دیوڑھی کے تمام ملازم اور تم دونوں بھی بڑی ماما جی، یعنی سب ہی اچھی طرح سے واقف ہیں کہ مسلسل تین دن اور تین رات میں نے چین آرام اور نیند تک اپنے پر حرام کر دی تھی۔ صرف کافی کے کپ پر کپ اور بلکل ہی معمولی غذا پر یکسو دور گذار دیا، محض اس ڈر سے کہ اگر میں سو جاؤں تو نہ معلوم مریض کا کیا حال ہو۔ یہ سب کچھ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ رحیم النسا، نواب آسمان جاہ بہادر امیر کبیر اور لکھپتی شخص کی لڑکی ہے اس لیے مجکو علاج کرنے کے بعد ضرورت سے زیادہ معاوضا ملے گا، بلکے اس لیے کہ جب سے میں نے اس دیوڑھی میں آنا جانا شروع کیا ہے، اس خوبصورت اور معصوم لڑکی سے مجھے بے پناہ محبت ہو گئی ہے، اور وہ بھی مجھ سے اسی طرح خلوص اور محبت سے پیش آتی ہے، دوسرے حق میں، ہم دونوں کے آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور سچ پوچھو تو اس کا کامیاب علاج میں، میں نے حقیقت میں دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں، آیا میں نے جو کچھ کہا بلکل بجا ہے یا نہیں؟

نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب، آپ نے جو کچھ بھی بیان کیا ہے، اس کا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی ہے۔ دیوڑھی کے تمام ملازمین نے دیکھا ہے کہ تین چار ہفتہ تک آپ ہماری شہزادی صاحبا کا باقاعدہ علاج کرتی رہی ہیں دیوڑھی سے باہر نہیں گئیں اور نہ ہی تین دن اور تین رات سوئی ہیں، خود آپ ہی کے الفاظ میں آپ نے اپنے اوپر چین آرام حرام کر لیا تھا۔

ہاں تو اب میں تم سے اصل مطلب کی بات کہنا چاہتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ لوگ افضل خان سے اچھی

بھی اس کو جانتی ہوں اور میرے خیال میں شہر کا ہر شخص بھی اس کو جانتا ہے - تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تمہاری صاحبزادی رحیم النسا کو ٹھنائی میں افیون ملا کر زہر دینے کا، افضل خان کا یہ پہلا واقعہ نہیں ہے، بلکے اس سے پہلے بھی جب کبھی کسی لڑکی سے عشق میں اس کو ناکامی ہوئی ہے، اس نے زہر دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی ہے - میں اس کے اس قسم کے چند ایک کمینے اور سفلہ واقعات سے بخوبی واقف ہوں، اس لیے اس وقت میں پورے طور پر یہ محسوس کرتی ہوں کہ رحیم النسا کو افیون ملی ہوئی ٹھنائی بھجوا کر اس نے اس معصوم اور حسین لڑکی کو ختم کر دینے کی کوشش کی تھی، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ افضل خان کو پولیس کے حوالے کرکے اس پر عدالت میں مقدمہ چلایا جاے، تاکے یہ کمینہ اور سفلا آدمی اپنے کیفر کردار کو پہنچے - تم لوگ خود بھی بہتر طریقے پر سمجھتے ہو کہ رحیم النسا کی ذات سے ہٹ کر دیکھا جاے تو انسانی نقطۂ نظر سے اس کی یہ ذلیل حرکت انتہائی حقارت آمیز اور ذلیل ترین نظروں سے دیکھی جاے گی، اور خصوصاً رحیم النسا جو ایک معصوم بے گناہ اور انتہائی شریف لڑکی ہے، اس کے ساتھ افضل خان کا یہ ذلیل فعل رذالت کی حد تک پہنچتا ہے -

یہ سن کر چھوٹی ماما جی نے کہا، ہاں ڈاکٹر صاحب دیوڑی کے سب ہی ملازم اس دردناک واقعے سے بے حد متاثر ہیں، اور خصوصاً ہمارے سرکار نواب آسمان جاہ بہادر کو تو اس حادثے کا بہت زیادہ اثر ہے - کرک پیٹرک نے پھر سے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوے کہا، سنو، اور تم دونوں بھی کان کھول کر خوب غور سے سنو! میں کل رات افضل خان کے گھر گئی تھی، اور میں نے افیون ملی ہوئی ٹھنائی بھجوانے کا سارا ماجرا کہہ سنایا، اور یہ بھی کہا کہ اے ظالم شخص تو نے ناحق اس معصوم لڑکی سے یہ بھی کہلوایا تھا کہ وہ ٹھنائی کسی دوسرے کو نہ دے، بلکے ساری ٹھنائی خود ہی کھالے، چنانچے تیری تاکید اور ہدایت پر رحیم النسا نے عمل کیا، اور ٹھنائی کھاتے ہی بالکل ہی بے ہوش ہو گئی - جب اس کی حالت غیر ہو گئی تو نواب آسمان جاہ بہادر نے مجھ کو طلب کیا، میں فوراً ہی ان کی دیوڑی کو گئی، اور جس وقت میں نے اس لڑکی کو دیکھا، اس کے منھ سے کف بہہ رہا تھا، وہ بالکل ہی بے سدھ اور بے ہوش پڑی تھی - اس پھول جیسی نوری چہرہ لڑکی کا سارا جسم نیلگوں ہو گیا تین رات وہیں رہی، اور اس کو فوری دوائیں بھی دیں اور انجکشن بھی دیے جس سے روز جب وہ لڑکی بالکل اپنی اصلی حالت پر آ گئی تو میں نواب صاحب سے اجازت لے کر اپنے گھر چلی گئی، اور میں نے اس ظالم شخص سے یہ سوال کیا کہ تمہارے کمینے اور سفلے آدمی تو نے ایسی ذلیل اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت کیوں کی ---؟

کرک پیٹرک نے قطع کلام کرتے ہوے عبدالقادر سے دریافت کیا، ڈاکٹر صاحب ایک طرف تو آپ کا کہنا ہے کہ نواب افضل خان کو ہماری شہزادی سے بے پناہ عشق اور محبت ہے، مگر ایک عاشق صادق سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے معشوق کو زہر دے کر مار ڈالے گا - یہ بات تو میری سمجھ سے باہر ہے میم صاحب! آپ نے ابھی ابھی ہم سے بیان کیا ہے کہ آپ نے افضل خان نے ٹھنائی میں افیون ملا کر بھجوائی، اور ہماری شہزادی کو مار ڈالنے کی جو ناکام کوشش کی تھی، اس کا سارا حال احوال آپ نے ہمیں کہہ سنایا، آیا خدا نہوں نے بھی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر کیا؟ عبدالقادر تم بھی عجیب کم عقل آدمی ہو، ارے بھلے آدمی، اپنے جرم کا اعتراف کون کرتا ہے - آیا افضل خان اتنا دیوانا ہے کہ یہ سارا ماجرا بیان کرکے ہی اقبال کرلے گا کہ میں نے رحیم النسا کو ختم کر دینے کی غرض سے افیون ملی ہوئی ڈبہ میں ٹھنائی بھجوائی تھی، اور بھی سنو کہ تمہاری صاحبزادی کو آج تک اس کا علم نہیں ہے کہ وہ ٹھنائی زہر ملی ہوئی تھی، ورنا خدا اس کو افضل خان سے نفرت ہو جاتی - ڈاکٹر صاحب، چھوٹی ماما جی نے بات کاٹتے ہوے کہا، نواب افضل خان بہادر کا تعلق حیدرآباد کے بڑے ہی امیر گھرانے سے ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے والد اور ہمارے سرکار نواب آسمان جاہ بہادر کے گہرے دوستی کے تعلقات ہیں اور ان کے باپ بہادر سرکار کی خدمت میں اکثر پیشتر آیا جایا کرتے ہیں، اور کبھی کبھی وہ اپنے بیٹے افضل خان کو بھی اپنے ساتھ لایا کرتے ہیں، ایسی صورت میں یہ کہنا کہ زہر خورانی کی ذلیل اور کمینی حرکت افضل خان نے کی ہے، میری سمجھ سے باہر ہے!

یہ سنتے ہی گرجدار آواز میں کرک پیٹرک نے کہا، نہیں جانتیں ماما جی کہ افضل خان شہر حیدرآباد کا شریف غنڈا ہے، جو ہر نوجوان اور خوبصورت لڑکی کا ٹوہ [illegible]

تو ایسی ذلیل اور کمینی حرکت پر اتر آتا ہے - خیر، میں تم دونوں کو اس بات کا پکا یقین دلاتی ہوں کہ افضل خان نے رحیم النسا کی زندگی ختم کر دینے کی جو ناکام کوشش کی تھی، اس کو اس سلسلے میں ضروری اور واجبی سزا ملنی چاہیے! افضل خان نہ صرف مکار اور دھوکے باز اور پرلے درجے کا بدعہد اور جھوٹا شخص ہے، بلکہ وہ ایک مانا ہوا ظالم شخص بھی ہے، جس کے ثبوت میں، ہم صاحبزادی کا تازا ترین کیس یا واقعہ پیش کرتے ہیں، اور ہم اس کو پولیس کے ذریعے عدالت بھجوا کر ہی رہینگے، تاکہ اقدام قتل کی علت میں اس کو کافی سزا ملے!

مگر ڈاکٹر صاحب! پہلے یہ تو بتایئے کہ اس بات کا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ وہ مٹھائی نواب افضل خان نے بھجوائی تھی - جب آپ پولیس اور عدالت میں ان کے خلاف کارروائی کرینگے تو وہ صاف انکار کر دینگے - اس وقت آپ کا کیا مقام رہے گا!

سنو! عبدالقادر" بات کترتے ہوئے مس کرک پیٹرک نے کہا، میں اس حادثے کا سب سے بڑا ثبوت خود ہوں - میں پولیس اور عدالت میں یہ بیان دے سکتی ہوں کہ صاحبزادی رحیم النسا نے جو مٹھائی کھائی، اس میں افیون ملی ہوئی تھی، اور افیون کے زہر کے سارے اثرات اس معصوم اور بے گناہ لڑکی کے پورے جسم اور دل و دماغ میں سرایت کر گئے تھے - اگر اس کے علاج میں اور تھوڑا وقفا ہو جاتا تو وہ حور رسی، خوبصورت لڑکی موت کا شکار بن جاتی - نواب آسمان جاہ نے مجھ کو فوراً طلب کیا، اور میں اس وقت گئی، اور اس کا مسلسل تین دن اور تین رات تک ان تھک طریقے پر علاج کیا، اور فوری دواؤں اور انجکشن کے ذریعے افیون کے خطرناک زہر کو زائل کر دیا، چنانچہ چوتھے روز مریضا اپنی اصلی حالت پر آ گئی - تم نے کیا سمجھ رکھا ہے عبدالقادر مجھ، میں ڈاکٹر ہوں، اور ایک انگریز ڈاکٹر ہوں، جس کا علاج مانا ہوا ہے، اس لیے میرے ہر بیان میں قوت ہوتی ہے اس بنا پر میں پولیس اور حاکم عدالت کو یقین دلا سکتی ہوں کہ زہر خورانی کے دوسرے معنی اقدام قتل کے ہیں، اس لحاظ سے قاتل کو موت کی سزا ملنی چاہیے - رہا تمہارا یہ کہنا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ مٹھائی افضل خان نے بھجوائی تھی

کو صاحبزادی رحیم النسا سے بے پناہ عشق ہے، اسی لیے جائز اور ناجائز طریقے پر اس حسین لڑکی کو حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر جب اس کو اس سلسلے میں ناکامی ہوئی تو اس نے اس لڑکی کو زہر دے کر ختم کر دینے کا ذلیل، کمینا اور سفلا حربا استعمال کیا تھا، اور یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع نہیں تھا، بلکہ اس سے پہلے بھی اس نے انگلستان میں اور شہر حیدرآباد میں، کئی ایک حسین لڑکیوں سے عشق و محبت کا رشتہ ناتا جوڑا تھا، اور جب کبھی وہاں بھی اس کو ناکامی رہی تو اس نے اسی قسم کے ذلیل اور کمینے حربے استعمال کیے تھے - ماما جی اور عبدالقادر! میرے لیے اس قسم کا ثبوت فراہم کرنا اور پیش کرنا کوئی مشکل اور دشوار گذار کام نہیں ہے، ہم ڈاکٹر لوگ تو ایسے کیس میں بڑے ہی ماہر اور تجربے کار ہوا کرتے ہیں اور پولیس اور عدالت کو ہر طرح سے اپنے بیانات سے مطمئن بھی کر سکتے ہیں، مگر اس میں تم دونوں ماما جی اور عبدالقادر کی مدد اور معاونت کی سخت ترین ضرورت ہے، یہ بالکل سچ ہے کہ یہ کیس بغیر تم لوگوں کے بیانات کے قوت نہیں پکڑ سکتا - حقیقت حال کے بیان کرنے میں تم تینوں کو کیا عذر ہو سکتا ہے؟

کرک پیٹرک سے یہ تفصیلی بیان سننے کے بعد ماما جی نے کہا، ڈاکٹر صاحب، میں دونوں بات جوڑ کر آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ کم سے کم مجھ کو ان جھمیلوں سے باز رکھا جائے - مجھ کو پولیس کے ناز پیا اور ناروا جابرانہ طرز عمل سے سخت نفرت ہے - آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ پولیس نے ہمارے بڑے سرکار کی اجازت سے ہم دونوں ماماؤں کو پولیس تھانے لے گئی تھی - ان ظالموں نے نہ صرف عوام کے سامنے ہم دونوں کو ذلیل و خوار کیا، بلکہ تفتیش کے سلسلے میں بھی ہماری بری طرح سے درگت بنائی - ہم دونوں کو مارا پیٹا اور حد یہ ہے کہ ہمارے جسم کو چرکے تک دیے - پولیس کا کہنا یہ تھا کہ وہ ہم سے جھوٹ سچ جو بھی سوال کرے، ہمیں بلا وجہ بھی ہاں کہہ دیں - ہم نے ان سے صاف طور پر کہدیا تھا کہ ہمیں اس بات کی مطلق پروا نہیں ہے کہ ہم دونوں کی جان چلی جائے، مگر ہم ایک لفظ بھی ہرگز ہرگز جھوٹ نہ بولینگے - ڈاکٹر صاحب وہ تو ہمارے سرکار کی مہربانی اور عنایت کا نتیجہ ہے کہ پولیس نے اور بھی زیادتیاں ہمارے ساتھ

عبدالقادر کے خلاف ایک لفظ بھی شکایتی طور پر نہیں کہا۔ وہ تو ہر وقت ہم تینوں کی تعریف اور تائید ہی کرتے رہے کہ یہ میرے قدیم ملازم ہیں، اس لیے میں ان تینوں سے چوری وغیرہ جیسی ذلیل حرکت کی ہرگز ہرگز توقع نہیں کر سکتا۔ میم صاحب! آپ تو بہتر طریقے پر جانتی ہیں کہ ہم دونوں ماں بیٹیوں سے (۲۴) گھنٹے ہماری پیاری شہزادی رحیم النسا صاحبا کی پیشی میں رہتی ہیں، اور ہر وقت ان کی خدمت میں لگی رہتی ہیں۔ آج تک صاحبزادی صاحبا کو بھی ہم دونوں سے کوئی بھی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب! آپ خود بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ چور ملازم کسی امیر کبیر کے گھر اور صاحبزادیوں کی پیشی میں مسلسل برسوں بلا شکایت کیسے اور کیونکر رہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب، میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ہمارے بھائی عبدالقادر کا بھی سرکار اور ہماری شہزادی دونوں ہی کی نظروں میں ایک خاص مقام ہے، اور ہمارے سرکار ان پر پورا پورا بھروسا اور اعتماد کرتے ہیں، اور اکثر و بیشتر معاملات اور مسایل میں عبدالقادر صاحب سے مشورا بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب، آپ خود ہی ٹھنڈے دل سے غور فرمایئے کہ ایسے باوقار اور با اعتماد ملازم چور بٹکار کیسے ہو سکتے ہیں، اس لیے میم صاحب اس دفعہ آپ ہم تینوں کو پھر سے پولیس کے حوالے کرنے کا خیال ترک کر دیں۔

اماجی کا اس طویل دکھ بھری کہانی کو سن کر کرک پیٹرک نے یقین دلایا کہ میں اس بات کی ذمے داری لیتی ہوں کہ اب کی دفعہ تحقیقات کے سلسلے میں پولیس آپ پر کسی قسم کا جبر یا زیادتی نہیں کرے گی۔ لیڈی ڈاکٹر کے اس تیقن کے باوجود عبدالقادر نے اس سے یہ بیان کیا کہ ڈاکٹر صاحب، جب افضل خان صاحب اور ہماری شہزادی دونوں ہی آپس میں محبت کرتے ہیں تو اس سلسلے میں آپ کو دخل در معقولات کرنے کی کیا وجہ ہے، اور یہ کہ آپ اس کیس کو پولیس کے حوالے کیوں کرنا چاہتی ہیں؟ یہ بات تو میرے سمجھ سے باہر ہے ڈاکٹر صاحب، تعجب کے انداز میں عبدالقادر نے کہا، مگر عبدالقادر کی بات کاٹتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر نے بیان کیا، نہیں عبدالقادر، تم لوگوں کو اس معاملے میں نہیں رحیم النسا سے محبت نہیں کرتا ہے، بلکہ دوستی کے بہانے وہ تمہاری صاحبزادی سے جلب منفعت کرنا چاہتا ہے۔ وہ نیچ جانتا ہے کہ رحیم النسا، نواب آسمان جاہ بہادر کی اکلوتی چہیتی لڑکی ہے، جس کو خود نواب دل و جان سے چاہتے ہیں، اور اس کی ضروریات پر ہزاروں ہی روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ نیز لاکھوں روپے کے زیورات رحیم النسا کے قبضے میں ہیں، چونکے نواب آسمان جاہ اور افضل خان کے باپ کے نہایت ہی گہرے دوستانہ تعلقات ہیں، اسی لیے وہ اپنے باپ کے ساتھ اکثر و بیشتر ڈیوٹی کے آیا کرتا ہے، اور ڈیوٹی کے نیز رحیم النسا کے تمام حالات سے پورے طور پر واقف ہے۔ اس کی یہ کوشش ہے کہ محبت اور دوستی کا حق جتا کر رحیم النسا سے زیادہ سے زیادہ مالی فائیدا حاصل کیا جائے۔ میں چونکے افضل خان سے برسوں سے واقف ہوں، اس وقت سے، جبکے یہ انگلستان میں پڑتا تھا، اور میں خود بھی ہمیشا اس کے ساتھ رہا کرتی تھی، وہاں بھی اس نے کئی ایک لڑکیوں سے عشق و محبت کا ڈھونگ رچا کر خوب خوب ہی مالی طور پر لوٹا تھا، اور خود مجکو بھی اس نالم شخص نے سخت نقصان پہنچایا تھا، اس لیے اس وقت پر تم سب کو میرا یہ مفید اور زرین مشورہ ہے کہ کسی بھی طرح افضل خان کے زہر خورانی کے کیس کو پولیس کے حوالے کر کے عدالت میں اس کو نواب سزا دلوائی جائے، تاکہ وہ آیندہ کسی بھی شریف زادی کو اس بری طرح سے ستانے نہ پائے۔ کہو، اس حقیقت حال کے سننے کے بعد اب تم دونوں کی کیا رائے ہے۔؟ اگر یہ سچ ہے میم صاحب تو میں خود بھی افضل خان کے خلاف بیان دینے کے لیے تیار ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ مجکو پھر سے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔ میں عدالت میں جو چاہے بیان دے سکتی ہوں۔

ٹھیک ہے اماجی، مس کرک پیٹرک نے کہا، تم لوگوں کے بیانات تو پہلے پولیس ہی لیگی، اور اس کے بعد عدالت کی نوبت آئے گی۔ تم گھبراؤ نہیں، اب کی دفعہ میں تمہاری پشت پر رہونگی اور پولیس کو تاکید کرونگی کہ تم دونوں سے صرف بیانات لیے جائیں، مگر کسی قسم کی سختی نہ برتی جائے۔ ہاں اماجی! ایک اور خاص بات تو میں نے بھلا ہی دی، وہ یہ کہ اس عورت کی بھی تلاش اور جستجو کی جائے،

تھی اور اس شخص کو ڈھونڈ نکالا جائے جس نے بڑی ماما جی کو بادلی میں ڈھکیل دیا تھا، جو مرتی مرتی بچی اور پولیس کے دو تین جوانوں نے اس کو بادلی سے باہر نکالا۔ یہ سنتے ہی عبدالقادر کے ہوش جاتے رہے، اور سوت آنکھوں میں پھر گیا، اس لیے کہ یہ پالی کا رتنا خدا سی کا تھا، یعنی موہنی مسٹر واکر عورت کا بھیس بدلا تھا، اور مٹھائی خریدنے آئی تھی، نیز افیون بھی خدا سی نے ملائی تھی، اور دونوں ماماؤں کے ساتھ تین بڑی کشتیوں میں وہ مٹھائی شہزادی رحیم النسا کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے، یہ کہا تھا کہ یہ مٹھائی جانے سرکار نواب افضل خاں بہادر نے آپ کی خدمت میں بھجوائی ہے، اور یہ تاکید کی ہے کہ یہ خاصے کی مٹھائی ہے، صرف آپ خود ہی کھائیں، اور اس میں سے خدا را برابر مٹھائی بھی کسی دوسرے کو نہ دیں۔ پھر خدا سی نے ایک دوسرے موقع پر یہ کہہ کر ایک لاکھ روپے کی موتیوں کی مالا، صاحبزادی سے داخل کرائی تھی کہ وہ عامل فراز علی سے اس کا خواب بیان کرکے اس کی بھی صحیح تعبیر معلوم کرے گا اور وہ مالا عامل فراز علی ایک بزرگ کے مزار پر بطور نذرانہ گذران دے گا۔ یہی وہ خیالات تھے، جو عبدالقادر کے دل و دماغ میں برقی رو کی سی تیزی کے ساتھ چکر کاٹ رہے تھے، اور ہر لمحہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر دونوں ماماؤں صاف گوئی سے کام لیں تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ عبدالقادر کو پریشان حال پاکر خدا کرک پیٹرک نے سوال کیا، عبدالقادر تم کچھ پریشان سے نظر آتے ہو، آخر کیا بات ہے۔؟ گھبرائی ہوئی آواز میں عبدالقادر نے جواب دیا، نہیں ڈاکٹر صاحب، آپ کو کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے، گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں۔ میں بالکل خیریت سے ہوں۔

یہ سن کر کرک پیٹرک نے عبدالقادر سے سوال کیا، عبدالقادر یہ تو میں بہتر طریقے پر جانتا ہوں کہ زنانے میں کوئی بھی چیز تمہاری نظر سے گذرے بغیر نہیں جا سکتی، پھر یہ افیون ملی ہوئی مٹھائی تم نے کیسے صاحبزادی کے ہاں بھجوا دی۔ یہ سنتے ہی مزاحیہ انداز میں ہنستے ہوئے عبدالقادر نے کہا، یہ بھی خوب رہی ڈاکٹر صاحب! میں کیسے واقف ہو سکتا کہ افضل خان صاحب نے افیون ملا کر مٹھائی بھجوائی ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ وہ بظاہر ہماری شہزادی کے جانی دوست ہیں۔ مٹھائی [illegible]

کو مٹھائی، ہماری دونوں ماماؤں کے ساتھ جاکر صاحبزادی کے حضور میں پیش کرنے کی اجازت دیدی۔ یہ سن کر مسٹر کرک پیٹرک نے عبدالقادر سے دریافت کیا، کیا تم یہ ضروری سمجھتے تھے کہ جو مٹھائی افضل خان نے بھجوائی ہے وہ صاحبزادی کے ہاں لازمی طور پر بھجوا دی جائے۔ اس پر عبدالقادر نے کہا، کیوں نہیں ڈاکٹر صاحب جب مجھ کو اس بات کا پکا یقین ہوگیا تھا کہ وہ مٹھائی افضل خان صاحب نے بھجوائی ہے تو ہماری شہزادی تک ضرور پہنچنی چاہیے۔

اس کے بعد پھر سے کرک پیٹرک نے عبدالقادر سے دریافت کیا، یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ یہ مٹھائی افضل خان نے بھجوائی تھی، مگر تمہاری صاحبزادی کے ہاں بھجوانا کوئی ضروری نہ تھا۔ اس کا جواب عبدالقادر نے اس طرح پر دیا، سنیے ڈاکٹر صاحب! جب افضل خان صاحب اور ہماری شہزادی دونوں ہی آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو کسی عاشق کا تحفہ اس کے معشوق کے ہاں پہنچنا ضروری ہے۔ عبدالقادر کی بات کاٹتے ہوئے کرک پیٹرک نے بیچ میں ٹوک بڑی اور دریافت کیا کہ آیا تم نے دونوں کو عاشق معشوق کا لقب دیا ہے یا دوسرے لوگ بھی اس راز سے واقف ہیں؟

عبدالقادر نے پوری صفائی کے ساتھ بیان کیا۔ سنیے ڈاکٹر صاحب! آپ کوئی بچی نہیں ہیں۔ سن رسیدہ اور تجربے کار عورت ہیں۔ کیا آپ خود بھی نہیں جانتی ہیں کہ افضل خان بہادر اور ہماری شہزادی آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، یہ صاحب سارے شہر حیدرآباد میں اس کے چرچے ہیں۔ صرف ہمارے سرکار نواب آسمان جاہ بہادر اس صورت حال سے ناواقف ہیں، اس لیے کہ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ ہر شخص ان سے اس واقعہ کو کہنے گھبراتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ ہمارے بڑے سرکار کے علم و اطلاع کے بغیر عشق و عاشقی کا سلسلہ ان دونوں میں چھڑ گیا ہے تو اس کا احترام کرنا، نہ صرف میرا بلکہ ہر ملازم کا اولین فرض ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے ڈاکٹر صاحب میں حقیقت میں نمک حلالی کا فرض ادا کر رہا ہوں، اور یہ موجود ماجی، اور دوسری ماما جی بھی اس سلسلے میں جو بھی خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ واقعی مشرقی انداز میں اور خصوصی ہمارے حیدرآبادی روایات کے

رحیم النسا صاحبا کا حق نمک ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ نواب افضل خان بہادر ہماری شہزادی کے بچے عاشق زار ہیں، اس لیے ہم تینوں میں سے کوئی بھی، ان کے خلاف چاہے پولیس میں ہو یا عدالت میں ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالے گا۔ میم صاحب! کان کھول کر یہ بھی سن لیجیے کہ میری اس صاف گوئی اور حقیقت حال بیان کرنے کے بعد بھی افضل خان صاحب آپ کی رائے میں ایک لچا، لفنگا، جھوٹا، دغاباز، جاہل عطائی اور پرلے درجے کا بدمعاش شخص ہے تو اس کو اسی حالت میں رہنے دیجیے، مگر ہماری نظر میں وہ ایک امیر کبیر اور بڑے جاگیردار کا شریف زادا اور قابل احترام شخص ہے کہ جس کے آگے ہم سب سر تسلیم خم کیے دیتے ہیں۔

عبدالقادر کی اس تقریر فصاحت کے بعد بھولی ماماجی نے کہا، بھائی عبدالقادر، آپ نے جو کچھ کہا، میں خدا جی آپ کے ایک ایک لفظ کی تائید کرتی ہوں۔ ہم ہمارے سرکار اور شہزادی کے قدیم ملازم ہیں۔ ہم سے ہرگز ہرگز یہ ممکن نہیں کہ اس سلسلے میں کچھ غیر غلط باتیں بیان کر جائیں، اور یہ کہ افضل خان بہادر نے ہمارا کیا بگاڑا ہے جو ہم اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ان کے خلاف نکالیں۔ سنو ڈاکٹر صاحب! کہتے ہوئے ماماجی نے اپنا رخ کرک پیٹرک کی طرف کیا اور کہنے لگی۔ آپ زبردستی بھی ہم کو پولیس کے حوالے کریں گے تو ہم وہاں بھی یہی بیان دیں گے جو اس وقت آپ کے سامنے کہا ہے، اس سے پولیس میں ہم کو پیش کر کے کیوں ہمارا وقت خراب کرتے ہیں۔ اب ہم دونوں کو ڈیوڑی واپس جانے کی اجازت دیجیے!

یہ سنتے ہی کرک پیٹرک نے دستک دی، اس کی آواز سنتے ہی اسکرین یا پردے کے پیچھے سے ایک باوردی لمبا اور چوڑا چکلا پولیس افسر نکلا، جس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک اور بلیو پنسل تھا۔ اس نے عبدالقادر اور ماماجی کی گفتگو کا ایک ایک لفظ نوٹ کر لیا تھا، کرک پیٹرک کے قریب آتے ہی وہ ہاتھ ملا کر کرسی پر بیٹھ گیا، اور اگریزی میں اس سے بات چیت شروع کی، اور آخر میں کہا، ڈاکٹر صاحب! میں نے ان دونوں کی گفتگو کا ایک ایک لفظ نوٹ کر لیا ہے، اس لیے اب انہیں واپس جانے دیجیے، اور جب کبھی ضرورت پڑے گی تو ہم خود ہی ان تینوں کو طلب کر لینگے!

یہ سن کر کرک پیٹرک نے ان دونوں سے کہا، اچھا اب تم دونوں جا سکتے ہو، اور جب کبھی ضرورت پڑے گی ہم تم تینوں کو طلب کر لینگے۔ اس کے جواب میں عورت نے کہا، ہم تو آپ کے پاس ہرگز ہرگز نہیں آئینگے۔ اس پر کرک پیٹرک اور پولیس آفیسر دونوں نے زبردست قہقہے لگائے۔

اس کے بعد عبدالقادر نے کرک پیٹرک سے بیان کیا، ڈاکٹر صاحب! ہماری شہزادی اب بالکل ٹھیک اور اچھی ہو گئی ہیں، اس لیے آپ جلدی ہماری ڈیوڑی کو مت آیئے۔ اس پر کرک پیٹرک نے مخصوص انداز میں بیان کیا، عبدالقادر تم اپنی عمر سے آگے بڑے چلے جا رہے ہو، یہ تو میرا اور نواب صاحب کا معاملہ ہے، وہ جب کبھی ہمکو طلب کرینگے میں ضرور آؤں گی، جاؤ تم دونوں یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ یہ سنتے ہی وہ دونوں چلے گئے اور ادھر کرک پیٹرک اور پولیس آفیسر نے کچھ دیر تک بات چیت کرنے کی خاطر بیٹھ گئے۔

ساغر نظامی

غزل

ہر قطرۂ خون میں ہے اک بوئے انقلاب
ہم صفحۂ ہستی سے مٹائے نہ جائیں گے

ہر شے نیاز مند نہیں ہے جہان میں
صورت میں چار چاند لگائے نہ جائیں گے

یہ انکشاف آخر ظالم نے کر ہی ڈالا
یہ نقش ہیں وفا کے مٹائے نہ جائیں گے

ساقی ترے نشانے کا کھل جائے تو بھرم
ہم تو کشش شنیم سے مٹائے نہ جائیں گے

کیوں گل کو کھلنے ہی سے کیا ہے رنجی ہے
عاشق کے جنازے پہ بلائے نہ جائیں گے

معیار وفا اے دل ہے آج مستعمر
سامان سکون دل لائے نہ جائیں گے

کچھ داستان دل بھی یوں مشتہر ہوئی ہے
ہم کو پیٹ بلائیں سے ہٹائے نہ جائیں گے

شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۲ ف ہندستانی ادب جولائی - اگست ستمبر ۱۹۷۳ء

جی - ایم - خان
ایم - اے (عثمانیا) ۔

"قومی لوری" یا NATIONAL LULLABY

ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

جس طرح رابندر ناتھ ٹیگور نے دیس اور قوم کو "قومی ترانا" یا NATIONAL ANTHEM "جنا۔گنا۔منا" دیا ہے، بلکل اسی طرح ہم نے دیس اور قوم کو "قومی لوری" یا NATIONAL LULLABY دی ہے۔ حقیقت میں دیس اور قوم کے لیے یہ ایک بلکل اچھوتا نیا اور لاجواب تحفہ ہے! جس طرح "قومی ترانا - جنا۔گنا۔منا" ہر سرکاری اور غیر سرکاری تقریب یا FUNCTION میں کشمیر سے لے کر کنیا کماری اور آسام سے لے کر راجستان تک سارے ہندستان میں گایا جاتا ہے، بلکل اسی طرح ہماری دی ہوئی بلکل ہی جدید اور نئی "قومی لوری" بھی بلاتفریق مذہب و ملت، سارے ہندستان مائیں گا کر اپنے بچوں کو سلا سکتی ہیں!

یہ لوری حقیقت میں شاعر باسط بسوانی نے لکھی ہے، جو اکتوبر ۱۹۷۲ء کے "حریم" لکھنؤ میں چھپی تھی۔ اصل لوری سو فیصد اسلامی ہے، جو صرف مسلمان مائیں گا کر اپنے بچوں کو سلا سکتی ہیں، اس لیے یہ لوری کسی دوسرے فرقے یا مذہب کے بچوں کے کام نہیں آسکتی۔ ہم تھوڑے سے سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر اس لوری میں حالیا ہندستانی لیڈروں یا HEROES کے نام رکھ دیے جائیں، اور چند لفظی تبدیلیاں کر دی جائیں تو یہ لوری آسانی سے "قومی لوری" میں تبدیل ہو سکتی ہے، جس کو ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی، پارسی، بدھی، جینی وغیرہ مائیں گا کر اپنے بچوں کو سلا سکتی ہیں، چنانچہ ہم نے خالد کی بجائے دُلبھ (سردار ولبھ بھائی پٹیل) مذہب کی بجائے کرمی (یا تاگاتگی) سنت کی بجائے نہرو (جواہر لال نہرو) طالبت کی بجائے راجندر (ڈاکٹر راجندر پرشاد) وحدت کی بجائے مولانا (مولانا ابوالکلام آزاد) یعنی ان پانچ بڑے قومی لیڈروں کے نام بٹھا دیے ہیں، اور اس کے بعد یہ فروری ترمیم بھی کی کہ دین کی بجائے قوم، اور مذہب کی بجائے ملت، اور اسلام کی بجائے ہند، اور ملت کی بجائے دیس، اور خدا کی بجائے تپا، اور اللہ اللہ کی بجائے ماتا پتا جیسے موزوں ترین واقعی حقیقت میں اور بلا مبالغہ الفاظ نگینوں کی طرح جڑ دیے ہیں، چنانچہ تھوڑی سی رد و باشی کے بعد ایک نہایت ہی فروری اور اہم "قومی لوری" تیار ہو گئی جو اس نمبر میں اس نوٹ کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ سیکولر ہندستان کے لیے ایک سیکولر "قومی لوری" کی ضرورت تھی، جس کو آج ہم نے پورا کر دیا، اور اب یہ ہمارے تمام ہندستانی بھائیوں کا کام ہے کہ وہ اپنے گھروں کی عورتوں کو اس "قومی لوری" سے واقف کرائیں، تاکہ مائیں وغیرہ اپنے بچوں کو سلاتے وقت کسی دوسری لوری کی بجائے یہ "قومی لوری" گایا کریں! باسط بسوانی کی اصل "اسلامی لوری" اپنی جگہ موجود ہے، اور ہماری اس جدت اور "ذہانت طبع" سے اس لوری کو اپنے نقطۂ نظر سے ایک سیکولر ہندستانی لوری کے قومی سانچوں میں ڈھال لینے سے اصل لوری پر کوئی آنچ نہیں پڑ سکتا!

یہ واضح رہے کہ ہمیں اس بات کا پورا پورا اعتراف ہے کہ اس "قومی لوری" کے سب اشعار شاعر باسط بسوانی کے لکھے ہوئے ہیں، چونکہ ہم، خدا شاعر نہیں ہیں، اس لیے اپنی طرف سے ایک شعر بھی نہیں لکھا ہے، مگر یہ ضرور ہے کہ دماغ شاعرانہ پایا ہے، جس کا ثبوت مسلسل اور پے در پے دیے چلے آرہے ہیں۔ اس کو ہمارے بعض معاصر ہمارے "انا" EGO پر محمول کرتے ہیں۔ ہمارے "انا" کو وہی لوگ اگر حقیقت کے آئینے میں دیکھیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے متعلق اپنے حاسد انا ناپاک جذبے سے باز آئیں۔

ہم اپنے انہیں حاسدوں سے سوال کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی "حریم" لکھنؤ ضرور بغور دیکھا ہوگا، اور باسط بسوانی کی "لوری"، یا اسلامی لوری بھی دیکھی ہوگی۔ اس لوری کو چھپے پورا ایک سال گذر گیا، پھر انہوں نے ضدی دماغ کیوں نہیں دوڑایا اور ایک ٹھیٹ اسلامی لوری کو "قومی لوری" میں کیوں نہیں بدل دیا جو اس کے لیے خاص دماغ کی ضرورت ہے، چنانچہ ہم نے اپنے "خاص الخاص" دماغ سے کام لیا، اور اوپر گنائے گئے ہندستانی لیڈروں کے نام بلکل یکساں کی طرح جڑ دیے، اور چند فروری لفظوں میں ردّ و بدل کر کے ہندستانی قوم کا اہم ترین ضرورت کو پورا کر دیا! اب ہم شاعر باسط بسوانی اور "حریم" لکھنؤ کے شکریے کے ساتھ سیکولر کو ہندستان کی سب ہی مائیں گا کر [illegible] یہ لاجواب، بے نظیر [illegible]

دیتے ہیں!

جی - ام - خان ام - اے (عثمانیا)، خالق "قومی لوری" اور ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

قومی لوری

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منھ دھونے والے

ماں کے دلارے باپ کے پیارے — لخت جگر اے آنکھ کے تارے
گھر کی رونق گود کی زینت — مال مرے اے میری دولت
سو جا سو جا میرے پیارے — سو جا سو جا راج دلارے
تجھ پہ تصدق تجھ پہ واری — چھوڑ دے پیارے گریہ وزاری

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منھ دھونے والے

قوم کا اپنی نام کرے تو — دنیا میں وہ کام کرے تو
دلبھ سا جانباز بنے تو — بیکس کا دمساز بنے تو
قوم کا اپنے پاس ہو تجھ کو — ملت کا احساس ہو تجھ کو
علم و ہنر کا ذوق تجھے ہو — فن ادب کا شوق تجھے ہو

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منھ دھونے والے

بخت کا تیرے تارا چمکے — تجھ سے نام ہمارا چمکے
دل سے ہو ہندکا حامی — دیس کے ہر کام کا حامی
گاندھی کی تقلید کرے تو — نہرو کی تجدید کرے تو
خضر راہ راجندر ہو تو — رہبر منزل مولانا ہو تو

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منھ دھونے والے

نام پتا کا لیتی ہوں میں — تجھکو لوری دیتی ہوں میں
چپ ہو جا تا پتا سن کر — سو جا میرے ننھے دلبر
سو جا میرے جان سے پیارے — سو جا میرے راج دلارے
گود میں آتے آتے سو جا — اے میرے نیند کے ماتے سو جا

سو جا میرے رونے والے
اشکوں سے منھ دھونے والے

شہریور۔ مہر۔ آبان ۱۳۸۲ھ ش ہندستانی ادب جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۷۳ء

کالیداس گپتا رضا

"بہار شفق" اور منشی کنج بہاری لال شفق

"بہار شفق" منشی کنج بہاری لال کرتپوری متخلص بہ شفق کا دیوان ہے جو آج سے سڑسٹھ سال پہلے ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء سمت ۱۹۶۱) میں مطبع مفید عام آگرا سے باہتمام منشی قادر علی خان صوفی طبع ہوا۔ منشی کنج بہاری لال شفق کرتپوری اس دیوان کے چھپنے کے وقت ریاست کنڈ بلا متعلق دارالسرور راج سوائی جے پور کے وکیل تھے۔ قوم کے کایست تھے۔ دیوان میں ایک "قصیدا در مدح وستائش اہل برادری کایست سبھا لاہور" بھی شامل ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شمالی ہندستان میں مدت تک سخت کساد بازاری کا دور دورا رہا۔ کایست معززین بھی جو اپنی ہشیاری اور عالی دماغی سے ہمیشا راج دربار میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز رہتے تھے، در بدر ٹھوکریں کھانے لگے، قصیدے میں اسی کیفیت کا ذکر کیا ہے ؎

کری نہ طالع ناسازنے مددگاری
ملائے خاک میں افلاک نے سب ہشیاری
کبھی دکھن گئے اتر کبھی گئے پچھم
تلاش رزق میں ازحد ہوئے خجل عاری
یہ سچ کہا ہے شریفوں کو ہے بڑی مشکل
خدا کسی کو دکھائے نہ ایسی ناداری
یہ التماس ہے اہل سبھا کی خدمت میں
جو اپنے بھائی ہیں ان کی کریں مددگاری

شفق ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں۔

نہ استادوں سے صحبت ہے نہ اس کو فکر سے فرصت ہے
خدا جانے شفق نے کی ہے پیدا یہ زباں کیوں کر

اس سے یہ مغالطا ہوتا ہے کہ شاید ان کا کوئی استاد نہیں تھا، اور وہ طبع موزوں اور رشحۂ فیاضی کے بل بوتے پر شعر کہنے پر قادر ہو گئے تھے، یہ صحیح نہیں۔ اس شعر سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ جس مقام پر سکونت پذیر تھے، وہاں انہیں استاد کی صحبت میسر نہ تھی، ورنہ ایک اور قطعے میں انہوں نے اپنی شاگردی کا نہایت خلصانا اقرار کیا ہے ؎

کر دیا پیش جو کچھ مجھ سے بن آیا لکھ کر
ہے مری شرم شفق اب مرے استاد کے ہاتھ

مگر ان کے استاد کون تھے؟ جواب خدا انہیں کی زبانی سنیے ؎

طفیل حضرت مجبور سے پورا ہوا دیواں
وگرنہ اے شفق جانی یہ محنت رائیگاں میری

احمد مرزا خان صاحب آگاہ تلمیذ غالب نے بھی دیوان کے تاریخی قطعے میں اس کا ذکر کیا ہے ؎

فیض مجبور را بہ بیں کہ شفق
ہر سخن را چو مسلک گوہر سفت
سال تاریخ دے سروش آگاہ
از سر جہد نظم رنگیں گفت

۱۳۲۳ھ

شفق کا ذکر ہمیں کسی تذکرے میں نہیں ملا۔ "آثار الشعراء پنور" ۱۸۸۶ء کی اشاعت کے وقت وہ شاید اس قابل نہ تھے کہ تذکرے میں جگہ پا سکے، مگر تعجب ہے کہ ان کا ذکر "خمخانۂ جاوید" (لالہ سیرام) ہندستانی شاعری کے ارتقا میں ہندوؤں کا حصا (سرویاستو) "ہندوؤں کی (رفیق نارہروی) "تذکرۂ شعرائے بے بدل" (شاکل) وغیرا میں بھی کہیں نہیں ملتا۔

شفق جملا اصناف سخن پر قادر تھے۔ ان کے دیوان میں غزل، قصیدا، مثنوی، نظمیں، قطعا، رباعی سب موجود ہیں۔ اپنے دیوان کی ایک تاریخ رباعی کے وزن میں کہی ہے، اور کیا خوب کہی ہے ع "ایں تحفۂ عشق است کہ دیوان منم"

کئی نظمیں اور غزلیں صنعت ترشیح میں ہیں، تاہم شفق کا اوڑنا بچھونا غزل اور حرف غزل ہے۔ اپنا ہر مطلب وہ اسی صنف کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ زبان صاف، شستہ، رواں اور سنجی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں کی، کی جگہ کی اور کرتے ہیں کی جگہ کریں ہیں بھی لکھ جاتے ہیں، مگر بہت کم۔ پر بعض مگر اور مگر بعض شاید کہیں ایک دو جگہ پر آیا ہے۔ ان کے دیوان میں بہالا جامولی سنگ کے فرزند ارجمند کی دلالت پر کہا ہوا قطعۂ تاریخ سب سے پرانا ہے جس کے عدد ۱۸۸۶ء ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا زمانہ شفق کم سے کم ۱۸۸۰ء سے شروع ہوا ہوگا، ورنہ ۱۹۰۵ء میں وہ اس قدر پختہ اشعار نہ کہہ سکتے تھے۔

شفق مذہباً ہندو تھے، مگر ہندستانی شاعری کی ہمہ مذہبیت کی روایت نے ان سے ایسی بے ساختگی سے اسلامی اشعار کہلوائے ہیں کہ الدیر بے اختیار مسلمان ہونے کا گمان ہوتا ہے، غزلیات کے حصے کا آغاز ملاحظہ فرمایئے۔

ہوں ثنا خواں ذات پاک ایزد سبحان کا
مد بسم اللہ ہے مطلع مرے دیوان کا
جا بجا جو سورۂ الحمد کی تفسیر ہے
ہے مرا دیوان گویا ترجمہ قرآن کا
اپنی رحمت سے خدا نے بھیجکر اپنا حبیبؐ
راستہ ہم کو بتایا دین اور ایمان کا
ہر سبق میں پہلے لازم ذکر ہے اللہ کا
ہے یہی روز ازل سے حکم بسم اللہ کا
پیش طاق ابروئے جاناں ہوں مصروف سجود
مجھ کو گھر بیٹھے میسر حج ہے بیت اللہ کا
کیوں اٹھاؤں میں شفق اب سفر دور دراز
دل میں مکہ مرے سینے میں مدینہ نکلا
قدم ان کے شفق کس کس محبت سے لئے میں نے
پھرے جو زائران روضۂ احمدؐ مدینے میں

کربلا کی جنگ و جدل کی لڑائی میں امام حسینؑ کا شہید ہونا ایسا واقعہ ہے جسے تاریخ عالم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ہندستانی کا شاید ہی کوئی ہندو شاعر ایسا ہوگا، جس نے کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں انتہائی عقیدت سے اس کا اظہار نہ کیا ہوگا۔ بعض مقامات پر تو ان کا اثر ان اس قدر اونچی ہوتی ہے کہ وہ بالکل اہل اسلام، بلکہ اہل تشیع سے بڑھکر اڑتے دکھائی دیتے ہیں، شفق بھی اس میدان میں پیچھے نہیں کہتے ہیں ؎

جنت انہیں کے واسطے ہے بالیقیں شفق
دنیا میں جو غلام شہ کربلا کے ہیں
یاد ہے اس کو شفق آل پیمبر کی پیاس
نالے کرتا ہے لب نہر جو ہر دم پانی

آخر میں ہے ہندستانی شاعری پر جس نے مذہبی تعصب کے ہیبت ناک دیو کو شعر کے آئینے میں لاشکل بنا کے رکھ دیا ہے۔ شفق کے دیوان میں جو ۲۲۵۰ صفحات کو محیط ہے، اور جس میں شاید تین ہزار سے زاید اشعار درج ہیں، سوائے شاعر کے نام کنج بہاری لال جو ایک ہندو ریاست کے وکیل تھے، اور کچھ تاریخوں کے جن میں بڑی مشکل سے شاید ہی کوئی ایسی چیز موجود ہو جس سے ثابت ہو کہ شفق مسلمان نہیں، بلکہ ہندو تھے۔ کسی ہندو سردار نے بادلی تعمیر کرائی اس کا قطعۂ تاریخ ملاحظہ فرمایئے ؎

برآمد ہوا اس میں وہ آب شیریں
جسے دیکھ پھیکا ہوا آب کوثر
زروئے قلم بہر تاریخ لکھ دو
یہ ہے چاہ زمزم پر از آب خوشتر
سنہ ۱۹۵۲ء

پانی کو گنگا جل نہیں آب کوثر کہا، اور بادلی کو شوجی کی جٹاؤں کے سوتے سے نہیں، بلکہ چاہ زمزم سے تشبیہ دی ہے۔

۱۹۰۰ء کے لگ بھگ مشیر مادھو سنگ، بی اے چانڈی سوانی رام گڑھ کی نظامت کے زمانے میں اندرون گڑھ ایک باغیچے کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس کا قطعۂ تاریخ بھی کنج بہاری لال شفق ہی نے کہا اور حق یہ ہے کہ بے مثال کہا اور ہندستانی شاعری کی روایت کو زندہ رکھا، یعنی ایک لفظ بھی ایسا نہ لائے جس سے یہ گمان ہو کہ کارنامہ ہندو ریاست کے ایک ہندو سردار کا ہے، اور اس کے گن بھی ایک ہندو شاعر ہی گا رہا ہے۔ قطعے کی زبان ہندستانی ہے، مزاج ہندستانی ہے، وہ ہندستان جس کا کوئی مذہب نہیں۔ آیئے ہم بھی صرف ہندستانی کی عینک سے اس قطعے کے چند شعروں کا معائنہ کریں اور فراخدلی سے لطف اٹھائیں ؎

نیرنگ زمانہ اس کو کہیئے باغیچہ ہے یا طلسم کا گھر
ہے باغ ارم کا یہ نمونہ حوریں جسے دیکھ کر ہیں شرمسار
اک چاہ ہے مثل چاہ یوسف پانی اس کا ہے آب کوثر
ہر قطعہ یہ سبزہ نو دمیدہ ہر تختہ میں نخل تازہ و تر
نرگس حیرت میں اک طرف ہے خنداں اک سمت ہے گل تر
سرو سہی با ادب کھڑا ہے نازاں جو بن پہ ہے صنوبر
دائم یہ بہار جوش میں ہو آئے نہ خزاں چلے نہ صرصر
خالق سے شفق کی یہ دعا ہے رکھیو سرسبز تا بہ محشر

ہے اس کی یہ لاجواب تاریخ
باغیچہ یہ ہے ارم سے بہتر
۱۹۵۷ء

غزلوں کا رنگ روایتی ہے۔ زبان کا چٹخارا اور حسن و عشق کی داستان پارینہ پوری شان سے جلوہ گر ہیں، مگر بلند خیالی اور مضامین کی جستجو بہت کم ہے۔ ڈھونڈے سے وارداتِ قلب اور تصوف کے اشعار بھی مل جائیں گے۔ سنگلاخ زمینوں میں بھی گلزار کھلائے ہیں، مگر پرواز خیال محدود ہے۔ اس زمانے کے شاعر اس سے ابھی اڑنا بھی نہ چاہتے تھے۔ بندش کی چستی اور زبان و بیان کی درستی کے آگے معانی کی نہ چلتی تھی۔ شفق جانتے تھے کہ ان کے اشعار جوہر معنی سے معرا ہیں، کہتے ہیں ؎

جوہر کے مقابل ہوں شفق کیا مرے اشعار
ہے جوہر معنی سے معرا سخن اپنا

تاہم غزلوں کے اشعار شوخیٔ مزاج اور موزونیت طبع کا پتا دیتے ہیں، ملاحظہ فرمایئے ؎

آنا نہ انہیں یاں مدنظر تھا کہ نہیں تھا
پر جذبۂ دل تجھ میں اثر تھا کہ نہیں تھا
لایا ہے بہر حال جواب خط عاشق
اس کو پئے پیغام قاصد کو گزر تھا کہ نہیں تھا
آخر کو جلا کر ہی رہا خانۂ دشمن
اس نالۂ سوزاں میں اثر تھا کہ نہیں تھا
صبحدم نہ سے وہ آنکھ جو ملتا اٹھا
مچ مچ دھوم کو لو خواب سے فتنا اٹھا
ایک کہنت عدو تھا ہی موذن شب چل
دوسرا مرغ سحر شور مچاتا اٹھا
میری صحبت سے نہ کر ترک نشیں گھبرائیں

رند مجھ سا کوئی دنیا میں نہ ہوگا پیدا
مرتے دم بھی مرے آگے سے نہ سینا اٹھا
ہیں لڑنے تجھ میں اے گل خوشرنگ رنگ ڈھنگ
باغ ارم بھی دیکھ کے ہے دنگ رنگ ڈھنگ
سیکھے لے کوئی ہم سے راہبری
ہادیٔ منزل رضا ہیں ہم
آپ کیوں خون سر پہ لیتے ہیں
زندگانی سے خود خفا ہیں ہم
کہاں اب چھپ کے تم بیٹھو کہ مجھ سے
تمہاری جستجو ہے اور میں ہوں
ہوئیں ہمدرد یار آپس میں للہم
دل پر درد! تو ہے اور میں ہوں
شفق سب سے تعلق میں نے چھوڑا
کسی کی آرزو ہے اور میں ہوں

سلام مچھلی شہری

آئینہ سے ایک سوال

ساز ہوا نہیں کہ سرود فضا نہیں
آئینے! یہ بتا مری رضا یہ کیا نہیں
پھر وہ جو میرے آقا ہیں، میرے "حضرت" بنے ہوئے
آخر سبب ہے کیا جو بہت دور دور ہیں
"کومل" کی زندگی میں وہی دلکشی سی ہے
محسوس ہو رہا ہے مگر کچھ کمی سی ہے
آتی ہے رات یوں کہ کوئی رات ہی نہیں
ہوتی ہے بات یوں کہ کوئی بات ہی نہیں
سونے کی ہے "بیاہ" کی انگوٹھی بھی وہی
کرتہ وہی ہے، جیکٹ پر تصویر بھی وہی
سیر چمن بھی ساتھ ہے، سیر بہار بھی
رہتا ہے ساز دل میں مگر انتشار بھی
یا ان کو اپنا سمجھنے کا دعویٰ کروں نہیں
یا سوچتی ہوں ان کی بھی پروا کروں نہیں
معبود! لوگ یہ بھی کہیں گے "حیا" نہیں!
ساز ہوا نہیں کہ سرود فضا نہیں
آئینے! یہ بتا مری رضا یہ کیا نہیں

شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۲ ف ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۶۳ء

ٹہل سنگ باغی، ایڈیٹر "آزاد بھارت"

دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائیز

اسٹاک ہوم میں ہر ہفتا بیسیوں لوگ نوبل پرائیز کے لیے درخواستیں بھیجتے ہیں - ان میں سے بیشتر تو انعام کے مستحق نہیں ہوتے، لیکن ان ادیبوں اور سائنس دانوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ان کی تخلیق اور تحقیق اتنی بلند پایا نہیں کہ اسے نوبل پرائیز کا مستحق قرار دیا جائے، مگر اس کے باوجود وہ درخواستیں بھیجتے ہیں - سینکڑوں درخواستیں ردی کی ٹوکری کے نذر ہو جاتی ہیں - نوبل پرائیز دنیا کا بیش قیمت انعام ہے، جو ایلفریڈ نوبل کی یاد میں ہر سال دیا جاتا ہے۔

ایلفریڈ نوبل کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو ہوا تھا - اس وقت اس کی عمر ساٹھ برس کی تھی - نوبل ایک فیاض طبع انسان تھا - وہ ٹھگنے قد اور عام شکل و صورت کا، مگر بے حد محنتی آدمی تھا - بلکل سادا زندگی بسر کرتا تھا - دولت مند اور مشہور ہونے کے باوجود اس میں تکبر نام کو نہیں تھا۔ اس نے ڈائنامیٹ ایجاد کیا، اور اس کے ذریعے کروڑوں کمائے اور اس کمائی کا بہت بڑا حصا اس نے ان انعامات کے لیے وقف کر دیا - نوبل پرائیز سب سے بڑا بین قومی علمی اور تحقیق اعزاز سمجھا جاتا ہے - ایلفریڈ نوبل نے شادی نہیں کی تھی - اس کی محبت کا مرکز مرتے دم تک اس کی ماں رہی تھی۔

ایلفریڈ نوبل کو ایک ہی فکر تھی کہ وہ گم نام نہ مر جائے، چنانچے اس نے وصیت لکھی کہ مرنے کے بعد اس کی لاش جلادی جائے - یہ وصیت پوری کر دی گئی - مرنے سے کچھ منٹ پیشتر اس نے ایک اور وصیت تحریر کی جس میں درج تھا کہ میرے عزیزوں اور رشتے داروں میں کچھ رقم تقسیم کرنے کے بعد میری ساری دولت ۳۳ ملین پونڈ جیسے سارے سترا لاکھ پونڈ ایک انعامی فنڈ کے قیام میں خرچ کی جائے - اس رقم سے جو سالانہ نافع ہو اس کو برابر کے پانچ انعاموں میں تقسیم کر دیا جائے - ایک انعام اس آدمی کو دیا جائے جس نے علم طبیعات کے میدان میں کام کیا ہو - دوسرا انعام علم کیمیا، تیسرا انعام علم الادویا کے شعبے میں اہم دریافت کرنے والے کو دیا جائے - چوتھا انعام کسی شاہکار ادبی تخلیق کے مصنف کو دیا جائے اور پانچواں انعام اس شخص کو دیا جائے جس نے اقوام عالم میں امن کو فروغ دینے کے لیے قابل قدر کام کیا ہو، اور یہ سب انعامات بلا امتیاز مذہب و قوم صرف مستحق لوگوں کو دیے جائیں!

ایلفریڈ نوبل کی موت کے بعد سے آج تک ڈھائی کروڑ روپے کے انعامات تقسیم ہو چکے ہیں، سب سے زیادا نوبل پرائیز حاصل کرنے والے جرمن ہیں رملاں میں ان انعامات کا اعلان ہو چکا ہے - چند سال پہلے یہ انعام روسی مصنف شولو خروف کو ملا - دوسرے نمبر پر سب سے زیادا انعامات انگلستان کے لوگوں نے حاصل کیے ہیں۔ اس کے بعد فرانسیسی اور پھر امریکیوں کی باری آتی ہے - سویڈن اور ناروے کے لوگوں نے بھی چھبیس (۲۶) انعام حاصل کیے ہیں - ہندستان میں ادبی انعام صرف "ٹیگور" رابندر ناتھ ٹیگور کو "گیتا نجلی" پر ملا - اقبال اور گاندھی اس قابل تھے کہ انہیں ادبی اور امن کے انعامات دیے جاتے لیکن دونوں کو انعام نہ مل سکا!

۱۹۳۰ء میں ہندستان کے مشہور سائنس دان سر سی وی (اس) کو نوبل انعام دیا گیا - ایک مشہور ہندستانی سائنس دان مسٹر کھورانا بھی اس انعام کے مستحق قرار دیے جا چکے ہیں -

نام بھیجنے کا ایک خاص ضابطا ہے - نوبل کمیٹی کے نامزد کردا چار ہزار آدمی دنیا کے مختلف حصوں میں مقیم ہیں جو انعام حاصل کرنے والوں کی درخواستوں کو نامزد کر کے بھیجتے ہیں - چند برس پہلے اٹلی کے ایک سائنس دان نے اپنے خط میں اپنی تخلیق پر حاشیا آرائی کی - اس سائنس دان نے مصنوعی بارش کے تجربات کیے ہیں۔

اس کا دعوا ہے کہ بخارات کو ایک خاص بلندی پر بارش کی صورت میں منتقل کیا جا سکتا ہے - سویڈن کے ایک جادوگر نے بھی نوبل پرائیز حاصل کرنے کی درخواست بھیجی تھی۔ اس جادوگر کا نام جرگین سس ہے۔

اسی کا دعوا ہے کہ ریڈیو پر سوں پیشتر مر چکے لوگوں کی آوازیں سنتا ہوں اور دوسرے بھی سن سکتے ہیں - اسی طرح ایک ہندستانی کا دعوا ہے کہ سورج حرارت نہیں رکھتا بلکہ سرد ہے۔ سب سے دلچسپ دعوا ایک امریکی مصنف نے کیا ہے - نوبل کمیٹی کا کہنا ہے کہ اس امریکی کی درخواست سب سے زیادا دلچسپ ہے - اسی مصنف نے اپنے اوغ کی نقل نوبل کمیٹی کو بھیجتے ہوئے لکھا ہے کہ "اپنی تخلیق کی نقل بھیج رہا ہوں لیکن یاد رہے کہ اگر آپ نے مجھے اس پر نوبل پرائیز دیا تو میں اسے لینے سے انکار کر دونگا۔

ایک اور دلچسپ دعوے دار ہیں - یہ دعوے دار خوش قسمتی سے سائیڈنی والی ہیں - انہوں نے نوبل کمیٹی کو اپنے ایک خط میں لکھا کہ میں نے ایک مشین ایجاد کی ہے جس کی تفصیل میں نہیں بتانا چاہتا - ہاں نوبل پرائیز ملنے کے بعد ساری تفصیل آپ کو بھیج دی جائے گی - نوبل پرائیز حاصل کرنے والوں کے لیے یہ لازمی امر ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، انعام کے اعلان کے ایک سال کے اندر اسٹاک ہوم پہنچ کر انعام حاصل کر لیں، ورنا یہ انعام ضبط ہو جاتے ہیں اور انعام کی رقم نوبل فنڈ میں جمع کر دی جاتی ہے، چنانچہ ایک بار جرمنی کے ناور ڈاکٹر کارل برڈ ٹاڈ کو کیمسٹری کے نوبل پرائیز کا اعلان ہوا۔ یہ ہٹلر کے عروج کا دور تھا - ہٹلر نے ڈاکٹر کو نوبل پرائیز لینے سے منع کر دیا، چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ڈاکٹر نے اپنے انعام کی رقم طلب کی مگر اسے رقم نہ دی گئی - ہاں سند اور تمغا دے دیا گیا -

شاعر نوبل کمیٹی کو رقم لینے سے انکار کرتا ہے - کہتے ہیں کہ جارج برناڈ شاہ نے اسے لینے سے انکار کر دیا تھا اور انعام کمیٹی کو لکھا تھا کہ میں اس روپے کا کیا کروں گا، چنانچہ نوبل کمیٹی نے جواب لکھا کہ آپ بہ غور سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔ ہفتے عشرا میں شاہ کا دماغ اعتدال اور توازن پر آگیا - اس نے رقم تو وصول کر لی، لیکن اس رقم سے ایک سوسائٹی [illegible]

ثقافتی تعلقات بڑھانے میں مدد دیتی ہے - ابھی چند برس ہوئے، ادبی انعام فرانسیسی ادیب سارتر کو دیے جا کا اعلان ہوا، لیکن سارتر نے انعام وصول کرنے سے صاف انکار کر دیا - سارتر پہلا شخص تھا جس نے اس انعام کو ٹھکرا دیا - اس میں شبا نہیں کہ سارتر ایک عظیم ادیب و مفکر تھا۔ بقول اس کے کہ سویڈن کی نوبل کمیٹی نے اس کی ادبی عظمت کا اعتراف کیا ہے، یہ کوئی سارتر کے لیے فخر کی بات نہیں سارتر بغیر نوبل پرائیز حاصل کیے ہوئے بھی ایک بین قومی شہرت کا ادیب رہا ہے، اور رہے گا -

ہر سال ۱۰ دسمبر کو اسٹاک ہوم میں نوبل پرائیز تقسیم کرنے کی تقریب منائی جاتی ہے - شام کے چار بجے بڑے کنسرٹ ہال میں تقریباً دو ہزار غیر ملکی اور سویڈن کے اکابر جمع ہوتے ہیں، ساڑھے چار بجے گجر بجتا ہے اور شاہ اور ملکا کی آمد پر موسیقی شروع ہو جاتی ہے - بادشاہ اور ملکا کرسی پر جلوا افروز ہو جاتے ہیں - پھر سویڈن کی اکاڈیمی کی طرف سے ایک ایک انعام کا اعلان ہوتا ہے، اور اعلان کے ساتھ ساتھ بادشاہ ہر انعام، سند اور تمغا اپنے دست مبارک سے عنایت فرماتے ہیں - اس رسم کے بعد سب لوگ ایک دعوت میں شریک ہوتے ہیں - اس میں بادشاہ، ملکا، اکاڈیمی کے ممبران اور دو ہزار موجود اکابر اور علما حصا لیتے ہیں -

موسم بہار میں منتخب نامزدگیوں پر غور ہوتا ہے، اور خزاں کے دنوں میں اس بات پر بحث ہوتی ہے - آخری فیصلا اکتوبر میں کیا جاتا ہے - یہ قابل ذکر ہے کہ ادب کے انعام کے علاوا دوسرے انعاموں کے متعلق پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ غور کرنے والی اکاڈیمی میں (۱۸) اراکین ہیں جو ہر تخلیق و تحقیق پر اپنی رائے تحریری تبصرے کی شکل میں پیش کرتے ہیں - ان میں ہر ایک ممبر ملک کا مشہور ادیب اور دو تاریخ دان ہیں ہر سائنس اور ایک بڑے افسر ہیں - ان اراکین کی اوسط عمر ستر برس کی ہے - سب سے کم عمر کا رکن (۵۴) برس کا ہے اور سب سے زیادا عمر والا رکن اسی برس کا ایک شاعر ہے -

عموماً انعام پانے والے زیادا عمر کے ہوتے ہیں سب سے کم عمر کا نوبل پرائیز پانے والا رڈیارڈ کپلنگ تھا جس [illegible]

سائنس داں برسوں اسی انعام کی آس لگائے رہتے ہیں اور اسی انتظار میں اکثر کی عمریں گزر جاتی ہیں۔

۱۹۷۲ء کا ادب کا انعام مغربی جرمنی کے مشہور ناول نگار، ہائینرش بوئیل کو دیا گیا۔ یہ انعام (۴) لاکھ (۸۰) ہزار سوئیڈ کروڑ یا (۷) لاکھ (۲۰) ہزار ہندستانی روپے کے برابر ہے، اور اسی سال کا میڈیسن کا انعام دو ڈاکٹروں میں تقسیم کیا گیا (۱) پروفیسر ڈاکٹر رادے نوف آف آکسفورڈ یونیورسٹی انگلینڈ) اور (۲) ڈاکٹر جیرالکا البڈامن آف راکیفیلر یونیورسٹی کے ویلیو یا اوورگ، روبیکا کو دیا گیا۔

دیدپرکاش شرما

عورت جس کے چار نام ہیں

ماں

ابھی جبکہ تھا دودھ پینے کا عادی
مجھے اپنی آغوش میں کسی نے جگہ دی
مجھے کس نے مٹی سی لوری سنادی
مرے دکھ میں کس نے مسرت پھیلا دی
کبھی گدگدی سے ہنسایا تھا کس نے
کبھی تھپکیوں سے سلایا تھا کس نے
مرا کون الفت سے منہ چومتی تھی
پنگوڑے کے چاروں طرف گھومتی تھی
پلا کر مجھے دودھ کس نے دی طاقت
مجھے بخشی دی کس نے جاہ و حشمت
وہ عورت ہے جسکو میں کہتا ہوں ماں ہے
اسی سے خوشی ہے اسی سے جہاں ہے

بہن

ابھی جبکہ مٹی سے کرتا تھا کھیلیں
بناتا تھا مٹی میں مٹی کی رلیں
مرے ساتھ کس نے کھلونے بنائے
کبھی ہاتھ کس بیگناہ پر اٹھائے
مجھے گھر میں کس پر یہ حاصل تھی سبقت
وہ تھی کون مجھ سے جو کرتی تھی الفت
مجھے بھائی کہہ کہہ کے کس نے بلایا
مرے رونے پر مجھ کو کس نے ہنسایا
مجھے چلنا پھرنا سکھایا کس نے
مرے ساتھ جھولا جھلایا تھا کس نے
وہ عورت ہے عورت ہے بہن نام اس کا
کرے پیار بھائی سے ہے کام اس کا

بیوی

گذرتا گیا وقت — آئی جوانی
بدل سی گئی میری جیون کہانی
ہوئی کس کو محسوس مجھ کو ضرورت
میری آنکھوں میں کس کی رہتی تھی صورت
وہ تھی کون — روٹھے پہ جسکو منایا
وہ تھی کون — جس کی ہنسی نے ہنسایا
میں چھوں یہ کس کی تھی بلہار جاتا
وہ تھی کون جس کو میں دل کی سناتا
مری سیوا میں کس نے تن من لگایا
مرا ساتھ دکھ سکھ میں کس نے نبھایا
وہ عورت ہے جس کو بیوی پکارا
وہ میرا سہارا میں اس کا سہارا

بیٹی

جوانی کو میرا ٹھکانے لگانے
گرہستی کی مجھ کو میرے خدا نے
میری ایک لڑکی اور ایک لڑکا
بہت پیار دونوں سے دن رات کرتا
سمجھتا تھا لڑکی کو دولت پرائی
اسی سے زیادہ محبت بڑھائی
مرے واسطے تھا یہ ہردم ضروری
میں کرتا رہوں اس کی ہر مانگ پوری
کبھی اس کو کندھے کے اوپر اٹھایا
کبھی اس کو گھٹنوں پہ اپنے بٹھایا
یہ عورت ہے بیٹی دل و جان سے پیاری
بڑی لاڈلی، بھولی بھالی، دلاری

شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۲ ف ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۳ء

خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی

یہ دلی ہے

میرے ایک دہلوی دوست کو جو بغداد میں ملازم ہیں بڑی حیرت اس بات پر ہے کہ وہاں ایک کلو دودھ خریدو تو دیڑھ کلو ملتا ہے، اور وہ بھی خالص! انہوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہوش سنبھالا ہے، اس لیے ملائی کے اصل مزے سے بھی وہ بغداد جاکر ہی واقف ہوئے ہیں!

دلی کے ڈھنگ آج کل نرالے ہیں۔ پہلی مٹی خریدنے جایئے تو سونے کی تول لے گی، اور کسی نے جھکتی ہوئی تول تولی تو سمجھ لیجیے کہ ترازو میں کچھ گڑبڑ ہے! فتح پوری اور کھاری باؤلی کے نکڑ پر تو تازا اور خشک میوے کے بعض دکاندار ایسے ہیں کہ بازار سے کم بھاؤ بتائیں گے، خوب جھکتا ہوا تولیں گے، مگر گھر پہنچنے کے بعد آپ کا سر پھر سودا آدا سیر ہی نکلے گا! قسمت نے بہت یاوری کی تو تین پاؤ۔ اس سے زیادا کی امید نہ رکھیے، اور صرف چھلکیں۔ کاغذ کی تھیلی بظاہر ہری نظر آئے گی جس میں آپ نے خدا اپنے ہاتھ سے چھانٹ کر سودا رکھا تھا، لیکن ہاتھ کی صفائی سے یہ تھیلی بدلی جاچکی ہوگی اب اس میں سے خراب مال اور کوڑا کرکٹ بھی برآمد ہو تو تعجب نہ کیجیے۔

دلی اور بغداد کے اس فرق کا وجوہ ممکن ہے متعدد ہوں — لیکن مجھے تو اس میں سب سے زیادا "بدنام اسلام" کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

قرآن نے پورا تولنے کا اس طرح بار بار حکم دیا کہ مسلمان مارے احتیاط کے سوایا اور ڈیوڑا تولنے لگے۔ ایران، عراق اور سعودی عرب کم سے کم ان تین مسلمان ملکوں کو میں نے بھی دیکھا ہے، وہاں "دھرم کانٹے" کا انسٹی ٹیوشن مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اسلامی تعلیمات نے وہاں کے ہر "کانٹے" کو "دھرم کانٹا" کہتے ہیں ۱۹۴۷ء سے پہلے دلی کا بھی یہی حال تھا۔ دکاندار اکھڑ اور بدمزاج ضرور تھے — اور کیوں نہ ہوتے۔ ؟ کون انقلاب تھا جس سے وہ نہ گزرے ہوں اور کون سی بپتا تھی جو ان پر نہ پڑی ہو ؟ اس لیے "یاد بہاری" سے ان کا "بیزار" ہونا قدرتی تھا! تاہم "مول" میں سختی کے باوجود "تول" کے بارے میں ان کی شکایت کم ہی سنی جاتی تھی۔

دلی کی تہذیب ۱۹۴۷ء کیا ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی خالصتاً اسلامی تہذیب نہ تھی پھر بھی بقول کسے ؎

"خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے"

مسلمان کہلانے والے بادشاہ، چاہے وہ اکبر اعظم جیسے سفلی ہی کیوں نہ ہوں بہت سی اسلامی روایات کے حامل تھے، چنانچہ کچھ سرکار دربار کا اثر کچھ مسلمان صوفیا کی تبلیغ اور صحبت کا فیض، دلی کے تمدنی مطلع پر اسلامی روشنی خوب تھی۔ "تھی" کو ذرا زور دے کر پڑھیے —

کیونکہ سورج تو ۱۸۵۷ء ہی میں ڈوب چکا
تھا چاندنی ۱۹۴۷ء سے ڈھلنے لگی، اور اب
تو بس تاروں بھری رات ہے!

عید بقر عید کی نمازیں پہلے وہ لوگ بھی لازمی طور پر پڑھا کرتے تھے۔ جن کو چھ زاید تکبیریں کیا۔ جمعہ کی نماز بھی نہ آتی تھی، نماز کے بغیر عید کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔ آج کل نماز کی جگہ سویوں نے لے لی ہے۔ نئی دلی کے بہت سے مسلمان گھروں میں عید کی واحد علامت سویاں ہیں، اور یہ فیشن بھی اس وجہ سے قایم ہے کہ برادران وطن میں سے کوئی عید کی مبارک باد دینے آگیا تو کیا ہوگا، عید کے دن غیر مسلم دوست یہ توقع رکھتے ہیں کہ جل پان کے ساتھ انہیں سویاں بھی کھانے کو ملیں گی، گویا عید کی یہ دودھ پوہے کی نشانی بھی غیر مسلم احباب کے طفیل باقی ہے ؎

"پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"

ایک وزیر کے ہاں ملاقات ہوئی - میں نے یوں ہی پوچھ لیا "کہیے آپ نے نماز کہاں پڑھی؟ پہلے تو کچ سٹ پٹائے، پھر سنبھل کر بولے، جی! میں نے تو گھر میں ہی پڑھی تھی!

ان بے چاروں کو اسلام اور اسلامی قانون سے جو نئی نئی دلچسپی پیدا ہوئی ہے، وہ بھی برادران وطن کی خاطر پیدا ہوئی ہے، ورنہ سچ پوچھیے تو "قطع تعلق" ایسا مکمل تھا کہ دین و مذہب سے واسطا "عداوت" کا بھی نہ رکھتے!

آپ کہیں گے نئی دلی میں مسلمان رہتے ہی کتنے ہیں؟ ان کو دلی کا شمار تیدا قرار دینا ہی غلط ہے - ڈاکٹر خواجہ ناصرالدین صاحب، حضرت خواجہ میر درد دہلوی کی یادگار اور ان کی درگاہ کے سجادہ نشین ہیں - ان کو آج بھی یہ دعوا ہے کہ دلی شہر فصیل کے اندر ہے - فصیل کے باہر سب گنوار بستے ہیں - میں ان سے عرض کرتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء سے قبل تو یہ بات ایک حد تک درست تھی، مگر آج کل درست نہیں ہے - آج کل شہر فصیل کے باہر ہی بستا ہے، اور فصیل کے اندر؟ کیا کہا جائے - فصیل کے اندر تو شہری یا گنوار جو بھی رہتا ہے "آہیں" کہنے والوں میں ہے -

۱۹۴۷ء سے پہلے دلی والوں کے لیے معیار ہر معاملے میں لال قلعا تھا - قلعۂ معلا کی زبان "اردوے معلا" کہلاتی تھی - بادشاہ اور قلعے والے جس طرح بولتے جاتے تھے جس طرح رہتے سہتے جو ان کا انداز فکر ہوتا شہر والے بھی بلا لحاظ مذاہب دولت اس کی نقل اور تقلید کرتے، بادشاہت ختم ہوئی قلعا اجڑا - تو معیار بھی ختم ہو گیا - قلعے کی جگہ سول لائین نے لینے کی کوشش ضرور کی، مگر اس میں پوری پوری کامیابی اس کو نہ ہو سکی سول لائین والے غیر ہی سمجھے گئے -

۱۹۴۷ء کے بعد نئی دلی والے غیر نہیں رہے، قلعے کی گدی نئی دلی نے سنبھالی، اور خوب سنبھالی، ہر معیار نئی دلی میں بننے لگا، اور دلی کے ساتوں آٹوں شہروں کی زندگی اس نئے معیار کے مطابق ڈھلنے لگی -

محترما اندرا گاندھی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے پرانی دلی کو جھوڑ بے خدا نئی دلی کی کتنی عورتیں بال کٹوا لی تھیں؟

مشکل سے ہزار میں دو چار! اور اب کوئی دن جاتا

بال کٹوانا اچھا ہے یا برا - بحث اس سے نہیں - غرض صرف یہ کرنا ہے کہ جیسا راجا ویسی پرجا جو متمدن حاکموں کا ہوگا، غالب رہنے والوں کا ہوگا، اسی کو محکوم اور مغلوب بھی اختیار کریں گے -

ایک روز دلی کے بار روم میں وکیل صاحبان ہنسی ہنسی میں رہے تھے، اکثریت پنجابیوں کی تھی، انہوں نے ایک پرانے دلی والے، ہندو وکیل کو ذرا الگ تھلگ دیکھ کر چھیڑا کہ دلی والوں کو پہننا اوڑھنا اور کھانا پینا ہم نے سکھایا ہے - ۱۹۴۷ء میں ہمارے آنے سے پہلے دلی میں نہ کوئی ڈھنگ کا ہوٹل تھا، نہ کوئی سلیقے کا درزی، اور آج دیکھو تو قدم قدم پر عالیشان ہوٹل اور گلی گلی ماہر فن درزی نظر آئے گا -

دلی والے وکیل اکیلے تھے، مگر وکیلوں کے چھکے کیسے چھڑاتے، کھنکار کر بولے، بھائیو! بات آپ نے سچ کہی واقعی آپ کی آمد سے قبل یہاں ایسے ہوٹل اور اتنے درزی نہ تھے، مگر اس کی وجہ یہ آپ نے غور نہیں فرمایا، ہمارے ہاں تو رواج یہ تھا کہ گھر والی ہی ہمیں پکا کر کھلاتی بھی تھی اور گھر والی ہی ہمیں سی کر پہناتی تھی، اس لیے ہم ہوٹل اور درزی دونوں سے بے نیاز تھے - آپ کے ہاں خاتون خانہ بے چاری کو زینت کاشانہ بننے کی مہلت ہی نہیں ہے، اسے دفتر جانا اور کمانا پڑتا ہے -

اس لیے آپ ہوٹل آباد نہ کریں، اور درزی کے
ہاں کے پھیرے نہ لگائیں تو کام کیسے چلے؟

مسلمانوں کے رائج وقت پردے کو لوگ راجستان کے ہندوؤں کا پردا بتاتے ہیں - واللہ اعلم راجستان میں پردے کا رواج کب سے ہے؟ وہاں کے مندروں کی مورتیوں سے تو پتا چلتا ہے کہ پرا چین کال میں پردے کا کوئی وجود نہ تھا، البتا بعد میں ضرور یہ حالت ہو گئی کہ جا بجا مسلمان حکمرانوں کے ایک راجستانی ہندو استاد کی بیوی دلی آئیں تو مسلمان عورتوں کا سا برقعا اوڑھنے لگیں - اصل میں مغل دربار میں راجپوتوں سے متاثر ہوا تھا وہاں اس نے راجپوتوں پر اپنی چھاپ بھی بڑی گہری لگائی تھی، اسی لیے اسلامی پردا راجستان میں اکبر آباد اور دلی کے قلعوں سے پہنچا ہو تو کیا عجب ہے -

دلی والوں کا نئی نسل پردے سے بڑی حد تک بے نیاز ہے - ایک وقت تھا کہ دلی کے پرانے ہندو گھرانوں کی خواتین

گھرانوں کا کیا ذکر بڑے بڑے قدامت پرست مسلمانوں کی بچیاں بے حجاب اور بے جھجک اسکول کالج آتی جاتی ہیں۔

یہ بے حجابی جہاں بہت سے فوائد اپنے ساتھ لائی ہے، وہاں اس سے نقصان بھی زبردست پہنچا ہے۔ ہندو مسلم شادیاں بہت کچھ اسی بے حجابی کی دین ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شادیوں کے ذریعے ہندو مسلمان شیر و شکر ہو رہے ہیں۔ دولی مٹ رہی ہے، اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے؟

لاریب! دولی کا مٹنا اور شیر و شکر ہونا واقعی بڑی نعمت ہے، مگر ذرا اس کا سائنٹیفک تجزیہ تو کر کے دیکھئے۔ شیر و شکر یعنی دودھ اور مٹھاس جب ملتے ہیں تو دودھ کو اکثریت میں رکھا جاتا ہے، اور شکر اقلیت میں رہتی ہے، ملنے کے بعد فائدہ دودھ کو پہنچتا ہے، یعنی وہ میٹھا ہو جاتا ہے، اور شکر بے چاری جو اقلیت میں ہوتی ہے، اس کا کوئی وجود نہیں رہتا، وہ گھل جاتی ہے، اور مٹ جاتی ہے!

ہندو مسلم شادیاں آج کل بہت ہو رہی ہیں، مگر اس شیر و شکر کے آمیزے میں دیکھا یہ جا رہا ہے کہ ماں مسلمان تب بھی بچے ہندو، اور باپ مسلمان تب بھی بچے ہندو!

دیدہ کاش کفنا ہمارے ایک دوست ہیں۔ ایک روز کہنے لگے، یارو! خوب تماشا ہے، ہم مرد سب جاہل ہو گئے اور عورتیں ہماری عالم فاضل بن گئیں! پوچھا گیا وہ کیسے؟ کہنے لگے آریا سماج والوں نے پنجاب میں مردوں کو ہندستانی پڑھنے سے نہیں روکا، کیونکہ یہ معاشی معاملے کی چیز تھی، البتہ عورتوں کو وہ ہندی پڑھاتے رہے۔ سکھ شاعر کے بعد ہندی آئی تو ہم سب اس سے جاہل تھے اور ہماری عورتیں "دودھاں پنڈت" بنی ہوئی تھیں!

کھنلہ جی نے بڑی عمدہ اور سچی بات کہی۔ نئی ہندو نسل انہی "دودھاں پنڈتوں" کی گود میں پروان چڑھی ہے، جن کو آریا سماج والے پڑھا سکھا چکے تھے، اس لیے اس نسل کے دور میں ہندی کا دور دورا کیوں نہ ہوتا؟ ہندو گھرانوں میں پہلے بھی یہ رواج تھا کہ مرد سرکار دربار سے وابستہ رہتے تھے، مسلم تہذیب کو اختیار کرتے تھے، مگر عورتیں گھر کی چار دیواری کے اندر پرانی چیزیں سینہ کا زندار کھتی تھیں۔ میں بہت سے ایسے ہندو بھائیوں سے واقف ہوں جو مسلمان دوستوں کے ہاں اور ہوٹلوں میں خوب گوشت کھاتے تھے مگر گھر میں ان کی [illegible]

قوم اپنی انفرادیت کو بچانے اور قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔

ہمارے ہاں معاملہ برعکس ہے، مسلمان بچیوں کو عربی اور ہندستانی سے واقف کرانے کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔ دینی معلومات بھی اسکول کالج جانے والی لڑکیوں کو بہت کم ہیں، اس لیے وہ ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ کر اٹھا لیتی ہیں۔

ہمارے گھروں میں پیتل کے ڈھیر دن بدن بڑھ رہے ہیں، نئی نسل کو ورثے میں بھی یہی "دولت" ملتی ہے!

مسلمانوں کی روشنی طبع "آج کل ایک اور لحاظ سے بھی "بلا" بن گئی ہے۔ مردم شماری والے کہتے ہیں کہ برادران وطن کے مقابلے میں ان کی تعداد زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ شکایت بہت پرانی ہے، حضرت خواجہ حسن نظامی رح جیسے معتبر راوی کا بیان ہے کہ کسی جلسے میں پنڈت مدن موہن مالوی نے قدرت سے شکوا کیا تھا کہ اولاد کے معاملے میں وہ بھی مسلمانوں پر زیادہ مہربان ہے، اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بے ساختہ کہا تھا کہ پنڈت جی! ہم اس معاملے میں آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں، وہ تو براہ راست آپ سے تعلق رکھتا ہے۔

بہر حال اس لطیفے سے قطع نظر، مسلمانوں کا تیزی سے بڑھنا جہاں دوسرے ہم وطنوں کے لیے باعث تشویش ہے، وہاں اس نے خود مسلمانوں کے لیے بھی بڑے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ انہی میں سے ایک مسئلہ رہائش کا بھی ہے۔ اتنا مال گراں میں ہے نہیں کہ نئی کالونیوں میں بازار کی قیمت پر پلاٹ خریدیں اور مکان بنائیں۔ رعایتی قیمت پر زمین حکومت صرف شرنارتھیوں کو دے سکتی ہے، کرایہ پر بھی مسلمان کو مکان ملنا کتنا دشوار ہے، اس کا حال انگریزی اخباروں میں چھپ چکا ہے، لے دے کر اب ان کے پاس پرانے محلے اور پرانی فصیل ہے، یا قبرستان اور مقبرے گرمی کے زمانے میں ہزاروں ہزار "کبوتر ان بام حرم" اپنی تنگ و تاریک کابکوں میں سے نکل نکل کر قبرستانوں میں بسیرا لیتے ہیں۔ یکی قبروں کے مکینوں کو یہ خبر کہاں تھی کہ پختہ مزار مرنے والے کے ساتھ زندا سونے والے کے لئے بھی عذاب بن جاتا ہے، خواجہ قطب صاحب رح، چراغ دہلی رح، حضرت خواجہ نظام الدین رح، قدم شریف حضرت خواجہ باقی باللہ رح کہیں چلے جایئے رات کے وقت مردا نیچے اور زندا اوپر سوتا ہوا ملے گا!

چھوڑ گئے تھے - آج کے حساب سے اس کی قیمت کروڑوں نہیں، اربوں روپے ہوگی - اگر اس کا بڑا حصہ کسٹوڈین اور ساہوکاروں کے پاس پہنچ گیا یا ان نوابوں اور جاگیرداروں کے ورثے میں آگیا جن کو نئی اصطلاح میں مخلصے اوقات کے کارکنان کہا جاتا ہے -

وہ زمانے گذر گئے جب ہر مکان میں ایک صحن ہوتا تھا - دالان در دالان ہوتے تھے، پیلو میں کوٹھریاں ہوتی تھیں اور جو ذرا حیثیت دار تھے - وہ دیوان خانے جیسی عیاشی کی چیزوں کے بھی مالک تھے - اب تو خدا کی مخلوق مکانوں کی بجائے دکانوں میں بھی رہنا رکھتی ہے دس دس آدمیوں نے مل کر ایک دکان لے لی - سامان اس میں بند کیا اور خود کسی فیکٹری کے کارخانے یا زیر تعمیر بنگلے کے حوالے کر دیا - دن کو کام اور رات کو کوئی پارک یا قبرستان میں آرام!

یہ بات نہیں کہ دلی کے لوگوں نے اپنے سارے رواج مردہ اور خفتہ کر دیئے ہیں - بعض بزرگوار تو ۱۹۴۷ء کے بعد ایسی اجڑی ہوئی دلی میں آباد ہوئے ہیں جس کا سایہ یہ ہے کہ مٹی میں بات ڈالتے ہیں تو سونا ہو جاتا ہے، مگر ان کو یہ توفیق ہے کہ اپنے بچوں کے لیے کوئی رہائشی کالونی بنا ڈالیں، خود اپنے اور اپنے بچوں کے لیے اچھے مکانات خرید لیتے ہیں - لاکھ شادی بیاہ ہو کوئی سہ تماشا ہو - دن کے بارہ بجے کرنے والا نہیں ملے گا - شراب اور جوئے کی لعنت سے بڑا رونق ہے -

شاہ جہاں نے دلی بسائی تو یہ انتظام کیا کہ کوئی مکان دو منزلہ سے اونچا نہ بننے پائے - [illegible] کی بڑی چوڑی رکھی گئی تھیں اور مکانات کی [illegible] کہ اس زمانے کے مکانوں میں آج بھی [illegible] - اسی روایت کو انگریزوں نے بھی قائم رکھا - شاہ جہاں اور سلاطین نے تو رہائشی علاقے ہی مقرر کیے تھے کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں لیکن ان کا زمین پر رہنا کچھ ہی آتا ہے لیکن ان اڑنے والے انگریزوں نے مرنا نہیں کیوں انہیں شمشان نہیں جاتے دیے - ان کی راکھ بھی آسمان کے بجائے زمین پر پھیلتی رہی - شاید اس لیے کہ انگریز عافیت پسند تھا اور خطرے سے بچ کر گوشہ گیر رہنا چاہتا تھا - جواہر لال ہی کہ یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی وہ کہتے تھے کہ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ پڑوسی کی خبر نہ ہو، چنانچہ یہ صدا سننی تو کہا -

"پڑوسی والیں پرسا کو اچھے پڑوسی پرچڑتے ہیں"

نئی نگریوں میں اندر اور باہر لیٹنے ہیں رہنے والے صبح ہوتے ہی اس بات سے واقف ہو جاتے ہیں کہ جمادار والے نہانے وقت پانی کتنا بہایا - کپڑے کیسے پہنے اور ناشتا کیا ہے کر رہا ہے، ان آبادیوں میں سڑکیں سوداگر کے دل کی طرح تنگ مکانات دولت کے انبار کی طرح بلند اور صفائی روز حشر کے سوالات کا نمونہ ہے!

یہ دل ہے! پچھلے پچیس برس میں بننے والا دل، مگر دل اس کا حال نہیں سمجھتے دنیا کہتا ہے -

اگرچہ ہم بھی ہیں شاکی پر جی یہ چاہے ہے
ہمارے یار کا ہم سے کوئی گلہ نہ کرے

ڈاکٹر ایس - پی تفتہ

غزل

ساز ہستی میں نغمگی نہ رہی
زندگی اب وہ زندگی نہ رہی

تنگ ظلمت ہوا ہر اک سینہ
بندگی آج بندگی نہ رہی

گلستاں میں یہ کون آیا ہے
کسی گل پر فسردگی نہ رہی

جب سے روشن ہوا چراغ غم
حوصلوں میں شکستگی نہ رہی

عشق ہی تو نہیں ہے وجہ ننگ
حسن میں بھی وہ سادگی نہ رہی

ایسا کیا کر گئے [illegible]
[illegible]

شہریور - مہر - آبان ۱۳۵۲ھ ش ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر نورالسعید اختر

ہندستان بابر کی نظر میں

سلطان ظہیرالدین محمد بابر (پیدائش ۸۸۸ھ مطابق ۱۴۸۳ء) کو علم و ادب سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ وہ ترکی زبان کا اچھا ادیب اور نامور شاعر بھی تھا۔ بابر کو روزمرہ کے واقعات قلمبند کرنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ "تزک بابری" اس کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس کے مطالعے سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ بابر نے نہ صرف رنج و تفکر کے شادیانے بجائے، بلکہ اس نے اپنے گرد و پیش کا بھی بغور جائزہ لیا۔ اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کیا، اور ان حقائق پر بھی روشنی ڈالی جو ایک عام آدمی کے دسترس سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اصل میں تزک بابری، وسعت علم، باریک بینی اور تاریخی واقعات کی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اس میں بے لاگ تنقید، حقائق کی پردہ کشائی، برائیوں کا اعتراف، سیاسی، معاشی اور دوسرے حالات کے مرقعے نہایت اچھی طرح پیش کیے گئے ہیں۔

ان باتوں کے علاوہ تزک میں شجاعت، جودت، انگیز کی اور جہانداری کی تابناک مثالیں ملتی ہیں۔ یہ شاہکار تصنیف بابر کی ہمہ گیر اور ہمہ دان طبیعت کا جاذب نظر نقش ہے۔ اس کے علاوہ یہ بابر کی فکری سوچ بوجھ عالمانہ تحقیق و تدقیق مجتہدانہ ثابت و قابلیت، سیاسی داؤ پیچ، ناکامی و محرومی کی داستانیں، دنیوی عروج و زوال، عزیز و اقارب کی بے مروتی فیروں کے خلوص، بلند حوصلگی، استقلال و غیرہ کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہے۔ بابر کی عمر بمشکل بارہ سال کی تھی کہ اسے عملی زندگی سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے کمسنی ہی میں کئی ایسی باتیں دیکھیں کہ ان پر یقین نہیں آتا۔ اس کی زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے دارالسلطنت فرغانا کا حاکم بن بیٹھا اور کبھی بے سروسامانی کے عالم میں ..... پھرتا رہا۔

بابری" کی تصنیف میں ہمیشہ منہمک رہتا۔ جب کہ ایک رات باد و باراں کے طوفان سے خیمے شاہی گر پڑا تو کتابوں کے سوا بابر نے اپنی جان کی تک پروا نہیں کی۔ رات بھر قلمی مسودے سے اور اق خشک کرتا رہا۔ سیف و قلم کا دھنی ہونے کے باوجود عالی درجے کا خوشنویس اور موسیقی سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ اس ضمن میں محمد قاسم فرشتا کی رائے قابل غور ہے۔

"در علم فقہ و حنفیہ مجتہد بود، و در علم موسیقی و شعر و انشاء املا نظیر نداشت، وقایع سلطنت خود بہ ترکی بنوع نوشتہ کہ فصحا قبول دارند۔" (تاریخ فرشتا)

ہندستان کی طرف توجہ

۹۱۰ھ میں بابر نے پہلی بار شعبان کے مہینے میں اپنے حاشیوں کے مشورے پر ہندستان پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ اس وقت وہ کابل تھا، بابر نے سفر کا چھ کٹھن منزلیں طے کیں، اور ہندستان کے حدود میں داخل ہو گیا۔ بابر کی ہندستان میں سب سے پہلی قیام گاہ آدینہ پور تھی۔ ہندستان میں ورود کے بعد بابر نے ہر طرح اجنبیت محسوس کی، چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"کرم ملک اور نواح ہندستان کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ یہاں پہنچتے ہی عجیب و غریب عالم نظر آیا۔ چوپائے اور قطع کے پرندے، دوسرے وضع کے قوموں اور قبیلوں کی رسمیں اور کچھ، ایک حیرت پیدا ہو گئی۔ حقیقت میں حیرت کی جا ہے۔"

(تزک بابری صفحہ ۱۴۹)

ہندستان میں جنگ کے بعد بابر نے قوم کیانی کے

رہبری میں درئے خیبر سے گذر کر "جام" کے علاقے میں قیام پذیر ہوا - یہاں اس نے ہندوؤں کے متبرک مقام "کورک تیری" کی سیر کی، جہاں کئی مندر اور شوالے تھے - بابر کی سیماب طبیعت سکون کی قایل نہ تھی - اس نے فوراً دوسرا رہبر ملک سعید بکرانی کو منتخب کیا، اور بکرام کی سیر کو نکل گیا - بابر دریائے سند کو پار کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کے ساتھیوں نے اسے کھکھ کی طرف باگیں موڑنے کا مشورہ دیا - بابر نے اپنے معتبر ساتھی باقی چغانیانی کی بات مان لی اور دریائے سند کو عبور کرنے کا ارادہ ترک کر دیا - اس طرح بابر کا ہندستان میں پوری طرح داخل ہونے کا پہلا منصوبہ پورا نہ ہو سکا - بابر اپنے جانباز سپاہیوں کے ساتھ، افغانوں کو دریائے سند کے کنارے لوٹتا کھسوٹتا "مزار پیر گاؤں" کے سامنے دریائے سند سے علیحدہ ہوا - بابر نے یہاں ان سپاہیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیے جنہوں نے مزار پیر گاؤں کے فیاضوں کو ستایا تھا - پیر گاؤں سے کوچ کرنے کے بعد بابر نے ایک رات موسلا دھار بارش میں گذاری وہ لکھتا ہے -

اسی منزل میں رات کو ایسی بارش ہوئی کہ
جھولداریوں میں سان تک پانی چڑھ گیا -
کمبلوں کو بچھا بچھا کر ان پر بیٹھے - ساری
رات بڑی تکلیف سے گذار کر صبح ہوئی -"
(تزک بابری ص ۱۵۶)

دوسری بار بابر نے ہندستان کا اس وقت رخ کیا، جبکہ قندھار کو شیبانی نے گھیر لیا تھا، اور قلات کا علاقہ بھی بابر کے ہات سے نکل گیا تھا - اسی عرصے میں یعنی ۹۱۴ھ میں بابر کا جانشین ہمایوں پیدا ہوا - بابر نے کابل کے اطراف و جوانب کے افغانوں کی اسی سال گوشمالی کی - چند مشکلات کے باعث اس بار بھی بابر نے ہندستان میں داخل ہونے کی رائے بدل دی -

اسکے بعد بابر نے تلارشد کو ایلچی بنا کر سلطان ابراہیم لودھی کے پاس دلی بھیجا - اس وقت پٹھانوں سے متعلق اسکی رائے یہ تھی کہ "پٹھان بے وقوف ہوتے ہیں، نہ دشمنی کی نیات رکھتے ہیں، نہ دشمنی کی راہ و رسم برت سکتے ہیں، نہ مقابلے میں لڑنے کی تاب رکھتے ہیں، اور نہ ہی بھاگنے کا انداز جانتے ہیں" - (تزک بابری ص ۲۲۷)

چھوٹے حملے کیے تھے، لیکن ۹۳۲ھ میں ہندستان فتح کرنے کے قصد سے نکلا - دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندستان میں داخل ہوا، اور بالناٹ جوگی کے پہاڑ میں قیام پذیر ہوا - ۹۳۳ھ مطابق ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی کو شکست فاش دی - دلی میں داخلے کے بعد بابر سب سے پہلے حضرت شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کی درگاہ پر آستان بوسی کے لیے حاضر ہوا - اس کے بعد حضرت خواجہ قطب الدین کے مزار مبارک کی زیارت سے مشرف ہوا - خاندان غلامان اور خلجی بادشاہوں کے مقبروں کی سیر کی - ہمایوں کو بکر اجیت کی اولاد سے "کوہ نور" بطور نذرانہ ہمایوں نے اسے بابر کو پیش کیا، لیکن بابر نے ہندستان کی فتح کی خوشی میں ہمایوں ہی کو بخش دیا - INSCRIPTS. SECTISN

تزک بابری ہندستان سے متعلق تفصیلی بیان (۲۰) صفحات پر مشتمل ہے، جس سے بابر کے تنقیدی شعور، حقیقت پسندی اور صاف گوئی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے - اس نے جو کچھ دیکھا اس کی بڑے وار تفصیل ہے کم و کاست بیان کر دی - اپنی پسند ناپسند کا بھی اظہار خیال کر دیا - اس نے کہیں بھی اعتدال کا دامن بات سے نہ چھوڑا اور ایجاز و اختصار کے ساتھ کئی باتیں بیان کیں -

تاریخی پس منظر

ہندستان کا تفصیلی بیان شروع کرنے سے قبل بابر نے ہندستان کے جغرافیا پر روشنی ڈالی ہے، پھر ان جلیل القدر سلطان بادشاہوں کا تفصیلی بیان کیا جو دار السلطنت دلی پر متمکن رہ چکے تھے - ۱۵۲۶ء میں ہندستان پر بابر کے تسلط کے بعد پانچ سلطان اور دو ہندو راجا حکومت کرتے تھے - ان کے علاوہ کچھ چھوٹی راجے رجاڑے تھے جو چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے - بڑے پانچ بادشاہوں کے نام یہ ہیں -

(۱) بہیرے سے بہار تک (پٹھان بادشاہ) سلطان فیروز شاہ کے ۵ باری امرا میں سے تھے -
(۲) گجرات سلطان مظفر
(۳) مالوا یا مندو سلطان محمود خلجی
(۴) بنگالہ نصرت شاہ
(۵) دکن کا بہمنی سلطنت

ہندوؤں میں سے دو بڑے راجا

بابر نے بنگالیوں کی بہت سی باتوں پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ بنگالیوں کے یہاں تخت شاہی کو واحد قرار دینے کا جو طریقہ رائج تھا اس پر بابر انگشت بدنداں تھا۔ وہ اس حقیقت کو بنگالیوں کی زبانی اس طرح ادا کرتا ہے۔

"بنگالہ میں بادشاہی یوں حاصل ہوتی ہے کہ کوئی بادشاہ حال کو مار کر جھٹ پٹ تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ اسی کو تمام امراء و وزرا فوج اور رعیت بادشاہ تسلیم کرنے لگتی ہے۔ مقتول بادشاہ کی طرح قاتل بادشاہ کے سب مطیع ہو جاتے ہیں۔ بنگالیوں کا قول ہے کہ ہم تو تخت کے نوکر ہیں جو تخت پر بیٹھے جائے وہی ہمارا بادشاہ ہے۔"

(تزک بابری صفحہ ۲۷۱)

کشمیر کی وجہ تسمیہ

بابر میں فطرت تحقیق اور جستجو کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات کی کھوج میں رہتا، اور کوشش کرتا کہ جو بات وہ لکھے وہ کسی ٹھوس دلیل پر مبنی ہو۔ بابر نے کشمیر کی وجہ تسمیہ سے متعلق جن دلایل سے کام لیا ہے جو قابل غور ہے، وہ لکھتا ہے کہ۔

کشمیر سے بنگالہ تک اس پہاڑ میں وسیع ملک ہے۔ گاؤں کے گاؤں آباد ہیں اور بے شمار قومیں ہیں۔ اس پہاڑی علاقے کی ساری قومیں "کھس" کہلاتی ہیں، چونکہ اہل ہند "ش" کو "سین" پڑھتے ہیں۔ اسی لیے وسیع پہاڑ "کھسیامیر" کہلاتا ہے، اور یہاں کے پہاڑی باشندے اسی مناسبت سے "کھس" کہلاتے ہیں۔ بابر نے کشمیر کے مکمل جغرافیا، معدنیات آب و ہوا، اور پیداوار پر اجمالی نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

ہندو کشمیر کو "سوالک" (سوالک پربت والا ملک) کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔"

ہندستان کے مشہور دریاؤں میں بابر نے سندھ، جہاں بے بیرونی نام کے لکھتا ہے ... ...

بناس، پن بوڑ اور سون کا ذکر کیا ہے۔ آخری چار دریا وسط ہند کے پہاڑوں سے اور بقیا دریاؤں کا منبع سوالک پہاڑ بتایا ہے۔

ہندستانی پہاڑوں سے متعلق بابر کہتا ہے کہ کشمیر کے پہاڑوں کے علاوہ وسط ہندستان کے پہاڑوں پر برف نہیں پڑتی ہے۔ اکثر پہاڑ پتھریلے ہوتے ہیں، شہروں سے متعلق رقمطراز ہے کہ ہندستان میں جتنے شہر اور مختلف ملک آباد ہیں وہ کسی اور ولایت میں نہیں ہیں، البتا ہندستان میں نہروں کا نقدان ہے۔ بابر نے ہندستان میں پہلی بار راہٹ کا استعمال دیکھا تھا، اس نے اسکا پوری تفصیل بیان کیا ہے۔

ہندستانی جانور اور پرندے

سیر و شکار بابر کا آبائی مشغلا تھا، اس لیے اس نے اس رجحان کے مدنظر ہندستان کے جنگلی اور پالتو جانوروں کا نہایت دلچسپی سے مشاہدا کیا۔ ان مقامات کا حال بیان کیا جہاں یہ جانور رہتے پائے جاتے اور پکڑے جاتے تھے، ان جانوروں کی عادات و اطوار، ان کی خوراک، اہمیت اور نوع وغیرا پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ تقریباً (۳۶) جانوروں کی تفصیل درج ہے، جنکے نام یہ ہیں۔

(۱) ہاتی (۲) گینڈا بابر نے سن رکھا تھا کہ گینڈا ہاتی کو اپنی سینگ پر اٹھا لیتا ہے۔ بابر نے اس کا تجربا کیا اور یہ بات غلط ثابت ہوئی (۳) جنگلی بھینسا (۴) نیل گائے (۵) کرتایا (۶) موتا نرجران (ایک قسم کا ہرن) جس کی پیٹھ کالی اور پیٹ سفید ہوتا ہے (۷) چکارا (چھوٹا ہرن) جس کا گوشت نہایت لذیذ ہوتا ہے (۸) بندر (کئی قسم کے) (۹) موش خرما (خرگوش) (۱۰) گلہری (۱۱) قرغاول (ایک پرندا) (۱۲) مور (۱۳) طوطی (کئی قسم) (۱۴) مینا (۱۵) توہ (بوقلموں) بابر نے اسے ہندستان کا کبک دری بتایا ہے) (۱۶) تیتر (۱۷) جنگلی مرغی (۱۸) بلیکار (۱۹) شام (مرغ نانگی کی طرح ایک پرندا) (۲۰) بودنا (ایک پرندا) (۲۱) خرصل (ایک پرندا) (۲۲) حمد (ایک پرندا) (۲۳) دنگ (دریائی پرندا) (۲۴) سارس (۲۵) سکسار (ایک پرندا) (۲۶) یک یک (ایک پرندا) (۲۷) مرغابی (۲۸) مرغ (۲۹) (۳۰) سارود (۳۱) لاقرا ہند (۳۲) مرغ جنگلی (۳۳) شپرا (۳۴) منیا یا مکا ہندستان

(۳۶) کویل (بلبل ہندستان) -

آبی جانور

(۱) شیر آبی - غالباً HIPPOPOTAMUS (۲) لڑیائی سور (۳) تمبز (؟) مچھلی جیسا جانور (۴) گھڑیال (مگرمچھ) (۵) گلکا ماہی (۶) مختلف اقسام کی مچھلیاں (۷) ہنڈک (۸) سسیار (؟)

ہندستانی نباتات

ہندستانی نباتات میں بابر کو آم بے حد پسند تھا، اس لیے اس نے اس کا ذکر سرفہرست کیا ہے -

(۱) آم (۲) کیلا (۳) خربوزہ ہندی (۴) املی (میوا جسکی شراب بنائی جاتی ہے) (۵) کھرنی (۶) جامن (۷) کرک (۸) کٹھل (۹) بڑل (سیب کی طرح ایک پھل) (۱۰) بیر (۱۱) کرونڈا (۱۲) نیالا (سیب کی طرح) (۱۳) گولر (گلے) (۱۴) آملا (۱۵) چرونجی (۱۶) ہندستانی کھجور (۱۷) تارگیل (تاریل) (۱۸) تاڑ (۱۹) تارنج (نارنگی) (۲۰) لیموں (۲۱) ترنج (نارنگی کے مشابہ) (۲۲) کلکل (بڑا لیموں) (۲۳) کرنا (ایک پھل) (۲۴) املی بید (؟) اس پھل سے متعلق مشہور ہے کہ سوئی چبھوئی جائے تو پانی پانی ہو جاتا ہے (۲۵) کملا -

گل ہائے ہندی

مغل بادشاہ پھولوں کے رسیا اور عطریات کے عاشق تھے، پھولوں اور پھلوں سے رغبت انہیں وراثت میں ملی تھی، اسی لیے انہوں نے دور دراز ممالک سے مختلف قسم کے پھولوں کے پودے منگوا کر ہندستانی باغوں کی رونق کو زینت بخشی تھی - بابر نے جن ہندستانی پھولوں کی تعریف کی ہے، ان میں کریل (دیاکل) گلاب، کنیر، کیوڑا، کیتکی، چنبیلی اور چمپا شامل ہیں -

بابر نے یہاں کے موسم، ہندستانی جانوروں کے نام اور دنوں کا مختصر ذکر کیا ہے - اوقات کی تقسیم کے سلسلے میں اس نے ہندستانی گھڑیال کی بابت یہ لکھا ہے کہ -

"اہل ہند نے رات اور دن کے آٹھ حصے کیے ہیں، ہر حصے کو پہر کہلاتا ہے - ہندستانیوں نے پہر کا اندازہ کرنے کے لیے ایک کٹورا پیتل کا طباق جیسی کوئی چوڑی چیز بنائی تھی، جس کی موٹائی دو انگلی تھی، اسے اونچائی پر ٹانگ دیا جاتا، اور اس کے نیچے ایک سوراخ ہوتا، جس میں پانی بھر دیا جاتا تھا - ایک کٹورے کے پیندے میں سوراخ کر کے اسے نند رے میں ڈال دیا جاتا - یہ کٹورا ایک گھڑی میں نیچے رہے سوراخ کے ذریعے بھر جاتا گھڑیال ہر وقت اس کٹورے کو دیکھتے رہتے - جب کٹورا بھر جاتا تو اسے الٹ دیتے، اور ایک گھنٹا بجا دیتے تھے"

ہندستان اوزان میں، رتی، ماشے، تولے کے علاوہ ٹانک کا خصوصی ذکر ہے - مغلیہ عہد میں جواہرات کے تولنے اور بند رتی میں ہار وغیرہ پہننے کی مقدار کا تعین ٹانک ہی سے ہوتا تھا - ہندستانی اقوام کے سلسلے میں بابر لکھتا ہے کہ اکثر و بیشتر لوگ بت پرست اور مختلف تناسخ کے قایل ہیں -

تلخیاں

اس میں شک نہیں کہ بابر نے نہایت جانفشانی اور پختہ عزم کے بعد ہندستان پر فتح حاصل کی تھی - اپنا آبائی ملک کو چھوڑ کر اس نے دور دراز اور اجنبی ملک میں سلطنت قایم کی اور ایک سعید دور کا آغاز کیا، جس کا سلسلہ تین سو برس تک چلتا رہا - کئی ہندستانیوں نے بابر کی دل و جان سے خدمت کی، اور اپنے فرایض نہایت خلوص اور ایمانداری سے انجام دیے - تمام بابر نامہ تنقید سے متعلق جو رائیں قایم کی ہیں، وہ بابر جیسی عظیم الشان شخصیت کے شایان شان نہیں معلوم ہوتیں، ممکن ہے اس میں مبالغہ کا عنصر پنہاں ہو، لیکن بقول بابر "ہندستان حسین ہیں نہ سیل جولاں کے لایق ہیں، نہ ان کا ادراک علاقہ رکھتے ہیں، نہ ان میں مروت ہے، نہ ان میں ذہن ہے، نہ ان میں ایجاد ہے - ہنروں اور کاموں کی ترکیب نہیں ہے - گھوڑا یہاں عمدہ نہیں ہوتا - گوشت اچھا نہیں ہوتا، میوے نہیں، ٹھنڈا پانی نہیں - بازاروں میں جو کھانے اور روٹیاں بکتی ہیں، وہ سب خراب، حمام اچھا نہیں، شمع مشعل اور شمعدان کا نام نہیں" یہ باتیں [illegible]

ہوا دار اور معتدل اور خوش قطع دخش وضع نہیں تھیں۔ عوام ننگے پاؤں لنگوٹا باندھے پھرتے تھے، اور عورتیں ننگی جیسی کوئی چیز غالباً دوپٹا پہنتی تھیں، اب بابر کہ زبانی ہندستان کی تعریف و توصیف میں چند جملے ملاحظہ فرمایئے، وہ کہتا ہے کہ۔

"ہندستان وسیع و عریض ملک ہے، جہاں سونے اور چاندی کی افراط ہے، برسات کی ہوا نہایت اچھی ہوتی ہے۔ یہاں کی ایک عمدگی یہ ہے کہ ہر فرقے اور حرفت کا آدمی کثرت سے ہے۔"

اس نے ہندستانی سنگ تراشوں کی بے حد تعریف کی ہے۔

یہ ہندستان ہی کی بابرکت سرزمین کا فیض تھا کہ بابر نے ہندستان میں ورود کے بعد شراب، معجون خوری اور ہزل گوئی سے توبہ کر لی تھی۔

رحمٰن جامی

ایک سہیلی کا خط

اے سہیلی تجھے آج لکھوں میں کیا
آپ بیتی یا قصہ کوئی دہر کا
لیکن اک قابل ذکر ہے واقعہ
میرے کالج کا وہ طالب علم تھا

میرے رخ بس گیا تھا وہ اعصاب پر
یوں بھی مقبول تھا اپنے احباب میں
ہاں اسے ہیرو کہہ کر بلاتے تھے سب
اس کی ہر بات سے دل لگاتے تھے سب

میرے بھی حسن کے چرچے ہر سمت تھے
نام پر میرے کتنے ہی دل لٹ گئے
کتنے لڑکوں کی خواہش میں ان کے ملوں
میں کسی بھی طرح بات ان سے کروں

چاہتے تھے نہیں وہ میرے ہم زباں
لیکن ان سب کی کوشش گئی رائیگاں

کیونکہ میں نے کبھی ان کو چاہا نہیں
ان کو نزدیک تک بھی بلایا نہیں

وہ بھی ان ہی نظر باز لڑکوں میں تھا
وہ جنہوں نے مجھے بارہا دق کیا
جب کہیں راہ میں ہو گیا سامنا
شعر اک عشقیہ چلتے چلتے کہا

میں مگر اس کی باتوں سے چڑتی رہی
جانے کیوں اس سے نفرت مجھے ہو گئی
میری خواہش رہی اس کو رسوا کروں
اس کی بے چارگی کا نظارہ کروں

رفتہ رفتہ مری بات بنتی گئی
اک بھی اس کی سرسوائی کی چل پڑی
جس جگہ وہ گیا انگلیاں اٹھ گئیں
سب کی ہمدردیاں میرے ہمراہ تھیں

اور پھر یوں ہوا جب کبھی وہ ملا!
سر جھکائے ہوئے گزرا چپ چاپ سا
پھر کبھی آنکھ اس نے ملائی نہیں
یہ ادا بھی مجھے اس کی بھائی نہیں

پھر کئی دن وہ مجھکو نہ آیا نظر
پھر کسی نے بتایا کہ وہ "بے ہنر"
ہیرو کالج کا کالج سے چلتا بنا
جانے کس راہ میں لٹ گیا قافلہ

آج کالج میں پھر ذکر اس کا چھڑا
اور کسی نے بڑے فخر سے یوں کہا
وہ حسیں نوجوان "ہیرو" اپنا جو تھا
فی الحقیقت وہ ہیرو بنا قوم کا

حسن کالج کا اب جس سے نودم ہے
آج سرحد پہ اس کی بڑی دھوم ہے
جانے کیوں اشک آنکھوں میں لہرا گئے
جانے کیوں اس کی باتوں کو دہرا گئے

اے سہیلی تجھے آج لکھوں میں کیا
قابل ذکر تھا بس یہی واقعہ

شہریور۔ مہر۔ آبان ۱۳۸۲ ف ہندستانی ادب جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۷۳ء

عیاذ انصاری

مولانا آزاد کا جمالیاتی ذوق

"جس چیز کو ہم جمال کہتے ہیں وہ موزونیت اور تناسب ہے اور یہی موزونیت اور تناسب بھرپور اور خوبی کے تمام مظاہر کی اصل اور بنیاد ہے" جمال کی یہ مختصر تعریف خود مولانا کی ہے، میری نہیں۔ ذوق مثال کے لیے یہ بات کچھ مبہم سی ہے، لیکن کیا جائے، کہ یہی ابہام مولانا کے ذوق جمال کا مائے امتیاز ہے۔ ان کا جمالیاتی ذوق ان کے اسلوب میں، اس قدر پیوست ہے، اور اس کی اتنی نرادائی ہے کہ پڑھنے والا ان کی گل فشانیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے اسلوب کی طرفگی پھر ان کا حسن ادا ہے کہ معمولی سی بات کو بھی وہ پوری آرائش و زیبائش کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ استعارے، کنائے شاعرانہ طرز نگارش، تمثیل اور خطابت ان کے اسلوب کے عناصر ترکیبی ہیں، اور یہی وہ آلات بھی ہیں، اپنے ذوق جمال کے اظہار کے لیے جب وہ انہیں کام میں لاتے ہیں تو وہ جادو جگاتے ہیں جو سر چڑھ کر بولتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

"حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن پھر حسن ہے، اور وہ اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔"

حسن سے ان کی اتنی گہری وابستگی شاید موسیقی کے ذوق بلکے شوق کی شیفتگی سے جڑی ہوئی ہے، جس کا انہوں نے بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔

"میں زندگی کی اشیاء میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آواز خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور چشم و دل کی بیماریوں کا علاج ہے۔"

چاندنی رات میں تاج کا حسن نکھر اٹھتا ہے، لیکن اس حسن کو تمثیل کے ذریعے ابھار کر اس میں موسیقی کا لطیف عنصر شامل کر کے مولانا نے ساری فضا کو نغمہ ریز بنا دیا ہے۔ مولانا کے ذوق جمال کی یہ ایک واضح مثال ہے۔

"رات کا سناٹا، تاروں کی چھاؤں اور اپریل کی بھیگی رات ۔۔۔ تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، پریاں خاموش بیٹھی تھیں، بیچ میں چاندنی سے دھلا گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت تھا۔"

تاج کے بھرپور حسن کو رنگا رنگ بنانے کی یہ ایک طرح کی آرائشی اور تزئینی تمہید سمجھیے۔ غالب کی طرح مولانا بھی مجرد حسن سے بڑھ کر حسن کے انگ انگ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ "چرانا نگاہ کا" اور "بگڑنا عتاب میں" کہہ کر غالب نے جس طرح محبوب کے مجرد حسن میں لاکھوں بناؤ کی نیرنگی پیدا کی ہے، مولانا بھی تاج کی مجرد دلآویزی میں تمثیل کا فسوں پھونک کر اس کی نیرنگی کو ابھارتے ہیں۔ وہ اس پر قانع نہیں ہوتے، ان کا ذوق جمال اس سے کچھ زیادہ کا متقاضی ہوتا ہے تو پھر موسیقی کو اپنے مقصد کا ذریعہ بناتے ہیں۔ لوگوں نے تاج کی ستائش و نوازش کو ان کی اپنی مذہب پرستی سے تعبیر کیا ہے۔

"اچانک پردہ اٹھا، ساز سے تالا ہٹے، حرف اٹھے، ہوا کی لہروں پر تیرنے لگے، آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے، اور انگلی کے زخموں سے نغمے۔"

جھلمل جھلمل ہوا کرتی یہ ساری فضا ایک لمحہ کے لیے پس منظر میں چلی جاتی ہے، اور وہ خود ایک قدم آگے بڑھ کر رقص کی نئی فوارہ کی طرح خطابت کے زور پیدا اسی فضا کو اپنے گرد گھومتے اور رقص کرتے دیکھ کر اپنے ذوق جمال کی تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

"تماشائی حرکت میں آنے لگے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیف میں آ آ کر جھومنے لگیں۔ باد ہوا کے بریاں اپنی قید سے ہٹا گئیں۔ مینارے اپنی خموشی کو [illegible]

باور کریں یا نہ کریں ــــ اسی عالم میں برجیوں سے میں نے باتیں کی ہیں اور جب گنبد کی طرف متوجہ ہوا ہوں تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مجھے صاف دکھائی دیتی تھی۔"

مولانا کا ذوق جمال کسی ایک فکر، خیال، فقرہ اور لفظ کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ایک طرح کا حال ہے جو ذہن سے لیا ما قلب پر وارد ہوتا ہے، اور ایک طرح کی وہ محویت ہے جو حسن آفرینی ہے۔ انہوں نے چاندنی رات، تاج اور موسیقی کے مجرد حسن کی اکائیوں کو جوڑ کر اپنے ذوق جمال کی وحدت میں سمو دیا ہے۔

شعر و ادب میں جمالیات سے زندگی نے جمال کے جو چراغ روشن کیے ہیں وہ کیف و مستی کا مکمل عرفان ہیں، اور نفس اور وہ پاک انبساط ہے جو ذہن سے زیادہ قلب سے ہے۔ رومی، حافظ اور سعدی، میر اور غالب کے اس ورثے کو مولانا نے نثر میں سمویا ہے، اور پڑھنے والے کو اپنے کیف و سرور کی ہر ممکن طرح انہوں نے شریک رکھا ہے، ہندستانی ادب تو کیا دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی جمالیاتی ذوق کا یہ تخلیقی کارنامہ کم ہے۔ ان کے ذوق جمال نے پھر زندگی کو سنوارا ہے، سجایا ہے اور بہتر اور برتر بنایا ہے، اور اس نیت کو اونچا اٹھایا ہے کہ ذوق جمال کا قرینہ یہی ہے اور یہی ہے۔

مولانا کے ذوق جمال کو محض عام جنسی اور حسی ذوق جمال سے ہٹ کر ان کے ذہنی اور قلبی ذوق جمال کی نظر سے دیکھنا پڑے گا۔

ذہنی اور فکری طور پر مولانا غالص مذہبی آدمی تھے، لیکن ان فطرت اور ان کی جہاں کہیں بھی انہیں حسن نظر آتا ہے، وہ مذہب کروہ اپنے راستے میں حائل نہیں ہونے دیتے۔ وہ حسن کو کھو جاتے ہیں اور اس میں کھو جاتے ہیں۔ مذہب کی حکومت بھی انہوں نے حیرت و حیرانیاں بنا کر پیش کی ہے۔ "ترجمان قرآن" نے اسی لیے دلوں کے سنورنے کی بھی خبر دی، مسخر بھی کیا ہے۔ جذبوں میں ایمان و یقین کی دیپ مالاؤں کو جگمگایا ہے۔ کسی نہ کسی انداز فکر کا بڑے لطف سے ذکر بھی کرتے ہیں۔

اپنی شگفتگی اور خستگی کسی بات کی شگفتہ ہے کسی زبان کی، یہ قرآن کی "تعلیم و تربیت کا" جو کچھ پایا ہے مرد بارگاہ سے پایا ہے، جتنا دیکھا ہے اسی سرچشمہ فیض اور ہادیٔ برحق سے دیکھا۔ ذرہ بن کر رہا، مگر خورشید بن گیا۔ علم کا دروازہ اسی نے کھلا۔ عمل کی حکمت اسی نے سکھائی۔ فریضہ تبلیغ بھی اسی سے سیکھا۔ عرفان کے نشیب و فراز کا بھی راہبر ہے قرآن مجید اسی نے سنایا، سنت ــــ اسی نے کہا۔"

ہے مہر و ماہ کے عمو سا کہا۔"

"مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ"

"غیر اضطراری طور پر اگر بے معرع زبان پر آ گیا، لیکن کہتا ہوں، یہ عشق پھر کیا تھا؟ ایک کو عظیم شاعر اور جس نے دوسرے کو دام دقت کے بلند مرتبا پر فائز کر دیا۔ سیدھی بات ہے، عشق اسی دور کی پیداوار ہے، جب ان لطیف کے ایک کثیر گروہ پر بقول حالی "ہمہ تن دقت پڑا ہے۔" انحطاط کا احساس، دود و کرب خلش اور بے چینی بن کر ابھرا تھا۔ شبلی، حالی اور سرسید جیسے زعیم، مایل بہ فکر و عمل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان سب بزرگوں کا ایک ہی موقف تھا۔ ایک ہی طرز فکر تھا۔ اصلاح اور ترقی، اللہ اور اس کا رسول، قرآن اور سنت، عرب کو سہارا ملے گا تو اسی سے مایوسیوں میں امید کی کرن پھوٹے گی تو اسی سے، الہلال اور البلاغ کا آہنگ، اسی جذبے سے سرشار، اسی نور سے منور تھا۔ یہی وہ تجلی تھی جو ان کی تحریروں میں چمکی۔ یہی وہ رعد تھا، جس کا غلغلہ ان کی آواز میں سنا گیا۔ یہی پھر تخیل، خطابت اور یہی ان کا ذوق جمال بنا۔"

"سمندر کا پھیلاؤ، دریا کی روانی، پہاڑوں کی بلندی اور وادیوں کا نشیب، صبح کا چہرہ، غروب اور شام کا جلوۂ محبوب، غرض تمام تماشا گاہ ہستی کے پیچھے حسن آفرینی اور جمال گاہ ہی کی ایک قوت ہے، جو کام کر رہی ہے، یہ چاہتی ہے کہ جو کچھ بھی ظہور میں آئے، حسن و زیبائی کے ساتھ، نگاہ کے لیے نشاط، سامنے کے لیے سرور اور روح کے لیے راحت و سکون کا سامان بن جائے۔"

"تذکرہ" اور "غبار خاطر" میں مولانا کا جمالیاتی ذوق نکتۂ عروج پر ہے۔ تعجب تو "تذکرہ" کو ان کی "انا" اور "غبار خاطر" کو خدشناسی کا مظہر کہا۔ پڑھنے والے کو ان کے ذوق جمال کا پرتو ہی ملتا ہے، وہ ہر حال میں مسرت آگیں ہی ہے۔

"تذکرہ" کے ناشر فضل الدین احمد کے اصرار پر جب مولانا اپنی سوانح لکھنے پر راضی ہو گئے تو سب سے پہلے ان کا ذوق جمال ہی ان کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ غزل کے لطیف شعر کی طرح اشاروں اور کنایوں میں قند اتنا جو پیکر انہوں نے تراشا وہ ان کے ذوق جمال کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

"ایک خود نما رعنا جو طلسم سراب کی تاریخ قلم بند ہوتی کیونکر؟ اور کیا میں جواب دیتے؟ ہاں میں خبار خاطر لکھتا"

طوفانوں نے درخت گرا دیے، سیلاب نے عمارتیں ڈھا دیں برف آشیاں پرست نے کرنے کے تنکے چن چن کر جمع کیے، خرمن و برق کا مقابلہ، آتش و خس کا افسانہ۔ ان سب کی سرگذشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجیے، میری سوانح بھی ان میں مل جائے گی۔ نصف افسانۂ امید، نصف ماتم یاس۔"

مولانا حبیب الرحمان شیروانی کو "غبار خاطر" کی خدمشناسی سے کیا ملا ہوگا یہ تو ظاہر ہے، پڑھنے والے کو "غبار خاطر" نے کیا کچھ دیا ہے۔ بقول مولانا نیاز فتح پوری "ہمیں اس فطرت کے مطالعے کا موقع نصیب ہوا، جو صدف کے اندر اندر قطرۂ نیساں کو موتی بنایا کرتی ہے۔ اس موتی کا علم ہمیں "غبار خاطر" ہی سے ہوا ہے۔ اس کی آب و تاب میں مولانا کا ذوق جمال ہے۔ حسن کی نیرنگیوں پر پڑنے والے کو بڑا رنگین لاتے ہیں کہ وہ لطف اندوز ہو۔"

مرزا عکاس کاشتاتی

غالب ترے پیچھے

اس ملک میں پیدا ہوا ٹاٹا ترے پیچھے
دلی میں بھی چلنے لگا باٹا ترے پیچھے
اب راج سنگھاسن ہے نہ راجا کوئی غالب
اب ظل الٰہی ہے نہ مولا ترے پیچھے
اجڑی تھی جو دلی وہ پھر آباد ہوئی ہے
حاکم ہوئی دلی کی رعایا ترے پیچھے
تسلیم نہ آداب، قدم بوسی نہ پرنام
"جے ہند" کا ہونٹوں پہ ہے نعرہ ترے پیچھے
شاعر کے خطابات وہ اگلے سے نہیں ہیں
ہے "پدما بھوشن" اک بڑا رتبہ ترے پیچھے
محفل کی صدارت کوئی شاعر نہیں کرتا
لیڈر کو دیا جاتا ہے موقعہ ترے پیچھے
اب علم و ادب بیچ کے کھاتے ہیں سخن ور
کچھ لوگوں نے سہرے کو بھی بیچا ترے پیچھے
اب شرفا کی پہچان لباسوں سے نہیں ہے
ملتا ہے بڑی شان سے کنجوٹا ترے پیچھے
اب لوگوں میں اگلی سی وہ بو باس نہیں ہے
ہر کوئی جلا لیتا ہے چرغا ترے پیچھے
حاکم ہیں سبھی، اب کوئی محکوم نہیں ہے
اس ملک سے رخصت ہوئے آقا ترے پیچھے
اب بالکی ہے، اور نہ ہوادار ہے غالب
موٹر کا ہے اب دھوم دھڑکا ترے پیچھے
شرفا بھی کیا کرتے ہیں سائیکل کی سواری
کی کہیئے ہوا کیسا یہ گھاٹا ترے پیچھے
نوابوں کے گھر چوہے بھی فاقوں سے مرتے ہیں
لاکھوں ہیں سمیٹے ہوئے بولا ترے پیچھے
لوگوں میں وہ اخلاق حمیدہ نہ رہے اب
اب آنکھ چراتے ہیں شناسا ترے پیچھے
دلی میں نئی دہلی اک آباد ہوئی ہے
اجڑا ہے فقط قلعہ معلی ترے پیچھے
اب جھگڑے ہیں مذہب کے سیاست کے یہاں پر
اب ہند مسلمان ہیں تنہا ترے پیچھے
یو پی سے جواہر اٹھے گجرات سے گاندھی
یہ لگ ہوئے ملک کے نیتا ترے پیچھے
سو سال وہ اس ملک پہ قابض رہا لیکن
انگریز جو حاکم تھا وہ بھاگا ترے پیچھے
اردو تجھے روتی ہے، بہت روتی ہے غالب
اپنوں ہی نے مارا اسے لوٹا ترے پیچھے
دفتر سے، مدرسوں سے، عدالت سے نکالا
ہے کون، جو دیوے اسے پرساد ترے پیچھے
سو سال ہوئے تجھ سے جدا ہو تیگو غالب
اب اہل وطن نے تجھے بھلا ترے پیچھے
اجڑی ہوئی گلیوں کو تری خوب سجا کر
گلیوں کو تری دینگے دلاسا ترے پیچھے
ہفتوں سے تری برسی کی اک دھوم مچی ہے
ہر گھر میں ہے بس تیرا ہی چرچا ترے پیچھے
"غالب" تجھے کہتا ہے، کوئی کہتا ہے غالب
ہر ایک ہوا تیرا شناسا ترے پیچھے
اخباروں کے تعصوں نکالے گئے نمبر
دنیا نے بالآخر تجھے پوجا ترے پیچھے

سلیم نوری

دنیا کا سب سے خوبصورت اور ہندستان کا قومی پرندمور

"ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں"

سورج کی تیز روشنی بانس کے گھنے جنگل کو منور کر رہی تھی۔ میں اپنا کیمرا سنبھالے اس حسین منظر کی تصویر لینے کے لیے کوئی موزوں جگہ تلاش کر رہا تھا، ایکایک ایک چھوٹے سے جھنڈ پر جو مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا، ایک پرندا شاہین کی طرح سیدھا تاننے بیٹھا نظر آیا۔ سورج کی روشنی سے اس کا سارا جسم جگ مگ کر رہا تھا اور یہ پرندا تھا مور۔ دل میں بے ساختہ یہ خواہش ابھری کہ مور کے حسن کو ہمیشہ کے لیے عکس میں محفوظ کر لوں اور جب میں ذرا آگے بڑھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ خاصنی سے کسی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے، مجھے یوں معلوم ہوا جیسے اس پر خوف طاری ہے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو مجھے ایک چیتا گھاس میں رینگتا ہوا آگے بڑھتا دکھائی دیا۔ میں نے کیمرا رکھ دیا اور رائفل تان لی ساتھ ہی چیتا اچھل کر کھڑا ہو گیا، اور ایک خوف زدہ آواز آئی کہ خدا کے لیے بندوق نہ چلانا ــــ مور برق رفتاری سے اڑا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔

یہ چیتا ایک غریب گڈریا تھا، جس نے چیتے کی کھال اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی تو وہ کہنے لگا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مور بڑا چالاک ہوتا ہے، مگر جانوروں کے جسم کے خوبصورت دھبوں کو دیکھ کر اکثر محو ہو جاتا ہے، اور مسلسل ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔ ہمیں اس کی عادت کا علم ہے۔ ہم اسی طرح اس کا شکار کرتے ہیں۔ چیتے کی کھال اوڑھ کر رینگتے ہوئے ہم اس کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں، اور اسے یا تو زندہ پکڑ کر فروخت کر دیتے ہیں یا مار کر کھا جاتے ہیں۔

اس حسین و جمیل پرندے مور کا اصل وطن مشرق بعید

والا اور سبز سینے والا، سبز سینے والا جاوا اور برما میں ہوتا ہے۔ اس کی گردن سنہری ہوتی ہے جاپان میں سفید مور بھی ملتے ہیں جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے پیارے لگتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ فلسطین کے باشندے موروں کے بڑے شوقین تھے۔ مشہور برطانوی ادیب آسکر وائلڈ نے اپنے رندۂ جاوید ڈرامے "سلومی" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہودیا کا حاکم ہیرودیس سلومی کو رقص پر آمادہ کرنے کے لیے جہاں زر و جواہرات کا لالچ دیتا ہے، وہاں اسے اپنے لاتعداد موروں میں سے کچھ مور دینے کی پیش کش بھی کرتا ہے۔ یہ مور اسے اتنے پسند تھے کہ اس نے ان کے پاؤں میں سونے کے حلقے ڈال رکھے تھے، بلکہ مصر قلوپطرا کے حالات میں بھی مور کا تذکرہ ہے۔ سکندر اعظم نے جب ہندستان پر حملہ کیا تو زرق برق پروں والے مور اسے بہت پسند آئے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے گیا، اور یوں یہ پرندا مشرق سے مغرب میں پہنچ گیا، اور وہاں بھی اس کی نسل پھیلتی گئی۔ مور کے بچے انڈوں میں سے نکلنے کے چند گھنٹے بعد اپنی دم کو اوپر اٹھانے لگتے ہیں، یوں تو اس کے سر کلغی گردن اور سینے میں بڑے خوبصورت رنگوں کا امتزاج ہوتا ہے، مگر اس کی دم پر پھیلے ہوئے پر حسن کی بالکل اچھوتی تصویر ہیں۔ دم کے لمبے لمبے پروں کی نشوونما میں تقریباً دو سال کا عرصہ لگتا ہے۔ دم عام طور پر (۵۰) سے (۶۲) انچ تک لمبی ہوتی ہے۔ گرمیوں کے اختتام پر دم کے پر جھڑنے لگتے ہیں اور سردیاں شروع ہوتے ہی دوبارہ نکل آتے ہیں۔ ان پروں کے سروں پر سبز اور سنہرے رنگ کے چمک دار چھلے بنے ہوتے ہیں۔ جب مور اپنی دم اٹھا کر پھیلا لیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہزار آنکھیں جھانک رہی ہیں۔ اہل روما کی دیومالا میں ان آنکھوں کے متعلق عجیب و غریب پیشین گوئی کی گئی ہے۔ ان کے ایک دیوتا مرکز کا نام آرگس تھا، اس کی ہزار آنکھیں تھیں، ایک دفعہ دیوتا [illegible]

ان آنکھوں کو مور کی دم میں منتقل کر دیا جب مور اپنی دم کو چنور کر کے رقص کرنے لگتا ہے تو سینیا تان کر ادھر ادھر گھومتا ہے - پھر کانپ کر اپنے پروں کو جھٹکتا ہے جس سے ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی ہے -

جنگل کی پرسکوت فضا میں موروں کے رقص کا منظر اور بھی قابل دید ہوتا ہے - کسی کھلے مقام پر مورنیاں اور مور اکٹھے ہوتے ہیں - مور اپنے پر پھیلا کر مورنیوں کے سامنے مست ہو کر رقص کرتے ہیں اور بے خودی کے عالم میں اپنے دلکش پروں کو پھیلا دیتے ہیں - مورنیاں ہمیشہ ان کے آگے ہوتی ہیں - عجیب بات یہ ہے کہ رات کو بھی جب وہ درختوں کی اونچی شاخوں پر بسیرا کرنے لگتے ہیں، اس وقت بھی مورنیاں ہی ان کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دیتی ہیں - موسم برسات میں جب گھنگور گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں اور بادل گرجنے لگتے ہیں تو وہ فرط مسرت سے رقص کرنے لگتے ہیں، جن لوگوں نے یہ دلکش منظر دیکھا ہے - وہ اسے عمر بھر فراموش نہیں کر سکتے -

مور کی آواز بڑی دلکش اور درد بھری ہوتی ہے - عام طور پر یہ بچے کی آواز سے مشابہت رکھتی ہے - جب یہ مست ہو کر بولتے ہیں، تو پی - آؤ، پی - آؤ کی آوازیں نکالتے ہیں، اور خطرے کے وقت کا اواں کا اواں کر کے چنگھاڑتے ہیں - ماہرین کا کہنا ہے کہ جنگل کے باسیوں میں مور بہت ہشیار اور چالاک پرندا ہے - ایک ماہر لکھتا ہے کہ مور سانپ کی طرح تیز ہے، بلے کی مانند گھات لگاتا ہے اور دشمنوں سے چوکنا رہتا ہے - آخر الذکر نسل کے سلسلے میں مور کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ مست ہو کر اپنی مورنی کے سامنے ناچتا ہے تو اسی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں - مورنی ان آنسوؤں کو زمین پر گرنے نہیں دیتی، بلکہ پی جاتی ہے، اور پھر وقت مقررہ پر انڈے دینے لگتی ہے، لیکن ماہرین فطرت اس نظریے سے متفق نہیں ہیں - وہ کہتے ہیں کہ آخر الذکر نسل کا سلسلہ مووں میں بھی دوسرے پرندوں کی طرح ہوتا ہے - ایک ماہر نے لکھا ہے کہ میرے دل میں یہ خواہش اکثر چٹکیاں لیتی تھیں کہ میں مووں کا وہ نظارہ دیکھوں جب مور اپنی مورنیوں کے سامنے اپنے بھڑکیلے جسم کی نمائش کرکے ناچتا ہے، چنانچہ میں اس کے لیے کئی دفعہ جنگل میں گیا - جب بھی میں ان کے قریب پہنچا، محافظ مورنیاں اڑ جاتیں اور ان کے ساتھ ہی مور بھی اڑ جاتے ہیں - ایک مرتبہ میں ایک درخت کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا - اتنے میں ایک درجن کے قریب مور اکٹھے ہو گئے، حسن اتفاق سے عین اسی درخت کے نیچے رقص شروع ہو گیا - سب کے سب مور تھے - مورنی ایک بھی نہ تھی - وہ دو دو ہو کر ناچنے لگے - وہ پر پھیلا کر چنور بنا کر کبھی آگے بڑھتے، کبھی پیچھے، ان کے پنکھ لرزنے لگے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں زمانہ ناچ دیکھ رہا ہوں - ایکا ایک گویا کسی نے اشارا کیا ہو، انہوں نے دمیں سمیٹ لیں اور قطار باندھ کر جنگل میں غائب ہو گئے - یہ نظارہ غلط ثابت ہوا کہ صرف مورنیوں کے سامنے ہی ناچتے ہیں - عام طور پر ایک مور کے حرم میں کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ مورنیاں ہوتی ہیں - مورنیاں دانا دنکا چگتی رہتی ہیں، اور مور اپنے پروں کے حسن کا مظاہرا کرتے رہتے ہیں - وہ کبھی کبھی اپنے آقا کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی ہیں -

"ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں"

عام روایت ہے کہ مور اور سانپ روز ازل سے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں - اس کے متعلق بعض مذہبی کتب اور ان کی تفاسیر میں بھی اشارے ہیں - مور کسی سانپ کو دیکھتے ہی بڑی چالاکی سے اس کے قریب جاتا ہے، اور اس کے گرد چکر کاٹ کر اسے ڈسنے کی ترغیب دیتا ہے - پہلے پہل وہ اسے مارنے کی کوشش نہیں کرتا - اسے صرف ستانے اور تنگ کرنے میں لطف آتا ہے - کبھی کبھی سانپ کو چرکہ بھی مارتا ہے جس سے وہ زخمی ہو کر بے بس ہو جاتا ہے - اب مور اسے چونچ میں پکڑ لیتا ہے اور سارے کا سارا نگل لیتا ہے - مور گو جنگل کا کھیرو ہے، اور اگر اسے پکڑ لیا جائے تو وہ قید کی برضا رغبت برداشت کر لیتا ہے - اپیر، غریب، اسے پالتو جانور کی طرح پالتے ہیں - دنیا کا کوئی چڑیا گھر اس حسین و جمیل پرندے سے خالی نہیں - سب سے زیادہ مور کے چڑیا گھر میں ہیں، جہاں ان کی تعداد دو سو کے قریب ہے - ان کی قیمت کا اندازا (۵) سے (۱۰) ہزار پونڈ تک لگایا گیا ہے - بعض مرتبا قیدی مور عجیب و غریب حرکات کرتے ہیں - کہتے ہیں کہ لندن کے چڑیا گھر کا ایک مور ایک بچے سے محبت کرنے لگا، وہ اسے بلاتا اور اس کے سامنے پر پھیلا کر ناچنے لگتا - مووں کے شوقین ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ تم مور کو اپنے

گھر میں لے آؤ تو بھر عمر بھر ان سے الگ ہونے کو جی نہیں چاہتا ان کا بے مثال حسن اور شعلا نور رنگ آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتا ہے - اگر قوس قزح کے رنگوں والا یہ پرند بدقسمتی سے ضایع ہو جائے یا مر جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی بے رنگ سی ہو کر رہ گئی ہے -

مور کے خوبصورت پروں سے کئی قسم کی چیزیں بنائی جاتی ہیں - مور چھل، پنکھے، اور جھاڑ و بنا کر لوگ اچھے داموں فروخت کرتے ہیں - بچے اس کے پروں سے اپنی کتابوں میں نشانیاں رکھنے کا کام لیتے ہیں - زمانۂ قدیم میں ہندو راجے مور کے پروں سے تیار کردہ اشیا اپنے دوستوں کو تحفتاً بھیجا کرتے تھے - کہتے ہیں کہ پیرٹیٹ ایک مشہور و معروف مور تھا، جو چوبیس سال کی عمر تک زندہ رہا - وہ جنوبی ایشیا کے باشندوں کے بیانات میں رہتا تھا - دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں کے سربراہ جب وہاں آتے تو ان کے درمیان اس کی تصویر بھی کھینچی جاتی - چنانچہ پیرٹیٹ کی تصاویر اختصوصی ایڈیشن، آئینہ ہند اور نیرو تجوت کے ساتھ اتاری گئی تھیں -

اس دل کش پرند کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ یہ ایک چوکیدار کی طرح ہمیشہ ہوشیار بیدار رہتا ہے - یہ ایک دوست جو جنگلات میں ملازم ہے، موروں کا بہت شوقین ہے اور ہمیشہ ایک دو جوڑے اپنی کوٹھی کے باغ میں رکھتا ہے - ایک رات دو بجے کے قریب مور کے چیخنے چلانے سے اس کی آنکھ کھل گئی اس نے اپنی بیوی کو جگایا اور کہا میرا خیال ہے کوٹھی میں چور گھس آیا ہے - کیا آپ نے کوئی آہٹ سنی؟ آہٹ تو نہیں سنی، لیکن موروں کی یہ آوازیں چور کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں - وہ باہر نکلا اور واقعی چور موجود تھا -

مظفر اکبر ابادی

محبت ہر قدم پر آدمی کے کام آتی ہے

محبت زندگی کی مشکلیں آسان بناتی ہے
محبت ہر قدم پر آدمی کے کام آتی ہے
محبت سے بدل جاتی ہیں انسانوں کی تقدیریں
محبت دامن ظلمت میں بھر دیتی ہے تنویریں
محبت آدمی کو روح کا نغمہ سناتی ہے
محبت جلوۂ خلد رشید نگہ جگمگاتی ہے
محبت رنگ بھر دیتی ہے ہستی کے فسانے میں
محبت پھونکتی ہے صلح کا افسوں زمانے میں
محبت دو دلوں کے ربط کو مضبوط کرتی ہے
محبت زیست کی روداد کو مربوط کرتی ہے
محبت کی بدولت نازکی آتی ہے خاروں میں
محبت سے خزاں تبدیل ہو جاتی ہے بہاروں میں
محبت ظالموں کو رحم پر مجبور کرتی ہے
محبت جذبۂ بے داد دل سے دور کرتی ہے
محبت خاکساری کا سبق دیتی ہے انساں کو
محبت دلنوازی کا سکھاتی ہے چلن سب کو
محبت قہر نفرت کو جلا کر خاک کرتی ہے
محبت داغ بغض و حسد کو پاک کرتی ہے
محبت تلخیوں سے کام لیتی ہے حلاوت کا
محبت ہر بشر کو جام دیتی ہے مروت کا
محبت آدمی پر بیخودی کا راز کھولتی ہے
محبت سوز و مستی دل کی نگہ میں گھولتی ہے
فضا میں گونج پیدا ہو محبت کے ترانوں کی
محبت کی نظر میں کام ہے رفعت آسمانوں کی
محبت جب کسی بیٹے کے ہونٹوں پر مچلتی ہے
[illegible]
[illegible]
محبت سے نکل آ کر دعائیں [illegible]
محبت الغرض [illegible]
خدا کی ذات سے [illegible]

امجد حیدر ابادی

رباعی

کب تک ہے بقائے تن فنا کو معلوم
کب تک ہے یہ زندگی قضا کو معلوم
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے جاتے جاتے
جاتی تو ہوں واپسی خدا کو معلوم

سرتاج عابدی

نہرو میوزیم لائبریری

ہر ملک میں کچھ ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جن کی یاد اس قوم کا سرمایا بن جاتی ہے۔ ہندستان کی عظیم شخصیتوں میں سے پنڈت جواہر لال نہرو کا نام ناقابل فراموش ہے۔ آپ کی بے لوث اور عالا ترین خدمات کو سراہتے ہوئے آپ کی وفات کے بعد یہ طے کیا گیا کہ آپ کے نام پر ہندستان میں ایک ایسا ادارا قایم کیا جائے جس سے آپ کی یاد بھی تازا رہے، اور ان مقاصد کی تکمیل بھی ہو جائے جو آپ کو محبوب تھے، چنانچہ ۱۴ نومبر کو جو پنڈت نہرو کا یوم پیدایش بھی ہے ہمارے سابق صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ۱۴ نومبر ۱۹۶۴ء میں نہرو میموریل میوزیم کا افتتاح کیا تھا۔

اس ادارے کا قیام ملک اور قوم کے بہترین احساسات کا ترجمان تھا، اور چونکہ اس کے عمل وقوع کے لیے تین مورتی ہاؤس سے بہتر جگہ ممکن نہ تھی، اس لیے سابق صدر نے اس عمارت کو قوم کے سپرد کرتے ہوئے نہرو میوزیم کے لیے مخصوص کر دیا۔ آزادئ وطن کے بعد سے وفات تک پنڈت جی تین مورتی ہاؤس میں مقیم رہے۔ اور یہاں کے در و دیوار سے آپ کی یادیں وابستا ہیں۔

نہرو میموریل میوزیم اور لائبریری کی تشکیل کے تین اسباب تھے۔ ایک یادگار میوزیم جس میں ان اشیا کی نمایش کی جائے جن سے آپ کا ذاتی تعلق رہا۔ دوسرے ہندستان کے عہد حاضر کی تاریخ پر ایک لائبریری کا قیام، اور تیسرے ہندستان کی عصری تاریخ پر ایک تحقیقی مرکز کا قیام، جس میں ہندستان کی تحریک آزادی اور بالخصوص عہد نہرو کا عمیق مطالعے شامل ہو۔

نہرو میوزیم لائبریری اس ادارے کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں وجود میں آئی، چونکہ اس لائبریری کو ہندستان کی عصری تاریخ کی تحقیقی لائبریری کی حیثیت سے فروغ دیا جانا تھا، اس لیے اس کے سامنے سب سے بڑا مسلا یہ تھا کہ راجا رام موہن رائے سے لے کر نہرو، اور اس کے بعد تک جتنی اہم تاریخی کتابیں تصنیف ہوئی ہوں، وہ سب اس لائبریری میں موجود ہوں۔ ان کی فراہمی کا کام ہدیے خرید اور بمشکل حصول عطیات نہایت سرگرمی سے شروع کیا گیا۔

لائبریری سائنس میں بین قومی شہرت کے مالک ڈاکٹر رنگناتھن نے ہر لائبریری کے آغاز کو اس طفل کے عہد طفلی سے مشابہ کہا ہے، کیونکہ اس دور میں نشوونما کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ یہی حال ایک لائبریری کا ہوتا ہے جسکے اس میں کوئی کتاب نہیں ہوتی، اور ہر متعلقا کتاب مہیا کرنا ہوتا ہے۔ جب یہ لائبریری اپنے عہد طفلی میں تھی تو کئی سرکاری محکموں سے کتابیں عطیات کے طور پر وصول ہوئی تھیں، مثلاً وزارت، پی۔ آئی۔ بی۔ سے۔ بہت سے اداروں نے کتابیں تحفے میں دیں، مثلاً سروے آف انڈیا سوسائٹی پرنٹا۔ گرکھلے انسٹی ٹیوٹ آف پالیٹکس اینڈ اکنامکس پرنٹا۔ چند عوامی لیڈروں کے ذاتی کتابوں کے ذخیرے نہرو میوزیم لائبریری کو حاصل ہوئے، مثلاً پرشوتم داس، ٹھاکر داس۔ ام۔ پی۔ ناناوتی۔ وینکٹ لال ہنتا۔ کانجی دوارکا داس وغیرا۔ اب تقریباً (۶۴) ہزار کتابیں اس لائبریری کے زینت ہیں۔ نئی کتابوں کے اضافے کی اطلاع ایک سہ ماہی فہرست کے ذریعے ملک اور بیرون ملک میں اداروں اور افراد کو بھیجی جاتی ہیں۔

لائبریری کی کتابوں میں ایک حصا پنڈت نہرو کے لیے مخصوص ہے، جسے نہرو سکشن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں ان کی جملا تصانیف، ان کے کارہائے نمایاں، اور شخصیت پر جتنی کتابیں لکھی گئیں، یہاں موجود ہیں۔ پنڈت جی کی کتابوں کے ترجمے ہندستان کی ملاقاتی زبانوں میں، اور سودیشی زبانوں میں کیے ہیں۔ مثلاً بنگالی، گجراتی، ہندستانی

فرانسیسی، اسپینی - جرمن - روسی - جاپانی - عربی - فارسی - بڑی - سنہالی وغیرہ - ایسی کتابوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے - اس سکشن سے کئی تحقیق کرنے والے فیضیاب ہو چکے ہیں، جنہوں نے نہرو کی شخصیت کے کسی پہلو کو لے کر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ لائبریری کی کتابوں میں پنڈت نہرو کی ذاتی کتابیں بھی شامل ہیں، جو انہوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد خریدی تھیں یا انہیں نذر کی گئی تھیں - پی - آئی - بی نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک پنڈت جی پر اخباروں کے تراشے لائبریری کو دیے تھے، جن کو تاریخ وار ترتیب دیا گیا ہے - بعد میں بمبئی اور لندن سے اخباری تراشے خریدے گئے جو تقریباً ساڑھے پانچ ہزار ہیں، اور پنڈت جی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں -

یہ سب نہرو سکشن کا حصہ ہیں

لائبریری میں اسٹاف خبر کتابوں کو تکنیکی اعتبار سے ترتیب دیتے ہیں، اور یہ کوشش رہتی ہے کہ کتاب کی خرید میں اور شیلف پر آنے میں کم سے کم وقت لگے، تاکہ کتاب کا جلد سے جلد استعمال اور استفادہ ہو سکے -

عہد حاضر کی تاریخ کے علاوہ لائبریری میں دوسرے مضامین پر بھی کتابیں ہیں، مثلاً سماجیات، اقتصادیات، تعلیم، اصلاحات، ہمارے ملکوں کی تاریخ، اور ان سے تجارتی اور ثقافتی روابط پر کتابیں بھی ہیں، نیز ترقی یافتہ ملکوں کی تاریخ اور ان سے ہندستان کے مراسم، دوسرے ملکوں کی تحریک آزادی پر کتابیں بھی موجود ہیں -

لائبریری میں گورنمنٹ آف انڈیا کی شایع شدہ کتابیں کافی تعداد میں موجود ہیں، مثلاً ہندستان کی مردم شماری پر، مختلف وزارتوں کی سالانا رپورٹیں، صوبائی حکومتوں کی کتابیں، اور اسمبلیوں کے مباحثے، اہم سماجی اداروں کی رپورٹیں اور انڈین نیشنل کانگریس کی رپورٹیں جو ۱۸۸۵ء سے آج تک موجود ہیں -

لائبریری میں اخباروں اور رسالوں کا سکشن خاص اہمیت رکھتا ہے - اس وقت موجودا تاریخ ہندستان اور دوسرے مضامین پر (۲۶۰) رسالے ہندستان اور بیرون جات سے آتے ہیں - جن رسالوں کا اشاعتی سلسلا ہندستان کی جنگ آزادی کے آغاز تک پہنچتا ہے، ان کی پرانی جلدیں خریدی گئی ہیں، مثلاً انڈین ریویو - ہندستان ریویو - وغیرا - اہم تاریخی مقالے جو تاریخی رسالوں میں آتے ہیں، ان کی ایک ماہانا فہرست ہندستان اور بیرونی ملکوں میں اداروں اور افراد کو بھیجی جاتی ہے -

ملکی اخباروں کے پرانے فائیل بہترین تحقیقی مواد ثابت ہوتے ہیں، اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ تقریباً اہم اخباروں کے فائیل نہرو میوزیم لائبریری میں موجود ہوں، اور آزادی سے قبل کے اخباروں کے فائیلوں میں یہ قابل ذکر ہیں - بامبے کرونکل - امرت بازار پتریکا - ٹریبون - ٹائمز آف انڈیا - نیشنل ہیرالڈ - ڈان - لیڈر - گجراتی - کیسری - کامریڈ - سرماک - نیگ انڈیا - ہری جل وغیرا - ان اخبارات کو الگ الگ بڑے ہال میں ترتیب دیا گیا ہے - اس سکشن سے مصنفین، سیاسی رہنما، اور صحافی فائیدا، اٹھا چکے ہیں -

فوٹو سکشن اس لائبریری کا ایک خاص حصا ہے - اس میں تقریباً (۴۰) ہزار فوٹو پنڈت نہرو کی سیاسی اور ذاتی زندگی سے متعلق ہیں - اس کے علاوا ہندستان کے دوسرے سیاسی مدبرین کی تصویریں اور وہ تمام تصاویر ہیں جن کا راست یا بلواسطا تعلق ہندستان کی قومی تحریک سے ہے - اب تک ہندستان کے کئی ایک مختلف ادارے اس سے مستفید ہو چکے ہیں جنہوں نے اپنے ہاں تصاویر کی نمایش کی یا وہ حضرات جنہوں نے ڈاکومنٹری فلمیں بنائیں - یہاں فوٹو اصلی قیمت پر بغیر منافعے کے دیے جاتے ہیں -

قلمی دستاویزات کا سکشن جسے

کہا جاتا ہے، اس میں تحریک آزادی کے قومی رہنماؤں کی قلمی یادداشتیں، نجی خطوط، اور دوسرے غیر مطبوعات کا غذات ہیں - ایسے سیاسی مدبرین کی فہرست تو طویل ہے، لیکن ان میں قابل ذکر یہ لوگ ہیں - موتی لال نہرو - جواہر لال نہرو - وکٹل بھائی پٹیل - بھولا بھائی دیسائی - ایم - اے - انصاری - آصف علی - ڈاکٹر سید محمود - شری پرکاش - راجکماری امرت کور - ہمایون کبیر - سدھیر گھوش - سید عبداللہ بریلوی - مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ہیں -

اس کے علاوا A - I - C. C کے کاغذات او

دلبھ بھائی پٹیل - موتی لال نہرو - سی - آر - داس جیسے سیاسی رہنماؤں کی قلمی یادداشتیں ہیں -

جدید لائبریری کا اثاثے سطالعا میں مائیکرو فلم بھی شامل ہے - یہ فلم رول ان مفید معلومات کی تصویر ہوتا ہے، جو مرسم اور وقت کے اثرات سے کاغذی شکل میں شایع ہو رہے ہوں یا کمیابی کے اعتبار سے صرف ایک دو جگہ ہوں، اور ان کی مانگ زیادہ ہو - ایسی دستاویزوں کو فلم پر منتقل کر لیا جاتا ہے، تاکہ وہ آیندہ نسلوں کو دستیاب ہو سکیں - ان فلموں کے پڑھنے کے لئے مائیکرو ریڈر ہوتے ہیں تاکہ پڑھنے والا ان کو آسانی سے پڑھ سکے - نہرو میوزیم لائبریری میں ایسی بہت سی فلمیں اور ان کو پڑھنے کے لیے مائیکرو ریڈر موجود ہیں - جن حضرات کے کاغذات کی فلمیں یہاں ہیں ان میں یہ خاص فلمیں ہیں - مثلاً لارڈ مورلے جو ہندستانی معاملات پر ۱۹۰۵ء تک سیکریٹری آف اسٹیٹ تھے لارڈ ہارڈنگ کے کاغذات کی فلم جو ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۶ء تک وائسرائے تھے - لارڈ جیمس فورڈ جو ۱۹۱۶ء تک وائسرائے تھے - سر ایڈون مانٹیگو جو ۱۹۲۲ء تک سیکریٹری آف اسٹیٹ تھے - لارڈ ریڈنگ ۱۹۲۱ء تک وائسرائے تھے - لارڈ اروِن ۱۹۲۶ء سے وائسرائے تھے - سر ہرکورٹ بٹلر کے کاغذات کی فلم جو یوپی کے گورنر تھے - یہ فلمیں تحقیق کرنے والوں کے لیے قابل قدر مواد پیش کرتی ہیں -

جب سے علم و دانش کے حصول کا سلسلہ عام ہوا، اور زیادہ تعداد میں تحقیق کرنے والے لائبریریوں میں آنے لگے، اور ضروریات زندگی کے فوری حل کی تلاش بڑھنے لگی تو لائبریری تیکنک میں بھی اسی اعتبار سے تبدیلیاں ہونی شروع ہوئیں -

اسی طرح کا ایک حل ہے، جس کے ذریعے کم سے کم وقت میں پڑھنے والے کو کسی مقالے، مضمون، یا خط کی نقل فراہم کی جاتی ہے، تاکہ وہ اسے اپنی تصنیف یا [illegible] میں شامل کر سکے - یہ عمل ٹوٹو کے ذریعے ہوتا ہے یا مشین کے ذریعے جو کسی بھی دستاویز کی نقل چند ثانیے میں بنا دیتی ہے - نہرو میوزیم لائبریری میں ایک موجود ہے جو اس کام کو انجام دیتا ہے - اس مشین نے بہت کرو مکل - ٹرمین اور دوسرے بہت سے اخبارات کی [illegible]

نہرو میوزیم میں ایک شعبا ORAL HISTORY یعنی زبانی تاریخ کا ہے - یہ ہندستان میں اپنی نوعیت کا پہلا شعبا ہے - اس میں ان حضرات کے انٹرویو INTERVIEW لیے گئے ہیں، جو ہندستان کی عصری تاریخ کا علم تو رکھتے ہیں، مگر ان کو کتاب لکھنے کا موقع نہ مل سکا یا کسی وجہ سے وہ اپنے علم کو کتابی شکل میں نہ پیش کر سکے - ایسے اشخاص سے یہ معلومات بہت سے سوالات قایم کر کے جوابات کی شکل میں حاصل کی جاتی ہیں، اور پھر ان کو کاغذ پر الفاظ کی شکل دی جاتی ہے - اس خیال نے سب سے پہلے امریکا میں جنم لیا، اور ہندستان میں نہرو میوزیم نے ایک شعبا قایم کیا، اور بہت سے افراد کا انٹرویو لیا، جو تاریخی اعتبار سے اپنا مقام رکھتے ہیں، مثلاً ڈاکٹر سمپورنند، کیلاش ناتھ کاٹجو، پی - این - سپرو، جے - پی - کرپلانی، نواب چھتاری، خان عبدالغفار خان، سی - ڈی - دیشمکھ، ٹک، ملکا دیوی چٹوپادیائے، لارڈ ماونٹ بیٹن اور لارڈ بٹلر وغیرہ -

غرضکہ نہرو میوزیم لائبریری ہندستان کے عصر حاضر کی تاریخی تحقیق پر ایک بے مثال لائبریری ہے، جہاں ہندستان کی تحریک آزادی، نہرو کی حیات اور کارہائے نمایاں، اور اس دور کے دوسرے سیاسی رہنماؤں پر بیش بہا مواد موجود ہے، اور اتنی مختصر مدت میں اس نے تحقیق کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، مثلاً یہاں امریکا کی یونیورسٹیوں کے پروفیسر، انگلینڈ کی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے محقق، چند کانگریسی شہر، دہلی یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، آسٹریلیا، روس، جرمنی، زیکوسلوواکیا کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور متعلقین مطالعے کے لیے آ چکے ہیں، اور اپنی کتابوں کے پیش لفظ میں لائبریری کی خدمات کو سراہا ہے -

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا	رباعی
کب میری طرح کا شباب دیکھا ہوگا	
کہتا ہوں جو میں کہ تم جوانی میری	
پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا	

شہریور - مہر - آبان ۱۳۵۲ھ ش ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۳ء

محمد اسحاق

شہد کے فائدے

کچھ دنوں کے بعد دنیا میں توانائی حاصل کرنے کا سب سے بہتر وسیلا شہد ہے - ایک کلو گرام شہد (۳۲۰۰) کیلو رینز ہوتی ہیں - اس لحاظ سے شہد دودھ سے چھ گنا زیادہ طاقتور غذا ہے -

ہندستانی اور اطالوی شہد کی مکھیاں زمانۂ قدیم سے انسانوں کو شہد فراہم کرتی رہی ہیں - شہد کی مکھیاں سماج میں رہنے والا ایک ایسا کیڑا ہیں جو بے حد منظم انداز میں ایک جگہ چھتا بنا کر رہتی ہیں - اور ان کے فرائض بھی بٹے ہوتے ہیں - ہر چھتے میں ایک رانی مکھی ہوتی ہے، جو انڈے دیتی ہے، اور اس طرح اسے اس چھتے کی ماں کا درجہ حاصل ہوتا ہے - نر مکھیاں بھی ہوتی ہیں، جن کا کام رانی مکھی سے اختلاط کرنا ہوتا ہے - ان کے علاوہ اکثر تر مادہ مکھیاں ہوتی ہیں، جن کی نشو و نما ٹھیک سے نہیں ہوتی - مکھیوں کے چھتے میں اکثر تر مکھیاں زیادہ ہوتی ہیں، جو چھتے کے رکھ رکھاؤ اور تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ذمے دار ہوتی ہیں — اپنی زندگی کے نصف اول حصے میں اکثر تر مکھیاں چھتے کے اندر کے فرائض ادا کرتی ہیں، جیسے رانی اور نر مکھیوں کی خدمت کرنا، اور انڈے سینا، نوزائیدہ مکھیوں کی پرورش کرنا، موم سے چھتے میں خانے بنانا، چھتے کی صفائی کرنا، دوسری مکھیوں کو داخل نہ ہونے دینا، شہد کو پکانا اور ذخیرہ کرنا وغیرہ - زندگی کا آخری نصف حصہ باہر کے فرائض کی ادائگی میں گذرتا ہے، جس میں پھولوں کا میٹھا رس، پانی اور زرگل کا جمع کرنا بھی شامل ہے - اکثر تر مکھیاں جب تک تھک کر چور نہ ہو جائیں، دن بھر کام کرتی رہتی ہیں - ان کا اپنا کوئی انفرادی مفاد نہیں ہوتا، وہ زندگی بھر مشترکہ مفاد کے لیے سرگرم عمل رہتی ہیں -

پھولوں کا میٹھا رس حاصل کرنے کے لیے اکثر تر مکھیوں سے چھ سات گنا مقدار اتنی قلیل ہوتی ہے کہ ان نازک ذرات کو جمع کر کے شہد تیار کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتے - ایک عام چھتے میں (۲۰) ہزار سے (۳۰) ہزار تک اکثر تر مکھیاں ہوتی ہیں - ہر مکھی روزانہ کئی کئی پھیرے لگاتی ہے - اور ہر ایک پھیرے میں لگ بھگ دو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے، اور ایک مکھی اپنی ساری زندگی میں لاکھوں پھیروں تک پہنچتی ہے - اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک مکھی کو ایک کلو گرام شہد کے لیے پھولوں کا میٹھا رس جمع کرنے کی غرض سے زمین کے گرد کم سے کم چار چکروں کے برابر فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے -

پھولوں سے جو سادہ میٹھا رس رال میں مل کر مکھی کی شہد والی تھیلی میں چلا جاتا ہے - شہد کی تھیلی میں کچھ اس طرح کا نظام ہوتا ہے کہ اس میں آنے والے تمام اجزا صدے میں چلے جاتے ہیں اور پھر وہاں سے ادا ہونے کے ذریعے برآمد ہو کر چھتے کے خانوں میں جمع ہو جاتا ہے - ان خانوں کے اوپر کھڑکی مکھیاں اپنے پروں کو متواتر پھڑپھڑا کر ہوا کی لہریں پیدا کرتی ہیں، جن سے پانی کے جز کا بڑا حصہ خشک ہو جاتا ہے - جب ایک خانہ ٹھیک سے تیار کیے گئے شہد سے بھر جاتا ہے، تو اس کے دہانے کو موم سے بند کر دیا جاتا ہے - ایک چھتے سے اوسطاً لگ بھگ چار کلو گرام شہد حاصل ہوتا ہے -

شہد کئی ترکیبوں، تشبیہوں اور گلوں کا ہوتا ہے - اس کا انحصار رس پر ہے کہ شہد کیسے پھولوں سے حاصل کیا گیا ہے - رنگ زیادہ تر شہد سے پہلے کے درمیانی کا اور سیاہ کہلاتا ہے -

شہد میں دو طرح کی شکر - ڈکسٹروز (گلوکوز نیز انگور کی شکر) اور لیولوز ایک طرح کے پھل کی شکر ہوتی ہے کہ اور اس کی اچھی صحت کے لیے دلکار زیادہ تر مفید نباتات اور جانور [illegible]

کھانے سے اتنی ہی توانائی حاصل ہوتی ہے جتنی کہ ایک لیٹر دودھ یا (۳۳۰) گرام گوشت یا آٹھ سترہ یا دس انڈوں کے کھانے سے ملتی ہے۔ ایک چمچا شہد (۲۱) گرام وزن کے ذریعے (۶۷) کیلوریز کے برابر توانائی حاصل ہوتی ہے۔ توانائی حاصل ہونے کا جہاں تک تعلق ہے کھجوروں کے بعد شہد کا نمبر آتا ہے۔ ایک کلوگرام شہد میں (۳۲۰۰) کیلوریز توانائی ہوتی ہے جو کہ دودھ سے چھ گنا زیادہ ہے۔ ایک امریکی سائنسدان نے ۱۹۳۸ء میں شہد کی بھرپور غذائیت کا عملی مظاہرہ کیا تھا۔ وہ (۱۲) ہفتے تک شہد اور دودھ اور کبھی کبھار ایک گلاس سنترے کا عرق استعمال کر کے معمول کے مطابق اپنا کام کرتا رہا، اور اس پر کسی طرح کا برا اثر نہیں پڑا۔ شہد کی اصل افادیت اس کی سادا شکروں میں مضمر ہے، جو راست تحلیل ہو جاتی ہے، اور جسم کو توانائی پہنچانے کے لیے تیار و سیلے کا کام دیتی ہیں۔ شہد صحت مندی یا بیماری کی حالت میں، دن میں کسی بھی وقت، کسی بھی موسم میں ہر عمر کے لوگ استعمال کر سکتے ہیں۔ بیماری میں دودھ کے مقابلے میں اسے ترجیح دی جاتی ہے۔ کھلاڑی عموماً کسرت، بھاگ دوڑ یا جانفشاں مشق کے بعد طاقت حاصل کرنے کے لیے شہد کھاتے ہیں۔ زیادہ کام کرنے والا یا تھکا ہوا شخص گرمیوں میں ایک گلاس ٹھنڈے پانی میں یا سردیوں میں گرم پانی میں ڈیڑھ چمچا شہد گھول کر پی لے تو فوری طور پر فرحت اور توانائی ملتی ہے۔

شہد قدرے قبض کشا، مسکن اور جراثیم کشی ہوتا ہے۔ جب کوئی معالج اپنے مریض کو شہد تشخیص کرتا ہے تو اسے غذا کے ساتھ مختلف اجزا، ایک ساتھ پیش کرتا ہے۔ یونانی اور آیورویدک طریقہائے علاج میں شہد اسی طرح بکثرت استعمال کیا جاتا ہے، جس طرح زیادہ تر ہومیوپیتھک ادویا میں الکحل ضروری ہے۔

دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ شہد خون بنانے میں ہیموگلوبین بننے میں معاون ہوتا ہے۔ یہ سردی زکام، کھانسی، بخار کے توڑ اور مصفی خون کے طور پر بہت مفید ہے، اور آشوب چشم، زبان پر السر، گلے کی تکلیف اور جل جانے کی صورت میں دوا کی حیثیت سے بھی مفید ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شہد سے ٹائیفائیڈ کے جراثیم دو ہفتے کے اندر دس گھنٹے میں مر جاتے ہیں۔ غالباً اس عمل کے لیے شہد میں موجود پوٹاشیم کا جز کارگر ہوتا ہے۔

شہد کو چائے، کافی، دودھ یا لیموں کے بدلے شکر کی جگہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ڈبل روٹی، کیک اور بسکٹ میں ڈالنے سے ان چیزوں کا ذائقہ بہتر ہو جاتا ہے، اور انہیں نسبتاً زیادہ دنوں تک رکھا جا سکتا ہے۔ شہد کو اور بھی کئی طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ شہد کی زیادہ مقدار جلد اور افزائش حسن کے نوشن بنانے، ڈیری کی گایوں کا دودھ بڑھانے، رسین کے گھوڑوں کی توانائی میں اضافہ کرنے اور مرغیوں نیز مچھلیوں کو موٹا کرنے میں استعمال ہوتی ہے۔ تجربہ گاہوں میں پودوں کی نشوونما کی رفتار کو بہتر کرنے، قلمی ہٹنیوں کے جلدی جڑ پکڑ لینے میں شہد کو مفید پایا گیا ہے۔

غزل

نسیم نور پوری پٹیالہ

عشق میں جو ہنستے ہنستے مر گئے
دہر میں وہ نام پیدا کر گئے

چارہ گر کی چارہ جوئی کے طفیل
میرے دل کے زخم سارے بھر گئے

جلد ئے مایوس ہو کر چارہ ساز
ان سے جو کچھ ہو سکا وہ کر گئے

دل نے بچنے کی بہت تدبیر کی
وار اس پر بھی وہ آخر کر گئے

ہے وہی حالت ترے بیمار کی
روز لاکھوں چارہ گر آ کر گئے

آج کیا سوجھی جناب شیخ کو
شام کو پیر مغاں کے گھر گئے

آتش دوزخ کا ان کو ڈر نہیں
دامن تر ساتھ جو لے کر گئے

میری پر سوز آہ سے اے ہمنشیں
آدمی تو کیا فرشتے ڈر گئے

سخت جاں ہوں میں جو زندہ ہوں نسیم
ساتھ کے ہیں کتنے مر گئے

خاجا احمد عباس

علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندستان دنیا کا واحد سکیولر ملک ہے، اور ہندستان کا دستور یا CONSTITUTION دنیا کا واحد سکیولر دستور ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ سکیولر ہندستان کا علمی ادبی، سوشل، کلچرل اور قومی ماہوار رسالہ "ہندستانی ادب" بھی سکیولر ہے، اور یہ بھی سو فیصد طریقے پر مانی ہوئی بات ہے کہ اس کا واحد ایڈیٹر جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا) خدبھی سکیولر ہے، اس لیے "ہندستانی ادب" کے (۴۳) سالہ وجود میں آج تک بھی اس رسالے میں کسی بھی مذہب یا مذہب کے کسی بھی پہلو پر ایک بھی مضمون شائع نہیں کیا گیا!

ہم فطرتاً سکیولر خیالات کو لیے پیدا ہوئے تھے، اسی لیے ہمارے بھائیوں، خاندان والوں، دوست احباب وغیرہ سے ہمارے خیالات مطلق ملتے نہیں تھے، بلکہ بسا اوقات خیالات میں ٹکراؤ پیدا ہو جاتا، اور اختلافات کی وسیع خلیج حایل ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی ہمارے ساتھ سوشل بائیکاٹ ہے، اور وہ صرف اور صرف مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ ہم تقریباً (۴۵) سال سے سکیولر خیالات کے حامل ہیں، اور اس پر پورے طریقے پر عمل بھی کرتے ہیں، لیکن آج تک ایک بھی ہندو یا عیسائی یا پارسی یا جینی یا بدھی یا سکھ یا یہودی یا کسی اور مذہب کے پیرو نے اشارتاً اور کنایتاً ہم سے یہ تک نہیں کہا کہ آپ سکیولرزم SECULARISM پر کیوں عمل کرتے ہیں، اور اس کے پیرو کیوں ہیں، اس لیے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ ہر شخص کو فطری حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہے مذہب اختیار کرے، اور جس ازم IZM پر چاہے عمل کرے، مگر مسلمانوں کا نظریا اس سے بلکل مختلف ہے، جس کی وضاحت خاجا احمد عباس نے اپنے نیچے کے مضمون میں کی ہے، اور جس کا ہم بری طرح سے شکار بن گئے ہیں، خصوصاً حیدرآباد کے مسلمانوں کا سلوک ہمارے ساتھ بلکل غنڈوں کا سا ہے، اور ہم ان کے ناروا اور نازیبا غنڈے پن کے سلوک کو خاموشی اور شرافت کے ساتھ برداشت کیے جا رہے ہیں۔ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں — عمر کے اعتبار سے اس وقت (۷۰) ستروی سال میں ہیں۔ صحت کے اعتبار سے T.B. کا شکار ہیں، چھ سات سال ہوئے ہیں دق ہو گئی ہے، اور یہ لا علاج مرض بن گیا ہے۔ ہمارے قوا بہت زیادہ کمزور ہیں، ہڈی چمڑی ایک ہے، جسم میں، تھوڑے سے مباشرت کے ساتھ، خون کا ایک قطرا تک نہیں ہے، گھٹنوں کا لعاب خشک ہو رہا ہے، چلنے پھرنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے، مگر ہم چلنے پھرنے پر مجبور ہیں، اس لیے کہ بغیر چلے پھرے چارا بھی تو نہیں ہے۔ اپنے گھر یا دفتر میں تن تنہا رہتے ہیں، اور کوئی دوسرا کام کرنے والا نہیں ہے، اسی لیے زیادا تر رسالے کی ضرورتوں اور بعض وقت اپنی اقل ترین ضروریات کے نکلنے کو خاطر جاتے نہ چاہتے بازار جانا ہی پڑتا ہے، گویا رسالے کے ایڈیٹر بھی ہم، منیجر بھی ہم اور گھر کے خانساماں بھی ہم، جناب سعدی کا مصرع ہم پر ورا اورا تر تا ہے ؎

"خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ"

جسم میں خون کی بڑی حد تک کمی کی وجہ سے ہم نیند سے محروم ہیں۔ رات میں مشکل سے دو تین گھنٹے کی نیند نصیب ہوتی ہے۔ اب آپ خود ہی اندازا لگا لیجیے کہ ایسے قابل رحم مریض کی صحت کا کیا حال ہوگا، جو چراغ سحری بنا ہوا ہے، اور جس کی زندگی کی ٹمٹماتی شمع کسی آن بھی گل ہونے کو ہے! بقول غالب ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

بہرحال آج کھلے طور پر ہم نے "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں پر یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ رسالا اور اس کا ایڈیٹر سو فیصد طریقے پر سکیولر خیالات کا حامل ہے، جس کے ثبوت میں اس رسالے کی (۳۳) جلدیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ اتنے طویل عرصے میں اس رسالے میں کسی بھی مذہب سے متعلق آج تک بھی ایک بھی مضمون شایع نہیں کیا گیا، اور جب تک یہ رسالا جاری رہے گا آیندہ بھی شایع نہیں کیا جاے گا!

ہم "ہندستانی ادب" کے جاری ہونے سے بہت پہلے سے بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے مذہبی ناموں کے سخت مخالف رہے ہیں اور جب کبھی اپنے مضامین میں ان دونوں یونیورسٹیوں کا نام لکھنا پڑا تو ہندو اور مسلم کے الفاظ حذف کرتے ہوے ہم نے صرف بنارس یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی لکھا ہے، اور جون ۱۹۷۱ء میں "ہندستانی ادب" کے جاری ہونے کے بعد سے آج ۱۹۷۳ء تک ہم نے ایک بار بھی ہندو یونیورسٹی نہیں لکھا، بلکہ موقع موقع سے "ہمارے خیالات" کے تحت پر زور اداریے لکھ کر اس بات پر زور دیا ہے کہ ان دونوں یونیورسیٹوں سے ناموں سے مذہبی عنصر کو نکال کر بنارس یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی جیسے سکیولر نام دیے جائیں، اس لیے کہ ہندو کے نام سے مسلمان کو ازلی نفرت ہے، اور مسلمان کے نام سے ہندو کو ازلی نفرت ہے۔ ظاہر داری کے طور پر یہ ایک دوسرے کو "بھائی بھائی" کہتے ہیں، لیکن جب مذہب کے آتش فشاں پہاڑ یا مذہب پرستوں کے دل و دماغ سے انتقام کا ناپاک اور تباہ کن جذبا پھوٹ پڑتا ہے تو وہی "بھائی" اپنے دوسرے بھائی کے گلے کاٹ کاٹ کر سڑکوں اور گلیوں میں "انسانی" خون کی ندیاں بہا دیتا ہے۔ یہ ایسی کھلی حقیقت ہے، جس سے متعصب سے متعصب مذہب پرست بھی انکار نہیں کر سکتا، اور جس کے مظاہرے وقفے وقفے سے چار دانگ ہندستان میں آے دن ہوتے رہتے ہیں، اس لیے ایسے مجنونوں، پاگلوں، بے وقوفوں، خونیوں اور بھیڑیوں کے خطرناک مذہب کو لے کر ہم کیا کریں، گویا نعیمت" ہم خدا ہی ایک خونی اور بھیڑیا قرار پائیں۔ یہ ہم سے ہرگز نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ مذہب "انسانیت" اس بات کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیتا، اور ہم خدا سو فیصد طریقے پر مذہب "انسانیت" کے پیرو ہیں، اور زرین "انسانی" اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ ہماری نظر میں ہندو اور مسلمان "بھائی بھائی" ہیں۔ ہم ہر ایک کو اپنی طرح "انسان" سمجھتے ہیں۔ ہم ہندو کو ایک نظر سے اور مسلمان کو دوسری نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ ہماری دونوں آنکھوں کا الگ الگ نظریہ "انسانی" نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد ایک ہو جاتی ہیں، اور اس مرکز یا عالا مقام پر ہمیں سوائے "انسان" کے دوسرا دکھائی نہیں دیتا، ہم کوشش بھی کرتے ہیں تو ہمیں ہندو الگ اور مسلمان الگ نظر نہیں آتا، بلکہ صرف اور صرف "انسان" دکھائی دیتا ہے، اور یہی ہے ہمارے لاجواب، بے نظیر، بے مثال اور سکیولر مذہب "انسانیت" کا نقطۂ عروج جو "فنا فی اللہ" کے درجے تک پہنچ گیا ہے، اور یہی وہ عالا ترین مقام ہے جو مسلمانوں میں صوفیوں کے نظریوں یا SOFIZM کا حامل ہے، اور یہی وہ عالا مقام ہے جو ہندوؤں میں، بھگتیوں کے نظریوں یا BHAGTICULT کا علمبردار ہے"! ہم نے بلکل انہیں اصولوں پر "انسانیت" یا انسانزم INSANIZM کو سکیولرزم SECULARIZM

اور قابل قدر نیز قابل تقلید خیالات بیان کیے ہیں، وہی اگر نرے مذہبی خیالات ہوتے تو کوئی مذہب پرست صاحب قلم کسی بھی رسالے میں کئی قسطوں میں مضامین لکھتا، اور یہ ظاہر کرتا کہ اس سے بہتر نظریہ کسی بھی صاحب دماغ ادیب نے آج تک ظاہر نہیں کیا، اور آخر کار مضامین کا وہی سلسلہ ایک مختصر سی کتاب کی شکل میں منصۂ شہود پر آتا، مگر چونکے ہمارے خیالات سنہرے، زرین، قابل قدر اور قابل ہیں، لیکن یہ نرے سیکولرزم پر مبنی ہیں، اس لیے ہمیں یقین کامل ہے کہ مذہب پرستوں کی طرف سے سوائے لعنت ملامت کی بوچھاڑ کے اور کوئی صلا نہیں ملے گا، ہمیں اس کی مطلق پروا نہیں، اس لیے کہ ہم بہتر طریقے پر سمجھتے ہیں کہ ہم نے ساری دنیا کو سیکولرزم یا "انسانیت" یا انسانیت کی دعوت دی ہے، جو حقیقت میں دنیا کا سب سے بہتر اور قابل عمل مذہب ہے!

اپنے مضمون "علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ" میں خواجہ احمد عباس نے تمام ہندستانیوں کو، بشمول ہندو اور مسلمان، اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ سیکولر ہندستان کے ہر مسئلے کو مذہب پرستی کی عینک سے نہ دیکھیں، بلکہ ہر مسئلے کو اس کے اپنے نقطۂ نظر سے جانچنا چاہیے، چنانچہ "علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ" کے مسئلے میں مسلمان اس کو نرے مذہبی نقطۂ نظر سے جانچ رہے ہیں، اور یہ ان کی تنگ نظری ہے۔ عباس نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ موجودا ایکٹ کو روبہ عمل لانے سے اقلیتی طبقے کے مفاد پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا، بلکہ ان کی رائے میں اس ایکٹ کی وجہ سے آگے چل کر اقلیتی طبقے کا فائدہ ہوگا۔ عباس علی گڑھ یونیورسٹی کے ایم۔اے، ایل ایل۔بی اور بہت پرانے طالب علم رہے ہیں، ان کا یونیورسٹی سے برسوں گہرا تعلق رہا ہے، اور وہ انجمن اتحاد طلبا سے علی گڑھ یونیورسٹی کے صدر یا پریسیڈنٹ بھی تھے۔ اس لحاظ سے علی گڑھ کے دوسرے قدیم طلبا کے مقابلے میں علی گڑھ یونیورسٹی سے عباس کو کہیں زیادہ انس اور محبت ہے، اور وہ ہر صورت اور ہر حالت میں علی یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے موجودا اور آیندا طلبا کی صرف اور صرف بھلائی بہتری چاہتے ہیں، چنانچہ موجودا ایکٹ میں عباس نے اس میں کوئی ایسی برائی نہیں دیکھی جو علی یونیورسٹی یا علی گڑھ یونیورسٹی کے موجودا طلبا یا علی گڑھ یونیورسٹی کے مستقبل میں ہونے والے طلبا کے مفاد کے خلاف ہو، اگر صورت حال یہ ہوتی تو عباس ہرگز ہرگز موجودا علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ کی تائید میں ایک بھرپور اور سوکار مضمون نہ لکھتے، بلکہ وہ لازمی طور پر اس ایکٹ کی خرابیاں گناتے، اور یہ ظاہر کرتے کہ یہ ایکٹ ناانصافی اور غیر ضروری ہے جو حقیقت میں علی گڑھ یونیورسٹی اور علی یونیورسٹی کے موجودا طلبا اور علی گڑھ یونیورسٹی کی آیندا پیدا وار کے خلاف پڑتا ہے، اس لیے حکومت ہندستان کو چاہیے کہ وہ خطرناک اور زہریلے ایکٹ کو فوراً واپس لے لے، مگر چونکے خواجہ احمد عباس نے اس ایکٹ کو علی گڑھ یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے موجودا طلبا اور علی گڑھ یونیورسٹی کی آیندا نسلوں کے لیے سو فیصد طریقے پر مفید اور بہتر پایا ہے، اس لیے انہوں نے اپنے مضمون میں زور دیا ہے کہ اس ایکٹ کو بغیر اعتراض اور بلا چوں و چرا قبول کر لیا جائے، جس سے علی گڑھ یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے طلبا کو ہمیشا فائدا ہی فائدا پہنچے گا۔

عباس کا کہنا ہے کہ بعض مفاد پرست افراد اور طبقے اس ایکٹ کے روبہ عمل لانے کی پرزور مخالفت کر رہے ہیں، اس لیے عباس نے ایسے عناصر کو مشورا دیا ہے کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ کو نری مذہبی عینک لگا کر نہ دیکھیں، بلکہ سیکولرزم کے نقطۂ نظر سے جانچیں تو انہیں اس ایکٹ میں سوائے بھلائی بہتری کے برائی نظر نہ آئے گی، بلکہ انہیں اندیشا اور خطرا ہے کہ اگر اس وقت اس بہتر ایکٹ کو روبہ عمل نہ لایا جائے تو آگے چل کر نہ معلوم کیا کیا پیچیدگیاں پیدا ہوں، اور اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی اور اس کے طلبا کو نقصان پہنچے، اس لیے عباس کا یہ کہنا ہے کہ مسلمانوں کو اس غنیمت موقع سے فائدا اٹھانا چاہیے اور حکومت ہندستان کے دیئے گئے اس زرین اور سنہرے تحفے" کو فاشسٹ سے قبل از لینا چاہیے"

تاکہ آگے چل کر علی یونیورسٹی اور اس کی موجودا اور آیندہ انسلیس بھلائی بہتری اور یونیورسٹی بھی ہے جنہیں ترقی کے ثمرے سے مستفید ہو!

ہم نے "ہندستانی ادب" کے پچھلے نمبر میں خاجا احمد عباس کا ایک افسانہ "سہاگ رات" شایع کیا تھا، اور اس پر نوٹ لکھتے ہوئے یہ ظاہر کیا تھا کہ عباس، خاجا غلام السیدین کے سگے چوٹے بھائی ہیں، اور ہماری یہ معلومات محض لاعلمی پر مبنی تھیں - عباس نے اپنے زیر بحث مضمون میں خود ہی بتایا ہے کہ سیدین ان کے چچا زاد بھائی تھے، جن کو وہ پیار سے "بھائی جان" پکارا کرتے تھے - اس نوٹ میں، ہم نے عباس کو مولانا خاجا الطاف حسین حالی پانی پتی کا نواسا لکھا تھا، نہ معلوم ہمارا یہ علم کس حد تک صحی ہے جو نانا نواسے کا یہ رشتا بھی سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے، اس لیے کہ آج تک ہم نے عباس کا کوئی سوانح حیات نہیں دیکھی، جس سے ہمیں ان کے خاندان کے افراد اور آبا واجداد کا صحی علم ہوتا!

ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

۴۸

یہ واقعا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں اٹھتالیس سال پہلے ہوا تھا، مگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے بارے میں جو بحث چل رہی ہے، اس پر بڑی دلچسپ روشنی ڈالتا ہے۔

۱۹۲۵ء کی بات ہے جب "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" اپنی "گولڈن جوبلی"، یعنی پچاسویں سالگرا منا رہا تھا۔ یہ وہی کالج تھا جس کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں پڑی، جس کو عظیم ماہر تعلیم اور سوشل ریفارمر سرسید احمد خان نے قایم کیا تھا، اور جو آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا۔

اس موقع پر خاص جوبلی ڈبیٹ کا اہتمام علی گڑھ یونیورسٹی یونین نے کیا تھا، جس میں کئی نمایاں اور سربرآوردہ مسلمان حصا لینے والے تھے، لیکن ڈبیٹ کے لیے تجویز پیش کرنے کا اعزاز میرے چچا زاد بھائی خاجا غلام السیدین کو (جن کو ہم پیار سے "بھائی جان" کہتے تھے) دیا گیا تھا۔ وہ علی گڑھ کے ایک نوجوان اولڈ بوائے تھے، اور حال ہی میں انگلستان کی لیڈز یونیورسٹی سے ماسٹر آف ایجوکیشن کی ڈگری اعزاز کے ساتھ لے کر لوٹے تھے، اور یونیورسٹی کے اسٹاف میں ابھی ابھی پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا۔

اس اہم موضوع پر بحث کے لیے "بھائی جان" نے جس مضمون کا انتخاب کیا وہ اس وقت ملک کا اہم ترین مسلا تھا، اور نصف صدی گزر جانے کے بعد آج بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے - سب ہندستانیوں کے لیے خصوصاً ہندستانی مسلمانوں کے لیے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے!

انہوں نے تحریک پیش کی کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ہندستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ وفاداری بنیادوں پر اپنی علحدہ تنظیم نہ کریں، بلکہ دوسرے فرقوں اور قومیتوں اور ترقی پسند افراد کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر سیاسی کام کریں، اور سارے ملک کی خوشحالی اور آزادی کے لیے متحدا جدوجہد میں حصا لیں - اپنے موضوع کی تائید میں انہوں نے مدلل اور بڑی پرزور تقریر کی -

اس کے بعد ہی مخالف سمت سے بڑی بڑی آوازیں بلند ہوئیں ڈائیس پر بیٹھے ہوئے مسلمان لیڈروں کی جن میں مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خان، اور سر علی امام جیسے مشاہیر شامل تھے -

ان سب نے اپنی اہم شخصیت سے فایدا اٹھا کر بڑے مربیانا انداز میں "بھائی جان" کے پیش کردا خیالات اور احساسات کو ایک ناتجربا کار نوجوان کے جوشیلے، مگر غیر ذمے دارانا اور ناقابل عمل مفروضات ٹھہرایا -

ڈبیٹ کے آخر میں جب "بھائی جان" مخالفوں کو "جواب الجواب" دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ اتنی روانی کے ساتھ بولے اور انہوں نے ایسے وزن دار دلایل پیش کیے، جو لیڈروں کی مخالفت کے باوجود مجمع کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے - جب ووٹ لیے گئے، تو ان کی تجویز کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی - حاضرین کی بڑی بھاری اکثریت نے اسے قبول کیا، اور سر جناح کو اپنی اس شکست کا (جو ایک ایسی بگ ہوئی تھی، جہاں مسلمانوں کے نمایندا دانشور اکٹھے تھے) اس قدر صدما پہنچا کہ ان کو سنبلنے کے لیے کم سے کم دس سال لگے -

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندستان، اور اس کے مسلمانوں کی تقدیر کیا ہوتی، اگر فرقا پرستی کا رجحان رکھنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں نے اس قوم پرست نوجوان کی تقریر اور قوی اتحاد کے امکانات پر توجہ [illegible]

یقینی پاکستان نہ بنتا، یقینی فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوتے، آبادی کا تبادلہ نہ ہوتا، اور نہ وہ منگاما ہوتا جو فرقہ پرستوں کٹ ملاوں اور جوشیلے، مگر گمراہ نوجوانوں نے ایک بے ضرر علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ (ترمیم) کے سوال پر کھڑا کر دیا۔

ایسی مخالفت جو متعصبوں، رجعت پسندوں، اور بھرے بھائے، مگر جوشیلے عوام کی اکثریت کی طرف سے کی گئی ہو (جن کو مذہب کے نام پر آسانی سے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے) علی گڑھ کی تاریخ، اور روایات میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

جب سید احمد خان نے محمڈن انگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی تھی، قدامت پسندوں اور کٹ ملاوں نے اس کالج کی شدید مخالفت کی تھی۔ اس کو ایک ایسا تعلیمی مرکز قرار دیا گیا تھا، جہاں بے دینی کی تعلیم دی جائے گی۔ سر سید احمد خاں کے خلاف کفر کے فتوے نکالے گئے تھے۔ ان کو کافر اور بے دین کے خطاب دیے گئے تھے۔

جدید زمانے کی باتیں کرنا سائنس کی تعلیم دینا سماج کے فرسودہ ڈھانچے کو سدار نے کی غرض سے اس میں ضروری کوئی تبدیلی لانا، اس وقت کے جاگیردارانہ مسلم معاشرے میں اس کے مسلمہ عقاید کے خلاف جہاد کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، مگر ایک مرد میدان نے دلیری سے یہ سب خطرے مول لیے، اور آخر میں کامیاب ہوا۔ اس کو آج سر سید احمد خان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بعد کو یہی باتیں دہرائی گئیں، لیکن ایک علحدہ اشکل میں جب ڈاکٹر ذاکر حسین نے، جو نہ صرف ایک پکے قوم پرست اور مشہور ماہر تعلیم تھے، بلکہ ایک سچے مسلمان بھی تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھ کر یونیورسٹی کے کردار میں ایک واضح تبدیلی لانے کی کوشش کی، تاکہ مسلمانوں کی تعلیم کا یہ مرکز قوم پرستی کے دھارے سے ہم آہنگ ہو سکے تو فرقہ پرستوں نے اور سرکار پرستوں نے ان پر اور ان کے ساتھیوں پر ناروا حملے کیے اور ان کو برا بھلا کہا۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی ہمیشہ مذہبی، سماجی، تہذیبی، سیاسی اور کلچرل باقی سیاستوں اور مناظروں کا مرکز رہی ہے۔ ایک طرف سدار اور سوشیل ریفارم، دوسری طرف قدامت پسندی، ایک طرف ترقی پسندانہ خیالات دوسری طرف رجعت پسندانہ رجحانات ایک طرف استدلال، عقل، اور تجربہ کی نظریات

دوسری طرف کٹر پن مذہبی تعصب اور جنگجو یا فرقہ پرستی۔ یہ سب نظریات ایک دوسرے کے خلاف برد آزما ہیں۔ پڑھے لکھے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

بنارس نے ہندو فرقہ پرست پیدا کیے، اور ساتھ ساتھ قوم پرست اور سوشلسٹ بھی، جبکہ علی گڑھ نے علمدگی پسند اور کٹر متعصب پیدا کیے اور ساتھ ہی پکے وطن پرست اور مارکسٹ ترقی پسند، معقولیت پسند اور سماج سدارک بھی، شاید یہ بات ان دو ہندو اور مسلم یونیورسٹیوں کی تاریخ اور روایات میں شروع ہی سے رہی ہے کہ علمدگی پسند قوتیں، قوم پرستوں اور معقولیت پسندوں پر حاوی ہائیں۔

یہ بات قابل غور (اور قابل عبرت بھی) ہے کہ جہاں بنارس میں مہاسبھا، اور آر۔ ایس۔ ایس کی جنگ جو یا نہ ہندو فرقہ پرستی کا زہر پھیلا، اسی طرح علی گڑھ میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کی متعصبانہ علمدگی پسندی اور فرقہ پرستی کا زہر پھیلا۔

یہ دونوں نظریے نہ صرف خطرناک ہیں، بلکہ یہ خطرے کی گھنٹیاں ہیں، جو اعلان کرتی ہیں کہ پھر سے بھیانک ہندستان میں فرقہ پرستی اور توہم پرستی کے رجحانات آج بھی زندہ ہیں۔ ان رجحانات کو روکنا چاہیے، سیاسی زندگی سے ان خطرناک رجحانات کو نکال باہر کرنا ہوگا۔

اس بحث کو اس پس منظر میں ہم کو دیکھنا ہوگا، کیونکہ یہ بحث نہ صرف علمی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ اس کے تلخ اور خطرناک سیاسی نتائج پیدا ہو چکے ہیں، اور بھی ایسے ہی اور نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔

پارلیمنٹ کے علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ کا نام لیکر (جس کا مقصد صرف تعلیمی زندگی کی بہتر تنظیم ہے) ہندو اور مسلم فرقہ پرست اور رجعت پسند پارٹیاں اپنا اپنا سیاسی کھیل کھیل رہی ہیں۔

ایک بار پھر ایسا لگتا ہے کہ مخالف، فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعتیں موقع پرستی کے جھنڈے تلے متحد ہو رہی ہیں، اور حکومت اور پارلیمنٹ کے ہر ترقی پسند اقدام کو ناکام بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ بات ہی مسلمانوں کے دلوں سے شک اور شبہات اور خوف کو دور کرنے کے لیے کافی ہے، جو اس ایکٹ کے متعلق ان

کے دلوں میں پیدا ہوئے نہیں ہیں، بلکہ پیدا کیے گئے ہیں۔

اس ایکٹ کا ابتدائی مقصد ہی علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلیمی انتظام کو جمہوری بنانا ہے، نہ کہ اس کے مسلم کردار سے انحراف یا اس کو محدود کرنا ہے اس میں استادوں کی نمائندگی کے لیے بڑے پیمانے پر ذرائع نکل آتے ہیں، نہ صرف اکیڈمک کاؤنسل میں، بلکہ یونیورسٹی کورٹ میں بھی جو یونیورسٹی کی نگرانی کرنے کا سب سے اونچا ادارہ ہے، اور جس میں اب تک جاگیردارانہ تسلط قایم تھا۔

اس کی ایک انقلابی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں طلبا کی نمائندگی کا خاص طور سے انتظام کیا گیا ہے، نہ صرف یونیورسٹی کورٹ میں، بلکہ اکاڈمک کاؤنسل میں بھی نمائندگی دی گئی ہے، اور اسٹوڈنٹ یونین کو قانونی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔

اس طرح یہ ایکٹ ایک مجموعہ ہے ان تمام شرائط اور قوانین کا جو ایک ترقی پسند یونیورسٹی اور ہمارے تیزی سے بدلتے ہوئے ترقی پسند معاشرے کے لیے ضروری ہیں اور جو علی گڑھ یونیورسٹی کو نہ صرف ہندستان، بلکہ دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں سے ایک بنانے کے لیے لازمی ہیں۔

یہ ایکٹ زیادہ تر گجندر گڈکر کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ہے جس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے سالہا سال سے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت میں قابل قدر حصہ لیا ہے، اور مسلمانوں کی تہذیب اور فلسفے کا گہرا مطالعہ یہاں کی علمی مصروفیات کی ایک نمایاں خصوصیت رہا ہے۔ یہاں کے عالموں نے اپنی تعلیمی مصروفیات، تحریروں اور اپنی تقریروں سے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندستانی تہذیب ایک مشترکہ کردار ہے، اور اسی مشترکہ تہذیب کو پھیلانے میں مسلمانوں نے اہم اور نمایاں حصہ لیا ہے۔

جس طرح بنارس اور علی گڑھ یونیورسٹیاں اپنے اشتراک عمل سے ہندستان کی تہذیبی زندگی میں ایک بہت بڑا رول ادا کر سکتی ہیں، اس کے بارے میں گجندر گڈکر رپورٹ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ میں نیچے رپورٹ کا ایک اور اقتباس پیش کر رہا ہوں۔

"ہماری نظر میں علی گڑھ مسلم اور بنارس ہندو یونیورسٹیوں کو اس بات کا امتیازی حق عطا چاہیے کہ نہ صرف مسلم اور ہندو فلاسفی اور تہذیب میں مہارت حاصل کریں، بلکہ آپس میں مل کر باہمی اشتراک سے ہندستان کی موجودہ مخلوط تہذیب، اور فلسفے اور طرز زندگی کے ارتقا کے سلسلے میں کھوج اور تحقیق کریں۔"

اس طرح علی گڑھ کا امتیازی کردار جو کہ اسلامی تاریخ کی روایات اور تہذیب کے مطالعے کے مرکز کی حیثیت سے ہے، اس کو کہیں نہیں جھٹلایا گیا، بلکہ اس پر برابر زور دیا جا رہا ہے۔ مزید یہ کہ مسلم تہذیب اور فلسفے کو ہندستان کے مشترکہ کلچر کا ایک حصہ ہی نہیں، بلکہ ہندستان کے عوام کا ایک مشترکہ تہذیبی ورثا سمجھا گیا ہے۔

مشترکہ ہندستانی تہذیب کا یہ تصور ہی ایسے لگتا ہے کہ بحث کی بنیاد ہے، لیکن یہ تصور موجودہ حکومت کی اختراع نہیں ہے۔ اس تصور کا ارتقا ہندستان کی تاریخ سے وابستہ رہا ہے، اور نتیجہ ہے مختلف نسلوں کے، کراؤ اور مذہبوں کے گھل مل جانے کا جو ہندستان میں داخل ہوئے، اور ایک دوسرے میں جذب ہو گئے اور ہندستانی تہذیب اور فلسفے کا گونا گوں مرقع بن گئے ہیں۔

مذہب میں صوفی اور بھگتی تحریکوں کے احیا کی آفاقی حیثیت، رام موہن رائے اور سرسید کے سماجی اور تعلیمی سدھار کی تحریکیں، ہندستانی طرز تعمیر کا مکمل ارتقا، اردو اور ہندی زبانوں کی تشکیل، یہ ساری باتیں اس مشترکہ تہذیب کی وجہ سے ظہور میں آئی ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اس مشترکہ تہذیبی حل کو اور آگے بڑھایا۔

ایک سیکولر، متحد، جمہوری سماج کا تصور ہمارا نصب العین ہے، اس لیے قدرتی امر ہے کہ ہم اپنی ہر عظیم قومی یونیورسٹی کو ایک تجربہ گاہ کی حیثیت سے دیکھیں، جہاں متحدہ ہندستان اور متحدہ ہندستانی تہذیب نشو و نما پا سکے۔

اس لیے اصلاح پسندی اور ترقی کے دشمن اور رجعت پسند جن میں فرقہ پرست بھی شامل ہیں، اس کی مخالفت کر رہے ہیں، اور اس کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں۔ ان کی یہ سیاسی چال تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن بڑے سادے نام نہاد مسلمان کہیں گمراہ نہ ہو جائیں، یہ سمجھ کر کہ ان کا روایتوں یا ان کے تمدن پر حملہ ہے یا ان کی تہذیبی انفرادیت کو دھیرے دھیرے ختم کیا جا رہا ہے۔

یہ کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار تسلیم نہیں کیا گیا ہے، میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اچھا ہے کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی جس کا میں سابق طالب علم ہوں، اور جس پر مجھے فخر ہے، اسکو اقلیت کا ادارہ تسلیم نہیں کیا گیا، اور نہ فرقہ پرست ادارہ، کیونکہ اس کو ایک قومی درسگاہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو فخر کرنا چاہیے کہ ان کی یونیورسٹی کو ایک قومی یونیورسٹی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بھی ملک کا ایک حصہ تسلیم کیا گیا ہے، ان کی تہذیب، فلسفہ اور طرز زندگی کو قومی تہذیب، قومی کلچر اور قومی طرز زندگی کا ایک حصہ سمجھ کر قبول کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ کے رول کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ علی گڑھ قومی زندگی میں ایک بہت بڑا کام کرے گا۔ یہ کام بنیادی طور پر ہندستانی سیاست کا ہے، اور ساتھ ہی ہندستانی تعلیم سے متعلق ہے، یعنی ایک سیکولر مملکت میں ایک متحد اور مخلوط قوم اور اس کی زندگی میں مسلمانوں کا مقام اور حصہ۔ وہ طریقے جس پر علی گڑھ بھی کام کرے گا، وہ انداز جس میں علی گڑھ سوچے گا اپنی خدمات جو مختلف حیثیتوں سے علی گڑھ قومی زندگی کو پیش کرے گا، یہ ساری باتیں ہماری قومی زندگی میں علی گڑھ کے مقام کا تعین کریں گی۔"

ایک عظیم ماہر تعلیم، ایک عظیم سپاہی، ایک عظیم ہندستانی، ایک عظیم انسان کے یہ الفاظ جو اسی کے مزار سے گونج رہے ہیں، ہم کو آگاہ کرتے ہیں، اور ہم کو مشعل راہ دکھاتے ہیں۔

علی گڑھ کو اپنے ممتاز فرزند کے کہے ہوئے ان الفاظ پر غور کرنا چاہیے۔

سیکولر ہندستان اور سیکولرزم پائندہ باد!

روشن پٹیالوی

چراغ علم ضروری ہے روشنی کیلئے

بہت ضروری ہے یہ علم آدمی کیلئے
ضروری کوئی باتیں ہیں زندگی کیلئے

طلسم زیست جہاں میں عجیب ہے جس میں
قدم قدم پہ مصیبت ہے آدمی کیلئے

مسرتوں میں یقیناً ہے دلکشی لیکن
مگر ضروری ہے غم بھی تو تازگی کیلئے

وطن پرستی ہی اپنا شعار ہو اے دوست
جئیں اسی کیلئے اور مریں اسی کیلئے

یہی ہے شرط وفا غم اٹھا کے ضبط کریں
بنانا پڑتا ہے دل سخت خامشی کیلئے

نہیں ہے سہل کہ دشمن بھی دوست بن جائے
سلیقہ سیکھنا لازم ہے دوستی کیلئے

غم حیات۔ غم عشق یا غم دنیا
ہو کچھ نہ کچھ تو یہاں اپنی دل لگی کیلئے

رہے یہ یاد نہ جائے گی رائیگاں ہرگز
اٹھائیں جتنی بھی تکلیف راستی کیلئے

جہالتوں کا اندھیرا ہے بزم ہستی میں
چراغ علم ضروری ہے روشنی کیلئے

ستائیں ہمت اہل وفا کے افسانے
طریقہ خوب ہے دنیا میں کم دلی کیلئے

کیا ہے اس کو پریشاں آرزوؤں نے
نہیں نصیب میں تسکین آدمی کیلئے

سکون قلب کی دولت محال ہے لیکن
سکون قلب ہے دشوار بندگی کیلئے

تخیلات ہوں مرکوز ایک نکتے کیلئے
یہی خدا کی عبادت ہے آدمی کیلئے

اٹھائے لطف مسرت کما کما کہ وہ روشن
غم حیات ضروری ہے آدمی کیلئے

پروفیسر عبدالرؤف

وحشت کا تنقیدی شعور

یہ مضمون ہم "غنڈوں کے "سب رس" سے نقل کر رہے ہیں۔ "سب رس" حیدرآباد "ہندستانی ادب" کے تبادلے میں آتا ہے۔ کچھ عرصے سے کارکنان "سب رس" نے "ہندستانی ادب" کے ساتھ "غنڈوں" کا سا سلوک شروع کر دیا ہے، یعنی پتے کی چٹ میں "ہندستانی ادب" کے نام کے بعد "اردو کا ماہوار رسالا" لکھنا شروع کر دیا ہے۔ شروع شروع میں، ہم انجان ہو گئے کہ شاید لکھنے والے کے سہو قلم کا نتیجہ ہے، مگر یہ "شرارت" پابندی کے ساتھ ہوتا رہا "غنڈے پن" کی شکل میں ظاہر ہوتی رہی، اور یہ "بدتمیزی" ہمارے لیے ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی۔ پچھلے ہدایتاً ہم نے ۶-۷-۷۳ کو ایک پوسٹ کارڈ لکھا، جس میں سختی کے ساتھ تاکید کی کہ آئندہ ایسے "غنڈے پن" کا مظاہرہ نہ کیا جائے، ورنہ "سب رس" کے "غنڈے پن" کا جواب "ہندستانی ادب" بھی معقول طریقے پر دے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ہم لکھیں تو کس کے نام، اور مخاطب کریں تو کس کو — اس لیے کہ "سب رس" تو بلکل ہی یتیم و بیسر اور لاوارث رسالا ہے۔ اس کا کوئی ایڈیٹر ہی ہے، اور نہ مدیر یا مرتب وغیرا۔ اس کے فہرست کے صفحے پر چند بھاری بھرکم نام ضرور لکھے جاتے ہیں، جن کو ہم آپ کی اطلاع کی غرض سے یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔ نگران - سید علی اکبر، ام - اے (کنیڈا) مجلس مشاورت - میر حسن - ڈاکٹر گوپی چند نارنگ - رسن راج سکسینا - ڈاکٹر غلام عمر خان - محمد منظور احمد - معتمد - محمد اکبر الدین صدیقی - اس کے بعد مہتمم اور منتظم کے نام بھی موجود ہیں۔

غور فرمایا آپ نے اتنی لمبی چوڑی فہرست میں ایک بھی شخص کو ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب وغیرا کی اہم ترین محاذ ذمے داری سونپی نہیں گئی ہے۔ اس نوبت پر ہم ان تمام زعما کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا رائے قایم کر سکتے ہیں کہ ان سب کی عقلیں "چر کھائے گئی ہیں" اور ان کے سروں میں "بھیجے" کی بجائے "بھونسی" ہے، ورنہ یہ سب برخوردار غلط لوگ ایسی معمولی اور فاش سی غلطی کے مرتکب نہ ہوتے کہ "سب رس" کو سرودگ کے مشہور اور تاریخی "یتیم خانے" یا موجودا ڈکٹوریا میموریل آرفنیج کا ایک لاوارث ممبر بنا دیا!

"ہندستانی ادب" کے تبادلے میں ہندستان کے مختلف شہروں سے متعدد رسالے تبادلے میں آتے ہیں۔ ان میں سے ہر رسالے پر دوسرے [illegible] ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب ضرور بفرور ہوتا ہے۔ جب پاکستان کی ٹاک کھلی تھی، اس وقت بھی [illegible] پچاسوں ہی رسالے تبادلے میں آیا کرتے تھے، جن پر ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب ضرور لکھا ہوتا تھا۔ ہم قریب قریب (۵۰) سال سے آج تک برابر رسالے اور اخبار پاکستان سے [illegible] ہم نے کوئی رسالا ایسا نہیں دیکھا، جس پر ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب نہ لکھا ہو۔ ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب

لکھنا لوازمۂ صحافت سے ہے، ورنا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسالا پڑھنے والا، رسالے کے بارے میں کچھ لکھنا چاہے تو کس کو لکھے؟ اسی وجہ سے ہم خود بھی مجبور ہوگئے اور پوسٹ کارڈ پر پتے میں بغیر ایڈیٹر والا "ٹیٹ لیس" "EDITORLESS" لکھا - ہمارے پوسٹ کارڈ کا متن یہ ہے -

"ع - چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" "سب رس ہمارے رسالے "ہندستانی ادب" کے بارے میں آتا ہے، مگر آجکل اپنے "غنڈے پن" کو ساتھ لیے آرہا ہے - پتے کی چٹ پر "ہندستانی ادب" کے نام کے بجائے - اردو کا ماہوار رسالا - لکھنا نرا "غنڈا پن" ہے - (۳۳) سالا پرانے ہندستانی زبان اور ادب کے علمبردار اور دعویدار کو "اردو کا ماہوار رسالا" لکھنا، ماں بہن کی فحش ترین گالی دینے کے برابر ہے، اس لئے کارکنان "سب رس" کو اپنے اس قبیح اور مذموم نیز نرے "غنڈے پن" سے خود باز آجانا چاہیے، ورنا "ہندستانی ادب" کے صفحوں میں اس کا مناسب ترین، موزوں ترین اور معقول ترین جواب دیا جائے گا"

ہم نے اپنا پوسٹ کارڈ ۲۵ رجون ۱۹۷۳ء کو لکھا تھا، لیکن اگست ۱۹۷۳ء کے ختم تک بھی اس کا کوئی جواب نہیں آیا، اسی لیے آج ہم کارکنان "سب رس" اور "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کو "سب رس" کے "غنڈے پن" سے واقف کرانے پر مجبور ہوگئے -

اس وقت ہمیں ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا، وہ یہ کہ جولائی ۱۹۷۳ء کے "سب رس" میں ایک مضمون "وحشت کا تنقیدی شعور" ہماری نظر سے گذرا - ہم نے پورا مضمون پڑھ ڈالا، اور اس کو بیعاری اور بہتر پایا، اس لیے اس نمبر میں نقل کرنے کی خاطر اس کو ایک نظر دیکھ بھی ڈالا، مگر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آٹھ صفحے کے اس طویل مضمون میں ایک بھی جگہ اشارتاً یا کنایتاً شاعر کا نام ہی نہیں دیا گیا ہے - قاعدا ہے کہ ہر مضمون نگار اپنے مضمون کے شروع میں شاعر کا نام ضرور لکھتا ہے - بعض مضمون نگار موقع محل سے شاعر کا نام درمیان میں یا کبھی کبھار مضمون کے آخری حصے میں بیان کیے دیتے ہیں - ان تینوں شکلوں سے ظاہر ہے پورے مضمون میں کہیں نہ کہیں شاعر کے نام کا اظہار ضروری اور لازمی ہے، ورنا پڑھنے والے کیا جانیں کہ وحشت کا نام کیا تھا - ؟ چنانچہ ایک جھوڑ دو رسالوں میں وہی مضمون چھپنے کے بعد بھی وحشت کا نام تاریکی ہی میں رہا - یہ تو نہیں معلوم ہے کہ وحشت کلکتے کے رہنے والے تھے اور ان کا نام رضا علی تھا، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص وحشت کے نام سے واقف ہو سکے!

اس نوبت پر ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام ان نام نہاد ایک درجن کارکنان "سب رس" کا تھا، جن کے نام اس رسالے کے ہر نمبر میں فہرست کے صفحے پر چھپا کرتے ہیں، مگر ذمے داری لے تو کون - ؟ ایک شخص کہے گا میں تو طرف نگران ہوں، دوسرے کہینگے ہم تو صرف مشیر ہیں، تیسرا کہے گا میں تو محض معتمد ہوں - "سب رس" بے چارا تو بلکل ہی لاوارث اور یتیم و یسیر ہے، جس کا نہ کوئی ایڈیٹر ہے، اور نہ مدیر اور نہ ہی مرتب - اگر کوئی باقاعدا ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب ہوتا تو وہ "سب رس" میں تمام بدتمیزیوں اور بدعنوانیوں کا معقول جواب دیتا، چونکے ایسا معقول جواب دینے کی کارکنان "سب رس" میں سے کسی میں بھی قطعی اور مطلق صلاحیت نہیں ہے، اس لیے ان نام نہاد ارکان نے اپنے بچاؤ کی خیر اسی میں دیکھی کہ کسی بھی شخص کے سر "سب رس" کی ایڈیٹری یا ادارت کی ذمے داری نہ سونپی جائے، چنانچہ نمبر موجودا زیر بحث شکل اس غیر ذمے دارانا حیثیت کی بہترین اور موزوں ترین مثال ہو سکتی ہے - یہ سچ ہے کہ ہم مضمون [illegible] ترکس کو؟ لکھیں تو کس کے نام؟ ہم اکبرالدین صدیقی کو اس کا ذمے دار [illegible]

اس لیے کہ معنی میں "سب رس" کے کرتا دھرتا اور ایڈیٹر بھی وہی ہیں، اور ادارے کے مقدمہ بھی وہی ہیں۔ وہ اپنے نام کے ساتھ مقدم اور مدیر تو ضرور لکھتے ہیں، لیکن ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب "سب رس" لکھتے انہیں کیوں لجا اور شرم سی محسوس ہوتی ہے؟ پہلے وہ ادارے نہیں لکھا کرتے تھے، لیکن اب "اپنی بات" کے تحت ہر نمبر میں ادارہ لکھنا بھی شروع کر دیا ہے۔ مضامین وغیرہ بھی وہی دیکھا کرتے ہیں اور مضامین وغیرہ کا انتخاب بھی وہی کرتے ہیں، تنقیدیں بھی وہی لکھتے ہیں، اور رسالے سے متعلق دوسرے نوٹس وغیرہ بھی وہی لکھا کرتے ہیں۔ یہ سارے کام ایک ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب کی حیثیت سے انجام دیتے ہیں، مگر اس کے باوجود اپنے نام کے ساتھ ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب نہیں لکھا کرتے ہیں، نہ معلوم اس میں کونسی مصلحت چھپی ہے، جو ہماری سمجھ سے باہر ہے؟ ہمیں اس کا پورا پورا علم ہے کہ نگران اور مشیر وغیرہ صرف کمیٹیوں کے وقت آیا کرتے ہیں، اور انہیں "سب رس" کے کاروبار سے دور کا بھی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔ ہر نیا "سب رس" چھپنے کے بعد جب ان کے ہاں پہنچتا ہے تو وہ اس رسالے سے واقف ہوتے ہیں، اور دوسری طرف رسالے کی لکھائی اور اشاعت کے تمام مراحل صرف اکبرالدین صدیقی انجام دیتے ہیں۔ رسالے کے نام جتنے بھی مضامین وغیرہ ادارے پر وصول ہوتے ہیں، ان کو بھی صدیقی ہی دیکھا کرتے ہیں، اور ان ہی سے ہر نمبر کے لیے انتخاب بھی فرمایا کرتے ہیں، یعنی دوسرے معنی ایک ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب کے تمام کام صرف اور صرف اکبرالدین صدیقی انجام دیتے ہیں، مگر "سب رس" کے ساتھ اپنا نام بحیثیت ایڈیٹر یا مدیر یا مرتب لکھتے انہیں کچھ شرم سی آتی ہے — نہ معلوم "یہ کیوں ——"

ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

مولانا شبلی نے شعر کی ماہیت سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں"۔ اس لحاظ سے شاعر سے مراد، وہ شخص ہے جو سماج کے دوسرے افراد کے مقابلے میں زیادہ باشعور ہو۔ شاعر جہاں قدم ہوتا ہے، وہ سوسائٹی کے صرف ظاہری خدوخال کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس کی نظریں روح کی پہنائیوں تک پہنچتی ہیں۔ چشم دل سے وہ ان چیزوں کو بھی دیکھ لیتا ہے، جو ان کی ذہن کے کسی نہ دیکھے جانے والے گوشے میں پڑی ہوئی ہوتی ہیں، "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی" کے مصداق اسے ان ذمے داریوں سے عہدا برآ ہونا پڑتا ہے، جہاں دوسروں کا گذر نہیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

سماج کے سب سے زیادہ باشعور فرد کی حیثیت سے شاعر ان تمام ذمے داریوں کو پورا کرتا ہے۔ جو سماج کی اصلاح کرنے والوں، سیاسی رہنماؤں، فلسفیوں، سوشیالوجسٹ اور عوام الناس کی تشکیل کرنے والوں پر عاید ہوتی ہیں۔ شاعر ضمیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب فکر گرا ہوتی ہے تو اسے ٹوکتا ہے، وہ زندگی کی تنقید کرتا ہے، اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے بعد خاموش نہیں بیٹھتا، بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ حقایق کی تلخیوں کو کس طرح شیریں بنایا جائے۔ وہ حال کی تفسیر لکھتا ہے، اور مستقبل کی بشارت بھی دیتا ہے۔ شعر کیا ہے، اس کی ماہیت کیا ہے؟ انسانی جذبات و شعور سے اس کا کیا تعلق ہے، طبیعاتی، مابعد طبیعاتی اور روحانی عالم کے درمیان کس طرح شعر رشتے قایم کرتا ہے۔ شاعری کس طرح سماجی، سیاسی، اور معاشی حالات سے متاثر ہوتی ہے، اور بذات خود کس طرح مختلف نظامہائے فکر کو متاثر کرتی ہے۔ وہ کس حد تک اپنے ماحول کی خالق اور اس کی رہنما ہوتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان کیا رشتے ہیں۔ شاعری کس طرح ماضی کی روایتوں اور قدروں سے استفادا کرتے ہوئے حال کو سیراب کرتی ہے، اور مستقبل کے لیے سرمایۂ میراث چھوڑتی ہے، ماضی، حال کو متاثر کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، لیکن فکر نے ایک نئی کروٹ لی ہے، اور اب یہ سوچا جانے لگا ہے کہ آیا حال ماضی کو متاثر کرتا ہے، چنانچہ دور حاضر کے عظیم نقاد

ٹی - ایس - ایلیٹ کا خیال ہے -

The Poet should be alter by the present as much as The present is directed by the past and The poet who is aware of This will be aware of great difficulties and responsibilities

مذکورا نکات نفس شاعری سے متعلق تھے - دور حاضر کے نقاد صرف فن شعر کی تنقید پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ وہ ہمیں یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ شاعر یعنی خالق فن پر کن عنوانات سے فرایض عاید ہوتے ہیں - شاعر کی ذات سے سماج اور ماحول کیا طلب کرتا ہے، زبان اور ماہیت شاعری اس سے کن چیزوں کا تقاضا کرتی ہے، اب تک جس خاص ہیت کو وہ صنف شاعری سمجھتا رہا ہے کیا اس کے علاوا دوسری ہیتیں شاعری نہیں بن سکتیں، کیا نثر میں شاعری ممکن ہے، وغیرا وغیرا -

فن تنقید کا آغاز اگرچے ارسطو کے باتوں ہوا (اس کا عہد ۳۸۴ ق - م تا ۳۲۲ ق - م ہے)، لیکن صدیوں تک یورپ اس خاص صنف ادب کی طرف متوجہ نہ ہوسکا - دوسرے اسباب کے علاوا اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اہل مغرب یونانی علوم وحکمت سے راست متاثر نہیں ہوے، بلکے بارویں صدی میں قرطبا اور قسطنطنیا کی راہ سے افلاطون اور ارسطو کی تصانیف کے عربی ترجمے اور تبصرے یورپ پہنچے انہیں دوبارا لاطینی میں ترجما کیا گیا اور پھر یورپ کی دوسری زبانوں میں ارسطو کی تصانیف کے ایک مترجم اور مبصر کی حیثیت سے ارسطو کو خاصی اہمیت نصیب ہوئی جس کے نام سے یورپ میں ایک مکتب فکر قایم ہوگیا، جو سولویں صدی تک قایم رہا (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا) اس طرح یورپ ابن ارسطو کی معرفت ارسطو سے متعارف ہوا - اس کے قایم کردا اصولوں کی روشنی میں موجودا فن تنقید کی بنیاد پڑتی ہے -

انیسویں صدی نے عظیم سائنسدانوں کو جنم دیا، جن کے انکشافات اور ایجادات کی مثالیں پچھلی صدیوں میں نہیں ملتیں - اس صدی میں سائنس کے علاوا دوسرے علوم کی بھی نئی تنظیم کی گئی، جس میں ایک فن تنقید بھی ہے -

ہماری زبان میں فن تنقید کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے - اس سے پہلے فارسی زبان میں تذکرے لکھے گئے، جن میں صرف شاعروں کے نام، تخلص اور حالات سے متعلق چند فقرے لکھ دیے جاتے تھے - شاعری کے بارے میں اول تو کوئی راے نہیں ملتی، اور ملتی بھی ہے تو رسمی اور غیر واضح طور پر اس کے باوجود یہ تذکرے ہمارے ادب کی تاریخ کی بنیاد ہیں -

اس میں کوئی شک نہیں کہ انتقادیات کا جو سرمایا ہمیں نصیب ہے وہ متقدمین شعرا، اردو یا فارسی کی دسترس سے باہر تھا، لیکن اس کے باوجود اگر ہم قدیم دیوانوں کا مطالعا کرتے وقت اس نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھیں کہ قدما کے نزدیک معیار سخن کیا تھا، اچھا شعر وہ کسے سمجھتے تھے، شاعری کے اصول اور لوازمات کے بارے میں ان کا کیا نظریا تھا، ہمیں خاصی تعداد میں ایسے اشعار مل جائیں گے، جن کی روشنی میں ہم ان کے قایم کردا معیار سخن کا پتا چلا سکیں -

قدیم دکنی دور یعنی پندرویں صدی کے آغاز سے لیکر شعرا کے جتنے دیوان اور کلام کے مجموعے مرتب ہوے ہیں، سب میں کچ نہ کچ اشعار ایسے ملتے ہیں، جو فن شعر اور اس کے محاسن اور معایب کی طرف واضح اشارا کرتے ہیں عہد حاضر کے شعرا میں اقبال، حسرت، اور وحشت کے یہاں یہ رجحان سب سے زیادا نمایاں ہے - فارسی اور ہندستانی شعرا نے اپنے کلام میں فکر وفن کے متعلق شاعرانا انداز میں جن اصولوں اور کلیوں کا ذکر کیا ہے، اگر انہیں عہد حاضر کے انتقادی ادب کے مقابل رکھا جاے تو شاید آج کا انتقادی ادب سواے چند اجنبی اور بھاری بھرکم اصطلاحوں کے کوئی نئی چیز پیش نہیں کرسکے گا، لیکن یہ بات صرف اصول اور کلیے سے متعلق ہے، شاعری کی تفصیلات سے نہیں - نفس مضمون کی وضاحت کے لیے اساتذۂ متقدمین کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جو فن شعر اور معیار سخن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں، مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

حسن بیان یہ ہے کہ محبوب کی باتیں دوسروں کی داستان میں بیان کی جائیں، مولانا کے اس شعر نے جو شہرت اور آفاقیت حاصل کی وہ محتاج بیان نہیں، اور کہ ہر شعر

اس میں وہ نقطہ مضمر ہے جو شعر و ادب کی روح کا پتا دیتا ہے۔
حافظ نے بتایا ہے کہ شعروں کی بندش میں چستی اور سلاست پیدا کرنے کے بعد ہی قبول عام کی توقع کی جا سکتی ہے ؎

حدیث چو می بری اے ست نظم بر حافظ
قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

ایک دوسرے شعر میں انہوں نے بتایا ہے کہ ایک کامیاب فنکار اور شاعر بننے کے لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ ادبی شہ پاروں کا مطالعہ کیا جائے، چنانچہ اپنے ایک کامیاب شاعر بننے کی توضیح اس طرح کرتے ہیں ؎

گر بہ ایوان غزل صدر نشینم چہ عجب
سالہا پیروئ صاحب دیوان کردم

ایوان غزل میں اگر مجھے صدر کی جگہ مل جائے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے، کیونکہ میں نے سالہا سال صاحب دیوان شعرا کی پیروی کی ہے۔

ایرانی شعرا کی تقلید میں ہندستانی کے اساتذہ نے بھی اس فن میں بہت کچھ کہا ہے، شعر کیا ہے، اور شاعر کے فرائض کیا ہیں، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ملا وجہی اپنی مثنوی "قطب مشتری" میں فرماتے ہیں ؎

کتا ہوں تجھے پند کی ایک بات
کہ ہے فائدہ اس سے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس
بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کیرے بات میں
پڑیا جاے کیوں جزے کر ہات میں
جسے بات کے ربط کا نام نہیں
اسے شعر کہنے سوں کچ کام نہیں
اسی لفظ کوں شعر میں لیاے توں
کہ لیا یا ہے استاد جس لفظ کوں
اگر خام ہے شعر کا تجکوں چھند
جنے لفظ لیا ہور معنی بلند
اگر خوب محبوب جیوں سور ہے
سنوارے تو نور علی نور ہے

اپنی علالت بیان اور شیرینیٔ سخن کا ذکر کرتے ہوئے ولی فرماتے ہیں ؎

ولی شہ سی زبانی کی نہیں ہے عاشقی سب کو

دوسرے مقام پر ایک مستزاد میں فرماتے ہیں ؎

فرہاد کی آتی ہے صدا روح صبا ہو
مجھ شعر کو سنتے
مذکور ہے از بسکہ ولی میرے سخن میں شیریں بچناں کا
چونکے میرے کلام میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے بول میٹھے تھے، اس لیے فرہاد کی روح صبا بن کر میرا کلام سننے آتی ہے۔

شاعر کا کلام، اس کی بقا کا ضامن ہوتا ہے، سودا فرماتے ہیں ؎

اکثر نشاں بنے ہیں عالم میں نام خاطر
تو نے سخن کو سودا اپنا نشاں بنایا

اور میر کیا کہتے ہیں ؎

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

شعر و سخن کے متعلق غالب کے اشعار انقلاب انگیز اور حکیمانہ ہیں ؎

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
ذکر عشق خوں ریز و دلگداز ہوتا ہے ؎
پر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

شعروں میں معنوی خوبیوں کے علاوہ لفظی خوبیوں کا ہونا بھی ضروری ہے ؎

نہیں گر سرو برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

اسی عنوان کے تحت حالی کہتے ہیں ؎

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

آیئے اب ہم معلوم کریں کہ وحشت نے ہندستانی اور فارسی کی اس عظیم روایت کو کس طرح برتا، اور فن شعر سے متعلق کیا نکات واضح کیے، اختصار اور جامعیت کا شمار محاسن شاعری میں ہوتا ہے دوسرے اصناف سخن کے مقابلے میں غزلوں میں اختصار، اور جامعیت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ غزل کا ہر شعر انسان کے مختلف جذبات کا ایک مکمل نقش ایک مکمل نظام فکر، ایک مکمل فلسفۂ حیات ہوتا ہے۔ حضرت وحشت

نے اپنے کلام میں شعوری طور پر اختصار برتا ہے، اور مختلف اشعار میں اس کی افادیت پر روشنی بھی ڈالی ہے ملاحظہ فرمائیں ؎

وحشت خصوصیت جو تری ہے برت اسے
ہاں ہاں غزل میں شان رہے اختصار کی

اختصار سے معنی میں تشنگی نہیں، بلکہ لطف پیدا ہوتا ہے ؎

زنہار بار خاطر اہل سخن نہ ہو
وحشت غزل میں لطف رہے اختصار کا

طوالت سے شعر کے اثر پر حرف آتا ہے ؎

گراں ہوتا ہے طبع شعر کو طول سخن وحشت
اگر پر لطف رکھنا ہے غزل کو مختصر کر دے

اہل نظر کو طول سخن کی نہیں، بلکہ حسن مضمون کی طلب ہوتی ہے ؎

ہمیں طول سخن سے کام کیا وحشت تغزل میں
کہ ہیں اہل نظر تو حسن مضمون دیکھنے والے

اشعار کے معنی مبہم نہ ہوں، پیچیدگی اور تعقید لفظی سے معنی خبط ہو جاتے ہیں، اور شعر کا لطف جاتا رہتا ہے ؎

پیچیدگی سے پاک رکھ اپنے کلام کو
وحشت سخن میں چاہئے لطف زبان رہے

کلید عقدۂ خاطر نہیں مضمون پیچیدہ
سخن میں جب بناوٹ آ گئی وحشت سخن بگڑا

کلام میں لطف معنی کے علاوہ لطف بیان کا ہونا بھی ضروری ہے، اگر شاعر کی تمام کاوشیں مضامین کی بندش تک محدود رہیں اور وہ فصاحت، بلاغت اور شاعری کے دوسرے لوازمات کی طرف متوجہ نہ ہو تو، اسے شعر کا عیب سمجھا جائیگا۔ ایسے شعر کی تعریف یہ ہے کہ وہ معنی دہیاں سے آراستہ ہو، چنانچہ حضرت وحشت نے اس کی طرف بھی اشارے کیے ہیں ؎

وحشت کمال شعر فصاحت کا نام ہے
مضمون کے خیال میں لطف بیان نہ چھوڑ

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

وحشت تری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر
جس میں کہ حسن معنی و لطف بیان نہ ہو

حق تو یہ ہے کہ وحشت نے معنی و بیان کی تکمیل میں عمر صرف کر دی، جس کا ایک گہرا اور پائیدار نقوش [illegible]

ذوغ طبع خداداد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب فن کے لئے

کلام اور انداز بیان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وحشت مری زباں کو تو اہل زباں سے پوچھ
ماہر زباں کے ہوں فقط اہل زباں غلط

کیا تھا روح غالب سے جو میں نے کسب فن وحشت
سخنور سیکھتے ہیں آج انداز بیاں مجھ سے

کسب فن کی وحشت نے جو ریاضت کی اس کی روشنی میں ان کا دعوئے سخن محض تعلی نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے، جس کی شہادت ان کی غزلوں میں موجود ہے، اور جس کا اعتراف عصر حاضر کے نقادوں، اور شاعروں نے بھی کیا ہے۔ وحشت کی شاعری کے اسی خاص پہلو (یعنی فصاحت اور بلاغت) کو مدنظر رکھتے ہوئے پرویز شاہدی نے نہایت ہی پر درد لہجے میں کہا ہے ؎

ماتمی قوت نطقت عجز کلک فکر
ہم بلاغت محو خواب و ہم فصاحت محو خواب

خاصئے فکر اس بات پر ماتم کر رہا ہے کہ اس میں قوت نظم یعنی شعر و شاعری کی طاقت باقی نہیں رہی، کیونکہ وحشت کی موت کے بعد فصاحت و بلاغت کو گویا نیند آ گئی (پرویز شاہدی نے علامہ وحشت کے انتقال پر فارسی میں ایک نظم لکھی تھی، جس کا ایک شعر اوپر درج کیا ہے، پوری نظم راقم کے پاس محفوظ ہے)

اساتذہ کے کلام سے وحشت نے جس طرح استفادہ کیا، اس کی مثال اس دور میں حسرت کے سوا کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے ان کا کلام نئی پود کے لیے روشنی کا ایک مینار ہے جو اسے گمراہی سے بچا سکتا ہے۔ وحشت نے اساتذہ کو جو داد سخن دی ہے خود ان ہی کی زبان سے سنیے ؎

سخن سے تیرے وحشت طرز غالب آشکارا ہے
کہیں رنگیں بیانی ہے کہیں نازک خیالی ہے

میں تو ہوں معتقد داغ، غزل میں وحشت
جس کی ہر بات ہم آہنگ اثر ہوتی ہے

میر اور غالب کی مدح میں جو انہوں نے نظمیں لکھی ہیں، وہ ان کے تنقیدی شعور کا نہایت شگفتا اور دلآویز نمونا ہیں، میر کے بارے میں فرماتے

وفا و مہر کا ایسا نہ ہو گداز داں ہرگز
لکھے گا یوں نہ کوئی درد و غم کی داستاں ہرگز
نہ آتی ہے نہ آئے گی کسی کو یہ زباں ہرگز
میسر ہو نہیں سکتا یہ انداز بیاں ہرگز

جو اس کا رنگ ہے وہ کب سے کامل نہیں ہوگا
الم پروردہ اس کا سا کسی کا دل نہیں ہوگا
نہ گزرا وادیٔ الفت کا ایسا رہنما کوئی
دلوں کے راز سے نکلا نہ اتنا آشنا کوئی
حریف اس کا بیان عشق میں وحشت نہ تھا کوئی
زمین ہند کیا، ایران میں بھی کب ہوا کوئی
ہوا تغیرِ رنگ ایک ایک کی صہبا بیانی کا
ہلالی کا ضمیری کا شفائی کا، فغانی کا

حضرت غالب کو وہ اس طرح داد سخن دیتے ہیں ؎

عبارت تیری کیا ہے سرمۂ تسخیر ہے گویا
کلام جانفزا اعجاز کی تقریر ہے گویا
سخن تیرا ہے کیا اک درد کی تصویر ہے گویا
جو تیرا نالہ ہے وہ نالے کی تاثیر ہے گویا

حکایت ہے ترے لب پر غم جاں سوز ہجراں کی
اڑائی تیرے خامے نے ادا دلہائے نالاں کی
نسیم صبح گاہی ہے کلام جاں فزا تیرا
دلوں کو جوش میں لاتا ہے رنگ آشنا تیرا
بہارستان مضموں ہے خیال نکتہ زا تیرا
فروغ طبع کی معراج ہے فکر رسا تیرا
ترا دیوان غالب دفتر نازک خیالی ہے
ترا پایہ سخنداناں ہندوستاں میں عالی ہے
ہماری طبع جب ہوتی ہے جدت آفریں وحشت
نیا انداز فن شعر میں ایجاد ہوتا ہے

وحشت فن میں نئے انداز، ایجاد، جدت آفرینی کے موید تھے، لیکن محض ہیئت پرستی کو جس کا شعریت اور معنویت سے کوئی تعلق نہ ہو، خارِ تنگِ سخن سمجھتے تھے، کے اشعار ملاحظہ ہوں -

کیے کیا کیا تصرف شعر میں جدت پرستوں نے
ہے وحشت مدعا ان کا یہ فن برباد ہو جائے
ہے مجھے وحشت تصرف ہائے بیجا کا گلہ
کس قدر ہے ان دنوں اردو زباں بدلی ہوئی

غزل کا ایک مخصوص مزاج، ایک مخصوص لہجا، ایک مخصوص انداز بیان ہوتا ہے، جسے محض جدت پرستی کے زعم میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس ضمن میں وہ قدما کی تقلید کو زیادہ مناسب سمجھتے تھے، چنانچہ میکانا انداز سے جس سے ان کے عزم و استقلال کا بھی اندازا ہوتا ہے، فرماتے ہیں ؎

غزل کا لطف ہے وابستۂ طرز کہن وحشت
خیال خاطر اصحاب جدت آشنا کب تک

کلام وحشت کی جاذبیت، رنگین لفظوں کی حسین ترتیب، فکر معنی کی شگفتگی، اور تخیلی شعور کی پختگی کے وہ اہم اسباب ہیں۔ اول یہ کہ انہوں نے فارسی اور انگریزی ادبیات کا گہرا اور وسیع مطالعا کیا تھا، اور دوسرے یہ کہ متقدمین کے کلام کے مطالعے اور اس سے اکتساب فیض کرنے میں عمر بسر کر دی تھی، صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اپنی کاوشیں ہندستانی اور فارسی کی کلاسیکی شاعری تک محدود رکھیں، بلکہ اپنے ہمعصر شعرا کے کلام کا بھی دلچسپی کے ساتھ مطالعا کرتے اور انہیں داد سخن دیتے رہے۔

طبع وحشت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض
یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا مطالعا کلاسیکی شاعری کی یاد تازا کر دیتا ہے۔ تیر نے اپنے بارے میں کہا تھا ؎

ہم کو شاعر نہ کہو تیر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

حضرت وحشت سے وابستہ رہنے والی ہستیوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ درد و غم کا کتنا حصا انہیں نصیب ہوا تھا، اور انہوں نے اس حصے سے کیا کام لیا۔

ہمارا دور نئی قدروں کو متعین کیے بغیر پرانی قدروں کو مسمار کرنے پر تلا ہوا ہے، اس لیے ہم کو یہ سوچنا ہے کہ کلام وحشت اور ان ہی کی صف کے دوسرے اساتذا کے کلام کی روشنی میں کس طرح ہم نئی سمتیں متعین کر سکتے ہیں۔

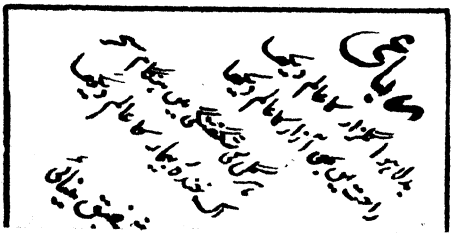

پریا کرونا کر

ولیم اسٹیفورڈ اور مرزا غالب

غالب اور اسٹیفورڈ دو مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے درمیان زمانا، زبان، تمدن اور ایک پوری طرز زندگی کا فرق ہے۔

غالب گذرے زمانے کا عظیم ہندستانی شاعر، رومان پسند اور اہل باطن تھا۔ شائستہ آداب کا مجسمہ، تیکھی نفاست کا پتلا، اسلوب بیان کا استاد بے مثل۔

اسٹیفورڈ جو آج زمانے کے ایک مانے ہوئے امریکی شاعر ہیں، وہ صاف گو ہیں، تکلف سے خالی، ٹھوس بات کہنے والے، اور گہرا، اخلاقی احساس رکھنے والے ایک خالص دیہاتی آدمی ہیں۔

تب اگر اسٹیفورڈ جیسے ایک شعر گو کو غالب کی ہندستانی شاعری کا ترجمہ آج کی امریکی بول چال میں کرنے کے لیے کہا جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک راست تصادم، یا تابارک شاعرانہ تباہی؟

نہیں، بلکہ جو اصل نتیجہ نکلے گا وہ ایک بلکل نئے محاورے میں غالب کے مضامین کی ایک شاندار توسیع کے مترادف ہوگا۔ غالب کو ہم ہندوستانی میں جس شکل میں جانتے ہیں اسے اسٹیفورڈ کے ترجمے میں تلاش کرنا ایک بڑی غلطی ہوگی۔ ان ترجموں کو ابتدائی طور پر محض اس طرح پڑھا جانا چاہیے، جیسے وہ اسٹیفورڈ کی طبعزاد نظمیں ہوں جن میں صرف غالب کے مضمون کو جذب کر کے محفوظ کر لیا گیا ہو۔ یہی ان کی کامیابی ہے۔

جیسا کہ اسٹیفورڈ خود کہتے ہیں، اگر غالب آج زندہ ہوتے تو وہ اپنے مطالب کے لیے ایک دوسرا محاورا، استعمال کرتے۔ یہ بات باعث دلچسپی ہے کہ یہ دونوں شاعر کسی قدر پرانی روایت سے تعلق رکھتے ہیں، اور وقت کی [illegible]

مشکوک ہو جاتا ہے۔

ولیم اسٹیفورڈ اس موقع کی یاد دلاتے ہیں جب ہندستانی شاعر کی برسی کے سلسلے میں انہوں نے شکاگو یونیورسٹی میں منعقدا ایک مشاعرۂ غالب میں شرکت کی۔ ہندستانی انگریزی بولنے والے طلبا سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پہلے تو اعجاز احمد نے غالب کی ہندستانی غزلیں پڑھیں، اور پھر ہر مترجم شاعر نے باری باری سے اٹھ کر اپنے ترجمے پڑھے۔ اسٹیفورڈ اس موقع کو ایک روح پرور تجربے کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ جب طلبا نے کھڑے ہو کر تحسین اور تنقید میں آوازیں بلند کیں تو وہ موقع جذبے خیرسگالی سے کس قدر پر تھا۔

اسٹیفورڈ ان دنوں ہندستان میں ہیں، ان کے نزدیک ان کا یہ دورا ایک دوسری ثقافت کی کھوج کے مترادف ہے۔

"کیا امریکا کے شاعر ایشیائی شاعری سے بہت زیادا متاثر ہو رہے ہیں؟ امریکا میں جن ارباب قلم کو جانتا ہوں وہ ان معنوں میں اس اثر سے مامون نہیں ہیں وہ سمجھتے ہوں کہ ان کے پاس سب کچھ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں جس چیز کی تلاش ہے وہ کہیں اور ہے، اور میں اس احساس میں ان کے ساتھ ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک لحاظ سے میں اپنے ملک سے باہر جاتا ہوں تا اصل میں یہ دیکھنے کے لیے کہ امریکا میں جس زندگی کے بارے میں لکھا جاتا ہے وہ کیسی ہے، لیکن ایک دوسرے معنوں میں میں ان خوش قسمت امریکی اہل قلم میں سے ہوں جنہیں دوسری قسم کے زرد و جواہرات سے مالا مال ہونے کا موقع ملتا ہے، میں کچھ ایسی ہی تلاش میں ہوں۔"

ان کی شایع شدا تصنیفات یہ ہیں: "ویسٹ آف [illegible] ۱۹۶۰ء [illegible]

جس پر ۱۹۶۳ء کا نیشنل بک ایوارڈ ملا تھا، اور "ایلی جا امینز" ۱۹۷۰ء ان کے علاوہ اعجاز احمد اور دوسرے امریکی شاعروں کے تعاون سے غالب کی غزلوں کا ایک مجموعہ تراجم ۱۹۷۱ء بھی ان کی تخلیق ہے۔

اسٹیفورڈ سے ملنے پر پہلا تاثر ایک ایسے شخص کے بارے میں ہوتا ہے، جس کا چہرا قدرے سخت اور بازو مضبوط ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی طور پر منکسر مزاج شخص ہیں، اور یہ محض ان کا ایک انداز نہیں ہے۔ ان کو طاقت کا راز ان کے انکسار میں ہے، اور زمین کے ساتھ ان کی قربت میں اور ان چیزوں میں جن سے انہیں واقفیت اور محبت ہے

وہ ہم اسٹیفورڈ دیہات کے باشندے ہیں۔ وہ ۱۹۱۴ء میں امریکا کی گیہوں پیدا کرنیوالی ریاست کینسس میں پیدا ہوئے تھے، اور اپنے اسکول اور کالج کے سالوں ہی میں وہ چقندر کے کھیتوں اور امریکی شکستہ جنگلات میں مزدوری کرنے لگے تھے۔ اپنی زندگی کے اس دور کو یاد کرتے ہی وہ کہتے ہیں۔ "میری پرورش لبرل نام کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوئی۔ اس قصبے میں ادیب بننے کا خیال کبھی کسی کے دماغ میں نہیں آتا تھا۔ لوگ تیل کا کام کرتے تھے یا مکئی کی کاشت کرتے تھے، اور اپنی پرسکون زندگی اس چھوٹے سے قصبے میں گذار دیتے تھے۔ وہ قصبا اتنا چھوٹا تھا کہ آپ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سانس پھولے بغیر دوڑ سکتے تھے۔ اپنی ماں سے مجھے یہ عقیدا ملا کہ اپنے حقیقی خیالات کا اظہار کرنا بالکل درست ہے اور دوسرے لوگ اس کا برا نہیں مناتے، تحریر میں یہ بات خاص طور پر صحیح ہے۔

۱۹۵۵ء کے بعد سے جب کہ انہوں نے آئیوا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی وہ سکون اور استقلال کے ساتھ لکھ رہے ہیں، اور کالجوں میں پڑھ رہے ہیں، جو فلک بوس عمارتوں والے ان شہروں سے بہت دور ہیں، جو عوامی تصور میں امریکا کی نمایندگی کرتے ہیں۔

اسٹیفورڈ اس شاندار پرانی روایت سے تعلق رکھتے ہیں جو فراسٹ سے ہوتی ہوئی ایمرسن اور تھوریو تک چلی گئی ہے۔ یہ سب وہ امریکی تھے جنہوں نے اپنے آپ کو دریافت کرنے کے لیے بڑے شہروں کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ان کا شاعری

عصر حاضر کی بیشتر امریکی شاعری سے مختلف ہے۔ یہ شاعری تشدد جارحیت یا نسلی عصبیت کی مخالفت وغیرہ کی مروج صف آرائیوں سے علاقہ نہیں رکھتی۔ ان کی نزدیک شاعری کوئی پراسرار چیز نہیں ہے۔

اگرچہ اکثر امریکی نقاد انہیں رینڈل جاریل، تھیوڈور روتھیک، ملر ولیمز، اور جیمز رائٹ جیسے سنجیدا شاعروں کی صف میں رکھتے ہیں، تاہم ولیم اسٹیفورڈ کی زیادا مماثلت ایک زیادا پرانے شاعر رابرٹ فراسٹ سے ہے۔

زندا امریکی شاعروں میں سے وہ سب سے زیادا مداح رابرٹ لاویل کے ہیں۔ تھامس ہارڈی کے نظموں میں بھی وہ بڑی قربت محسوس کرتے ہیں۔ اسٹیفورڈ نے اپنی برامدی کی بنیاد مستقبل میں اپنے کام اور ذاتی زندگی پر رکھی ہے اور شاعر کی ذات کے بارے میں ہمارے لیے بس اتنا ہی علم کافی ہے۔

سنہ ۴۲ کا اگست

نضا میں اڑتے جو دیکھا ترنگے جھنڈے کو
ہوا یہ شور کہ یقیناً اگست آئی ہے
پیام عیش ہے اس میں نوید آزادی
خوشی کی خاص چمک سب کے رخ پر چھائی ہے
لہو بہا تھا جو چھبیس سال پہلے دوست
فضائے امن کی جس نے گود بھائی ہے
دکھا کے فرقہ پرستوں نے اپنی تنگ دلی
وطن میں تیز تعصب کی آندھیاں لائی ہے
ہزار حیف کہ اس کا اثر ہوا پختہ
وطن پہ فرقہ پرستی کا راج ہو کے رہا
دھرم کے نام پہ اہل وطن کا خون بہا
جہاں میں ننگ ہمارا سماج ہو کے رہا
خوشا وہ لوگ جو محو نشاط ہیں اے دوست
مگر ہمارے لیے انتشار آج بھی ہے
سسکتی روح تپاں ذہن دل اداس اداس
حیات پہلے کی مانند بار آج بھی ہے
نظر کے سامنے رقصاں ہیں وہ تمام سماں
کہ جس نے کر دیا انسانیت کا سر ہی نگوں
درندے محو تماشا ہیں کیا قیامت ہے
خرد کی بزم ہے آماج گاہ جوش جنوں

سردار جعفری

شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۲ ف ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۳ء

سلامت علی

پیرس کی سیر

دنیا کا عجیب و غریب شہر

جہاں کی ہر چیز خوبصورت اور دنیا سے نرالی ہے

روم سے میں T.W.A کے جہاز پر پیرس کے لیے سوار ہو کر اب میں پیرس جا رہا تھا، لیکن میں ایسا محسوس کر رہا تھا، جیسے میری روح اب بھی روم میں بھٹک رہی تھی۔ مجھے اس شہر کی یاد بری طرح بے چین کر رہی تھی۔ اس کی سادگی۔ اس کی عزت اور اس کی شان و شوکت مجھے رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ میں نے یہ بھی فیصلا کر لیا تھا کہ میں واپسی پر روم میں مزید ایک ہفتے قیام کروں گا، لیکن انسان کچھ سوچتا ہے، اور ہو کچھ جاتا ہے۔ میں کوشش کے باوجود واپسی کے وقت روم میں نہیں رک سکا۔

بہر حال اب میں پیرس جا رہا تھا۔ میں فرانس کے قلب کی طرف جا رہا تھا۔ اس فرانس کی طرف جس کی آبادی ساڑھے چھ کروڑ اور رقبا صرف دو لاکھ تیرا ہزار مربع میل ہے۔ میں پیرس کی طرف بڑھ رہا تھا، جس کی آبادی نوے لاکھ ہے، اور جو آج کی دنیا کا سب سے بڑا عشرت کدا سمجھا جاتا ہے، اور جو یقیناً فیشن کا سب سے بڑا عشرت کدا سمجھا جاتا ہے، اور جو یقیناً عیش کا سب سے بڑا اڈا ہے۔

میں نے صرف پیرس دیکھا پورا فرانس نہیں دیکھا، ورنا یہ ضرور معلوم ہو جاتا کہ فرانس دنیا کی پانچویں صنعتی طاقت اور دنیا کی تیسری خلائی طاقت کیوں ہے؟ یہ ضرور جان جاتا کہ دنیا میں سب سے زیادہ موٹریں بنانے میں فرانس کا چوتھا نمبر کیوں ہے، اور سب سے زیادہ ہوائی جہاز پیدا کرنے کے اعتبار سے ساری دنیا میں اس کا چھٹا نمبر کیوں ہے؟ میں نے صرف پیرس دیکھا، اور فرانس نہیں دیکھا۔ اس کا مجھے افسوس رہے گا۔ میں اس کہاوت کو بلکل غلط کہتا ہوں کہ جس نے پیرس دیکھ لیا، اس نے پورا فرانس دیکھ لیا، البتا میں یہ ضرور مانتا ہوں کہ پیرس صرف فرانس کی ہی نہیں، بلکے میرے خیال میں پورے یورپ کی دلہن کی طرح ہے۔

بے حد خوبصورت۔ بے حد سجیلی۔ بے حد نرم و نازک اور بے حد پرکشش، لیکن شہر پیرس کی مختصر داستان سنانے سے قبل میں سب سے پہلے آپ کو کچھ فرانس کے بارے میں بتا دوں۔

فرانس، یورپ کے قدیم ترین ملکوں میں سے ایک ہے۔ دو ہزار سال قبل فرانس کی قدیم قوم "گال" کو رومنوں نے شکست دے دی تھی۔ اس کے بعد وہاں رومی تہذیب پھیلی، اور پھر عیسائی تہذیب۔ اسی زمانے میں وہاں جون آف آرک کو زندا جلایا گیا۔ سترہویں صدی میں فرانس شہنشاہ لوئیس کی قیادت میں یورپ کا سب سے طاقتور ملک بن گیا۔ ۱۷۹۹ء میں وہاں تاریخ کا سب سے پہلا انقلاب آیا۔ شہنشاہیت ختم کر دی گئی، لیکن جلد ہی وہاں نپولین اعظم کا دور دورا ہو گیا، اور فرانس نے پورے یورپ کو دہلا کر رکھ دیا۔ ۱۸۶۵ء میں وہاں جمہوریت قایم ہوئی، جو آج تک قایم ہے۔ ۱۹۶۰ء تک فرانس ایشیا اور افریقا کے کئی ملک کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھا

لیکن اس نے بتدریج ان تمام ممالک کو آزاد کر دیا۔ آج فرانس صرف فرانس میں ہے۔ اب نہ وہ الجیریا میں ہے نہ ویت نام میں، لیکن اس کے باوجود فرانس آج بھی دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران فرانس بالکل ختم ہو گیا تھا۔ پیرس پر ہٹلر کا قبضہ تھا، اور پورا فرانس نازیوں کے چنگل میں آ چکا تھا، لیکن فرانس نے آزادی کی لڑائی جنرل ڈیگال کی قیادت میں لڑی، اور بہرحال ۱۹۴۵ء میں ایک دن ایسا بھی آیا جب ڈیگال اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیرس میں داخل ہوا۔

۱۹۴۵ء میں فرانس بالکل تباہ ہو چکا تھا، لیکن اس کے باوجود آج وہاں طلبا کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ ہے۔ ذرا تصور کیجیے پانچ کروڑ کی آبادی میں طلبا کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ۔ ان میں سات لاکھ یونیورسٹی طالب علم بھی شامل ہیں۔ فرانس میں آج دو کروڑ دس لاکھ انسان کام کرتے ہیں۔ ان میں عورتوں کی تعداد ۱۵ فیصد کی رہ گئی ہے۔

فرانس میں ۳۱ ہزار لمبی ریلوے لائین ہے، اور پانچ لاکھ میل لمبائی کی سڑکیں۔ اس چھوٹے سے ملک میں جس کی آبادی میرے ملک کے صوبے یو۔ پی۔ بنگال۔ مہاراشٹر اور بہار سے کم ہے۔ ۳۷ ایسے شہر ہیں، جن کی آبادی ایک لاکھ سے زاید ہے۔

فرانس کا صرف فیشن ہی مشہور نہیں ہے۔ اس کی صرف آوارگی اور عیش پسندی ہی مشہور نہیں ہے، بلکہ اس ملک کا کپڑا، لوہے کا سامان، موٹریں اور شراب بھی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ غالباً دنیا کا واحد ملک ہے، جہاں پینے کا پانی ہوٹل میں مہنگا بکتا ہے، اور شراب سستی بکتی ہے، کیونکہ وہاں کے عوام صرف پہاڑ کی چشموں کا پانی پیتے ہیں۔

پیرس میں بعض علاقے ایسے ہیں، جہاں نہ کبھی سورج نکلتا ہے، اور نہ غروب ہوتا ہے، اور بعض علاقے ایسے ہیں کہ وہاں رات کبھی نہیں آتی۔

واقعی یہ شہر دنیا کا عجیب ترین شہر ہے۔ یہاں کا فتح دروازہ۔ یہاں کا ایفل ٹاور، یہاں کے دریائے رین کا کنارا۔ یہاں کے کلب۔ یہاں کے شہنشاہوں کے

بہت لمبی ہے، جو کبھی پھر کہوں گا۔ اب میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں پیرس میں تین دن رہا۔ میں نے پیرس کا دن بھی دیکھا، اور وہاں کی رات بھی۔ میں وہاں کے مفلسوں کے ساتھ بھی گھوما، اور وہاں کے امیروں سے بھی ملا۔ میں نے وہاں بیروزگار بھی دیکھے، اور ارب پتی بھی۔ میں نے وہ نوجوان بھی دیکھے، جو ہر وقت بھوکے رہتے ہیں، اور وہ بوڑھے بھی دیکھے، جن کو یہ پتا نہیں کہ ان کے پاس منقولہ اور غیر منقولہ دولت کتنی ہے۔

میں ایک ہندستانی ہوں، میرا تعلق ہندستان کی قدیم معاشرت سے ہے۔ میں اخلاق کی جن قدروں کو گلے سے لگائے ہوئے ہوں، وہ آج کے زمانے میں فرسودا کہی جا رہی ہیں، پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں پیرس دیکھ کر یہ نہ محسوس کرتا کہ میں ایک بالکل نئی دنیا میں آ چکا ہوں۔ اور اس دنیا اور میری دنیا کے درمیان ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں میل کا فاصلہ ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں مسلسل تین دن تک پیرس کو حیران حیران نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

میں نے وہاں رات کے اندھیرے اجالے میں بعض ایسے مناظر بھی دیکھے کہ میری نگاہیں شرم سے جھک گئیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے وہاں کے گرجوں کو بھی عبادت گذاروں سے بھرپور پایا۔ میں نے وہاں مزدور کو پسینہ پونچھتے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے وہاں ایسی مائیں بھی دیکھیں، جو اپنی گود میں بچے لے کر کے ساتھ سودا سلف خرید رہی تھیں، اور ایسی عورتیں بھی دیکھیں، جو آنے جانے والوں کو اپنا لائسنس دکھا کر یہ تبلا رہی تھیں کہ ان کے پاس جسم فروخت کرنے کے لیے باقاعدہ سرکاری اجازت نامہ موجود ہے۔

پیرس میں زندگی بڑی بھرپور نظر آتی ہے۔ وہاں زندگی کا ہر روپ دکھائی دیتا ہے۔ وہاں ادیب ہیں۔ شاعر ہیں۔ فلسفی ہیں۔ ناول نگار ہیں، اور لطف یہ ہے کہ ان میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ نوجوان جب گفتگو کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں کوئی ساٹھ سال کا بوڑھا بیٹھا ہوا ہے، لیکن جب یہی نوجوان شراب پی کر بدمست ہو جاتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ آنکھیں بند کر لی جائیں۔ میں وہاں کے طلبا سے بھی ملا، اور مزدوروں سے بھی، لیکن ان سب کو بڑا ذہین پایا۔ میں نے یہ بھی محسوس

ان کی قوم نے ایشیا اور افریقا پر بڑا ظلم ڈھایا تھا۔

میں پیرس میں بے شمار افراد سے ملا۔ میں نے ان سے مختصر گفتگو بھی کی اور طویل گفتگو بھی۔ میں نے پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اس پوری قوم کو فقط آزادی سے بڑا پیار ہے۔

یہ ان کا آزادی سے پیار ہی تو تھا، جو اس قوم نے امریکا کو آزادی کا دیوی کا مجسمہ بھجوایا تھا۔ یہ مجسمہ آج بھی نیویارک کے سمندر میں آزادی کی مشعل اٹھائے نظر آتا ہے، حالانکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس وقت فرانس امریکا کو آزادی کا یہ تحفہ دینے کے لیے محو انتظار تھا۔ ٹھیک انہیں دنوں میں وہ ایشیا اور افریقا کے کروڑوں عوام کو غلام بھی بنا رہا تھا، اور ان کی زندگی کی مسرتوں سے محروم کر رہا تھا۔

اور پیرس اسی فرانس کا دل ہے، جو ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔ پیرس کے عوام کھانے کے بھی شوقین ہیں، اور پہننے کے بھی شوقین ہیں، اور پہننے کے بھی شوقین ہیں۔ پیرس کے ہر دوسرے مکان میں ریسٹورنٹ ضرور ہے، اور ہر تیسرے مکان میں کپڑا دھونے کی مشین ہے۔ شہر کی ۷۰ فیصد آبادی کے پاس ٹیلی ویژن ہے، اور پچاس فیصدی کے پاس ذاتی موٹریں ہیں۔ پیرس میں ہر شخص کو آسان قسطوں پر سامان مل جاتا ہے، اس لیے ہر گھر سامان سے سجا سجایا نظر آتا ہے۔

پیرس میں ٹپ یعنی بخشش دینے کا رواج اتنا زیادہ ہے کہ تمام دن ہر شخص ٹپ دیتا یا لیتا رہتا ہے، مثلاً میں جتنی بار بھی اپنے ہوٹل کی لفٹ کے ذریعے آیا گیا۔ مجھے لفٹ چلانے کو ٹپ دینا لازمی ہے۔ ٹیکسی والا میٹر کے علاوہ ٹپ لینا اپنا حق سمجھتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ہال کے اندر عورت سیٹ پر بٹھاتی ہے، وہ بھی اندھیرے میں ٹپ کے لیے ہاتھ پھیلا دیتی ہے۔ وہاں کے نائٹ کلب واقعی دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان کلبوں میں جوا ہوتا ہے، شراب پی جاتی ہے، عریاں رقص دیکھے جاتے ہیں اور عیاشی کی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کلب مہنگے ہیں، اور ان کلبوں میں جانا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے۔ پیرس میں عوام کتابیں اور پڑھنے کے بھی بہت شوقین ہیں۔ بعض کتابوں کی دکانوں پر اتنی بھیڑ نظر آتی ہے، جیسی ہندستان کے سنیما گھروں [illegible]

کتاب پڑھنے یا کرائے پر لے کر کتاب پڑھنے کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ پیرس میں تمام سرکاری عمارتیں نہ صرف بہت خوبصورت، بلکہ بہت عظیم بھی ہیں۔ نیشنل میوزیم بھی کافی دلچسپ ہے۔ پیرس میں ہر قوم اور ملک کے آدمی رہتے ہیں، اور وہاں تقریباً ہر ملک کا کھانا مل جاتا ہے۔ ہوٹلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پیرس میں جہاں کے کھانے اور اور پوری ساری دنیا میں مشہور ہیں، وہاں لوگ بھی بڑے خلیق۔ بڑے ملنسار اور بڑے ہی ہنس مکھ ہیں۔ تین دن تک پیرس میں میں گھومتا رہا، لیکن تین دن تو کیا۔ تین برس تک بھی کوئی غیر ملکی نہ پیرس کو دیکھ سکتا ہے، اور نہ پیرس کے مزاج کو سمجھ سکتا ہے، چنانچہ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے پیرس کی نہ مکمل تصویر ہی دیکھی اور نہ ادھوری ہی تصویر دیکھی بلکہ میں نے پیرس کی ایک معمولی سی ایک جھلک سی دیکھی ہے۔

تین دن کے بعد جب میں اپنے نئے سفر کے لیے اپنے ہوٹل سے باہر آیا تو میں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے پیرس پر الوداعی نظریں ڈالیں، اور پھر اچانک مجھے پیرس بڑا پیارا نظر آنے لگا۔ مجھے پیرس پر پیار آ گیا، اور میں سچ کہتا ہوں کہ جب پیرس سے میرا جہاز لندن کے لیے روانا ہوا تو میں ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا۔

آزادی کا جشن مبارک

آزاد بارائی

بہت سی نعمتیں اللہ نے ہم کو عطا کی ہیں
مگر کوئی بھی آزادی کی نعمت سے نہیں بڑھکر
اگر حاصل ہے آزادی کا ہم کو ایک بھی لمحہ
وہ لمحہ ہے غلامی کے ہزاروں سال سے بہتر
بڑے دن سال میں آتے ہی رہتے ہیں کئی لیکن
کوئی دن یوم آزادی کا ہمسر ہو نہیں سکتا
کسی دن کو کوئی ذرہ جگمگا جائے یہ ممکن ہے
یقیناً کبھی مہر منور ہو نہیں سکتا
وطن کی سرزمیں اپنی، وطن کا آسماں اپنا
وطن والو یہ انعام خداوندی مبارک ہو
وطن والو! بڑے فخر و مسرت کی یہ ساعت ہے
تمہیں پچیس سالہ جشن آزادی مبارک ہو

شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۲ ف ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۲۰۰۳ء

ٹی - ایس - بلراج

ملاوٹ کی کرشماسازیاں

اگر کوئی آپ کو زہر کا پیالا پینے کے لیے دے تو کیا آپ اسے ہنسی خوشی پی لیں گے؟ اگر کوئی آپ کے سامنے ہی ہر روز آپ کے کھانے میں زہریلی گندی چیزیں ملا دیں تو کیا آپ اس کھانے کو کھا لیں گے؟ یقیناً آپ اس طرح کے سوال کرنے والے کو پاگل کہیں گے۔ بھلا کوئی زہر بھی کھا سکتا ہے؟ پھر زہر دینے والا سامنے ہو اور ہمارے ہاتھوں سے بچ کر چلا جائے۔ لیکن صاف کیجیے، آپ سب ہر روز زہر کھا بھی رہے ہیں اور زہر کھلانے والوں کو بھی کچھ نہیں کہتے۔ آپ جب صبح اٹھتے ہیں تو سب سے پہلے چائے پینے کو جی چاہتا ہے، چائے تو ملتی ہے، لیکن ہم سب ہر روز یہی شکایت کرتے ہیں کہ چائے میں اب پہلے جیسا مزا نہیں رہا۔ ادھر بیوی ذکر کرتی ہے کہ تم اول نمبر کے نکمے ہو جو چائے بنانا تک نہیں جانتے ہو اور گھر کے دوسرے ممبر بھی پریشان ہیں کہ نہ جانے چائے کیوں اچھی نہیں بنتی، لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ چائے اچھی کیسے بنے، اگر ڈبے میں چائے کی پتی کی جگہ کسی جنگلی پودے کے جھاڑ پھوس بھرے ہوئے ہوں یا استعمال شدہ چائے کو دوبارہ رنگ کر بھر دیا گیا ہو، تو ایسی صورت میں چائے کا رنگ اور مزا آئے تو کہاں سے آئے؟ جڑی بوٹیاں اور رنگ تو پھر بھی غنیمت ہیں۔ سستے داموں کھلی بکنے والی چائے میں تو رنگا ہوا برادا اور لال ریت بھی ملا دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ چائے میں کئی اور چیزیں بھی ملائی جاتی ہیں، مثلاً چنے کے کالے چھلکے۔ قہوہ کے چھلکے اور کاجو کے چھلکے بھی اس کام میں لائے جاتے ہیں، اور ان چھلکوں کو وہ رنگ دیا جاتا ہے، جو کہ زہر ملا ہوتا ہے۔ ایسی چائے سستی کو تو خیر کیا دور کرے گی ہاں پیٹ کی نئی نئی بیماریاں ضرور پیدا کر دیتی ہے، جو لوگ چائے نہیں

بازوں کے چنگل سے نہیں بچ پاتے۔ دودھ میں ملاوٹ کرنا تو بہت پرانی بات ہے، مگر اب تو دودھ میں ملاوٹ کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں، اور اب دودھ میں سے کریم نکالنے کی جگہ جگہ ایسی مشینیں لگی ہوئی ہیں، جن سے دودھ میں سے ساری چکنائی (کریم) نکال لی جاتی ہے، یہ کریم نکالا دودھ خالص دودھ سے بھی زیادہ گاڑھا دکھائی دیتا ہے۔ اسے اور گاڑھا کرنے کے لیے اس میں نشاستہ ملا دیا جاتا ہے۔ ملائی دودھ میں سنگھاڑے کا آٹا بھی ملا دیتے ہیں، تاکہ اس پر موٹی موٹی ملائی آئے۔ پہلے کھوے میں میدا اور سنگھاڑے کے آٹے ہی کی ملاوٹ ہوتی تھی، مگر اب اس میں بلاٹنگ پیپر بھی ملائے جانے لگے ہیں۔ دہی کی ملائی موٹی بنانے کے لیے دودھ کو جاتے وقت اس پر بلاٹنگ پیپر کی تہہ جمادی جاتی ہے، اس طرح آئیس کریم میں ملائی کا ڈالیقا لانے کے لیے بلاٹنگ پیپر کے ٹکڑے ملا دیے جاتے ہیں اور مکھن بنانے کے لیے "تلوں کا تیل، چاک اور خاص رنگ استعمال کیے جاتے ہیں۔ پندرہ روپے کا گھی اصلی گھی گھر میں آتا ہے، اور گھی لانے والا اپنے دل میں کہتا ہے کہ گھی اسی قیمتی تو اصل ہو گا ہی، اور اس میں تھوڑا سا بناسپتی بھی مل گیا تو کیا ہوا، لیکن ملاوٹ بناسپتی تک ہی محدود رہے تو بھی غنیمت ہے، مگر اس "اصلی" گھی میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے۔ مونگ پھلی اور تاریل کے تیل کی۔ پھر اس میں ابلے ہوئے آلو بھی ملا دیے جاتے ہیں۔ آلوؤں کو اس باریکی سے پیسا جاتا ہے کہ وہ بلکل گھی ہی کی طرح پتلے ہو جاتے ہیں، چونکہ عام لوگوں کا خیال ہے کہ خالص گھی کا رنگ بلکل سفید نہیں ہوتا، اس لیے اس میں شکر قند بھی پیس کر ملاتے ہیں، لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک اور نقصان پہنچانے والی چیز جو گھی

پکا کر گھی میں ڈالتے ہیں۔ دیکھنے میں تو اس کا پتا نہیں چلتا، لیکن ہمارا معدا اسے ہضم نہیں کر سکتا۔ اس سے مل کی بیماری اور پھوڑے پھنسی، خارش جیسے آزار پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح صرف گھی ہی کے رستے کتنا زہر ہر روز ہمارے جسم کے اندر پہنچ جاتا ہے، کیونکہ ہندستانی کھانے گھی کے بغیر عام طور پر بنتے ہی نہیں۔ اسی طرح مسالے بھی دیسی کھانوں کی جان ہیں، لیکن اب پسی ہوئی مرچیں گھی میں ڈالتے ہی کالی ہونے لگتی ہیں۔ سبزی کا رنگ لال ہونے کی بجائے سیاہ ہو جاتا ہے اور ذائقہ آتا ہے برادے اور مٹی کا سا۔ یہ پسی ہوئی مرچیں لال مٹی، لال رنگ میں رنگی ہوئی ریت اور رتن جوت پیس کر ہی تو تیار ہوتی ہیں۔ ان نقلی چیزوں کو رنگنے کے لیے جو رنگ استعمال کیا جاتا ہے، وہ بھی صحت کے لیے بہت بڑا ہے۔ اسے کھا کر انتڑیوں کی بیماریاں آ چمٹتی ہیں۔ ہلدی کے متعلق بھی عام شکایت ہے کہ اس کی رنگت بالکل پیلی ہوتی ہے جیسے صابن ہو، لیکن یہ شکایت نہیں حقیقت ہے۔ اصل میں یہ ہلدی ایک چکنے پتھر کو پیس کر تیار کی جاتی ہے، اور ان چیزوں کو رنگنے کے لیے جس رنگ کا استعمال ہوتا ہے وہ رنگ کھانے کا نہیں ہوتا، زہریلا ہوتا ہے ——

کالی مرچ پیٹ کے بہت سے روگوں کا علاج ہے۔ دہی میں ڈال کر کھائیں تو پیچش دور بھاگے۔ چاولوں میں چند دانے چھوڑ دیں تو مہک اٹھیں، لیکن آج کل ہم جو کالی مرچ کھاتے ہیں اس میں پپیتے کے بیج، چھوٹے گول بیروں کی گٹھلیاں اور اڑد کی دال کے چھلکے ملے ہوتے ہیں۔ یہ تو ثابت کالی مرچ کا حال ہے، پسی ہوئی سیاہ مرچ کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

بازار سے چاٹ کے مسالے کا ایک پیکٹ منگوایا، چاٹ تیار ہوئی ہے، سب لوگ چٹخارے لیکر کھاتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے، اس میں چاٹ میں پسی ہوئی مٹی استعمال کی جاتی ہے۔ چاٹ کھانے کے بعد دل گھبرانے لگتا ہے، پیٹ خراب ہو جاتا ہے، پتا چلتا ہے اس چاٹ کے مسالے میں آدھے سے زیادہ گھوڑے کی لید ہوتی ہے، اور اجوہن میں مٹی ملائی جاتی ہے۔ اجوہن پانی میں ڈالئے مٹی نیچے بیٹھ جائے گی۔ گھوڑے کی لید اوپر تیرتی رہے گی، خالص مسالا گھل جائے گا۔ بزرگ پریشان رہتے ہیں کہ چھالیا بے مزا تو ہے ہی، لیکن سروتے کو بھی اس نے بیگار کر رکھ دیا ہے۔ آخر سخت چھالیا انہوں نے کبھی نہیں کھائی تھی۔ کھٹے کو سونہہ میں ڈالتے ہی جیسے سونہہ میں کرکل تار گھل جاتا ہے۔ ایکائی سی آنے لگتی ہے، لیکن بے چارے بزرگ کیا کریں، اگر چھالیا کی جگہ انہیں لکڑی چبانی پڑے، اور کھٹے میں نقلی کرکل تار ملا ہو تو!

ادھر دادی اماں پریشان ہیں کہ ان کے بتائے ہوئے نسخے آج تک غلط ثابت نہیں ہوئے۔ جب کسی بچا کا گلا خراب ہوتا ہے اور ساتھ ہی بخار چڑھا تو وہ دارچینی ابالتیں، سونہہ میں بھی دارچینی کا ٹکڑا رگھوا دیتیں، بخار دم دبا کر بھاگ جاتا، اب ان کی بتائی ہوئی دارچینی کوئی اثر ہی نہیں کرتی، دادی اماں بھول گئیں کہ قصور ان کی عقل کا نہیں، بلکہ دارچینی کا ہے، جب دارچینی رنگی ہوئی پیڑ کی چھال ہو تو وہ اپنا ہی اثر کرے گی۔ دارچینی کا نہیں۔ نقلی دارچینی ہمیشہ ہلکی ہوگی۔ پانی میں ڈالئے تو سرخ رنگ چھوڑے گی۔ آپ کے ہاں ایک دال پکائی جاتی ہے۔ اس میں بہت سی چیزوں کا مزا آتا ہے، پھر رنگ ایسا چھوڑتی ہیں کہ ساری دیگچی کو بد رنگ بنا ڈالتی ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان دالوں میں ان کی شکل سے ملتے ہوئے بیج ملائے جاتے ہیں۔ دوسرے ان کو پالش کیا جاتا ہے۔ پالش میں جو رنگ استعمال ہوتا ہے وہ پیٹ کی کئی بیماریوں کو پیدا کرتا ہے۔

بازار سے پسا ہوا آٹا لائے، روٹی کا نوالا لیتے ہی سونہہ مٹی سے بھر جاتا ہے، آٹے میں سے جتنی طاقت کی چیزیں ہیں، وہ تو پہلے ہی نکال لی جاتی ہیں۔ میدہ اور نشاستہ نکال کر اس میں پسی ہوئی بھوسی ملا دی جاتی ہے، چونکہ جو کا آٹا سستا ہوتا ہے، اس لیے گیہوں کے آٹے میں جو کا آٹا ملا دیا جاتا ہے۔ میدے میں کانچ کے مصالے ہوئے چاک کا ہوتا ہے جو پیٹ میں پہنچ کر زخم پیدا کر دیتا ہے۔

کون سا بچا ایسا ہوگا جو رنگ برنگی گولیاں اور ٹافیاں دیکھ کر نہ مچل اٹھے، لیکن انہیں خریدتے وقت والدین نہیں جانتے کہ وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو میٹھا زہر

دے رہے ہیں - ان گولیوں اور ٹافیوں میں جو رنگ استعمال ہوتا ہے، وہ بے حد خطرناک ہے، اور اندر جاتے ہی گلے اور پیٹ کو خراب کرتا ہے - جن ٹافیوں کو دودھ سے بنی ہوئی کہہ کر بیچا جاتا ہے، ان میں سے آدھے سے زیادہ آٹا اور میدا ہوتا ہے - ان میں بھربھراہٹ پیدا کرنے کے لیے صابن میں استعمال ہونے والے پتھر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے دشمن ملاوٹ کرنے والے منافع خور ننھے بچوں کی زندگی سے کھیلنے سے بھی نہیں چوکتے -

آج کل ولایتی شراب بہت مہنگی بکتی ہے جو بوتل پہلے پانچ سات کو ملتی تھی وہ آج ایک سو سے بھی مشکل سے ملتی ہے، چنانچہ بدیشی وسکی کی بوتل سے سرینج کے ذریعے ولایتی شراب نکال لی جاتی ہے، اور اس کے اندر دیسی شراب سرینج کے ذریعے بھر دی جاتی ہے -

کہتے ہیں کہ مدراس سے کچھ دور ایک کاریگر پکڑا گیا ہے، جہاں پتھر کے ٹکڑوں کو چانول کی شکل دی جاتی ہے، انہیں اصلی چانولوں میں ملا کر بیچا جاتا ہے -

ایک اور بات جو پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی، وہ یہ ہے کہ بڑی بڑی لیبارٹریاں کھول رکھی ہیں، جن میں بڑے بڑے ماہر کام کرتے ہیں، اور ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ ملاوٹی چیزوں کو اصلی چیزوں جیسا رنگ و روپ، ہر چیز کی عام طور پر خشبو بھی رہتی ہے، یہ ماہرین خشبو کی ملاوٹی چیز میں پیدا کر دیتے ہیں -

کہا جاتا ہے کہ اس ملاوٹ سے کالی مرچ اور دار چینی وغیرہ میں سو روپے خرچ کر کے ایک ہزار روپیا مل جاتا ہے - سرسوں، تلی، تھوہر کے تیل میں ملاوٹ سے پچاسی فیصد ہی منافع ہوتا ہے -

انسانی زندگی کے ساتھ جس قسم شرمناک مذاق اور کھیل ہندستان میں ہو رہا ہے، وہ بے مثال ہے - آج تک دنیا کے کسی بھی ملک میں نہیں، منافع خوروں کو یہ مجال نہیں ہوتی کہ اپنے نفع کی خاطر انسانوں کی زندگی سے کھیلیں، لیکن اپنے وطن میں کھلے عام بازاروں میں ہر کھانے کی چیز میں زہر بھرا پڑا ہے، اور کوئی پوچھنے والا ہی نہیں - لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان چیزوں کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کر کے خریدیں - عورتوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ تمام مسالے اور ضرورت کے سامان کو گھر میں اپنے ہاتھوں سے پیسیں - ایسا کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے، لیکن ستم یہ ہے کہ ان لوگوں کو کچھ نہیں کہا جاتا جو ہر روز ہر چیز میں زہر گھول کر بیچ رہے ہیں - ہمیں ایسے اپاہج قانون کو بدلنا ہوگا جو اس طرح ان کی جان لینے کے جرم میں زیادہ سے زیادہ صرف دو ہینے کی سزا یا دو ہزار روپے جرمانہ (ویسے آج تک کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کے جرم میں کسی کو پانچ سو روپے جرمانے سے زیادہ سزا نہیں ہوئی ہے)

لیکن قانون کے شکنجے سے بھی زیادہ ان ملاوٹ کرنے والوں کو سماجی سزا کی ضرورت ہے - ملاوٹ اسی لیے ہوتی ہے کہ تجارت میں اخلاقی معیار کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا - کاروبار اخلاق کو اونچا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جو قانون ان قاتلوں کو کڑی سے کڑی سزا دے وہاں ان کا سماجی طور سے بھی بائیکاٹ کیا جائے - ایسے منافع خوروں سے سماجی نفرت اور بائیکاٹ ان کے حوصلوں کو ختم کر دے گا، اور وہ بھی رستے پر آجائیں گے - کام کسی ایک کا بس نہیں، آپ سب کو مل کرنا ہے، مگر سرکار کو اس طرف زیادہ دھیان کرنا ہوگا ورنہ یہ موت کے بیوپاری اپنا کھیل کھیلتے رہیں گے -

ضیا زخمی

غزل

دو چار اس زباں کے دو چار اس زباں کے
جملے ہوئے مکمل یوں میری داستاں کے

مجنوں کی خاک اب تک سرگرم جستجو ہے
پھرتی ہے پیچھے پیچھے ایک ایک کارواں کے

جھونکوں سے آندھیوں کے اب وہ بجھ بے پتا نہیں
بجلی سے جو بچے تھے دو تنکے آشیاں کے

اس سے تو ہو گیا ہوں کچھ اور بھی پریشاں
الفاظ منتشر ہیں قاصد ترے بیاں کے

تو اعتبار ان کا کرنا کبھی نہ ترکھی
ہوتے ہیں ایک فتنہ یہ لوگ درمیاں کے

شہریور۔ مہر۔ آبان ۱۳۵۲ ف ہندستانی ادب جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۷۳ء

آسی رام نگری

شیر شاہ سوری کا انصاف

شہزادے کو حاضر کرو!

شیر شاہ نے اپنی فطری سخت آواز میں حکم دیا۔

دربار میں سناٹا چھا گیا۔ بڑے بڑے امیر اور ممتاز سردار تعجب سے حیرت زدہ رہ گئے۔ کسی کو امید نہ تھی کہ شاہ ایسا حکم دیں گے۔ وزیر کے چہرے پر بھی پریشانی سی دکھائی دی صرف ایک شخص بیباک و بے پروا انداز سے کھڑا رہا۔ وہ تھا ایجے سنگ۔

ایجے سنگ ایک غریب کسان تھا۔ آگرے سے جو سڑک متھرا کی طرف جاتی ہے۔ اس کے قریب اس کی کچ بیگھے زمین تھی، جو اسے اس کے باپ دادا سے ورثے میں ملی تھی، اور اس وقت کے بائے تخت آگرا کی حد جس جگہ ختم ہوتی ہے، وہیں اس کا چھوٹا ٹوٹا پھوٹا سا مکان تھا۔

دن بھر وہ کھیت پر خون پسینا ایک کرتا جاڑے جیٹھ کی دوپہر ہو۔ ساون کی سردی ہو یا بھادوں کی موسلا دھار بارش، شام کو وہ گھر آتا۔ اس کی بیوی مایا اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھی رہتی۔ مایا کو خوش دیکھ کر وہ غربت اور تھکاوٹ کو بھول جاتا اس کی شکل، ایجے سنگ کے سب دکھ درد مٹا دیتی۔ مایا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ اپنے کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھتا۔

اور دنوں کی طرح جب اس دن ایجے سنگ کھیت سے گھر لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے گھر میں خوب منڈلا رہی ہے۔ کسی انجانے اندیشے سے اس کا دل کانپ گیا۔ اس کا پیارا گھر آج اس کا سواگت کیوں نہیں کر رہا ہے۔

سورج سنولا انتی میں ڈوب چکا تھا۔ شام کا دھندلکا ہر پل دبیز ہوتا جا رہا تھا۔ ایجے سنگ کے گھر پر بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ روز کی طرح سرسوں کے تیل کے دیے نے مدعو کر اس کے رستے میں روشنی نہیں پھیلائی کیا مایا گھر میں نہیں ہے؟ وہ کہاں گئی؟ جلدی جلدی قدم بڑھا کر وہ گھر میں گھسا۔

"مایا! مایا!!" اس نے پکارا۔

کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دیا جلایا۔ اس نے تعجب سے دیکھا کہ کمرے کے ایک کونے میں پڑی مایا تڑپ رہی ہے۔ اس کا سونہ مرجھائے ہوئے کنول کی طرح اداس ہے، اس کی آنکھیں گیلی ہیں۔ آنسوؤں سے گال بھیگے ہوئے ہیں۔ وہ زندہ ہے، لیکن معلوم ہوتی ہے مری ہوئی سی۔

"مایا" تو بولتی کیوں نہیں؟ ایجے سنگ نے پوچھا۔

مایا شوہر کے پیروں سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔

"بتا تو سہی، بات کیا ہے۔؟" ایجے سنگ حیران تھا۔

"ناتھ، تمہارے درشنوں کے انتظار میں میں ابھی تک زندہ تھی، مایا نے روندے گلے سے کہا۔" اب تم مجھے اجازت دو، میں ستی ہو جاؤں۔"

ایجے سنگ کو ہنسی آ گئی۔

"دت پگلی، میں زندہ ہوں اور تو ستی ہونا چاہتی ہے؟"

مایا کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

"نہیں ناتھ، میں اب آپ کے قابل نہیں رہی۔ میرا جسم اب پوتر نہیں رہا۔ آپ اجازت دیجئے۔ اب میں ایسے جسم کو اگن دیو کی نذر کر دوں۔ اگر میرا دل پوتر ہے۔ تو سورگ میں پھر مجھے آپ کے چرنوں کی سیوا کرنے کا موقع نصیب ہوگا۔ یہ ناپاک جسم اب آپ کی سیوا نہیں کر سکتا۔ ایجے سنگ کے ہونٹ کانپ اٹھے۔ بازو پھڑکے اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

"ہم غریب ہیں، لیکن ہماری بھی عزت ہے" وہ گرج اٹھا۔ "میں کھیتی کرتا ہوں" لیکن میری رگوں میں راجپوتوں کا خون ہے۔ کوئی سچا راجپوت کسی عورت کی بے عزتی نہیں سہہ سکتا، کسی گندی نظر نے شہزادی کی طرف آنکھ اٹھا کر

دیکھا ہے۔ تو مجھے جلدی بتاؤ، کس کتے نے راجپوتنی کے جسم کو چھونے کی ہمت کی ہے؟"

"مجھے کسی نے نہیں چھوا۔" "کسی نے نہیں چھوا؟"

"نہیں" "تب" مایا نے کچھ جواب نہیں دیا۔

"جلدی بتاؤ کس نے تمہارا اپمان کیا ہے؟ میں اسے جیتا نہ چھوڑوں گا۔"

نات! آپ اس جھگڑے میں نہ پڑیں۔ آپ کا جیون انمول ہے۔ آپ مجھے بھول جائیں۔ ایک عورت کی قیمت ہی کیا ہے۔ میرے مرنے کے بعد آپ دوسری شادی کر کے نئے سے اپنا جیون بتا سکتے ہیں، لیکن میری وجہ سے آپ پر کوئی سنکٹ آیا تو میں پرلوک میں بھی سکھی نہ ہو سکوں گی۔

"کیا تم مجھے بہت پیار کرتی ہو؟" "بہت"

"تمہاری نظروں میں دیوتا ہوں؟"

"دیوتا سے بھی بڑھ کر۔" "اگر تمہارا کتھن سچ ہے، تم مجھے بہت پیار کرتی ہو، اور دیوتا سے بھی بڑھ کر سمجھتی ہو تو تمہیں میرا حکم ماننا ہوگا۔ مجھے جلدی بتاؤ کہ کون سا حادثہ تمہاری بے چینی کا باعث ہے؟"

مایا نے آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں سے شوہر کی طرف دیکھا۔ خوف سے وہ سہم رہی تھی۔

نات، آج شہزادے کا جلوس نکلا تھا۔ اس کے ساتھ بہت ہی بھیڑ تھی۔ شہزادا ایک ہاتی پر ——"

"کیا تم جلوس دیکھنے گئی تھیں؟" ایجے سنگ نے تعجب سے سوال کیا، "نہیں، میں آپ سے بے پروا کیسے جا سکتی تھی؟ میں کہیں نہیں گئی۔" "تو تم نے جلوس کیسے دیکھا؟" "وہ ہمارے گھر کے سامنے سے نکلا تھا۔"

"ہمارے گھر کے سامنے سے؟" "ہاں" تو پھر ایجے سنگ نے کہا۔

"دوپہر ہو گئی تھی، گرمی بہت تھی، رسوئی سے چھٹی پا کر میں نے سوچا کہ نہاروں میں چھت پر گئی۔ مندیر زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اور ٹوٹ پھوٹ بھی گئی ہے۔ شہزادے کا ہاتی بڑا اور اونچا تھا۔ سونے کے ہودج پر بیٹھے شہزادا ——"

مایا کی آواز بھرا گئی۔ وہ چپ ہو گئی۔

"بولو" چپ کیوں ہو گئیں؟ ایجے سنگ نے کہا۔ وہ بے حد مشتعل سا تھا۔

"میں نے کپڑے اتار دیے تھے، میں نہا رہی تھی، اسی وقت میں نے دیکھا کہ سونے کے ہودج پر بیٹھے شہزادے کی آنکھیں مجھ پر گڑی ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے بدنیتی ٹپک رہی تھی۔ میں نے اپنی لاج ڈھانکنے کی ناکام کوشش کی۔ شہزادے نے عجیب آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر نفرت انگیز مسکراہٹ تھی۔ میں شرم سے مر گئی۔ اس نے پان کا ایک بیڑا میرے اوپر تاک کر پھینکا۔ میں اپنے کپڑے لینے دوڑی۔ شہزادے کا ہاتی آگے بڑھ گیا، لیکن میری لاج لوٹ چکی تھی۔

ایجے سنگ چپ ہو گیا۔ راجا باپ کے برابر ہوتا ہے۔ اس نے اپنی ایک بیٹی کا اپمان کیا۔ کیسی شرم کی بات ہے۔ ایجے سنگ کی عقیدت اور جذبۂ احترام کو گہرا دھکا لگا۔

مایا رو رہی تھی۔

"نات، میرے لیے اپنے پرادھوں کرشما کرو، ایک بری نظر نے مجھے آپ کے لائق نہ رکھا۔ مجھے اجازت دو، میں ستی ہو جاؤں۔"

ایکا ایک ایجے سنگ چونکا جیسے سوتے سے جاگا ہو۔

"نہیں، تمہیں ستی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم پوتر ہو۔ کیونکہ تمہارا دل پوتر ہے۔ لیکن کینے کو سزا دینی ہی ہوگی۔ جرم کے جرم کی طرف آنکھیں بند کر لینا بھی ایک جرم ہے۔"

ایجے سنگ اپنی تلوار اٹھانے کو لپکا، مایا نے اسے دوڑ کر روک لیا۔

"کیا کرتے ہو نات؟"

"بس، اب نہ بولو۔"

ایجے سنگ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ "کیا مجھے کوئی حق نہیں ہے؟"

"تمہارے حق ہی کی مجھے حفاظت کرنی ہے، میں اس پاپی کا خون پی جاؤں گا۔ یہ تلوار آج اسے بتائے گی کہ کسی راجپوت عورت کا اپمان کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ جن آنکھوں نے تم پر بری نظر ڈالی ہے۔ ان آنکھوں کو پھوڑ کر تب میں لوٹوں گا۔"

"وہ ہندستان کے بادشاہ کا بیٹا ہے، نات۔"

"بادشاہ کا بیٹا، چاہے خدا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایک راجپوت ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ یہاں عورت کے اپمان کا سوال ہے۔"

"تم بھولتے ہو میرے سوامی۔ وہ معمولی آدمی نہیں، ایک

شہزادا ہے۔"

"میں نہیں بھولتا مایا، تم بھول رہی ہو، یہ کمینا پن کرنے کے بعد وہ آدمیت سے گر گیا ہے۔ وہ شہزادا نہیں، وہ اب ایک کتا ہے۔ اور کتے کی موت مارا جائے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے، لیکن آپ کی جان۔"

تو اس میں گھاٹا کیا ہے؟ اس سے تمہاری خواہش پوری ہوتے میں مدد ملے گی۔ تم سستی ——

"اوہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں ایسی بات سننا نہیں چاہتی۔"

ساری رات پتی پتنی نے بیٹھے بیٹھے بنادی دونوں میں بحث ہوتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ مایا کا دل دکھ سے بیٹھا جا رہا تھا۔ اور ابھے کا دل غصے سے بے چین تھا۔

"آپ میری ایک بات مانیں۔" آخر میں مایا نے کہا۔

کیا؟ "میں نے سنا ہے کہ بادشاہ بہت ہی انصاف پسند ہیں، اور ہمیشہ انصاف ہی کرتے ہیں۔"

ہاں انہوں نے کبھی کوئی بے انصافی نہیں کی ہے۔

"تو آپ بھی ان سے شکایت کریں، وہ ضرور ہمارے معاملے میں انصاف کریں گے۔"

ابھے سنگ کی آنکھیں اپنی تلوار پر جا لگیں اس نے کہا۔ اب مجھے کسی کا اعتبار نہیں ہے۔ وہ اسی کمینے کا باپ ہے۔ اس سے میں انصاف کی کیا امید رکھوں؟ اگر بادشاہ انصاف نہ کریں تو آپ جو مناسب سمجھیں وہ کیجیے گا۔

ابھے سنگ نے مایا کی بات مان لی، اور اس وقت وہ بادشاہ کے دربار میں کھڑا تھا۔

شہزادا ابھی تک نہیں آیا؟، شیر شاہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"جی، انہیں مطلع کر دیا گیا ہے۔ وہ سو رہے تھے۔ ابھی آتے ہیں۔" وزیر نے جواب دیا۔

شیر شاہ نے تیز نظر سے ابھے سنگ کو دیکھا۔

تمہارا کوئی گواہ ہے۔

میرا گواہ صرف شہزادے کا پھینکا ہوا پان ہے، اور آپ کی انصاف پسندی کے نزدیک میرا اعتبار۔

ابھے سنگ نے جواب دیا۔ اس کے سوا مجھے مایا اور کوئی گواہ نہیں ہے۔

گواہ کہاں سے آئیں حضور، وزیر نے کہا۔ یہ تو بلکل۔

شیر شاہ کے ابرو میں بل پڑ گئے۔

اس روز شہزادے کے ہاتھ پر کون مہادت تھا؟

رام دین۔ اسے حاضر کرو۔

ڈرتے کانپتے رام دین دربار میں حاضر ہوا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی، اکیلا ایک دربار میں حاضر ہونے کا حکم پاکر اس کی آدھی جان نکل چکی تھی۔

تم اس آدمی کو جانتے ہو؟ شیر شاہ نے پہلا سوال کیا۔ اس کی انگلی ابھے سنگ کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

رام دین نے ڈرتے ہوئے ابھے سنگ کی طرف دیکھا۔

"نہیں حضور۔"

"اس کا بیان ہے کہ جب جلوس اس کے مکان کے سامنے سے نکلا تو اس کی بیوی چھت پر نہا رہی تھی، اور"

"میں کچھ نہیں جانتا حضور۔" رام دین جلدی سے بولا۔ "ہم لوگ غریب آدمی ہیں، غریب پرور! پرائی بہو بیٹی کو ایسی ہی سمجھتے ہیں، جیسی اپنی۔"

"فضول مت بکو۔" شیر شاہ نے ڈانٹ کر کہا۔

"بدتمیز مہادت" وزیر نے ڈانٹا، "جہاں پناہ فرمائیں اسے دھیان سے سنو، اور جو سوال کریں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

رام دین ڈر کر چپ ہو گیا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ اس کی غلطی ہوئی ہے، اور اس نے کون سی بے جا بات کہی ہے۔

"ہم پوچھتے ہیں۔" بادشاہ نے کہا۔ "کیا تم نے شہزادے کو اس عورت پر پان کا بیڑا پھینکتے دیکھا تھا؟"

"نہیں حضور، میں نیچے کی طرف نظر کیے ہوئے تھا۔" رام دین نے جواب دیا۔ "میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ آپ اور شہزادا ادھار کے بیمار ہیں حضور میں۔"

شیر شاہ نے ہاتھ سے اشارا کیا۔ رام دین چپ ہو گیا۔ جس طرح وہ دربار میں لایا گیا تھا اسی طرح چار سپاہیوں نے اسے حراست میں دربار کے باہر کر دیا۔

اگرچہ اس کے بیان سے ابھے سنگ کو کچھ مدد نہیں ملی، پھر بھی اس نے تشکر اور توصیف نظر سے رام دین کو دیکھا وہ سوچ رہا تھا۔ اسے ہم نیچ قوم کا سمجھتے ہیں، لیکن... اس کے خیالات اور اس کا اخلاق، اکثر اعلیٰ درجے

اور یہ دولت و حکومت کے نشے میں مست و مدہوش بڑے آدمی! اس کا دل نفرت سے بھر گیا۔

"حضور، آپ نے رام دین کا بیان سن لیا" وزیر نے عرض کیا۔ "یہ شکایت بالکل جھوٹی ہے۔ شہزادہ اے قصور ہے۔"

شیر شاہ کی تیوری چڑھ گئی۔ وزیر چپ ہو گیا۔ اسی وقت شہزادہ دربار میں داخل ہوا۔ اس کے پاؤں کچھ ڈگمگا رہے تھے۔ آنکھیں لال لال تھیں۔ شاید شراب کے نشے سے۔ بادشاہ کے اونچے تخت کے برابر ایک چھوٹا سا تخت تھا۔ شہزادہ اسی کی طرف بڑھا۔

"عادل خان ——"

شیر شاہ نے تیز آواز سے کہا۔ شہزادہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہے جہاں پناہ؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"تمہاری ایک شکایت ہے۔" "میری"

"ہاں تمہاری، ایک عورت کے بارے میں"

"کس عورت کے بارے میں؟ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

شہزادہ عادل خان نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"ایسے چھوٹے موٹے کتنے واقعات ہوا کرتے ہیں۔"

"میں اسے سنگ کی بیوی کے بارے میں کہہ رہا ہوں اس کے شوہر کا بیان ہے کہ تم اس کی ننگی بیوی کو دیکھ کر ہنسے، اور اس پر بان کا بیڑا پھینکا۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب تمہارا ہاتی اسے سنگ کے گھر کے سامنے سے گذرا۔"

شیر شاہ نے بتایا۔ اس وقت اس کے چہرے پر سخت خفگی کی جھلک تھی۔

"اوہ، اب یاد آیا" شہزادے نے کہا۔ "میں نے کوئی ویسی بات نہیں کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ بھی یہی کرتے۔ کیا کہوں جہاں پناہ، میں نے ایسی خوبصورت عورت آج تک نہیں دیکھی۔ اس کی چھاتی اتنی حسین تھی اور اس کی رانیں"

"خاموش بے شرم" شیر شاہ نے غصے سے ڈانٹا۔

عادل خان حیرت زدہ ہو کر باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

"تو تم اقبال کرتے ہو" شیر شاہ نے سوال کیا۔ "تم نے اسے سنگ کی بیوی کا اپمان کیا ہے"

"اپمان، اس میں اپمان کی کیا بات ہے؟"

عادل نے حقارت سے اسے سنگ کی طرف دیکھا۔

"یہ اس عورت کی خش نصیبی تھی کہ میری نظر اس کے حسن پر پڑی۔ میں اس واقعے کو بھول گیا تھا۔ اب مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ میرے بیڑا اٹھانے پر بھی وہ عورت حد میرے محل میں ابھی تک حاضر کیوں نہیں ہوئی؟ اسے لانے کے لیے شاید چار سپاہی ——" بیٹھنے کے لیے عادل خان تخت کی طرف بڑا۔

"وہیں کھڑے رہو" شیر شاہ نے حکم دیا۔

عادل خان ٹھٹک گیا۔

"تم ابھی نہیں بیٹھ سکتے، تم مجرم ہو"

"میں مجرم"

"ہاں تم مجرم ہو، تمہارا جرم ثابت ہو گیا ہے، تم نے اس کسان کی ننگی بیوی کو بری نظر سے دیکھا، اس لیے "تعزیری کرنی ویسی بھرنی" کے مطابق میں حکم دیتا ہوں کہ اسے سنگ ہاتی پر بیٹھے، ہاتی کو شاہی محل کے سامنے لے جایا جائے اور جس طرح شہزادے نے اسے سنگ کی بیوی کو دیکھا، اسی طرح اسے سنگ عادل خان کی بیگم کو دیکھے، سن لیا وزیر؟"

وزیر کانپ کر رہ گیا۔ اس کے مونہہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ دربار میں خوفناک سناٹا چھا گیا کسی کو ایسے فیصلے کی امید نہ تھی۔ عادل خاں پتھر کی بے جان مورتی کی طرح کھڑا رہا۔ اسے سنگ کی بھی عجیب حالت تھی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بادشاہ کے فیصلے سے وہ خوش ہے یا دکھی؟

"جہاں پناہ! میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔" اسد خان جرات سے کام لیا۔ وہ شیر شاہ کا رشتے دار اور بہت ہی بااثر پٹھان سردار تھا۔

"کہو۔"

"آپ کا حکم نامناسب ہے"

"اس میں نامناسب کیا ہے؟"

"شہزادے کی بیگم کی اس طرح توہین و بے عزتی نہیں کرنی چاہیے"

"کیا اسے سنگ کی بیوی کی بے عزتی شہزادے نے نہیں کی؟"

"لیکن وہ ایک معمولی کسان کی بیوی ہے، شہزادے کی بیگم سے اس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا"

"اسد خان، تمہارا خیال غلط ہے" شیر شاہ نے کہا۔

"قانون کی نظر میں امیر اور غریب برابر ہیں، جہاں انصاف کا سوال ہے، وہاں کسان اور شہزادے میں کوئی فرق نہیں - عادل خان میرا بیٹا اور ولی عہد ہے، اس لیے اس کا قصور معاف نہیں کیا جا سکتا - میرا فیصلہ مذہبی نقطۂ نظر کے مطابق ہے - اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

اسد خان غصے سے ہاتھ ملکر رہ گیا -

"اچھے سنگ اب تم جا سکتے ہو" شیر شاہ نے کہا -

"میں تم سے خوش ہوں میں، اپنی رعیت کے ایسے نڈر اور بیباک لوگوں کی قدر کرتا ہوں، جن میں مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات ہو۔"

اچھے سنگ تشکر سے پانی پانی ہو گیا - اس نے دوڑ کر شیر شاہ کے پاؤں پکڑ لیے - اس کی جرات نے درباریوں کو حیرت زدا کر دیا - وہ تصویر حیرت بنے اس عجیب واقعے کو دیکھتے رہ گئے -

"آپ مجھے معاف کریں" اچھے سنگ نے گڑگڑا کر کہا -

"تمہارا قصور کیا ہے"؟ شیر شاہ نے تعجب سے سوال کیا؟

"میں نے آپ کے انصاف میں شک کیا تھا - اب میں مطمئن ہوں - میری بری کی عزت آپ کے فیصلے سے حل ہو گئی، لیکن ہمارا دھرم عورت کا اپمان کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لیے میں خدا یہ جرم نہیں کروں گا، جس جرم کی شکایت لے کر میں آپ کے سامنے آیا - میں اپنی شکایت واپس لیتا ہوں" اور امید کرتا ہوں کہ شہزادہ پھر ایسی غلطی نہیں کریں گے -

گوہر مشیخ پوروی

قطعہ

ہند آزاد ہوا ہو گئے چھبیس برس
اور ابھی تک نہ مٹا فرقہ پرستی کا چلن
کیا اسی طور سے آدرش بنے گا بھارت
کیا اسی چھوٹ سے چھوٹے گی ترقی کی کرن

بے وطرک بنارسی

ہمارے نوجوانوں کی جوانی دیکھتے جاؤ

ہمارے نوجوانوں کی جوانی دیکھتے جاؤ
نئی چپل ہوئی جیسے پرانی دیکھتے جاؤ
وہ کس انداز سے سڑکوں پہ بل کھا کر چلتے ہیں
یہ ان کے کمر کی لوٹی کمانی دیکھتے جاؤ
ہوئی ہے وائٹ واشنگ جیسے کوئی کالے تختے پر
ذرا غور کر چہرے کا پانی دیکھتے جاؤ
بنا موچھوں کی صورت، نہ چہرے پہ ہی رونق ہے
کہلاتے مرد، پر صورت زنانی دیکھتے جاؤ
ہوئے ہیں سوکھ کر ایسے گویا ٹینس کے ریکٹ ہوں
اچھلتی بال جیسی زندگانی دیکھتے جاؤ
لگاتے ہی لگاتے آنکھ چشمہ ہو گئی پتھر
بچاری بنگئی ہے سرمہ دانی دیکھتے جاؤ
دھنسی آنکھیں، ہیں پچکے گال، تکلی ناک، چپٹا منہ
یہی حسن کی ہے جو نہانی دیکھتے جاؤ
جوانی دیکھکر ان کی بڑھاپا آ گیا ہم کو
جوانی کیا بڑھاپا کی ہے ثانی دیکھتے جاؤ
ہنسیں ان پر کہ روئیں ہم سمجھ میں کچھ نہیں آتا
پر درد یہ ہے ہنستی کیا ثانی دیکھتے جاؤ
کبھی مردوں میں ڈھونڈا تو کبھی کھو جا زنانوں میں
نہیں ملتا ہے کوئی ان کا ثانی دیکھتے جاؤ

نمائش میں انہیں رکھو یا چڑیا گھر میں رکھ چھوڑو
یہی ہے باپ دادوں کی نشانی دیکھتے جاؤ

شہریور - مہر - آبان ۱۳۴۲ ف ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۶۳ء

جگن ناتھ آزاد

جوشؔ کی شاعری

جوشؔ کی شاعری ولولے اور گھن گرج کی شاعری سمجھی جاتی ہے، اور شاید اسی بنا پر انہیں بعض حلقوں میں ایک مدت تک شاعر انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔

جب ہم جوشؔ کی شاعری کا مطالعہ ان کی زندگی کی روشنی میں کرتے ہیں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ ان کی شاعری میں ولولے کی دین اس کردار سے آئی ہے جو آفریدی پٹھانوں کی زندگی کا خاصا ہے۔

جوشؔ صاحب کا خاندان آفریدی پٹھانوں کی ایک شاخ علی خیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے خاندان کی خاصیت کے بارے میں آپ یادوں کی برات لکھتے ہیں —

ہندستان آکر بھی اور جوار لکھنؤ میں رہنے کے باوصف ہم نے اپنی جنگ جوئی کی عادت نہیں چھوڑی اور آفریدیوں اور قزلباشوں کے مابین ایک مدت دراز تک تلوار چلتی رہی اور فرنگیوں نے آکر، جب تلوار چین لی تو ٹھپ ہونگا ہونے لگا۔

"مدتوں تک ہمارا یہ عالم رہا کہ اگر کسی راہ رو کو اتفاقاً کھانسی آجاتی تھی اور وہ کسی کے دروازے کے سامنے تھوک دیتا تھا تو صاحب خانہ لٹھ لے کر گلی میں آجاتے تھے کہ خان صاحب آپ ہمارے مکان میں تھوک رہے ہیں، اور تھوکنے والے خان صاحب اکثر کو یہ جواب دیتے تھے کہ جب نہیں تھوکا تھا تو اب تھوک رہے ہیں۔ آخ تھو، آخ تھو، اور دونوں کے درمیان بڑے زور و شور سے لٹھ چلنے لگتا تھا اور اگر کسی شادی بیاہ میں دو حریف گروہ آمنے سامنے حقوں پر بیٹھے حقا پیتے تھے، تو ان میں سے جب ایک گروہ کا آدمی کڑکڑ، کڑکڑ، کڑ اک کی آواز نکال کر حقا پیتا تھا، تو دوسرے گروہ کے تمام آدمی اس کو اعلان جنگ سمجھ کر، اس سے بھی زیادہ زور زور سے حقے پینے تھے کہ چلموں سے آنچیں نکل آتی تھیں اور اس ضدم ضدا کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا تھا کہ پل بھر میں فریقین کے سر لہولہان ہو کر رہ جاتے تھے"

تو یہ وہ ماحول تھا جس میں جوشؔ ملیح آبادی کی شاعری پروان چڑھی۔ یہ ماحول ان کی شاعری کے اکثر و بیشتر حصے میں بڑی نمایاں جھلک دکھا رہا ہے۔ "بغاوت" کے عنوان سے جو نظم آپ نے کہی ہے اس میں کہتے ہیں ؎

ہاں بغاوت تا گ بجلی موت آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل میری جلو میں قتل عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اٹھتی ہے مری چین جبیں سے کائنات
جنگ کے میدان میں میری سیف کی الٹی ری ضو
خاک بن جاتی ہے بجلی برق و رعد اٹھتی ہے لو
ذکر ہوتا ہے مرا تیر ہول پیکاروں کے ساتھ
ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ
میری اک جنبش سے ہوتا ہے جہاں زیر و زبر
میری سرتابی ثریا کا جھکا دیتی ہے سر
الاماں والحذر میری کڑک میرا جلال
خون، سفاکی، گرج، طوفانی، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں، کٹار
شیر قبضے، برچھم، علم، گھوڑے، پیادے، شہسوار
آندھیوں سے میرا رتبہ ہے دنیا کا نظام
رقص کا دلدادہ ہے میری شجاعت سے دوام

ظاہر ہے کہ اس انداز بیان کو ان طرز طریقوں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا جن سے آفریدی پھاٹوں کی زندگی، ہندستان آنے کے بعد بھی عبارت رہی۔ یہاں جوش صاحب کی زندگی کے ایک خاص رجحان کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا جس سے ان کے کردار پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں -

"شاعری سے جب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب ترین مشغلا تھا کہ ایک اونچی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو جو بھی جی میں آتا تھا آناپ شناپ درس دیتا تھا۔ درس دیتے وقت میری میز پر ایک پیلا سا بید رکھا رہتا تھا، اور جو بچا توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا تھا، اسے میں اس بید سے اس بری طرح مارتا تھا کہ بے چارا چیخیں مار مار کر رونے لگتا تھا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کمزور ذہن بچے کے کاندھوں پر سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار مار کر دوڑاتا تھا کہ وہ غریب بے دم ہو کر گرنے لگتا، اور میرے مزاج کی یہی وہ بنیادی سختی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ و ترش بن کر آج بھی نمودار ہوتی رہتی ہے، اور میری شاعری پر انتقاد میرے لہجے کی درشتی پر چیخ چیخ اٹھتا ہے۔"

لہجے کی یہ درشتی جوش کے یہاں بعض اوقات غیر شاعرانہ حدوں تک پہنچتی نظر آتی ہے، مثلاً ایک نظم میں جو انہوں نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں کہی تھی ہٹلر کو مشورا دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

جو تیرا ہو کبھی قصر کنگلم کی طرف جانا
ہمارے نام کا بھی ایک گولا پھینکتے آنا

اسی طرح ایک اور نظم میں برطانیا کے ہندستانی وفادار ازل جارج پنجم سے یوں خطاب کرتے ہیں - ؎

تیرے سر پر تاج ہے ہاں پاؤں میں جوتا نہیں
اب اس مصرع کے کوئی جو بھی معنی دا ہے سچ ہے۔

جوش صاحب کا تخلص شروع میں شبیر ہوا کرتا تھا۔ بعد میں انہوں نے جوش تخلص اختیار کیا، اس کا سبب بھی جوش صاحب ہی کی زبان سے سنیے، اس لیے کہ تخلص کی تبدیلی کا واقعہ ان کی زندگی کے مذکورا رجحان سے لاتعلق نہیں ہے۔ آپ لکھتے ہیں -

ابتدائے شباب و شاعری کا زمانا تھا۔ لکھنؤ میں قیام تھا۔ شہر میں ایک تھیٹر کمپنی آئی ہوئی تھی۔ رات کو چند دوست تھیٹر دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ اس خوبصورت ایکٹریس کا ذکر آ گیا جس کے حسن سے سب متاثر تھے۔ شعر پڑھے جا رہے تھے۔ دوران گفتگو میں کسی نے کہا ہم لوگ بڑے جوشی میں ہیں۔ بس نہ جانے کیسے یہ طے ہو گیا کہ یہ تخلص اب شبیر کے عوض جوش ہوگا"

لیکن اس جوش کا ولولے اور گھن گرج ہی کو جوش کی شناخت شاعری سمجھ لینا ہمیں کلام جوش کے مطالعے سے روکے گا۔ جوش کی شاعری صرف ولولے ہی سے عبارت نہیں ہے، بلکہ اس میں درد کی وہ کسک، اور گداز کی وہ لہر بھی ہے جسے عالا شاعری کی بنیادی قدر قرار دیا جا سکتا ہے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ جب بعض نقادوں نے جوش کی شاعری میں درد و گداز کے فقدان کا ذکر کیا تو جوش صاحب نے صرف اس نقدان کا اعتراف ہی نہیں کیا، بلکہ اس کے جواز کے لیے طرح طرح کی عبارت آرائی سے کام لیا۔ "روح ادب" کے دیباچے میں آپ لکھتے ہیں -

جی تو یہ چاہتا تھا کہ میں اس ادبیں
و آرزات نیت اور اس کے ساتھ اپنے تمام
واقعات رنگین کو اس دیباچے میں درج
کر دوں اور دنیا کو بتا دوں کہ حسن کی
زلفوں کی کمندوں نے کتنی بے پایاں نیاز
مندیوں کے بعد میرے ناز کو گرفتار کرنے
کی سعادت حاصل کی لیکن ڈرتا ہوں
بیان کرتے سے ڈرتا ہوں سے اپنی رسوائی
سے نہیں، اپنے صبا دلوں کی رسوائی سے
ڈرتا ہوں کہ ان کی معصوم نگاہیں شکنیں
نہ پڑ جائیں۔ بہر حال مجموعی حیثیت سے

مناسب سمجھتا ہوں کہ میں محبت کے سلسلے میں ہمیشہ خشن قسمت اور غرنی کے اس شعر کا مصداق رہا ؎

آنہا کہ آہوان حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوک صیدانگن من اند

اور یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں آنسو، آہیں اور سینا کوبیاں بہت ہی کم ہیں، کیونکہ یہ چیزیں ناکامی اور انفعالیت سے پیدا ہوتی ہیں اور میں ان چیزوں سے شاذ ہی دوچار ہوا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی آپ لکھتے ہیں۔

"میری بیشتر عاشقانہ نظموں میں اس چیز کی (لوگ کہتے ہیں) کمی ہے جسے آہ و فغاں اور سوز و گداز کہا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی ذمے داری ہے میرے عشق ہائے کاراں پر۔ میرے اٹھارا بڑے بڑے عشقوں میں سے سترا عشق ایسے رہے ہیں جن کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ عاشق کامیاب ٹوٹے نہیں بہایا کرتا اور جس کا یہ دعویٰ رہا کہ"؎

آنہا کہ آہوان حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوک صیدانگن من اند

اس کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ ناکامی کے آنسو بہائے۔

اس بات سے قطع نظر کہ جوشش صاحب نے غرنی کے اس شعر ؎

آنہا کہ آہوان حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوک صیدانگن من اند

کے ساتھ جو مفہوم وابستہ کیا ہے وہ غرنی کا مفہوم نہیں تھا، آپ نے شوے سے بہانے اور سینا کوبی کو درد و گداز کی لطافت کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ سینا کوبی جیسے شاعروں کا شیوا نہیں رہا۔ شوے سے ناآشنا نہیں ہیں چاہے انہیں اس حقیقت کا شعوری طور پر احساس ہو یا نہ ہو۔ "شعلہ و شبنم" میں ایک نظم ہے "شام کی بزم آرائیاں" اس میں آپ کہتے ہیں ؎

پھر خموشی کی حدیثِ غم نے لب سل کر دیا
پھر شفق کی داستانیں خون رلوانے لگیں
جتنی چوٹیں دل پہ کھائی تھیں ابھر آئیں تمام
جتنی شکلیں دل میں پنہاں تھیں نظر آنے لگیں
پھر کسی عشوے کا پرتو روح میں غلطاں ہوا
پھر کسی محفل کی شمعیں دل میں تھرانے لگیں
میٹھا میٹھا درد پھر سینے میں پیدا ہو گیا
صحبتیں بچھڑی ہوئی پھر ہائے یاد آنے لگیں

یا ایک اور نظم دیکھیے ؎

جب درد جگر اتنی لطافت سے ہو پیدا
دل کو خلش غم پہ شاشت کا ہو دھوکا
ہو دل میں سمویا ہوا احساس کا جوہر
آنکھوں میں ہوں اشک اور تبسم ہو لبوں پر
جب شورشیں ادراک کی خاموشی ہوں دل میں
جب شادی و غم دونوں ہم آغوش ہوں دل میں
جب موج ہوا میں نفس شام کی بو ہو
حیرت ہے کہ اس وقت مرے سامنے تو ہو

اصل میں جوشش کی شاعری گھن گرج اور درد و گداز کے امتزاج سے عبارت ہے۔ ان کے یہاں یہ دونوں کیفیتیں ملتی ہیں۔ آپ چاہے انہیں متضاد کیفیتیں کہیں یا مختلف نوع کیفیتیں، ان کے یہاں یہ تمام عناصر قدم قدم پر ملتے ہیں، اور یہ تمام عناصر مل جل کر ان کی شاعری کی تشکیل کرتے ہیں۔ آپ ان کے مجموعوں کے نام دیکھیے۔ یہ گرہ کسی صورت سے کھل جائے گی۔ نام یہ ہیں۔

شعلہ و شبنم۔ فکر و نشاط۔ جنون۔
حرف و حکایت۔ آیات و نغمات۔ عرش و فرش۔
سنبل و سلاسل۔ سرود و خروش۔ سموم و صبا۔
وغیرہ۔ یہ تمام عنوانات اس شخصیت کی نشان دہی کرتے ہیں جو ایک خط مستقیم پر رواں نہیں ہے۔

ایک اور جگہ میں آپ کہتے ہیں ؎

عشرت، اندیشہ، ذرہ، اختر، درد، شیطان
درویش، اقطاب، امام مرسل، یزداں

ادر جوشش اس کیفیت فراق یا لذت فراق

گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف
یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں وتپاں

یہ رباعی جوشش کی شاعری کے اکثر گوشوں کی نشان دہی کرتی ہے اور اس شخصیت کا بھی اس سے سراغ ملتا ہے جو ڈولے اور کیفیت درد کے امتزاج سے تشکیل پاکر جوشش کی شاعری پر اپنا پرتو ڈالتی ہے۔

جگن ناتھ کمال کرتارپوری

بیسویں صدی کے سرون

ایک دن اک فاقہ کش بڈھے نے بیٹوں سے کہا
اے مرے نور نظر، لخت جگر، جان وفا
جو بھی ممکن تھا کیا میں نے تمہارے واسطے
رنج کھایا، غم پیا میں نے تمہارے واسطے
اب بڑھاپے کے سبب مجبور ہوں، معذور ہوں
ناتوانی کے سبب لاچار ہوں، رنجور ہوں
اب تمہاری زندگی کے شاندار امکان ہیں
خیر سے تمکین وراحت کے سبھی سامان ہیں
اب تمہیں میری طرف بھی دھیان کرنا چاہیئے
کچھ مرے آرام کا سامان کرنا چاہیئے
ایک نے سب بھائیوں کا ترجماں بنکر کہا
تر زباں نے نکلنے کا ہمزباں ہوکر کہا
قبلہ، جو کچھ آپ کہتے ہیں بجا ہے ٹھیک ہے
آپ کا ناگفتہ طعنہ بھی روا ہے ٹھیک ہے
لیکن اب فرسودہ رسموں کی کوئی قیمت نہیں
آج کل فرسودہ رسموں کی کوئی وقعت نہیں
یہ زمانہ برق کا ہے اس کی قدریں اور ہیں
ہر برس کے سیکنڈ کے یا نکلنے کے طور ہیں
اب جنم داتا کا قصہ تو پرانا ہو چکا
پرورش تعلیم کے احساں فسانا ہو چکا
ہم جنم سے پہلے شامل تھے مذاکے نور میں
پھنس گئے ہیں پھر حیات وموت کے دستور میں
آپ کہتے ہیں کہ یہ ہم پر بڑا احسان ہے
لیکن اس چکر میں تو نقصان ہی نقصان ہے
یہ سزا ہم کو ملی ہے کس کے کار خیر کی؟
یہ کرم ہے، مہربانی ہے کہ صورت بیر کی؟
جب جنم میں لا چکے تو پالنا بھی فرض تھا
کیا غلط بخشی کا جرمانہ بھی ہم پر فرض تھا؟
لیجئے، مانا، کہ خدمت اب ہمارا فرض ہے
آپ سے اس سلسلے میں اک ذرا سی عرض ہے
ان دنوں دس کو کھلاتی تھی کمائی ایک کی
ان دنوں دو بھی نہیں گنتی کمائی ایک کی
اب کمانا، کام کرنا ہر کسی کا کام ہے
کام میں تکلیف وجہ راحت وآرام ہے
مانتے ہیں آپ کی صحت ذرا کمزور ہے
ہو گئے ہیں کان بھاری آنکھ بھی کچھ کو رہے
آپ کو تھوڑا بہت تو کام کرنا چاہیئے
زندہ رہنا ہے تو صبح وشام کرنا چاہیئے
چھوٹے بڑے کاموں میں زور کی حاجت نہیں
پھر بکانا مدعا بھی آنکھ پر آفت نہیں
ہلکی ورزش کیلئے گھر میں صفائی کیجئے
خیر سے سودا سلف پر بھی تو جا دیکھئے
آپ چاہیں تو انہی کاموں کا دھندا کیجئے
گھر کی بچت کیلئے نوکر کو چلتا کیجئے
گھر میں بیٹھے مفت کی کیوں روٹیاں توڑا کریں
کام لازم ہے تو اس سے منہ نہ اب موڑا کریں
ہند میں کیا تیس سالہ عمر معیاری نہیں؟
کیا یہ ستر سال جینا چور بازاری نہیں؟

جاتے جاتے کام اتنا کر ہی جانا چاہیئے
موت آئے یا نہ آئے مر ہی جانا چاہیئے

جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

سرقا بالعمد

عبدالحمید بوسیرے، ایڈیٹر "صبح امید" جواب دیں!

عبدالحمید بوسیرے ایڈیٹر "صبح امید" بمبئی رنگے ہاتھ پکڑے گئے

"صبح امید" بمبئی کئی سال سے "ہندستانی ادب" کے تبادلے میں پابندی کے ساتھ آتا ہے، چونکہ "ہندستانی ادب" ایک ٹوائیسٹ ماہوار علمی ادبی رسالا ہے، اس لیے اس رسالے کے تبادلے میں آنے والے متعدد علمی ادبی رسالوں سے معیاری مضامین - افسانے - انشائیے - نظمیں - غزلیں - ہزلیں - قصیدے - مثنویاں - قطعے اور رباعیاں وغیرا وغیرا بلا تکلف نقل کرتا اور ساتھ ہی شکریہ بھی ادا کیے دیتا ہے -

جون ۱۹۴۱ء "ہندستانی ادب" کا پہلا نمبر شایع ہوا تھا - اس وقت اس رسالے کے راستے مضامین اور نظمیں وغیرا وصول ہوا کرتے تھے - اس رسالے میں لکھنے والے غیرمنقسم ہندستان، یعنی موجودا ہندستان، پاکستان اور بنگلا دیش کے مشہور ادیب اور شاعر وغیرا شامل تھے - ہر نمبر (۶۴) صفحے کا ہوا کرتا تھا، جو نارمے کے چکنے کاغذ پر چھپا کرتا تھا، لیکن اس کے باوجود بارا نمبر کا سالانا چندا صرف چار روپے تھا، جس میں خاص نمبر بھی شامل ہوا کرتے تھے -

صرف "ہندستانی ادب" ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ ہر نئے رسالے کے ساتھ یہی ہوا کرتا ہے کہ بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر یہی چاہتے ہیں کہ ان کی تخلیقات کو اولیت دی جاے - اگر ان کے مضمون یا نظم وغیرا کی اشاعت میں دیری ہو تو ایڈیٹر کو خاص طور پر توجہ دلائی جاتی ہے، اور بے چارا ایڈیٹر ان کی شخصیت کا لحاظ کرتے انہیں اولیت دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور دوسرے مضمون نگاروں اور شاعروں کے مضامین وغیرا کو پیچھے ڈالدیا جاتا ہے، اور یہ سلسلا مہینوں بلکہ ایک سال یا دو سال تک بھی چلتا ہے، اور دوسرے مضمون نگاروں اور شاعروں وغیرا کو خطوط کے ذریعے سنوالیا جاتا ہے، اور ان سے وعدا کیا جاتا ہے کہ آپ کا اور آیندا نمبر میں آپ کا مضمون یا افسانا وغیرا ضرور بضرور شایع کیا جاے گا - بہرحال ایک تجربا کار ایڈیٹر بڑے اور چھوٹے یا مشہور اور غیرمشہور مضمون نگاروں اور شاعروں وغیرا کو کسی نہ کسی طرح منوالیتا ہے - سن ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۲ء تک یا دوسرے لفظوں میں رسالے کے جاری ہونے سے دس بارا سال تک مضمون نگار اور شاعر وغیرا ایڈیٹر کی مسلسل خشامد چاپلوسی کرتے ہیں کہ پہلے ان کا مضمون شایع کر دیا جاے - اس کے بعد انہیں اس رسالے سے کچھ گھن سی آتی ہے، اور دوسرے نئے رسالوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں، اور وہاں بھی ان نئے ایڈیٹروں کو بالکل اسی طرح پریشان کیے دیتے ہیں -

۱۹۵۲ء کے بعد سے تو خدا ہمارے خشامد چاپلوسی کرنے کی نوبت آگئی - چند سال تک ہم نے خشامد بھی گوارا کی، لیکن ۱۹۵۷ء میں تو خشامد وغیرا سے کام ہو کر رہ گئی - ہم نے پرانے لکھنے والوں کو بہت کچھ لکھا کہ مضامین کی کمی کے سبب سالانہ کر دینے کی نوبت آگئی ہے، مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی، اور کسی نے بھی جواب تک نہ دیا - اس وقت رسالے کی موت

اور حیات کا سا اہم سوال پیدا ہوگیا - آزاد اور غیور طبیعت اس بات کو ہرگز ہرگز گوارا نہیں کرتی تھی کہ دوسرے رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین ہم اپنے معیاری اور قدیم رسالے میں شایع کریں - اگر ایسا نہیں کرتے ہیں تو رسالا بند ہوجاتا ہے، اور "ہندستانی ادب" کا نام و نشان دنیائے صحافت سے مٹ جائے گا اور اگر دوسرے معیاری رسالوں سے معیاری مضامین وغیرا نقل کرتے ہیں تو رسالا باقی نہ رہ سکتا ہے، چنانچہ ہم نے رسالے کو باقی رکھنا چاہا" اور فروری ۱۹۵۸ء میں "ہندستانی ادب" کا پہلا نمبر اپنی نئی ڈائجسٹ کی شکل میں ظاہر ہوا، جس کو آج تک بھی ہم بڑے زور و شور سے نبھاے جا رہے ہیں، اور آج تو ہم پوری قوت اور نہایت ہی فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ "ہندستانی ادب" حقیقت میں شاہوں کا شاہ یا "شاہنشاہ ڈائجسٹ" ماہوار علمی ادبی رسالا ہے، جو اپنا ایک سو صفحے کا ہر نمبر ایک عالا پایا اور معیاری علمی ادبی "گلدستے" کی شکل میں پیش کرتا ہے!

یہ سچ ہے کہ "ہندستانی ادب" کا یہ کہنا فخر دوسرے رسالوں کا مرہون منت ہے، لیکن اس سلسلے میں ہماری عرض یہ ہے کہ دوسرے رسالوں سے جواہر پارے چننے اور منتخب کرنے کے لیے جواہر شناس نظر بھی تو چاہیے، جو ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں - ہم بہترسے بہتر مضامین وغیرا کے انتخاب میں اپنی جان لڑا دیتے ہیں، اور بعض وقت تو کسی ایک سارے رسالے میں ایک بھی مضمون ہمارے معیار پر نہیں اترتا ہے تو اس رسالے کو نظر انداز کیے دیتے ہیں، پھر دوسرے، تیسرے، چوتھے اور اس طرح مسلسل کئی ایک رسالوں کے مطالعے کے بعد اپنے مقصد کا ایک آدھ جواہر پارا نکال ہی لیتے ہیں اور اس طرح ایک سے دو، تین چار، اور جتنے بھی مضامین وغیرا کی ضرورت ہو، ایک سو صفحے کے نمبر کے لیے منتخب کر ہی لیتے، اور ہر تین مہینے میں ایک عالا پایا اور معیاری نمبر شایع کیے دیتے ہیں - ہم نے، اس رسالے کے ڈائجسٹ کیے جانے کے پہلے ہی نمبر میں فہرست کے صفحے پر "شکریے کے ساتھ" کا کالم رکھا تھا، جس پر آج تک بھی پورا پورا عمل کر رہے ہیں - جس طرح ہم دوسرے رسالوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں، اسی طرح اگر "صبح امید" کا مضمون

اس کے برعکس "صبح امید" بمبئی ڈائجسٹ رسالا نہیں ہے، اور نہ وہ دوسرے رسالوں سے مضامین وغیرا نقل کرتا ہے، لیکن اس "صبح امید" نے اپنی فروری ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں "ہندستانی ادب" سے ایک عالا پایا، معیاری اور نہایت ہی دل چسپ اور معلومات آفرین مضمون "ٹوکیو کی سیر" نقل کیا ہے، مگر ایڈیٹر "صبح امید" نے مضمون کے شروع میں یا آخر میں "ہندستانی ادب" کے شکریے کے ساتھ، کہیں بھی نہیں لکھا ہے، اور یہ داستان بڑی ہی دل چسپ اور معنی خیز ہے! واقعہ یہ ہے کہ ایک نہایت ہی عالا پایا معیاری ماہوار رسالا "برہان"، دہلی، "ہندستانی ادب" کے تیارے میں برسوں سے آتا ہے، چونکہ "ہندستانی ادب" ایک سیکولر قسم کا رسالا ہے، اس لیے ہم "برہان" سے غیر مذہبی مضامین اکثر و بیشتر نقل کیا کرتے ہیں - اس کے قابل اور لائق ایڈیٹر سعید احمد اکبر آبادی، ام - اے (علیگ) نے حکومت ہند کے نمایندے کی حیثیت سے اکتوبر ۱۹۷۰ء میں جاپان میں "مذہب اور امن پر دوسری عالمی کانفرنس" میں شرکت کی تھی - اس کانفرنس کی روداد بشکل سفرنامہ، "برہان" میں قسط وار چھپا تھی، جس کی پہلی قسط اپریل ۱۹۷۱ء میں چھپی تھی - اس کے بعد مئی ۱۹۷۱ء میں دوسری قسط، اور اس کے بعد وقفے سے جولائی ۱۹۷۱ء میں تیسری قسط، اور اگست ۱۹۷۱ء میں چوتھی قسط چھاپ کر یہ سلسلہ روک دیا تھا - اس کے کچھ عرصہ بعد جنوری ۱۹۷۲ء میں پانچویں قسط دی تھی (جس کی پیشانی پر لکھا تھا - سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو، "برہان" ماہ اگست ۱۹۷۱ء) اور اس سلسلے کی چھٹی اور آخری قسط "برہان" فروری ۱۹۷۲ء میں چھپی تھی -

ہم نے "برہان" جنوری اور فروری ۱۹۷۲ء میں بھی، ایڈیٹر "برہان" کے اس اہم سفرنامے کی دونوں قسطیں پڑھ ڈالیں، اور ساتھ ہی ہم نے یہ محسوس کیا کہ ان آخری دو قسطوں کے گنگا جمنی جوڑ سے ایک بہترین اور دل چسپ مضمون بن سکتا ہے، چنانچہ ہم نے جنوری ۱۹۷۲ء کا پرچہ جاپان نمبر لیا - یہ مضمون "جاپان میں چند روز" پانچویں قسط "صبر جاپان" کے صفحہ (۶۵) سے شروع ہوکر (۷۲) پر ختم ہوتا ہے - ہم نے صفحہ (۷۱) کے پہلے پیراگراف کا چار

یوں شروع ہوتا ہے "میں کوئیٹو کی مذاہب عالم کانفرنس جیسی کسی بین الاقوامی کانفرنس میں جب کبھی شریک ہوتا ہوں تو ایک طالب علم کی حیثیت سے شریک ہوتا ہوں ...." اس مضمون کا دوسرا پیراگراف یوں شروع ہوتا ہے "ناراؔ کو ٹیٹو کی طرح جاپان کا قدیم یعنی ایک ہزار برس پرانا شہر ہے" چنانچہ ہم نے دوسرے پیراگراف کے اوپر "ناراؔ" کا لم کی سرخی لگادی۔ اس کے بعد مضمون نگار نے پروفیسر عبدالکریم سے اپنی ملاقات کا ذکر صفحہ (۷۲) کے تیسرے یا آخری پیراگراف میں یوں کیا ہے" کانفرنس کے مقامی مندوب پروفیسر عبدالکریم رہ بھی تھے" چنانچہ ہم نے کالم میں "پروفیسر عبدالکریم" کی سرخی لگادی۔ اس کے بعد اس مضمون کا سلسلہ فروری ۱۹۷۳ء میں صفحہ (۱۲۹) پر ملتا ہے۔ اس آخری قسط میں مضمون نگار نے کوئیٹو میں شاما اور اس کے باپ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے، چنانچہ ہم نے "شاما" کی سرخی بھی کالم میں لگائی ہے۔ کوئیٹو سے مضمون نگار جب جاپان کے پائے تخت ٹوکیو پہنچے ہیں، یہ بھی سرخی ہم نے کالم میں لگائی ہے۔ اس کے بعد "روسی سفارت خانے" میں اور "اشوک ہوٹل میں لنچ" اور "ٹوکیو سے روانگی" کالم کی سرخیاں بھی ہماری ہی لگائی ہوئی ہیں۔ آخر میں، ہم نے اس پورے سفر کا آرا اور دل چسپ مضمون کا سرخی "ٹوکیو کی سیر" بھی ہم نے لگائی ہے، اور یہ پورا مضمون ان تمام سرخیوں کے ساتھ فروری ۱۹۷۳ء کے "صبح امید" بمبئی میں صفحہ (۲۶) سے (۴۲) تک موجود ہے۔

اس وقت یہ تفصیلی نوٹ لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ایڈیٹر "صبح امید" اپنے ہر نمبر میں کتابات کی ہدایت کرتے ہیں کہ "صبح امید" کا کوئی بھی مضمون اس رسالے کے حوالے کے بغیر نقل نہیں کیا جاسکتا" تو پھر آپ نے مضمون "ٹوکیو کی سیر" "ہندستانی ادب" کے بغیر حوالے سے کیسے اور کیونکر نقل کیا؟ آپ اس کلی حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ آپ نے یہ مضمون "ٹوکیو کی سیر" ہمارے سفر کا آرا ڈائیجسٹ رسالہ "ہندستانی ادب" بابت اپریل - مئی - جون ۱۹۷۳ء کے پہلے نمبر سے نقل کیا ہے، آپ کو اپنے فروری ۱۹۷۳ء کے نمبر کے لیے ایک اچھے اور معیاری، نیز دل چسپ مضمون کی ضرورت

کی سیر" مضمون کو دیکھا، مضمون چونکہ دل چسپ اور معیاری تھا، اس لیے آپ نے ہمارا وہ نمبر کاتب کے حوالے کرتے ہوئے اپنے فروری ۱۹۷۳ء کے نمبر میں اس مضمون کو نقل کرنے کی ہدایت کردی۔ آپ نے "ہندستانی ادب" کا حوالہ دینا یا شکریہ ادا کرنے کی زحمت اس لیے گوارا نہیں کی کہ وہ مضمون سعید احمد اکبر آبادی کا ہے جو "برہان" میں چھپا ہوگا مگر آپ کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ یہ مضمون کس مہینے کے "برہان" میں چھپا تھا؟ آپ کو تو کیا، خود مضمون نگار سعید احمد کو تک اس کی خبر نہ ہوگی کہ میرا یہ سفر کا آرا مضمون کس مہینے کے "برہان" میں، اور کیونکر چھپا تھا، اس لیے کہ ایک مسلسل سفر نامے کی پانچویں اور آخری دو قسطوں کے گتھا گتھی جوڑ سے ہم نے ایک عالا پایا، معیاری اور دل چسپ مضمون بنا ڈالا، اس کی سرخی بھی خود ہم نے لگائی اور ذیلی سرخیاں بھی ہم نے لگائی ہیں، اور بہت بڑا کمال یہ کیا کہ پانچویں قسط کے آخری حرف پر نے دو صفحے لیے اور اس کو پوری چھٹی قسط سے جوڑ دے کر ربط اور تسلسل پیدا کردیا، جس پر خود صاحب مضمون سعید احمد "انگشت بدنداں" ہوگئے!

آپ کے کاتب نے صرف "شاما" کی ایک کالم کی سرخی چھوڑ دی ہے، جس کی جگہ کالم میں خالی ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سرخی چھوڑ دی گئی ہے، اس لحاظ سے آپ یہ کہتے ہوئے تو حق بجانب نہیں کرسکتے کہ "ہندستانی ادب" کے مضمون میں "شاما" کی سرخی موجود ہے، اور "صبح امید" کے مضمون میں وہ سرخی نہیں ہے! خیر! ایک جھگڑے کی طرح آپ بھاگ رہے ہیں، اور اپنی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ہم آپ کو ایک اور طریقے پر گرفتار کیے لیتے ہیں۔ "صبح امید" کے صفحہ ۲۹ پر کالم کی سرخی "ٹوکیو" کے نیچے سعید احمد نے یہ لکھا تھا کہ "پھر اردو کا یہ شعر یاد آیا" اور وہ شعر لکھ دیا، مگر چونکہ ہم "اردو" کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، اور جہاں کہیں کسی کے مضمون میں "اردو" کا لفظ لکھا ہوتا ہے، ہم اس کی بجائے "ہندستانی" بنادیتے ہیں، چنانچہ ہم نے اس موقعے پر "ہندستانی" ہی لکھا تھا، اور وہ جملا یوں ہے "پھر ہندستانی کا یہ شعر بھی یاد آیا" کیجیے اس کھلے ثبوت کے بعد بھی آپ تسلیم کرتے ہیں کہ

ڈائجسٹ رسالے "ہندستانی ادب" سے نقل کیا ہے یا نہیں؟ نہیں — تو پھر آپ کو ہم ایک ایسے مدلل فوقت کے ساتھ جانتے ہیں کہ جس کے آگے سر تسلیم خم کیے بغیر آپ کو چارا ہی نہیں — ! اوپر گنائے گئے ہندستانی شعر کے لکھنے کے بعد سعید احمد نے اپنے مضمون میں "اور فارسی کا وہ شعر" لکھ کر شعر نہیں لکھا، لکھے صرف ایک مصرع لکھا تتاع " حیف درچشم زدن صحبت یار آخر شد" چنانچہ ہم نے اپنے طور پر اس کو یوں لکھا تھا " اور فارسی کا وہ شعر بھی یاد آیا، جس کا پہلا مصرع یہ ہے ع " حیف درچشم زدن صحبت یار آخر شد!

کہیے اس کے بعد بھی مداح زار ہے آپ کے لیے کر "جی نہیں! ہم نے تو مضمون " ٹوکیو کی سیر" معاصر" برہان" ہی سے نقل کیا تھا" ! آیا آپ کو اب بھی " ہندستانی ادب" کا نام لینے میں عار ہے، اور " ہندستانی ادب" کی برتری اور بزرگی اپنی سعادت مندی سے برگزیدا اور میعاری رسالا تسلیم کرنے میں کوئی عذر تو نہیں ہے؟

ظفر صہبائی

غزل

راس آجائے ہیں پیار کا لمحہ کوئی
اپنے زخموں کا نہیں اور مداوا کوئی

درک و احساس کی آنکھوں سے عبارت پڑھو
ان کتابوں میں بھی ملجائے نہ صفحہ اکوئی

بے مکانی جو مقدر ہے تو شکوہ کیسا
مل ہی جائے گا کہیں زیر سیہ اکوئی

اپنے ہی زخم کو پاتا ہوں برہنہ یارو
توڑ دیتا ہے ہر اک شب مرا چہرہ کوئی

کس سے کہتا کہ محبت کی ضرورت ہے مجھے
وہ گریزاں آئے میرے پاس نہ ٹھہرا کوئی

اب روایات کی تجدید سے حاصل کیا ہے
اب تو باقی نہیں اس راکھ میں شعلہ کوئی

مدت سب چھپی جگ تیرگی وقت ظفر
ڈھونڈتا پھرتا ہے اب اپنا ہی سایا کوئی

خلیق پڈھانوی

تجھے بھی پوچھتی دنیا جو تو نے کچھ کیا ہوتا

کسی محتاج و بیکس کا اگر تو آسرا ہوتا
حقیقت میں اے ہمدم زندگی کا کچھ مزا ہوتا

تقاضائے اخوت یہ نہیں کہ تو بگڑ جائے
پرائی آگ میں پڑ کر جو جلتا تو بجا ہوتا

کسی روتے ہوئے کو دیکھ کر تجھکو یہ لازم تھا
ترے قلب و جگر میں درد اس سے بھی سوا ہوتا

مصائب کی فراوانی ہزاروں کو ستاتی ہے
کوئی اک تو تسلی گو دمیں تو نے لیا ہوتا

نہیں مجھتی ہیں اے دوست تیری شان مختاری
کسی مجبور کا جام مصیبت تو پیا ہوتا

سخاوت تھی تو یہ تھی کہ کسی دامن کا تار و پو
محبت اور مروت کی جو سوزن سے سیا ہوتا

ترا دل شاد ہوتا اور نگاہوں میں چمک آتی
جو تو نے بھی کسی کی آنکھ سے کچھ دیکھا ہوتا

ہوا و حرص و خود غرضی تری گھٹی میں ہے ہمدم
مزاج جب تھا کہ غیروں کیلئے ہی تو جیا ہوتا

تو کیوں ڈرتا عدو کی بے اثر آتش بیانی سے
جو طوفانی تھپیڑوں میں تو کھیلا اور جیا ہوتا

تری تقلید بے معنی، مرے ہمدم مزاج تھا
اگر تو قوم و ملت کا مربی رہنما ہوتا

حقیقت میں تجھے پھر دائمی یہ زندگی ملتی
وطن کی شمع پہ گر مثل پروانہ جلا ہوتا

خلیق اب یہ حسد کیا ہے، انا کیا ہے پچتاوا
تجھے بھی پوچھتی دنیا جو تو نے کچھ کیا ہوتا

شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۲ھ ف ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۳ء

پروفیسر کرامت علی کرامت

امجد نجمی کے خطوط

عبداللطیف عارف کے نام

۸ / فروری ۱۹۶۵ء

عزیز مکرم!

خش رہے - مہینے بھر کی مسلسل علالت نے گویا میرے وجود بے بود کے رسن، جس، کسن بل، آب و تاب اور رنگ و روغن تمام پر پانی پھیر دیا ہے، لیکن قلم ہے کہ بات میں آنے کے لیے بیقرار ہے - کاغذ نقش فریادی بنکر پکار رہا ہے کہ میری سادہ اوراقی کو اپنے قلم کی شوخی و رنگینی سے بھر دیجیے، اور میں حیران ہوں کہ لکھوں تو کیا لکھوں؟ اپنے غمنامے کا آغاز کروں تو کس طرح کروں ؎

غم نامہ اپنا صفحۂ محشر سے کم نہیں
ہے شور التیاث صریر قلم نہیں

بہر حال ایک طویل بیماری کے بعد ذرا ہنس بول لیں تو کیا مضایقہ ہے، کیونکہ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ خوش طبعی اور ہنسنا ہنسانا صحت اتنی کے لیے بڑی مفید چیز ہے - دیکھا جاتا ہے کہ اکثر لوگ طبعاً بڑے ظریف ہوتے ہیں، اور بعض بلکل خشک مزاج - خواص تو خواص، عوام میں بھی بذلا سنجی اور خوش طبعی پائی جاتی ہے - ناخواندہ ہونے کی وجہ سے عوام کا طرز گفتگو سوقیانہ قسم کی ہوتی ہے، اور خواص کی نہایت سنجیدہ، شگفتہ اور شوخ، دونوں، اگر چہ بات ایک ہی کہیں گے، لیکن ان کی ترکیبوں میں بڑا فرق ہے - شگفتہ مزاجی انسان کے لیے ضروری ہے - خصوصاً ایک ادیب، شاعر، مصنف اور مقرر کے لیے تو یہ لابدی ہے - عربی میں مثل ہے "المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام" باتوں میں مزاح ایسا ہے، جیسے کھانے

حیات جاوید میں حالی لکھتے ہیں کہ سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلا سنج تھے - جوانی میں اس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی ان کی طبیعت میں تھی - دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامی نہایت حسین تھی، مگر اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی، ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لیے آئی تھی، سرسید بھی موجود تھے، اور دلیا ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے، وہ ان کی ماں کو دیکھ کر بولے -

مادرش بسیار تلخ است

سرسید نے فوراً یہ مصرع کہا - ع

گرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں دلدار

ایک دفعہ کسی اور طوائف نے سنا کہ آپ کالج M.A.O بنوا رہے ہیں، جس کے لیے یوں گھر گھر بھیک مانگتے پھرتے ہیں - طوائف امیر تھی، اپنے کسی دوست کے آگے ظاہر کیا کہ میں بھی اس چندے میں کچھ دینا چاہتی ہوں، اگر سرسید صاحب سنلدر کریں - یہ خبر سرسید تک پہنچ گئی - اللہ جانے کیا چاہیے، وہ آنکھیں، آپ فوراً اس کے مکان پر ضمیر ماقبل الذکر کی طرح جا دھمکے، اور اس سے وہ رقم بڑی خوش دلی اور شکریے کے ساتھ لے لی - ان کے احباب نے اس رقم کے حلال ہونے پر اعتراض کیا تو سرسید نے جواب دیا کہ بھئی اسوقت یہ بھی غنیمت ہے، کالج کا باغانہ بن جائے گا -

دیکھا جناب من آپ نے! کس قدر سچا جواب دیا، کتنا ولولا انگیز خیال اور کیا بھتا دیا تھی تھی -

حیاتی گیلانی نے سچ کہا ہے، ؎

ہاں آپ نے کل شب کو شاعر ہے میں جو غزل پڑھی تھی، اس کے ایک شعر میں "زلف عنبر" لکھ گئے یعنی چہ ؟

نجمی

۱۶ر فروری ۱۹۶۵ء

مولانا صاحب !

سلام مسنون و شوق افزوں -

خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کا شہرۂ آفاق مقطع ہے - ؎

اے ذوقؔ دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

منہ سے چھوٹے یا نہ چھوٹے، لیکن واقعہ ہے کہ یہ کافر، یہ بنت عنب، یہ انگور کی بیٹی یہ آتش سیال، یہ آب آذر گوں، یہ رام رنگی، یہ جلو میں الو بنانے والی اور یہ شیشے کی بری سرزمین عرب سے نکل کر ایران و توران کے سینے میں دندناتی ہوئی ہندستان کے گرد و نواح میں درآئے گھس کر ہمارے شعر و ادب کے ریشے ریشے میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ الامان والحفیظ ! عرب و عجم کے جس شاعر کا دیوان اٹھایئے جس کلیات پر نظر ڈالیے، اس کے ذکر سے خالی نہیں، تا آنکہ بڑے بڑے صوفی شعرا بھی اس کے "ذکر خیر" سے اپنا پیچھا چھڑا نہ سکے - خیامؔ و حافظؔ کے متعدد اشعار اس کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں - خواجہ صاحب کے رندانہ اور مستانہ اشعار کو دیکھ کر یوپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کا فلسفۂ زندگی بھی وہی ہے، جو یونانی فلاسفر اپیکورس E CURUS کا نظریۂ اخلاق ہے، یعنی PLEASURE IS TH E CHIEF GOOD عیش و عشرت ہی انسانی زندگی کا مقصود عین ہے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

آپ کو معلوم ہوگا کہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے دور حکومت میں دیوان حافظ کا پڑھنا پڑھانا عوام کے لیے ممنوع قرار دیدیا تھا - صرف اس خیال سے کہ لوگ اس کو پڑھ کر بہک نہ جائیں - اسی نقطۂ نظر سے اقبال نے اپنی مشہور مثنوی "اسرار خودی" میں حافظ پر بڑے کڑے الفاظ میں حملہ کیا تھا، اور ان کا یہ اعتراض خالص ادبی نقطۂ نظر سے تھا - ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جانش از زہر اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ و رباز اراد
از دو جام آشفتہ شد دستار اد
رفت و شغل ساغر و ساقی گذاشت
بزم رندان و مئے باقی گذاشت

غرض کلیم سودا اشعار تھے بڑے سخت، لیکن جب سارا ملک ان کے خلاف ہوگیا تو انہوں نے معذرت کے ساتھ وہ اشعار ثمنوی سے قلم زد کر دیے -

چونکہ ہندستانی شاعری، فارسی کی عین کاربن کاپی ہے - خصوصاً صنف غزل، اس لیے اس میں بھی خمریات کا ایک خاصا ذخیرا پایا جاتا ہے - کسی ہندستانی شاعر کا کلام اس کی آلودگی سے خالی نہیں، خصوصاً ریاض احمد ریاض خیرابادی تو خمریات اور شراب کے امام کہلاتے ہیں - نقادوں نے حساب لگایا ہے کہ ان کے ہاں ایک ہزار تین سو چھیاسٹ اشعار صرف شراب اور ذکر شراب پر پائے جاتے ہیں، یہ انہیں کا شعر ہے - ؎

کمبخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا
واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

مجھے یاد ہے آپ نے بھی کسی وقت کہا تھا گھبرا کے پی گیا، للچا کے پی گیا - اٹھا کے پی گیا، لہرا کے پی گیا، چمکا کے پی گیا، سنبھلا سنبھلا کے پی گیا - جھلا کے پی گیا - اٹھلا کے پی گیا - اٹھلا کے پی گیا - دکھلا کے پی گیا - پہونچا کے پی گیا - ترسا کے پی گیا - غرا کے پی گیا - شرما کے پی گیا - تھرا کے پی گیا - ٹھکرا کے پی گیا - بہلا کے پی گیا - برسا کے پی گیا - پھسلا کے پی گیا - جھجھلا کے پی گیا - وغیرا، غرض کسی ہندستانی معمار کو آپ کی "مئے نوشی" کے تیر نے نہیں چھوڑا - ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

اسی سلسلے میں ایک تاریخی لطیفہ بھی ملاحظہ ہو -

ملا شیدا نے جو صاحب قران شاہ جہاں بادشاہ کا دربار شاعر تھا، ایک قصیدا کہا جس کا مطلع یہ تھا ؎

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے
حسن راہ پروردگارے عشق را پیغمبرے

تو تمام اہل سخن نے پسند کیا اور خاص و عام میں مشہور ہوگیا -

ارباب نشاط نے ترانوں میں گایا - شاہ جہاں نے بھی سنا، مگر نجانے کیا خیال آیا کہ سنکر بہت خفا ہوا، گرجا یہ ع

نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد

اور کہا کہ شراب ام الخبائث جس کی حرمت قطعی قرآن سے ثابت ہے، اور مذمت شریعت سے، اس نے (شاعر نے) اسے یہاں تک پہنچادیا! کہدو کہ ہماری قلمرو کی حدود سے نکل جائے - یہاں شیدا چیں بول گئے - مقربان دربار کی سفارش سے اس کی خطا معاف ہوئی - شیدا نے ایک معذرتی قطعہ لکھا جس میں جامی کے ایک شعر کا حوالا دیکر اپنی خطا معاف کروالی - اور بادشاہ کو پھر اپنے حال پر مہربان کیا -

مولانا جامی کا شعر یہ ہے ؎

از صراحی دو بار قلقل مے
نزد جامی بہ از چہار قل است (یعنی جبلوز؟)

غرض اس سمع خراشی سے میری مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے ہم کو شراب و کباب کے مضامین سے شعر و ادب میں احتیاط بلکہ احتراز چاہیے -

آپ اپنی مدافعت میں غالب کا یہ شعر پیش کرسکتے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اور کہہ سکتے ہیں کہ آپ معرفت کو شراب، ارباب ذوق کو ساقی اور سودا و جنوں وغیرہ الفاظ سے تعبیر یا کنایا کرتے ہیں - میں کہا ہوں بجا ارشاد ہوتا ہے، لیکن پھر بھی یہ کھلے بندوں رندی اور سرمستی ہے، غلو سے ہم کو اس بچانا چاہیے -

اہل یورپ جن کی گھٹی میں شراب پڑی ہے، اور سوچئے بادا بخط یہ ہمیں حیات ہے - کبھی تو اپنے شعر و ادب میں اس کا ذکر اس قدر شد و مد سے نہیں کرتے جیسا کہ ہم ایشیائی شاعری حالے کرتے ہیں! کیا یہ امر غور طلب نہیں! کیا یہ خیال اصلاح طلب نہیں؟ ہم کو اپنے شعر و ادب میں سب سے پہلے اخلاقی قدروں کو مدنظر رکھنا چاہیے - نیز واعظ، شیخ اور زاہد سے بھی زیادہ الجھنا نہیں چاہیے — گو یا کسی حد تک صحی ہے -

APOETIS STRUGLING WITH A PREACHER

یعنی شاعر کبھی کبھی خطیب سے دست و گریباں ہو جاتا ہے، لیکن اتنا بھی نہیں کہ - ع

گریبانم دریدہ، زنخدانش شکستم

مجھی —

۲۳ر فروری ۱۹۶۵ء

عارف مشہور و معروف

سلام علیکم - کیف مزاجکم!

۱۹۰۴ء کا ذکر ہے کہ شہر لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا عظیم الشان سالانا جلسا منعقد ہے - پنڈال حاضرین باتمکین کی کثرت سے سنھوں سنھ لبریز ہے - پنجاب کے بڑے بڑے شہروں سے لوگ امنڈ آئے - ڈاکٹر نذیر احمد ال ال ڈی کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہیں - سندھ ہی میں دوسرے شاعر ملک کے ساتھ سعدیٔ ہندستان مولانا الطاف حسین حالی اور جناب شیخ محمد اقبال بھی تشریف فرما ہیں - ہر طرف جیل پیل تیزی اور پھرتی ہے - دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں - سامعین ہمہ تن گوش بن کر لکچر سن رہے ہیں - مقرر یکے ایک کے بعد ایک اپنی جادو بیانی کا کرشمہ دکھا کر عرب کے بازار عکاظ کو شرمسار کر رہے ہیں - اسی اثنا میں اچانک ایک پندرہ سالا لڑکا صدر جلسا سے تقریر کرنے کی اجازت حاصل کرکے پلیٹ فارم پر آتا ہے، اس کا موضوع سخن ہے - "مذہب کی ضرورت" گویہ نوجوان ڈاکٹر نذیر احمد کی انشا پردازی اور مولانا حالی کی شاعری کے طلسم سے آگاہ ہے، اور جانتا ہے کہ ان حضرات کے سامنے لب کشائی امر محال میں سے ہے، لیکن ان کا رعب اس پر ذرا بھر بھی اثر انداز نہیں ہو رہا ہے - لوگ خندہ زیر لب فرما رہے ہیں یہ برخوردار ہیں کے گالوں، چہرے پر ابھی خط سبز بھی نمودار نہیں ہوا ہے، کیا تقریر کریگا، لیکن تقریر شروع ہوتی ہے، پہلے آہستہ پھر کسی قدر تیز پھر تیز سے تیز تر - پھر اسی قدر روانی، دھواں دھار جیسے طاطم خیز سمندر کی موجیں ہوتی ہیں کہ فوج آدمی کو آلیتی ہیں اور بے دست و پا کرکے جدھر چاہتی ہیں، لے جاتی ہیں، جوش و خروش، ولولا، امنگ، زور و شور!

تقریر کیا تھی خیالات کا سیلاب، الفاظ کے موتیوں کو سمیٹ کر امنڈا چلا آرہا تھا یا جوالا مکھی کے دہانے سے لاوا ابل رہا تھا - حاضرین بہوت، صدر دوم بخود، اقبال حیران، حالی ششدر! تقریر ختم ہوتی ہے، تحسین و آفرین کے بھول پنڈال پر برستے ہیں - حالی سے ضبط نہ ہوسکا انہوں نے علانیہ کہدیا کہ انہیں یقین نہیں آتا کہ خطبا اس

صاحبزادے کا ہے، چنانچہ انہوں نے (استعانتاً خدا) ایک موضوع تجویز فرمایا، اور جب یہ فرجوان اس موضوع پر بھی بے تحاشک کامیابی کے ساتھ تقریر کر چکا تو چار و ناچار انہیں ماننا پڑا، لیکن ان کا استعجاب دور نہ ہوا۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کچھ آیا خیال شریف میں آپ کے۔ یہ صاحبزادہ کون تھا؟ یہ تھے ابوالکلام احمد جو بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے بین قومی، بلکہ عالمگیر شہرت کے مالک بنتے ہیں، اور جو سیاسیات اور مذہبیات کے علاوہ عالا درجے کے لٹریچر کے مالک ہیں، اور ہندستانی زبان کے ایک ایسے اسکول کے بانی ہیں، جس نے برصغیر ہندستان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ہزاروں پرشکوہ الفاظ، سینکڑوں دلکش تراکیب، بیسیوں دلآویز استعارات اور درجنوں خوبصورت تشبیہات کا ایک کافی ذخیرا جن کا تقریروں اور تحریروں میں پایا جاتا ہے، تیر نے کیا سچی بات کہی ہے ؎

ست سہلی انہیں جاز پھرتا ہے خلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ہندستانی زبان کے دور اول سے قطع نظر، دور ثانی میں مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، اور علامہ نیاز فتحپوری، تین شخصیتیں ایسی ہیں جنہوں نے خدا ایک طرز ایجاد کیا اور خدا اسی کے خاتم بھی ہوئے۔ ان کی طرز تحریر اور اسلوب بیان کسی کے بس کا روگ نہیں، بہتوں نے ہاتھ پاؤں مارے، مگر تھک ہار کے بیٹھ گئے ؎

عشق مادر زاد باشد عاشقی دیوانہ را
نیست تعلیم از کسے در سوختن پروانہ را

بقیہ

۷ مارچ ۱۹۶۵ء

جناب من!

تسلیم دو ہفتہ ہوئے دونوں طرف سے سکوت ہے۔ آپ امتحانات میں مصروف اور میں بزم کے سالانا جلسے کے لیے سرگرداں۔ بہر حال آج اس مہر سکوت کو توڑتا ہوں اور خاندان تیموریہ کا دو چار بیگمات کا ذکر اختصار سپرد قلم کرتا ہوں۔ آپ بھی بے شبہ ان کے ذوق شعری اور ادبی کارناموں سے

گلبدن بانو بیگم۔ یہ بابر کی بیٹی، ہمایوں کی ہمشیرا، اور شہنشاہ اکبر کی پھوپی تھیں، وہ ہمایون نامہ" اس کی تصنیف ہے، جس میں اس نے بابر ہمایوں کے حالات بڑے لطیف پیرائے میں لکھے ہیں، اس کی زبان بڑی شستہ ستھری ہے۔ سلیما سلطان بیگم یہ ہمایوں کی پھوپی زاد بہن ہے، بڑی عالی فہم، خوش تقریر اور لطیفہ گو تھی۔ اکثر شاہوں اور شہزادوں میں جو معاملات الجھا کرتے تھے سلجھایا کرتی تھی۔ یہ شعر اس کا بہت مشہور ہے ؎

کا کلت را من زمستی رشتۂ جاں گفتہ ام
مست بودم نیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

اس پر "حرف پریشاں" سے عنوان سے میں نے چند اشعار تضمین کے ہیں جو "طلوع سحر" میں آپ دیکھیں گے۔

مہرالنسا بیگم یا نور جہاں بے جستا گوئی اور شعر فہمی کے علاوا غضب کی ناقدانا نظر بھی رکھتی تھیں۔ ابوالمعانی کلیم جو ملک الشعرا شاہ جہانی تھا، اس کی نکتہ چینیوں سے بڑا گھبراتا تھا۔ ایک دفعا کلیم نے یہ شعر کہا ؎

ز شرم آب شدم کاب را شکستے نیست
بجز تم کہ مرا روزگار چوں بشکست؟

یعنی میں شرم سے پانی ہوگیا۔ تعجب ہے کہ زمانے مجھے کیونکر توڑ سکا، کیونکہ پانی توڑنے کی چیز نہیں، نور جہاں نے فوراً ٹوکا "بخ بخ بہ دریں شکست" یعنی پانی کو پہلے برف بنا دیا پھر توڑا۔

جہانگیر رمضان بھر پیتا نہ تھا۔ فرخ شوال کو دیکھ کر سال خشکی کے مارے یوں اٹھا ع

ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد

نور جہاں نے فی البدیہہ کہا ع

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

ارجمند بانو بیگم عرف ممتاز محل، شاہ جہاں کی رفیقۂ حیات زیور علم و فضل سے آراستا تھی، شعر و سخن میں بھی خاصا دخل رکھتی تھی۔ ایک دفعا شاہ جہاں کے کنارے بیٹھا محو نظارۂ قدرت تھا۔ ارجمند بھی ساتھ تھی۔ دریا کی موجوں کی طرف اشارا کر کے ممتاز بیگم سے کہا ؎

آب از برائے دیدنت می آید از فرسنگہا

ممتاز نے فی الفور کہا ؎

زیب النسا بیگم۔ یہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی دختر نیک اختر تھی۔ ملا سعید اشرف اس کے استاد تھے۔ زیب التفاسیر اسی کے عہد کی تصنیف ہے۔ صاحب دیوان گزری ہے۔ مخفی تخلص کرتی تھی۔ یہ شعر اسی کا ہے ؎

بیرون ہمہ سرسبز در دلش ہمہ پرخون
از حالت من برگ حنا را کہ خبر کرد

جہاں آرا بیگم عرف بیگم صاحبہ شاہجہاں کی بڑی صاحبزادی بڑی عالمہ فاضلہ اور صاحب سلیقہ تھی۔ "مونس الارواح" اسی کی تصنیف ہے۔ قبل میں برابر اپنے بوڑھے باپ کی خدمت گزاری اور دلداری میں مصروف رہتی تھی۔ ایک دن گلگشت چمن کو نکلی۔ باغ کے چاروں طرف پردا کرا دیا گیا۔ صیدی ملہانی شاعر بالاخانے سے چھپ کر تماشا دیکھنے لگا۔ شہزادی کی سواری جب سامنے سے گزری تو بے ساختہ یہ مطلع پڑھا ؎

برقع بہ رخ افگندہ بردند نازپروردش
تا نگہت گل پختہ آید بہ دماغش

یعنی برقعا منہ پر ڈالے وہ اس لیے باغ میں جاتی ہے کہ پھولوں کی خشبو پختہ ہو کر دماغ میں آئے۔

شہزادی نے حکم دیا کہ شاعر کو سامنے لایا جائے۔ صیدی سامنے آیا تو یہ شعر بار بار اس سے پڑھوایا، پھر حکم دیا کہ پانچہزار روپے انعام دے کر اس کو شہر سے نکال دو! دیکھا آپ نے مہربانی کے ساتھ قہربانی اسی کو کہتے ہیں، لطف کے ساتھ ستم یہی ہے ع

تمہارا لطف مرتا بھی مرے حق میں ستم نکلا!

اس کا مقبرا حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار کے پاس ہے، جس پر یہ عبارت کندا ہے۔

ھو الحی القیوم

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است
اللہ بس باقی ہوس

خیر

۵ر اپریل ۱۹۶۵ء

عارف صاحب!

السلام علیکم۔ "بانگ درا" کے بعد ڈاکٹر اقبال کی دوسری ہندستانی تصنیف "بال جبریل" ہے جو ۱۹۳۵ء میں شایع ہوئی تھی۔ یہ ہندستانی میں پہلی کتاب ہے، جس میں اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی وضاحت کی ہے، اور جو تغزل کے لحاظ سے ہندستانی شاعری میں بہت بلند پایا تخلیق ہے اس کا ترجما مارٹرگ یونیورسٹی کی ایک خاتون پروفیسر نے جرمن زبان میں ۱۹۵۹ء میں کیا ہے۔ بہرحال جب یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آئی تو سب سے پہلے علامہ سیماب اکبرآبادی نے اس کے چند اشعار پر اعتراضات کیے تھے، جن اشعار میں انہوں نے خامیاں بتلائی تھیں وہ یہ ہیں۔

ضمیر لالہ مے لعل سے ہوا لبریز!
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز
مدت سے ہے آوازۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے تو چاند کے غاروں میں نظر بند
مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو
اسے روز ازل انکار کی جرات ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
روز حساب جب میرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

شعر نمبر (۱) پر اعتراض تھا کہ "پرہیز" مذکر ہے، شاعر نے غلط جمہور اس کو مونث باندھا ہے۔

شعر نمبر (۲) پر اعتراض کیا گیا کہ "فکر" مونث ہے، اقبال نے اسے مذکر لکھا ہے۔

شعر نمبر (۳) میں لفظ "کدو" کو عامی اور بازاری لفظ کہا گیا۔

شعر نمبر (۴) پر یہ اعتراض کیا گیا کہ ضمیر "اسے" لکھ کر اور اسم "شیطان" کا ذکر کسی شعر ماقبل میں نہ کرنا ایک فاش غلطی ہے، جو بندی بھی نہیں کر سکتا۔

شعر نمبر (۵) پر یہ نکتہ چینی کی گئی کہ اسی میں عبودیت کا خوفناک تجاوز ہے۔

غرض آپ نے دیکھ لیا کہ یہ اعتراضات کچھ ایسے وزنی نہیں ہیں۔ اقبال کے شعر نمبر ۲ پر معترض صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "چاند کے غار" سے شاعری کی کیا مراد ہے؟ یہ خیال تو بڑی بوڑھیوں کی کہانی سے جو وہ بچوں کو بہلانے کے لیے کہتی ہیں، زیادا وقعت نہیں رکھتا۔ اس کا جواب جناب حفیظ علی اثر لکھنوی نے دیا تھا، جو سائنٹفک

انکشافات پر مشتمل ہے۔ انہیں کے الفاظ کو بعینہٖ میں یہاں دہراتا ہوں، تاکہ آپ بھی لطف اندوز ہوں، انہوں نے بتلایا کہ۔

۱۸۶۴ء کے لگ بھگ ایک جرمن سائنس داں زیگلر ZEIGLER نے دریافت کی کہ چاند کی سطح بالراست روشن نہیں ہے، بلکہ اس میں غار ہیں اور ان غاروں سے روشنی نکلتی پھیلتی اور پوری سطح کو منور کرتی ہے، انگریزی میں ان غاروں کو FISSURES OF LIGHT کہتے ہیں، جس کا لفظی ترجمہ نور کے غار ہوا۔

اب اس وضاحت کی روشنی میں اقبال کا شعر پڑھیے۔ شاعر کہتا ہے میری فکر جو مدت سے آوارا پھر رہی ہے تو اے چاند کے غاروں میں بند کردے، تاکہ یہ وہاں سے ایک لمحۂ نور بن کر نکل آئے، اور تاریکیٔ شب لوگوں کی جہالت دور کردے۔

دیکھا آپ نے سچ کہا ہے گرامی نے ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نہ تواں گفت!

یہ ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ۱۹۵۹ء میں سوویت روس نے اپنا مون راکٹ "لونک" خلا میں بھیجا تھا جو بہت اونچا اڑا تھا، اور سیاروں کے خلائے طلائے تھے۔ اس نے چاند کی سرزمین کا ایک فوٹو بھی لیا تھا، جو اخباروں میں چھپ چکا ہے۔ یہ نقشہ میری نظر سے بھی گذرا ہے، اس میں کئی دریا اور کئی خاک کے تودے بتلائے گئے تھے۔ ایک دریا کا نام مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ SEA OF TRANQUILLITY تھا۔ میں نے اپنی نظم "مون راکٹ" میں اس کی طرف اشارا کرکے کہا تھا ؎

چاند کے "بحر سکوں" میں ہے تلاطم پیدا
چاند سے جاکے اب ان نے ٹکر لی ہے

بہرحال اس نقشے میں جو خاک کے تودے بتلائے گئے تھے، کچھ ہے یہی روشنی کے پربت یا پہاڑیاں ہوں جن کو اقبال نے چاند کے غاروں سے تعبیر کیا ہے ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست

۱۲ر اپریل ۱۹۶۵ء

مولوی صاحب!

خلوص بے پایاں۔ اس خط کو میرے گزشتہ مکتوب کا ضمیمہ تصور فرمایئے، کیونکہ روسی مون راکٹ کے ساتھ خلا بازی کی دھن میں جو باتیں مجھے کہنی تھیں وہ یکقلم بھول گیا، اور زمین کو چھوڑ آسمان کی کہہ گیا۔

بہرکیف کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ اگر اقبال سے کچھ لسانی فروگذاشتیں ہوگئی ہیں یا انہوں نے چند الفاظ کو خلاف جمہور مذکر یا مونث استعمال کیا ہے تو یہ کوئی ایسی قابل گرفت بات یا واجب التعذیر جرم نہیں ہے۔ اگلے اساتذہ نے بھی ایسا کیا ہے۔ اقبال بھی اپنے وقت کے ماستاد تھے، اس لیے وہ ایسا کرنے میں مجاز تھے، اس کے علاوہ یہ تذکیر و تانیث کا اختلاف تو ایسا ہے جیسے "آمین بالجہر" اور "آمین بالسر" کا جھگڑا۔ اسکو کسی طرح "آمین بالشر" بنانا مناسب نہیں۔ ملاحظہ ہو یہ شعر ؎

نہ فقرے کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے
وہ قوم جس نے گنوایا متاع تیموری

دیکھیے یہاں "متاع" کو اقبال نے مذکر استعمال کیا ہے، حالانکہ یہ لفظ جمہور کے نزدیک مونث ہے۔ البتہ "مال متاع" مذکر ہے، اسی طرح اس شعر میں ؎

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ یہ بھی ہے حرام اے ساقی

"مینا" کو انہوں نے مونث باندھا ہے۔ اس لفظ پر جب ان کے ایک دوست نے انہیں ٹوکا تو اقبال نے جلال لکھنوی کی "مفید الشعراء" منگا کر دیکھی، اور تسلیم کرلیا کہ ایسی لغزشیں ان سے کبھی کبھی ہو جایا کرتی ہیں۔

غرض اقبال نے میر تقی میر کی طرح کبھی یہ دعوا نہیں کیا کہ ع

سند ہے میرا فرمایا ہوا!

اسی طرح اقبال کے اس شعر پر ؎

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دور گراں خوابی

ایک لکھنوی صاحب نے اعتراض کیا کہ یہ "صبح روشن" کیا ہے؟ اقبال نے جواب دیا کہ حضرت جب صبح کاذب

ہوسکتی ہے تو یہ "صبح روشن" ہے۔ اس کے ہونے پر اعتراض کیوں؟"

ایک معترض کہتے ہیں کہ "ان کی بانگ درا" میں جو لغزشیں ہیں وہ زیادا تر محاورا کی ہیں، تمثیلی دو بیان کی جاتی ہیں ؎

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت ترے سر
(نظم ہمالا)

کسی کے سر باندھنا نہیں کہتا، بلکے سر پر باندنا محاورا ہے۔ خالی سر باندنا یا سر منڈنا بھی بولتے ہیں، مگر اس کے دوسرے معنی ہیں، تمثیلاً کہتے ہیں جب کوئی نہ ملا تو فلاں چیز تم نے سرے سر باندی یا منڈی، یعنی زبردستی دی ع

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں

کسی کو پیار کرنا بولتے ہیں۔ کسی سے پیار کرنا محاورا نہیں ہے، البتا پیار اور اخلاص ساتھ لکھیں تو بولیں گے آج کل ان سے آپ کا پیار اور اخلاص بڑا ہوا ہے، اس لیے ایسے موقع پر جہاں خالی پیار کا لفظ ہے، مجھے ہونا چاہیے۔ وغیرا وغیرا۔

تعب تو یہ ہے کہ اقبال کی غزل، بلکے نظم کو بھی اہل لکھنو تسلیم نہیں کرتے۔ ایک دفعا اقبال لکھنو گئے اور پیارے صاحب رشید کو جو میر انیس کے نواسے اور لکھنو کے مشہور مرثیا گو اور اہل زبان تھے، اپنا کلام سنایا۔ اس زمانے میں اقبال پر فارسی کا خاصا غلبا تھا۔ پیارے صاحب رشید خاموشی سے نظم سنتے رہے، اور اس کے بعد بولے۔ "صاحب یہ ہندستانی ہے یا فارسی؟ ہم نے تو ایسی ہندستانی کبھی نہیں سنی"

غلط یہ لفظ، وہ مضمون برا، یہ بندش سست
ہنر عجب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو!

ایک اعتراض اقبال پر یہ بھی ہوا تھا کہ وہ "گفتار کے غازی" ہیں "کردار" کے نہیں۔ یقولون مالا یفعلون، اس پر بھی لگے باتوں ایک چٹکلا سن لیجے۔ مولانا محمد علی جوہر نے ایک دفعا اقبال سے کہا کہ حضرت! بہت ہوچکی قومی و ملی شاعری۔ اب میدان عمل میں اتر آیے، تو اقبال نے جواب دیا کہ مولانا اگر قوال کو بھی حال آجائے تو خیریت نہیں۔

قانی بدایونی انہیں شاعر سے زیادا ناظم سمجھتے تھے

مجنوں گورکھپوری کا اعتراض ہے کہ "اقبال کی تنگ نظری اور غلط فکری میلانات کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، وہاں ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ وہ اتنی بڑی شخصیت کے باوجود ٹھیٹ پنجابی تھے" لیجے صاحب! پنجابی ہونا بھی گویا جرم ہوگیا ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی!
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست
جامی

۱۶ اپریل ۱۹۶۵ء

لطیف حلیف!

صباح الخیرا زلف جاناں سے سوا آپ کا طویل دلاآنا نامہ بعد از انتظار بسیار ملا، جس کو پاکر میں نے "اہلا وسہلا" و "مرحبا" کہا۔

نامہ کیا ہے پورے پانچ صفحات پر مشتمل ایک اچھا خاصا پمفلٹ یا کتابچا ہے۔ ماشاءاللہ آپ کو ہندستانی انشا پردازی پر کسی قدر عبور حاصل ہے، اور آپ طلبا کو کتنی تندہی کے ساتھ درس دیتے ہیں۔ اے کاش دوسرے "مولویان اسکول" اور "پروفیسران کالج" بھی اگر اسی شغف وانہماک اور اسی ہمدردی اور خلوص سے لڑکوں کو پڑایا کریں، اور زبان کا صحی ذوق ان میں پیدا کردیں تو اس میں شک نہیں کہ اڑیسا میں ہندستانی کا بیڑا پار ہے، اس کے لیے میرا سارا الزام معلمین حضرات پر تھوپنا نہیں چاہتا۔ شصت رصد اگر مدرسین ذمے دار ہیں تو صد در صد طلبا پر بھی اس کا الزام عاید ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گروہ غرض صرف میٹرک یا بی اے پاس کرنے پر ہندستانی کو اپناتا ہے۔ پھر پاس ہونے کے بعد نہ اسکو زبان سے کوئی غرض ہوتی ہے نہ مطلب۔ بھلا ایسی حالت میں ہندستانی یہاں خاک پنپے۔ جو دو چار فقرس یہاں ہندستانی کی بے لوث خدمت اور زبان کی روز افزوں ترویج میں لگے ہوے ہیں، ان کا وجود بعینہ بہت غنیمت ہے ؎

من و تو ہر دوائے مجنوں بیا از بہبودی رفصید!
کہ در شہر جنوں دیوانہ با دیوانہ می رقصد!

آپ نے والئ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کا جو لطیفا لکھا ہے، ان سے متعلق اور ایک چٹکلا بھی بہت مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہی امیر صاحب دربار برخاست کرکے اپنے کیمپ کو لوٹ رہے تھے رستے میں انہیں استنجے

کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے حسب دستور کلوح طلب فرمایا۔ انگریز آفیشل جوان کی معیت میں تھے، ڈھیلے کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی شہر پر یہ شعر کہا تھا ؎

کوئی دیکھے نمازی شاہزادے کے تو کھیلوں کو
کہ افسر ڈھونڈتے پھرتے ہیں اسنجے کے ڈھیلوں کو

واقعہ تھی ہو یا غلط، لیکن اکبر نے اپنے کام کی بات اس سے نکالی ہے۔ غرض اس شہنشاہ طنز و ظرافت کے بیسیوں لطیفے اور بے شمار برجستہ گوئیاں زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے، گوہر جان نام کی ایک طوائف ان کے وقت میں الہ باد میں بہت مشہور تھی۔ اس کی آسودہ حالی اور دولتمندی کا ذکر سنکر اکبر نے برجستہ یہ شعر کہا ؎

کون آرام سے دنیا میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

دیکھا آپ نے گوہر اور شوہر کا سنگم؟ اور کتنی چبھتی ہوئی حقیقت ہے، اور یہ شعر بھی بلا خطا ہو کتنی سچی بات کہی ہے، حضرت نے ہم مسلمانوں کی موجودہ حالات کا صحیح نقشا کھینچا ہے ؎

تھے کو بھلا کے آپ فقط ہیں کو دیکھئے
ہم کا زمانہ اب نہ رہا ہیں کو دیکھئے

تجمی

۳ر جولائی ۱۹۶۵ء

عزیزم مولوی صاحب!

صبیحک بالخیر۔ کل شب کو بہار الدین ریاض کے مکان پر ہماری گفتگو کا پھیلاؤ جو تا دیر قایم رہا، وہ نہایت دلچسپ تھا۔ اس خط کو اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھیے۔ چند انگریزی اصطلاحات جو ہمارے شعر و ادب میں آجکل بکثرت مستعمل ہونے لگے ہیں، ان کے ہندستانی مترادف الفاظ نیچے سپرد قلم کرتا ہوں جو یقیناً آپ کی مزید دلچسپی کا باعث ہوں۔

ROMANTIC	رومانی
IMPULSES	ہیجانات
ANALOGY	مماثلت
CONSIOUSMIND.	نفس شعوریہ
SUBCONCIOUS MIND	تحت شعوری
[illegible]	علم النفس
TECHI QUE	ترکیب اظہار
IDIOLOGY	اخلاقیات
EGOISM	انانیت
TIME SPIRIT	روح عصر
LOICALSOUL.	نفس ناطقہ
INCARNAATION.	حلول
SCIENTIFICCERTAIN.	علم الیقین
VISUALCERTAINY.	عین الیقین
REAL CERTAINY	حق الیقین
SYMBOL	علامت، نشان
EPICUREAN	شہوانی
NED-PLATONISM	جدید افلاطونیت
SEXUALITY.	جنسیت
PROPORTION.	تناسب
IDEALISM.	تخلیت
REALISM	واقعیت
PROPORTION	تناسب
DIVINE ORDINANCE	امر الٰہی

وغیرا۔ وغیرا ؎

مادمجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

نجمی

۱۸ر مئی ۱۹۶۵ء

جناب والا!

السلام علیکم!۔ مزاج اقدس؟ جب کڑاکے کا جاڑا پڑنے لگتا ہے تو فارسی میں کہتے ہیں۔ شمس در عقرب است، یعنی آفتاب برج عقرب میں آگیا ہے، اسی لیے کڑکڑاتی سردی ہونے لگتی ہے۔ معلوم نہیں آفتاب عالم تاب اس وقت کون سے برج میں داخل ہوا ہے کہ دن کو ایسی چلچلاتی دھوپ پڑنے لگی ہے کہ پناہ بخدا! گرمی کی وجہ سے کسی پہلو قرار نہیں پڑتا۔ ربنا و قنا عذاب النار!

اکبر الہ بادی کا یہ شعر کتنا صحیح ہے ؎

پڑ جائیں الجی آبلے اکبر کے بدن میں
پڑھ کر جو کوئی پھونکے اپریل مئی جون

لطیفہ سن لیجیے، جس کو ڈاکٹر عندلیب شادانی نے حافظ شیرازی کے اشعار پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی بزرگ کا عرس تھا، مزار پر قوالی ہو رہی تھی، ہزاروں آدمی جمع تھے، قوال گا چکے تو ایک نوجوان، حسین اور شوخ اور چنچل طوائف کی باری آئی، اس نے محفل میں آتے ہی یہ غزل شروع کی ؎

اگر یوں ہی توڑا مروڑی رہے گی
تو کاہے کو انگیا نگوڑی رہے گی

نسوانی حسن - آواز جادو بھری، ادائیں قیامت کی، اشارے غضب کے غرض سارا مجمع دل تھام کر رہ گیا، سچ ہے ؎

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے میں تیری آواز کا

سجادہ نشین پیر صاحب پر تو کچھ ایسی حالت طاری ہوئی کہ الا اللہ کا نعرہ مار کر کھڑے ہو گئے اور محفل میں رقص فرمانے لگے - رقص کرتے کرتے آخر تھک کر گر پڑے، مگر طوائف برابر اسی شعر کو دہراتی رہی - تھوڑی دیر میں جب پیر صاحب کے ہوش و حواس درست ہوئے اور وہ اطمینان کے ساتھ گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے اور محفل سماع برخاست ہو گئی تو ان کے ایک مرید نے عرض کیا کہ حضور اس شعر کا ظاہری مطلب تو ہم لوگ بھی سمجھ گئے لیکن اس میں جو رموز معرفت نہاں ہیں ان تک ہماری عقل کی رسائی نہ ہو سکی، اگر حضور اس کی تشریح فرما دیں تو عین نوازش ہوگی - پیر صاحب نے فرمایا کہ بات تو سیدھی ہی سی ہے، غور کرتے تو تم خود ہی سمجھ جاتے - انگیا سے مراد ہے جسم انسانی، روح اس میں قید ہے اور ہر وقت اس سے نکل جانے کی کوشش کرتی رہتی ہے، تاکہ ذات احدیت سے جا ملے -

توڑا مروڑی سے مراد جسم اور روح کی کشمکش - پس شعر کا مطلب یہ ہوا کہ اگر جسم و روح کی رسا کشی اسی طرح جاری رہی تو روح کا یہ قفس عنصری یعنی بدن جلد ہی ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے گا -

دیکھا جناب آپ نے کتنی خوبصورت تاویل ہے، اور شعر کے سنتے ہی توڑا مروڑ کے کس طرح گنجینۂ اسرار معرفت بنا دیا گیا ہے، اقبال نے سچ کہا ہے ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند

نجمی

۲۵ مئی ۱۹۶۵ء

عزیز من مولوی صاحب

اسلام علیکم - مزاج مبارک ؟

شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر اگر شعر و سخن کا بہت ہی اچھا اور شستہ مذاق رکھتا تھا تو اس کی رفیقۂ حیات ملکۂ نور جہاں بیگم بھی سخن فہمی، سخن سنجی اور برجستہ گوئی میں اس سے کسی طرح کم نہ تھی - شعر و ادب میں ان دونوں کی نوک جھونک بڑی دلچسپ ہوا کرتی تھی -

ایک دفعہ جہانگیر کے دربار میں امیر الامرا شریف خاں شیرازی کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

گذر مسیح از سر ما کشتگان عشق
یک زندہ کردن تو بصد خوں برابر است

اس کے ایک درباری ملا احمد نے کہا ؎

اے محتسب ز گریۂ پیر مغاں بترس
یک خم شکستن تو بصد خوں برابر است

جہانگیر نے نور جہاں کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہا ؎

از سر مہتاب رخ کنیم یا تو یک نفسی
یک دل شکستن تو بصد خوں برابر است

نور جہاں نے فوراً جواب دیا ؎

چوں تابم از تو رخ کہ تو ئی قبلہ مراد
رخ تافتن ز قبلہ بصد خوں برابر است

اسی طرح جہانگیر نے ایک موقع پر نور جہاں کی طرف مخاطب ہو کر کہا ؎

بلبل نیم کہ نالہ کنم در قفس دمم
پروانہ ام کہ سوزم و دم بر نیا ورم

نور جہاں نے فوراً جواب دیا ؎

پروانہ سم نیم کہ بیک شعلہ جاں دہم
شمعم کہ شب بسوزم و دم بر نیا ورم

دیکھا آپ نے جناب عالی
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

اور جب جہانگیر نے ایک مرتبہ نور جہاں کے لباس پر نقرئی چھینٹے دیکھ کر برجستہ یہ شعر کہا ؎

نیست جاناں بر گریباں تو رنگ زعفراں
زردیٔ رنگ رخ من شد گریباں گیر تو

نورجہاں بھلا کب چوکنے والی تھی! جہانگیر کی قبا پر لال بوتام ٹکا ہوا تھا، اس پر نظر ڈالتے ہوئے فوراً کہا ؎

ترا کہ تکمۂ لعل است بر لباس حریر
شدہ است قطرۂ خون منت گریبان گیر

غرض یہ کہ بادشاہ اور بادشاہ بیگم جو ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے، شعر و سخن کا کتنا اچھا اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، ہائے ؎

اے ہم نفسان محفل ما!
رفتید و نے نہ از دل ما!

نجمی

۴ اگست ۱۹۶۵ء

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

مولوی صاحب سلامت! مزاج اقدس؟

میرے اور آپ کے "جنوں کی حکایات خونچکاں" کا سلسلہ ایک بند ہو جانا بڑے افسوس کی بات ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدانہ کردہ کسی نے ہمارے ہاتھ قلم کر دیے بخدا ایسے بہت سے خیالات اور تاثرات ہیں جو نہاں خانۂ دماغ و دل سے نکل کر نوک قلم کے ذریعے سے صفحۂ قرطاس پر الفاظ و معانی کی شکل میں نمودار ہونے کے لیے بیتاب رہتے ہیں، لیکن چونکہ آپ ادھر سے خاموش اور میں ادھر سے چپ تھا، اس لیے یہ سلسلہ جذبے القطع رہا۔ اب میں اپنی طرف سے پھر اس کی تجدید کر رہا ہوں ع

سن از سر نو حلوہ و ہم دار و رسن را

چونکہ ان خطوط میں جواب طلب امور بہت کم ہوتے ہیں، اسلیے آپ ان کے جواب میں چند ان فکر نہ کیجیے صرف ایک نظر غلط انداز ان پر ڈال کر اپنے فائل میں رکھ چھوڑیے کہ "داشتہ آید بکار" کا اصول بہت اچھا ہے۔ ؎

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو!
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ متقدمین میں محبت یار خاں صاحب ایک اچھے سخن سنج اور صاحب ذوق شاعر گزرے ہیں جن کا [illegible]

یہ ہندستانی کے علاوہ فارسی میں بھی گاہ بگاہ طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ فارسی میں انکے یہ دو شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

گر گشش من اثرے داشتے یار بہ گو یم گزے داشتے!
آنکہ جہاں را بہ نگہ زندہ کرد کاش بہ ماہم نظرے داشتے!

ان اشعار میں کتنی سادگی اور واقعیت ہے، زبان کس قدر صاف اور ہلکی پھلکی ہے!

اسی "نظر گزر" پر شریف تبریزی کے دو شعر بھی سن لیجیے ؎

زود دیدہ خوں نشاندم کہ نظر کنی نکردی
برہ تو خاک گشتم کہ گزر کنی نکردی!
دم مرگ ہیچ دانی ز چہ باز ماند چشمم؟
ز تو بود چشم آنم کہ نظر کنی نکردی!

دیکھا آپ نے آنا، جانا، دیکھنا وغیرا معمولی باتیں ہیں، لیکن جس پیرائے اظہار نے ان کو کس قدر دل پذیر بنا دیا ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ کمال اظہار شاعری کی اولین شرط ہے۔ اسلوب بیان بھدے سے بھدے خیال اور المناک سے المناک جذبے کو خوبصورت بنا دیتا ہے، خاقانی کہتا ہے

بہ رخت چہ چشم دارم کہ نظر دریغ داری
بہ رہت چہ گوش دارم کہ خبر دریغ داری

اس پر نورالعین واقف بلگرامی کے دو اشعار بھی پڑھیے سنیے اور سر دھنیے ؎

تو بکار کسے نمی آئی بکنار کسے نمی آئی!
از برائے تو چوں تواں مردن بہ مزار کسے نمی آئی!

نجمی

۲۳ اگست ۱۹۶۵ء

عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک!

مولانا صاحب! سلام علیک۔ دو چار ہماری زبان میں کئی محاورے رائج ہیں جیسے آسمان زمین ملا دینا، آسمان زمین ایک کر دینا، آسمان سے تارے توڑ لانا، آسمان ٹوٹ پڑنا، آسمان پھاڑ کے تھگلی لگانا، آسمان زمین کے قلابے ملانا، آسمان سے باتیں کرنا وغیرا وغیرا۔ ان کے مجازی معنی کی ہوا لیکن انکے حقیقی معنی موجودہ دور میں جتنے بھی ثابت ہو رہے ہیں، شاید اگلے زمانے میں [illegible]

آسمان کے گنگرے چھونا، خلائی تسخیر کا سمی مشکور ہونا، آب دوزوں کا سمندر کا سینہ چیر کر پاتال تک پہنچنا، ایورسٹ پر پرچم لہرانا، ریڈیو کا ہزاروں میل دور کی آوازوں سے کان کے پردے پھاڑنا، ٹیلی ویژن کی اعجاز نمائی، غرضکہ سائنس نے ہمیں بہت کچھ بھلا برا دیا ہے دے رہا ہے اور دیگا۔ "راز دہر کمتر جو" سے اب ذرا بیت باقی نہیں رہی، بلکہ یہ زمانہ "بیشتر جو" کا ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

کہنے کا مدعا یہ ہے کہ استنبول سے ایک تازہ خبر ہے کہ کشتی نوح کا بھی پتا لگ گیا ہے ع

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

ایک انتھر ۶۹ سالا امریکن جان لبی JOHNZI B I کا دعوا ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی کو ARARAT کے پہاڑ پر خاک اور کہرے سے آلودا ایک تودے کی شکل میں دیکھا ہے۔ یہ پہاڑ مشرقی ترکی کی جانب واقع ہے جس کی بلندی سطح زمین سے (۱۶،۹۵۰) فٹ بتائی جاتی ہے۔ مسٹر لبی اس پہاڑ پر تین دفعا چڑھ چکے ہیں۔ یہ صاحب سان فرانسکو کے ایک متمول تاجر ہیں اور چھ بار اس سلسلے میں ترکی جا چکے ہیں، اور گزشتہ سال کے اندر وہ اس مہم پر تیس ہزار ڈالر خرچ کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ وہ اپنے ایک ترکی دوست میجر شہاب عطائے کے ساتھ کوہ ارگری کو پھر سے سر کرنے کے لیے ساز و سامان اور آدمی مہیا کر رہے ہیں۔ حکومت ترکیا نے انہیں اس مہم کی اجازت دیدی ہے۔

دیکھا جناب آپ نے؟ یہ بے پر کا بچیر و یعنی انسان ضعیف الابنیان کہاں سے کہاں پہنچ رہا ہے، اور آسمان و زمین سے کیا گیا تلاے ملا رہا ہے؟

سچ کہا ہے اقبال نے ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغان
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک ست

بہرکیف طوفان نوح کے بعد کشتی نوح جودی پہاڑ پر جا کر ٹھہری تھی! بائبل میں اسے MOUNTARARAT اکثر لغات کی بنا پر کہا گیا ہے اور قرآن کریم نے اس کا نام جودی بتایا ہے آیت کریمہ ہے۔ واستوت علی الجودی۔ یعنی کشتی نے جودی پر لنگر لیا تھا۔

"عجایب المخلوقات" کے مصنف کا بیان ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی سے باہر آنے کے بعد یہاں یعنی کوہ جودی پر ایک مسجد بنائی تھی اور اس مسجد پر عہد نبی عباسی تک ناؤ کے تختے موجود تھے، صاحب مجمع البحار کا کہنا ہے کہ دجلہ اور فرات دو دریاؤں کے بیچ میں ایک جزیرا ہے، جس پر یہ جودی پہاڑ واقع ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ پہاڑ موصل اور شام کے درمیان کہیں ہے۔

اقبال کے اس مصرع سے جو انہوں نے "ہندستان کے بچوں کا قومی گیت" کے عنوان سے لکھا ہے یعنی ع

نوح نبی کا آ کر ٹھیرا جہاں سفینا

معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہاڑ ہمارے ہندستان جنت نشان کی سرحدوں پر کہیں واقع ہے۔

خیر کہیں بھی واقع ہو، دیکھنا اب یہ ہے کہ مسٹر لبی کا کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟ ع

کہ سالک بیخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا!

بالکل صحی ہے۔

مدعی نے سچ دیکھ بھال کے اور سچ بوج کے ہی تو یہ دعوا کیا ہے۔

نجمی

ادریس ایلیگانوی

دنیا میں رہ کے خواہشیں دنیا کبھی نہ کی
جو تب کے دل میں ہے وہ تمنا کبھی نہ کی
آئی فراق دوست میں اکثر لبوں پہ جان
اس پر بھی آرزوے مسیحا کبھی نہ کی
محروم دست شوق نہ رہتا کبھی، مگر
پروا ہمیں نے اے چمن آرا کبھی نہ کی
بے سود اضطراب" گذر جائے کوئی سانس
صورت وہ تیرے عشق نے پیدا کبھی نہ کی
آتا ہے جس سے عظمت اہل جنوں پہ حرف
وہ بات، زندگی میں گوارا کبھی نہ کی
خود اپنے دل کو طور بنائے ہوئے ہیں ہم
حالانکہ سیر وادی سینا کبھی نہ کی
اس کی نگاہ ناز سلامت رہے ادیب
ہم نے تو منت سے دنیا کبھی نہ کی

جاوید احمد خاں

آزادی کا جشن سیمیں

چمن میں اب ہوائیں اس ادا سے سرسراتی ہیں
کبھی تو مسکراتی ہیں کبھی دل کو لبھاتی ہیں
عجب انداز الفت سے قریب آ آ کے کانوں میں
لہک کے ساتھ بیغام مسرت یہ سناتی ہیں
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ، جشن کا دن ہے

وطن کے بیٹے والے دل ہی دل میں مسکراتے ہیں
اچھلتے ہیں چھلکتے ہیں خوشی کے گیت گاتے ہیں
گلے ملتے ہیں آپس میں محبت آزماتے ہیں
چمن کی وادیاں ہریالی، چمن پر رنگ لاتے ہیں
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ جشن کا دن ہے

اس آزادی کی نعمت پا کے کھیتی لہلہاتی ہے
ترقی بڑھتی جاتی ہے زمیں سونا اگاتی ہے
خوشی سے جھومتی ہے یہ زمیں اور گیت گاتی ہے
وطن کے گوشے گوشے سے یہی آواز آتی ہے
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ، جشن کا دن ہے

بڑے ہی شوق سے گنگ و جمن دھارا بہاتی ہیں
زمیں سیراب کرتی اور وہ مستی میں گاتی ہیں
ہمارے دیش کی سب وادیاں خوشبو لٹاتی ہیں
ہمالہ کی چمکتی چوٹیاں مژدہ سناتی ہیں
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ، جشن کا دن ہے

یہ آزادی ہے جس نے من کے دیپک کو جلایا ہے
یہ آزادی، شعور جس نے اپنا جگایا ہے
وطن کے پیار میں اہل وطن نے خوں بہایا ہے
جبھی دلکش یہ نقشہ سامنے آنکھوں کے آیا ہے
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ، جشن کا دن ہے

مبارک ہو کہ نہرو جی کی وہ تدبیر جاگ اٹھی
مبارک ہو کہ گاندھی جی کی وہ تعبیر جاگ اٹھی
مبارک ہو کلام آزاد کی تحریر جاگ اٹھی
مبارک ہو کہ اپنے دیش کی تقدیر جاگ اٹھی
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ، جشن کا دن ہے

یہ آزادی نہیں آپس کی سنگت کا نتیجہ ہے
وطن کے واسطے دن رات محنت کا نتیجہ ہے
یہ ہمت کا نتیجہ ہے صداقت کا نتیجہ ہے
فداکاروں کی قربانی و خدمت کا نتیجہ ہے
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ، جشن کا دن ہے

شہیدان وطن کے پاس کہتی ہے صبا جا کر
یہی مژدہ سناتی ہے مچلتی ہے یہ کہہ کہہ کر
وطن آزاد ہے چاہے تو کوئی دیکھ لے اٹھ کر
شہیدان وطن کی روح کہتی ہے یہ ہنس ہنس کر
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ، جشن کا دن ہے

مسرت کے گھنے بادل فلک پر چھائے جاتے ہیں
خوشی کے اشک برسا کر ترانے گائے جاتے ہیں
نشان رفعت ہندوستان لہرائے جاتے ہیں
شہیدوں کے نشاں پر پھول بھی برسائے جاتے ہیں
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ، جشن کا دن ہے

خوشی کا نام ہے رنج و محن سب کا مٹا دینا
دلوں میں آدمیت کے لئے جذبہ بسا لینا
وطن والوں کی الفت کو نگاہوں میں بسا لینا
ہماری کامرانی ہے اسی حکمت کو پا لینا
بہار و مسکراؤ، گنگناؤ، جشن کا دن ہے
مسرت کی فضا میں گنگناؤ، جشن کا دن ہے

بڑھو جاوید تم تیوار کو ہاتھوں میں لینا ہے
ہوا و موج کی زد پر بھی اپنا سفینا ہے
غریبوں مفلسوں کا آج بھی مشکل میں جینا ہے
ابھی سیکھا نہیں ہم نے بھی جینے کا قرینا ہے
بہار و مسکراؤ، رنگ لاؤ، جشن کا دن

اوشا رانی

دو اہم شخصیتیں

بیگم سید میر قاسم

ان کے مزاج اور رہن سہن کی سادگی کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ بیگم مریم قاسم جموں اور کشمیر کے وزیر بھالا کی بیوی ہیں۔ وہ کشمیر کے کسی بھی متوسط گھرانے کی خاتون سے مختلف نہیں ہیں۔ ان کا آبائی وطن ڈورو شاہ آباد ہے، جو سری نگر کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، لیکن ان کی پیدائش پہلگام کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی تھی جو ان کی ننھیال ہے۔ ان کے دادا سید مقبول ایک نامی درویش اور زمین دار تھے، اور ان کے والد سید غلام مصطفیٰ ایک اسکول میں ٹیچر تھے۔

بیگم مریم قاسم کے ایک بڑی بہن اور دو چھوٹے بھائی ہیں۔ گھر داری سے انہیں بچپن ہی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ ان کی بڑی بہن کو ان کے برعکس گھر کے کاموں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ جس کے نتیجے کے طور پر ساری گھریلو ذمے داری ان ہی کے نازک کاندھوں پر آ پڑی تھی، مگر اس ذمے داری کو وہ انتہائی خوش اسلوبی سے پورا کرتی رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے والد صاحب کی بہت چہیتی تھیں۔

جب بیگم مریم کی عمر گڑیوں سے کھیلنے ہی کی تھی تو وہ خود ایک گڑیا سی دلہن بن گئیں۔ جب ان کی شادی ہوئی تو وہ صرف دس سال کی تھیں، اور ان کے شوہر سید میر قاسم دسویں کلاس کے طالب علم تھے، مگر اس سے پہلے کہ رخصتی ہوتی قاسم مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ ادھر مریم بیگم نے پہلے ادیب کامل پاس کیا، اور اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ میر قاسم نے سیاست میں آنے سے پہلے کچھ دن پڑھایا بھی اور وکالت بھی کی اور پھر سیاست کے اتھاہ ساگر میں کود پڑے۔

میر قاسم کی سیاسی زندگی میں ہر بڑے لیڈر کی طرح اتار چڑھاؤ آتے ہیں، اور سیاست ان کی زندگی کے بیشتر حصے میں ان کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔ اس کے باوجود بیگم میر قاسم کو سیاست سے زیادہ دل چسپی نہیں ہے۔ سیاست، اس کے ہنگامے اور داؤ پیچ انہیں پسند نہیں۔ وہ ایک سیدھی سادی عورت ہیں، جن کی ساری توجہ اور دل چسپی گھر اور گھریلو قرائض تک محدود ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر وہ بھی سیاست میں آجائیں تو ان کے بھرے پرے گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ بچوں کی تربیت خام رہ جاتی اور شاید وہ مستقبل کے اتنے اچھے شہری نہ بن سکتے جس کا خواب ہر ماں اور ہر باپ دیکھا کرتا ہے۔ ان کے چاروں بچوں میں سے کسی کو بھی سیاست سے لگاؤ نہیں، بلکہ ان کے گرد و پیش نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ میر قاسم کے خاندان میں سیاست سے زیادہ ڈاکٹری کا دور دورا ہے۔

بیگم مریم کے بھائی ڈاکٹر سید ظہور احمد سری نگر کے میڈیکل کالج میں پروفیسر ہیں۔ ان کے سب سے چھوٹے بھائی سید منظور احمد بھی ڈاکٹر ہیں اور امریکا مزید تعلیم کے لیے گئے ہیں۔ ان کی بڑی لڑکی نذیرا بھی ڈاکٹر ہے اور ان کی چھوٹی لڑکی شمیم بھی میڈیکل کالج کی طلب علم ہے۔ بڑا لڑکا سید میر سمیر بھی ڈاکٹر ہے اور امریکا مزید تعلیم کے لیے گیا ہوا ہے۔ صرف ان کے سب سے چھوٹے لڑکے جاوید حسین کو ڈاکٹری سے دل چسپی نہیں، اور وہ ابھی کالج میں زیر تعلیم ہے۔ یوں دیکھا جائے تو میر قاسم بھی ایک طرح ڈاکٹر ہی ہیں۔ ایک مخلص اور ایمان دار لیڈر بھی تو ایک ڈاکٹر ہی ہوتا ہے جو بیمار معاشرے کا علاج کرتا ہے۔

اپنے شوہر سے بیگم مریم کو کس قدر محبت ہے، اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ صرف

بہت ہی ضروری تقریبوں میں وزیر عالا کے ساتھ جاتی ہیں۔ اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا ان کا آج بھی محبوب مشغلا ہے۔ گھر پر جو دعوتیں ہوتی ہیں ان کا پورا انتظام وہ خود کرتی ہیں، اور وہ صرف ان دعوتوں میں شریک ہوتی ہیں، جن میں اور دوسری خواتین بھی شامل ہوں۔ شروع میں مریم نے میر قاسم نے نوکری کرنے کی اجازت مانگی تھی، لیکن میر قاسم نے جب ان کی حوصلا افزائی نہیں کی تو انہیں یہ شوق چھوڑنا پڑا تھا۔ ان کی بڑی بہن استانی ہیں اور میر قاسم کے بڑے بھائی سے بیاہی ہوئی ہیں۔

عورتوں کی تعلیم سے بیگم مریم کو بے حد دلچسپی ہے۔ اگر گھر کی ذمے داریاں انہیں مہلت دیتیں تو وہ اپنی تعلیم کو جسے وہ ادھورا سمجھتی ہیں ضرور مکمل کرتیں۔ وہ کہتی ہیں۔ تعلیم میں ایک ایسا جوہر ہے جس سے عورت میں نہ صرف روشن خیالی اور سوجھ بوجھ آتی ہے، بلکہ اس میں خود اعتمادی بڑھتی ہے۔ تعلیم میں ایک ایسا عنصر ہے جو کسی بھی آڑے وقت میں کام آسکتا ہے۔"

عملی سیاست میں دلچسپی نہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بیگم مریم گھر کی چار دیواری میں گھر کر بیٹھ گئی ہیں۔ وہ سوشل ویلفیئر بورڈ کی وائس چیرمین ہیں۔ کشمیر کی انجمن دست کاران برائے خواتین کی صدر ہیں۔ آل انڈیا ویمین کانفرنس کی نائب صدر ہیں، دوسرے لفظوں میں انہیں ان کاموں سے زیادا دلچسپی ہے جو عورتوں کی بہبود اور ان کے مفاد سے متعلق ہوں۔ انہوں نے سماجی فلاح کی تنظیموں میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی نیک مقصد کے لیے وہ لداخ جیسے دور دراز علاقوں تک گئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہاں مردوں سے زیادا عورتیں کام کر رہی ہیں۔ سماجی فلاح کی تنظیموں کے زیر نگرانی بہت سے سنیٹر گاؤں گاؤں میں کھولے گئے ہیں۔ بچوں کے لیے پرورش گاہیں قایم کی گئی ہیں، جہاں کام کرنے والی عورتیں اپنے بچوں کو چھوڑ کر اپنے کام کاج پر چلی جاتی ہیں۔ ان پرورش گاہوں میں دوپہر کا کھانا بچوں کو مفت دیا جاتا ہے۔ سنیٹروں میں عورتوں کو طرح طرح کے کام سکھائے جاتے ہیں، انہیں کڑائی سلائی اور بنائی کی تربیت دی جاتی ہے، تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکیں۔ شادی بیاہ کی تقریبات پر سجے جانے والے لے ما اخراجات سے بیگم مریم بھی نالاں ہیں۔ وہ کہتی ہیں" آج کا انسان زندگی کے اور شعبوں میں تو اتنا آگے بڑھ گیا ہے، مگر نام ونمود کے ارمان اور جہیز جیسی لعنتوں کا طوق ابھی تک گلے میں پہنے ہوئے ہے۔" انہیں یاد ہے کہ جب خود ان کی شادی ہوئی تھی تو مہینوں دعوتوں کا سلسلا جاری رہا تھا، مگر اب وقت بدل گیا ہے، اگر آمدنی بڑی ہے تو ہنگامے اور ذمے داریاں اسی سے کہیں زیادا بڑی ہیں۔ دوسرے پہلے لوگ اپنی حیثیت کے مطابق لڑکی کو جہیز دیتے تھے اور اب لڑکے والے اپنی خواہش اور ہوس کے مطابق اسٹانڈرڈ مانگتے ہیں، جس کو دینے کی دھن میں لڑکی والوں کو بے حد زیر بار ہونا پڑتا ہے، کیونکہ جہیز تو ایک ایسی خندق ہے، جس میں کتنا ہی مال ڈالتے رہو وہ اٹ نہیں سکتی۔"

خالی وقت کے مشاغل کے بارے میں بیگم مریم کہتی ہیں" کیا وقت کبھی خالی بھی ہوتا ہے؟ میں تو فجر کے وقت اٹھتی ہوں، اس وقت سے لے کر رات تک جب میں سونے کے لیے لیٹتی ہوں ایک لمحا بھی فرصت کا میسر نہیں آتا۔ اگر انسان پورے طور پر گھر کے کاموں میں دلچسپی لے تو وہی اتنے ہیں کہ ان سے عہدا برآ ہونا آسان بات نہیں۔ اب آپ دیکھیے میر قاسم کی مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ ہفتوں بچوں سے نہیں مل پاتے، ایک زمانے تک تو انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بچے کیا اور کہاں پڑھ رہے ہیں، کیا یہ سب ایک بیوی پسند کرے گی، اور اگر میں بھی ان کی طرح سیاست کی ہو رہتی تو ان بچوں کا کیا ہوتا ہے جن کے کاندھوں پر کل کے سنہرے خوابوں کی تعبیر کی ذمے داری ہے۔

سروپ بخشی

ہندستان میں کشمیری پنڈتوں کا گھرانا ہمیشا علم وفضل کا گہوارا رہا ہے۔ سروپ بخشی بھی ایک کشمیری پنڈت پدمری پرشاد شنگلو کی بیٹی ہیں۔ ان کے والد ہندستانی کے شاعر ہیں۔ موسیقی اور مصوری میں ان کا خاص مقام ہے، علم وادب سے دلچسپی انہیں باپ سے ورثے میں ملی ہے۔

لکھنؤ میں تارنی شکتی نکیتن کے نام سے لڑکیوں کا ایک اسکول اور کالج ہے، سروپ بخشی اس کالج کی پرنسپل ہیں، وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئی تھیں، لیکن پھر ان کے والدین

لاہور چلے گئے - یہیں سے سروپ بخشی نے ۱۹۴۰ء میں بی - اے کیا، اور یہیں ان کی شادی آر - ایس بخشی سے ہوگئی - آر - ایس بخشی اپنے زراعتی فارم پر کام کرتے ہیں، شادی کے بعد سروپ واپس لکھنو آگئیں، اور یہیں سے انہوں نے انگریزی ادب میں ام - اے کیا - اس کے بعد سنسکرت میں بھی ام - اے کیا -

سروپ بخشی کو بچپن ہی سے شاعری کا ذوق تھا، انہوں نے چودہ برس کی عمر سے ہی شاعری شروع کردی تھی - لکھنو آکر تو جیسے ان کے ادبی ذوق کو چار چاند لگ گئے، اور یہاں انہوں نے ناٹک اور ڈرامے بھی لکھے - ان کے ڈرامے کہانیاں اور نقلیں ۱۹۴۵ء سے آل انڈیا ریڈیو لکھنو سے نشر ہوتے رہے ہیں -

۱۹۴۷ء میں سروپ بخشی نے تعلیم کے میدان میں قدم رکھا اور وہ ناری شکشا نکیتن کی پرنسپل ہوگئیں - ان کے اسکول اور کالج میں پانچ ہزار لڑکیاں زیر تعلیم ہیں -

۱۹۶۹ء میں سروپ بخشی انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی کی صدر منتخب ہوئیں - اس سلسلے میں وہ ایک ثقافتی وفد تاجکستان بھی لے کر گئیں - یہ وفد تاجکستان کی راج دھانی دوشنبہ میں دس روز تک رہا - اس وفد میں ہندستان کے مشہور کلاکار شامل تھے - تاجکستان کا ذکر کرتے ہوئے سروپ بخشی نے کہا کہ وہاں کے نوے فی صد آبادی مسلمان ہے، لیکن پردا نام کو نہیں - عورتیں تعلیم یافتا ہیں، اور مردوں کے ساتھ مل جل کر کام کرتی ہیں - انقلاب روس سے پہلے تاجکستان روس کا انتہائی پس ماندا علاقا تھا - سروپ بخشی تاجکستان کو روس کا یو پی کہتی ہیں - علم وادب شعر وشاعری اور مسلم تمدن کا مرکز جیسے ہندستان میں یو پی ہے، ایسے ہی روس میں تاجکستان ہے، وہاں کی زبان فارسی ہے -

سروپ بخشی اب تک آٹھ ستاہیں لکھ چکی ہیں - ان میں سے کچ کتا ہیں آل انڈیا ریڈیو نے لے لی ہیں - آج بھی آل انڈیا ریڈیو لکھنو سے ان کی نقلیں اور ڈرامے نشر ہوتے رہتے ہیں - یو - پی کی حکومت نے انہیں کئی کتابوں پر انعامات دیے ہیں - ۱۹۶۵ء میں انہوں نے ایک موسیقی کانفرنس منعقد کی، جس میں بسم اللہ خان نے بھی حصا لیا تھا - اسی زمانے میں انہوں نے ایک ڈرامہ "دیر سہاہی" کے نام سے اسٹیج کیا، جس سے انہیں گیارا ہزار روپے کی آمدنی ہوئی - لکھنو میں ایک ریکارڈ ہے، یہ رقم انہوں نے قومی فنڈ میں دے دی -

لکھنو کی ڈراموں کی فضا اختر پیا نواب واجد علی شاہ کے زمانے کے بعد بگڑ ہی گئی تھی، ہندستانی ڈراموں نے لکھنو میں پھر آنکھ کھولی تھی - امانت کی اندر سبھا لکھنو میں ہی اسٹیج کی گئی تھی - سروپ بخشی نے ایک ڈراما "شام اودھ" لکھا، اور برسوں کے بعد لکھنو میں ڈراموں کا دور شروع ہوا - یہ ڈراما بہت کامیاب رہا، اخبارات میں اس کے خوب چرچے ہوئے -

سروپ بخشی کا نہرو خاندان سے بہت قریبی تعلق رہا ہے - مرحوم پنڈت نہرو، جب بھی لکھنو آتے، سروپ بخشی کے گھر "راج بھون" میں ہی ٹھہرتے ان سے پہلے ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو بھی سروپ بخشی کے گھر میں قیام کرتے تھے - وہ موجودہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کو بھی بہت قریب سے جانتی ہیں - اندرا گاندھی سروپ بخشی کی لڑکی اوشا کو اپنی لڑکی سمجھتی ہیں، اور جب بھی غیر ملک کے دورے سے واپس آتی ہیں اوشا کے لیے کوئی نہ کوئی تحفا ضرور لاتی ہیں -

اندرا گاندھی کے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ایک دلچسپ واقعا سنایا - اندرا شادی سے پہلے سوئٹزرلینڈ میں تعلیم پاتی تھی - جب وہ واپس ہندستان آئیں تو ایک محفل میں کسی نے ہٹلر کی تعریف کردی تھی - اندرا کی جمہوریت نواز طبیعت کا اندازا اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے وہیں رونا شروع کردیا - ہٹلر جرمنی کا ڈکٹیٹر تھا، اور ڈکٹیٹر شپ اندرا گاندھی کو بالکل پسند نہیں - سروپ بخشی کہتی ہیں کہ ہم لوگوں کو اندرا کا رونا کافی بچکانہ بات آگیا، ہم جب بھی ان کو چڑانا چاہتے ہٹلر کی تعریف شروع کردیتے، اور وہ ہم سے لڑنے لگتیں - اندرا گاندھی کے مرحوم خاوند فیروز گاندھی، سروپ بخشی کے بہت قریبی دوست تھے - شادی سے پہلے فیروز گاندھی مشہور آدمی نہیں تھے، لیکن اندرا گاندھی کو ان سے محبت تھی، اور انہوں نے باپ کی مخالفت کے باوجود فیروز گاندھی سے شادی کرلی - شادی کے کچ عرصا بعد میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہوگئے - پنڈت نہرو دلی میں تنہا رہتے تھے، انہیں گھر کی بھال اور غیر ملکی مہمانوں کی آو بھگت کے لیے ایک عورت کی ضرورت تھی - اندرا گاندھی نے باپ کا ساتھ دیا، اور دلی میں ان کے ساتھ رہنے لگیں - فیروز گاندھی کو یہ بات پسند نہیں تھی، لیکن وہ مجبور تھے - فیروز گاندھی کا انتقال لگ بھگ پچاس برس کی عمر ہوگیا تھا، وہ دل کے مریض تھے - ایک دفعا جب مرحوم پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی بھوٹان کے سفر میں تھے تو فیروز گاندھی کو دل کا دورا پڑا تھا، لیکن وہ بچ گئے تھے - اس کے بعد ان کی طبیعت خراب رہنے لگی - بیماری کی حالت میں انہوں نے سروپ بخشی کے گھر میں ہی گذارا -

پریم وار برٹنی

شوہر

میں نے چاہی تھی کوئی چاند سے پیاری بیوی
مل گئی تیز چمک دار کٹاری بیوی
شکل اور عقل سے جس وقت ہو عاری بیوی
بعد شادی کے بھی لگتی ہے کنواری بیوی
اس کے گاندھوں پہ چڑھے رہتے ہیں بچے میرے
میرے اعصاب پہ کرتی ہے سواری بیوی
جیسے شوکیس میں رکھا ہوا ماڈل ہو کوئی
میں نے یوں شعر کے شیشے میں اتاری بیوی
ایک دو تین، نہیں نیمی پلاٹنگ والو!
پورے چھ بچوں کی اماں ہے ہماری بیوی
چینی مانگوں تو مجھے چاٹ کھلا دیتی ہے
چٹنی، تیز، مزے دار، کراری بیوی
گھر میں چوہے تو کہاں ہیں، کوئی مچھر بھی نہیں
مجھ کو بخشی ہے مقدر نے شکاری بیوی
پھیلتے جسم کا جغرافیہ دیکھے تو کوئی
کم نہیں کوہ ہمالہ سے ہماری بیوی
گوشت کا بھاؤ اسی طرح اگر بڑھتا گیا
کام آئے گی کسی روز یہ، بھاری بیوی
اب تو راکٹ میں منائیں گے ہنی مون کا جشن
چاند پر جانے کو تیار ہے نیاری بیوی
اپنے شوہر کو سمجھتی ہے کسی ناگ کا بھن
میری پیاری، میری جادو کی پٹاری بیوی
مانگتی ہے کبھی سیکسی تو کبھی بیسل بائم
جیسے دیتی نہیں، فیشن کی پجاری بیوی
بوجھ آدھا بھی تو اٹھتا نہ تھا مجھ سے لیکن
پڑ گئی میرے گلے ساری کی ساری بیوی
جیت کر بھی نہیں جیتا میں کبھی پیار کا داؤ
ہار کر بھی کوئی بازی نہیں ہاری بیوی
ہیر یا ایک سی ہوتی ہیں ادیبوں کی تمام
پریم صاحب وہ مری ہو کہ تمہاری بیوی

شریمتی پریم وار برٹنی

بیوی

کون کہتا ہے کہ بیوی کا خدا ہے شوہر
فتنہ ہے، قہر ہے، آفت ہے، بلا ہے شوہر
نہ محبت کی دوا ہے، نہ دعا ہے شوہر
میرے ناکردہ گناہوں کی سزا ہے شوہر
گھر کی جنت کر بنایا ہے جہنم اس نے
مجھ سے پوچھے نہ خدارا کوئی کیا ہے شوہر
کانپ اٹھتی ہے مسیحائی بھی اس کے ڈر سے
بچ کے رہیو کہ بہت موذی و با ہے شوہر
پیر کی جوتی ہے بیوی وہ روایت تھی غلط
اب تو اس در میں خاک کف پا ہے شوہر
راک اینڈ رول جو کرتی نہیں اس کے ہمراہ
اس لئے مجھ سے بہت سخت خفا ہے شوہر
میں بھی اس بدلہ جو اس کا تو مزا آ جائے
میری ہر ایک سہیلی پہ فدا ہے شوہر
شرم خود شرم سے ہو جاتی ہے پانی پانی
ہر جواں جسم کا وہ تنگ قبا ہے شوہر
کیا اثر کرتے مرے پیار کے نغمے اس پر
قہر کا ساز، قیامت کی صدا ہے شوہر
رات دن مجھ سے کیا کرتا ہے پیار ایسے جیسے
کسی بیوی کی طرح، پوچھ رہا ہے شوہر
کوئی بیوی بھی اسے ہضم نہیں کر سکتی
یعنی ہر مرغ سلیم سے بڑا ہے شوہر
اس سے ٹکرا کے پلٹ آتی ہے آواز مری
میری ہر سوچ کے گنبد کا خلا ہے شوہر
یہ سمجھتا ہے جوانی کا کھلونا مجھ کو
لوگ کہتے ہیں بڑھاپے کا عصا ہے شوہر
داد اولاد تو دیتی ہے مگر میں چپ ہوں
میرے بیڈ روم میں کیوں نغمہ سرا ہے شوہر
بعد شادی کے کھلا راز تو کھل کر روئی
پہلے معلوم نہ تھا شادی شدہ ہے شوہر